خطبات حکیم الاسلام

جلد نہم

افادات

حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی

نور اللہ مرقدہٗ

مرتبہ

قاری محمد ادریس ہوشیارپوری

اضافہ وترتیب جدید :- مولانا محمد شفیق فاضل جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

دارالاشاعت

اردو بازار - کراچی - فون ۲۶۳۱۸۶۱

حقوق طباعت بحق ناشر محفوظ ھیں ۔

مرتب مدظلہ کے اصل مکتوب گرامی کا عکس

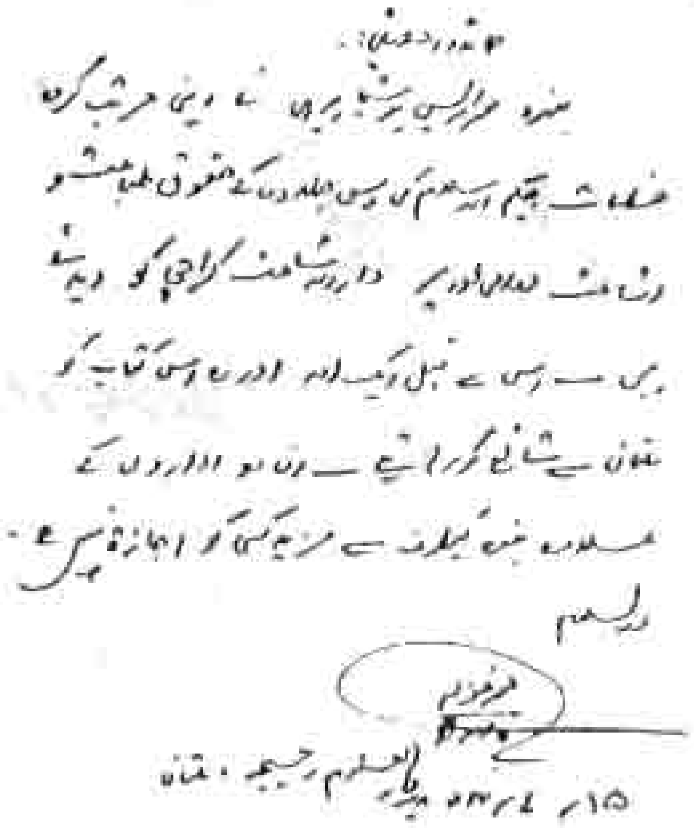

طبع اوّل کمپیوٹر : ۱۹۹۷ء

طبع دوم کمپیوٹر جدید ایڈیشن نومبر ۲۰۰۰ء

باھتمام : خلیل اشرف عثمانی

مرتب : قاری محمد ادریس ہوشیارپوری ❖ اضافہ و ترتیب جدید، مولانا محمد شفیق صاحب

مصححین : مولانا محمد عمیر صاحب۔ مولانا عبدالبصیر صاحب۔ مولانا محمد ہارون صاحب

طباعت : حسان پرنٹنگ پریس

فون 6642832

ملنے کے پتے :

بیت القرآن اردو بازار، کراچی ۱

ادارۃ المعارف دارالعلوم، کراچی ۱۴

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور

ادارۃ القرآن ڈی۔۴۳۷۔ ویپ روڈ گارڈن ایسٹ۔ کراچی۔

اجمالی فہرست

نام خطبات | صفحہ

◆ دعوات فتحیہ ۔۔۔۔۔۔ ۵
◆ انتساب ۔۔۔۔۔۔ ۶
◆ پیش لفظ ۔۔۔۔۔۔ ۷
◆ کلماتِ تبرک ۔۔۔۔۔۔ ۱۱
◆ حرفِ سپاس ۔۔۔۔۔۔ ۱۲
◆ اسلام عالمی مذہب ہے ۔۔۔۔۔۔ ۴۱
◆ جامع مذہب ۔۔۔۔۔۔ ۷۵
◆ اسلام کے تین بنیادی امتیازات ۔۔۔۔۔۔ ۷۷
◆ اسلامی تمدن ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۵
◆ اشتراک مذہب ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۵
◆ مذہب اور سیاست ۔۔۔۔۔۔ ۱۳۳
◆ اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۵
◆ اسلام اور آزادی ۔۔۔۔۔۔ ۲۲۵
◆ سائنس اور اسلام ۔۔۔۔۔۔ ۲۳۳
◆ مسلم پرسنل لاء ۔۔۔۔۔۔ ۲۸۵
◆ فکر اسلامی کی تشکیل جدید ۔۔۔۔۔۔ ۳۰۵
◆ امارات شرعیہ ۔۔۔۔۔۔ ۳۲۹
◆ تکمیل انسانیت ۔۔۔۔۔۔ ۳۵۵
◆ حقوق مالیہ ۔۔۔۔۔۔ ۳۷۱
◆ عروج وزوال ۔۔۔۔۔۔ ۳۹۹
◆ ملت اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج ۔۔۔۔۔۔ ۴۰۳
◆ فلسفۂ موت ۔۔۔۔۔۔ ۴۳۱
◆ اسلام میں تصورِ آخرت ۔۔۔۔۔۔ ۴۴۹
◆ راہِ نجات ۔۔۔۔۔۔ ۴۵۷
◆ تعلیم و تبلیغ ۔۔۔۔۔۔ ۴۸۹
◆ جماعتی تبلیغ ۔۔۔۔۔۔ ۴۹۷
◆ تبلیغی جماعت اور اصلاح ۔۔۔۔۔۔ ۵۱۳

عارف ربّانی، حجۃ القراء شارح شاطبی

حضرت الحاج مولانا المقری القاری فتح محمد صاحب

(ادام اللہ بقاءہ بالعزۃ والجمال)

مکتوب گرامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میرے پیارے عزیز مولوی قاری محمد ادریس صاحب نور ک اللہ .علمہ وعرفانہ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

الحمدللہ بخیریت ہوں، مرض میں نہ اضافہ ہے اور نہ افاقہ، اللہ پاک سے احباب کی مخلصانہ دعاؤں کی بدولت صحت وقوت کا امیدوار وطلب گار ہوں۔ الحمدللہ سب نمازیں حرم شریف میں ہو رہی ہیں، کبھی کبھی عمرہ بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ ذہنی سکون، طبعی بشاشت میسّر ہے۔ فللّٰہ الحمد والشکر۔ آپ کی مساعی حسنہ کے ثمرات خطبات حکیم الاسلام جلد اول مکمل سنے، بے حد لطف آیا۔ اللہ پاک حکیم الاسلام دامت برکاتہم اور جامعین خطبات کو اپنی شایان شان دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ یہ ایک مبارک اور عظیم کام کر رہے ہیں۔ ان مواعظ، خطبات کا مقصود یعنی رجوع الی اللہ ورسولہ صحیح معنی میں امت مسلمہ کو عطا ہو۔

میرے پیارے! آیات قرآنی اور احادیث نبوی اعراب سے معرّیٰ ہیں۔ طبع ثانی میں صحیح اعراب لگا دیئے جائیں کہ پڑھنے والے سب حافظ وعالم نہیں ہوتے۔ آج کل خطبات جلد ۲ سن رہا ہوں وعظ "راہ اعتدال صفحہ ۴ میں" **ھنّ امّ الکتاب** کا ترجمہ شاید لکھنے سے رہ گیا ہے۔ طبع ثانی میں اس کو بھی پورا کر دیا جائے۔ تمام احباب کو بہت بہت سلام اور چھوٹے بچوں کے لئے پیار ودعا پیش ہوں۔ اس پرچہ کی دعائیں اللہ پاک سب کے حق میں قبول فرمائیں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؒ

دعواتِ فتحیہ

حق تعالیٰ شانہ آپ کو اور پورے خاندان کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو کامل عافیت و راحت اور سکون واطمینان کے ساتھ رکھ کر جملہ ضروریات اپنے غیبی خزانے سے پوری فرماتے رہیں اور آج سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک بے شمار' بے حساب' حلال' بابرکت' باوسعت رزق بھی آپ حضرات کو اور پورے عالم کے مسلمانوں کو عطا فرماتے رہیں۔ نیز آپ حضرات کو اور ہم سب کو آخرت کی فکر و شوق دنیا کی فکر و شوق سے کروڑ درجے زیادہ نصیب فرمائے۔ نیز موت اور خاتمے کے دن کو ہم سب کے لئے کروڑوں عیدوں سے بڑھ کر خوشی کا دن بنا دیں۔ نیز ہماری قبروں کو اپنی رحمت سے جنت کا باغ بنادیں اور دوزخ کے گڑھے نہ بنائیں اور سب کی تمام پریشانیوں کو راحتوں سے اور بیماریوں کو شفائے کامل عاجل مستمر سے اور مشکلات کو آسانیوں سے اور رنجوں اور غموں کو خوشیوں سے اور قرض داریوں کو سبکدوشیوں سے اور تنگیوں کو فراخیوں سے آن کی آن میں اور دم کے دم میں بدل دیں۔

آمین یا رب العالمین۔ بجاہ سیدالمرسلین صلی اللّٰہ علیہ وسلم

ازاحقر کاتب السلام علیکم وعرض دعا قبول ہوں۔

بقلم عبدالقادر بن محمد متقی عفی اللہ عنہما
۵/۶/۱۴۰۲ھ
۳/۱/۱۹۸۲ء
بعد عصر حرم نبوی شریف

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

خطبات حکیم الاسلام جلد چہارم کی ترتیب و تدوین کے
بعد اس ذرۂ بے مقدار کو اپنے اس صاحب عزیمت و عظیم المرتبت
استاذ، مستقیم الاحوال بزرگ عارف ربانی کے اسم گرامی سے منسوب
کرتا ہوں جو زندگی بھر خدمت قرآن حکیم میں مصروف عمل رہے
اور طالبانِ قرآن کریم کی ایک دنیا اُن سے اکتساب فیض کرتی رہی
بالآخر چالیس برس کی عظیم جد و جہد کے بعد
اسی مسند پر جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی
جہاں روزِ اول درس قرآن کریم کیلئے تشریف فرما ہوتے تھے
میری مراد مجدد القراءت، استاذ الاساتذہ
شیخ العرب والعجم، عارف باللہ سیدی و مولائی حضرت الامام
المقری القاری رحیم بخش صاحب نور اللہ مرقدہ (خلیفہ ارشد
حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی
نور اللہ مرقدہ) سے ہے جن کے فیض صحبت سے پایا
عنایات اور خصوصی اعتماد سے بندہ ناچیز نے کام کیا
گرد راہِ حضرت استاذ مکرم

[illegible]

۲۸ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حامدا للّٰہ العظیم ومصلّیا علیٰ رسولہ الکریم

اما بعد

حضرات اہل اللہ کے خطبات ومقالات اور ان کے سوانح وتذکرے دل کی دنیا کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔ دل سے دنیا کی محبت زائل ہوجائے اور حق تعالیٰ شانہ کی عظمت ومحبت سے دل معمور ہوجائے۔ اس کے لئے اصل تو اہل اللہ کا فیض صحبت ہے جس سے علم وعمل میں رسوخ پیدا ہوتا ہے، علم کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے اور مقصود علم سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، قلوب کا زنگ دور ہوکر امراض باطلیہ کا احساس ہونا شروع ہوجاتا ہے اور یہی احساس ان کے ازالہ کا ذریعہ بن کر زینۂ ترقی ثابت ہوتا ہے ____ آج کے جدید دور نے صحبت ومعیّت کی اہمیت کو حسی مثالوں سے اس طور پر نمایاں کردیا ہے کہ اب اس کا انکار گویا واقعات کو جھٹلانا ہی نہیں بلکہ خود اپنی عقل وخرد کی ناکامی کا اعتراف بھی ہے، جیسے آم کو لیموں یا کسی اور پھل کی قلم لگادی جائے تو آم کی صورت گو وہی رہے جو حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اسے روزِ اول سے ودیعت کی گئی ہے، تاہم اس کا ذوق باطن اور اندرونی مزہ وہ ہوگیا جو لیموں کے باطن کا تھا۔

اہل اللہ کے قلوب سے اپنے قلب کی پیوند کاری سے اہل اللہ کا ذوق وشوق اور ان کی باطنی کیفیات دل میں منتقل ہونا شروع ہوجاتی ہیں اور اسی صحبت کے اثرات سے انسان کا قلب وقالب بدلتا چلا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے :

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ۔ (توبہ پ۱۱ آیت ۱۱۹)

اہل ایمان کو تقوی اختیار کرنے کا حکم ہے جو کہ مقصود ہے اور حصول مقصود کا آگے سہل راستہ ہے کہ :

”سچے لوگوں کے ساتھ ہوجاؤ“۔

گویا تقویٰ کے حصول کا ذریعہ صادقین کی معیت ہے۔

چونکہ قرآن حکیم ابدی کتاب ہے اس کے تمام اوامرونواہی بھی ابدی ہیں، تو اہل صدق کی معیّت اختیار کرنے کا حکم بھی ابدی اور دائمی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل صدق وصفا کا وجود مسعود ہمیشہ ہوگا۔ ورنہ حکم کے پورا کئے جانے کی کوئی صورت نہیں --- الغرض اہلِ صدق ہمیشہ تھے اور ہمیشہ ہوں گے۔ ہاں اس جنس گرانمایہ کی قلّت وکثرت ہوسکتی ہے اور اہل طلب کو ڈھونڈنے سے کیا کچھ نہیں مل سکتا؟

بہرحال صحبت صالحین کی اس قدر اہمیت ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا چھوٹے سے چھوٹا عمل پوری امت کے تمام اعمال پر اسی لئے بھاری ہے کہ وہ صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے باطنی کمالات حاصل کرچکے ہیں کہ جس کیفیت اور حسن استغراق سے وہ حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ قدس میں عجزونیاز کا اظہار کرپاتے ہیں۔ وہ کسی ایسے شخص کے لئے ممکن ہی نہیں جس نے صحبت نبوی سے حصہ نہ پایا ہو، اسی کو تو کہا ہے کہ ۔

وہ کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کردیا

اسی مسیحائی اعجاز کا ظہور تھا کہ دنیا کے جس خطے کی طرف ایک صحابیؓ بھی نکل گئے تو دنیا کی دنیا بدلتی چلی گئی ــــ یہی قلب کی وہ دولت ہے جس کے سامنے دنیا کا کوئی فکر' فکر نہیں رہتا اور پوری دنیا کے بارے میں متاع الدنیا قلیل کی قلبی و حقیقی کیفیت حاصل ہوجاتی ہے اور فقر میں شاہی کرنے والا انسان اپنی صفات میں ملکوت کو شرمادیتا ہے کہ ۔

نے تخت و تاج میں' نے لشکر وسپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

دنیا کے جاہ وجلال سے حجابِ غرور اٹھ جاتا ہے اور مردار بکری کی دینار و درہم سے خرید کو معیوب سمجھنے والا انسان اپنی زندگی کے سرمایہ سے دنیا وما فیھا کی خرید پر آمادہ نہیں ہوتا کہ ۔

نرخ بالا کن' ہنوز ارزانی

صبر وتوکّل' زہد وغناء' ورع وتقویٰ کی وہ شمع قلب میں فروزاں ہوجاتی ہے کہ وہ زبانِ حال سے کہتا ہے ۔

من دلقِ خود بافرِ شاہاں نمی دھم
من فقرِ خود بملک سلیمان نمی دھم

از رنج فقر دردلے گنجے کہ یافتم
ایں رنج را براحت شاہاں نمی دھم

اسی خزانے کا مالک جذب وشوق اور فنائیت کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ ۔

دل ڈھونڈتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
ایک ڈھیر ہے یاں خاک کا اور آگ دبی ہے

حکیم الامت حضرت اقدس مولانا تھانوی قدّس اللہ سرّہ ایک مقام پر فیض صحبت کی اسی تاثیر واہمیت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں :

"صحبت اولیاء میں ایک خاص بات قلب میں ایسی پیدا ہوجاتی ہے جس سے خروج عن الاسلام کا احتمال نہیں رہتا' خواہ گناہ اور فسق وفجور سبھی کچھ اس سے وقوع میں آویں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوجاوے۔ مردودیت تک کبھی نوبت نہیں پہنچتی۔ برخلاف اس کے ہزار برس کی عبادت میں بذاتہ یہ اثر نہیں کہ وہ کسی کو مردودیت سے محفوظ رکھ سکے' چنانچہ شیطان نے لاکھوں برس عبادت کی لیکن وہ اس کو مردودیت سے نہ روک سکی۔ یہی معنی ہیں اس شعر کے ۔

یک زمانہ صحبت باولیاء، بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کیونکہ ظاہر ہے کہ ایسی چیز جو مردودیت سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کردے ہزارہا سال کی اس عبادت سے بڑھ کر ہے' جس میں یہ اثر نہ ہو۔"

(حسن العزیز صفحہ ۱۵ جلد ۱)

نیز ایک اور مقام پر فیضِ صحبت اور اگر وہ میسر نہ ہو تو اس کے لئے بدل کیا ہو' اس کے بارے میں ارشاد ہے :

"کمال اسلام کے لئے ضرورت ہے علم اور ہمت کی ـــــ اور تیسری چیز ایک اور ہے جس سے علم وہمت میں قوت پیدا ہوتی ہے وہ اہل اللہ کی صحبت ہے یہ عجیب چیز ہے جس سے اس مردہ جسم میں روح پڑ جاتی ہے اسی کو کہا ہے کہ ۔

مقام امن و مے بے غش و رفیق شفیق
گرت بدام میسر شود زہے توفیق

اگر ہمیشہ میسر نہ ہو تو گاہے گاہے سہی۔ جب بھی موقع ہو۔ ایک اور چیز اس کے قائم مقام بھی ہے کیونکہ جب مروارید میسر نہ ہو تو صدف سے ہی کام نکال لیا جاتا ہے اس کا بیان اس شعر میں ہے ۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحی مے ناب و سفینہ غزل است

یعنی بزرگوں کے تذکرے اور حالات جن میں برقی اثر ہے کہ کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو ان کو پڑھ کر ایک دفعہ تو مستعد ہو ہی جاتا ہے ان میں بھی صحبت کی سی برکت ہے۔ اگر صحبت میسر نہ ہو تو اسی کو اختیار کرو بہت کام دے گی"۔

(الاسلام الحقیقی صفحہ ۹۲)

بہرحال ان مواعظ وخطبات سے ان شاء اللہ جہاں علمی نکات واسرار آپ کے سامنے آئیں گے وہاں روحانی رموز ودقائق بھی حل ہوں گے۔ اس دور صدف میں صحبت اہل اللہ کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے ان انوار وبرکات سے بھی حصہ وافر پائیں گے ۔

دادیم ترا ز گنج مقصود نشان
گر ما نرسیدیم شاید تو بری

بہرحال خطبات حکیم الاسلام کی چوتھی جلد اس وقت آپ کے زیر ملاحظہ ہے مختلف موضوعات پر مواعظ جمع ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے ہر وعظ انفرادیت کا حامل اور اپنی نوعیت میں ندرت رکھتا ہے ـــــ آج سے چار سال قبل جو مواعظ طیبہ کی جمع وترتیب کا سلسلہ شروع کیا تھا اب چوتھی جلد کی شکل میں اس کا مجموعہ آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہے۔

آغاز سفر میں ہرگز یہ خیال نہ تھا کہ خطبات کا سلسلہ اتنا وسیع اور ان کا پھیلاؤ اس قدر ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی کم ہمتی کو دیکھوں تو بات اب بھی سمجھ سے بالاتر ہی نظر آتی ہے کہ آخر یہ کام کیسے سرانجام پایا؟ ـــــ محسن اساتذہ کرام اور مخلص احباب کرام کی دعائیں شامل حال رہیں تو یہ کام ہو سکا۔ اس لئے جو کچھ بھی آپ کو نظر آ رہا ہے اس کو ہرگز اس بندۂ عاجز کی محنت کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ اپنی دعوات صالحہ کا ثمرہ خیال فرمادیں۔

اور اس کا اصل سبب تو حضرت العلام حکیم الاسلام مدظلہ العالی کا اخلاص و للّٰہیت ہے۔ جس کی قبولیت کا یہ مظہر ہے۔ حق تعالیٰ شانہ ہم سب کے لئے اس کو نافع بنائیں۔

حضرت حکیم الاسلام مدظلہ کے ارشاد فرمودہ خطبات الحمدللہ ہر لحاظ سے جامع ہوتے ہیں۔ ایسے علمی، ادبی، تحقیقی اور اصلاحی خطبات و مواعظ پر عنوان قائم کرنا مجھ ایسے بے بضاعت کے لئے نہایت مشکل کام تھا مگر بفضلہ تعالیٰ سرانجام پایا ـــــ بایں ہمہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عنوانات قائم کرنے میں جس نزاکت اسلوب کو ملوظ رکھنا چاہئے تھا وہ "ذوقِ ادب" سے خالی ہونے کی بنا پر نہ رکھ سکا ـــــ قارئین کرام کو خطبات کے علمی مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے جو خوش کن کیفیات حاصل ہوں گی خدا نہ کرے کہ اس میں ترتیب عنوانات ان کے ذوق سلیم کے لئے بار گراں ثابت ہو ـــــ اپنی سعی و کوشش کی حد تک حسن ترتیب کا خیال رکھا ہے مگر پھر بھی کمی کا رہ جانا امر لازم ہے ؎

فدایت دیدہ ودل رسم آرائش ازمن مپرس
خراب ذوق گل چینی چہ داند باغبانیہا

اپنے احباب مخلصین حضرت الحاج مولانا القاری والمقری سیف الدین صاحب مدظلہ مقیم مکہ مکرمہ اور حضرت الحاج مولانا قاری ومقری محمد رفیق صاحب مدظلہ مقیم جدہ (سعودی عرب) کا تہہ دل سے ممنون اور شکر گزار ہوں کہ انہوں نے خطبات کی تمام جلدوں کے لئے بھرپور مواد مہیا فرمایا اور اس طرح یہ عظیم علمی سرمایہ منظرعام پر آسکا ـــــ اپنے برادر عزیز قاری محمد قاسم عزیز سلمہ کا بھی شکر گزار ہوں کہ وہ بھی اس سلسلہ میں اپنی ذاتی مصروفیت کے باوجود تعاون فرماتے رہے۔ حق تعالیٰ شانہ ان تمام حضرات کے درجات بلند فرماویں اور ان کو بہت بہت اجر و صلہ نصیب فرماویں۔ اور ان خطبات و مواعظ کو شرف قبولیت نصیب فرماویں۔

امین یا رب العالمین۔ بجاہ سیدالمرسلین علیہ الصلوۃ والتسلیم الف الف مرۃ

بندۂ نابکار
محمد ادریس ہوشیارپوری غفرلہ
یکم ربیع الاول ۱۴۰۳ھ
مطابق ۱۸ر دسمبر ۱۹۸۲ء

****

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلماتِ تبرّک

الحمد لولیہٖ والصلوٰۃ والسلام علی نبیہٖ،

اما بعد!

برکۃ السلف، حجۃ الخلف، حکیم الاسلام حضرت العلام مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی کی علمی وروحانی شخصیت کا نام نامی آجانا مواعظ وخطبات کی اہمیت وافادیت کے لئے کافی ووافی ہے ____ علوم ومعارف پر مشتمل یہ گرانقدر مجموعہ اہل علم، خطباء، ائمہ مساجد اور مقررین و مبلغین کے لئے علم وحکمت کا عظیم سرمایہ ہے۔ عنوانات کے اضافے سے مضامین کا استحضار نہایت سہل ہو گیا۔

الحمد للہ! بندہ نے شروع سے آخر تک تمام مسودہ بنظرِ عمیق دیکھا، اور متعدد مقامات پر برائے اصلاح نشاندہی کی۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ

عزیزم مولوی حافظ قاری محمد ادریس سلمہ، (فاضل خیر المدارس، ملتان) نے شبانہ روز محنت وکاوش سے اسے مرتب کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بالآخر کتاب، موجودہ شکل میں منظرِ عام پر آگئی۔ دل سے دعا ہے اللہ تعالیٰ میرے پیارے عزیز سلمہ کی اس محنت وجان فشانی کو اپنی رضا کا ذریعہ بنائے اور اپنی جنابِ خاص سے اس کا اجر بے پایاں عنایت فرمائے۔ نیز علم وعمل صحت وعمر میں برکت نصیب فرما کر خلوص وللّٰہیت کے ساتھ مزید بر مزید خدمت دینِ متین کے مواقع فراہم فرمائے۔ اور ہم سب کا ایمان پر خاتمہ نصیب فرمائے۔

آمین

جزاک اللہ یا ادریس خیرا
علی ماصنعت لاھل الدین خیرا

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ

۱۰/ ۱۲/ ۱۴۰۱ھ
(والد محترم مرتب مدظلہ)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

حرف سپاس

ناسپاسی ہوگی ۔ اگر اوّل ، دوم ،سوم کی طرح جلد چہارم کے اس مجموعۂ صد رنگ کا سرنقطہ آغاز اس بزرگ اور مہربان شخصیت کو قرار نہ دوں جس نے اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں مجھے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بھرپور تعاون سے نوازا اور اس مشکل کام کو میرے لئے آسان کردیا۔

تشکر وامتنان کے جذبات کا اظہار یوں بھی ایک دشوار گزار مرحلہ ہے مگر جب یہ تعاون ایک ایسی ہی شخصیت کی جانب سے ہو جو بوقلموں فضائل کے ساتھ ساتھ والد گرامی کی نسبت وعظمت بھی رکھتی ہو تو ان جذبات کا اظہار جس نزاکت اسلوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کی استعداد کہاں سے لائی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ والد گرامی قبلہ محترم حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دامت برکاتہم ___ کی علمی رہ نمائی اور عملی شفقت وعنایت ہی سے میں اس قابل ہوا کہ اس گلدستۂ پند وحکمت کو مرتب کرسکوں۔

دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ بتصدق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ظلّ عاطفت کو ہمارے سروں پر تادیر سایۂ فگن رکھے اور اپنی جناب خاص سے انہیں اپنی اور ان کی شایان شان اجر وثواب سے خوش وقت وشاد کام فرمائے اور اس کوشش ناکام کو سعی مشکور سے مبدل فرمائے۔ آمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اسلام عالمی مذہب ہے

قرآن کریم تمام کتابوں کا محافظ ہے ان کے اندر جو تعلیم حق ہے۔ وہ قرآن نے جاری کردی اور قوموں نے جو رلا ملا دیا تھا قرآن نے اس کو نکال کر پھینک دیا۔ اس لئے ایک مسلمان جب اسلام لائے گا تو مسلمان ہونے کے بعد سچا عیسائی بنے گا۔ کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح معنی میں ایمان لائے گا۔ اسی طرح جو مسلم بنا وہ صحیح معنی میں موسائی بنا کہ اس نے سند متصل کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو صحیح طور پر سمجھا۔ وہی ابراہیمی بنا وہی آدمی بنا۔ یعنی جناب آدم علیہ السلام کو مانا۔۔ تو سند متصل کی دنیا میں ایک ہی کتاب ہے۔ س نے دنیا کی کتابوں کا تعارف کرایا۔ اس کا ماننا سب کا ماننا ہے۔ اس میں داخل ہونا ساری چیزوں کو اپنے سامنے لے آنا ہے۔"

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- خطبۂ مسنونہ ۴۱
- حکیمانہ تشکر ۴۱
- دار العلوم کا ایک طالب علم ۴۲
- ادائیگی فرض ۴۲
- تمہید ۴۲
- نظریاتی یکسانیت ۴۳
- مذہبی یکسانیت ۴۳
- عالمی دین ۴۴
- آغازِ اسلام ۴۶
- تکمیلِ شریعت ۴۶
- وحدت دین ۴۶
- ترکِ توحید کی پھٹکار ۴۷
- تاثیر توحید ۴۹
- عبادت و تعظیم کا فرق ۴۹
- تعظیمی سجدہ ۵۰
- معیارِ تعظیم ۵۰
- اوصافِ معبودیت ۵۱
- تکمیل توحید ۵۲
- استحقاقِ عبودیت ۵۳
- اختلافِ مذاہب کے اسباب ۵۴
- حدودِ عقل ۵۵
- امور غیبیہ اور عقل ۵۶
- حدودِ ادراک ۵۷
- منبعِ عقائد ۵۷
- ضرورتِ اعتدال ۵۸
- کمالِ ایمان ۵۸
- ممنونیت احسان ۵۹
- شانِ عبدیت ۵۹
- اقسامِ توحید ۶۰
- اسلام کا مزاج ۶۲
- عقائدِ صحیحہ کی پہچان ۶۲
- بین الاقوامی دین کی علامت ۶۳

فہرست مضامین

◆ ایک یہودی سے گفتگو ۶۴
◆ بین الاقوامی دین کی دوسری علامت ۶۵
◆ بین الاقوامی دین کی تیسری علامت ۶۵
◆ افضلیت کا بین الاقوامی معیار ۶۶
◆ بین الاقوامی دین کی چوتھی علامت ۶۶
◆ بین الاقوامی دین ہونے کا معیار ۶۷
◆ فکرِ فردا ۶۹
◆ درپیش منزل ۷۰
◆ دین حق کی آسان پہچان ۷۰
◆ حضرت حاتم اصمؒ کا واقعہ ۷۱
◆ انتخاب محبوب ۷۱
◆ تعیین دشمن ۷۱
◆ با اعتماد ذات ۷۲
◆ صاحبِ دور کا اتباع مدارِ نجات ہے ۷۲
◆ انکارِ قرآن تمام کتب کے انکار کو مستلزم ہے ۷۳
◆ قرآن کریم تمام کتبِ سماویہ کا محافظ ہے ۷۳

جامع مذہب

فہرست مضامین

◆ جامع المذاہب ۷۵
◆ طبقاتی اجتماعیت ۷۶
◆ دار العلوم کی شانِ اجتماعیت ۷۶
◆ وفاق المدارس ۷۶

اسلام کے تین بنیادی امتیازات

فہرست مضامین

- تمہید ۷۷
- ہدایت خداوندی ۷۷
- عقل اور حواسِ خمسہ ۷۸
- دین حق کی پہچان اور اس کے دو معیار ۷۹
- پہلا معیار روایت ۷۹
- حفاظتِ قرآن کی ظاہری سند ۸۰
- حفاظتِ قرآن کی باطنی سند ۸۱
- اوصافِ راوی ۸۱
- نبی کریم ﷺ کے اوصاف ۸۴
- کلامِ خدا و کلامِ رسول ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری ۸۵
- کلامِ رسول کلامِ خداوندی کا بیان ہے ۸۶
- حضرت علیؓ کی جانب سے ابنِ عباسؓ کو استدلال بالقرآن کی ممانعت ۸۸
- منکرینِ حدیث کا انجام اور حدیث ۸۸
- قرآن کا لب ولہجہ ۸۹
- دار العلوم میں سلسلہ مسلسلات بالاولیت ۹۴
- ازروئے روایت دینِ اسلام اور اس کی ہر بات مستند ہے ۹۵
- علم نبی کریمؐ کی وراثت ہے ۹۶
- مسلمانوں کے ہاتھ میں مستند دین موجود ہے ۹۷
- مسلمان دنیا میں لینے کے لئے نہیں بلکہ کچھ دینے کے لئے آیا ہے ۹۷
- ہر مرد مسلم کو اپنے ازم کی دوسروں کو دعوت دینی چاہئے ۹۸
- دعوت الی اللہ کے مختلف طریقے..... بذریعہ طب ۹۹
- تجارت کے ذریعے دعوت الی اللہ اور چین میں اسلام کا ورود مسعود ۹۹
- خیر خواہی اور خدمتِ خلق بھی ذریعہ ہے دعوتِ الی اللہ کا ۱۰۰
- حکمت کیساتھ دعوت الی اللہ کی پیشکش ۱۰۱
- دعوت الی اللہ کے غیر مسلم بھی مستحق ہیں ۱۰۲
- مخاطب کے مناسب حال طریقے سے دعوت پہنچاؤ ۱۰۲
- حضورؐ کا رکانہ کو کشتی میں پچھاڑنا ۱۰۳
- وہ طریقہ اختیار کرو جس سے غیر مسلم بھی اسلام کی طرف لپکیں ۱۰۴
- چہرہ بھی اسلام لانے کا سبب بن جاتا ہے ۱۰۴
- حضرت عمرؓ کی خدمت کا ایک عجیب واقعہ ۱۰۵
- دعوت الی اللہ کے دو درجے ۱۰۵
- دین کو عملاً قبول کرنے کی صورتیں..... وراثت غیروں کی نظر میں ۱۰۶
- اسلام میں تعدد ازدواج اور غیر مسلموں کا سلوک ۱۰۷

◆ غلبہ اسلام کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ کی پیشن گوئی ۱۰۷
◆ اسلام کے متعلق جارج برناڈ شاہ کی پیشن گوئی ۱۰۸
◆ مذکورہ پیشن گوئیوں کی تائید میں حدیث رسول ۱۰۸
◆ مسلمانو! انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤ ۱۰۸
◆ غلبہ اسلام کے متعلق خداوند عالم کی شہادت ۱۰۹
◆ اللہ نے حضور ﷺ وصحابہ کو منتخب فرمایا اور ہر ایک صحابی کسی نہ کسی نبی کی نسبت پر ہے ۱۱۰
◆ طلبہ دین صورۃً مساکین ہیں مگر قلوباً سلاطین ہیں ۱۱۰
◆ حضرت عالمگیرؒ اور ایک طالب علم کا دلچسپ واقعہ ۱۱۱
◆ مدارس اسلامیہ کا مقصد حقیقی دعوت الی اللہ ۱۱۲
◆ جشن صد سالہ پر حضرت حکیم الاسلام کی طرف سے اہل مدرسہ کو مبارک باد
اور ایک صدی گزرنے پر انقلابی حالات پر مختصر کلام ۱۱۳
◆ دعا ۱۱۴

اسلامی تمدن

استفتاء اور سوال کرنے والوں کے لئے ضرورت ہے کہ وہ فکر کے ساتھ واقعات سامنے رکھیں۔ اسی طرح مفتیوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ سارے واقعات کے ایک ایک پہلو کو سامنے رکھ کر حکم لگائیں۔ صرف اجمالی ذکر نہ کریں، تفصیلی واقعات کو سامنے رکھ کر فتویٰ صادر کریں...... مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس میں ایسی گنجائشیں نکلیں گی کہ قوم کو اپنے مفاد سے بھی محرومی نہیں ہوگی اور ناجائز و حرام کا ارتکاب بھی نہیں کرے گی۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہٗ

فہرست مضامین

- اسلام کے پیش کردہ دو راستے ۱۱۵
- علم کی دو قسمیں ۱۱۶
- ہر ملت کا ایک مزاج ہے ۱۱۶
- دور جاہلیت کے تمدن کی بنیاد نفس پرستی پر اور اسلامی تمدن کی بنیاد حق پرستی پر ہے ۱۱۶
- دور حاضر کا تمدن جہاں اسلامی تمدن سے ٹکرائے تو اسلامی تمدن کو ترجیح دینی چاہئے ۱۱۷
- دور جدید کے حوادث و واقعات سے اسلام صرف نظر نہیں کرتا ۱۱۸
- دور حاضر کے پیش آمدہ واقعات میں مفتی اور صاحب واقعہ ملکر اعتدال کی راہ نکال سکتے ہیں ۱۱۹
- اسلام ابدی بین الاقوامی قانون ہے، وہ بین الاقوامی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا ۱۲۰
- ایسی اشیاء جو اپنی ذات سے ممنوع ہیں، خاص اوقات میں مشروع ہو جاتی ہیں ۱۲۱
- مفتی کے سامنے تفصیلی واقعات لانے سے ہی جدید مسائل میں گنجائشیں نکل سکتی ہیں ۱۲۲
- اظہار تشکر ۱۲۳

اشتراکِ مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائے گی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہو گا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں...... اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو، اونچ نیچ نہ ہو۔ جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا، وہی کامیاب ہو گا۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

- اشتراک ذہن ۱۲۵
- تبدیلیٔ اصول ۱۲۶
- اشتراک مذہب ۱۲۶
- عمومی مساوات ۱۲۷
- حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول ۱۲۷
- مہاتما بُدھ کی پیشن گوئی ۱۲۷
- اجمالی بیان ۱۲۸
- مذہب کی بنیاد ۱۲۸
- احترام انسانیت ۱۲۹
- مذہب واحد ۱۲۹
- دین خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) ۱۳۱

مذہب اور سیاست

قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علم نافع (حکمت نظری) خلق عادل (حکمت اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمت عملی تھے) جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بد نظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا، اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان طاقتوں کے ذریعے سے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے، عباد کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح ورشد، امن وسکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- مخلصانہ شکریہ ۱۳۴
- زمانہ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں ۱۳۴
- مذہب اور سیاست ۱۳۵
- جنگ کا آخری فیصلہ ۱۳۵
- آزادی، جمہوریت اور شہنشاہیت ۱۳۶
- ہندوستان کی صورت حال ۱۳۶
- ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں؟ ۱۳۶
- جہل ۱۳۷
- ظلم ۱۳۷
- غلامی ۱۳۷
- قرآن حکیم کا فیصلہ ۱۳۷
- غلامی کے متعلق قرآن مجید کا حکم ۱۳۹
- عرب اقوام چودہ صدی قبل ۱۴۰
- رحمت الٰہی کا ظہور علم نبوت، مکارم اخلاق، اسوۂ حسنہ ۱۴۰
- مسلمان بحیثیت فاتح عالم ۱۴۱
- زمانہ جاہلیت ۱۴۳
- وفور جہل ۱۴۳
- فقدان اخلاق ۱۴۳
- ثمرات غلامی ۱۴۴
- دیانت وسیاست تباہ ہو جانے کے نتائج بد ۱۴۴
- تعلیم احکام، تہذیب اخلاق، تنظیم اعمال ۱۴۶
- قرآن کا اصلاحی پروگرام ۱۴۶
- شریعت ۱۴۶
- طریقت ۱۴۷
- سیاست ۱۴۷
- اسلام میں دین، سیاست سے الگ نہیں ۱۴۹
- دین سیاسی نظام کی حیثیت میں ۱۵۱
- دین اور سیاست کی علیحدگی ۱۵۱
- اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق ۱۵۳
- اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ ۱۵۳
- حکومت الٰہی ۱۵۴

فہرست مضامین

- الحکومت والجہاد ۱۵۵
- اسلامی جہاد کی غرض وغایت ۱۵۵
- ایک لمحۂ غور وفکر ۱۵۶
- خلافت راشدہ کے بعد ۱۵۶
- ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال ۱۵۶
- حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ ۱۵۷
- حضرت قاسم العلوم والخیرات ۱۵۷
- عصر شیخ الہندؒ ۱۵۷
- تحریض عمل ۱۵۷
- اشاعت دین الٰہی ۱۵۸
- قاسمی علوم اور فلسفہ ۱۵۸
- مرکز علوم دار العلوم دیوبند ۱۵۸
- مستقبل کا تعلیمی پروگرام ۱۵۸
- مسجدی تعلیم ۱۵۹
- درس قرآن ۱۵۹
- تبلیغ ۱۵۹
- تبلیغ ایک اجتماعی مؤثر کی حیثیت میں ۱۵۹
- مسلم سلاطین کا قصور ۱۶۰
- نقطۂ اتحاد ۱۶۰
- طریق تبلیغ ۱۶۰
- تذکیر ۱۶۱
- عسکریت ۱۶۱
- تزکیۂ نفوس اور اصلاح عالم ۱۶۲
- صورت کا اثر سیرت پر ۱۶۲
- خانقاہیں ۱۶۳
- خلاصۂ نقاط بحث اور قرآن حکیم ۱۶۳
- اقامت حکومت الٰہی ۱۶۴
- حکومت الٰہی اور قانون الٰہی ۱۶۴
- حفاظت نظام زندگی ۱۶۵
- دفاع ملی ۱۶۶
- جمعیت علماء ہند کے پچیس ۲۵ سال ۱۶۶
- جمعیت علماء ہند تاریخ کے آئینے میں ۱۶۷
- بزرگان دیوبند ۱۶۷
- سن ۱۹۱۴ء کے مجاہدین ۱۶۷
- حضرت امیر الہند مولانا مدنیؒ ۱۶۸
- حضرت مفتی اعظمؒ ۱۶۸
- تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ ۱۶۸
- کانگریس اور لیگ ۱۶۹
- کانگریس کی تاسیس ۱۶۹
- کانگریس سن ۱۹۱۶ء میں ۱۷۰
- ایک واقعاتی لطیفہ ۱۷۰
- مسئلۂ پاکستان ۱۷۰
- مخالفین پاکستان ۱۷۱
- جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم ۱۷۲
- جمعیت علماء ہند کی قدر وقیمت ۱۷۲

اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام

میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب وسنت سے پیش کیے جائیں۔ میرے خیال میں جو شرعی راہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام عصری سیاست کے ڈھچر پر اور اس سے اخذ کر کے نہ لیا جائے۔ یہ پرفریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے جسنے دنیا کا امن وسکون برباد کر دیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے...... البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے۔ اس کو سمجھ کر پھر صرف شرعی سیاست سے ہمارے پروگراموں کا تعلق ہونا چاہئے۔ جس سے اس پر مکر عصری سیاست کی ظلمت دور ہو سکے اور قلوب پر سے اس کا استیلاء اُٹھ جائے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- میری سب سے بڑی عزت وسعادت ۱۷۶
- تذکیر قدیم ۱۷۷
- اجمالی پیغام ۱۷۸
- برطانیہ کی سرکشی ۱۷۸
- اسبابِ غلامی ۱۷۸
- علم کی تباہی ۱۸۰
- حیثیت عرفی کی بربادی ۱۸۱
- اقتصادی تباہی ۱۸۱
- خارجی تعلقات سے محرومی ۱۸۲
- برطانیہ کا طرزِ عمل ۱۸۲
- مسلمانوں کا نظامِ تعلیم برباد کرنے کی برطانوی سازش ۱۸۲
- برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ ۱۸۴
- ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام کی حمایت سے محروم رکھنے کیلئے برطانیہ ۱۸۶
- آزادی پسند مسلمانوں کو بدنام کرنے کی اسکیم ۱۸۶
- بنیادی مسئلہ ۱۸۷
- جدوجہد آزادی ایک مذہبی فریضہ ۱۸۸
- حصول آزادی کا پروگرام ۱۸۸
- برطانیہ کا جمہوری استبداد ۱۸۹
- پیغمبرانہ قیادت کی ضرورت ۱۹۰
- غاصب قوم سے حکم جہاد ۱۹۰
- عدم تشدد کے ذریعہ احتجاج ۱۹۱
- عدم تشدد کے پانچ ہتھیار ۱۹۲
- یورپ کی غلامی سے نجات کا راستہ ۱۹۲
- اشتراکِ عمل کی ضرورت ۱۹۳
- معیارِ قیادت ۱۹۳
- مذاکرات کی بنیاد ۱۹۴
- حکومت اور قوم سے افہام وتفہیم کی ضرورت ۱۹۴
- شعارِ قیادت ۱۹۵

فہرست مضامین

◆ اقتدار کے فرعون سے طرزِ گفتگو	۱۹۶
◆ بلند بانگ دعوؤں کی ممانعت	۱۹۷
◆ مسلم قیادت کا اولین فرض	۱۹۷
◆ قیادت علماء کے لئے کیوں ناگزیر ہے	۱۹۸
◆ ترجمانِ رسالت حاملِ معرفت ہونا چاہئے	۱۹۹
◆ طرزِ نبوت اپنانے کی ضرورت	۲۰۰
◆ قوت کے گھمنڈ میں جائز مطالبات تسلیم نہ کرنے والوں کا انجام	۲۰۱
◆ جہدِ مسلسل سے ہی نتائج یقینی بنتے ہیں	۲۰۳
◆ مطالبۂ آزادی کے ساتھ تبلیغِ دین کی ضرورت	۲۰۴
◆ فرعونِ وقت کو قیادتِ موسوی ہی شکست دے سکتی ہے	۲۰۶
◆ اسلام میں آزادی کی غرض وغایت	۲۰۷
◆ مطالبۂ آزادی، مذہبی آزادی کے نام پر ہونا چاہئے	۲۰۹
◆ اسلام آزادی کے دو راستے	۲۱۰
◆ مطالبۂ آزادی میں اعجازی حجت کی ضرورت	۲۱۲
◆ انتخابِ امیر اور تشکیل مرکزیت	۲۱۴
◆ صفاتِ قیادت	۲۱۵
◆ صالح قیادت سے روگردانی کی پاداش	۲۱۶
◆ مخلوط معاشرہ میں جمعیت مسلمہ کے دو اصول	۲۱۷
◆ غیر مسلم سے اشتراکِ عمل	۲۱۷
◆ ہمہ گیر مقصد کے حصول کے لئے طریقِ کار	۲۱۸
◆ باہمی ربط وتعاون کی بنیاد، اتحادِ مقصد اور تقسیمِ عمل پر ہونی چاہئے	۲۱۸
◆ جمعیت العلماء کا شرف وامتیاز	۲۱۹
◆ افہام وتفہیم کا راستہ اپنانے کی ضرورت	۲۲۰
◆ حصولِ آزادی کا مختصر پروگرام	۲۲۰
◆ سیاستِ شرعیہ کی عظمت	۲۲۲

اسلام اور آزادی

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی تاکہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضا پر محیط ہو جائے...... اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی وحیرت کا منادہے۔ جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- آزادی کا مفہوم ۲۲۵
- آزادی کا اسلامی نصب العین ۲۲۶
- آزادیٔ ضمیر ۲۲۷
- آزادیٔ عقل وفہم ۲۲۷
- آزادیٔ رائے ۲۲۸
- ظاہری آزادی، باطنی آزادی کے تابع ہے ۲۳۰
- باطنی آزادی ۲۳۰
- ذلیل قسم کی غلامی ۲۳۰
- صرف اسلام ہی آزادی کا علمبردار ہے ۲۳۱
- آزادی کا معیار ۲۳۱
- اسلامی آزادی کے آثار ۲۳۲

سائنس اور اسلام

یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلت نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ و مجاہدہ جن سے اسغناء و عزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام کا موضوع عمل ہیں تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس توانجام کار انسان کو ذلت نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام انجام کار اسے عزت اور فلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے — پہلی صورت یعنی مادیات اور غلو اور سائنس کا بحران روح کی پامالی اور مادہ کے غلبہ کی ہے، جس سے عزیز تو ذلیل اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے، جو قلب موضوع اور دونوں کے لئے موجب ہلاکت ہے ...... اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف روح کی سربلندی اور مادہ کی محکومی ہے جس سے عزیز مسند عزت پر اور ذلیل اپنی حد ذلت و مقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عین عدل اور دونوں کے لئے دارین میں موجب فلاح و بہبود ہے، بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی ماہیتوں کا اجمالی خاکہ۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

- تقاریظ ۲۳۴
- تمہید ۲۴۰
- فن سائنس کا موضوع ۲۴۱
- عناصر کی قوتوں کا باہمی تفاوت اور اسکا اصولی معیار ۲۴۲
- عنصر خاک ۲۴۳
- عنصر آتش ۲۴۵
- عنصر آب ۲۴۶
- عنصر ہوا ۲۴۷
- جامع العناصر اور اس کی طاقت ۲۴۸
- عناصر میں انسانی تصرفات ۲۴۸
- عناصر میں انسانی ایجادات ۲۵۰
- انسانی طاقت و تسخیر کار از اس کی روح میں مضمر ہے ۲۵۲
- روح انسانی کی لطافت اور حسی نورانیت ۲۵۳
- روح انسانی کی معنوی لطافت و طاقت ۲۵۴
- صفات روح سے الٰہیات پر استدلال ۲۵۵
- روح کی طاقتوں کا غلط استعمال ۲۵۷
- قوائے روح کے غلط استعمال کا نتیجہ حرمان و خسران ہے ۲۵۹
- روحانی طاقتوں کے محیر العقول کارنامے ۲۶۱
- مادی تصرف کوئی حقیقی کمال نہیں ۲۶۲
- انسان میں محتاجگی اصل مادہ ہے ۲۶۳
- عناصر اربعہ کے اخلاق اور ان کی محتاجانہ خاصیتیں ۲۶۳
- مٹی اور اس کے جبلی اخلاق ۲۶۳
- آگ اور اس کے جبلی اخلاق ۲۶۴
- ہوا اور اس کے جبلی اخلاق ۲۶۵

فہرست مضامین

- پانی اور اس کے جبلی اخلاق ۲۶۶
- رذائل نفس کے چار اصول، فضائل نفس کے چار اصول ۲۶۶
- اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں ۲۶۷
- مادی اخلاق کا مظہر فعل امساک ہے ۲۶۷
- روحانی اخلاق کا مظہر فعل انفاق ہے ۲۶۷
- صدقہ سے غنا کس طرح حاصل ہو سکتا ہے ۲۶۸
- مادیات سے استغناء ہی تعلق مع اللہ کی بنیاد ہے ۲۶۹
- تعلق مع اللہ کی قوت ہی سے روحانی عجائبات اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے ۲۶۹
- سائنس محض کبھی یہ غنا پیدا نہیں کر سکتی ۲۷۰
- سائنس اور اسلام میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے ۲۷۱
- سائنس اور اسلام کی حقیقتوں کا ہم پر تقاضہ کیا ہے؟ ۲۷۲
- مادیات محضہ کی مضرتیں ۲۷۳
- طلباء یونیورسٹی کو خطاب و موعظت ۲۷۴
- مادیات کی مضرتیں رفع کرنے کا طریقہ ۲۷۴
- استحکام توحید ۲۷۴
- یاد حق اور اس کا ابتدائی آسان طریقہ ۲۷۵
- صحبت صلحاء اور اہل اللہ سے رابطہ ۲۷۶
- خلاصۂ بحث ۲۷۷
- مباحث تقریر کا رابطہ حدیث زیب عنوان سے ۲۷۷
- مباحث حدیث کے لطیف نتائج ۲۷۸
- لطافت روح مذہبی بننے میں مضمر ہے ۲۷۹
- اسلام کی بنیادی حقیقت ۲۸۰
- سائنس کی جڑ، بنیاد کیا ہے؟ ۲۸۰
- ایک غلط فہمی کا ازالہ ۲۸۲
- طلباء یونیورسٹی کے لئے مقام عبرت ۲۸۳
- خاتمۂ کلام اور خلاصۂ نصیحت ۲۸۴

مسلم پرسنل لاء

آج اگر سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو "اسلامی معاشرت" ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے...... سارے مل کر اگر عمل کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے، زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل در آمد ہو اس کے اوپر...... اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دیدی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں۔ مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ حسن مقام	۲۸۵	◆ طریق تحفظ	۲۹۳
◆ مرکز جہاد و شہادت	۲۸۶	◆ ذرائع حفاظت کی سعادت	۲۹۳
◆ اکرام ضیف	۲۸۶	◆ دین اور رسمی قوانین کا فرق	۲۹۴
◆ حضرت داؤد علیہ السلام کا طریق تشکر	۲۸۷	◆ مسلم پرسنل لاء کا منشاء	۲۹۵
◆ طریق تشکر نبوی (علیہ الصلوۃ والسلام)	۲۸۷	◆ مسلم پرسنل لاء کے لئے سربراہان مذاہب کا اتحاد	۲۹۵
◆ اظہار تشکر	۲۸۸	◆ نعمت تالیف قلوب	۲۹۶
◆ پرسنل لاء کا مفہوم	۲۸۸	◆ مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کے فوائد	۲۹۶
◆ دنیائے انسانیت کا قانون	۲۸۸	◆ مبنی برحقیقت قانون	۲۹۸
◆ بنائے تعصب	۲۹۰	◆ پرسنل لاء کی خدمت	۲۹۹
◆ قانون فطرت	۲۹۰	◆ دوام شکر	۲۹۹
◆ ذات انسان پر نفاذ قانون	۲۹۰	◆ وحدۃ خیال و وحدۃ قلوب	۳۰۰
◆ ذات انسان پر نفاذ قانون کی حکمت	۲۹۱	◆ اشتراک مقصد اور اخلاص باہمی	۳۰۱
◆ دور تربیت	۲۹۱	◆ بندہ کی ذمہ داری اور نصرت خداوندی	۳۰۱
◆ نہایت مختصر زندگی کا نہایت جامع قانون	۲۹۱	◆ شاہ حبش کی شکست	۳۰۲
◆ تعلیم فطرت	۲۹۲	◆ پرسنل لاء میں مداخلت کی وجوہ	۳۰۳
◆ اسلامی پرسنل لاء	۲۹۲	◆ فریضۂ مسلم اور ادائیگی شکر	۳۰۳
◆ پرسنل لاء کا تحفظ	۲۹۳		

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

اسلام میں سیاست واجتماعیت کے اصول و قوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں، جنہوں نے دین ودنیا کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی سر انجام دیئے۔ آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نمود اسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب و سنت اور فقہ فی الدین کے انوار شامل تھے۔ البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کے حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے لیکن ان کے عملی کارناموں سے کوئی سبق نہیں لیا۔ اگر قوم اپنے نظریات کو قائم رکھ کر آج کے عملی میدانوں میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت و شوکت دکھلا سکتی تھی جواب سے پہلے دکھلا چکی ہے۔ اور دنیا اس کی تقلید پر مجبور ہوتی نہ کہ قصہ برعکس ہوتا۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہٗ

فہرست مضامین

◆ حرف آغاز ۳۰۵
◆ عالم بشریت میں فکر و تفکر کی اہمیت ۳۰۶
◆ انسان کی فکری قوت کی کار پردازی ۳۰۷
◆ عقل کی کارگذاری کے قابل التفات ہونے کا حقیقی معیار ۳۰۹
◆ قرآن حکیم کی انسان کو فکر و تدبر کی دعوت اور اس کا انداز ۳۰۹
◆ حاصل کلام ۳۱۱
◆ خلاصۂ کلام ۳۱۱
◆ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مرکزی نقطہ منہاج نبوت ۳۱۲
◆ منہاج نبوت کا امت کے مزاج اور ذوق کی تعمیر پر اثر ۳۱۲
◆ تشکیل جدید میں آج کی ضرورت ۳۱۴
◆ فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں اصول اور قوائد کلیہ اور ضوابط کی پابندی کی اہمیت ۳۱۴
◆ اصول وضوابط کے ساتھ جزئیات کے تعین کا مسئلہ ۳۱۴
◆ حاصل مطلب ۳۱۶
◆ فقہاء متقدمین کے استخراج کی افادیت ۳۱۶
◆ اسلام میں آزادیٔ ضمیر اور حریت رائے کے حدود ۳۱۷
◆ اسلام اور اسلامی اصولوں کی عالمگیری پر واقعاتی حقیقت کے شواہد ۳۱۹
◆ دور جدید کی عملی و نظریاتی خصوصیات اور اسلامی قوت و شوکت ۳۱۹
◆ دور جدید میں دینی مزاج کے مطابق فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا واحد طریق عمل ۳۲۰
◆ تشکیل جدید کرنے والے مفکرین کیلئے ایک امر لازم ۳۲۱
◆ سیاسی ملل و نحل کی تدوین کی ضرورت و اہمیت ۳۲۱
◆ اسلامی مزاج اور منہاج نبوت کے اساسی اصول ۳۲۲
◆ منفی پہلو ۳۲۲
◆ مثبت پہلو ۳۲۴
◆ خلاصۂ اصول ۳۲۶
◆ تشکیل جدید میں اہم قدم رجال کار ۳۲۶
◆ حرف آخر ۳۲۷

امارتِ شرعیّہ

امارتِ شرعیہ کا قیام ضروری ہے...... اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کرلیں اپنے معاملات میں ان کی طرف رجوع کریں اور سمع و طاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ روزِ مسرت	۳۲۹	◆ فرائض امیر	۳۴۱
◆ اسلام کی بنیاد	۳۳۰	◆ عجیب لطیفہ	۳۴۱
◆ عقائد	۳۳۰	◆ نظم اجتماعیت	۳۴۳
◆ عبادات	۳۳۱	◆ مبنی بر حجتہ اختلاف مذموم نہیں	۳۴۳
◆ اخلاقیات	۳۳۱	◆ آمین بالشر	۳۴۴
◆ معاملات	۳۳۲	◆ مسائل کی آڑ میں اندرونی بخار نکالنا	۳۴۵
◆ اجتماعیات	۳۳۲	◆ توحیدِ مقصد	۳۴۵
◆ متکلمین اسلام کی خدمات	۳۳۲	◆ توحید مطلب	۳۴۶
◆ آئمہ اجتہاد کی خدمات	۳۳۳	◆ امیر معاملات	۳۴۷
◆ اختلافِ مشرب	۳۳۳	◆ حق امارت	۳۴۷
◆ فقہائے اسلام کا تأدب	۳۳۴	◆ اطاعت ذاتی اور وصفی	۳۴۸
◆ احسانِ عظیم	۳۳۶	◆ اطاعت امیر کا معیار	۳۴۹
◆ عرفاء اسلام کی خدمات	۳۳۶	◆ صلاحیت کی بنیاد پر چیف جسٹس کی تقرری	۳۵۰
◆ امراء اسلام کی خدمات	۳۳۷	◆ انحرافِ اطاعت موجب تفریق ہے	۳۵۱
◆ خلفاء اسلام کی خدمات	۳۳۷	◆ امارت کی بنیادی شرط	۳۵۱
◆ خلفاء کے لئے طریقِ عمل	۳۳۷	◆ اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی	
◆ محافظین شئونِ نبوت کی تعظیم......	۳۳۹	ذمہ داری	۳۵۲
◆ نظم مسائل	۳۳۹	◆ انتخاب امیر کے لئے مجموعی زندگی کو	
◆ تنظیم بلاامام ممکن نہیں	۳۴۰	پیش نظر رکھا جائے	۳۵۲
◆ سمع وطاعت	۳۴۱		

تکمیل انسانیت

بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے عمل کا بار کم ڈالا جاتا ہے...... یہی وجہ ہے کہ اس امت پر عمل کا بار کم کر دیا گیا، پچھلی امتوں میں سلاسل اور اغلال تھے، نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال۔ وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی، ایک عمل کرو گے تو دس نیکیوں کا ثواب اور اس کے بعد سات سو تک...... اور وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ.

غرض اجر بڑھا دیا، تحسین بڑھا دی مگر عمل کا بار گھٹا دیا۔ اس لئے کہ امت بوڑھی ہو چکی تھی...... تو عمل کا بار بہت کم، اجر بہت ہی زیادہ۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ تقریب تکمیل	۳۵۵	◆ تکمیل دین	۳۶۴
◆ ابتداو تکمیل پر خوشی	۳۵۶	◆ انتہاء زیادہ خوشی کی چیز	۳۶۴
◆ تکمیل پسند امت	۳۵۶	◆ تمنائے انتہا	۳۶۵
◆ عالم بشریت کی طفولیت اور اسکا......	۳۵۶	◆ یوم تکمیل کا انتخاب	۳۶۵
◆ ابتدائی عبادت	۳۵۷	◆ ایک درجہ میں تکمیل اور ایک درجہ میں آغاز	۳۶۶
◆ عالم بشریت کا دوسرا دور اور اس کا علم	۳۵۷	◆ علوم و شخصیات کے مراتب	۳۶۶
◆ عالم بشریت کا تیسرا دور اور اس کا علم	۳۵۸	◆ تبریک	۳۶۷
◆ دورِ موسوی اور اس کا علم	۳۵۸	◆ حسن طلب نہیں، بیانِ واقعہ	۳۶۷
◆ احکام کی حقیقت کا دور	۳۵۸	◆ حسن نیت کے ثمرات	۳۶۷
◆ دورِ نبوی، اجتہادِ انسانیت کا دور	۳۵۹	◆ اخلافِ صدق کا وعدہ	۳۶۷
◆ امت محمدیہ میں آثار نبوت	۳۵۹	◆ ضرورتِ انتخاب	۳۶۸
◆ شرائع اصلیہ اور وضعیہ	۳۶۰	◆ معیارِ انتخاب	۳۶۹
◆ عالم بشریت کا شباب	۳۶۰	◆ عوام کے لئے حجت	۳۶۹
◆ عالم بشریت کی طفولیت کیلئے اندازِ تعلیم	۳۶۱	◆ اتحاد علماء کی ضرورت	۳۶۹
◆ عالم بشریت کے شباب کیلئے اندازِ تعلیم	۳۶۲	◆ طلب صادق	۳۷۰
◆ عالم بشریت کا بڑھاپا، قوۃ فکر کا ازدیاد	۳۶۳		
◆ بڑھاپے میں علم کی وسعت	۳۶۴		
◆ بوڑھی امت پر بار عمل کی کمی	۳۶۴		

حقوقِ مالیہ

کیمونزم اور اسلام کا یہی فرق ہے کہ کیمونزم دلواتا ہے، مگر جبری طور پر، اس سے غصہ اور غیض و غضب پیدا ہوتا ہے۔ امیر کہتا ہے کہ اس فقیر کو کسی طرح تباہ کردو، یہ کمائی میری ہے، لوٹ کر یہ لے جاتا ہے۔ غریب کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کو تباہ کردو، جنہوں نے ہمارے حقوق مار رکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تاک میں ہیں۔ یہ غالب آئے گا، اسے ختم کردے گا، وہ غالب آئے گا، اسے ختم کردے گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہٗ

فہرست مضامین

- بدن اور اس کی ضروریات کا خالق ۳۷۱
- روح اور اس کی ضروریات کا خالق ۳۷۲
- روح وبدن کو صحیح کر کے اس کے مالک کو سونپنا ہے ۳۷۳
- روح وبدن کو اپنے خالق کی بندگی کے سوا چارہ نہیں ۳۷۴
- بدنے کا کام ارادہ سے ہمہ قسم عبادت ہے ۳۷۵
- آبرو سے عبادت ۳۷۵
- عبادتِ مالی ۳۷۶
- عبادتِ مالی سے مقصود امیر و غریب میں توازن قائم کرنا ہے ۳۷۸
- امام ابو حنیفہؒ کی غریب پروری ۳۸۰
- امام ابو حنیفہؒ کا تجارت میں تقویٰ ۳۸۱
- اسلام نے مالیات کی بنیاد تقسیم کے اصول پر رکھی ہے، جمع پر نہیں ۳۸۱
- قرنِ اول کے مسلمانوں میں جذبہ سخاوت ۳۸۲
- سخاوت مسلمانوں کا قومی مزاج ہے ۳۸۳
- تقسیم دولت میں اسلام اور کیمونزم...... ۳۸۵
- اسلام نے امیروں کو غریبوں پر شفیق بنایا ۳۸۶
- اسلام نے خرچ کرنے کی حدود بتلائی ہیں ۳۸۷
- مالِ حرام غلط مصرف میں ہی جاتا ہے ۳۸۷
- لقمۂ حلال قربِ خداوندی کی شرطِ اول ہے ۳۸۸
- حلال کمائی ہی میں برکت و نورانیت ہے ۳۸۹
- انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لئے قرآن حکیم کا طرزِ اسلوب ۳۹۰
- ایمان اور سکون قلب دنیا کی کروڑوں سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں ۳۹۱
- مسلم کو دنیا بطورِ حق نہیں، بلکہ خدمات کے صلہ میں ملتی ہے ۳۹۲
- بندے اور خدا میں صرف غلامی کی نسبت ہے ۳۹۳
- اجتماعی طور پر غرباء کی خدمت کی ضرورت ہے ۳۹۶

عروج وزوال

مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے۔ لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے، جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو...... کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت و ثروت یا جاہ و مال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب اوروں کے پاس بھی ہیں بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں...... اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرۃ الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

فہرست مضامین

◆ عروج و زوال کا معیار ۳۹۹
◆ معلم و امام اقوام ۴۰۰
◆ قلبی تمکین ۴۰۰
◆ عظیم تعمیری خدمت ۴۰۱

ملت اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج

ملک اگر آزاد بھی ہو، ہندوستان ہو، پاکستان ہو، کچھ بھی ہو، اور انتظام واثرات غیروں کے غالب ہوں کہ جب تک وہ مدد نہ کریں چل نہیں سکتے اسے اقتدار تھوڑا ہی کہتے ہیں؟

اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر چیز میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ روٹی، رزق اور ٹکڑے میں، عزت اور اقتدار میں تو سوال یہ ہے کہ اس بے رزقی، اور بے عزتی کے بارے میں آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ہم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟

یہ شکایت رہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں کیوں نہیں دیا؟ ہمارے ملک کیوں چھین لئے؟ ہماری عزت کیوں چھین لی؟ کیوں ہم بھیک مانگے پھر رہے ہیں؟

اللہ کی نسبت تو خیال آتا ہے اپنی نسبت خیال نہیں آتا کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

◆ گزارش واقعی	۴۰۳
◆ اضطراب عام	۴۰۳
◆ حدیث حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	۴۰۴
◆ تعدد نداء	۴۰۴
◆ مقام اشتباہ	۴۰۵
◆ اشتیاق مقصد	۴۰۵
◆ انتظار رغبت	۴۰۶
◆ طرز نصیحت	۴۰۷
◆ حکمت تربیت	۴۰۸
◆ تربیت کا امتیاز	۴۱۰
◆ اللہ و بندے کا باہمی معاہدہ	۴۱۱
◆ قانون مکافات	۴۱۱
◆ بندے کا انحراف عہد	۴۱۲
◆ عظمت در اور سر	۴۱۳
◆ ذلت انحراف	۴۱۴
◆ اسلامی قانون کی عملی پابندی کی ضرورت	۴۱۴
◆ حصول عزت اور اقتدار کی تدبیر	۴۱۵
◆ کفر کے دست نگر اسلامی ملک	۴۱۶
◆ آزادی اقتدار	۴۱۶
◆ پارٹی بندی کا انجام	۴۱۶
◆ قومی غفلت	۴۱۷
◆ زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت	۴۱۸
◆ کم ہمتی کی انتہاء	۴۱۹
◆ عزم وہمت کی ضرورت	۴۱۹
◆ بلا اسباب دعاء موثر نہیں	۴۱۹
◆ عزت واقتدار کا قانون عام	۴۲۱
◆ خاصیت ذکر اللہ	۴۲۱
◆ ذکر اللہ اور اسلام	۴۲۲
◆ ادائیگی فرض	۴۲۲
◆ معیار اقتداء	۴۲۳
◆ مسلم کے لئے اسباب اقتدار	۴۲۴
◆ دشمن سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ	۴۲۵
◆ تدبیر عمل	۴۲۵
◆ دنیادار علماء	۴۲۶
◆ جدوجہد کا ثمرہ	۴۲۷
◆ ایمان کے سونے کی ضرورت	۴۲۸
◆ دعاء	۴۲۸
◆ تنبیہ	۴۲۹

فلسفۂ موت

موت جیسے فزع اکبر ہے۔ جیسے عظیم ترین مصیبت ہے ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے، عظیم ترین انعامِ خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس، ہائے افسوس۔ بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مومن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا، اور نئے مربیوں کے پیدا ہونے کا۔ اسلئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے اس کی تمنا بھی کرے......

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

- تمہید ۴۳۱
- عالم کی بقاء روحانیت کی بقاء سے ممکن ہے ۴۳۲
- ہر چیز تسبیح خواں ہے ۴۳۳
- ہر چیز نمازی بھی ہے ۴۳۴
- اسلام کی نماز کی عظمت اور جامعیت ۴۳۵
- عبادت کا صحیح مفہوم ۴۳۶
- صرف نماز اپنی ذات میں عبادت ہے ۴۳۶
- صرف نماز پوری کائنات پر فرض ہے ۴۳۷
- ربطُ الحق بدوں نماز ممکن نہیں ۴۳۷
- نماز سے دیدارِ خداوندی کی استعداد ۴۳۷
- روحِ خداوندی ہر چیز میں موجود ہے ۴۳۷
- مسلم اقوام کی پریشانی کا علاج ۴۳۷
- روحِ اسلامی نکلنے سے مسلمانوں کا انجام ۴۳۷
- عالم کی روح فی الحقیقت ذکر اللہ ہے ۴۳۹
- روح کا حسّی مرکز ۴۳۹
- فلسفۂ موت اور علماء ربانی کی شان ۴۳۹
- اللہ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ ۴۴۰
- موت دنیوی تحفہ بھی ہے ۴۴۱
- موت کی تمنا کرنا علامت ولایت ہے ۴۴۱
- طالب علمانہ شبہ ۴۴۲
- موت چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے ۴۴۳
- موت اصلاح وتربیت کے تعدد و تفنن کا ذریعہ ہے ۴۴۳
- ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علماء وقت نے اسلام پیش کیا ۴۴۴
- کافر کی تمنا ۴۴۴
- غفلت عن الحق کے بُرے آثار ۴۴۵
- میت پر جزع فزع ۴۴۶
- آیت استرجاع میں عقلاً وطبعاً صبر کی تعلیم ہے ۴۴۷
- مؤمن اور کافر کی موت کا موازنہ ۴۴۷
- ضروری نوٹ ۴۴۸

اسلام میں تصورِ آخرت

آخرت کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے تصور باندھ رکھا ہے کہ آخرت تو آسمانوں کے اوپر ہے، اور دنیا یہ ہے۔ یہ غلط ہے بلکہ ہماری آخرت اسی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ اسے نکالنا ہمارا کام ہے۔ یہ کھانے، پینے کے اور سونے جاگنے کے افعال انہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ ان کے ذریعے سے اپنی آخرت نکالو۔ یہ نہیں کہ آخرت کوئی الگ عالم ہے اور دنیا ترک کرو، تب جا کے آخرت میں پہنچو گے......

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

فہرست مضامین

- آخرت کے بارے میں اسلام اور دیگر مذاہب کا فرق............ ۴۵۰
- افعالِ دنیوی کے بارے میں اسلام کا نظریہ............ ۴۵۲
- اعمالِ ایمانی کی خوشبو............ ۴۵۲
- دربارِ خداوندی کی پہلی پیشی............ ۴۵۳
- وسعتِ مغفرتِ خداوندی............ ۴۵۳
- توبہ کا راستہ ترک نہ کیا جائے............ ۴۵۴
- توبہ کی قوت............ ۴۵۵

تعلیم و تبلیغ

آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس دور میں مسلمانوں کے لئے صرف دو پناہ گاہیں ہیں ایک دینی مدرسے اور دوسرے یہ تبلیغی کام...... تعلیمی ادارے باہر سے لوگوں کو لاکر ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور پھر اپنی تعلیم دیتے ہیں...... اور یہ تبلیغی کام والے جمع شدہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہٗ

فہرست مضامین

- مکی زندگی ۴۸۹
- جہاد کبیر ۴۹۰
- انقلاب عظیم ۴۹۰
- ہماری نجات کا ذریعہ ۴۹۱
- قوت ایمان ۴۹۱
- ایک اعتراض اور اس کا جواب ۴۹۲
- عام تبلیغ ہر شخص پر ضروری ہے ۴۹۲
- تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ ۴۹۳
- تبلیغی جماعت اور انقلابِ عظیم ۴۹۳
- تبلیغ میں باہر نکلنے کا فائدہ ۴۹۳
- مقصد تبلیغ ۴۹۴
- بے لوث خدمت ۴۹۴
- دو پناہ گاہیں ۴۹۴
- دعوت شرکت ۴۹۴
- دعوتی کام کا نفع ۴۹۵

جماعتی تبلیغ

یہ مولانا مرحوم کی فراست باطنی تھی کہ جماعتی حیثیت قائم کر کے ایک ماحول بنایا۔ گھروں سے نکل کر اللہ کے گھر میں لوگ جمع ہوں گے۔ کوئی چلہ دے گا، کوئی دو چلے، کوئی دس دن، کوئی بیس دن۔ ایک جگہ جمع ہوں گے۔ اب جب سارے مل کر ذکر اللہ کریں گے تو ایک آدمی کیسے ان میں سے غافل رہے گا؟ وہ خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہو گا۔ تو عمل کا راستہ بھی ڈال دیا۔ فقط تعلیم و تربیت ہی کا نہیں، بلکہ عملی راہ بھی ہموار کر دی۔ تو جماعتی حیثیت اسلئے ڈالی تا کہ لوگ اس کو قبول کریں، انفرادی بات کم قبول کرتے ہیں اور ماحول اس لئے بنایا کہ جماعت کے لوگوں میں خود دین راسخ ہو۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

- ہمیشہ سے دین ایک رہا اور شرائع حسبِ مزاج اقوام نازل ہوتی رہیں ۴۹۷
- امت محمدیہ کو اجر و ثواب زیادہ دیا گیا اور عمل کا بار کم ڈالا گیا ۴۹۹
- امت محمدیہ سے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مراعات ۵۰۰
- وحدت دین اور اختلاف شرائع کا قرآن سے ثبوت ۵۰۱
- فقہ میں اختلاف مشرب ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے ۵۰۲
- تصوف میں اختلاف مسلک ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے ۵۰۳
- ابلاغ و تبلیغ کے طریقے مختلف ہوتے رہے ہیں مگر ماخذ سب کا ایک رہا ۵۰۳
- جمہوریت پسندی کے زمانے میں دعوت تبلیغ کا کام جماعتی طور پر زیادہ مؤثر ہے ۵۰۵
- جماعت میں مادی اور روحانی تربیت ہوتی ہے ۵۰۶
- جماعت تبلیغ کی برکت سے عمل کا ماحول پیدا ہو گیا ۵۰۷
- ماحول کا اثر ۵۰۸
- جماعت میں تربیت باطن بھی ہوتی ہے ۵۰۹
- جماعت تبلیغ کی مقبولیت کے آثار ۵۱۰
- تبلیغ دین میں جماعتی حیثیت کا رد کرنا مشکل ہوتا ہے ۵۱۱
- تعلیم و تبلیغ کا باہمی تقابل نہیں ہے ۵۱۱
- ایک اللہ والے کے اخلاص نے پوری دنیا کو متحرک کر دیا ۵۱۲

تبلیغی جماعت اور اصلاح

اصلاح نفس کے چار جز اور طریقے ہیں اور تبلیغ کے اندر حسن اتفاق سے چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں۔ صحبت صالح بھی ہے۔ ذکر و فکر بھی ہے۔ مواخاۃ فی اللہ بھی ہے (دشمن سے عبرت و موعظت بھی) اور محاسبہ نفس بھی ہے اور انہی چاروں کے مجموعہ کا نام تبلیغی جماعت ہے۔ عام لوگوں کے لئے اصلاح نفس کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اس طریق کار سے دین عام ہوتا جا رہا ہے اور ہر ملک کے اندر یہ صدا پہنچتی جا رہی ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کے عقائد درست ہو رہے ہیں۔ لوگ تیزی سے اعمال کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مد ظلہ

فہرست مضامین

◆ تمہید	۵۱۳	◆ نیک نیتی کا اثر	۵۲۴
◆ ایک غور طلب حقیقت	۵۱۴	◆ تبلیغی بھائی	۵۲۵
◆ انسان کی قدر قیمت اوصاف سے ہے	۵۱۶	◆ جماعت میں دشمنوں سے عبرت کا موقع	۵۲۵
◆ حقیقت آدمیت	۵۱۷	◆ تبلیغ میں محاسبہ	۵۲۶
◆ کمالات انسانی	۵۱۸	◆ تبلیغ اور اصلاح	۵۲۶
◆ صحبت اہل اللہ	۵۱۸	◆ اعتراضات اور ان کا اصولی جواب	۵۲۶
◆ فیض صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	۵۱۹	◆ مقصد تبلیغ	۵۲۷
◆ علم حقیقی	۵۲۰	◆ خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے	۵۲۷
◆ مؤاخات فی اللہ	۵۲۰	◆ بے جا اعتراض	۵۲۸
◆ انتخاب دوست	۵۲۱	◆ اعتراض کی حقیقت	۵۲۹
◆ دشمن کے ذریعے اصلاح	۵۲۳	◆ انعام خداوندی	۵۲۹
◆ محاسبہ نفس	۵۲۳	◆ خلاصہ	۵۲۹
◆ تبلیغی جماعت اصلاحی طریقوں کی جامع ہے	۵۲۳		
◆ جماعت کی برکات	۵۲۴		

راہِ نجات

چار اُصول نجات کے ارشاد فرمائے گئے۔ علم، عمل۔ اخلاص اور اپنی آخرت کا فکر۔ یہ چار بنیادیں ہیں، جس سے آدمی کی آدمیت بنتی ہے۔ انسان کی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ اگر انسان میں علم نہ ہو، تو یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جہالت سے نجات نہیں مل سکتی۔ اگر علم آ گیا، روشنی آگئی مگر عمل نہیں ہے، تو کورا علم کسی کو نجات نہیں دلائے گا۔ بلکہ وبالِ جان بن جائے گا، اگر علم کے ساتھ عمل بھی ہو، مگر عمل کے ساتھ نفاق ہے، اخلاص نہیں ہے، وہ عمل بھی بیکار ہے۔ نجات نہیں دلائے گا۔ اگر علم بھی ہے، عمل بھی ہے، اور اخلاص بھی ہے۔ مگر انسان میں ناز اور شیخی ہے کہ میں سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہوں، آخرت کا خطرہ نہ ہو، وہ اخلاص بیکار ہے، وہ ختم ہو گیا۔ چار چیزیں جمع ہوں گی، تب انسان کی انسانیت بنے گی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

فہرست مضامین

◆ تمہید ۴۵۷
◆ آدمی کی نجات اس کے اندرونی جوہر سے ہے ۴۵۸
◆ اصل کمال وہی ہے جو انسان کی ذات میں ہو ۴۵۸
◆ دل ایک عجیب کیمیا ہے ۴۶۰
◆ قلب کے دو دروازے ۴۶۱
◆ علم، روشنی اور غلبہ کا ذریعہ ہے ۴۶۲
◆ جہالت ذریعہ مغلوبیت ہے ۴۶۲
◆ انسانی عقل وشعور کی قوت ۴۶۵
◆ امتِ محمدیہؐ کے نام حضرت ابراہیمؑ کا پیغام ۴۶۵
◆ دنیا میں ہر انسان معمار ہے ۴۶۷
◆ علم محض کار آمد نہیں ۴۶۹
◆ بڑا عمل بلا اخلاص معتبر نہیں ۴۷۱
◆ چھوٹا عمل خلوص کی وجہ سے ذریعۂ نجات ہے ۴۷۲
◆ غرور اخلاص کو ختم کر دیتا ہے ۴۷۵
◆ مدارِ نجات صرف اللہ کا فضل ہے ۴۷۵
◆ ہر عمل توفیقِ خداوندی سے ہی وجود میں آتا ہے ۴۷۷
◆ جو عبادت ہی صورۃً ہو تو اس پر اترانا کیا؟ ۴۷۸
◆ حق تعالیٰ کے سامنے اعتراف قصور ہی شکر ہے ۴۷۹
◆ روحانی زندگی کے عناصرِ اربعہ ۴۸۱
◆ اصل بنیادی چیز صحبت ومعیت ہے ۴۸۱
◆ صحبت ومعیت کے ثمرات ۴۸۲
◆ گناہ کا جمع ہونا بُرا ہے ۴۸۴
◆ موت کا کوئی وقت مُعین نہیں ۴۸۴
◆ مقامِ عبرت ۴۸۵
◆ اخروی غذا بھی حاصل کرنی چاہئے ۴۸۵
◆ مسلمان کو متفکر پیدا کیا گیا ۴۸۶
◆ فکر آخرت کو چمکانے کی ضرورت ۴۸۷

اسلام عالمی مذہب ہے

"قرآنِ کریم تمام کتابوں کا محافظ ہے ان کے اندر جو تعلیم حق ہے، وہ قرآن نے جاری کر دی اور قوموں نے جو رلا ملا دیا تھا، قرآن نے اس کو نکال کر پھینک دیا ۔۔۔ اس لئے ایک مسلمان جب اسلام لائے گا تو مسلمان ہونے کے بعد سچا عیسائی بنے گا۔ کہ یہ عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح معنی میں ایمان لائے گا۔ اسی طرح جو مسلم بنا وہ صحیح معنی میں موسائی بنا کہ اس نے سند متصل کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو صحیح طور پر سمجھا۔ وہی ابراہیمی بنا وہی آدمی بنا۔ یعنی جناب آدم علیہ السلام کو مانا ۔۔۔ تو سندِ متصل کی دنیا میں ایک ہی کتاب ہے۔ اس نے دنیا کی کتابوں کا تعارف کرایا۔ اس کا ماننا سب کا ماننا ہے۔ اس میں داخل ہونا ساری چیزوں کو اپنے سامنے لے آنا ہے"۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔۔۔ اَمَّا بَعْدُ ۔۔۔

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۔

حکیمانہ تشکر

بزرگانِ محترم!

میرے تعارف کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا۔ یہ اپنی عالی ظرفی اور بلند خیالی کا اظہار کیا گیا ہے۔ میرے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں ان حضرات نے اپنے ظرف کی بلندی ظاہر فرمائی۔ میری بلندی امید نہیں ہوئی۔ اس لئے میرے ذمہ شکریہ ادا کرنا نہیں ہے۔ اس لئے کہ آپ تعریف اپنی کریں کہ ہم اتنے عا

حوصلہ یا وسیع الظرف ہیں اور شکریہ میں ادا کروں؟ آپ اپنی تعریف کریں تو مجھ پر شکریہ کب فرض ہے؟ میری آپ تعریف کریں تو میں شکریہ ادا کرتا ___ اور تعریف کی بھی تو ایسی کہ اس کا واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ کسی نے کہا یہ چاند اور سورج ہیں تو میں کب چاند اور سورج ہوں میں انسانی مخلوق ہوں یہ کونسی میری تعریف ہوئی جو واقعہ کے خلاف ہے۔

کسی نے کہا کہ بہت بڑا آدمی ہوں؟ تو میں کب بڑا ہوں؟ غرض آپ میری تعریف کرتے میں شکریہ ادا کرتا۔ آپ نے میری تعریف نہیں کی۔ اس لئے میرے ذمہ نہیں ہے کہ میں آپ حضرات کا شکریہ ادا کروں؟

دار العلوم کا ایک طالب علم

جہاں تک تعارف کا تعلق ہے تو میں اپنا تعارف خود کرائے دیتا ہوں! میرا تعارف نہ چاند سورج سے ہو گا۔ نہ علم اور فضل سے ہو گا۔ اس لئے کہ علم اور فضل میں یہ حضرات مجھ سے بڑھے ہوئے ہیں۔

آپ کے سامنے مولانا محمد حسن صاحب کھڑے ہوئے تھے آپ ہمارے دار العلوم (دیوبند) کے استاذ ہیں۔ میں بھی ان کی تعظیم کرتا ہوں میں ان کے سامنے ایک طالب علم ہوں۔

مولانا انظر شاہ صاحب ہیں۔ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ مگر علم میں کہیں بڑے ہوئے ہیں میں دل سے ان کی عظمت کرتا ہوں ___ تو میرا تعارف یہ ہے کہ میں دار العلوم دیوبند کا ایک طالب علم ہوں۔ وہاں کے اساتذہ اور بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنا میرا کام ہے اس کے سوا اور کوئی کام نہیں۔ غرض اس سے زیادہ سمجھا بھی نہ جائے۔

اور یہ کوئی تواضع نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرات تو دن رات تعلیم میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا علم تازہ ہے مجھے پڑھے ہوئے ساٹھ برس ہو گئے۔ ان کا علم تازہ ہے اور میرا باسی ہے۔ اور باسی ہو کر بھی چوراسی ہو گیا۔ گویا قریب الختم ہے ___ اس واسطے میرا تعارف اس سے زیادہ نہیں کہ دار العلوم کا ایک طالب علم ہوں۔ اور ان حضرات کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا اپنی عالی ظرفی سے کہا۔ میرا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ادائیگی فرض

باقی شکریہ ادا کر دینا میرا فرض تھا۔ کہ جب آپ نے صدر بنا دیا۔ تو اصل میں تو صدر بنانے والے آپ ہیں۔ جو گھٹیا آدمی کو بنا سکتے ہیں۔ تو وہ خود صدر رہیں (بلکہ صدر ساز ہیں) جن کو بنانے پر قدرت ہے وہ خود صدر ہوں گے۔ بہر حال جب آپ نے صدر بنا دیا اور اس کو کرسی پر بٹھا دیا۔ تو لامحالہ اس کرسی کا وقار اور اس کی لاج رکھنا میرا فرض ہے ___ اس سلسلہ میں چند باتیں مجھے گزارش کرنی ہیں۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے جس کے بارے میں چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔ اس سے پہلے ایک مختصری تمہید عرض کردوں جس کے ذریعے آیت کا مفہوم سمجھنا بھی آسان ہو جائے گا اور آیت کا جو منشاء اور مقصد ہے وہ بھی انشاء اللہ واضح ہو جائے گا۔ ابتدا میں تھوڑی سی تمہیدی باتیں ہیں۔

تمہید

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا بین الاقوامی ہو گئی ہے۔ یعنی ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ بن گئی ہے

پہلے اگر دوسری ولایتوں کا مہینوں میں سفر ہوتا تھا اب وہ دنوں میں ہونے لگا ہے' جو سفر دنوں میں ہوتے تھے اب وہ گھنٹوں میں طے ہونے لگے ہیں جو گھنٹوں میں ہوتے تھے وہ منٹوں میں طے ہونے لگے تو ساری دنیا سمٹ کر ایک قبیلہ کا بن گئی ہے۔

پہلے بچپن میں ہم لوگ اگر دس بارہ میل کا سفر کرتے تھے تو بڑی تیاریاں ہوتی تھیں۔ کہ سفر درپیش ہے۔ آج وہ سفر سفر نہیں رہا شہروں میں دس بارہ میل کا سفر تو روزانہ ہوتا ہے۔ تو وسائل ایسے مہیا ہو گئے کہ جن کی وجہ سے مہینوں کا سفر گھنٹوں میں بدل گیا ہے۔ ہوائی جہاز پہ آپ یورپ جائیں گے تو بارہ گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے پہلے دیوبند سے دہلی تک اڑتالیس گھنٹے لگتے تھے۔ اور اب لندن بارہ گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو ہزاروں میل کا سفر ایسا ہو گیا ہے جیسے چند فرلانگ کا سفر ہوتا ہے سواریاں ایسی ایجاد ہو گئیں کہ انہوں نے ساری دنیا کو لپیٹ کر رکھ دیا۔

نظریاتی یکسانیت

اسی طرح سے علم و فضل سے وسائل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ آج جو آپ یہاں علم رکھتے ہیں' وہی علم لندن والے بھی رکھتے ہیں۔ وہی معلومات امریکہ و جرمنی میں ہیں۔ کوئی خصوصیت کہیں کی باقی نہیں رہی۔ حتی کہ تمدن کی خصوصیات مٹتی چلی جارہی ہیں یورپ و امریکہ اور ہندوستان کا تمدن یکساں سا ہو گیا ہے۔ جو چیزیں آپ لندن میں دیکھیں گے' وہی بمبئی میں اور کلکتہ میں دیکھیں گے' جو امریکہ میں ہیں وہی امریکن اسٹائل یہاں بھی نظر پڑیں گی۔ تو تمدن بھی یکساں' نظریات بھی یکساں گویا پوری دنیا بین الاقوامی بن گئی۔ مسائل ایک ملک کے ہیں اور دنیا کے سارے ملک مل کر طے کر رہے ہیں۔ تو کسی ملک کی سیاست اپنی اندورنی نہیں رہی بلکہ بیرونی سیاست کے تابع ہو گئے ہیں ہر ملک کا یہی معاملہ ہے۔ کشمیر کا معاملہ آپ کے ملک کا ہے اور اقوام متحدہ میں یہ مسئلہ درپیش ہے۔ آپ کے ملک کا مسئلہ ہے اور یورپ و امریکہ والے بیٹھ کر طے کر رہے ہیں۔ تو چھوٹے چھوٹے مسائل اقوام متحدہ میں پیش ہوتے ہیں اور وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ تو کسی ملک کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہی' اس لئے نظریات بھی یکساں ہوتے چلے جارہے ہیں۔ جو نظریہ تمدن کے بارے میں یورپ کا ہے وہی آج آپ کا امریکہ اور روس کا بھی ہے۔ تو مدنیت اور معاشرہ کا ایک ہی ذریعہ ہو گیا ہے۔ کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ وہاں سے نظریات برآمد ہوتے ہیں۔ آپ کے ملک میں آتے ہیں۔ آپ قبول کرتے ہیں۔ تو ساری دنیا سمٹ کر ایک کنبہ بن گئی ہے جس سے ہر ملک کی خصوصیات ختم ہو گئیں۔ نظریات ایک ہو گئے۔ ذہنوں کا رخ ایک بن گیا۔ پلیٹ فارم ایک بن گیا۔ اور دنیا چاہتی ہے کہ سب کے اندر یکسانیت پیدا ہو جائے۔ یہ ایک نظریہ ہے جو اب چل رہا ہے۔

مذہبی یکسانیت

تو میں عرض کرتا ہوں کہ یہ نظریات جب یکسانیت کے ساتھ قائم ہو گئے حتی کہ تمدن و معاشرہ بھی ایک ہو تو قدرتی طور پر یہ مسئلہ سامنے آئے گا کہ پھر مذہب بھی ایک ہی ہو۔ دین بھی سب کا ایک ہی ہو' کوئی وجہ نہیں کہ معاشرت تو یکساں ہو اور مذہب الگ الگ ہو۔ تمدن ایک ہو جائے اور تدین ایک نہ ہو' یہ فطرت اور طبیعت کے خلاف ہے ___ نظریات میں یکسانیت پیدا ہو گئی۔ مذہب کی یکسانیت کا مسئلہ باقی رہ گیا۔ وہ بھی آہستہ آہستہ آتا جارہا ہے۔ اور مذہبیت جاندار ہو رہی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لایبقی علی ظہر الارض بیت مدر ولا وبر الاادخلہ اللہ کلمۃ الاسلام بعزّعزیز وبذلّ ذلیل۔

روئے زمین پر کوئی کچا اور پکا مکان باقی نہیں رہے گا ___ کپڑے کا گھرانہ ہو جیسے خیمہ یا پتھروں کا گھرانہ ہو جیسے پہاڑوں پر مکانات ہوتے ہیں یا اینٹ پتھر کا گھرانہ جسے آپ تعمیر کرتے ہیں ___ کوئی گھرانہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے گا بعزّ عزیز وبذلّ ذلیل کوئی رغبت سے قبول کرے یا مجبور ہو کر ___ مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان کسی کے گلے پر چھری رکھیں گے کہ یا قبول کرو نہیں تو ذبح کردیں گے۔ اس کی تو اسلام نے مخالفت کی ہے۔ صاف فرمایا گیا:

لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ۔

دین کے اندر کوئی جبر نہیں ہے نیکی اور بدی، خیر اور شر خود کھل کر سامنے آگئی ہے جس کا جی چاہے اسلام قبول کرے جس کا جی چاہے نہ کرے، کوئی جبری چیز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یہاں تک فرمایا:

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔

”اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ لوگ مسلمان بنیں“۔

یہ آپ کا حق نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حق ہے۔ جس کے جی میں چاہے ایمان ڈال دیں آپ کا کام صرف تبلیغ اور دین کا پہنچا دینا ہے ماننا نہ ماننا ہر شخص کے اختیار میں ہے۔ جس کو دوسری جگہ قرآن کریم نے فرمایا

فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا۔

”جس کا جی چاہے ایمان قبول کرے جس کا جی چاہے نہ قبول کرے ہم نے عذاب آخرت تیار کر رکھا ہے۔ جس کا جی چاہے بچ جائے۔ جس کا جی چاہے اپنے کو اس کے اندر جھونک دے“۔

تو دین میں کوئی جبر نہیں۔

اس لئے فرمایا بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَبِذُلِّ ذَلِیْلٍ اسلام کا کلمہ ہر شخص تک پہنچ جائیگا خواہ وہ رغبت سے مانے یا مجبور ہو کر ___ تو مجبوری کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ مسلمان تلوار سے مجبور کریں گے۔ مجبوری کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر شخص کو دھکے کھا کر مجبور ہو کر انہی اصول کے اندر پناہ ملے گی، جو اسلام نے لاکر رکھے ہیں۔ لوگ مجبور ہو کر قبول کریں گے۔ اس کے سوا چارۂ کار باقی نہیں رہے گا۔ تو یہ حاصل ہوا کہ گھر گھر اسلام کا کلمہ داخل ہو کر رہے گا۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ آج اس کی تمہید بڑھتی چلی جارہی ہے تمدن ایک بن گیا۔ نظریات ایک بن گئے، معاشرت ایک ہوتی جارہی ہے۔ خود یہ سوال آئے گا کہ پھر مذہب کیوں نہ ایک ہو؟ دین کیوں نہ ایک ہو؟ ساری قومیں مل کر ایک پلیٹ فارم پر کیوں نہ جمع ہوں؟ اتحاد تو جبھی پیدا ہوگا۔ تو یہ نظریہ سامنے آنے والا ہے۔ بلکہ زبانوں پر آنے بھی لگا ہے، اب کھل کر آنے والا ہے چند دن کے بعد ___

عالمی دین

تو مقصد یہ ہے کہ جب دنیا بین الاقوامی ہے تو لامحالہ ایسے دین کی طرف توجہ منعطف ہوگی جو خود بین

الاقوامی ہو ___ اگر دین ایک ملک کا ہو کہ دوسرے ملک کا اس کے ساتھ تعلق نہ ہو وہ بین الاقوامی نہیں ہے' وہ تو ملک والوں کے لئے ہے۔ یا ایک خاندان کا ہو دوسرے خاندان کا نہ ہو تو دوسرا خاندان متوجہ نہیں ہو سکتا ___ لیکن جو سارے ملکوں کا ہو سارے عالم کا ہو اس کی طرف خواہ مخواہ عالم کی توجہ ہوگی ___ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

کان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس کافۃ۔

"پہلے پیغمبر اپنی اپنی اقوام اور خاص خاص قوموں کی طرف ___ ان کو ہدایت کرتے تھے نصیحت کرتے تھے ___ تو اب یہ خاص کون ہیں؟"

تو بعض انبیا علیہم السلام تو ایک خاندان کی طرف آئے جیسے بنی اسرائیل اِس خاندان میں ہزاروں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے لیکن ہر نبی کا کام یہ تھا کہ اسرائیلی خاندان کی اصلاح کرے' انہیں دوسرے خاندان سے تعلق نہیں تھا جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

عیسیٰ علیہ السلام رسول ہیں مگر بنی اسرائیل کے۔

خود حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے آیا ہوں کہ یہ منتشر نہ رہیں دوسری اقوام میں جو بھیڑیں ہیں ان سے مجھے تعلق نہیں ___ تو بعض انبیاء مخصوص خاندان کی طرف آئے۔ اسی خاندان کی اصلاح ان کے ذمے تھی۔

بعض مخصوص ملکوں کی طرف آئے یا مخصوص قوموں کی طرف جیسے حضرت یونس علیہ السلام کہ چار قوموں کی طرف مبعوث ہوئے انہی کے اصلاح کے لئے آئے تھے۔ اور قوموں سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی طرح سے اور انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اقوام' خاندان اور قبیلوں کی طرف بھیجے گئے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔

"ہر قوم کے لئے ہم نے ہادی بھیجا اور ڈرانے والا بھیجا"۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔

"کوئی امّت ہم نے نہیں چھوڑی جس میں ڈرانے والے نہ بھیجے ہوں"۔

اور فرمایا گیا:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔

"ہم کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک کہ رسولوں کو بھیج کر اتمام حجت نہ کر دیں"۔

دین پیش کر دیں اور وہ نہ مانیں' حجت تام ہو تب ہم عذاب دیں گے' ورنہ ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں۔

تو قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی قوم اور ملک باقی نہیں ہے جس کے اندر انبیاء علیہم السلام نہ آئے ہوں۔

اب یہ حجت تام اتنا عام ہے تو کروڑوں کا ملک ہو یہ کیسے ممکن تھا کہ اسکے اندر اللہ کی طرف سے ڈرانے

والے نہ آئے ہوں۔

آغازِ اسلام

اور میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے پیغمبر تو ہندوستان ہی میں مبعوث ہوئے حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان میں ہی آئے تو ہندوستان میں ان کا نزول اور اترنا ثابت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے ہندوستان سے عربستان کا سفر کیا ہے۔ اور ایک سو بیس حج کئے ہیں چالیس حج پیدل کئے ہیں اور بقیہ حج بیل پر سوار ہو کر کئے ہیں۔ تو سب سے پہلا دارالنبوّت اور دارالخلافت اللہ کا ہندوستان ہے جس سے مذہب کا آغاز ہوا۔ مذہب کی تکمیل عربستان میں ہوئی مگر آغاز ہندوستان سے ہوا۔ تکمیل کے لئے تو فرمایا :

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

"حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آج کے دن میں نے دین کو مکمل کردیا۔ اور اپنی نعمتوں کو تم پر پورا کردیا ہے۔ اور میں آج اسلام کے سوا تم سے کسی اور دین پر راضی نہیں ہوں"۔

اسلام لے کر تو آدم علیہ السلام آئے ہیں۔ آغاز ان سے ہوا۔ تکمیل عربستان میں ہوئی۔ بیچ میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے۔ ہر ملک اور قوم کی طرف آتے رہے اور تبلیغ اسلام کرتے رہے مگر اللہ کا دین ایک رہا شریعتوں میں چونکہ تغیّر و تبدّل ہوتا رہا پچھلی شریعتوں میں ایک چیز حلال تھی تو اگلی شریعتوں میں اسے حرام کردیا۔ یا پہلی شریعت میں حرام تھی اگلی شریعت میں اسے حلال کردیا ___ شرائع کے اندر تو تغیّر و تبدّل رہا۔ مگر دین ایک رہا۔

تکمیلِ شریعت

دین کے معنی اصول کے ہیں۔ اللہ کی توحید، نبی کی عظمت، آخرت کا یقین جنت و دوزخ کا ہونا۔ ملائکہ کا وجود، پل صراط کا ہونا۔ عرش و کرسی اور لوح و قلم کا ہونا یہ غیبی چیزیں ہیں جو سب انبیاء کے زمانے میں ایک رہی ہیں۔ البتہ حلال و حرام کے احکام جس کو ہم عملی پروگرام کہیں گے اس عملی پروگرام میں کچھ تغیّر و تبدّل ہوتا رہا، اخیر میں آکر وہ بھی مکمل ہوگیا۔ شریعت بھی اتنی مکمل ہوگئی کہ اب اس میں کمی اور زیادتی کی گنجائش نہیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے بچہ پیدا ہوا تو اس کے لئے کرتہ بنائیں تو بالشت بھر کا ہوگا، اور وہ بھی بلکہ بڑا ہوگا۔ بچہ اس میں چھپ جائے گا۔ لیکن اب جوں جوں بڑھتا جائے گا تو پیمائش بڑھتی جائے گی۔ تو بچہ تو پیدائش سے لے کر ایک ہی ہے۔ مگر لباس اسکے بدلتے رہے، اسی طرح سے دین ایک ہے مگر عملی پروگرام کے لباس بدلتے رہے ہیں۔

وحدتِ دین

انبیاء علیہم السلام آتے رہے تو تغیرو تبدل ہوتے رہے ہیں مگر دین سب کا ایک تھا۔

کان دین الانبیاء لا الہ الا اللہ۔

سارے پیغمبروں کا دین توحید تھا کہ ایک کو ہی مانو۔ ایک ہی کو سب کا کرتا دھرتا سمجھو' ایک ہی کو نفع ونقصان کا مالک سمجھو' ایک ہی کو ہادی سمجھو' ایک ہی کو زندہ کرنے اور موت دینے والا سمجھو' نہ کسی کے بس میں موت ہے نہ حیات' نہ کسی کے بس میں ہدایت وراہنمائی ہے' یہ صرف اللہ کا کام ہے' نجات دینا اس کا کام ہے' تو توحید سارے انبیاء کا دین رہا اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ

"کوئی رسول دنیا میں ہم نے نہیں بھیجا جس نے یوں نہ کہا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور اسی کی عبادت کرو"۔

نہ انبیاء علیہم السلام کی عبادت کرو نہ اولیاء اللہ کی عبادت کرو' نہ علماء ومشائخ کی' عبادت کے لئے سزاوار صرف ایک ہی ذات ہے' اور وہ ذات اللہ کی ہے' اس لئے کہ زندہ کرنے اور مارنے والا صرف اللہ ہے اگر زندہ کرنے میں معاذ اللہ اس کا کوئی شریک ہوتا کہ کچھ ہماری اور آپ کی قوت اور کچھ اللہ تعالیٰ کی قوت' مل ملا کر زندہ کر دیا۔ اسی طرح موت دینے میں اللہ کے کچھ اور بھی شریک ہوتے کہ تنہا اللہ کی قوت کافی نہ تھی' کچھ اور لوگوں کو ملا کر فلاں کو موت دی جائے ___ تو اگر موت وحیات میں شرکت ہوتی تو عبادت میں بھی شرکت ہوتی' تو اللہ کی بھی عبادت کرتے اور جو ان کے شریک ہوتے' ان کی بھی عبادت کرتے۔

مگر زندگی' موت' صحت ومرض' رزق دینے والے وہ تنہا ہیں اور کل معاملات ان کے ہاتھ میں ہیں پھر عبادت بھی تنہا انہی کی ہوگی' یہ کیسے ممکن ہے کہ کام تو وہ کریں اور جھکیں دوسرے کے آگے' دوسروں کے آگے پیشانی رگڑیں' جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت کی باگ ڈور ہے' اسی کی عبادت کی جائے گی تو آیتِ شریفہ میں یہ بتلایا گیا کہ ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا جس نے یہ تعلیم نہ دی ہو کہ دیکھو! اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی عبادت کرو' اسی سے ڈرو۔

اگر اس سے ڈرو گے تو سب سے ڈرنا چھوڑ دو گے۔ اگر اس سے نہیں ڈرو گے تو سب سے ڈرنا پڑے گا' اگر اس کی عبادت کرو گے تو ہر ایک کی عبادت ترک کر دو گے۔ اگر اس کی عبادت نہیں کرو گے تو در در پر جھکنا پڑے گا۔

ترکِ توحید کی پھٹکار

آج کوئی آپ کے آگے جھک رہا ہے' کوئی پتھر کے آگے جھک رہا ہے' کوئی آگ کے آگے کوئی پانی کے آگے' تو میں کہتا ہوں یہ شرک نہیں ہے یہ پھٹکار ہے کہ جب ایک کی عبادت نہیں کی تو ایک ایک چیز کے سامنے ناک رگڑ رگڑ کر یہاں بھی ذلیل بنو وہاں بھی ذلیل بنو' انسان کو اللہ نے معظم اور مکرم بنایا تھا کہ اللہ کے سوا کسی اور کے آگے اس کی پیشانی نہ جھکے' جب اس نے اپنے آپ کو خود عزت والے سے ہٹالیا تو ایک ایک مخلوق کے آگے اسے جھکنا پڑا' ذلیل ہونا پڑا ___ حالانکہ آگ' پانی' مٹی ہوا تو ہمارے خادم ہیں۔ یہ معبود تھوڑا ہی ہیں۔ ان سے تو ہم کام لیتے ہیں' پانی سے نجاستیں اور گندگیاں دھوتے ہیں۔

پھر پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جائے۔ آپ پانی سے آٹھویں منزل پر پائپ کے ذریعے لے گئے' جانے پر یہ مجبور ہے آپ پانی سے مجبور نہیں ہیں' پانی آپ سے مجبور ہے' کہ وہ نیچے کو جانا چاہتا ہے آپ اس کی طبیعت کے خلاف اس کو اوپر لے جانا چاہتے ہیں۔

آگ کی طبیعت یہ ہے کہ وہ اوپر کو جاتی ہے' اس کی لپٹ جب جاتی ہے تو اوپر کی طرف' نیچے کی طرف

نہیں جائے گی، لیکن مشینوں کے ذریعے سے آپ اس کی لپٹ کو نیچے لے جاتے ہیں، وہ مجبور ہے کہ مشین چل رہی ہے لپٹ نیچے جارہی ہے تو آگ نے آپ کو مجبور نہیں کیا، آپ نے آگ کو مجبور کردیا۔

زمین پر آپ کو قابو ہے۔ زمین کو آپ پر قابو نہیں ہے، چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا:

هُوَالَّذِی جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ وَاِلَیْهِ النُّشُوْر۔

زمین کو ہم نے تمہارے سامنے ذلیل بنادیا ذلیل نہیں کہا بلکہ مبالغہ کا صیغہ ذلولا فرمایا۔ اس کو کھودیں، پھاڑیں، چکنا چور کریں، بیچاری چوں نہیں کرتی۔ اسی طرح اس میں پانی بہادیں، نالی کھود دیں چوں نہیں کرے گی، تو زمین آپ کے سامنے مجبور ہے۔ آپ اس کے سامنے مجبور نہیں ہیں۔

یہی صورت ہوا کی بھی ہے کہ ہوا کو آپ نے مجبور کر رکھا ہے، یہ ہوا جو فضا میں بھری ہوئی ہے، آپ کے قبضے میں جب آتی ہے تو جیسا چاہے تصرف کریں، سائیکل کے ٹیوب کے اندر آپنے اسے بند کر رکھا ہے، نکلنا چاہتی ہے مگر جا نہیں سکتی، پانچ آنے کی گیند آتی ہے اس میں الگ بند کر رکھا ہے، گیند کو نیچے ماریں کے وہ اچھل کر اوپر جائے گی وہ ہوا ہی ہے نکلنا چاہتی ہے مگر نہیں نکل سکتی آپنے اس کو قید کر رکھا ہے، غرض ہوا آپ کے سامنے مجبور ہے۔

یہی صورت آگ کی بھی ہے۔ اب یہ آپ کے سامنے بجلی ہے یہ پہاڑوں کو چکنا چور کردیتی ہے۔ اب جب انسان کے ہاتھ میں آگئی تو ایک پلے سے تار میں باندھ رکھا ہے نہ چھوڑیں تو تار میں بند ہے۔ ذرا سوئچ نیچے دبادیں فوراً خادم حاضر ہے۔ تو جو پہاڑوں کو چکنا چور کرتی ہے انسان کے ہاتھ میں آکر قید ہوئی، تو چوں نہیں کرسکتی ہے۔ گرفتار ہے، بجلی کیا ہوئی ایک خادم ہوئی ___ تو خادم کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے آگے جھکے، انسان نے الٹا کام کردیا خود اس کے آگے جھکنا شروع کردیا کبھی آگ کے آگے کبھی پانی کے آگے، کبھی درخت کے آگے۔ یہ سب چیزیں تو تمہاری خادم ہیں، تمہارے استعمال کے لئے پیدا کی گئی ہیں، ان کا کام ہے کہ وہ تمہاری اطاعت کریں، نہ یہ کہ انسان جیسی معظم و مکرم چیز ان کے آگے جھکے اور ان کی اطاعت کرے ___ تو جھکنے کے لئے ایک ہی ذات سزاوار ہے۔ جس کے ہاتھ میں سورج بھی ہے چاند بھی ہے درخت بھی ہیں پہاڑ بھی ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا

لَاتَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔

نہ تم سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو سجدہ کرو، اس ذات کو سجدہ کرو جس نے سورج اور چاند جیسی چیزیں تمہارے سامنے بنا کر رکھ دیں، اور تمہارے لئے بنائیں۔ تو صبح کو سورج نکلتا ہے روشنی پھینکتا ہے تاکہ تم اپنے کام کاج کرو، رات کو چاند نکلتا ہے۔ اگر رات کو بھی سورج رہتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ تو رات کو وہ ستارے چمکائے جس میں ٹھنڈی روشنی ہے، دن میں وہ ستارے چمکائے جس میں گرم روشنی اور چاندنی کافی ہے۔ تو جس نے ان کے نوروں اور روشنیوں میں فرق ڈالا اور وہ اللہ رب العزت ہیں تو وہ عبادت کے لائق ہیں یا یہ چاند سورج عبادت کے لائق ہیں؟ یہ تو اس قدرت کے مظاہر ہیں کہ کسی میں گرم نور اور کسی میں ٹھنڈا نور بھر دیا، پہاڑوں کو عظمت اور رفعت دیدی۔ آسمان کو بلند کردیا مگر سب کی بلندیوں سے جو زیادہ بلند ہے وہ ذات بابرکات ہے، سب عظمتوں پر جس کی عظمت فائق ہے وہ اللہ رب العزت کی ذات ہے ___ تو سارے انبیاء کا دین یہی رہا توحید اور یہ کہ ایک کو کرتا دھرتا سمجھو اور اسی کے آگے جھکو۔

تاثیرِ توحید

اسی میں قلب کی قوت بھی ہے ۔

یک　　در گیر　　محکم　　گیر

ایک در کو مظبوط تھام لو' جو ایک کا ہو جاتا ہے اسکے قلب میں قوت آجاتی ہے کہ میرا آقا موجود ہے' اور چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا ایک کی طرف جھکے گا اسے خطرہ ہوگا کہ دوسرا خفا نہ ہو جائے۔ دوسرے کے آگے جھکے گا اسے خطرہ ہوگا تیسرا خفا نہ ہو جائے۔ تو چند آقاؤں کا غلام کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا' غلام جب خدمت کرے گا ایک آقا کی کرے گا جو متعین ہو کہ اسی کے ہاتھ میں میرا مفاد ہے ___ تو حق تعالیٰ شانہ' کے ہاتھ میں نفع و نقصان' وجود و عدم اور موت و حیات ہے' اس واسطے عبادت کے لائق وہ ہی ہے سارے انبیاء علیہم السلام نے یہی تعلیم دی ہے' تو میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ دین سارے انبیاء علیہم السلام کا ایک رہا۔ شریعتیں کچھ مختلف ہوتی رہی ہیں' جیسے آدمی کے لباس بدلتے رہتے ہیں مگر آدمی وہی رہتا ہے' وہی بچہ جس نے بالشت بھر کا لباس پہنا تھا وہی اب ڈیڑھ گز کا لباس پہنے گا کیونکہ اس کی عمر اب بیس برس کی ہوگئی لیکن جب اس کا نشوونما مکمل ہو گیا۔ اب اس میں بڑھنے کی گنجائش نہیں رہی۔ اب جو لباس پہنے گا اس کی پیمائش متعین ہو گئی وہ نہ کم ہو سکتا نہ زیادہ۔ اس لئے کہ کم زیادہ تو تب ہو جب انسان کے اندر بڑھنے کی گنجائش ہو کیونکہ اس کی نشوونما اور بڑھوتری مکمل ہو چکی ہے۔

اب لباس کی پیمائش متعین ہو گئی ___ غرض دین تمام انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی رہا۔ شریعتیں بدلتی رہیں ___ اس لئے عبادت صرف ایک ہی ذات کی کی جائے گی۔

عبادت و تعظیم کا فرق

البتہ کسی چیز کی تعظیم کا حکم ہو تو اس کی عظمت بجالائی جائے گی ___ ! حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ جو صاحب کشف و کرامات بزرگ اور اولیائے کاملین میں سے تھے' دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے' مولانا پر اکثر جذب کی کیفیت طاری رہتی تھی۔!

ایک دفعہ مولانا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ گنگا کہاں سے نکلی ہے؟ جو ایک قوم کی قوم گنگا کی عظمت کر رہی ہے۔ اسی وقت اٹھکر سفر شروع کر دیا تو دیوبند سے چالیس میل کے فاصلے پر گنگا بہتی ہے' مولانا نے چالیس میل کا سفر کیا۔ اور اس موضع میں پہنچے جہاں سے گنگا کا دہانہ پھوٹا ہے۔ جو ہمالیہ پہاڑ کے دامن میں ہے' گنگوتری اس جگہ کا نام ہے' سات دن وہاں ٹھہرے اس کے بعد آکر فرمایا کہ میں نے گنگا کے دہانے پر روزے رکھے' عبادتیں کیں ذکر اور تلاوت خوب کرتا رہا تو مجھے یہ منکشف ہوا کہ جہاں سے دہانہ پھوٹا ہے وہاں سے مجھے انوار نبوت محسوس ہوئے یا تو کسی نبی کی قبر ہے یا کسی نبی کی نشست گاہ ہے جہاں بیٹھ کر انہوں نے قوم کو ہدایت کی ہے۔ اسی برکات کے آثار اس پانی میں ہیں' اس لئے قوم کی قوم' اس کی عظمت کر رہی ہے۔

فرق اتنا ہے کہ ایک ہے کسی چیز کی عظمت کرنا اور ایک ہے عبادت کرنا۔ عبادت جائز نہیں عظمت سب کی ضروری ہے۔

زمزم شریف جو آپ کے ہاں پانی ہے اس کی آپ عظمت کرتے ہیں اس لئے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام

کے ساتھ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور چھوٹے بچے ہیں، پیاس لگ رہی ہے۔ اور وَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ جہاں بیت اللہ ہے۔ ارد گرد ریگستان ہے، پانی کا نشان نہیں۔ تو بچے نے پیاس کے اندر تڑپنا شروع کیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر پر مارا اور زمزم کا چشمہ جاری ہو گیا۔ تو زمزم کو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے نسبت ہے۔ اس لئے اس کی تعظیم ضروری ہو گئی۔ آپ عظمت سے پیتے ہیں ہر پانی کے لئے بیٹھ کر پینا سنّت ہے، لیکن زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا سنّت ہے یہ تعظیم کی وجہ سے ہے اور فرمایا گیا حدیث میں:

ماء زمزم لما شرب له۔

"زمزم پی کر جو دعا مانگو گے، اللہ اسے قبول کرے گا"۔

تو زمزم پینے سے پہلے کچھ اپنی مراد مانگنی چاہئے، وعدہ خداوندی ہے کہ وہ مراد عطا کی جائے گی۔ عام پانیوں میں یہ بات نہیں ہے، زمزم میں یہ خصوصیت ہے، اس لئے سارے مسلمان ملکر زمزم کی تعظیم کرتے ہیں، زمزمیوں میں بھر کر لاتے ہیں اس کا قطرہ زمین پر گرنے نہیں دیتے کہ معظم و مشرف پانی ہے لیکن اس کے سامنے سجدہ نہیں کرتے، سجدہ کے لئے صرف ایک اللہ کی ذات ہے، عظمت و تعظیم اگرچہ کی جائے گی۔

تعظیمی سجدہ

اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعظیم آپ کے اوپر فرض ہے، ذرا بے عظمتی کوئی کرے گا تو اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نہیں، تمام ہی انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ہے، تو تعظیم اتنی ضروری کہ جب تک نبی کی عظمت نہ کی جائے ایمان نہیں بنتا، مگر عبادت جائز نہیں کہ نبی کو سجدہ کرنے لگیں، اس کو شریعت نے ممنوع قرار دیا۔

حدیث میں ارشاد ہے کہ ایک صحابی حاضر ہوئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا — آپ نے فرمایا! تم نے یہ کیا حرکت کی؟ عرض کیا یا رسول اللہ! یہ قیصرو کسریٰ جو روم اور فارس کے بادشاہ ہیں ان کے درباری جب آتے ہیں تو ان کو سجدہ کرتے ہیں تو اللہ کا رسول اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے، اس لئے میں نے سجدہ کیا۔

"آپ نے فرمایا کہ غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے اگر میں اجازت دیتا سجدہ کرنے کی، تو عورتوں کو اجازت دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں"۔

لیکن ان کے لئے بھی ممنوع اور ناجائز ہے، اس لئے یہ حرکت کبھی نہ کی جائے نبی ہو یا غیر نبی، عبادت کسی کی جائز نہیں — تعظیماً بھی سجدہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ صحابی نے تو تعظیماً ہی سجدہ کیا تھا۔ عبادت تو نہیں کی تھی، اس کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع قرار دیا۔ تو غیر اللہ کے سامنے عبادت کی ہیئت بھی نہیں آنی چاہئے، لیکن تعظیم ضروری ہے۔

معیارِ تعظیم

ہم انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی بھی تعظیم کریں گے، اگر اولیاء اللہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ بھی نکلے جو بظاہر شریعت کے خلاف ہو، تو ہم اس کی تاویل و توجیہ کریں گے یہ نہیں ہے کہ گستاخی یا توہین کرنے لگیں۔ تو اولیاء کی توہین جائز نہیں چہ جائیکہ انبیاء علیہم السلام؟

حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی بعض کتابوں میں تحریر فرمایا کہ ہندوؤں کے جو بڑے اور مقتدیٰ ہیں جیسے شری گلشن جی ہیں یا شری رام چندر جی ہیں ان کا نام لیکر کبھی ان کی شان میں گستاخی نہ کرو، ممکن ہے اپنے وقت میں یہی پیغمبر اور مردان حق ہوں۔ اگر ہمیں سند سے معلوم ہو جاتا کہ یہ واقعی پیغمبر تھے تو ہم ان پر اسی طرح ایمان لاتے جیسے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لاتے ہیں، مگر سند سے ثابت نہیں اور احتمال ہے کہ یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں اس لئے حضرت نے تحریر فرمایا کہ کلمہ گستاخی کا ان کی شان میں نہ کہا جائے، ممکن ہے یہ مردان حق ہوں اور اللہ کی طرف سے شریعتیں لیکر آئے ہوں، مگر جیسے حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کی شریعتوں میں قوم نے تغیر کردیا، شریعت اپنی ذات کی حد تک حق تھی جو آئی، بعد میں لوگوں نے تغیرّ و تبدل کیا اور تحریف کی، کتابوں کے اندر ردّو بدل کیا، اس کا وبال قوموں پر ہے، پیغمبر اس سے بری ہیں وہ اپنے وقت میں حق تھیں، تو بدلنا قوموں کا کام ہے، لیکن جہاں تک کتابوں کا تعلق ہے وہ آسمان سے نازل ہوئیں۔ ان پر ایمان لانا ضروری ہے، جن پیغمبروں کا نام بتلایا گیا ان پر اور جن کا نام نہیں بتلایا گیا، ان پر بھی بالاجمال ایمان لانا ضروری ہے۔

مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔

بعض وہ ہیں جن کے واقعات بیان کردئے نام بھی لیا اور بعض وہ ہیں جن کا نام ہم نے نہیں لیا۔ جن کے نام لے لیا ہے، ان کا نام لیکر ان پر ایمان لاؤ، اور جن کے نام نہیں لئے ان کے بارے میں کہو کہ جتنے اللہ کے پیغمبر آئے ان سب پر ایمان لاتے ہیں۔

تو تعظیم اور چیز ہے عبادت اور چیز ہے، تعظیم حضرات انبیاء اور اولیاء اللہ کی بھی ہوگی اور فرض ہے علماء ربّانی اور مشائخ حقانی کی بھی تعظیم کی جائے گی مگر عبادت کسی کی نہیں کی جائیگی، عبادت صرف ایک اللہ رب العزّت کی کی جائے گی کہ وہ مالک اور مختار ہے۔ اسی کے ہاتھ میں وجود و عدم کی باگ ڈور ہے، تو انبیا علیہم السلام جتنے بھی آتے ہیں ان سب کا دین توحید رہا ہے کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو، کسی دوسرے کی طرف عبادت کے راستہ سے مت جھکو، تعظیم کے راستہ سے جھکو۔

اوصافِ معبودیت

اس لئے آگ ہو یا پانی، ہوا ہو یا مٹی۔ ہم ان کی توقیر کریں گے کہ یہ اللہ کے تبرکات ہیں، مٹی بھی اسی کا ایک عطیہ ہے جس سے ہمارے پھل اور دوسری چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ جس سے ہم خود پیدا ہوئے ہیں تو وہ ماں کی جگہ ہے۔ اسی لئے ایک عام مثل پھیل گئی کہ "مادر وطن" یعنی وہ زمین جس پر آدمی پیدا ہوا اس کو اپنی ماں کہتا ہے اور بعض روایات میں بھی یہ لفظ آتا ہے کہ زمین مثل ماں کے ہے۔ تو مادر وطن کا لفظ چلا، اس لئے کہ جس سے ہمارا خمیر بنا، جس سے ہماری غذا نکلی۔ اس کو ہم ماں کی جگہ سمجھیں گے، تو اس کی توقیر کریں گے کہ اللہ کا ایک عطیہ ہے مگر اس کی عبادت نہیں کریں گے ___ آگ کو ایک عطیہ سمجھیں گے، اس کی عبادت نہیں کریں گے سردیوں میں اس کے بغیر تاپ نہیں سکتے، اس کے بغیر کھانا نہیں پک سکتا۔

اور اگر کوئی عبادت کرے گا تو میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ کیا بے عقلی کی بات ہے۔ اس لئے آگ کے سامنے اگر آپ جھکیں گے تو آگ کی لپٹ آئی تو سب سے پہلے اس کو ہی جھلسے گی جو سجدہ میں پڑا ہوا ہے۔ جس آگ کو یہ بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا ماننے والا پجاری ہے اس کو تو بتادوں دوسروں کو پل بھر ختم کردوں، جس معبود کو اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ یہ میرا عابد ہے اور یہ میرا عابد نہیں وہ عبادت کے لائق ہوگا؟ اسے دوست دشمن

کی بھی پہچان نہیں۔

اسی طرح پانی میں آپ گئے' آپ نے اس کی عبادت کی۔ جب موج آئیگی تو پہلے وہی ڈوبے گا جو عبادت کر رہا ہے۔ اس پانی کو یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ اسے نہ ڈبوؤں یہ تو میری عبادت کر رہا ہے' دوسروں کو جا کے ڈبوؤں ___ تو جس معبود کو یہ بھی تمیز نہ ہو کہ کون میرا عابد ہے اور کون نہیں؟ کون میرا مطیع ہے اور کون نہیں؟ تو وہ عبادت کے لائق ہو گا؟ عبادت کے لائق وہ ہے جو علیم و خبیر ہو :

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ۔

وہ پیدا کرنے والا ہے جو پیدا کرنے سے پہلے بھی جانتا ہے کہ میں کیا چیز پیدا کر رہا ہوں پیدا کرنے کے بعد بھی جانتا ہے کہ میں نے کیا چیز پیدا کی۔ اس کے انجام کو بھی جانتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا تو اول سے لیکر آخر تک جس کے سامنے سارا عمل حاضر ہے وہی عبادت کے لائق ہے' تو سارے انبیاء علیہم السلام نے ایک ہی چیز کی تعلیم دی اور وہ توحید ہے۔

تکمیلِ توحید

اور توحید کے لئے البتہ نبوّت کا ماننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ توحید کے معنی ہیں کہ ایک کو کرتا دھرتا مانو' ایک ہی کی رضا حاصل کرو ایک ہی کی مرضیات پر چلو' اور اس کی نامرضی چیزوں سے بچو' جس سے وہ خوش ہے اسے قبول کرو' یہی دین کا حاصل نکلے گا کہ مرضیات خداوندی کے مطابق عمل کرو اور نامرضیات سے الگ رہو۔ جس کا حکم دیا ہے اس کو مانو جس سے روک دیا ہے اس سے بچو۔ تو مرضی اور نامرضی کو پالینا یہی فی الحقیقت دین کی روح ہے ___ لیکن آپ جانتے ہیں کہ کسی کی مرضی اس کے بتلائے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ دو حقیقی بھائی ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں تو ایک کے دل کی بات دوسرے کے دل میں نہیں آئے گی' جب تک کہ دوسرا زبان سے ظاہر نہ کرے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں اور فلاں چیز سے ناخوش ہوں۔ تو حقیقی دو بھائی جو ایک جنس اور ایک نوع کے ہیں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں' ایک ماں کے پیٹ میں پیر پھیلائے' ایک کے دل کی خبر دوسرے کے دل میں نہیں آتی۔ جب تک بتلانے والا خود نہ بتلائے ___ تو اللہ رب العزّت جو نور مطلق ہیں اور انسان جو ظلمت محض ہے وہ وراء الوراء اور یہ سافل در سافل کوئی نسبت بندے کو خدا سے نہیں۔ اس کی مرضیات کا علم بلا بتلائے آدمی کے اندر کیسے آجائیگا جب تک وہ خود نہ بتلائے کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں' فلاں چیز سے ناخوش ہوں فلاں چیز کو ترک کرو' اور فلاں کو اختیار کرو۔ یہ میرا قانون اور آرڈر ہے۔

اب ایک تو صورت یہ ہے کہ اللہ میاں خود گھر گھر کہتے پھریں کہ میں فلاں چیز سے خوش ہوں فلاں چیز سے ناخوش ہوں ایک ایک کے گھر میں خود آئیں اور اطلاع دیں لیکن یہ اس کی شان اقدس کے لائق نہیں۔ دنیا کے معمولی بادشاہ جنہیں ہم بادشاہ بناتے ہیں خود انکی بادشاہت ذات کی نہیں ہے' ہم نے ووٹ دیا تو بادشاہ بن گئے۔ ووٹ نہ دیں بادشاہ نہیں۔ لیکن بادشاہ بن جانے کے بعد بادشاہ کو بھی اس سے عار آتا ہے کہ وہ رعیت کے گھر گھر جا کر اپنے قانون کو پہنچائے کہ دیکھو میں اس سے خوش ہوں اور اسے ناخوش ہوں وہ اپنے وزیر اعظم کو مقرر کرتا ہے' وزیر اعظم گورنروں کو مقرر کرتا ہے گورنر کمشنروں کو مقرر کرتے ہیں اور تحصیلدار ایک بھنگی کو بلا کے کہتا ہے کہ منادی کر دو کہ بادشاہ کا حکم یہ ہے تو پھر رعیت کے دل میں آتا ہے۔ تو جب دنیا کے بادشاہ جنہیں ہم ہی بناتے ہیں انہیں غیرت آتی ہے کہ گھر گھر جائیں قانون کی منادی کریں تو اللہ رب العزّت تو

بادشاہوں کا بادشاہ ہے اس کی جناب کے لائق کہاں ہے کہ وہ گھر گھر میں آ کے خود فرمائیں۔ وہ اپنے وزراء کو مقرر کرتا ہے اور وہ وزراء انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے قلوب پر اپنی وحی اتارتا ہے۔ وحی کے ذریعے اطلاع دیتا ہے' یہ میرا قانون ہے۔ میں یکتا اور بے مثل ہوں۔ وحی سے حضرات انبیاء علیہم السلام نے جان لیا کہ ہمارا مالک ایک ہے اور یہ اس کی شان ہے۔ فرمایا گیا :

اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ۔

"موسیٰ علیہ السلام کے قلب پر وحی فرمائی کہ میں اللہ ہوں۔ میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو"۔

اپنی شان بیان فرمائی کہ :

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔

"میری مانند کوئی نہیں' کوئی مجھ جیسا نہیں۔ نہ میرا کوئی جسم ہے نہ میرا کوئی ضد ہے نہ کوئی ند اور شریک ہے"۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔

"کہہ دے اے پیغمبر! اللہ یکتا ہے"۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ۔

"اللہ صمد ہے"۔

صمد کے معنی یہ ہیں کہ سارے اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے ___ زندگی نہیں مل سکتی جب تک ادھر رجوع نہ کرے۔ موت نہیں آسکتی جب تک وہی موت نہ دے۔ ہم باقی نہیں رہ سکتے جب تک وہ باقی نہ رکھے' ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے تو ہم اپنی موت وحیات اور حدوث وبقاء میں محتاج ہیں لیکن اللہ کسی کا محتاج نہیں اس کا وجود اپنا ہے وہ کہیں وجود مانگنے نہیں گیا۔ اس کی قدرت اپنی ہے' اس نے دوسروں سے قدرت نہیں مانگی۔ اس کا علم اپنا ہے اس نے دوسروں سے کب کہا تھا کہ مجھے علم دے دو۔

استحقاقِ عبودیت

علم وقدرت اس کی اپنی صفات ہیں اس کے علم کا کچھ سایہ ہم پر پڑ جائے تو ہم بھی عالم کہلانے لگ جائیں۔ اس کی قدرت کی پرچھائیں پڑ جائیں تو ہم اور آپ بھی قادر کہلانے لگ جاتے ہیں کہ ہمیں بھی کچھ قدرت اور بس ہے۔ تو اصل میں قدرت والا ایک ہے۔ جس پر وہ اپنی قدرت کا نور فائز کردے اس میں قدرت آجاتی ہے۔ جس پر اپنا علم ڈالدے وہ عالم کہلانے لگتا ہے۔ جس پر اپنے اخلاق کا رنگ ڈالدے وہ درویش کہلانے لگتا ہے۔ عطا اور جود سب اس کی طرف سے ہے خود کسی کی ذات کے اندر کچھ نہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ انسان کی ذات کوری ہے نہ اس میں علم ہے نہ قدرت ہے نہ کوئی اور کمال ہے کمالات کو قبول کرنے کی صرف استعداد اور صلاحیت ہے۔ مگر پیدائشی طور پر ماں کے پیٹ سے کوئی کمال لیکر نہیں آتا۔ چنانچہ ارشاد ہے :

وَاللّٰهُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔

''ہم نے تمہاری ماؤں کے پیٹ سے تمہیں نکالا۔ اس حالت میں کہ ذرہ برابر تم علم نہیں رکھتے تھے' پیدا شدہ بچہ مضغہ گوشت ہوتا ہے' نہ اسے اچھے کی خبر نہ برے کی خبر' نہ سیاہ کی تمیز نہ سفید کی' کوئی امتیاز اور علم نہیں تو ماں کے پیٹ سے لاعلم پیدا ہوتا ہے''۔

یہ انسان کی ابتدا ہے ___ اور فرماتے ہیں کہ انتہا کیا ہے؟ اس کے بارے میں فرمایا :

ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا

''انجام کار ہم تمہیں ایسی رذیل عمر کی طرف لوٹا دیتے ہیں کہ عالم ہونے کے بعد تم پھر جاہل بن جاتے ہو''۔

نوّے سو برس کی عمر ہو گئی آج آنکھوں نے جواب دے دیا تو جو دیکھ کر علم حاصل ہوتا تھا اس کے راستے بند ہو گئے کانوں نے جواب دیدیا۔ ثقل سماعت پیدا ہوئی تو سن سن کر جو علم حاصل ہوتا تھا وہ راستہ ختم ہوا۔ اب کچھ حافظے میں محفوظ تھا۔ کچھ پہلی معلومات جمع تھیں۔ مگر پچھلی عمر میں حافظہ بھی کمزور ہو جاتا ہے تو پچھلی معلومات بھی ختم ہوئیں۔ تو اگلی معلومات کا راستہ بند ہو گیا پچھلی معلومات نسیان کی نذر ہو گئیں۔ نتیجہ آگے واضح ہو گیا تو جیسے کورے آئے تھے ویسے ہی کورے چلے گئے۔ تو حق تعالیٰ شانہ' نے بتلا دیا کہ تمہاری ذات میں کوئی علم نہیں جب ہم نے چاہا ڈالدیا۔ اور جب چاہا نکالدیا۔ اگر یہ چیز تمہاری ذات میں ہوتیں تو پیدائشی طور پر تم عالم ہوتے اور مرتے دم تک عالم رہتے۔ لیکن ذات میں نہیں ہے تو ہماری دین سے آتی ہیں۔ غرض ہمارا علم وجود' علم اور قدرت سب اس کی دی ہوئی ہیں۔ تو اسی کے سامنے جھکیں گے جس نے دی ہیں۔ دوسروں نے دی نہیں تو دوسروں کے آگے کیسے جھکیں گے؟ تعظیم و توقیر الگ چیز ہے مگر عبادت نہیں کریں گے' ذلت اختیار نہیں کریں گے۔ تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب ہماری دین ہے۔ یہ انسان کی حالت ہے کہ نہ پیدائشی طور پر اس میں علم ہے نہ اخلاقی کمالات ہیں۔ اور جتنے ہوں اخیر میں وہ بھی چھن جاتے ہیں' مثل مشہور ہے کہ بچہ اور بڑا ایک بن جاتا ہے ___ یعنی جیسے بچہ معصوم اور دوسروں کے ہاتھوں میں ہے وہ بھی دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ چل نہیں سکتا جب تک کوئی چلانے والا نہ ہو۔ بیٹھ نہیں سکتا جب تک اس کو حرکت نہ دیں۔ غرض بالکل بچہ کی طرح دوسروں کے ہاتھ پڑجاتا ہے۔ پھر اس پر معصومیت طاری ہو جاتی ہے تو واضح ہوا کہ انسان کی ذات کوری ہے۔ اس میں کچھ نہیں۔ جب انسان کی ذات کوری ہے تو انسان عبادت کے لائق نہیں بن سکتا۔ جو اپنی ذات سے جاہل ہو وہ معبود کیسے بن جائے' معبود کی شان یہ ہے کہ وہ عالم ہو۔

جب انسان معبود نہیں بن سکتا تو اور تو تمام انسان کے نیچے ہی نیچے ہیں تو کیا جانور معبود بنیں گے جو انسان کے نیچے ہیں' کیا آگ پانی معبود بنیں گے جن کو انسان خود عدم سے نکالتا ہے' دیا سلائی کھینچی تو آگ آگئی۔ پاؤں سے روند دی تو آگ ختم ہو گئی تو یہ آگ معبود بنے گی؟

جب انسان معبود نہیں تو ساری چیز انسان کے نیچے نیچے ہیں وہ انسان کی خادم ہیں وہ کیسے معبود بن سکتی ہیں۔ ایک ذات سب کی معبود ہے اور ایک یہی کرتا دھرتا ہے۔ یہی انبیاء علیہم السلام بھی تعلیم دیتے ہیں۔ تو انبیاء علیہم السلام ساری دنیا اور سارے ملکوں میں آئے اور ایک ہی چیز لیکر آئے۔

اختلاف مذہب کے اسباب

اور ابتدا میں سارے انسان ایک ہی دین پر تھے' لیکن جوں جوں لوگوں نے اپنی عقلیں چلائیں تو دین

کے اندر فتنے پیدا ہوتے گئے اگر محض اتباع کرتے کہ جو اللہ کے رسول نے لاکر دے دیا اس پر آنکھ بند کر کے چلتے، کوئی نزاع نہ ہوتا۔ نزاع جب ہوتا ہے جب اوپر سے آئی ہوئی چیزوں میں آدمی عقلیں لڑائیں اور عقلی ڈھکوسلوں سے عقیدے بنانا شروع کرے، یہیں سے آدمی کے اندر خلل پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔

اس طرح کبھی انتہائی محبت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی ذات سے انتہائی محبت اور عقیدت ہے اس کو اتنی بڑائی دی کہ اس کو خدائی کے درجہ میں پہنچا دیا۔

کبھی انتہائی عدوات سے عقیدہ بگڑتا ہے۔ کہ کسی سے عداوت ہوئی کہ فلاں پر نام لے کر لعنت بھیجنی شروع کردو۔ نام لے کر برا کہو۔ اس کا بھی ایک غلو ہے۔ تو کبھی غلو عداوت میں اور کبھی غلو محبت میں عقیدے بگڑتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ:

"اے علی! تمہارے بارے میں بعض لوگ محبت کی وجہ سے تباہ ہوں گے اور بعض عداوت کی وجہ سے"۔

بعض لوگوں نے انتہائی محبت کی کہ حضرت علیؓ کو خدا تک کہا اور کہا کہ یہ خدا کا مظہر ہیں۔ اور اتنی انتہائی عقیدت کی کہ ان کی سامنے جھکے جیسے خدا کے آگے، یہ غلو محبت میں ہلاک ہوئے، اور رفض کا قصہ چلا۔

اور خوارج ان کی عداوت میں ہلاک ہوئے تو ان کو مسلمان تک بھی نہ مانا۔ ان کا تبرا شروع کیا معاذ اللہ ان پر لعنت بھیجنی شروع کی۔ تو بعض محبت میں اور بعض عداوت میں غلو سے تباہ ہوئے۔

یا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ بابرکات کہ نصاریٰ ان کی محبت میں تباہ ہوئے کہ ان کو اللہ کہا، اللہ کا بیٹا کہا خدائے مجسّد کہا کہ ایک نورانی خدا ہے ایک جسمانی ہے، نورانی خدا اوپر ہے جسمانی خدا نیچے ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ان کے لئے علم غیب اور قدرت ثابت کی اور سارے وہ اوصاف جو اللہ کے لئے ہیں ان کے لئے ثابت کئے تو غلو محبت میں عقائد تباہ کئے۔

اور یہود عداوت میں برباد ہوئے حتیٰ کہ ان کے بارے میں کہا کہ یہ وَلَدُ الزِّنَا ہیں۔ بازار والے آدمی یوسف نجار سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم علیہا السلام پر انہوں نے تہمت لگائی۔

بہر حال عقائد میں ان دو چیزوں سے خلل پڑتا ہے اور کبھی عقل لڑانے سے اس لئے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی چیز ہو اس میں عقل کی گنجائش نہیں۔

مثلاً قرآن کریم یا حدیث میں فرمایا گیا کہ عذابِ قبر برحق ہے اور وہ اپنی جگہ ہوتا ہے۔ اب لوگوں نے عقل لڑائی کہ ہم نے قبر کھود کے دیکھی ہمیں تو اسمیں عذاب نظر آیا نہیں۔ وہاں تو ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہاں نہ کوئی آگ تھی نہ سانپ نہ بچھو۔ تو ہم اس عقیدے کو کیوں مانیں۔ عقل لڑائی تو عقیدہ بگڑ گیا ____!

حدودِ عقل

حالانکہ یہ عقل سے بالاتر چیز ہے، وہ دوسرے عالم کی چیز ہے، لاش پڑی ہوئی ہو اور سب کچھ گزر رہا ہو ممکن ہے کہ آپ کو نظر نہ آئے۔

آپ ایک سوتے ہوئے آدمی کو دیکھیں کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں۔ تختِ سلطنت پر بیٹھا ہوا ہوں اور میرے سامنے ہزاروں غلام خدّام کھڑے ہیں۔ اور فوجیں سلامیاں دے رہی ہیں۔ مگر آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ پڑا ہوا سو رہا ہے، نہ وہاں حشم و خدم ہیں نہ سپاہی اور اس پر سب کچھ گزر رہی ہے، مگر

آپ کو نظر نہیں آرہا ___ اس لئے کہ وہ ایک دوسرے عالم، عالمِ مثال سے گزر رہا ہے۔ روح نیند کے وقت نکل کر اس عالم میں پہنچی تو وہاں وہ سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ آپ کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

جب وہ خود سویا ہوا، اٹھکر بیان کرے کہ میں نے یہ خواب دیکھا آپ اس کی تصدیق کریں گے، تو خواب میں اس نے لذّت وراحت بھی اٹھائی اور عزّت بھی پائی آپ کو کچھ نہیں آیا مگر آپ نے یقین کیا۔ تو جیسے ایک سونے والے پر سب کچھ گزر رہی ہے مگر آپ کو کچھ نظر نہیں آتا تو حدیث میں ہے کہ :

النوم اخت الموت

"نیند موت کی بہن ہے"۔

تو جو چیز نیند میں گزرتی ہے وہ موت کے بعد بھی گزر سکتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ قبر میں عذاب ہو رہا ہے آپ کو ایک لاش نظر آرہی ہے مگر اس پر سب کچھ گزر رہی ہے

یا ایک چارپائی پر دو آدمی سو رہے ہوں ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ میں بادشاہ بن گیا ہوں ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ سپاہی مجھے ڈنڈے مار کر جیل خانے میں لے جا رہا ہے۔ ایک خواب میں ہنس رہا ہے اور ایک رو رہا ہے مگر ایک دوسرے کی خبر نہیں جو اس پر گذر رہی ہے اس کی دوسرے کو اطلاع نہیں جو دوسرے پر گزر رہی ہے اس کو دوسرے کی خبر نہیں حالانکہ ملے ہوئے ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں ___ اسی طرح اگر ایک قبر میں دو مردوں کو دفن کر دیں ایک اللہ کا مطیع ہے ایک مجرم ہے۔ ایک خواب دیکھ رہا ہے کہ قبر میں بہترین نعمتیں میرے سامنے ہیں۔ اور ایک دیکھ رہا ہے کہ بدترین عذاب میرے اوپر ہے اس کی اسے خبر نہیں، اس کی اسے خبر نہیں اور آپ دیکھیں گے کہ دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں نہ نعمت ہے نہ عذاب ہے۔

جب دنیا میں اللہ نے ایک نظیر رکھدی ہے، اس میں جب نعمتیں اور مصیبتیں گزرتی ہیں تو مرنے کے بعد اگر قبر میں راحت اور مصیبت گزرے، عذاب اور ثواب ہو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے دنیا میں اس کی نظیر موجود ہے ___ لیکن اگر عقل لڑائیں گے تو عقیدہ بگڑ جائے گا۔ اس لئے کہ عقل کا وہاں کام نہیں۔

عقل ہوا مٹی، آگ پانی کے اس دارِ فانی میں کام کرنے کے لئے ہے یہاں کی چیزوں میں عقل چلے گی۔ یہاں کی عقل سے وہاں کی چیزوں میں کام لینے لگیں تو وہاں یہ نہیں چلے گی۔

امورِ غیبیہ اور عقل

یہ بالکل ایسا ہے جیسے ترازو جو پیتل کی چھوٹی سی ہوتی ہے اس پر سونا اور چاندی تلتا ہے۔ ایک ذرا بڑی ہوتی ہے اس میں حلوئی تلتا ہے ایک اس سے بڑی ہے اس میں ایندھن اور سوختہ تلتا ہے اور ایک اتنی بڑی ہے کہ اس میں ہزاروں ٹن کا ریل کا ڈبہ تلتا ہے کہ اس میں اتنے ٹن وزن ہے۔ دس ہزار ٹن کا ایک جہاز ہے اس میں ایک مشین لگی ہوئی ہے تو کانٹا بتلا دیتا ہے کہ اتنے ہزار ٹن کا جہاز ہے۔ اب اگر آپ جہاز کو کانٹے پہ تولنے لگیں تو کیا تل جائے گا؟ ایندھن تولنے کی ترواز پر آپ ریل کے ڈبے کو رکھ دیں تو کیا وہ تل جائے گا؟ حالانکہ یہ بھی ترازو ہے وہ بھی ترازو ہے، مگر یہ ترازو سونا تولنے کی ہے یہ گیہوں تولنے کی اور یہ ترازو لکڑیاں تولنے کی ہے، اور یہ ترازو ریل کا ڈبہ تولنے کی ہے ہر ترازو میں وہی چیز تلے گی جس کے لئے وہ بنائی گئی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ چھوٹی ترازو میں بڑی چیز تلنے لگے ___ تو عقل بھی ایک ترازو ہے مگر اس میں محسوسات تولے جاتے ہیں، وجدان اور وحی بھی ایک ترازو ہے جس میں غیبی امور تولے جاتے ہیں، باطن بھی ایک ترازو ہے جس کے

ندر قبر کا عذاب اور ثواب تولا جاتا ہے۔ اب اگر آپ آنکھ سے قبر کا عذاب اور ثواب تولنے لگیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے سونا تولنے کی کانٹے میں ریل کے ڈبے کو تولنے لگیں۔ وہ نہیں تلے گا بلکہ وہ ترازو ہی ختم ہو جائے گا۔ تو اگر عقل پر غیبی امور کا بوجھ ڈالدیا جائے تو وہ سسک کر مر جائیگی فیصلہ ان کا کیا کرے گی؟ تو آپ دنیا کی ترازو سے آخرت کی چیزیں تولنے لگیں تو وہاں عقل کیا کام کرے گی؟ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے سونے تولنے کی ترازو میں آپ لکڑی تولنے لگیں وہ نہیں تلیں گی ___ بہرحال کبھی عقائد میں عقل لڑانے سے بگاڑ آتا ہے کہ عقائد کی چیزیں ہیں عقل وہاں کام نہیں کرتی گویا آپ نے عقل کے کانٹے میں عقیدے کو تولنا شروع کر دیا۔

حدودِ ادراک

دنیا کے اندر آنکھ کا کام نظر ہے، کہ صورتیں دیکھے اور رنگ دیکھے' آپ یوں کہیں کہ میں آنکھ سے خوشبو سونگھوں' نہیں سونگھ سکتے۔ اس کے لئے ناک ہی کام دے گی۔

ناک خوشبو سونگھتی ہے آپ ناک کے ذریعے کسی چیز کو دیکھنا چاہیں کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ کان آوازیں سنتے ہیں۔ آپ یوں چاہیں کہ میں کان سے رنگ دیکھ لوں کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ حالانکہ ایک چہرے میں یہ ساری چیزیں جمع ہیں' آنکھ' ناک' کان' گلہ ان میں انچ انچ بھر کا فاصلہ ہے مگر ایسی سدِّ سکندری حائل ہے کہ آنکھ کے دائرے میں کان اور کان کے دائرے میں ناک کام نہیں کر سکتی' اپنے اپنے دائروں میں کام کرتے ہیں۔ تو عقل کا بھی ایک دائرہ ہے اور باطن کا بھی ایک دائرہ ہے اب اگر میں گنگا کے کنارے پر بیٹھ کر معلوم کرنا چاہوں تو مجھے کیا معلوم ہو گا کہ گنگا کے اندر کیا برکت ہے۔ کون سے نبی آئے تھے کن کے آثار ہیں۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کو پتہ چل گیا۔ اس لئے کہ باطن کی آنکھ تھی ان پر منکشف ہو گیا کہ واقعی اس پانی میں کچھ برکات کے آثار ہیں' اور پیغمبروں کی طرف نسبت ہے۔ اس لئے قوم کی قوم اس کی عظمت پر لگی ہوئی ہے۔

تو ہر چیز سے اس کے دائرے کی چیزیں تولی جاتی ہیں۔ عقل سے عقلی امور، آنکھ سے رنگ و صورت' ناک سے خوشبو بدبو اور کان سے آوازیں۔ پھر ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے۔ تو اسی طرح سے ایک دائرہ وحی خداوندی کا ہے وحی بتلا سکتی ہے کہ قبر کیسی ہے' جنت و دوزخ کیسی ہے، پل صراط کیسا ہے۔ میزان عمل "جس میں اعمال تولے جائیں گے" وہ کیسی چیز ہے۔ آپ عقل سے جاننے لگیں گے نہ سمجھ سکیں گے یہ عقل سے بالاتر چیز ہے۔ جو وحی سے سمجھ میں آئے گی۔ بہرحال ہر چیز کا ایک دائرہ ہے۔

منبع عقائد

تو عقیدہ کبھی عقل سے بگڑتا ہے کہ بے غیر عقلی چیز اس میں عقل لڑانے شروع کی تو یا سچے عقیدہ کا انکار کریں گے یا غلط عقیدہ گڑھ لیں گے۔ دین برباد ہو جائے گا ___ اور کبھی عقیدہ غلو محبت سے بگڑتا ہے کہ اپنے اعتقاد والے بزرگوں سے اتنی محبت بڑھ جائے کہ آدمی فانی بن جائے جو وہ کہیں اسی کو آدمی شریعت سمجھ لے' جو وہ کہیں اسی کا عقیدہ بنا لے' کیونکہ عقیدے شریعت کے ہیں ان میں اس سے بگاڑ پیدا ہو گا اور کہا جائے گا کہ عقیدے پیغمبر سے لئے جائیں گے اولیاء سے عقیدے نہیں لئے جائیں گے' علماء عقیدے بنانے والے نہیں ہیں' مشائخ عقیدہ قائم کرنے والے نہیں ہیں۔ مشائخ خود پابند ہیں ان عقیدوں کے جو اللہ کے رسول نے بتلائے ہیں' علماء خود ان عقائد کے پابند ہیں جو اللہ کے رسول نے ارشاد فرمائے عقیدہ خدا کی خبر سے بنتا ہے' علماء

کے کہنے سے عقیدہ نہیں بنتا، لیکن محبت میں ان کے ہر قول وفعل کو آدمی عقیدہ بنالے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ شریعت اور دین کے اندر خلل پیدا ہوگا۔

اور کبھی غلو عداوت سے عقیدہ بگڑتا ہے کہ کسی جماعت یا کسی شخص سے عداوت پیدا ہو جائے، ضد یا عناد پیدا ہو جائے۔ اچھی سے اچھی بات بھی کہیں گے، تو یہ غلط کہے گا۔ اس لئے کہ بدگمانی پہلے قائم کرلی۔ وہ صحیح عقیدہ بھی بیان کریں گے تو غلط کہے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ غلط عقیدے پر قائم ہو جائے گا، اور صحیح عقیدے سے محروم رہے گا تو عقائد کو بگاڑنے والی کبھی عقل ہوتی ہے کہ غیبی امور میں دخل دے۔

ضرورتِ اعتدال

کبھی محبت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا محبت پیدا کرلے اور کبھی عداوت کا غلو ہوتا ہے کہ بے جا عداوت پیدا کرے، اس لئے شریعت نے اعتدال بتلائی۔ عربی کا ایک شعر ہے جس کا ترجمہ ہے:

> ''اگر کسی سے محبت کرو تو اعتدال سے کرو، افراط کے ساتھ مت کرو، ممکن ہے کہ کل کو دشمنی پیدا ہو جائے کہ آج محبت میں آ کے سارے راز کھول دیئے، اور کل کو ہوگئی دشمنی تو خود اسکے ہاتھ میں آگئے، جدھر چاہے تمہیں لے جاکے پٹخ دے۔ اب پچھتاؤ گے کہ محبت میں سارے راز میں نے کھول دیئے''۔

اور فرمایا کہ کسی سے عداوت کرو تو اعتدال سے کرو ممکن ہے کہ کل کلاں دوست بن جائے، تو عداوت میں آکر جو برا بھلا کہا ہے کل کو تمہاری آنکھ نیچی ہوگی کہ ہم نے بہت برا بھلا کہا تو کیوں افراط و تفریط سے چلتے ہو، محبت کرو تو اعتدال سے، عداوت کرو تو اعتدال سے، نفس کے جذبے سے نہ محبت ہو نہ عداوت ہو۔ اس لئے کہ اسلام کی یہی تعلیم ہے۔

کمالِ ایمان

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا:

من احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان

جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے، نفس اور اپنی ذات کے جذبے سے نہیں کی رضاء خداوندی کے لئے، عداوت باندھی تو اللہ کے لئے باندھی کہ یہ اللہ کا دشمن ہے، مجھے بھی اس سے عداوت ہے۔ یہ اللہ کا دوست ہے میں بھی اس سے محبت کروں کسی کو دیا تو اللہ کی رضا کے لئے دیا اور کسی سے ہاتھ روکا تو اللہ کے لئے روکا۔ عطاء ومنع اور محبت وعداوت سب لوجہ اللہ ہوں تو اس شخص نے ایمان کامل کرلیا تو کمالِ ایمان یہ ہے کہ محبت اور عداوت لوجہ اللہ ہوں، ذاتی جذبہ اور غیض کا دخل نہ ہو، دینا اور لینا لوجہ اللہ ہو، محض ذاتی جذبہ نہ ہو کہ فلاں سے محبت ہوگئی تو سب دے ڈالو اور فلاں سے عداوت ہوئی تو روک لو نہیں بلکہ دیکھو کہ اللہ کے نزدیک اسے دینا پسندیدہ ہے یا نہیں۔ پسندیدہ ہو تو دو اگرچہ نفس نہ چاہے، اور اگر اللہ کے نزدیک اگر دینا پسندیدہ نہیں تو ہرگز نہ دو اگرچہ نفس دینا چاہے، تو اپنے کو ایک طرف ڈالو، اللہ کی رضا کو مقدم رکھو، تو حاصل ایمان کا یہ ہے کہ۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اگر آپ زندہ کریں تو آپ کی عطا ہے زندہ ہونے کو تیار ہیں اور اگر آپ موت دیں تو میں آپ پر فدائی ہو جاؤں گا۔ دل آپ سے اٹک چکا ہے جو آپ کریں جس سے آپ راضی اس سے میں راضی ہوں تو بندے کا کام یہ ہے کہ رضاء خداوندی میں فنا ہو جائے کہ میری رضا کچھ نہیں جو رضاء ہے وہ اللہ کی ہے۔ میرا لینا دینا اور محبت و عداوت سب اللہ کی رضا کے تابع ہے۔

ممنونیّتِ احسان

اور خود میرے حق میں بھی نفس کے تابع نہیں ہے۔

کسی غلام سے کسی نے کہا تھا کہ تو کیا کھائے گا؟

اس نے کہا جو آقا کھلا دے ___ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنا دے کام کیا کرے گا؟ کہ جو آقا کام لے ___ اس نے کہا کہ آخر تیری بھی کوئی مرضی ہے۔ اس نے کہا کہ اگر میری اپنی مرضی ہوتی میں غلام ہی کیوں بنتا' میرے غلام بننے کے معنی یہ ہیں کہ اب میری مرضی بھی غلام' میرا ارادہ اور خواہش بھی غلام جو کچھ ہو گا آقا کی مرضی کے مطابق ہو گا ___ وہ کھلا دیں گے تو کھالیں گے' نہیں کھلائے گا تو نہیں کھائیں گے وہ کام لے تو کام دیں گے۔ معطل چھوڑ دے تو معطل ہو جائیں گے' تو ہم اپنے آقا کے تابع ہیں۔

جب ایک انسان' ایک انسان کے ذرا سے احسان کی وجہ سے اتنا تابع ہوتا ہے تو رب العزّت تو سارے محسنوں سے برتر محسن ہیں جب اس کا بندہ بنیں تو بندگی کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز اس کے تابع کر دی نہ میری اپنی مرضی نہ اپنی رضا نہ میرا ارادہ' جو کچھ ہو وہ آپ کا ہی ہے' یہ شان جب پیدا ہو گئی تو کہا جائے گا کہ آج انسان میں بندگی آ گئی۔ آج اس کے اندر عبدیّت آئی۔

شانِ عبدیّت

اگر اپنا ارادہ اور اپنے عزائم ہیں تو پھر وہ بندہ کیا ہے؟

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ نے اپنے ایک مرید کو خلافت دی اور فرمایا کہ فلاں جگہ جاؤ اور جا کر دین پھیلاؤ۔ رخصت ہوتے وقت اس مرید خلیفہ نے عرض کی کہ حضرت مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔

فرمایا دو نصیحتیں کرتا ہوں :

ایک خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اور ایک نبی ہونے کا دعویٰ نہ کرنا۔

وہ حیران ہوا کہ حضرت کیا مجھ سے آپ کو یہ توقع تھی کہ میں خدائی کا دعویٰ کر دوں' آپ کا مرید اور آپ کا نائب اور خدائی کا دعویٰ کرے۔

اور کیا آپ کو یہ توقع تھی کہ میں نبی ہونے کا دعویٰ کروں گا۔ یہ ادنیٰ مسلمان بھی نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ آپ کا مرید اور نائب خدائی اور نبوّت کا دعویٰ کرے۔

فرمایا پہلے اس کے معنی سمجھ لو' خدا کے معنی ہیں کہ جو کچھ وہ فرمائیں وہ ہو کر رہے وہ اٹل ہے' اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی بندہ یہ کہے کہ جو میں چاہوں وہی ہو گا۔ وہ در پردہ خدائی کا مدعی ہے' چاہے زبان کے واسطے سے نہ کہے۔

اور نبی کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو فرمادیں' وہی صدق اور حق ہے ممکن نہیں کہ نبی کا کہا ہوا غلط ہو' جو آدمی یوں کہے کہ یہی صحیح ہے' اس کے علاوہ سب غلط فی الحقیقت نبوّت کا مدعی ہے' چاہے زبان سے نہ کہے' اس لئے میں نے کہا کہ نہ خدائی کا دعویٰ کرنا نہ نبوّت کا دعویٰ کرنا۔

انسان جب یہ دعویٰ کرے کہ جو میں کہہ رہا ہوں' اٹل ہے وہی ہوگا کہ یہ درپردہ خدائی کا دعویٰ ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ اٹل ہے یہ درپردہ نبوّت کا مدعی ہے۔ اسے یوں کہنا چاہیے کہ جو اللہ نے کہا ہے وہی حق ہے۔ میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں جو اللہ کے رسول نے کہا وہی حق ہے۔ میرا کہا ہوا کوئی چیز نہیں جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا میرا چاہا ہوا پورا نہیں ہو سکتا :

وَمَا تَشَاءُوْنَ إِلَّآ أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ

اگر یوں کہے تو ہے بندہ۔ اور اگر یوں کہے کہ میں جو چاہوں وہی ہوگا تو درپردہ خدائی کا مدعی ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے۔ باقی سب غلط ہے۔ یہ درپردہ نبوّت کا دعویٰ ہے۔ یہ تفویض اور عبدیت کے خلاف ہے۔ بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کہا جائے یا کیا جائے وہ اس کی رضاء کے لئے ہو' حتیٰ کہ ہر نقل و حرکت اس کی رضا کے لئے ہو۔

جیسے مولانا رومی نے فرمایا ہے :

> "اے اللہ اگر آپ ہمیں علم دیں اور ہم علم کے میدان میں آئیں تو آپ کے محل اور ایوان و قصر میں داخل ہو گئے۔ اور اگر آپ جہالت میں رکھیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہیں' آپ کے بندے علم میں لے آئیں تو آپ کے محل میں داخل ہو گئے اور اگر جیل میں لے آئیں تو آپ کے جیل خانے میں داخل ہو گئے"۔

اگر آپ سُلا دیں تو ہم بے بس ہیں اور اگر آپ بیدار رکھیں تو آپ کے ہاتھ میں ہیں نہ خواب ہماری نہ بیداری ہماری۔ جو کچھ دیا ہوا ہے وہ آپ کا ہے' تو بندگی کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ ادھر کا منشاء ہو اس کی آدمی تابعداری کرے ـــ جب آدمی اپنی بات چلائے' عقل چلائے' غلو محبت یا غلو عداوت چلائے تو درپردہ الوہیت و نبوّت کا مدعی ہے ـــ اس کا کام یہ ہے کہ اللہ کے آستان کے آگے جھکے توحید کے معنی ہی یہ ہیں کہ دل سے بھی ایک ہی کو یکتا اور کرتا دھرتا سمجھے اور عمل سے بھی ایک ہی کی طرف جھکے۔

اقسامِ توحید

اسی لئے شریعت اسلام نے توحید دو قسم کی بتلائی ہے ایک توحید اعتقادی اعتقاد بھی یہ کہ ایک ہی اللہ ہے جو معبود ہے' وہی علیم و خبیر ہے اور رحمن و رحیم' وہی آقا وہی مالک ہے' یہ عقیدہ ہے' عملاً یوں جھکایا کہ زندگی کا کوئی موڑ نہیں ہے جس میں اللہ کی طرف نہ جھکایا ہو۔ اگر آپ سونے کے لئے لیٹیں' حدیث میں حکم ہے کہ دعا پڑھو :

باسمک اللھم اموت واحی۔

اے اللہ! تیرے ہی نام پر مر رہا ہوں اور تیرے ہی نام پر صبح کو زندہ ہوں گا۔ یہ بھی ایک مجازی موت ہے اللہ کے نام پر خاتمہ ہونا چاہیے' جب آپ جاگے تو پھر شریعت متوجہ ہوئی کہ آپ پھر اللہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اور کہو :

الحمد لله الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور۔

”حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے موت کے بعد پھر مجھے زندگی بخشی‘ اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کے جانا ہے“۔

آفتاب طلوع ہو تو فرمایا‘ اللہ کی طرف توجہ کرو اور یہ دعا کرو :

اللھم ھذا اقبال لیلک وادبار نھارک واصوات دعاتک فاغفرلی۔

”اے اللہ! تیرے سورج کے جانے کا وقت ہے اور تیری رات کے آنے کا وقت ہے اور تیرے منادی نداء کر رہے ہیں کہ دوڑو نماز کی طرف‘ ایسے وقت میری مغفرت فرما“۔

غرض زندگی کا کوئی موڑ آئے شریعت نے فوراً متوجہ کیا ہے ، کہ توجہ الی اللہ کرو تا کہ توحید میں خلل نہ پڑے‘ ایسا نہ ہو کہ تم سورج کو کرتا دھرتا سمجھ لو‘ ایسا نہ ہو کہ تم روشن دن کو یہ سمجھ لو کہ یہ ہمارا کام چلانے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ رات کو تم موت دینے والی سمجھ لو کہ رات آگئی تو مر گئے سو گئے‘ نہ دن زندگی دیتا ہے نہ رات‘ جس نے رات اور دن بنائے وہی زندگی اور موت کا مالک ہے‘ اسی طرح کھانا کھا کے فارغ ہوں تو فوراً دعا کرو :

الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وکفانا واوانا۔

”حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے ہمیں کھلایا جس نے ہمیں پلایا جس نے ہمیں ٹھکانا دیا“۔

تا کہ ادھر توجہ نہ ہو کہ یہ کھانا کھانا زندگی کا بڑا سبب ہے۔ کھانے نے ہمیں زندہ رکھا ہے‘ کھانا کیا چیز ہے؟ فاقہ مست بھی زندہ رہتے ہیں‘ زندگی ایک کے ہاتھ میں ہے‘ روٹی میں زندگی نہیں ہے‘ تو روٹی کے وقت متوجہ کیا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ روٹی کو خدا سمجھ بیٹھیں‘ اس کو خدا سمجھو جس نے روٹی عطا کی۔ تو کھانا شروع کرو تو کہو بسم الله اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں‘ ختم کرو تو کہو الحمد لله کثیرا بہت تعریف میرے پروردگار کے لئے ہے ، جس نے کھلایا۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ اگر کوئی بسم الله سے کھانا شروع کرے اور الحمد لله کثیرا ___ پر ختم کرتا ہے غفرله ماتقدم من ذنبه اس کے پچھلے چھوٹے گناہ سب بخش دیئے جاتے ہیں۔ اس کی فضیلت بیان فرمائی ___ تو حاصل یہ ہے کہ زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہ ہوگا جس میں توجہ الی اللہ نہ ہو۔ استنجا کے لئے جاؤ تو دعا بتلائی گئی :

اللھم انی اعوذبک من الخبث والخبائث۔

”اے اللہ! میں ناپاک چیزوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں“۔

شیطان ہو یا کچھ اور ہو میں پناہ مانگتا ہوں ___ اور جب استنجاء کر کے نکلو پھر اللہ کو یاد کرو‘ اور کہو :

الحمد لله الذی اذھب عنی الاذی وعافانی۔

”حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے اذیت کی چیزیں مجھ سے دور کر دیں اور اب میں اس کی عبادت کے لئے تیار ہو گیا اور میرے قلب میں نشاط پیدا ہو گیا“۔

تو آدمی یوں نہ سمجھ جائے کہ استنجاء کرنا درحقیقت صحت ہے‘ میری صحت استنجاء کے ہاتھ میں ہے‘ قبض

ہوگا تو بیمار ہوں، قبض نہیں ہوگا تو بیمار نہیں رہا۔ گویا قبض وبسط کے ہاتھ میں میری زندگی ہے، تو اس سے بچانے کے لئے کہا کہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ ___ تو سونے جاگنے، استنجاء کرنے اور فارغ ہونے میں، سورج نکلنے اور غروب ہونے میں، دن کے آنے اور جانے میں اور اسی طرح گھر کے باہر نکلنے میں بھی کہ وہاں بھی متوجہ کیا کہ اب تم کام کاج کے لئے جارہے ہو تو اللہ کی طرف توجہ کرو اور کہو :

بسم اللہ امنا باللہ۔ توکلنا علی اللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

"میں اللہ کے نام سے نکل رہا ہوں، میں اللہ پر ایمان لا چکا ہوں میں نے اللہ پر بھروسہ کرلیا ہے کہ جو کچھ پیش آئے گا، اس کی تقدیر سے پیش آئے گا۔ کوئی مجھے نقصان پہنچانے والا بجز ایک اللہ کے نہیں ہے"۔

اسی طرح گھر میں داخل ہو تو فوراً دعا کرو :

بسم اللہ ولجنا وبسم اللہ خرجنا وعلی اللہ ربنا توکلنا۔

اللہ ہی کے نام سے ہم گھر میں داخل ہو رہے ہیں، اور اللہ ہی کے نام سے نکلیں گے، اور ہمیں تو اللہ پر بھروسہ ہے، کسی غیر اللہ پر ہمیں بھروسہ نہیں ہے تاکہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آرام دینے والا یہ گھرانہ ہے، گھرانے آدمی سے چھنتے رہتے ہیں، آج بڑی جائداد اور کئی گاؤں کا مالک، لیکن کل کو غریب بن گیا، تو وہ خدا نہیں ہے، وہ دینے والا نہیں ہے، وہ اسباب کے درجہ میں ہے ___

غرض ہر موقعہ پر اللہ کی طرف توجہ کرائی ہے ___ تو ایک توحید اعتقادی ہے کہ دل میں یہ یقین رکھے کہ اللہ کی ذات اور ساری صفات یکتا ہوں، اور ایک ہی میں ہیں دوسرا اس کا مثل نہیں ___ اور دوسری عملی توحید ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک ہی کی طرف متوجہ کیا ہے، فقط نماز روزے ہی میں نہیں معاشرہ میں چلنے پھرنے میں، گھر آنے جانے میں، مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے میں، سفر کے لئے جانے اور آنے میں بھی ہر موقع پر اللہ کی طرف توجہ کرو۔ یہ توحید عملی ہے تاکہ عمل کے ایک ایک گوشہ میں تم اللہ ہی کیطرف پہنچو، کسی دوسرے تک نہ جاؤ۔

اسلام کا مزاج

توجس دین نے ہمیں سونے جاگنے، چلنے پھرنے میں ایک ذات کی طرف متوجہ کیا ہے تو کیا وہ دین غیر اللہ کی طرف متوجہ کرے گا کہ ہم غیر اللہ کو سجدہ کریں اور غیر اللہ سے ہم پناہ مانگیں، غیر اللہ سے ہم مرادیں مانگیں، اس دین کا مزاج ہی نہیں، یہ مزاج لوگوں کی عقلوں نے پیدا کیا ہے۔ لوگوں کی غلو محبت اور غلو عداوت نے پیدا کیا ہے اور عقائد انہیں اسباب سے بگڑتے ہیں۔ تو جب عقیدہ کا معاملہ آئے تو ان سب چیزوں سے ہٹ کر اللہ کی طرف اور عشق رسول کی طرف رجوع کرو جو ارشاد خداوندی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے۔ ہماری عقل اور طبیعت اس قابل نہیں، تو عقائد کا مخزن قرآن کریم یا حدیث نبویؐ ہے جن سے عقیدہ بنتا ہے۔

عقائد صحیحہ کی پہچان

اور قرآن کریم میں اگر خلجان پیدا ہوا تو حدیث اس کی شرح ہے، حدیث کے سمجھنے میں خلجان پیدا ہو تو

صحابہؓ کا عمل اس کی شرح ہے' صحابہ کرامؓ نے جو چیز قبول کی اور جوان کا عمل جاری ہوا اس سے ہم دیکھیں گے کہ اللہ کے رسول کا یہی مطلب ہے ورنہ تو سب سے اول قرآن کریم ہے اس کے بعد حدیث نبوی ہے اس کے بعد تعامل صحابہؓ ہے' حدیث اور تعامل صحابہؓ سے کٹ کر قرآن کریم میں محض عقل لڑائے تو وہ ہمارا عقلی عقیدہ ہوگا' خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ نہیں ہوگا ___ خدا کا بھیجا ہوا عقیدہ وہی ہے جسے خدا خود فرمائے' اللہ کا رسول اس کی شرح کرے' ان کی شرح صحابہؓ کا عمل و تعامل کردے' تو اول کتاب اللہ' پھر سنت رسول اللہ پھر تعامل صحابہؓ کا درجہ ہے۔

اور اعمالِ صحابہؓ میں اگر خلجان ہو پھر عام امت کا عمل ہے' یعنی علماءِ امت اور ربانیوں کا عمل ہے کہ جو دین پہنچانے والے ہیں ان کا طریقِ عمل کیا رہا ہے؟ محدثین' فقہاء' متکلمین وغیرہ یہ حضرات کس چیز پر جمے ہوئے ہیں تو اس سے عقیدہ واضح ہو جائے گا' قرآن نے اجمالاً کہا حدیث نے اس کی شرح کی' فقہ نے تفصیل کی' تعامل صحابہؓ نے اسے مضبوط بنایا' اور اب امت کے علماء ربانی نے اس کو مؤکد کر دیا' ان چیزوں سے مل کر عقیدہ بنتا ہے' ان میں سے ایک چیز کو بھی آپ رکھدیں گے تو عقیدہ صحیح نہیں بنے گا' اس واسطے ضرورت پڑے گی کہ عقیدہ درست ہو اور عمل درست ہو۔

خیریات دور نکل گئی' میں کہنا کچھ اور چاہ رہا تھا' یہ بیچ میں آ گئی۔

بین الاقوامی دین کی علامت

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی دین لے کر آئے ہیں۔ اس واسطے قرآنِ کریم نے ہم پر واضح کیا کہ سارے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لاؤ :

قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ

حکم ہے کہ مسلمانوں کو کہہ دو' اعلان کر دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ اور جو اللہ نے ہم پر (قرآن وحدیث) نازل کیا' اس پر ہم ایمان لائے اور ابراہیم علیہ السلام پر جو صحف نازل ہوئے ان پر بھی ایمان لائے کہ وہ اپنے زمانے میں حق تھے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحٰق علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی تمام اولاد تو اس میں بنی اسرائیل کے تمام پیغمبر آ گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو نازل ہوا' اور دیگر انبیاء علیہم السلام پر جو نازل ہو خواہ وہ کسی بھی ملک سے آئے ہوں' ہم سب پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم تفریق نہیں کرتے کہ اس نبی پر ایمان لاؤ اور اس پر نہ لاؤ سب کو ہم اللہ کا فرستادہ سمجھتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ تعصب جو پیدا ہوتا ہے وہ شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ میرا متبع ہے میں اسے مانتا ہوں اور یہ تمہارا متبع ہے میں اسے نہیں مانتا یہیں سے جھگڑا شروع ہوتا ہے' اور جو سارے مقتداؤں کو مانے تو جھگڑا کہاں باقی رہا؟ اسلام نے سارے مقتداؤں کو ماننا بتلایا' تو بین الاقوامی دین اسلام ہی ہو سکتا ہے اگر اسلام یوں کہے کہ عرب میں جو پیغمبر آئے ہیں انہیں تو مانو' شام حجاز اور ہندوستان و سندھ میں جو آئیں انہیں مت مانو' یہ تعصب ہوتا۔ یہ بین الاقوامی دین کی علامت نہیں ہوتی' بین الاقوامی دین کے معنی یہ ہیں کہ تعصبات کی جڑ کاٹ دی جائے' تعصب شخصیتوں سے پیدا ہوتا ہے' جب ہم ساری شخصیتوں پر ایمان لائے ہیں تو ہندو

سندھ میں کوئی پیغمبر آئے ہوں۔ ہمیں نام معلوم ہوں یا نہ ہوں ہم بالاجمال ایمان لاتے ہیں تو اقوام کے اندر سے غیض اور غصّہ نکل جائے گا۔ غصّہ تو جب ہو جب ہم کسی پیغمبر کو برا کہیں' وہ ہم سے لڑے گا۔ ہمارے پیغمبر کو برا کہے تو ہم لڑیں گے۔ اگر آنے والا یوں کہے کہ میں تمہارے پیغمبر کو بھی مانتا ہوں اپنا جان کر اور تم میرے پیغمبر کو بھی اپنا جان کر مانو' لڑائی ختم ہوگئی' تو پہلا تعصّب شخصیتوں کا ہے' اسلام نے اسے مٹا دیا یہ علامت ہے کہ وہ بین الاقوامی دین ہے وہ پوری دنیا کے لئے آیا ہے پوری دنیا اس کی طرف متوجہ نہ ہوتی اگر وہ برا بھلا کہتا کہ فلاں جگہ کے نبیوں کو مت ماننا اور ہندو سندھ کے پیغمبروں کو مت ماننا تو سندھ و ہند کی اقوام ہم سے الگ ہوتیں' ہم ان سے الگ ہوتے۔ اور جب سب کو مانا تو کسی کے دل میں غیض نہیں رہا۔ تو یہ بین الاقوامی دین کی علامت ہے ___ اور اگر کوئی یوں کہے کہ میرے پیغمبر کو مانو اور فلاں جگہ کے پیغمبر کو مت ماننا تو یہ تعصب و تنگی اور مقامیت کی علامت ہے۔

ایک یہودی سے گفتگو

میرا افریقہ جانا ہوا تو ہمیں پرس (یعنی بٹوے) خریدنے تھے۔ اس لئے کہ ہمیں افریقہ سے حجاز مقدس جانا تھا تو احرام میں گھڑی' مسواک کہاں ہے میں ڈالے کپڑا تو نہیں پہن سکتے ___ تو ہمارے میزبانوں نے کہا کہ پرس بنانے کی ایک بہت بڑی فیکٹری ایک یہودی کی ہے' وہاں انواع واقسام کے پرس بنتے ہیں آپ وہاں چلیں' بہتر سے بہتر پرس ملے گا' چنانچہ ہم وہاں پہنچے' تو ہمارے میزبانوں نے پہلے جا کے کچھ میرا تعارف کرا دیا کہ ہندوستان سے آیا ہے اور دارالعلوم دیوبند کا ذکر وغیرہ' وہ یہودی جو ادب پتی تھا' وہ استقبال کے لئے باہر نکلا' بڑی آؤ بھگت کر کے اپنی فیکٹری میں لے گیا ___ خیر ___ اس نے کہا کہ پہلے آپ پرس پسند کرلیں' بعد میں بیٹھ کر بات چیت کریں گے' ہم نے پرس پسند کئے مگر ہم نے کہا کہ ان پرسوں میں جو ہینڈل ہے وہ چھوٹا ہے ہمیں گلے میں ڈالنے کے لئے چاہئے۔ اس نے کہا میں ابھی بنوائے دیتا ہوں اس نے آرڈر دیا کہ ان کا جو فیتا ہے وہ لمبا کر دو تاکہ گلے میں ڈالنے کے قابل ہو جائے وہ دیدیئے اور کہا کہ وہ بن کر آجائیں گے اتنے میں ہم آپس میں بات چیت کریں' وہ بات چیت ہوتی رہی' اس میں اس نے کہا کہ کوئی مذہب کی بات بتایئے۔ میں نے کہا میں مذہب کی کیا بات بتلاؤں' آپ اپنے مذہب پر ہیں میں اپنے مذہب پر ہوں'

لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ

کہنے لگے' آپ کچھ کہئے ___ میں نے کہا آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ کہنے لگا' بالکل نہیں مانوں گا ___ میں نے کہا پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ہمارے دشمن ہیں' ہم آپ کے دوست ہیں ___ کہنے لگا یہ کیسے؟ میں نے کہا کہ ہم تو آپ کے دوست ہیں ___ اس لئے کہ آپ کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ہم ان کو اپنا پیغمبر جانتے ہیں کہ ذرہ برابر اگر موسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہوئی تو آدمی اسلام سے خارج ہو جائے گا' اس لئے جو آپ کے پیغمبر ہیں وہ ہمارے پیغمبر ہیں۔ اس لئے ہم مسلمان بن نہیں سکتے جب تک موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائیں اور آپ یہودی بن نہیں سکتے جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جھٹلائیں اور یہ نہ کہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ کہا وہ غلط تھا تو آپ انہیں جھٹلائے بغیر یہودی نہیں بن سکتے ہم تصدیق کئے بغیر مسلمان نہیں بن سکتے' تو ہم آپ کے دوست ہیں آپ ہمارے دشمن ہیں ___ اب وہ بے چارہ چپ ہو گیا ___ چپ ہو کر کہنے لگا کچھ اور کہئے ___ میں نے کہا کہ ہم ایماندار ہیں آپ بالکل ایمان سے خارج ہیں ___ کہنے لگا یہ کیسے؟ میں نے کہا ایمان ماننے کا نام ہے' نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے' ہم سب

کو مانتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی، حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام اور سارے پیغمبروں کو بھی، آپ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتے ہیں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں تو نہ ماننے کا نام ایمان نہیں ہے ماننے کا نام ایمان ہے، اس لئے آپ ایمان سے خارج ہیں ہم ایمان میں داخل ہیں۔

کہنے لگا اور کچھ کہئے ___ میں نے کہا آپ اب رہنے دیں ___ کہنے لگا کچھ تو کہئے ___ میں نے کہا آپ کے اندر عداوت بھری ہوئی ہے، ہمارے اندر محبت بھری ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ایمان محبت کا نام ہے جب ہم ایمان لائے تو سارے انبیاء سے محبت رکھتے ہیں ___ آپ کے ہاں نہ ماننے کا نام ایمان ہے اور عداوت کا سرچشمہ ہے، اس واسطے آپ عداوت سے بھرپور ہیں ہم محبت سے بھرپور ہیں۔

کہنے لگا! بس کافی ہو گیا۔ اب زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اب میں بات چیت کرنے کو برا مانوں گا ___ تو حقیقت یہی ہے کہ ایمان ماننے کا اور محبت کا نام ہے، مؤمن وہی ہے جو سارے اللہ والوں کو مانے، وہ مومن نہیں ہے جو بعض انبیاء علیہم السلام کو مانے اور بعض کو نہ مانے، مؤمن وہی ہے جو سارے اولیائے کرام کا نام عظمت سے لے، ان کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دے، بعض اولیاء کو مانے اور بعض کو نہ مانے بعض کی تکفیر کردے اور بعض کو مؤمن مانے، حقیقت میں یہ شخص محبت سے خالی ہے۔

بہرحال ایمان ماننے اور محبت کا نام ہے۔ اور ایمان توکل اور بھروسہ کرنے کا نام ہے، تو اللہ پر بھروسہ اور انبیاء علیہم السلام کا ماننا اور ان کی اطاعت میں سرگرم رہنا، اور اطاعت میں بھی اس طرح کہ عقیدہ بھی درست ہو ایک ہی کو کرتا دھرتا مانے اور عمل بھی درست ہو کہ ہر موقع پر ایک ہی کی طرف توجہ ہو۔

بین الاقوامی دین کی دوسری علامت

اور جو کچھ میں نے عرض کیا کہ صبح کو بھی اللہ کی طرف متوجہ۔ گھر سے نکلتے وقت نماز کے وقت بھی اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ یہ سارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اعمال ہیں، آپؐ سے ہی یہ ساری دعائیں منقول ہیں کہ جب آپ گھر میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے اور جب گھر سے خارج ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے، مسجد میں جاتے تو یہ دعاء پڑھتے، تو مقصود اس سے یہی ہے کہ انسان کے قلب میں صرف ایک ہی ذات سے محبت و تعلق ہونا چاہئے، ایک ہی کی طرف دھیان اور لگاؤ ہو۔

اور ایک سے تعلق رکھنا جب انفرادی طور پر آسان ہے ایسے ہی اجتماعی طور پر آسان ہے ایک ہی کی ذات کی نسبت سے دنیا کے تمام انسان ایک لڑی میں آسکتے ہیں شخصیت، وطن، رنگ ونسل کی نسبت سے اجتماعی وحدت پیدا ہونا ممکن نہیں اور جب تک اجتماعی وحدت نہ ہو ان امور کے لحاظ سے ___ دین بھی مختلف ہوتا رہے تو کبھی بھی دین میں بین الاقوامیت نہیں آسکتی، بین الاقوامی دین وہی ہو سکتا ہے جو رنگ ونسل اور شخصیت ووطن کے بتوں کو پاش پاش کردے اور ان سب چیزوں سے وراء الوراء کسی ایسی مقدس ذات سے انسان کو جوڑے جو سب کے لئے قابل قبول ہو اور وہ ذات اقدس اللہ رب العزت کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ اللہ رب العزت کی حقیقی پہچان اسلام دیتا ہے تو اسلام ہی بین الاقوامی دین ہو سکتا ہے، کوئی اور دین نہیں ہو سکتا۔

بین الاقوامی دین کی تیسری علامت

بہرحال اسلام نے شخصی تعصب کو بھی ختم کیا، اور سب کو ماننے کا حکم دیا۔ اسی طرح وطنی تعصب کو بھی ختم کیا۔ تاکہ اس کی بین الاقوامیت ہر پہلو سے واضح ہو جائے اور اس پر کوئی حرف نہ آسکے ___ چنانچہ اگر

کوئی یوں کہے کہ میرا وطن بہت عمدہ ہے تمہارا وطن گھٹیا' خواہ مخواہ جذبات کو مشتعل کرنا' میرے وطن کو برا کہہ دیا اور اپنے وطن کو اچھا کہا' میری زمین کو برا کہا اپنی زمین کو اچھا کہا۔ تو اس سے آدمی میں وطنی تعصب پیدا ہوتا ہے کہ میری زمین ایسی اور تمہاری زمین گندی۔ اس سے بھی قوموں میں لڑائیاں پیدا ہوتی ہیں' زمین کے ٹکڑے بھی لڑائیاں کرا دیتے ہیں' اس تعصّب سے کبھی عقیدے اور مذہب میں خلل پڑتا ہے' کہ میری زمین سے جو مذہب اگا ہے وہی مذہب ہے تمہاری زمین پر جو مذہب اگا ہے وہ ہمارا مذہب نہیں ہے بھلا مذہب کو بھی گیہوں چنے کی طرح پیدوار سمجھ لیا تو اس سے ایک تعصّب پیدا ہوتا ہے۔

اس لئے اسلام نے ہم وطنوں کی بھی تقدیس کی' احادیث کو آپ دیکھیں یمن' شام کی مدح فرمائی گئی' حجاز کی فضیلت بیان کی گئی' ہندوستان کے مناقب الگ بیان کئے ہند اور سندھ کے بارے میں بھی تعریفی کلمات فرمائے، گویا ہر ملک کی تقدیس کی اور ہر ملک کی خوبی بیان کی تو اسلام نے وطنیت کی جڑ نکال دی یہ مذہب کی تفریق کا ذریعہ بنتی تھی' جب سارے ملک ایک ہو گئے ۔

ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما است

ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے اور خدا سب کا ایک ہے تو ہمارے سارے وطن! تو تعصّب کہاں سے پیدا ہوگا؟ لڑائی کیسے پیدا ہوگی؟ تو اسلام نے جب وطنوں کی تعریف کی' معلوم ہوا اسلام بین الاقوامی مذہب ہے اور بین الاوطانی مذہب ہے ورنہ یوں کہتا کہ صاحب! عرب کی زمین میں جو فضیلت ہے نہ وہ ہندوستان میں ہے نہ یمن میں نہ شام میں' ان ملکوں کے آدمیوں سے ہمیں کوئی تعلق نہیں۔

افضلیّت کا بین الاقوامی معیار

ہم تو عرب کے لوگوں کو جانتے ہیں ___ بلکہ یہ فرما دیا گیا :

لیس لعربی علی عجمی فضل الابدین وتقوی

کسی بھی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں ہے' فضیلت ہے تو تقویٰ پارسائی اور پاکدامنی سے ہے' کہیں کا رہنے والا ہو جو متقی ہوگا وہ اللہ کے ہاں معظم اور مکرّم ہے جو تقویٰ نہیں اختیار کرے گا خدا سے نہیں ڈرے گا' پاکدامن پارسا نہیں بنے گا وہ اللہ کے ہاں محبوب نہیں چاہے وہ عرب ہی کا رہنے والا ہو' تو وطنیت کی جڑ نکال دی' سارے وطنوں کو اپنا وطن کہا۔ یہ دلیل ہے کہ اسلام بین الاقوامی دین ہے کوئی مقامی مذہب نہیں ہے کہ ایک زمین سے نکلا تو اس زمین والوں کے لئے ہے' دوسری زمین والوں کے لئے نہیں ہے۔ تو شخصیّت کا تعصّب مٹایا' وطنیت کا تعصب بھی مٹایا۔

بین الاقوامی دین کی چوتھی علامت

کبھی رنگ سے تعصّب پیدا ہو جاتا ہے جیسے افریقہ میں ہو رہا ہے کہ وہاں کالے اور گورے کی بڑی سخت تفریق ہے کالوں کی گاڑیاں الگ اور گوروں کی الگ' کالوں کی بسوں میں گورے اور گوروں کی بسوں میں کالے نہیں بیٹھ سکتے' گوروں کے لئے عالی شان اسٹیشن ہے اور کالوں کے لئے ایک معمولی ساویٹنگ روم بنا ہوا ہے گورے ادھر نہیں آسکتے کالے اُدھر نہیں جاسکتے ' ہوائی اڈے پر جو اعلیٰ ترین حصہ ہے وہ گوروں کا ہے اور ایک معمولی ہال بنا ہوا ہے اس میں کالے بیٹھتے ہیں تو اس تفریق کی وجہ سے ایک خاص

تعصب وہاں پیدا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کالے گوروں کے اور گورے کالوں کے دشمن بنے ہوئے ہیں' کالوں کے بس میں آجائے تو گوروں کو گولی سے اڑا دیں' اور گوروں کے بس میں آجائے تو کالوں کو ختم کر دیں تو رنگ کی وجہ سے تعصب پیدا ہو گیا ___ مگر اسلام نے اس تعصب کو مٹا دیا اور ارشاد فرمایا :

بعثت الی الاسود والاحمر۔

میں کالے اور گورے کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ کالے بھی میرے ہیں گورے بھی میرے ہیں' جو میرے خدا کا حکم مان لے وہ میرا ہے چاہے وہ کالے رنگ کا ہو چاہے وہ گورے رنگ کا ہو ___ تو گورے اور کالے رنگ کا فرق مٹایا۔ اور شخصیتوں کا فرق الگ مٹایا' یہی تو اس دین کے بین الاقوامی ہونے کی علامت ہے۔ اگر زمین کیساتھ مقید ہوتا تو مقامی دین ہوتا' شخصیتوں کے ساتھ مقید ہوتا شخصی دین ہوتا۔ رنگ کیساتھ مقید ہوتا تو رنگین دین بنتا ___ لیکن رنگ' وطن اور شخصیتوں سے بھی بالاتر ہے تو یہ اسکی علامت ہے کہ پورے عالم کے لئے یہ مذہب ہے۔ اس لئے یہ فرمایا گیا کہ :

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ

پہلے تو یہ کہو کہ جتنے بھی انبیاء ہیں ہم سب پر ایمان لائے' ان انبیاء پر جو کتابیں نازل ہوئیں ان سب پر ہم ایمان لائے اپنے اپنے وقت میں وہ سب حق تھیں۔ اگر برائی پیدا کی تو اقوام نے پیدا کی' انبیاء اور کتابیں اس سے بری ہیں' تغیر اور تبدل اقوام نے کیا ہے۔

پھر یہ انبیاء علیہم السلام سارے وطنوں میں آئے جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا :

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ

تو جن رسولوں پر ہم ایمان لائے' جب وہ ہر وطن میں ہیں تو سارے وطن ہمارے نزدیک مقدس ہیں' جس وطن میں پیغمبر آئے ہم کہیں گے وہ وطن ہمارے نزدیک مقدس ہے' وہاں بھی اللہ والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اسلام سارے وطنوں ۔۔کے لئے ہے کسی ایک وطن کے لئے نہیں ہے وہ سارے افراد بنی آدم کے لئے ہے کسی ایک شخص کے لئے نہیں ہے کسی ایک قوم کے لئے نہیں ہے وہ سارے رنگوں کو اپنا کہتا ہے تو اس میں کالے گورے کی کوئی تمیز نہیں تو جس میں یہ تفریقیں مٹ جائیں سمجھو کہ وہ مذہب بین الاقوامی ہے' جہاں یہ تفریقیں موجود ہیں سمجھو کہ وہ مقامی مذہب ہے' وطنی مذہب ہے۔ تو کسی دوسرے کو حق نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے وطن میں جاکے داخل ہو۔ یہ حق تو بین الاقوامی مذہب کو ہے کہ وہ ساری دنیا میں پھیلے۔

بین الاقوامی دین ہونے کا معیار

یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ دھڑے بندی مت کرو ایک اللہ کی طرف متوجہ ہو کر یہ کوشش کرو کہ اللہ کا پیغام سند کے ساتھ ہمیں ملے گا۔

اس لئے کہ دین نقلی ہے اور نقل کے لئے روایت کی ضرورت ہے اور روایت کے لئے سند کی ضرورت ہے۔ تو سند تلاش کرو مقصد یہ کہ سندی اور تاریخی طور پر کونسا دین پیغمبر تک پہنچتا ہے اور بیچ میں پہنچانے والوں کو' سب کو ہم پہچانتے ہوں کہ یہ اس کا راوی یہ اس کا راوی تو سند کے ساتھ جو دین پیغمبر تک پہنچ جائے وہ واجب الاعتقاد ہو گا' جس کی سند نہ ہو گویا قصے اور کہانی کے طور پر آرہا ہے' ہو سکتا ہے اس میں غلطیاں داخل ہو گئی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ برائیاں داخل ہو گئی ہوں۔ لیکن سند کیساتھ جو چیز آئے گی اس میں برائی نہیں آسکتی ___ قرآن کو یا حدیث کو دیکھو ایک ایک آیات کی سند پیغمبر تک پہنچی ہوئی ہے مثلاً

اگر میں یوں کہوں کہ میں نے قرآن کریم حضرت قاری عبدالوحید خاں صاحب مرحوم سے حفظ کیا۔ انہوں نے قاری عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے حفظ کیا انہوں نے قاری عبداللہ صاحب مرحوم سے' قاری عبداللہ صاحب نے قاری محمود صاحب مصری سے اور قاری محمود صاحب نے اپنے استاذ سے اور اس طرح سند میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچادوں پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن جبریل علیہ السلام سے پہنچا اور جبریل امین کے قلب میں حق تعالیٰ شانہ نے القاء کیا گویا ایک حافظ کی سند حق تعالیٰ شانہ' تک پہنچی ہوئی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ دنیا میں شاید کوئی مذہب اس طرح سند نہیں پیش کر سکے گا۔ اگر انجیل والوں سے پوچھو کہ یہ انجیل کہاں سے آئی۔ تمہارے استاذ کون ہیں۔ ممکن ہے ایک دو اساتذہ تک بتلادیں۔ آگے غائب ___ یہودیو ں سے پوچھو کہ تورات لانے والے کون ہیں؟ راوی کون کون ہیں؟ تاریخ ندارد ہے کیا خبر کسی نے کیا تصرف کیا۔ زیادہ کیا یا کم کیا۔ جب سندی دستاویز نہیں تو تصرفات ہو سکتے ہیں تو سب سے پہلے دیکھنے کی چیز تاریخ اور سند متصل کہ اللہ تک ملی ہوئی ہو تو قرآن و حدیث کے سوا ہم انصافاً کہتے ہیں کہ کوئی سند ملی ہوئی نہیں ___ اس کی رو سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انجیل بھی حق ہے۔ اگر قرآن نہ بتلائے تو ہمیں خبر نہیں تھی کہ انجیل حق ہے یا نہیں۔ قرآن نے کہا کہ تورات حق ہے تو سند صحیح کے ساتھ معلوم ہوا کہ واقعی حق ہے۔ تو اسلام نے سند متصل کے ساتھ پیغمبروں کا پتہ دیا۔ ہم نے مانا' ایمان لائے۔

تو اصل چیز ایمان لانے کی سند ہوتی ہے ___ اگر آج موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبری ماننے کے قابل ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری زیادہ ماننے کے قابل ہے اگر موسیٰ علیہ السلام پر اللہ نے معجزے نازل کئے کہ ہاتھ گریبان سے نکالا تو سورج کی طرح روشن، اور عصا پھینک دیا تو اژدھا بن گیا اور یہ انکی نبوت کی دلیل ہے تو اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں معجزے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے عطا کئے۔ آپ کی انگشتان مبارک سے چشمے پھوٹ پڑے اور چودہ سو آدمیوں نے اپنے مشکیزے بھر لئے آپؐ کی انگلی کے اشارے سے چاند شق ہوا۔ آپ کو معراج کے لئے عرش تک پہنچایا گیا۔ پتھروں نے آپؐ سے سلام کیا۔ درندوں نے آپؐ کی شہادت دی کہ :

اشهد انک رسول اللّٰہ

ایسی روایات سندِ متصل کے ساتھ اور نقلِ صحیح کے ساتھ موجود ہیں' جن کی سند ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا سکتے ہیں۔ مسلمانوں نے پچاس ہزار آدمیوں کی جو حدیث کی روایت کرنے والے ہیں۔ ان کی تاریخ مرتب کر دی کہ یہ انکا کیریکٹر تھا یہ ان کا خاندان تھا۔ یہ ان کی نسل تھی۔ یہ ان کی سچ اور جھوٹ کی کیفیت تھی۔ ایک ایک چیز جمع کی۔ تو آج جس سند سے ہم روایت کریں گے اس سند کے ایک ایک فرد کی تاریخ بھی بیان کر سکیں گے کہ ہمارے استاد یہ تھے تو ان کی یہ شان تھی۔ ان کے استاد یہ تھے تو ان کا یہ کردار تھا۔ اسی طرح آگے سلسلہ ہے اس طور پر پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخ مرتب ہے جن سے قرآن و حدیث ہم تک پہنچا تو سب سے پہلی چیز سند و روایت ہے۔ تو قرآن کی سند سے بڑھ کر کوئی سند نہیں۔ اور کتابوں کی ہم سند ہی نہیں پاتے۔ قرآن حکیم کی سند کے ہر ایک کے زمانے میں لاکھوں افراد موجود ہیں جنھوں نے قرآن کریم حفظ کیا اگر معاذاللہ کوئی قرآن کریم کو دریا برد بھی کر دے تو منٹ بھر میں پھر لکھا جائے گا ہزاروں لاکھوں حفاظ موجود ہیں :

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ

"اللہ نے یہ آیتیں اہل علم کے سینے میں محفوظ کر دی ہیں"۔

اگر صندوقوں میں قرآن محفوظ ہوتا تو صندوقوں کو دریا میں بہا دیا جا سکتا تھا۔ زمین میں دفن کرتے تو زمین

اس کو گلا دیتی۔ ہوا میں رکھتے تو ہوا کاغذوں کو اڑا دیتی۔ اللہ نے ایسی جگہ حفاظت کی کہ نہ وہاں آگ جا سکے نہ پانی نہ ہوا نہ مٹی اور وہ اہل علم کے قلوب ہیں۔ ان میں محفوظ ہے اسی طرح وہاں شیطان اور جن بھی نہیں جا سکتے۔ تو قرآن کی حفاظت یہ ہے کہ ایک وقت میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں۔ حدیث کی حفاظت یہ ہے کہ ایک ایک ٹکڑے کے لئے اللہ کے رسول تک سند موجود ہے ___ تو اتنا مستند کلام تو معتبر نہ ہو اور جس کی کوئی سند نہ ہو وہ معتبر ہو جائے؟ اگر وہ ماننے کے قابل ہے تو سب سے پہلے یہ ماننے کے قابل ہے۔ اگر موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانا ضروری ہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ان سے زیادہ ضروری ہے۔

جو وہاں دلائل ہیں ان سے بڑھ کر یہاں دلائل موجود ہیں اس لئے اسی دین کو اختیار کرنا چاہئے۔

فکرِ فردا

ایسے دین کے ہوتے ہوئے ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنی موت اور آخرت دیکھ کر آخرت کو سیدھا کرے، دین کا بڑا کام یہ ہے کہ آخرت درست کرے، اس لئے کہ مرنا مجھے بھی ہے تمہیں بھی۔ یہ سارے قصے یہیں ختم ہو جانے والے ہیں۔ نہ کوئی بوڑھا باقی رہے گا نہ کوئی جوان۔ بالآخر اسی پروردگار کے آگے جانا ہے، جس نے پیدا کیا ہے اور جہاں سے ہم آئے ہیں:

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ

جس نے ہماری ابتدا کی ہے اسی کی طرف ہماری انتہا بھی ہے، وہی مبدا بھی ہے وہی معاد بھی ہے، وہیں سے چلے ہیں وہیں لوٹ کر جانے والے ہیں، تو جب ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ ہمیں اللہ کے آگے کھڑا ہونا ہے۔ ایک ایک چیز کا حساب دینا ہے۔ تو آدمی غور کرے اور سمجھے کہ میں وہاں کے لئے تو کچھ سامان کروں۔

اور وہاں کا سامان روٹی کا ٹکڑا تو ہے نہیں؟ وہ دین ہی ہو سکتا ہے۔ تو دین وہ ہو جو مستند ہو، سند متصل کیساتھ پیغمبر تک پہنچا ہوا ہو۔ جس پر آدمی یقین کر سکے کہ یہ دین ہے ___ تو غور و فکر کرنا ہم سب کا فرض ہے خواہ ہندو ہو یا مسلمان ہو۔ ہر ایک کو اس کے ہاں جانا ہے اور ہر ایک کو اس سے ملنا ہے۔

اور موت کا کوئی وقت ہمیں تو معلوم نہیں۔ خدا جانے کب آجائے۔ یہ تو اللہ ہی کے علم میں ہے۔ یہ خیال کرنا کہ ابھی تو جوانی ہے، بڑھاپا جب آئے گا، دیکھی جائے گی۔ ابھی تو ہم تندرست ہیں بیماری آئے گی تو دیکھی جائیگی۔ کیونکہ موت تو بیماری سے آتی ہے ___ تو بھئی! موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے نہ بیماری شرط ہے نہ بچپن شرط ہے، بوڑھے بچے جوان سبھی مرتے ہیں تندرست بھی مرتے ہیں مریض بھی مرتے ہیں۔ بعضوں کے ہارٹ فیل ہو جاتے ہیں۔ اچھے بھلے تندرست ہوتے ہیں مگر منٹ بھر میں ختم ہو جاتے ہیں۔ تو یہ شیطانی دھوکہ ہے کہ جب بڑھاپا آئے گا جب توبہ کرلیں گے اور غور کرلیں گے، کیا خبر ہے بڑھاپا آئے گا بھی یا نہیں؟ کیا پتہ پہلے ہی چلتے بنیں ___ بلکہ میں تو کہتا ہوں جوان زیادہ مرتے ہیں۔ بوڑھے کم مرتے ہیں۔ زیادہ موت جوانوں کو آتی ہے بوڑھوں کو نہیں ___ اس لئے کہ آپ مجمعوں پر نگاہ ڈالیں تو بوڑھے کم نظر پڑیں گے جوان زیادہ نظر آئیں گے۔ یہ اس کی علامت ہے جوان زیادہ مرتے ہیں اس لئے کہ اگر سارے بوڑھے ہو کر مرا کرتے تو بوڑھے مجمعوں میں زیادہ نظر پڑتے مگر وہاں جوان زیادہ نظر آتے ہیں ___ معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے تک پہنچ ہی نہیں پاتے، پہلے ختم ہو جاتے ہیں تو نوجوانوں کو زیادہ موت آتی ہے، بوڑھوں کو کم آتی ہے۔ بڑھاپے تک لوگ کم پہنچتے ہیں، غرض اس دھوکہ میں آپ نہ رہیں کہ جب بڑھاپا آئے گا جب سوچ لیں گے، جب بیماری آئیگی جب سوچ لیں گے۔ موت کی جب علامتیں شروع ہوں گی جب سوچ لیں گے ___ وہ

تو یکدم آجاتی ہے۔ کھڑے پیر آجاتی ہے۔

درپیش منزل

تین پیغمبر ہیں جن کو اچانک ہی موت واقع ہوئی ہے۔ حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت یوسف علیہم السلام۔ تینوں کی موت اچانک ہوئی ہے تو جب انبیاء علیہم السلام اس دنیا سے اچانک گزر سکتے ہیں تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے؟ ہم کس چیز پر غرّہ کریں؟ ___ بہرحال موت کے لئے ظاہری علامت ضروری نہیں کئی آدمی بیٹھے بیٹھے گزر گئے۔ ہزاروں واقعات اس قسم کے ہیں۔ اس لئے جب سب کو یہ منزل درپیش ہے تو سب کو اس کی فکر کرنی چاہئے، اور اپنے ضمیر سے سوچنا چاہئے۔

دینِ حق کی آسان پہچان

آدمی کا دل بڑا مخلص ہوتا ہے۔ دل منافق نہیں ہوتا۔ دل آدمی کو صحیح مشورہ دیتا ہے ادھر ادھر کے دوست غلط مشورہ بھی دے دیں مگر دل مطمئن نہیں ہوگا۔ جب تک آپ صحیح بات سوچ کر سامنے نہیں رکھدیں گے اس لئے اپنے ضمیر سے سوچیں اور غور کریں کہ دینوں کے اندر واقعی کونسا دین حق ہے۔ سند اور روایت کے لحاظ سے کونسا دین حق ہے۔ تعلیمات کے لحاظ سے دیکھو تو کس کی تعلیم زیادہ ستھری، منقّٰی اور ممتاز تعلیم ہے کہ حق وباطل اس میں نکھرا ہوا ہے ___ اور جب ذہن میں آجائے اور دل گواہی دے تو فوراً آدمی کو قبول کرنا چاہئے۔ پھر اس پر نہ رہے کہ قوم کیا کہے گی، اور میرے رشتہ دار کیا کہیں گے۔ وہاں نہ رشتہ دار کام آئے گا نہ قوم کام آئے گی۔ وہاں تو اپنا دین اور عمل کام آئے گا۔ اور اللہ کے آگے تو تنہا پہنچنا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا گیا :

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ آگئے تم تن تنہا ہمارے پاس، جیسے ہمارے پاس سے تنہا گئے تھے۔ کیونکہ تمہارے پیدا ہونے میں کوئی شریک نہیں تھا۔ ہم نے تنہا بھیجا اور تم تنہا پہنچے۔ آج اسی طرح ہمارے پاس آئے ہو جیسے ہم نے پیدا کیا تھا اور جن چیزوں پر تم نے بھروسہ کر رکھا تھا انہیں اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ جن کو تم نے دوست سمجھ رکھا تھا کہ یہ ہمیں بخشوالیں گے۔ (ان سب کو پیچھے چھوڑ آئے ہو؟) آج ہم تمہارے کوئی سفارشی نہیں دیکھتے، کوئی مددگار نہیں دیکھتے، جن کو تم یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے شریک ہیں جو اللہ کے ساتھ ملکر ہمیں نجات دلائیں گے۔ آج وہ تمہارے شفیع اور سفارشی کہاں ہیں؟ وہ سب امیدیں تمہاری قطع ہو گئیں۔ اور جو کچھ تم نے سوچ رکھا تھا وہ سب گنبد سرا ہو گیا۔

اس لئے میری گزارش یہ ہے کہ دین کے بارے میں آدمی اپنے ضمیر سے غور کرے۔ اپنے دل سے مشورہ لے۔ اپنی موت اور اپنی آخرت کو سامنے رکھ کر سوچے یہ سامنے رکھکر نہ سوچے کہ میرے ساتھ سامان کتنا ہے، میرے ساتھ مشورہ دینے والے کتنے ہیں؟ میرے عزیز کتنے ہیں؟ یہ کوئی نجات والے نہیں۔ نہ کوئی ساتھ جانے والا ہے۔ ضمیر ساتھ جائے گا۔ اعتقاد اور ایمان ساتھ جائے گا۔ عمل ساتھ جائے گا۔ اسی لئے انہی

کو اپنے ساتھ رکھو۔

حضرت حاتم اصمؒ کا واقعہ

حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شقیق بلخیؒ کے مرید ہیں اور خلیفہ بھی ہیں۔ بزرگوں میں سے ہیں۔ حضرت شقیق بلخیؒ کے ہاں تینتیس برس رہے ہیں وہیں تربیت پائی اور تعلیم باطن حاصل کی۔ تینتیس برس کے بعد شقیق بلخیؒ نے پوچھا کہ تینتیس برس میرے پاس رہے تم نے کیا حاصل کیا؟

عرض کیا کہ میں نے آٹھ مسئلے سیکھے ہیں :

فرمایا کہ کل آٹھ مسئلے؟ عرض کیا جی ہاں کل آٹھ مسئلے!

فرمایا کہ میرا بھی وقت ضائع کیا اپنا بھی وقت ضائع کیا۔ بندۂ خدا تینتیس برس میں کل آٹھ مسئلے؟ فرمایا آخر وہ آٹھ مسئلے کیا ہیں؟

عرض کیا کہ :

انتخاب محبوب

پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ میں نے دنیا میں دیکھا کہ ہر ایک کو کسی نہ کسی سے محبت ہے اور وہ اپنے محبوب کی فکر میں ہے کہ وہ مجھ سے راضی ہو اور میں اس سے مل جاؤں، مجھ میں اور اس میں جدائی اور فراق نہ ہو۔ لیکن مرنے کے بعد یہ سارے محبوب جدا ہو جاتے ہیں۔ نہ کوئی محبوب قبر میں ساتھ جاتا ہے جس سے محبت کی تھی نہ وہ دستگیری کرتا ہے اس واسطے میں نے قرآن کریم میں یہ دیکھا کہ عمل آدمی کے ساتھ جاتا ہے تو میں نے اعمال صالحہ کے ساتھ محبت کی، اور سب سے محبت ترک کردی تاکہ میرا محبوب قبر میں بھی میرے ساتھ رہے اور الگ نہ ہونے پائے، تو ایک مسئلہ تو میں نے یہ سیکھا ہے کہ سارے محبوبوں کو چھوڑ کر ایک عمل صالح کو محبوب بنالیا ہے۔ اس لئے کہ کوئی محبوب قبر میں ساتھ نہیں جائے گا۔ نہ بیوی نہ دوست نہ بچہ، عمل آدمی کے ساتھ جائے گا۔ اس لئے اس کو محبوب بنالیا اور سارے محبوبوں کو ترک کردیا۔

تعیینِ دشمن

دوسرا میں نے یہ دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک کو کسی نہ کسی سے عداوت بھی ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوشش اور فکر میں رہتا ہے۔ اور دوسرا اس کو نیچا دکھانے کی فکر میں رہتا ہے تو آپس میں دشمنی ٹھن جاتی ہے، لیکن سارے دشمن ایک دن ختم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ تن تنہا رہ جائے گا۔ اب کس کی دشمنی سے آدمی بچے، فوج سے بچے، سپاہی سے بچے، بچھو سے بچے، سانپ سے بچے، سارے دشمن ہی دشمن ہیں تو بچنے میں مشکل ہوگی۔ ہزاروں دشمن ہیں اور آدمی کا دل ایک ہے تو بچنے کے لئے کہاں کہاں جائے؟ ___ تو میں نے قرآن کریم دیکھا ___ اس میں ہے کہ :

إِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا

"شیطان تمہارا دشمن ہے جو اخیر تک دشمنی کرے گا"۔

تو میں نے ایک سے دشمنی بنا کے سب سے دشمنی قطع کرلی، تو میں شیطان سے لڑتا ہوں۔ اس سے لڑوں

گا تو سب دشمن ختم ہو جائیں گے' ساری دشمنی کی بنا' شیطان ہی ہے۔ لہٰذا میری کسی سے دشمنی نہیں۔ کسی سے عدوات نہیں تو دوسرا مسئلہ میں نے یہ سیکھا۔

بااعتمادِ ذات

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک نے کسی نہ کسی پر سہارا کر رکھا ہے' کسی نے روپے پر سہارا کر رکھا ہے کہ میرے گھر میں دولت ہے جو چاہوں گا کروں گا۔ کسی نے غلّہ پر سہارا کر رکھا ہے' کسی نے حکومت پر سہارا کر رکھا ہے' کسی نے رشتہ دار پر سہارا کر رکھا ہے میں نے قرآن کریم میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ سارے سہارے ختم ہو جائیں گے صرف ایک اللہ کا سہارا ہے جو باقی رہے گا۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

"جو اللہ پر بھروسہ کرے اللہ اس کے لئے کافی ہے"۔

تو میں نے ایک کو سہارا بنایا' باقی سہاروں کو ترک کر دیا ___ تو یہ میں نے تیسرا مسئلہ سیکھا ___ اسی طرح سے انہوں نے اور مسائل بیان کئے ___ تو حاصل یہ ہے کہ ایک کو اپنا سہارا بنالو' ایک کو معبود بنالو' پھر اسی کی طرف جھکو۔ دنیا کی عداوت بھی چھوڑو' دنیا کی محبّت بھی چھوڑو اگر محبت کرو تو اللہ کے لئے' عداوت باندھو تو اللہ کے لئے' جس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب تمہارا ایک ہی ہے اور مبغوض شیطان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کو ہمیشہ کے لئے دشمن سمجھو' اس سے دشمنی ٹھان لو۔ اللہ سے دوستی کرلو اور اپنے ضمیر سے فیصلہ کرلو تو مطلب یہ ہے کہ دین اور آخرت کی بات آدمی کو تنہا سوچنی ہے۔ اس میں کوئی سہارا نہیں' خود اپنے ضمیر سے فیصلہ کرلو۔ اپنے دل سے سوچ لو اور خوب چھان بین کرلو' جب حق واضح ہو جائے۔ علی الاعلان اس کو مان لو یہ نہ دیکھو کہ کون کیا کہے گا؟ کون کیا کہے گا؟ کہنے والے کہا ہی کرتے ہیں ان کی باتوں کا قطعی دھیان نہ کیا جائے' اپنے ضمیر کی آواز کو دیکھا جائے۔

صاحبِ دور کا اِتّباع مدارِ نجات ہے

تو قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ تم اپنے ایمان کو مضبوط کرو۔ ایمان کو تعصبات میں دخل نہ دو۔ نہ شخصیتوں کے تعصبات کو۔ نہ رنگ و بو کے تعصبات کو۔ نہ زمین کے ٹکڑوں کے تعصبات کو۔ نہ وطن اور قوم کے تعصبات کو۔ صرف ایک اللہ پر بھروسہ کرو۔ ایک نبی کی بات کو مانو۔ کہ اس دور میں صرف انہی کے ماننے میں نجات منحصر ہے۔ جس کا دور اور زمانہ ہو گا اسی کے ماننے پر نجات موقوف ہو گی۔ یا کوئی یوں کہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو مانتا ہوں اور نجات ہو جائیگی۔ یہ غلط ہے' صاحب زمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان کا دور ہے۔ ان کے ماننے میں نجات ہے' دوسروں کے ماننے میں نجات نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے :

لو كان موسى حيا لما وسعه الا اتباعى

آج اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہو کر آئیں گے تو میری اتباع کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ ان کی نجات بھی میرے ہی دین کے ماننے میں ہے۔ اس لئے کہ میں صاحب وقت اور صاحب زمان ہوں' میری شریعت کا دور دورہ ہے آج پریزیڈنٹ وقت فخرالدین علی احمد ہیں۔ ہندوستان کا قانون ان کے دستخطوں سے جاری ہو رہا

ہے۔ آج پچھلے لوگ صدر نہیں اگر ان سے کوئی زندہ بھی ہو اور کوئی یوں کہے کہ میں اس قانون کو مانتا ہوں جو پچھلے صدر کے زمانے میں جاری ہوا۔ اور ان کے قانون کو نہیں مانتا تو وہ باغی سمجھا جائے گا اس کو پھانسی کی سزا ہوگی۔ کہا جائے گا کہ آج انکا دور ہے انہی کے قانون میں نجات ہے۔ آج کسی اور صدر کا قانون نہیں چلے گا۔

یا کوئی سابقہ صدر یوں کہے کہ میں چونکہ پریزیڈنٹ رہ چکا ہوں اب بھی میرا وہی مقام ہے۔ میں چاہے کسی کی مانوں چاہے نہ مانوں۔ میں اب بھی پریزیڈنٹ ہوں گورنمنٹ مقدمہ کرے گی کہ آج کا پریزیڈنٹ فخر الدین علی احمد ہے آج تم نہیں ہو، تمہیں ان کا اتباع کرنا پڑے گا۔ جو وہ قانون دیں تمہیں ماننا پڑے گا۔ اب تمہاری صدارت کا زمانہ نہیں ہے۔ تو جو صاحب دور اور صاحب زمان ہوتا ہے اس کے ماننے میں نجات منحصر ہوتی ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور مبارک جب آگیا۔ اور آپ خاتم الانبیاء ہیں اور آپ نے شریعت اور قانون لاکے رکھا تو آج نجات اسی کے ماننے میں منحصر ہے۔

آج کوئی کہے کہ میں تورات کو مانتا ہوں یا کہے انجیل کو مانتا ہوں نجات نہیں ملے گی ان کا دور ختم ہوا۔ آج کا دور قرآن کا ہے۔ اسی کے ماننے میں نجات منحصر ہے۔

بہر حال اس آیت سے یہ مسئلہ نکلا کہ سات سو بات میں دخل مت دو ایمان قبول کرو

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

ہم ان میں تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں۔ ہم سب کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ ہم سب کے بارے میں تسلیم و رضا اختیار کرتے ہیں۔

انکارِ قرآن تمام کتب کے انکار کو مستلزم ہے

اور یہ ہمیں کس نے منوایا؟ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے، آپ کا ماننا سب سے پہلے ہے۔ آپ کو ماننا سب کو ماننا ہے۔ قرآن کو مانا تو انجیل اور تورات کو بھی مانا۔ زبور کو بھی مانا۔ قرآن کریم کا انکار کیا تو کسی چیز کو بھی نہ مانا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی تو سند صحیح موجود ہے اور تورات و انجیل کی سند موجود نہیں۔ یہ تو قرآن کریم نے بتلایا کہ یہ آسمانی کتابیں ہیں اس لئے قرآن کے ذریعے ان کو بھی مانیں گے، اس لئے قرآن کریم نے فرمایا ____ ومهيمنا عليه

قرآنِ کریم تمام کتبِ سماویہ کا محافظ ہے

قرآن کریم تمام پچھلی کتابوں کا محافظ ہے کہ ان کے اندر جو تعلیم حق ہے وہ قرآن نے جاری کردی۔ اور قوموں نے جو رلا ملا دیا تھا قرآن نے اس کو نکال کر پھینک دیا۔

اس لئے ایک مسلمان جب اسلام لائے گا تو مسلمان ہونے کے بعد سچا عیسائی بنے گا عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح معنی میں ایمان لائے گا۔ اسی طرح جو مسلم بناوہ صحیح معنی میں موسائی بنا۔ کہ اس نے سند متصل کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو صحیح طور پر سمجھا۔ وہی ابراہیمی بنا وہی آدمی بھی بنا۔ یعنی آدم علیہ السلام کو مانا۔ تو سند متصل کی دنیا میں ایک ہی کتاب ہے۔ اس نے دنیا کی کتابوں کا تعارف کرایا۔ اس کا ماننا سب کا ماننا ہے۔ اس میں داخل ہونا ساری چیزوں کو اپنے سامنے لے آنا ہے اس واسطے ہم سب کا فرض ہے کہ دین کے بارے میں تعصبات کو چھوڑ دیں۔ دین کے بارے میں اس بات کو چھوڑ دیں کہ فلاں کیا کہتا ہے، فلاں کیا کہتا ہے۔ خود

اپنے ضمیر پر غور کریں۔ اور اگر ماننے کی چیز ہے تو مانیں اور برملا اس کا اظہار کریں۔

یہ چند باتیں اس آیت کی روشنی میں مجھے عرض کرنی تھیں خدا جانے کہ میں اس میں کامیاب ہوا کہ نہیں اور آیت کے سلسلہ میں جو مقاصد ہیں وہ پیش ہو سکے یا نہیں؟ مگر بہرحال جو استطاعت تھی وہ چند جملے میں نے عرض کردیئے۔ خدا کرے کہ نافع ہوں۔

اور جب آیت میں آپ غور کریں گے تو یہ باتیں منکشف ہو کر آپ کے ذہن میں گھومیں گی۔ جتنا آپ سوچیں گے اور اتنا انشاء اللہ آپ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور اس سے اچھے نتائج اخذ کریں گے، بہرحال یہ چند باتیں میں نے عرض کردیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق دکھلائے اور باطل کو باطل دکھلائے۔

اللّٰهم ارنا الحق حقاو ارزقنا اتباعا وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابا ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذهديتنا وهب لنامن لدنك رحمةً انك انت الوهاب۔

اللهم انا نعوذبک من الحور بعد الکور

اللّٰهم لاتنزع منا صالح مااعطيتنا ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا في امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا على القوم الكفرين___ (آمین)

۱۴۔ ربیع الثانی ۱۴۰۵ھ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جامع مذہبؐ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ـــــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (پ۶) (صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ)

جامع مذہبؐ

آیت کے ذیل میں دینِ اسلام کو جامع بتلایا۔ یہود و نصاریٰ کی مختلف جزئیات کو پیش کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا کہ دینِ اسلام پچھلے تمام آسمانی دینوں اور ملتوں کا جامع بنایا گیا ہے۔ اس دین میں جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی سختی موجود ہے وہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی نرمی اور درگزر بھی موجود ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہیں اگر کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم بھی ایک تھپڑ مارو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا اگر یہ حکم تھا کہ تمہارے گال پر اگر کوئی ایک طمانچہ لگائے تو تم دوسرا گال بھی پیش کردو۔

دینِ اسلام میں نہ وہ سختی ہے اور نہ یہ نرمی ہے، بین بین کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا

"برائی کا بدلہ برائی لیکن اتنا ہی"۔

اس کی وضاحت دوسری آیت میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ اگر تمہاری کوئی ایک آنکھ پھوڑے تو تم بھی اس کی ایک آنکھ پھوڑ دو، تمہاری ناک پر اگر کوئی ایک گھونسہ مارے تو تم بھی اس کی ناک پر ایک گھونسہ مار دو، تمہارا کوئی اگر ایک دانت توڑ دے تو تم بھی اس کا ایک دانت توڑ دو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاف کردیا جائے تو اس کی بھی اجازت ہے گویا بدلہ لینے کی بھی اجازت ہے اور معاف کردینے کی بھی اجازت ہے۔ اس طرح اس دین میں شریعتِ موسوی بھی آگئی ہے اور شریعتِ عیسوی بھی آگئی۔ متعدد واقعات اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے اس جز کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ جس طرح اسلام سے پہلے مختلف ادیان اور

مختلف شریعتیں جاری تھیں اور آپس میں اختلاف اور عداوتوں کی خلیج روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اسلام نے آکر اختلاف اور عداوتوں کی خلیج کو پاٹا۔ اتفاق و اتحاد پیدا کیا اور تمام اقوامِ عالم کو ایک دین پر جمع کر دیا۔

طبقاتی اِجتماعیّت

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ہندوستان کے تمام مذہبی طبقات بلکہ اُمراء کو صوفیاء کو سلاطین کو وزراء کو غرض ملک میں تمام ہی پھیلے ہوئے منتشر طبقات کو جمع کرنے کی کوشش کی، خطوط روانہ فرمائے۔ پیغامات روانہ کئے اور ملّت کے تمام طبقات کو ایک نقطہ پر جمع فرمایا۔

دارالعلوم کی شانِ اجتماعیّت

یہ دارالعلوم دیوبند بھی اپنے ورث اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے طرز پر قائم کیا گیا۔ دارالعلوم دیوبند سے پہلے ہندوستان میں اہلِ علم کے مختلف طبقے تھے۔ کوئی متکلّم اور کوئی منطقی تھا اور کوئی اہلِ حدیث تھا، کوئی اہلِ قرآن تھا، کوئی فلسفی تھا۔ مگر دارالعلوم کے اکابر، اس کے بانیوں نے ایک ایسا نصاب جاری فرمایا جس سے ملک کے تمام طبقوں میں وَحدت اور یکسانیت بیدار ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند نے سینکڑوں ہی نہیں ہزاروں محدّثین پیدا کئے۔ ہزاروں مفسّرین قرآن اور متکلّم پیدا کئے جنہوں نے دینِ اسلام کی حقّانیت، اسلامی تعلیمات کی نشر واِشاعت دنیا کے گوشے گوشے میں کی۔ دارالعلوم کا فاضل بیک وقت محدّث بھی ہے مفسّر بھی ہے، متکلّم بھی ہے، مبلّغ اور صوفی بھی ہے۔ حق تعالیٰ نے دارالعلوم دیوبند کو ایسی جامعیّت اور مرکزیّت عطا فرمائی ہے کہ اس کے فضلاء دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور دینی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ وہی جامعیّت اور مرکزیّت ہے۔ جس پر شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ملک کے تمام طبقات کو جمع فرمایا۔

وفاقُ المَدارس

دارالعلوم دیوبند نے اجلاس صد سالہ کے موقع پر متعدّد اہم و مفید اور کار آمد تجاویز منظور کرائیں۔ ان تجاویز میں سے ایک اہم تجویز وفاقُ المدارس کی بھی ہے اس تجویز کا مقصد بھی ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام مدارس ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ دارالعلوم دیوبند پہلے سے بنا بنایا مرکز موجود ہے تو اس میں نفع دونوں کا ہے۔ مدارس اور مکاتب کا بھی اور دارالعلوم دیوبند کا بھی، ملک میں پھیلے ہوئے مدارس کی خدمات سے دارالعلوم باخبر رہے گا۔ ان مدارس کے فضلاء اور تعلیم یافتہ حضرات کی شہرت اور ان کی خدمات سامنے آئیں گی۔ مدارس اپنے مرکز دارالعلوم دیوبند کی خدمات، حالات اور کارگزاریوں سے واقف ہوں گے۔ تو یہ وفاق مدارس کی تجویز ایسی تجویز ہے۔ جس کے روبہ عمل آجانے کے بعد فضلاء کی تنظیم بھی قائم ہو جائے گی۔ تنظیم فضلاء نہ تنہا کوئی مقصد ہے نہ اس پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ اصل وفاق المدارس اور تنظیم مدارس ہے۔ اگر ہندوستان کے تمام مدارس اور مکاتب منظم ہو کر اپنے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو جائیں گے تو فضلاء کی تنظیم خود بخود قائم ہو جائے گی کیوں کہ ان مدارس اور مکاتب کے چلانے والے اس کے اساتذہ اور ذمہ دار اکثر و بیشتر فضلاء دارالعلوم ہی ہیں۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اسلام کے تین بنیادی امتیازات
عقل، نقل، استناد اور دعوت کے اُصول

(بعد از خطبہ مسنونہ)

اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ○بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○
ھوالذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ و کفی باللہ شھیدا محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ذالک مثلھم فی التوراۃ و مثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطاہ فازرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعداللہ الذین اٰمنوا وعملوا الصلحٰت منھم مغفرۃ واجرا عظیما ○صدق اللہ العظیم○

تمہید

بزرگانِ محترم! میں نے جو آیت تلاوت کی ہے اس کے ذیل میں چند ضروری گزارشات عرض کروں گا وہ حقیقت میں تقریر نہیں ہوگی' بلکہ ایک درجے میں تفسیر ہوگی اس آیت کی جو میں نے تلاوت کی ہے' اس کے ذیل میں کچھ تشریح و تفصیل پیش کی جائے گی' اسے آپ تقریر کہہ سکتے ہیں۔

ہدایتِ خداوندی

حق تعالیٰ شانہ اپنا احسان واکرام انسانوں پر بے حد فرماتے ہیں اور بہانے بہانے سے فرماتے رہتے ہیں' ان احسانوں میں سے ایک احسان عظیم یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو ہماری ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔ ارشاد ربانی ہے ھوالذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق وہ ذات ہے کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت دے کر بھیجا تو ظاہر بات ہے کہ اس سے بڑھ کر انعام خداوندی اور احسانِ الٰہی اور کیا ہو سکتا ہے کہ راستہ دکھلایا جائے' اچھے اور برے کے اختیار کا طریقہ بخشا جائے۔ حدیث میں ہے کہ سورۃ فاتحہ میں ایک سوال کیا گیا ہے اور اسی لئے اس سورت کو سورۃ مسئلہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سوال ہے اھدنا الصراط المستقیم کہ ہم کو سیدھا راستہ دکھلا دیجئے۔ ہماری رہنمائی فرمایئے۔ بظاہر یہ دعا معمولی سی دعا ہے جب کہ سوال بتانا تھا تو جنت کا سوال' اللہ کی جزاء کا سوال اور دین ودنیا کی بھلائی کا سوال سکھایا جاتا' یہ سوال کہ سیدھی راہ کی ہدایت کر دیجئے ایک عام سی بات معلوم ہوتی ہے' کسی بڑی بات کی درخواست بظاہر نظر نہیں آتی لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخواست تمام دعاؤں کو شامل ہے' اگر سیدھے راستے کی ہدایت ہو گئی تو ہدایت خداوندی بھی حاصل ہو گئی۔ اگر سیدھے راستہ پر چل پڑیں تو دین ودنیا کی فلاح و بہبود بھی حاصل ہو گئی اور آخرت کی دائمی عیش وعشرت بھی تو اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور احسان جتلایا کہ ہم نے اپنے رسول

کو وہی چیز دے کر بھیجا جو تم نے مانگی تھی۔ یعنی ہدایت دے کر رسول بھیجا۔ وہ رہنمائی کرتے' تمہیں راستہ بتلاتے ہیں' شاید کوئی اعتراض کرے کہ ہدایت کا راستہ عقل بھی ہے' ممکن ہے حضور ﷺ نے آکر فرمادیا ہو کہ اپنی عقلوں سے راستہ تجویز کرلیا کرو۔ دنیا میں اچھے برے کا کہ خدا نے تمہیں عقل دی ہے۔ دل میں سمجھ موجود ہے۔ اپنی عقل سے اپنی سمجھ سے تم راستہ تجویز کرلو' اور طے کرلو میں تو یہ ہدایت کرنے آیا ہوں کہ عقلوں کو درست کرلو۔ تو تقاضا بشریت سے یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ ہدایت سے مراد عقلی ہدایت ہے اور اهدنا الصراط المستقيم میں ہدایت مانگنے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی عقلوں کو اُبھار دیا جائے تاکہ وہ اپنے راستے بنالیں لیکن اس شبہ کا رد فرمایا اس ٹکڑے سے کہ ارسل رسوله بالهدى و دين الحق یعنی ہدایت اور رہنمائی دے کر بھیجا اور سچا دین بھی دے کر بھیجا ہے' اس طریقے پر چل کر آدمی فلاح و بہبود کو پہنچتا ہے۔ لہذا دین کے بارے میں محض عقل کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ وحی کی رہنمائی نہ ہو' اس لئے کہ عقل کا دائرہ محسوسات تک ہو کچھ چیزیں آنکھوں سے دکھائی دیتی ہیں کچھ چیزیں سننے میں آتی ہیں۔ کچھ چکھنے میں آتی ہیں' عقل ہی ان کے دائرہ کار میں کام کرتی ہے اور کر سکتی ہے' اس سے بالاتر غیب کی چیزوں میں عقل کام نہیں کرتی ہے اور نہ ہی عالم غیب کی باتوں کا عقل ادراک کر سکتی ہے۔ اس میں ضرورت پڑتی ہے وحی کی علم خداوندی کی' اور مخبر صادق کی' مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقل محض بیکار ہے۔ ایسا نہیں ہے اسلام نے عقل کو اس کا صحیح مقام عطاء کیا ہے۔

عقل اور حواسِ خمسہ

عقل کے بارے میں فرمایا گیا: اول ما خلق الله العقل یعنی اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے عقل کو پیدا فرمایا ہے' اور عقل کی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں' اس لئے عقل کو بے کار نہیں سمجھنا چاہیئے۔ البتہ اس کو اس کے حدود اور اس کے دائرے میں استعمال کرنا چاہیئے۔ جیسے آنکھ میں دیکھنے کی طاقت ہے وہ صرف شکلیں اور صورتیں دیکھ سکتی ہے۔ کانوں میں سننے کی طاقت ہے وہ آوازیں سُن سکتے ہیں۔ ناک میں سونگھنے کی طاقت ہے وہ خوشبو اور بدبو کا ادراک کر سکتا ہے۔ زبان میں چکھنے کی طاقت ہے وہ کھٹے میٹھے کا ادراک کر سکتی ہے۔ ان سب کے دائرے الگ الگ ہیں' اگر آپ یوں چاہیں کہ کان سے خوشبو سونگھ لیں یہ کیسے ممکن ہوگا۔ آپ یوں چاہیں کہ آنکھ سے آوازیں سن لیں تو اس کام کے لئے آنکھ بے کار ہے۔ اس کا دائرہ یہ ہے کہ وہ شکلیں اور صورتیں دیکھے۔ زبان کھٹے اور میٹھے کو چکھتی ہے' آپ چاہیں کہ میں زبان سے خوشبو سونگھ لوں' زبان یہ کر ہی نہیں سکتی کیونکہ اس کا دائرہ نہیں ہے اور یہ حق تعالیٰ کی حکمت ہے کہ یہ سونگھنے' چکھنے اور سننے کی ساری طاقتیں ان تینوں کے اندر رکھ دیں جبکہ ان کا درمیانی فاصلہ بہت معمولی ہے۔ کان بالکل ملا ہوا ہے' آنکھ سے آنکھ بالکل ملی ہوئی ہے ناک سے لیکن ہر ایک کے درمیان میں ایسی سد سکندری حائل ہے کہ کان' آنکھ کے کسی کام میں دخل نہیں دے سکتا اور آنکھ کان کے کسی کام میں دخل نہیں دے سکتی' اور زبان ناک کے کسی کام میں دخل نہیں دے سکتی۔ حالانکہ ناک منہ سے متصل ہے' غرض ہر ایک کا دائرہ الگ الگ ہے' ہر ایک کے

دائرے میں دوسرا دخل نہیں دے سکتا ہے۔ اسی طرح ان سے بالاتر ایک حاسہ ہے عقل کا‘ دیگر حواس اس میں دخل نہیں دے سکتے۔ اگر عقلی کلیات کو آنکھ سے معلوم کرنا چاہیں تو نہیں معلوم کر سکتے کان سے اگر آپ کام لینا چاہیں کہ کلیات میں سے جزئیات نکال دے اور فلسفہ گھڑ لیں تو کان یہ کام نہیں کر سکتا۔

تو گویا حواس جہاں ختم ہو جاتے ہیں عقل کا دائرہ وہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ مگر عقل کا دائرہ مغیبات تک ہے۔ مغیبات پر جا کر عقل عاجز ہو جاتی ہے عقل یہ ادراک نہیں کر سکتی۔ عرش کسے کہتے ہیں۔ عرش کے معنی کیا ہیں؟ کرسی کے معنی کیا ہیں؟ جنت کی کیا صفات ہیں؟ جہنم کی کیا صفات ہیں؟ پل صراط کیسا ہے؟ میدانِ حشر کی کیا کیفیات ہوں گی؟ یہ باتیں عقل کے دائرہ سے خارج ہیں۔ یہ وحی کے دائرہ میں داخل ہیں‘ مخبر صادق آ کر خبر دے کہ اللہ کا عرش ہے‘ ایک کرسی ہے‘ ایک جنت ہے‘ ایک سرکاری مہمان خانہ ہے۔ ایک سرکاری جیل خانہ ہے‘ ایک مجرموں کی جگہ ہے اور ایک مطیعوں کی جگہ ہے۔ اس سلسلہ میں عقل بے کار ہے۔ عقل صرف محسوسات میں کار آمد ہے۔ مغیبات میں وحی خداوندی کام دے گی‘ اور عقل کو اس کے تابع بن کر خادم کی حیثیت سے چلنا پڑے گا۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے ارسل رسوله بالهدى کے بعد ودين الحق کی قید لگائی کہ ہدایت کے لئے اللہ نے اپنے رسول کو بھیجا مگر انسان کو نہیں سونپا کہ جس طرح چاہیں عقل سے تجویز کر لیں بلکہ دینِ حق بھی بھیجا ہے۔ یعنی طریقہ بھی بتا دیا کہ اس دین پر چلو اور یہی دینِ حق ہے۔ اسی پر چل کر تم کامیاب ہو سکو گے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

دینِ حق کی پہچان اور اس کے دو معیار

اب رہا یہ سوال کہ دین حق ہم کس طرح سے پہچانیں‘ کیونکہ دنیا میں تو بہت سے آوازے لگ رہے ہیں‘ ہر قوم مدعی ہے کہ میرا دین حق ہے۔ ہر طبقہ مدعی ہے کہ میرا دین حق ہے تو کوئی معیار بھی ہونا چاہئے کہ جس سے ہم حق و باطل کی پہچان کر سکیں‘ اور پہچان سکیں کہ واقعی دین حق کون سا ہے جو اللہ کا دین ہے تو اس کے لئے دو معیار ہیں ایک درایت اور ایک روایت۔

پہلا معیار روایت

روایت کے لئے سند ضروری ہے کہ دین پیغمبر سے منقول ہوتا ہوا آ رہا ہے اور روایت میں جو رجال ہوں ان کی سند پیغمبر تک متصل ہو کہ اس نے اس سے سنا‘ اس نے اس سے سنا‘ اس نے اس سے سنا۔ غرض سند جا کر ختم ہو جائے نبی کریم ﷺ پر تو جب تک کہ سند نہ ہو گی اور سند کے اندر جو راوی ہیں ان کی صفات معلوم نہیں ہوں گی اور راویوں کے احوال معلوم نہ ہوں گے‘ اس وقت تک سند نہیں چلے گی اور جب سند نہ ہو گی تو روایت نہ چلے گی‘ اور جب تک روایت نہ ہو گی تو اختراع اور قصہ کہانی رہ جائے گی۔ سند متصل کے بغیر دین باقی نہیں رہے گا تو پہلا معیار تو یہ ہے کہ ہم دین کو سند کے ساتھ پرکھیں گے کہ دین پیغمبر سے منقول ہو کر آ بھی رہا ہے یا نہیں یا بیچ میں کسی نے بنا لیا ہے۔ سند کے ساتھ ثابت بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے علماء اور محدثین نے ایک مستقل فن ایجاد کیا ہے اسماء الرجال کا کہ جس میں ان راویوں کے حالات جمع

کئے ہیں۔ ان کا خاندان' ان کا نسب نامہ' ان کا کریکٹر اور کردار کہ جو روایت کرتے آرہے ہیں نبی کریم ﷺ سے تقریباً پچاس ہزار افراد کی تاریخ مدون کی کہ یہ ہیں وہ افراد جو حدیث کے راوی ہیں' قرآن کی روایت تو بہت مضبوط ہے' زیر وزبر کی بھی غلطی نہیں ہو سکتی ہے' ہر زمانے میں ہر ملک میں' ہر علاقے میں بے شمار اور لا تعداد حفاظ موجود رہے ہیں' اگر معاذ اللہ قرآن کریم کے نسخے خرید کر سمندر میں بھی ڈال دیئے جائیں تو اگلے دن پھر قرآن لکھا جائے گا۔ وہ تو سینوں میں موجود ہے بل هو آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم یہ آیات بینات اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ کی گئی ہیں۔ یعنی حق تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کی جگہ وہ تجویز کی ہے کہ جہاں نہ چور پہنچ سکے' نہ ڈاکو پہنچ سکے' نہ کوئی آفت پہنچ سکے۔ اگر آپ کاغذ پر لکھ کر اس کو آگ میں رکھ دیں تو آگ کاغذ کو جلا سکتی ہے۔ اگر کاغذ کو سمندروں کے اندر ڈال دیں تو کتاب اس میں غرق ہو جائے گی اور اگر زمین میں دفن کر دیں تو چند دن کے بعد کاغذ گل جائے گا۔ دیمک لگ جائے گی کاغذ ختم ہو جائے گا۔ ان سب چیزوں کی حفاظت عارضی ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی کتابِ کریم کی جگہ سینوں کو قرار دیا ہے کہ جہاں نہ دیمک پہنچتی ہے نہ چور پہنچتا ہے' نہ ڈاکو پہنچتا ہے' نہ گل سکتا ہے' نہ پھٹ سکتا ہے بلکہ لوحِ محفوظ بنا دیا سینوں کو کہ اس میں قرآن کریم محفوظ رہے اور لاکھوں کی تعداد میں ہر دور میں حفاظ موجود رہے ہیں۔ قرآن کریم کی حفاظت ہے تواتر کے ساتھ اور تواتر بھی طبقے کا اور سب کی سندیں الگ الگ ہیں۔

حفاظتِ قرآن کی ظاہری سند

ہر قاری' ہر مجود کی سند محفوظ ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی سند پیش کر سکتا ہے۔ مثلاً میں ہوں' میں کہتا ہوں کہ میں نے قرآن کو پوری سند کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے پڑھا ہے اور میں اس کی سند بیان کر سکتا ہوں۔ اس طرح پر کہ میں نے قرآن کریم تجوید کے ساتھ پڑھا ہے' حضرت قاری عبدالوحید خان صاحب الہ آبادی سے' انہوں نے تجویز کے ساتھ پڑھا قاری عبدالرحمٰن صاحب مکی سے انہوں نے حفظ اور قرآن کی سند حاصل کی قاری عبداللہ صاحب مکی سے اور قاری عبداللہ مکی نے شیخ محمود مصری سے اور سلسلہ بسلسلہ حضرت ابی بن کعب سے اور حضرت ابی ابن کعب نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضور ﷺ نے حضرت جبرائیل امین سے اور جبرئیل امین نے حق تعالیٰ شانہ سے۔ اس طرح ہر حافظ کی سند ملی ہوئی ہے اللہ کے ساتھ۔ جماعت اور تواتر کا طبقہ تو الگ رہا۔ فرداً فرداً بھی حضرات حفاظ اور مجودین اپنی سندیں پیش کر سکتے ہیں تو قرآن کریم میں غلط ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ سورتیں اس کی گنی ہوئی' رکوع اس کے گنے ہوئے' حروف اس کے گنے ہوئے' زیر اور زبر اس کے گنے ہوئے۔ قرآن کریم جس طرح سے نازل ہوا تھا اسی طرح سے محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا۔ اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرات حفاظ کے سینوں کو منتخب کر لیا ہے' صرف سند ہی پر قناعت نہیں کی گئی' پھر سند کے دو درجے رکھے ہیں- ایک تو وہ ہے کہ حضور ﷺ سے صحابہؓ اور تابعین سے ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے یہ تو ظاہری سند ہے۔

حفاظت قرآن کی باطنی سند

اور ایک باطنی سند ہے کہ حضور ﷺ کی سند اللہ تک پہنچ رہی ہے۔ اس سند میں حضور ﷺ کے اور اللہ کے درمیان ایک راوی ہے' یعنی جبرئیل امین کہ حضور ﷺ نے سنا جبرئیل امین سے اور جبرئیل نے سنا قرآن کو حق تعالیٰ شانہ' سے۔ مروی عنہ جس سے قران کی سند چلی وہ حق تعالیٰ شانہ' کی ذات بابرکات ہے جو ہر عیب سے پاک ہے۔ ہر بُرائی سے بری۔ خدا کہتے ہی اس کو ہیں جو ہر عیب سے منزہ اور مقدس ہو تو جو وہ بات فرمائے گا وہ کیسے غلط ہو سکتی ہے' غلطی کا وہاں امکان ہی نہیں' اس لئے اس میں تو کلام کرنے کی گنجائش ہی نہیں' اور نبی کی ذات وہ ہے کہ اس میں بھی کلام کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ نبی کہتے ہی اس کو ہیں جو سچا ہو' جس میں شائبہ تک نہ ہو جھوٹ کا یا غلط بیانی کا' تو نبی کی ذات بھی مقدس اور اللہ کی ذات تو سرچشمہ مقدس ہے ہی۔ اب رہ جاتے ہیں بیچ والے راوی یعنی جبرئیل امین۔

اوصاف راوی

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو یہ کہہ کر نہیں منوایا کہ جبرئیل ہمارا فرشتہ ہے مانو! اگر نہیں مانو گے تو ہم سزا دیں گے' فرشتہ معصوم ہے' کیا وجہ ہے کہ اس کی روایت پر اعتماد نہ کیا جائے' یہ نہیں کہا' بلکہ جبرئیل کے جو اوصاف بیان کئے وہ ہیں جو ایک راوی میں ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس راوی کو فنی طور پر پرکھ کر قبول کرو۔ اس دباؤ سے مت قبول کرو کہ ہمارا فرشتہ ہے جب یہ لے کر آیا ہے ماننا ہی پڑے گا' نہیں بلکہ جبرئیل کے اوصاف دیکھو! ان اوصاف کے ہوتے ہوئے وہ غلط بیانی کر ہی نہیں سکتے ہیں۔ قرآن کی جو روایت کریں گے وہ سچی کریں گے۔ اسی لئے قرآن نے جبرئیل کے اوصاف بیان کئے بحیثیت راوی کے' سورۃ تکویر میں فرمایا: انه لقول رسول کریم یہ قول جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ رسول کا قول ہے اور ظاہر بات ہے کہ جب رسول کہہ دیا یہ خود دلیل ہے سچے ہونے کی' کیونکہ کئی حکومت اگر کسی کو اپنا قاصد یا سفیر بنائے تو سب سے پہلے یہ دیکھتی ہے کہ یہ اطاعت گزار بھی ہو سکتا ہے یا نہیں' فرمانبردار بھی ہے یا نہیں اور حکومت کی پالیسی کا اول سے آخر تک حامی بھی ہے یا نہیں۔ پالیسی سے ذرہ برابر اسے اختلاف تو نہیں ہے۔ دیگر ممالک میں حکومت کے منشاء کو پورے طور پر سے ادا کرے' اگر سفیر میں ذرا بھی بغاوت یا غلط بیانی کا خیال ہو اور اندیشہ ہو تو حکومت ایسے شخص کو کبھی سفیر نہیں بنا سکتی ہے' اگر سازش سے یا غلطی سے بن جائے تو فوراً ایسے سفیر کو معزول کر دیا جاتا ہے اور سزا دی جاتی ہے۔ سفیر معتمد علیہ ہوتا ہے' اپنی دلیل کے لئے وہ کاغذات لا کر پیش کرتا ہے۔ یہ کاغذات اس کے لئے سند کا درجہ رکھتے ہیں پھر اس کو سفیر تسلیم کر لیا جاتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کسی کو سفیر بنائے اور اس میں ادنیٰ شائبہ بھی بغاوت کا ہو یا ذرہ برابر حکم عدولی کا شائبہ ہو' اول رسول کے لفظ سے ہی صداقت ظاہر ہے کہ جبرئیل نے اللہ کے اس کلام کو پہنچایا ہے تو جب وہ رسول ہیں تو سچ ہی کہیں گے مگر ممکن تھا کہ کوئی یوں کہہ دے کہ رسول تو ہے مگر کیا ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات سے کوئی بزرگی اور بڑائی بھی رکھتا ہو۔ ادنیٰ یا اعلیٰ ہو جیسے چاہے اللہ سفیر بنا کر بھیج دے اس شبہ ہی کو دور کرنے کے لئے

آگے ایک لفظ بڑھایا ہے: ان لقول رسول کریم کہ رسول بھی ہے اور کرامت والا بھی ہے اور اس میں بزرگی کی شان موجود ہے اس واسطے کوئی وجہ نہیں کہ اس کے قول کا اعتبار نہ کیا جائے۔

اول تو ہمارے رسول ہیں اوپر سے کریم النفس۔ دو وصف ہوگئے جو راوی میں ہونے چاہئیں جب ہی اس کی روایت سچی ہو سکتی ہے' پھر ممکن تھا کہ کوئی یوں کہہ دے کہ ہم نے مان لیا رسول ہیں اور کرامت والے بھی ہیں' لیکن ہے بے چارہ کمزور' ذرا کسی نے دباؤ ڈالا جھٹ بات بدل دی۔ اگر ڈرپوک قسم کا آدمی ہوگا تو ذرا سی دھمکی میں ڈر جائے گا اور بات بدل دے گا وہ سچی نہیں کر سکتا۔ اس لئے حق تعالےٰ نے ایک جملہ اور بڑھا دیا ذی قوۃ کہ وہ طاقتور بھی ہے' ڈرپوک نہیں' کمزور نہیں' ایسا نہیں کہ دباؤ ڈال کر جس کا جو جی چاہے کہلوالے۔ وہ وہی کہے گا جو اللہ نے کہلا کر بھیجا ہے۔ تو وہ رسول بھی ہے' کریم بھی ہے' ذی قوۃ بھی ہے' اور طاقتور بھی ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ جبرئیل امین نے حضور ﷺ کے سامنے اپنی طاقت کا ذکر کیا کہ اللہ نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ جب اللہ نے قوم لوط کی بستیاں اُلٹنے کو کہا تو میں نے اپنے ایک ہاتھ پر ان کی ساری بستیاں رکھ کر آسمان کے قریب لے جا کر پٹخ دیا۔ یہ طاقت ہے جبرئیل کی۔ ایک چنگھاڑ ماری اور ایک ڈانٹ دی تو قوم کے کلیجے پھٹ گئے اور ایک آن میں ساری قوم ختم ہوگئی۔ تو کیا ان کی آواز تھی؟ اور کیا ان کی طاقت تھی؟ اس لئے فرمایا کہ قول ہے رسول کا وہ کریم النفس بھی ہے اور طاقتور بھی ہے' لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ دباؤ میں آکر بات بدل دے۔ وہ وہی کہے گا جو مالک نے کہلا کر بھیجا ہے' مگر یہاں ممکن تھا کہ کوئی سوال کرے کہ صاحب مان لیا ہم نے کہ وہ رسول بھی ہے۔ کرامت والا بھی ہے' اور طاقتور بھی ہے۔ ہو سکتا ہے سننے میں غلطی ہو کیونکہ دور سے آواز آرہی تھی۔ معلوم نہیں کہ صحیح سنا یا غلط سنا۔ تو راوی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس سے وہ روایت کر رہا ہو اس سے اس کا سماع ثابت ہو۔ راوی مروی عنہ کے پاس ہو' اگر آپ نے ٹیلی فون پر کہلایا' ریڈیو کے ذریعہ آواز دے دی۔ ایک مشرق میں ہے' آواز دی ہے مغرب میں تو سننے میں غلطی کا امکان قوی ہے کہ بات کچھ ہو اور سنا کچھ اور ہو' اس سے روایت میں شبہ پڑ جاتا ہے' اس لئے جبرئیل کی روایت کو کیسے مانیں گے' اس لئے حق تعالیٰ شانہ' نے ایک جملہ اور بڑھا دیا۔ کہ انہ لقول رسول کریم ذی قوۃ عند ذی العرش مکین "کہ عرش والے کے پاس ہی ان کا مکان اور مقام ہے۔ کہیں دور نہیں اس لئے جو حق تعالیٰ فرمائیں گے وہ وہی سنیں گے۔" اب جس راوی کا سماع بھی ثابت ہو اپنی ذات سے بزرگی بھی رکھتا ہو کیریکٹر بھی اس کا اونچا ہو' خدا کا بنایا ہوا قاصد بھی ہو' طاقتور بھی کہ دباؤ میں آکر بات بدل بھی نہیں سکتا پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روایت نہ مانی جائے' کوئی وجہ نہیں کہ اس پر اعتماد نہ کیا جائے لیکن پھر بھی شبہ کرنے والے تو ہر موقعہ پر شبہ کر ہی گزرتے ہیں کہ کوئی کہے کہ صاحب یہ تو صحیح ہے کہ وہ رسول بھی ہیں۔ کریم النفس بھی ہیں' طاقتور بھی ہیں اور اللہ کے مقرب بھی ہیں' مگر پوزیشن زیادہ بڑی نہیں ہے۔ جیسے اور فرشتے ہیں وہ بھی ایک فرشتہ ہے اور بات مانی جاتی ہے پوزیشن والے

ں جب حیثیت بڑی ہوتی ہے تو بات بھی بڑی سمجھی جاتی ہے' ایک جملہ میں کہوں تو معمولی بات سمجھی جائے
ں اور وہی جملہ پریذیڈنٹ یا وزیر اعظم کی زبان سے نکلے تو دنیا کی سیاست میں انقلاب آ جاتا ہے۔

شخصیت کی وجہ سے گواہی میں بڑائی گواہ سے پیدا ہوتی ہے۔ گواہ اگر اونچے درجے کا ہے تو گواہی اونچی
ہے اور اگر گواہ معمولی درجے کا ہے تو گواہی بھی معمولی درجے کی ہو گی۔ تو ہم نے مان لیا کہ جبرئیل میں ساری
صفتیں موجود ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ مگر کوئی عہدہ یا پوزیشن معلوم نہیں ہوئی جس سے ان کی حیثیت کا
پتہ چلے اس لئے حق تعالیٰ نے ایک جملہ اور بڑھا دیا کہ **انه لقول رسول کریم ذی قوة عند ذی العرش**
مکین مطاع وہ واجب الاطاعت بھی ہیں اور سید الملائکہ ہیں' ظاہر بات ہے کہ تمام ملائکہ کا جو افسر اعلیٰ ہو گا
اور سب پر حکمران ہو جب وہ پیغام لے کر آئے گا تو شخصیت اور پوزیشن کتنی بڑی ہو گی پھر کوئی وجہ نہیں کہ
اس کی روایت کو غلط سمجھا جائے' وہ خدا کی نسبت سے قاصد ہیں اور اپنی ذات سے کریم النفس اور قوی ہیں' اللہ
کا قرب ان کو حاصل ہے سننے میں بھی کوئی غلطی نہیں ہو سکتی ہے اور مطاع بھی ہیں یعنی ذات واجب
الاطاعت ہیں۔ تمام ملائکہ ان کی اطاعت کرتے ہیں سب سے پہلے وحی کو سنتے ہیں پھر ملائکہ میں اس کی
ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وحی خداوندی نیچے اترتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کے قلوب پر وارد ہوتی
ہے وہ بھی جبرئیل لے کر آتے ہیں۔

تو بہر حال بیچ میں راوی ایسا ہے اس میں کوئی کھٹکے کی بات نہیں' جب اتنے اوصاف ان میں جمع ہیں جتنے
ایک راوی کے اندر ہوتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ کوئی وجہ نہیں کہ روایت کے اندر شک و شبہ کیا جائے۔
کوئی وجہ نہیں کہ روایت نہ مانی جائے لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود شبہ ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات بڑا
آدمی بھی اپنے کسی جذبے کے تحت یا کسی وجہ سے امانت داری میں خلل ڈال سکے یا امانت میں فرق آ جائے۔
بہر حال اس واسطے ایک جملہ اور فرمایا کہ **مطاع ثم امین** "کہ وہ امانت دار بھی ہیں۔"

گویا امانت داری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔ خیانت کا کوئی جذبہ ہی نہیں تو ظاہر بات ہے کہ
جب کوئی ایسا راوی روایت کرے کہ خدا کا قاصد بھی ہو' کریم النفس بھی ہو' طاقتور بھی ہو' عرش والے کے
پاس مقیم بھی ہو اور واجب الاطاعت بھی ہو اور اوپر سے امانت دار بھی ہو تو کیا وجہ ہے کہ اس کی روایت کو نہ
سنا جائے' تعصب کی وجہ سے کوئی نہ مانے لیکن عقل سے ممکن نہیں کہ انکار کرے' عقل تو کہتی ہے کہ جب
راوی اتنا اعلیٰ ہے تو مانا جائے۔ مطلب عرض کرنے کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے روایت کو جبراً نہیں منوایا کہ یہ
کہہ دیا ہو کہ چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ چاہے عقل مطمئن ہو یا نہ ہو۔ یہ آرڈر سرکاری ہے' ماننا پڑے
گا۔ نہیں بلکہ فرمایا کہ اوصاف دیکھو کہ فن کے قواعد کے اعتبار سے وہ اس درجے کا ہے یا نہیں کہ اس کی
روایت مانی جائے تو راویوں کے جتنے اوصاف محدثین نے لکھے ہیں اور عقل تجویز کر سکتی ہے ان سب
اوصاف پر پرکھ کر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اب بتلاؤ کیوں روایت قبول نہیں کرتے؟ کیوں روگردانی کرتے ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف

ادھر نبی کریم ﷺ ہیں۔ قرآن خود ان کی ذات بابرکات پر اترا اور آپ ﷺ کا لقب امین ہے۔ حتی کہ آپ ﷺ کے دشمن بھی آپ ﷺ کو امین کہتے تھے۔ دعویٰ نبوت سے قبل تمام عرب آپ ﷺ کو امین کا خطاب دیئے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کہیں بھی تشریف لے جاتے تو لوگ کہتے تھے جاء محمدالامین "امانت والے محمد آگئے۔" کہ جن میں ذرہ برابر بھی خیانت کا شائبہ نہیں ہے تو دشمن بھی جس کی امانت کو مانتے ہوں اس سے زیادہ امین ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ والفضل ماشهدت به الاعداء فضیلت تو وہ ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں کہ واقع اس کے اندر وہ کمال موجود ہے تو حضور ﷺ کی ذات سرچشمہ امانت ہے اور جبرئیل کا لقب بھی امین ہے' یہ لقب تو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور اللہ کے ننانوے ناموں میں ایک نام امین بھی ہے' تو امین سے روایت چلی' امین کے ذریعے آئی اور امین کے اوپر اتری اور روایت خود امانت ہے' تو نیچے سے اوپر تک ساری روایت کو گھیر رکھا ہے امانت نے' جس میں خیانت کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا ہے اور ردوبدل کا امکان بھی نہیں تو پھر نہ ماننے کی کیا وجہ ہے' قرآن کی سند کو حق تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے' اُصول و قواعد پر پرکھ کر مانو۔ زبردستی قرآن کو نہیں منوایا۔ جب کوئی کمی نہیں ہے تو اب تمہارا فرض ہے کہ اس کو مانو اگر نہیں مانو گے تو یہ ہٹ دھرمی ہوگی۔ اس کی آیت کو سمجھو بصیرت سے غور کرو' اس کے اونچ نیچ کو سمجھو۔ صحابہؓ کی شان فرمائی گئی ہے: اذا ذكروا بايات ربهم لم يخروا عليها صما وعميانا "جب اللہ کی آیت ان کے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو وہ اندھے اور بہرے کی طرح سے نہیں گرتے تھے' سمجھ بوجھ کر شنوا اور بینا ہو کر اور بصیرت کے ساتھ قبول کرتے تھے۔"

اس سے عقلیں بھی تسکین پاتی تھیں اور دل بھی تسکین پاتے تھے' جس کو قرآن کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا۔ مقولہ وہ حضور ﷺ کا ہے مگر اس کو نقل کیا حق تعالیٰ شانہ' نے قرآن کریم کے اندر کہ على بصيرة انا ومن اتبعني و سبحان الله وما انا من المشركين میں اور میرے ماننے والے بصیرت پر ہیں' یہ نہیں کہ کوئی رسمی بات میں نے کہہ دی اور انہوں نے رسم بنالی۔ نہیں۔ بلکہ حقیقت کو سمجھ کر تسلیم کیا اور قبول کیا۔ تو اسلام کوئی رسمی مذہب نہیں کہ چند رسوم کے مجموعہ سے کہہ دیا جائے کہ اب ہو گیا۔ مسلمان وہ تو حقائق کا مذہب ہے قلوب انہیں سمجھیں' دماغ اور عقلیں قبول کریں۔ وہ دین فطرت ہے' عقل بھی انکار نہیں کر سکتی' دماغ اور قلب بھی انکار نہیں کر سکتا اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اور میرے ماننے والے بصیرت پر ہیں۔ شنوا اور بینا ہو کر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں احکام بیان کئے گئے ہیں وہاں احکام کے ضمن میں حکمتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ ہر حکم کسی نہ کسی حکمت پر مبنی ہے اور حکمت کسی نہ کسی علت پر مبنی ہے اور ہر علت کسی نہ کسی مصلحت پر مبنی ہے تو ایک سلسلہ ہے احکام کا۔ محض یہی نہیں فرمایا کہ اقيموا الصلوة نماز پڑھو۔ بلکہ نماز کے فوائد' اس کی معنوی حقیقتیں' ظاہر ہونے والے برکات و فوائد

سب کی تفصیل بھی کی گئی ہے کہ یہ فائدہ ہوگا۔ فلاں جگہ سے نماز چلی' فلاں سر چشمہ سے نماز چلی' یہ اس پر ثمرات مرتب ہوں گے' تو ہر حکم کے نیچے کوئی نہ کوئی حکمت اور ہر حکمت کے نیچے کوئی نہ کوئی علت ہے جس پر وہ حکم دائر ہے۔ اسی علت کو سامنے رکھ کر مجتہدین اجتہاد کرتے ہیں اور حق تعالیٰ نے اس امت میں اجتہاد کا درجہ رکھا ہے کہ حکم کی جب علت معلوم ہو جائے جس پر وہ مبنی ہے تو جہاں جہاں یہ علت پائی جائے گی حکم منتقل ہوتا چلا جائے گا۔ چنانچہ قیاس کے ذریعے سے ہزاروں چیزوں کے احکام معلوم ہو جاتے ہیں۔ جب علت جامعہ اور مشترک علت کا پتہ چل گیا تو احکامات کا علم ہو گیا اور علت جامعہ کا پتہ بہر حال اجتہاد سے' عقل سے اور بصیرت سے ہی چلے گا' اس لیے اسلام نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ ہر حکم کو بصیرت کے ساتھ سمجھو۔ تعلیم و تعلم کے ذریعہ' مشائخ کی صحبت اور معیت کی برکات کے ذریعہ کسی حکمت تک پہنچو' اور اس نور معنوی کو حاصل کرو' جس کے ذریعے سے تم احکام کی اونچ نیچ کو سمجھ سکو' تو اللہ تعالیٰ نے ہر حکم میں یہی طریقہ رکھا ہے کہ بصیرت سے سمجھو' اس لئے روایت کو سمجھانے میں فنی اُصول کو استعمال فرمایا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی روایت کو بھی محض اس لئے نہ مانو کہ فرشتہ ہے بلکہ اس لئے مانو کہ رسول بھی ہے' کریم بھی ہے ذی قوۃ بھی ہے' عرش والے کے پاس مقیم ہے' سماع بھی اس کا ثابت ہے' اور ساتھ میں امانت دار بھی ہے تو جب ظاہری اور باطنی تمام اوصاف موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی روایت قبول نہ کی جائے۔

کلام خدا و کلام رسول ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری

بہر حال قرآن کریم کی ایک روایت ہے رسول ﷺ سے لے کر حق تعالیٰ تک' اور ایک روایت ہے رسول ﷺ سے لے کر ہم تک اور آپ تک' تو اوپر کی روایت میں تو ایک ہی واسطہ ہے اور نیچے کی روایت میں درمیان میں واسطے زیادہ ہیں۔ مگر ان کے اوصاف اور کردار منضبط کر لئے گئے ہیں کہ جس سے ہم نے سیکھا اس کا یہ خاندان تھا۔ یہ اس کی عادتیں تھیں' یہ اس کے خصائل تھے' کلام خداوندی تو بجائے خود اس اُمت نے کلام رسول کی وہ حفاظت کی ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ ایک چھوٹا سا حدیث کا جملہ بھی اگر ہے تو اس کی سند اوپر تک موجود ہے کہ حدثنا فلاں قال حدثنا فلاں کہ مجھ سے یہ حدیث فلاں نے بیان کی اس سے فلاں نے بیان کی اس سے فلاں نے بیان کی یہاں تک سلسلہ پہنچ گیا نبی کریم ﷺ تک۔ اس طرح ایک ایک جملہ ہم تک پہنچا ہے۔ کلام خداوندی کے بارے میں تو حق تعالیٰ نے ہی فرمایا تھا کہ **انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون۔** "کہ ہم نے ذکر اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔" لیکن حدیث بھی در حقیقت اللہ ہی کی حفاظت میں چلی آ رہی ہے' جب وحی قرآنی اُترتی ہے تو حضور ﷺ کی عادت کریمہ یہ تھی کہ آپ جلدی جلدی پڑھنا اور رٹنا شروع کر دیتے تھے تاکہ ذہن سے نہ نکل جائے' اور یاد ہو جائے ادھر وحی اتر رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ آپ ﷺ رٹ بھی رہے ہیں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا **لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ** کہ اے نبی! جب وحی آئے تو زبان کو حرکت

مت دو۔ آپ جلدی مت کریں۔ آپ اسی لئے تورٹ رہے ہیں کہ کہیں بھول نہ جائیں' اس کی ذمہ داری لی کہ ان علینا جمعه و قرانه یہ ہمارے ذمہ ہے کہ آپ کے سینے میں جمع بھی کر دیں اور پڑھوا بھی دیں آپ کی زبان سے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضی الیك وحیه آپ جلدی نہ کریں جب تک کہ وحی پوری نہ ہو جائے۔ آپ زبان سے بھی ادا نہ کریں؟ بھولنے کی فکر نہ کریں ہم ذمہ دار ہیں آپ بھول نہیں سکتے' ہم آپ کے سینے میں بھی جمع کر دیں گے اور پڑھوا بھی دیں گے آپ کی زبان سے۔ یہاں تک ہوا قرآن کا بیان کہ قرآن کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے ہم نے ہی اس کو اپنے رسول پر اتار ہے' اب آگے فرماتے ہیں کہ آیت قرآنیہ کی تفسیر کیا ہے' مراد اس کی کیا ہے' اس کو بیان کریں گے اللہ کے رسول اسی کا نام حدیث ہے۔

کلام رسول' کلام خداوندی کا بیان ہے

تو حدیث گویا سب سے پہلی تفسیر ہے قرآن کی' جو چیز اس کے اندر آگئی ہے اس کے بعد پھر کسی کی تفسیر مقبول نہیں اس لئے حدیث کو قرآن کا بیان کہا گیا ہے' کیونکہ کلام رسول نے ہی قرآن کی وضاحت کی اور کھولا ہے' جگہ جگہ قرآن میں فرمایا بھی گیا ہے وانزلنا الیك الذکر لتبین للناس مانزل الیهم ولعلهم یتفکرون۔ ''ہم نے یہ ذکر آپ پر اتارا تاکہ آپ کھول کھول کر بیان کر دیں۔'' کہ اس کی مراد یہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے' پھر جب بیان سے مراد خداوندی واضح ہو جائے تو اسے سمجھو مگر مراد کو بس اپنی عقل سے مت سمجھو۔ بلکہ وحی سے سمجھو۔ جو رسول ﷺ فرمادیں کہ یہ مطلب ہے تو مان لو۔ جب مراد متعین ہو جائے پھر اس میں جتنا تدبر کرو گے علوم کھلتے چلے جائیں گے اور وہ علوم تابع ہوں گے مراد خداوندی کے اور اگر مراد ہی کا پتہ نہیں تو جتنا غور و فکر کریں گے وہ تخیلاتِ نفسانی ہوں گے' اس کا تفسیر سے کوئی تعلق نہیں' وہ خیالات واوہام پراگندہ ہیں' تو حقیقی معنی میں نتائج وہ ہوں گے جو مراد کے تابع ہوں۔ اس لئے لتبین للناس تو رکھا پہلے کہ ہم نے ذکر اتارا تاکہ آپ بیان کر دیں اور دوسر الفظ ولعلهم یتفکرون بیان کے بعد اب مراد متعین ہو گئی' غور و فکر کریں' تدبر کریں' علوم نکالیں' لطائف نکالیں اور وہ لطائف قرآنی قیامت تک ختم نہیں ہوں گے' جن کا وعدہ دیا گیا ہے کہ لاتنقضی عجائبه کہ قیامت آجائے گی مگر قرآن کے عجائبات ختم نہ ہوں گے۔ لطیفے پر لطیفے اور علوم پر علوم نکلتے رہیں گے۔

ہر صحہ پس راست اندر معنی معنی در معنی

چھوٹا سا یہ ایک حکم ہے۔ اس کے اندر غور کرو گے تو ایک اور علم نکلے گا۔ پھر اس میں غور کرو گے تو اس میں سے بھی ایک اور علم نکلے گا' پھر اس میں تدبر کرو گے تو ایک اور علم نکلے گا۔ غرض علوم کا ایک سمندر ہے جتنا جس میں ادراک و قوت ہے غوطہ لگاتا جائے' اس سمندر میں سے جواہرات نکالتا جائے۔ لہذا قیامت تک عجائبات ختم نہیں ہوں گے مگر وہ عجائبات وہی معتبر ہیں جو مراد خداوندی کے تابع ہوں۔ اگر مراد کو آپ عقل سے متعین کرنے لگیں تو عقل کا کام یہ نہیں کہ اللہ کے اندر کی چیز کو معلوم کرلے۔ عقل تو

محسوسات کو معلوم کرے گی اور اللہ کی ذات بابرکات تووراء الوراء ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دو حقیقی بھائی ہیں۔ایک ماں کے پیٹ میں دونوں نے پاؤں پھیلا دیئے ہیں۔وہ دونوں سینے سے سینہ ملا کر بیٹھ جائیں ایک کے دل کی بات دوسرے کے دل میں نہیں جائے گی۔جب تک وہ خود زبان سے نہ بیان کردے۔خواہ وہ دونوں مل کر بیٹھیں اور دونوں ایک ماں کے پوت ہیں مگر ایک کے ضمیر کی بات دوسرے کے ضمیر میں منتقل نہیں ہوگی جب تک خود نہ کہے کہ میرا مطلب یہ ہے تو جب یہ بات ہے کہ ایک ہی نوع اور ایک ہی جنس اور ایک ماں کے دو پوت بغیر بیان کے ان کے دل کی بات نہ کھلی تو اللہ کے بطن میں جو کمالات موجود ہیں' کون بندہ ہے جو ان کمالات کو اپنے دل میں محض اپنی عقل سے اخذ کرلے جب تک کہ وہ خود نہ بتلائے کہ یہ ہے میری مراد تو حق تعالیٰ شانہ' نے جیسے قرآن میں وہ الفاظ نازل فرمائے۔ نبی کریم ﷺ نے کبھی ایسا نہیں فرمایا کہ آیت نازل ہوئی ہو اور آپ غور کررہے ہوں کہ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے اور زمانے کے مطابق یہ بھی ہوسکتا ہے لہٰذا بس یہ تفسیر ہوگئی۔یہ نہیں بلکہ جن معانی کے اندر تعدد ہوتا تھا اور الفاظ کے کئی کئی معانی ہوتے تھے تو آپ وحی کا انتظار فرماتے تھے کہ یہاں پر حق تعالیٰ کی مراد کیا ہے۔خود غور نہیں فرماتے تھے حالانکہ آپ سید العالمین ہیں۔نبی کی عقل سے بڑھ کر کس کی عقل ہوسکتی ہے؟ پوری امت کی عقلیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور تنہا نبی کی عقل ایک پلڑے میں تو وہی پلڑا جھکا رہے گا جس میں نبی کی عقل ہوگی۔

تو آپ جیسے افضل الخلائق ہیں ایسے آپ اعقل الخلائق بھی ہیں کہ سب سے زیادہ عقل کامل حضور ﷺ کو عطاء کی گئی لیکن اس کمال عقلی پر بھی کبھی آپ ﷺ نے مراد خداوندی کو متعین کرنے میں عقل کو استعمال نہیں فرمایا بلکہ انتظار کیا کہ حق تعالیٰ خود کیا فرماتے ہیں کہ میرا مطلب یہ ہے۔ تو اللہ کے کلام کے اندر جو چیز ہے وہ تو اس کے بیان کرنے سے آئے گی۔جو مطلب آپ ﷺ پر واضح ہوا وہ آپ ﷺ نے بیان فرمادیا وہی حدیث ہے۔ تو حدیث درحقیقت بیان ہے قرآن کا اس لئے جیسے قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے اور فرمایا کہ **ان علینا جمعه و قرآنه** "آپ ﷺ کے سینے میں جمع کرنا اور اس کو پڑھوا بھی دینا ہم پر لازم ہے۔"

چونکہ پڑھنے کا تعلق الفاظ سے ہی ہوتا ہے اور معنی پڑھے نہیں بلکہ سمجھے جاتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔اس سلسلے میں آگے فرمایا: **ثم ان علینا بیانه** "پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ اس کے مطالب و مراد کو کھول کھول کر بیان کردیں۔" تو اس لئے مراد کے واضح ہونے میں اللہ ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا کہ آپ کے اس لفظ کا کیا مطلب ہے' وہ اس کی مراد کو اپنے رسول پر کھول دیں گے' وہ پھر امت کے سامنے بیان کریں گے تو جیسے الفاظ خدا کی طرف سے آتے ہیں ایسے ہی معانی و مطالب و مرادات کی حفاظت کی ذمہ داری بھی آگئی ہے اور وہ حدیث ہے۔

تو حدیث درحقیقت بیانِ قرآنی ہے' اگر حدیث کو الگ کردیا جائے قرآن سے اور پھر مراد کو متعین

کر دیا جائے تو وہ اختراعی اور عقلی مراد ہوگی۔ خداوندی ہرگز نہ ہوگی۔ تو بہر حال حدیث سے کٹ کر قرآنی لفظ رہ جائیں گے مگر معانی باقی نہیں رہیں گے۔ وہ حدیث اور سنت ہی سے متعین ہوتے ہیں' کیونکہ قرآن کے جملے تو جامع ہیں وہ تو دستور اساسی ہے' کئی کئی معنی میں عبارت ڈھل سکتی ہے۔ رہی بات یہ کہ کون سے معنی مرادِ خداوندی ہے وہ سنت متعین کرے گی۔

حضرت علیؓ کی جانب سے ابنِ عباسؓ کو استدلال بالقرآن کی ممانعت

چنانچہ حضرت علیؓ نے جب عبداللہ بن عباسؓ کو خوارج سے مناظرہ کرنے کے لئے بھیجا تو کہا کہ ان سے جا کر بحث و مباحثہ کرو اور ان کو راہِ راست پر لاؤ۔ روانگی کے وقت ایک وصیت فرمائی۔ دیکھو خوارج کے سامنے قرآن سے کوئی دلیل پیش نہ کرو۔ دلیل سنت اور حدیث سے پیش کرو۔ تو ابن عباسؓ کو حیرت ہوئی اور عرض کیا کہ امیر المومنین قرآن کریم تو میرا مضمون ہے مجھے اللہ کے رسول نے خاص دعا فرمائی ہے اس کے بارے میں **اللهم علمه الكتاب و الحكمه** "اے اللہ! ابنِ عباس کو کتاب اللہ کا علم اور حکمت عطا فرما۔" تو اس کا علم تو خصوصی طور پر حق تعالیٰ نے مجھے دیا ہے اور اسی سے آپ مجھے روک رہے ہیں کہ میں اس سے دلیل نہ پکڑوں حجت قائم نہ کروں' حدیث اور سنت سے دلیل قائم کروں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ **القران ذو وجوه** یعنی قرآن کی ایک ایک آیت اتنی بلیغ ہے کہ کئی کئی معنی ڈھل سکتے ہیں۔ تم اگر قرآن سے اپنا مطلب ثابت کرنا چاہو گے تو فریق مخالف اسی آیت کا دوسرا پہلو لے کر اپنا مطلب نکالے گا۔ عوام کہیں گے کہ یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں اور یہ بھی قرآن پڑھ رہے ہیں دونوں ہی حق ہیں تو حق اور باطل میں امتیاز نہ ہوگا' لیکن جب کلامِ رسول اور فعل رسول سے دلیل پیش کرو گے تو اس میں دوسرے احتمال کی گنجائش نہیں اس لئے مراد ہو جائے گی متعین' اس سے انکار کرنا ممکن نہیں ہوگا لہٰذا قرآن سے استدلال نہ کرنا حدیث سے کرنا۔

منکرین حدیث کا انجام اور حدیث کا مقام

حدیث کو دراصل ایک بیرسٹر کی سی حیثیت حاصل ہے کہ آدمی قرآن کے اندر اپنے عقلی گھوڑے کتنے ہی دوڑائے۔ حدیث کی موجودگی میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حدیث متن قرآن کے معنی متعین کرتی ہے اور مرادِ ربانی بتلاتی ہے۔ اس لئے عقل زدہ لوگوں کے تیر تکے ہرگز کارآمد نہیں ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قرآن سے اپنی من مانی مرادیں نکالنے کی سعی کرتے ہیں وہ حدیث کا انکار پہلے ہی کر دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مقاصد حدیث کے سامنے کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔ ان کا ذہن یہ ہے کہ حدیث سے انکار کر دو اور بس آزادی مل جائے گی۔ جو مطلب چاہیں گے نکال لیں گے۔ اور منکرین حدیث کا طبقہ مختلف اوقات میں مختلف شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔

ابتداء میں وضاعین حدیث کی صورت میں ظاہر ہوا کہ حدیث گھڑ گھڑا کر ان کو روایتوں میں لانا شروع کیا تا کہ اصلی اور نقلی اور جعلی چیزیں غلط ملط ہوں گی تو اصل کا بھی اعتبار نہ ہوگا مگر اللہ جزائے خیر دے

محدثین کو۔ انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھلا دیا۔ ایسے اُصول بنا دیئے جن سے واضح ہو کہ یہ کلام رسول ہے۔ فن اسماء الرجال بنا دیا' فن مصطلحات المحدثین بنا دیا جو کسوٹی اور معیار ہے کہ یہ حدیث رسول ہے اور یہ حدیث نفس ہے' اس سلسلے میں مستقل کتابیں لکھی گئیں۔

چنانچہ شیخ جلال الدین سیوطی نے اللآلی المصنوعہ لکھی یعنی مصنوع قسم کے موتی ہیں۔ آب و تاب ان کی اچھی ہے مگر حقیقت میں وہ کانچ کے ٹکڑے ہیں۔ تو اصلی حدیث اور نقلی حدیث میں یہ فرق ہے۔ روایت و درایت میں جو کچھ شبہ ہو سکتا تھا محدثین نے حقیقت بیانی سے کام لیا اور وضاعین کے پول کھول کر رکھ دیئے' آج حدیث کی وضع کرنے والوں کا کہیں پتہ بھی نہیں ہے اور حدیثیں اسی طرح جگمگا رہی ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک جگمگاتی رہیں گی۔ مدارس میں اس کی تعلیم جاری ہے' ختم پر اجتماعات ہوتے ہیں اور بڑی شان و شوکت سے یہ مجالس منعقد ہوتی ہیں۔ بعض لوگوں نے حدیث کے انکار کی دوسری شکل اختیار کی کہ الفاظ تو حدیث کے باقی رکھے۔ ان کے انکار کی جرأت ہوئی نہیں مگر معانی کے اندر ردوبدل شروع کر دی کہ یہ معنی نہیں ہیں بلکہ یہ مطلب ہے' اور یہ اس کا مطلب نہیں ہے بلکہ یہ ہے اور کہیں اتنے مطالب بیان کر دیئے کہ جو اصل مطلب تھا وہ اس میں مخلوط ہو کر رہ گیا اور لوگوں کو حق و باطل سمجھنا دشوار ہو گیا۔ اس پر شکریہ کے مستحق ہیں فقہاء و اصولیین کہ انہوں نے قواعد عربیت اور قواعد شرعیہ ایسے منضبط کئے کہ مراد اور غیر مراد کے اندر امتیاز ہو جائے' کسوٹی ہاتھ میں دے دی کہ اس پر پرکھ کر معلوم کر لو کہ حدیث کا یہ مطلب غلط ہے اور یہ صحیح ہے۔ قواعد عربیت کے لحاظ سے اور قواعد شرعیہ کی رو سے یہ مطلب صحیح بنتا ہے اور یہ مطلب نہیں بنتا تو الفاظ کے بارے میں محدثین کی سعی مشکور ہوئی اور معانی کے بارے میں فقہاء و اصولیوں کی سعی مشکور ہوئی۔

قرآن کا لب ولہجہ

قرآن کے اندر جیسے الفاظ و معانی ہیں تیسری چیز لب ولہجہ بھی ہے۔ یعنی بعض مطالب لب ولہجہ سے متعلق ہیں۔ کلام کی بہت سی خصوصیات ہیں کہ لب ولہجہ بدلنے سے وہ بدل جاتی ہیں۔ جیسے کسی لفظ کو متکلم نے ادا کیا۔ اگر ایسے ہی ادا کریں گے تبھی وہ مطلب ادا ہو گا جو متکلم کی مراد ہے۔ مثال کے طور پر میں کہا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان کا ایک جملہ ہے ''کیا بات ہے؟'' آپ لوگ اس جملہ کو ہر روز استعمال کرتے ہیں' اس کے بہت سے معنی آتے ہیں' لب ولہجہ بدلنے سے معانی بدل جاتے ہیں اگر اسے یوں کہیں کہ ''بھائی کیا بات ہے؟'' (استفہامیہ) تو سب کہیں گے کہ سوال کر رہا ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا اور اگر میں یوں کہوں کہ ''کیا بات ہے؟'' (تعظیم کے لئے) اب اس جملے سے آپ بالکل نہیں سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں بلکہ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس سے جملے سے کسی شئے کی بڑائی بیان کر رہا ہوں' اب اگر لب ولہجہ بدل کر یوں کہوں کہ ''کیا بات ہے؟'' (تحقیر کے لئے) تو آپ سمجھیں گے کہ میں کسی چیز کی حقارت بیان کر رہا ہوں' اور اگر لب ولہجہ بدل کر یوں کہوں کہ ''کیا بات ہے؟'' (تعجب کے لئے) آپ اس پر سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کسی شئے پر تعجب کا اظہار کر رہا ہوں۔ تو جملہ ایک ہی ہے' محض لب ولہجہ بدلنے سے استفہام ہو گیا'

تفخیم شان ہو گئی' تحقیر شان ہو گئی' تعجب ہو گیا۔ سارے معانی اس ایک جملے سے نکل رہے ہیں اور لب ولہجہ بدلنے سے معانی بدل جاتے ہیں۔

مان لیجئے اگر یہ جملہ آپ کو خط میں لکھ کر بھیج دوں اور اس کی ادائیگی کا لب ولہجہ آپ کے سامنے نہ ہو تو پھر آپ اس کا مطلب کیا سمجھیں گے؟ اس وقت آپ جو مطلب متعین کریں گے وہ وہ ہو گا جو آپ کے ذہن میں آئے گا۔ جو کیفیت آپ پر غالب ہو گی' وہ اس کا مطلب نکال لے گی' اس سے متکلم کی مراد ظاہر نہیں ہو گی اور یہ ایک دھوکہ اور تلبیس ہو گی کہ الفاظ تو پیش کریں گے متکلم کے اور معنی داخل کریں گے اس میں اپنے اور دھوکہ دیں گے کہ متکلم نے یہ کہا ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ وہ آپ کہہ رہے ہیں متکلم نہیں کہہ رہا ہے اس لئے حق تعالیٰ شانہ' نے فقط قرآن ہی نازل نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ اپنے رسول کو بھیجا کہ لوگوں کو طرز ادا سمجھادیں کہ یہ مطلب نہیں بلکہ یہ مطلب ہے' ورنہ یہ مشکل تھا کہ قرآن کریم لا کر بیت اللہ کی چھت پر رکھ دیا جاتا اور حضرت جبرئیل آواز لگا دیتے کہ اے لوگو! تم سب روحانی بیمار ہو۔ یہ نسخہ شفاء ہے' اسے لے جاؤ' اپنا اپنا علاج کر لیا کرو۔ یہ نہیں کیا بلکہ قرآن بھیجا اور ساتھ میں رسول ﷺ بھی بھیجا تاکہ وہ پڑھ کر سنائے اور لب ولہجہ بتلائیں اور عمل کر کے دکھلائیں تاکہ مراد متعین ہو جائے' اور غیر مراد کا دخل نہ رہے۔ ٹھیک سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ ہی نے کہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قانون تو نازل کر دیا گیا ہو اور شخصیت کوئی نہ آئی ہو یا محض شخصیت بھیج دی گئی قانون کوئی نہ آیا ہو۔ اگر آدم آئے تو دس پارے صحف آدم کے بھی اترے یا محض سیپارے ہی نہیں بھیج دیئے' بلکہ ساتھ میں حضرت آدم علیہ السلام کو بھی بھیجا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تو تورات بھی آئی اور تورات آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی آئے۔ انجیل آئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھیجے گئے' زبور آئی تو حضرت داؤد علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ قرآن آیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو کوئی دور ایسا نہیں کہ محض قانون اُتار دیا گیا ہو مگر شخصیت نہ آئی ہو۔ اس لئے کہ اگر محض قانون اُترتا تو اس میں لوگ عقلیں لڑاتے اور اپنی عقلوں سے مرادیں متعین کرتے اور وہ اللہ کی مراد نہ ہوتی۔ اس پر دین اور غیر دین مخلوط ہو کر رہ جاتا اور مشتبہ بن جاتا اس لئے حق تعالیٰ شانہ نے ہر قانون کے ساتھ ایک شخصیت نازل فرمائی کہ وہ اس کو دکھلائے' چلائے' سنائے۔

قرآن کریم کے اندر حضور ﷺ کے چار فریضے ذکر کئے گئے ہیں۔ **ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ** رسول کو ہم نے چار باتیں دے کر بھیجا۔ سب سے پہلی بات کہ اللہ کی آیات کی تلاوت کرو یعنی حق تعالیٰ نے جو الفاظ آپ کے قلب مبارک پر نازل فرمائے ان کو امانت داری کے ساتھ امت تک پہنچادے کہ یہ قانون کی تعبیر ہے۔ چونکہ میں نے عرض کیا کہ تعبیر بدل جاتی ہے تو معانی بدل جاتے ہیں۔ حقیقت بدل جاتی ہے اس لئے تعبیر ان کی اتنی صاف ہونی چاہئے کہ ذرا بھی گنجلک باقی نہ رہے۔

پہلا فریضہ جب پورا ہو گیا اور الفاظ کی صحیح تلاوت آپ نے فرمائی تو اب دوسری چیز رہ گئی معانی اس کی طرف اشارہ کیا ویعلمھم الکتاب کہ تعلیم کرو کتاب کی' اس سے مراد خداوندی کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرا جملہ فرمایا کہ تعلیم حکمت کی۔ حکمت کے معنی یہاں منطق اور فلسفہ کے نہیں ہیں بلکہ حکمت دو طرح کی ہوتی ہے ایک حکمت نظری اور ایک حکمت عملی۔ حکمت نظری تو تعلیم کے اندر آگئی کہ یہ مراد ہے علمی طور پر سمجھ میں آگئی۔ اب باقی رہ گئی حکمت عملی تو نبی کا کام یہ ہے کہ وہ حکمت کے کام کر کے بھی دکھلائے جس کے کرنے کو کہا ہے اب ظاہر بات ہے کہ مراد کے سمجھنے میں اور متعین ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا اس لئے کہ نبی نے الفاظ بھی سنا دیئے اور معانی بھی سمجھا دیئے' کر کے نمونہ بھی دکھلا دیا۔ اب اس میں گنجائش کیا ہے احتمال باطل کا کیسے پیدا ہو؟

یہی وجہ ہے کہ رسول نے آپ کو آرڈر ہی نہیں دیا کہ صلوا کہ لوگو! نماز پڑھ لیا کرو' نہیں بلکہ یہ فرمایا کہ صلوا کما رایتمونی اصلی نماز پڑھو جس طرح سے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہو' وہی نمونہ اختیار کرو تب نماز بنے گی' تم نے اپنے نمونے سے من گھڑت کوئی نماز اختیار کی وہ خدا کے یہاں معتبر اور مقبول نہیں ہوگی۔ بلکہ آپ نے ہر علم کا عملی نمونہ پیش کر کے بتا دیا کہ یہ کام ایسے ہوگا' اگر جہاد کا حکم دیا تو جہاد کر کے بھی دکھلایا۔ کہ یہ طریقہ ہے جنگ کرنے کا' صلح کرنے کا حکم دیا تو صلح کر کے بھی دکھلائی کہ یہ شرائط ہوتی ہیں صلح کی' معاہدے کئے تو وہ قول ہی سے نہیں بتلایا بلکہ حکومتوں سے معاہدے بھی کئے تو ہر چیز کا نمونہ عملی پیش کر دیا جیسے قرآن جامع ہے تمام علوم کا اور اس کو فرمایا گیا تبیانا لکل شئی ہر دعویٰ مع دلیل کے اس میں موجود ہے۔ اسی طرح عمل کے بارے میں فرمایا لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ عمل کے نمونے اللہ کے رسول کی ذات میں رکھ دیئے گئے ہیں' تو قرآن کریم جامع علوم ہے اور حضور ﷺ کی ذات جامع اعمال ہے جو قرآن کہتا ہے وہ حضور ﷺ کر کے دکھلاتے ہیں اور جو حضور ﷺ کر کے دکھلاتے ہیں وہی قرآن کہتا ہے' تو علم و عمل میں کامل مطابقت ہے' نہ ذرہ برابر کوئی آیت آپ کے عمل کے خلاف ہے' تو میں بعض دفعہ کہہ دیا کرتا ہوں کہ اللہ نے دنیا میں دو قرآن نازل کئے ہیں ایک علمی قرآن جو کاغذات میں محفوظ ہے اور دوسرا عملی قرآن جو ذات بابرکات ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

قرآن کہتا ہے تو آپ عمل کر کے دکھلاتے ہیں' جو آپ ﷺ عمل کرتے ہیں قرآن اس کا مؤید ہوتا ہے تو ایک علمی قرآن ہے اور ایک عملی قرآن ہے' اول آپ نے لفظ پڑھے پھر معانی بتلا دیئے پھر عمل کر کے دکھلا دیا' اس کے بعد ایک چوتھا فریضہ اور ذکر کیا گیا ہے کہ ویزکیھم یعنی ان کے قلوب کا تزکیہ بھی کریں' ذہن سازی آپ کا کام ہے کہ ان کا ذہن بھی وہی بنائیں جو اللہ کے یہاں مطلوب ہے' ذہن کے اندر کجی نہ رہے اور زیغ نہ رہے۔ استقامت پیدا ہو جائے' اتنے سیدھے راستے پر ذہن آجائے کہ اللہ کی آیتیں پڑھی جائیں تو ٹھیک وہی مطلب سمجھیں جو اللہ کی مراد ہو۔ اس میں کج روی نہ ہو۔ چنانچہ صحابہؓ کے قلوب کو مجاہدات اور ریاضتوں کے ذریعہ اور تہجد و ذکر اللہ اور جہاد کے ذریعہ ایسا اللہ کی طرف مائل کر دیا کہ وہی صحابہؓ

جن کے قلوب زمین کی طرف تھے ان کا رخ بدل کر عرش کی طرف کر دیا اسی بناء پر وہ ٹھیک وہی چیز سمجھتے تھے جو حق تعالٰی کے یہاں سے نازل ہوئی تھی۔ جہاں سنا کہ اللہ نے اور اللہ کے رسول نے یہ فرمایا بس ان کے ذہنوں نے قبول کر لیا۔ ذہن سازی بھی اللہ کے رسول کا ہی کام ہے کیونکہ اگر قلب کا رخ سیدھا ہو تو ہر چیز کا سیدھا ہی مطلب سمجھے گا اور اگر قلب کا رخ الٹا ہے تو ہر چیز کا مطلب الٹا ہی نکالنے کی کوشش کرے گا۔ اگر کسی آدمی کے ذہن میں خدانخواستہ نصرانیت راسخ ہو تو اس کو ہر آیت سے نصرانیت ہی نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اگر یہودیت کا اثر ذہن میں ہو تو ہر ہر آیت سے یہودیت نکلتی ہوئی معلوم ہوگی۔ اگر قادیانیت ذہن میں ہے تو ہر ہر آیت سے قادیانیت نکلتی معلوم ہوگی' اس لئے کہ ذہن بنا ہوا نہیں ہے تو محض قرآن کے الفاظ اور معنی اور عمل کا نمونہ کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ ذہن نہ بنا ہوا ہو اور ذہن کو مانجھ کر درست نہ کر لیا ہو تاکہ قلب میں صحیح طور پر کجی اور زیغ باقی نہ رہے قلب کے اندر' یہ چار چیزیں ذکر فرمائی گئیں' جس سے معلوم ہوا کہ محض قرآن کے الفاظ کافی نہیں ہیں' اس کے معانی' لغت اور ادب کے زور سے حل نہیں کئے جا سکتے ہیں' وہ تو روایت کے ذریعے حل کئے جائیں گے۔ لغت سے اگر معانی ہی سمجھ لئے معیار تو نہیں سمجھ سکیں گے' اور لغت مراد خداوندی کو متعین نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے لغوی مطلب کچھ ہو اور عرفی مطلب کچھ اور' ایک وہ شخص ہے جو زبان داں نہیں وہ لغت دیکھ کر زبان دانی نہیں سیکھ سکتا ہے اور نہ ہی بول سکتا ہے' اگر بولے گا بھی تو وہ مطلب نہیں ہوگا جو عوام میں رائج ہے اور معروف ہے قوم کے اندر۔

مثلاً ہمارے یہاں اردو میں ایک محاورہ ہے "سونے پر سہاگہ" لغت میں سو اس کے معنی یہ ہیں کہ سونے کو ہاتھ میں لو اور سونے کو نیچے رکھ کر سہاگہ اس کے اوپر رکھ دو تو سونے پر سہاگہ ہو گیا لیکن یہ مراد نہیں ہے عرف میں' مراد اس سے یہ ہے کہ اگر کسی چیز کی خیر اور بھلائی میں مبالغہ کیا کرتے ہیں تو کہا کرتے ہیں کہ سونے پر سہاگہ۔ یعنی اپنی ذات سے تو سونا تھا ہی اس پر سہاگہ اگر رگڑ دو تو اور چمک جاتا ہے اور اس میں خوب صورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ تو مبالغہ فی الخیر کے لئے یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے' یا کسی کی برائی میں اگر مبالغہ کیا جائے تو ایک محاورہ ہے "کریلا نیم چڑھا۔" اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ کریلا میں دھاگہ باندھ کر نیم پر ٹانگ دو' کریلا اور نیم چڑھا ہو گیا' مگر یہ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ کریلا اپنی ذات سے تو کڑوا تھا ہی نیم پر چڑھنے کے بعد اس میں اور کڑواہٹ بڑھ گئی اور زیادہ برائی پیدا ہو گئی۔ اب جو شخص اردو ماحول میں نہ رہا ہو وہ محض ڈکشنری دیکھ کر بول رہا ہو تو کریلا کو نیم پر چڑھا دے گا اور یہی اس کا مطلب بیان کرے گا اور سمجھے گا اپنے آپ کو کہ بس میں نے اردو کا حق ادا کر دیا' حالانکہ یہ مراد نہیں بلکہ مراد تو اور ہے جسے اہل عرف اور اہل زبان سمجھتے ہیں' تو ایسے محاورے لغت سے حل نہیں کئے جاتے جب تک کہ اہل زبان سے تحقیق نہ کر لے اور ہر زبان میں اس قسم کے محاورے موجود ہیں جن کو خود سمجھتے ہیں لغات سے حل نہیں ہوتے۔

اسی طرح سے قرآن کریم اور حدیث شریف کا بھی ایک عرف ہے۔ اس کو محض ادب دانی اور لغت کے زور سے حل کرنا یہ کافی نہیں ہے جب تک کہ اہل عرف میں رہ کر باقاعدہ اس کی تعلیم حاصل نہ کرے

اور اس لب و لہجہ کو نہ معلوم کر لے یہی وجہ ہے محدثین نے جہاں روایت حدیث کے لفظوں کی نقل کی ہے' وہاں معانی اور کیفیت اور لب و لہجہ کو بھی نقل کیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں مشکوۃ شریف پڑھتا تھا اور مشکوۃ میں نے اپنے والد ماجد سے پڑھی ہے تو جب حدیث آئی غنیۃ النھاج کی۔ یعنی زمانہ جاہلیت میں ایک دستور تھا کہ مرنے والا وصیت کرتا کہ مجھے چھ مہینے رویا جائے۔ مجھے ایک سال رویا جائے۔ اگر ایک دو دن رو پیٹ کر بیٹھ گئے تو سمجھا جاتا تھا کہ کوئی چھوٹا سا آدمی ہو گا لیکن اگر چھ مہینے یا ایک سال روئیں گے تو سمجھا جائے گا کہ کوئی بڑا آدمی گزر گیا کہ چھ مہینے گزر گئے مگر اب تک رو ہی رہے ہیں' تو اس قسم کی وصیتیں کرتے تھے۔ اب ظاہر بات ہے کہ کس کے آنکھ میں اتنے آنسو رکھے ہیں جو وہ چھ ماہ یا ایک برس تک روئے اس لئے رونے والیاں کرائے پر رکھی جاتی تھیں۔ عورتیں چونکہ رونے کی زیادہ مشتاق ہوتی ہیں اس لئے ان کو ہی منتخب کیا جاتا تھا اور ان کا کھانا کپڑا فیس وغیرہ دے دی جاتی تھی اور طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جہاں کوئی اجنبی آدمی آتا معلوم ہوتا' انہوں نے گھیر اڈالا اور رونا شروع کیا کیونکہ مرد تو ذرا اقوی القلب ہوتا ہے اسے دیر میں رونا آتا ہے اور ان عورتوں نے جہاں ارادہ کیا اور پٹ پٹ آنسو گرنے شروع ہو گئے اور واجبلاہ' واشمساہ کہہ کر روتی تھیں کہ تو' تو پہاڑ کے برابر تھا۔ تو' تو سورج کے برابر تھا' سننے والا کہتا تھا کہ بھائی کوئی بڑا آدمی ہو گا مرنے والا جس کو چھ ماہ سے رویا جا رہا ہے اور اس رونے میں وہ ایک عجیب قسم کی لے اور آواز بناتی تھیں جس سے سننے والے کا دل بھی پگھل جائے' تو میرے والد نے جب اس حدیث کو پڑھ کر سنایا تو ایک منٹ تک کچھ راں راں کر کے بتلایا کہ اس طرح رویا کرتی تھیں تو اس پر ہمیں تعجب ہوا کہ اس کی ضرورت کیا تھی کہ اس لب و لہجہ اور اس ہیئت سے کر کے دکھلایا۔ پھر خود فرمایا کہ شاید تمہارے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ میں نے اس رونے کی نقل کیوں اتاری۔ فرمایا کہ میں نے اس لئے یہ نقل اتاری کہ جب میں نے یہ حدیث حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ سے پڑھی تو انہوں نے بھی یوں کر کے دکھلایا تھا اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ جب میں نے یہ حدیث حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ سے پڑھی تو انہوں نے بھی یوں کر کے دکھلایا تھا اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ جب میں نے یہ حدیث حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ سے پڑھی تو انہوں نے بھی یوں ہی کر کے دکھلایا تھا اور انہوں نے کہا کہ جب یہ حدیث میں نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ سے پڑھی تو انہوں نے بھی مجھے یوں ہی کر کے دکھلایا تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ حدیث جب میں نے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تو انہوں نے بھی مجھے یوں کر کے دکھلایا تھا اور سند پہنچا دی۔

راوی حدیث صحابی تک۔ تو فقط الفاظ حدیث میں ہی روایت نہیں کئے بلکہ معانی بھی روایت کئے اور وہ کیفیت' وہ لب و لہجہ' وہ ہیئت بھی روایت کی حدیث میں مستقل روایات ہیں جیسے مسلسلات کی روایت کہ

بعض روایتیں ایسی ہیں کہ ان کو کہتے ہیں کہ یہ مسلسلہ الاولیت ہے اول وہ کام کیا نبی کریم علیہ السلام نے پھر صحابیؓ نے پھر تابعی نے پھر تبع تابعی نے جیسے حدیث مسلسلہ الماء والتمر ہے کہ آپ علیہ السلام نے حضرت علیؓ کو کھلایا' پانی پی کر بچا ہوا پانی بھی انہیں پلایا اور پھر اس کے بعد فضیلت بیان کی کہ جو اس طرح مہمانی کرے کسی کی' اس کے یہ یہ درجات و مراتب ہیں تو حضرت علیؓ کو فقط حدیث ہی نہیں سنائی بلکہ اس پر عمل کر کے دکھلایا۔

حضرت علیؓ کے ایک شاگرد تابعی ہیں۔ انہوں نے اس طرح سے اس حدیث کی اجازت حاصل کی کہ حضرت علیؓ نے کھجوروں کی دعوت کی خود کھا کے انہیں کھلائی' خود پانی پی کر ان کو پلایا پھر تابعی نے اپنے شاگرد تبع تابعی کو اسی طرح سے دعوت دی اور یہ تمام کیفیت کر کے دکھائی اور اجازت دی یہ حدیث مسلسلہ بالاولیت کہلاتی ہے اور یہ مسلسل بالماء والتمر ہے یعنی پانی اور کھجور کے اندر تسلسل کے ساتھ حضور علیہ السلام سے یہ عمل چلا آرہا ہے۔ محض حدیث میں نقل نہیں کی بلکہ وہ عمل بھی نقل ہوتا چلا آرہا ہے جو حضور علیہ السلام نے کر کے بتلایا تھا جس ہیئت کے ساتھ۔

یا دوسری حدیث مسلسل بالمصافحہ ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: **صافحت بکفی ھذا کف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** کہ میں نے اپنی اس ہتھیلی سے حضور علیہ السلام کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھا تو اتنی ملائم اور اتنی چکنی تھی کہ میں نے ریشم میں وہ چکناہٹ نہیں دیکھی' میں نے حریرہ میں وہ نرمائی محسوس نہ کی جو آپ علیہ السلام کے دستِ مبارک میں تھی۔ تو آپ کے شاگرد تابعی نے کہا کہ ہاتھ پھیلایئے اپنے ہاتھ رکھا تو کہا کہ آپ مصافحہ کریں تو مصافحہ کیا اسکے بعد تابعی کے جو شاگرد ہیں تبع تابعی انہوں نے کہا کہ آپ ہاتھ پھیلایئے تاکہ میں مصافحہ کروں تو انہوں نے مصافحہ کیا یہاں تک کہ وہ مسلسل بالمصافحہ حدیث لوگوں تک پہنچ گئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری ہیں انہوں نے مجھے مسلسلات اور حدیث کی تمام کتابوں کی اجازت دی ہے جب میں ان کے پاس پہنچا تو مولانا زکریا صاحب سے فرمایا کہ بھائی مظاہر علوم کے کتب خانہ میں حدیث کی جتنی کتابیں ہوں وہ سب لے آؤ' تو صحاح ستہ' معانید' و مسانید اور اجزاء ساری کتابیں آگئیں۔ حضرت نے تمام کتابوں کی اول اول حدیث مجھ سے پڑھوائی' اور اجازت دے دی' اور بعض کتابوں کی حدیث خود پڑھی اور اجازت دی۔ اسی طرح سے ان دونوں مسلسل بالماء والتمر اور مسلسل بالمصافحہ کی عملی اجازت دی۔ کھجور منگائی خود کھائی مجھے کھلائی' پانی پیا بچا ہوا مجھے پلایا اور پھر حدیث سنائی۔ اس طرح سے حدیث انسؓ میں مصافحہ کیا اور کہا کہ یہ مصافحہ کی سند حضور علیہ السلام تک پہنچ گئی۔ گویا کہ بالوسائط تمہاری ہتھیلی رکھی گئی نبی کریم علیہ السلام کی ہتھیلی مبارک پر پھر حضرت نے اجازت دے دی۔

دارالعلوم میں سلسلہ مسلسلات بالاولیت

چنانچہ دارالعلوم میں یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ صحیح بخاری وغیرہ پڑھنے والے طلباء کو سال کے آخر میں جب سند ملتی ہے تو مجھ سے براہِ راست کہتے ہیں کہ مسلسلات کی بھی سند دو۔ پھر مجھے کھجوریں منگوانی پڑتی ہیں۔ ماشاء اللہ تین سو ساڑھے تین سو کے قریب طالب علم ہوتے ہیں۔ چالیس پچاس روپیہ کی

کھجوریں آتی ہیں اگر میں ایک ایک کھجور کھا کر دوسرے کو کھلاؤں تو میرا پیٹ معلوم نہیں کہاں جائے گا اس لئے میں تو کہہ دیتا ہوں کہ میں صرف چند کھجوریں کھا کر ان تمام میں ڈال دیتا ہوں سب کا یہی حکم ہو جائے گا جو میری کھائی ہوئی کا ہے اور جب پانی پینے کا موقع آتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ اگر ایک ایک گھونٹ بھی پیوں تو تین سو ساڑھے تین سو گھونٹ ہوتے ہیں میرا پیٹ تو خدا جانے کہاں جائے گا۔ اس لئے تھوڑا پانی پی کر بچا ہوا پانی بالٹی میں ڈال دیتا ہوں اور وہ پانی سب کو پلا دیا جاتا ہے تو ان مسلسلات بالاولیت کا ایک سلسلہ جاری ہوتا ہے۔ تو عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ محدثین نے فقط الفاظ ہی کی روایت نہیں یا فقط معانی کی ہی روایت نہیں کی بلکہ ہیئت کذائی کی بھی روایت کی ہے اور لب ولہجہ کی بھی روایت کی ہے اور ان کیفیات کو بھی روایت کیا ہے جو اس حدیث کے سننے کے وقت پیش آئیں تو ظاہر بات ہے کہ حدیث کی وہ حفاظت ہوئی کہ دنیا میں قومیں اپنی آسمانی کتابوں کی بھی وہ حفاظت نہیں کر سکی ہیں جو اس اُمت نے کلام رسول کی حفاظت کی ہے۔

اَز روئے روایت دینِ اسلام اور اس کی ہر بات مستند ہے

دین کو اگر روایت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن مستند اور مکمل، حدیث بھی مستند اور مکمل اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے قلوب میں سند ایک جزو مستقل بن کر داخل ہو گئی۔ حتیٰ کہ آپ فقہ پڑھ لیجئے تو ہدایہ کی سند موجود ہے کہ صاحب ہدایہ سے کس کس نے ہدایہ کو سنا، اور وہ ہم تک کس طریقے سے پہنچی۔ اسی طرح علم کلام کی بہت سی کتابوں کی سند موجود ہے کہ مصنف سے لے کر یہاں تک اتنے واسطوں سے یہ کتاب پہنچی ہے۔ تصوف کے اندر ایک رسالہ قشریہ ہے امام ابو اسحاق اسفرائنی کا، یہ رسالہ تصوف میں بنیادی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ وہ تمام محدثانہ طریق پر ہے اور طرز بیان بھی اس کا محدثانہ ہے۔ حدثنا فلاں قال حدثنا فلاں قال حدثنا جنید یعنی جنید نے یہ فرمایا سلسلہ بسلسلہ ہم تم پہنچ گیا۔ حضرت شبلی رحمۃ اللہ نے یہ فرمایا حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ نے یہ فرمایا اور سلسلہ وار روایت ہم تک پہنچ گئی تو مسلمانوں میں استناد کا عام دستور ہو گیا کہ فن فقہ کی الگ سند، فن عقائد کی الگ سند، حدیث کی الگ سند، اصول کی الگ سند، بے حجت کوئی بات ہی نہیں کہتے ہیں اور یہ کہنا کہ ہم تو اپنے باپ دادا سے سنتے چلے آرہے ہیں یہ کوئی سند نہیں۔ ہاں آپ یہ بیان کریں کہ آپ سے روایت کس راوی نے بیان کی ہے اور اس نے کس سے روایت کی ہے، اس کا کردار کیا تھا کہ روایت کا پتہ چلا ئیں اور مشرکین مکہ سے جب قرآن یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم جو یہ شرک کر رہے ہو۔ یہ سورج اور بت پرستیاں کر رہے ہو اس کی سند کیا ہے؟ کس پیغمبر نے تم کو یہ تعلیم دی ہے؟ ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہ تھا کہ **انا وجدنا اباء نا علی امة وانا علی اثارهم لمقتدون**۔ باپ دادا سے یونہی دیکھتے کرتے چلے آرہے ہیں اس لئے ہم بھی یوں ہی کر رہے ہیں۔ حجت اور سند کچھ نہیں ہے، جس کا جواب قرآن نے دیا ہے۔ **اولو کان اباء هم لایعقلون شیئا ولا یهتدون** یعنی خواہ وہ باپ دادا بے عقل کی ہی باتیں کہیں، گمراہی کی باتیں کہیں پھر تم اسلئے مانو گے کہ باپ دادا نے کہا

ہے' یہ باپ دادا کا کہنا تو کوئی سند نہیں ہے بلکہ یوں کہو کہ خدا نے کہی ہے اور خدا کے رسول نے کہی ہے۔ فلاں سند سے فلاں عالم نے کہی۔ سند حجت ہے تو اسلام نے ان بے سند چیزوں کو رد کر دیا ہے۔

اس لئے میں عرض کر رہا تھا کہ روایت دین کے حق و بطلان کے پرکھنے کا پہلا ذریعہ ہے۔ تو پرکھ لیا اس بات کو کہ دین ثابت ہے تو حق تعالیٰ کا شکر و فضل ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں مستند دین موجود ہے۔ اسلام قصے اور کہانیوں کی صورت میں نہیں آیا بلکہ سند اور روایت کے طور پر آیا ہے اور اللہ کے رسول تک سند متصل موجود ہے۔ آپ مدارس کے اندر پڑھاتے ہیں اور سند دیتے ہیں' اس سند ہی سے تو آپ پہچانتے ہیں کہ یہ واقعی عالم ہے' یہ نہیں کہ جو محض مطالعہ کر کے آجائے اس کو آپ عالم کہہ دیں یا صرف اوراق دیکھ کر آجائے اس کو آپ عالم کہہ دیں' ایسا نہیں۔ وہ مستند نہیں ہے بلکہ آپ عالم کی نسبت پوچھتے ہیں کہ علم آپ نے کن مشائخ سے حاصل کیا؟ ان کا طریق کیا تھا؟ ان کے کردار کیا تھے پھر ان کے مشائخ کا کیا کردار تھا؟ اس طرح سے آپ سند دیتے ہیں۔ اب سند سے ہی پہچانا جاتا ہے کہ واقعی عالم ہے' آپ کسی عالم کو کتاب سے نہیں پرکھتے ہیں' آپ نہیں کہتے کہ فلاں صاحب نے مطبع مجتبائی کی بخاری میں پڑھا تھا' اس لئے وہ اچھا اور دوسرے نے اس کتاب میں پڑھا تھا جس کے حروف اچھے نہیں تھے اس لئے وہ اچھا عالم نہیں ہے۔ کتاب سے کسی عالم کی بڑائی یا چھوٹائی نہیں پہچانی جاتی ہے بلکہ سند سے پہچانتے ہیں کہ اس کے مشائخ کا طبقہ کس درجے کا تھا۔ اگر آپ کہیں کہ میں شاہ ولی اللہ رحمۃ کی جماعت میں سے ہوں تو اس کی وقعت ہوگی اور اگر آپ کہیں کہ میں نے تو خود مطالعہ کر لیا تھا اس کا مطلب یہ کہ کوئی سند نہیں ہے اور آپ مستند نہیں ہیں۔

علم نبی کریم کی وارثت ہے

علم تو نبی کریم ﷺ کی وراثت ہے جس کو آپ نے فرمایا کہ **ان الانبیاء لم یورثوا دینارا ولا درهما** حضرت انبیاء جب دنیا سے جاتے ہیں تو وہ روپیہ یا اشرفی چھوڑ کر نہیں جاتے اپنے ورثہ میں **ولکن ورثوا العلم** بلکہ وہ ورثہ چھوڑ کر جاتے ہیں علم کا' معرفت الٰہی کا۔ اخلاقی کمالات کا' غیبی علوم کا' یہ انبیاء کی وراثت ہوتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ وراثت دنیاوی میں مال و دولت جبھی دیا جاتا ہے کہ نسب نامہ ماں باپ سے ملا ہوا ہو گا اگر کسی کا باپ ہی ثابت نہ ہو تو وراثت کیسے مل جائے گی؟ اسے کبھی بھی وراثت نہیں مل سکتی ہے' اب ثابت کرنا پڑے گا' میں فلاں کی اولاد ہوں' اس وقت وراثت میں حصہ ملے گا' اور اس کو پہلے اس کے باپ سے ملا ہے اس کو بھی ایسے ہی ثابت کرنا پڑا تھا الی آخر النہایہ' تو جیسے مادی وراثت میں نسب کی ضرورت پڑتی ہے ایسے ہی روحانی وراثت میں نسب کی ضرورت پڑتی ہے کہ میرے اساتذہ فلاں ہیں ان کے اساتذہ فلاں ہیں اور سند پہنچ گئی نبی کریم ﷺ تک جو ہمارے مورث اعلیٰ ہیں' جہاں سے یہ علم چلا ہے اور یہ ورثہ ہم تک پہنچا ہے' ہم اس علم کے موجد نہیں مخترع نہیں بلکہ ہم تو ناقل ہیں جیسا ہم نے سنا اپنے اکابر سے ویسا ہی ہم نے نقل کر دیا' مگر سنا محبت کے ساتھ دلائل عقلیہ و نقلیہ کے ساتھ' اب دوسروں تک اس علم کو پہنچائیں گے' یہ ہمارے گھر کی چیز نہیں ہے کہ اسکو ہم اپنے گھر میں رکھیں' ہم نے دوسروں سے سیکھا ہے اور دوسروں کو

سکھائینگے۔ یہ ورثہ ہے نبی کریم ﷺ کا اور وراثت کیلئے سند کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے دین میں بھی سند کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کے ہاتھ میں مستند دین موجود ہے

آج تو بحمد اللہ مسلمانوں کے پاس سند موجود ہے، وہ قرآن کی دعوت دیں گے تو مستند طریق پر دیں گے، وہ ہدایہ اور درمختار کے مسائل بیان کریں گے تو سند دیں گے کہ فلاں نے فلاں سے یہ کتاب سنی اور فلاں نے فلاں سے اور سند پہنچ گئی۔ ان مسائل کی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تک تو اسناد کے ساتھ جب دین ہوتا ہے تو وہ ماننے کے قابل ہوتا ہے اور جس دین کی کوئی سند نہیں وہ ماننے کے قابل نہیں ہوتا۔ علماء نے لکھا ہے کہ **لو لا الاسناد لبطل الدين** اگر اسناد نہ ہو تو دین باطل ہو جاتا ہے، جس کا جو جی چاہے کہہ بھاگے، ہم تو حجت طلب کریں گے کہ تم نے یہ دین کہاں سے حاصل کیا ہے۔ قرآن کا یہ مطلب کس حدیث سے لیا ہے۔ کس فقیہ سے سنا؟ کس امام مجتہد سے لیا ہے، اگر حوالہ صحیح ہے تو ماننے کے قابل اور اگر حوالہ صحیح نہیں تو ہم کہیں گے کہ تمہارے نفس کا اختراع ہے، یہ ہم پر ماننا کب ضروری ہے؟

بہر حال اصل چیز دین میں سند اور استناد ہے۔ اسی بناء پر آج مسلمانوں کے ہاتھوں میں مستند چیز موجود ہے جو دنیا کی کسی قوم کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ دنیا کی تمام اقوام کو یہ مستند دین پہنچائیں کوئی دوسری قوم جرأت نہیں کر سکتی ہے کہ ہمیں وہ اپنا دین پہنچائے، اس لئے کہ ان کے پاس اس کی سند موجود نہیں ہے۔ اس کے بارے میں پوچھیں کہ تم نے تورات سے روایت بیان کی ہے اس کی کیا سند ہے؟ اس کے راوی کون ہیں؟ روایت کہاں سے چلی؟ کس طرح سے چلی؟ کہیں سند موجود نہیں، انجیل کی کوئی سند موجود نہیں، درجنوں انجیل ہیں مگر تمام کی تمام اختراعی ہیں۔ ہر زمانے میں نئے سے نیا ترجمہ انجیل کا ہوا اور ان تراجم میں اختلاف و نزاع ہے۔ تو پہلا سوال یہی ہو گا کہ وہی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ پر اتری تھی یا کوئی دوسری ہے، اگر وہی ہے تو سند لاؤ۔ اس کی سند وہ قیامت تک بھی پیش نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ دنیا میں کسی مذہبی کتاب کی سند موجود نہیں بجز قرآن کے، اس واسطے اسی کا حق ہے کہ دنیا کی اقوام کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ مستند دین ہے۔

مسلمان دنیا میں لینے کے لئے نہیں بلکہ کچھ دینے کے لئے آیا ہے

مسلمان دنیا میں سائل بن کر نہیں آیا کہ دنیا کی قوموں سے بھیک مانگے، یہ تو دینے کے لئے آیا ہے کہ دنیا کی قوموں کو امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر کرے، وہ اللہ پر ایمان لائیں گے اور تمہارے ہاتھ میں سند موجود ہے۔ کتاب اللہ کی بھی کہ تم نبی تک سند پہنچا کر پیش کرو گے کہ یہ ہے مستند چیز، اسے قبول کرو، اب مسلمانوں کا کام یہ رہ گیا ہے کہ دنیا کی دیگر اقوام کے پاس بھیک مانگتے پھرتے پھر رہے ہیں، حالانکہ دین ان کے پاس مستند موجود ہے اور ہر مشکل کا علاج ان کے پاس موجود ہے، مگر پھر بھی کسی قوم سے تمدن کی بھیک مانگ رہے ہیں، کسی سے معاشرت کی، کسی سے رہن سہن کی، اس لئے ہماری مثال ایسی ہو گئی ہے

جیسے مولانا رومی نے کہا ہے

چوں یک بسد برنہ ترا درخرق شئے
تو ہمیں جوئی بسینہ دربدر!

”ٹوکرا بھرا ہوا سر پر روٹیوں کا رکھا ہوا ہے اور گھر گھر بھیک مانگتے پھر رہے ہیں کہ خدا کے لئے ہمیں ٹکڑا دے دو۔“

اس بے غیرتی کی بھی کوئی انتہا ہے کہ اگر گھر میں موجود ہے، سر پر ٹوکرا رکھا ہوا ہے، اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ ہاتھ اونچا کر کے اس میں سے نکال لیں، ہاتھ نیچا کر کے دوسروں کے سامنے تو پھیلا رکھا ہے، وہ اپنی حیثیت کو بھول گئے ہیں مسلمان دنیا میں بھکاری بن کر نہیں آیا بلکہ دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے اور دے گا وہی چیز جو اس کے پاس ہے دوسروں کے پاس نہیں ہے، اگر آپ دنیا دینا چاہیں تو دنیا آپ سے زیادہ دوسروں کے پاس موجود ہے۔ سونا چاندی دینا چاہیں تو وہ بھی دوسری اقوام میں زیادہ موجود ہے۔ کوٹھی بنگلہ دینا چاہیں تو وہ بھی دوسری اقوام میں ہم سے زیادہ موجود ہے۔ آپ وہ چیز دیں جو آپ ہی کے پاس ہے دوسروں کے پاس نہیں ہے، اور وہ مستند دین کہ دنیا اور آخرت کی بہبود کا یہ طریقہ ہے جو تم میں کسی کے پاس نہیں اور اس کو ہم پیش کرتے ہیں تم قبول کرلو۔

ہر مرد مسلم کو اپنے ازم کی دوسروں کو دعوت دینی چاہیئے

آج دنیا میں ہر شخص اپنے مشن کی دعوت دے رہا ہے۔ کمیونسٹ دعوت دے رہے ہیں کمیونزم کی اور سوشلسٹ دعوت دے رہے ہیں شولزم کی، کیپٹلسٹ عوت دے رہے ہیں کیپٹلزم کی۔ آخر یہ اسلام کا ازم بھی آپ کے سپرد کیا گیا ہے، آپ کو بھی ضرورت ہوتی ہے کہ دعوت دیں دنیا کے ہر باطل سے باطل مذہب کی دعوت چل رہی ہے، دعوت تو چلانا آپ کا فرض ہے جس طرح اور ازم دنیا کے سامنے آرہے ہیں مگر جب دنیا کو سکون ہوگا، اسی اسلامی ازم سے ہوگا، نہ کہ کمیونزم سے، نہ کیپٹلزم سے اور نہ سوشلزم سے ہوگا اور سب بناوٹی اور رد عمل ہے اور رد عمل کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی، جو معتدل راستہ ہے وہی ازل سے قائم ہے وہ باقی رہنے والا ہے تو ہر مسلم کا فرض ہے خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہتا ہو کسی بھی نسل سے تعلق رکھنے والا ہو کہ اپنے ازم کو دنیا کے سامنے پیش کرے میں تو طلبہ سے عرض کیا کرتا ہوں کہ بھائی مدارس میں آکر تعلیم پانا فرض ہے اور بہت ضروری ہے لیکن تعلیم پانے کے بعد صرف یہی مقصد ہو کہ یہ کتاب دوسروں کو پڑھا دیں کافی نہیں تو یہ ایک محدود حلقہ ہو گیا۔ آپ نے ایک سے پڑھا دوسروں کو پڑھا دیا یہ تو بنیادی چیز ہے اس کے بغیر تو کام چلے گا نہیں لیکن اس پر قناعت نہیں کرنی چاہیئے بلکہ دعوتِ الی اللہ کا جذبہ عام ہونا چاہیئے اور اس کا ڈھنگ یہ نہیں ہے کہ آپ ہر ایک سے یوں کہیں کہ تم مسلمان بن جاؤ بلکہ اس کے مختلف طریقے ہیں۔

دعوت الی اللہ کے مختلف طریقے...... بذریعہ طب

جس طریقے سے بھی انسان متاثر ہو اس کو اسی طرز سے دعوت الی اللہ پیش کرنی چاہیئے۔ کہیں حکمت سے دعوت دی جاتی ہے، کہیں احسان و سلوک کے ذریعہ دعوت پیش کی جاتی ہے۔ انسان متاثر ہو کر خود دعوت قبول کرے گا۔ صحابہؓ نے کتابیں پڑھا کر دعوت نہیں دی۔ کتاب پڑھانے کا الگ مخصوص طبقہ تھا اور مخصوص طبقے کے لئے تھا اور دعوت الی اللہ میں کتاب نہیں وہاں تو حکمت کام آتی ہے۔ بعض حضرات نے طب کے راستے سے دعوت دی کہ معالجات کرتے ہوئے گزرے اور دعوت دیتے رہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ مریض طبیب سے متاثر ہوتا ہے اور جانتا ہے یہ میرا محسن ہے، اس تاثر کو اطباء نے دین کی باتیں سکھلانے میں استعمال کیا ہے۔ اس طب کے ذریعے سے ہی لاکھوں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

تجارت کے ذریعہ دعوت الی اللہ اور چین میں اسلام کا ورود مسعود

بعض نے تجارت کے ذریعہ دعوت الی اللہ دی ہے۔ اپنی تجارت کرتے اور لوگوں کے ساتھ وہ معاملات اختیار کرتے جو اسلام نے سکھائے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ انسان حسن معاملہ سے بہت متاثر ہوتا ہے اسی لئے تجار نے اسی پیشے کے ذریعہ لاکھوں کو داخل اسلام کیا اور دعوت الی اللہ کی خاطر صحابہؓ آپ ﷺ کے وصال کے بعد پوری دنیا میں پھیل گئے۔ چنانچہ تاریخ میں ہے کہ آٹھ صحابہؓ بغرض دعوت الی اللہ تجارت کی لائن سے کسی علاقے میں گئے، وہاں جا کر انہوں نے اپنا سلسلہ شروع کر دیا۔ معاملات کی سچائی اور دیانت کی وجہ سے ان کے بازاروں کو اس درجہ فروغ ہوا کہ دوسری سب دکانیں ٹھپ پڑ گئیں۔ ملک کے تجار کو حسد ہوا کہ یہ غیر ملکی لوگ کہاں سے آگئے کہ ہمارے سارے بازاروں پر انہوں نے قبضہ کر لیا، یہاں سے ان کو نکالنا چاہیئے۔ حکومت سے درخواست کی کہ صاحب یہ چند غیر ملکی ہیں، ہمارا کام انہوں نے چوپٹ کر دیا ہے، آپ انہیں ملک سے نکال دیں۔ حکومت وقت نے انہیں بلایا اور کہا کہ تم ہمارے ملک کو کیوں تباہ کرنے آگئے ہو۔ انہوں نے کہا کہ تباہ کرنے کے لئے یا آباد کرنے کے لئے؟ تباہ تو تمہارے ملک والوں نے کر رکھا تھا، چوری سے، بددیانتی سے، ہم نے امانت داری، دیانت داری اور معاملات کی سچائی سکھلائی تو پورے ملک پر اثر پڑا۔ اس لئے ہم تو آباد کرنے کے لئے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں آپ چلے جائیے، ان حضرات صحابہؓ نے کہا کہ اگر ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو آپ بتلائیں ہم برملا اقرار کریں گے، اگر آپ بے وجہ نکالنا چاہتے ہیں تو ہم پوری حکومت کو چیلنج دیتے ہیں کہ ہم نہیں نکلیں گے۔

یعنی آٹھ آدمی حکومت وقت کو چیلنج دے رہے ہیں۔ حکومت نے کہا کہ نہیں۔ بہر حال آپ چلے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ آپ حجت بیان کریں یا خطا بیان کریں، اگر واقعی خطا ہو گئی ہے تو ہم اقرار کریں گے، نہیں ہوئی تو ہم جواب دیں گے، لیکن یہ جو آپ نے آرڈر دے دیا ہے ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ ملک تو خدا کا ہے کوئی نکال نہیں سکتا ہے۔ پھر جب انہوں نے سختی کر کے کہا کہ نکلو، یہ خبر پورے

علاقے میں پھیل گئی، اس پر سب لوگوں نے مطالبہ کیا کہ یہ اگر نکلیں گے تو ہم بھی سارے ان کے ساتھ ہی نکل جائیں گے۔ ہم بھی اس ملک میں رہنا نہیں چاہتے، اس لئے کہ ان صحابہؓ کے اثرات ان پر قائم ہو چکے تھے۔ اس لئے سب کے سب ان کی طرف ہو گئے۔

اب وزراء نے بادشاہ سے کہا کہ حضور آپ کس کو نکال رہے ہیں؟ وہ تو حکومت ہی جا رہی ہے، آپ کا سارا ملک ان کے ساتھ جا رہا ہے۔ تب جا کر مجبوراً حکومت کو جھکنا پڑا اور کہا بھائی تم اپنی دکانیں بازار میں اسی طرح قائم رکھو، ان ہی حضرات کے طفیل اس علاقے میں کروڑوں مسلمان آج بھی موجود ہیں۔

مؤرخین کی ہدایت کے مطابق وہ علاقہ چین کا ملک ہے۔ تو آدمی اگر دعوت الی اللہ کا جذبہ رکھے تو دکان پر بیٹھ کر بھی دعوت دے سکتا ہے۔ سرکاری دفاتر میں بیٹھ کر بھی دعوت دے سکتا ہے۔ طب کی لائن سے بھی دعوت دے سکتا ہے اور دوسری راہیں ہزاروں ہیں حکمت کے ساتھ دعوت دی جاتی ہے۔

خیر خواہی اور خدمت خلق بھی ذریعہ ہے دعوتِ الی اللہ کا

ایک یونیورسٹی میں اوپر کی جماعت میں چودہ پندرہ لڑکے غیر مسلم تھے اور ایک لڑکا صرف مسلمان تھا اور وہ بھی بے چارہ غریب، کم گو اور صوفی منش۔ اس کو انہوں نے اپنی مجلس کا مسخرہ بنا رکھا تھا۔ کوئی پھپتی گسنی ہوتی تو اس پر کسی جاتی، کوئی جملہ کسنا ہوتا تو اس پر کس دیا جاتا۔ رات دن اس کو پریشان کیا کرتے تھے اور وہ بے چارہ صبر کرتا، ایک لفظ نہ بولتا۔ یہ لوگ مسخرہ پن کرتے رہے ادھر صبر ہوتا رہا۔ خدا کی قدرت ان میں جو سب سے زیادہ رئیس اور امیر نوجوان لڑکا تھا وہ بیمار پڑا اور اتنا شدید بیمار ہوا کہ جینے کی توقع نہ رہی تو اب سب لڑکوں نے اس کو چھوڑ دیا اور اسپتال میں داخل کر دیا، اس مسلمان لڑکے نے خدمت شروع کی اس لئے کہ اس کا اور اس کا کمرہ بالکل بالکل قریب قریب تھا، اگر رات کے بارہ بجے دوا دینی ہے تو ٹھیک اسی وقت اس کے پاس دوا لے کر حاضر، اگر ڈاکٹر نے کہا کہ ایک بجے اس کو دودھ پلایا جائے تو ٹھیک اسی وقت دودھ دیا جاتا تھا۔ خدمت کرنے میں دن اور رات ایک کر دی۔ پندرہ بیس روز کے بعد وہ اچھا ہو گیا۔ اب وہ ہاتھ جوڑ کر اس مسلم نوجوان کے سامنے بیٹھ گیا کہ تم کوئی بھگوان معلوم ہوتے ہو اور خدائی روح تمہارے اندر کام کر رہی ہے، ہم نے تمہارے ساتھ یہ مسخرہ پن کیا اور تم نے یہ خدمت کی، خدا کے لئے ہمارا قصور معاف کر دو اور جتنے اس جماعت میں لڑکے تھے سب جمع ہو گئے اور سب نے کہا کہ ہمارا قصور معاف کر دو۔ ہم نے کمینہ پن کیا اور رذالت کی اور تم نے شرافت نفس کا ثبوت دیا۔ ہم نے تم پر پھبتیاں کسیں، تم نے صبر کیا اور اتنی خدمت انجام دی یہ کام کسی اونچے ہی آدمی کا ہو سکتا ہے اور پھر پوچھا انہوں نے کہ یہ باتیں تم نے کہاں سے سیکھی ہیں؟ اس نے کہا کہ میرے مذہب نے سکھلائی ہیں۔ کہنے لگے کہ اس مذہب کی تلقین ہمیں بھی کرو۔ انہوں نے اسلام کے کلمے بیان کرنا شروع کر دیئے اور اس کے فضائل بھی بیان کئے تو ان میں سے بہت سے اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔

اس لئے میں کہہ رہا تھا کہ خدمت کا راستہ بھی اسلام پھیلانے کا ہے اور دیگر مختلف طریق ہیں دعوت الی اللہ کے، جذبہ دل میں ہوتا ہے، تو کچھ نہ کچھ دعوت چلتی ہے اور کارگر بھی ہوتی ہے۔

حکمت کے ساتھ دعوت الی اللہ کی پیشکش

ہمارے مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ کے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد صاحب رحمۃ اللہ کے مریدین میں سے حاجی عبدالرحمٰن صاحب میواتی تھے۔ صرف حافظ قرآن تھے، زیادہ لکھے پڑھے آدمی نہ تھے مگر صاحب نسبت اور ذاکر وشاغل بھی تھے، ہر وقت ذکر اللہ ان کی زبان پر جاری رہتا تھا اور قلب میں ایمانی کیفیات رچی ہوئی تھیں۔ تقریباً ایک ہزار غیر مسلموں کو انہوں نے دائرہ اسلام میں داخل کیا حالانکہ ایک حرف بھی لکھنا نہیں جانتے تھے۔ کچھ ڈھنگ بولنے کا ایسا تھا کہ دوسرا آدمی خواہ مخواہ مائل ہو کر اسلام قبول کر لیتا تھا۔ یہ ان کے قلب میں ایک حکمت تھی۔ ان کی موجودگی میں میوات کے علاقے میں ایک سادھو آ گیا۔ وہ ہندو تھا، ریاضت و مجاہدے بہت کئے ہوئے تھے، وہ کچھ کرشمے اور خوارق عادات بھی دکھلاتا تھا۔ لوگوں میں اس کی کافی شہرت ہو گئی۔ ان کا جی چاہا کہ اس کو دائرہ اسلام میں داخل کریں، تو حاجی صاحب اس کے یہاں پہنچ گئے۔ اس نے حاجی صاحب کا ادب واحترام کیا کیونکہ قوم کے سردار کا احترام واعزاز کیا ہی جاتا ہے اور اس کے اخلاق بھی اونچے ہوتے ہیں۔ اس نے کہا حاجی صاحب کیسے تشریف لائے! حاجی صاحب نے کہا کہ آپ کو دیکھنے کے لئے آ گیا ہوں۔ اس کے بعد حاجی صاحب نے اس کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کی تمہید شروع کی اور کہا کہ سادھو جی! آپ تو بڑے باکمال معلوم ہوتے ہیں، آپ سے تو کرشمے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ مالک کی دین ہے، میں کیا چیز ہوں؟ حاجی صاحب نے کہا نہیں صاحب آپ تو بڑے باکمال ہیں، ہر ایک میں ایسا کمال نہیں ہو سکتا ہے جو آپ کے اندر ہے۔ جب خوب تعریف کر لی پھر اس کے بعد کہا کہ یہ کمال آپ کو کس طرح حاصل ہوا؟ اس نے کہا کہ میرا ایک اصول ہے کہ جس چیز کو میرا جی چاہا میں نے وہ نہیں کیا، ہمیشہ میں نے جی میں آئی ہوئی چیز کے خلاف کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جی پر مجھے قابو ہو گیا اور اب میرا نفس اور دل میرے تابع ہیں۔ میں اس کے تابع نہیں ہوں، یہ مشق کی میں نے۔ حاجی صاحب نے کہا کہ واقعی آپ نے تو اصول اختیار کیا، اسی مجاہدہ کا نتیجہ ہے کہ آپ بڑے باکمال ہو گئے ہیں۔ اس سے اس قسم کی باتیں خوب کہہ کر اخیر میں کہا کہ اسلام لانے کو بھی جی چاہتا ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کہ بالکل نہیں۔ حاجی صاحب نے وہیں بات پکڑ لی کہ پھر تو ضرور قبول کرو، ورنہ تمہارا اصول ختم ہو جائے گا جو عمر بھر کی محنتیں ہیں وہ سب ضائع ہو جائیں گی۔ جب اصول کے خلاف ہو گا اگر جی چاہتا اسلام لانے کو تو بالکل نہ لاتے، مگر جب جی نہیں چاہتا تو جی کے خلاف کرو اور اسلام لاؤ، ورنہ تو پھر تمہارا اصول ختم ہو کر تمام محنت غارت ہو جائے گی، کیونکہ جب اصول باطل ہو جاتا ہے تو اس کی جزئیات بھی باطل ہو جاتی ہیں۔

غرض اس کو ایسا گھیر لیا کہ وہ اسی مجلس میں مسلمان ہو گیا اور اس کی وجہ سے اور بھی بہت سے مسلمان ہو گئے۔ انہوں نے کوئی ایسی تعلیم نہ پائی تھی، مستند نہ غیر مستند، مگر صاحب نسبت ضرور تھے۔ ذکر اللہ رچا ہوا تھا، ہر موقعہ کے مناسب حق تعالیٰ الہام فرما دیتے تھے اور قلب میں ایک قسم کا جذبہ تھا۔ دعوت الی اللہ کا،

حکمت کے ساتھ اس کو پیش کرتے تھے۔ وہ قاعدہ بن جاتی تھی اور تدبیر خود بخود سمجھ میں آتی چلی جاتی تھی، تو جب آپ دل میں ٹھان لیں گے اور قلب میں اللہ نے ایمان کا جذبہ بھی دیا ہے تو وقتی تدابیر خود آپ کے دل میں پڑ جائیں گے بشرطیکہ آپ کا عزم بھی ہو۔

دعوت الی اللہ کے غیر مسلم بھی مستحق ہیں

ایک دعوت تو ہے اپنوں کو دینا وہ تو ہر حالت میں ضروری ہے جیسے ہماری تبلیغی جماعتیں ہیں کہ انہوں نے ہزاروں آدمیوں کی اصلاح کی مگر یہ میدان کہ غیروں کو بھی دعوت دی جائے بالکل خالی ہے۔ آخر غیر مسلموں کا بھی تو حق ہے آپ کے اوپر، آپ کا سلام آپ کی جدی میراث تو نہیں ہے کہ کہیں نہ جائے، آپ تک ہی محدود رہے، وہ تو دنیا کی تمام اقوام کے لئے آیا ہے مگر اس کے ان تک پہنچانے کا آپ ہی ذریعہ بنیں گے، اور آپ ان تک پہنچا نہیں رہے ہیں اس لئے آپ ان کا حق مار رہے ہیں جیسے آپ کے اوپر اپنوں کا حق ہے ایسے ہی اغیار کا بھی حق ہے، وہ یہ ہے کہ آپ ان کی خیر خواہی کریں اور خیر خواہی یہ ہے کہ انہیں وہ دین پہنچائیں جس کے ذریعہ وہ عذاب آخرت سے بچ جائیں اور ان تک بات حکمت سے پہنچائیں جیسے حاجی عبد الرحمٰن صاحب نے پہنچایا اور ایسے انداز سے پہنچائیں کہ ماننے پر مجبور ہو جائیں، جو راستہ آسان ہو اس ذریعہ سے وہ دعوت چلائیں، چاہے خدمت کا راستہ ہو یا احسان کا راستہ ہو یا حکمت کا راستہ ہو، بہر حال دعوت الی اللہ لازمی چیز ہے۔

مخاطب کے مناسب حال طریقے سے دعوت پہنچاؤ

میں طلبہ سے کہا کرتا ہوں کہ مدارس میں جو ہماری تعلیم ہے وہ تو بہت ہی اہم اور ضرری ہے، اگر تعلیم نہ ہو تو تبلیغ کا بھی دروازہ بند۔ ساری بنیاد تعلیم سے ہی چلتی ہے مگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد تعلیم ہی کو مقصد بنالینا یہ کافی نہیں بلکہ دعوت عام ہونی چاہیئے۔ کتابیں پڑھانے کے وقت آپ کتابیں پڑھائیں اور جب دوسرے لوگ سامنے آئیں تو دعوت الی اللہ کا راستہ اختیار کریں۔ جیسا مخاطب ہو ویسا ہی خادم بن کر اس سے گفتگو کریں اگر علم و حکمت والا آدمی سامنے آئے تو اسے حکمت کے راستے سے اسلام پہنچائیں۔ کوئی سادہ لوح آدمی ہو تو سادگی سے اسے اسلام پیش کرو، اور اگر کوئی کٹ حجت ہو تو اس کے مسلمات سے اس پر حجت قائم کریں۔

غرض جیسا مخاطب ہو آپ اس سے ایسا ہی کلام کریں **کلموا الناس علی قدر عقولهم** جس درجہ کی عقلیں ہوں اسی درجے کا کلام کیا جائے۔ سادے آدمی کے ساتھ اگر آپ منطق و فلسفہ بگھارنا شروع کریں گے تو وہ بے چارہ کیا سمجھے گا۔ جیسے لکھنؤ کے ایک زمیندار تھے ان کے پاس کچھ کاشت کار زمین وغیرہ بونے اور جوتنے کے لئے خادم تھے۔ زمیندار کو کچھ فارسی بولنے کا مرض تھا اور جی چاہتا تھا کہ فارسی بولا کریں مگر صحیح نہیں بلکہ غلط بولتے تھے، ایک بار کچھ دیہاتی جمع ہو کر آئے ان زمیندار نے دیہاتیوں سے کہا کہ امسال دہقان کے کشت زار پر تقاطر امطار ہوا کہ نہیں یعنی پوچھنا یہ تھا کہ اس سال بارش کیسی ہوئی ہے تو

زمیندار نے فارسی بگھارنے کے لئے یہ الفاظ استعمال کیے تو دیہاتیوں نے آپس میں کہا کہ اس وقت میاں صاحب قرآن پڑھ رہے ہیں جب فارغ ہو جائیں گے جب آ کر بات کریں گے۔ ان کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے تو ان دیہاتیوں کے سامنے فارسی بولنا غیر مناسب تھا، وہ بے چارے غریب کیا سمجھتے؟ کچھ بھی نہیں ایسے حکمت پسند کے آگے آپ سادہ لوحی باتیں کریں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی۔ تو جیسا انسان ہو گا اس کے مناسب ہی آپ کو کلام کرنا پڑے گا۔ اسی لئے قرآن کریم نے تین لفظ بولے ہیں فرمایا: ادع الی سبیل ربك بالحکمه والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن یعنی دعوت دو اللہ کے راستے کی حکمت سے، موعظت سے اور مجادلہ حسنہ سے، اس لئے کہ دنیا میں آدمیوں کی بھی تین ہی قسمیں ہیں کچھ عقل پسند ہیں اس کے سامنے دین کو معقول انداز میں پیش کیا جائے گا اور کچھ سادہ لوح ہیں کہ اللہ اور رسول کا نام سنا اور گردن جھکا دیں۔ ان کو صرف اتنی نصیحت کافی ہے اور کچھ ٹیڑھی طبیعت کے ہیں بلکہ الٹے مزاج کے، کسی کی نہیں مانتے جب تک کہ ان کی مانی ہوئی باتوں سے ان پر حجت قائم نہ کر دیں، یہ ہی اصول ہے ان کو سمجھانے کا، ان سے مناظرہ کیا جائے گا۔ ان سے بحث و مباحثہ کیا جائے گا۔ اس کے بغیر وہ سمجھیں گے نہیں تو لہٰذا جیسا آدمی ویسا ہی خادم بھی ہونا چاہیئے۔

حضور کا رکانہ کو کشتی میں پچھاڑنا

ایک روایت ہے اگرچہ وہ ضعیف ہے مگر چوں کہ احکامات میں نہیں ہے۔ بلکہ فضائل و مناقب کی ہے اس میں ضعیف روایات بھی قبول کر لی جاتی ہیں اس لئے قابل قبول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رکانہ عرب میں بہت بڑا پہلوان تھا۔ وہ ایک آدمی ایک ہزار کے مقابلے کا سمجھا جاتا تھا اور ان کے بدن کی مضبوطی اور وزن کی کیفیت یہ تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کی غیر مدبوغ تازی کھال بچھا دی جاتی اور رکانہ اس پر بیٹھ جاتا اور عرب کے نوجوان چاروں طرف سے اس کھال کو کھینچتے تو کھال کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑ جاتے مگر اتنی کھال کو جنبش نہ ہوتی تھی جو رکانہ کے نیچے ہوتی تھی، اتنا وزن تھا ان کے بدن میں۔ گویا منوں کی لاش تھی۔ حضور ﷺ نے ان کو دعوت اسلام دی، اس نے کہا اے محمد! سیدھی بات سن لو۔ میں ایک پہلوان آدمی ہوں، نہ عالم ہوں، نہ عارف، نہ فلسفی، صرف کشتی لڑنا جانتا ہوں اگر آپ نے مجھے کشتی میں پچھاڑ دیا تو میں اسلام قبول کر لوں گا ورنہ نہیں۔ یہ گویا اس نے حجت رکھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا بسم اللہ! آپ کشتی لڑنے پر راضی ہو گئے، وہ بھی لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں آ گیا اور آپ بھی آستینیں چڑھا کر اکھاڑے میں آ گئے۔ اب رکانہ پہلوان کا بھاری بدن کہ اونٹ کی کھال کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں مگر اس کے نیچے سے حرکت نہ کریں لیکن آپ نے ایک دو داؤ پیچ کے بعد ان کے بند کمر میں ہاتھ ڈالا اور اس طرح ایک ہاتھ سے اچھال دیا کہ جس طرح سے کوئی چڑیا کو نچاتا ہے اور آہستہ سے زمین پر رکھ کر آپ ﷺ اس کی چھاتی پر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ رکانہ اب کہو، تو رکانہ کو یقین نہ آیا کہ مجھے حضور ﷺ نے پچھاڑ دیا ہے کیونکہ وہ کبھی کسی سے پچھڑا ہی نہ تھا،

اس نے کہا کہ کیا میں پچھڑ گیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا نیچے نہیں پڑے اور کیسا پچھڑنا ہوتا ہے، یقین نہ آیا۔ کہنے لگا کہ اے محمد ﷺ! کشتی ایک بار اور ہوگی۔ فرمایا بہت اچھا۔ آپ ﷺ کھڑے ہوگئے اور پھر کشتی شروع کی۔ پھر ایک دو داؤ پیچ کے بعد آپ ﷺ نے ایک ہی دست مبارک ڈال کر اٹھایا اور چڑیا کی طرح نچایا اور زمین پر رکھ دیا۔ اب یقین کرنے پر مجبور ہوگیا۔ کہنے لگا کہ اے محمد ﷺ! تمہارے بدن میں تو اتنی طاقت ہے نہیں، کوئی اندر کی طاقت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسی اندر کی طاقت ہی کی طرف تو بلا رہا ہوں۔

ظاہری طاقت کی طرف نہیں بلاتا ہوں، جو میرے اندر ہے اسی کو منوانا چاہتا ہوں۔ پھر وہ اسلام سے مشرف ہوگئے۔ اب بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اکھاڑوں میں کشتیاں لڑنے کے لئے تھوڑا ہی تشریف لائے ہیں لیکن اگر کوئی شخص اپنے ایمان کو دائر کردے اس پر کہ اس کے بغیر میرے اوپر حق واضح ہوگا ہی نہیں، تو یہ بھی کرنا پڑتا ہے اور حضور ﷺ نے ایسا کیا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جیسا مخاطب ہو ویسا ہی خطاب ہوگا۔ جیسا آدمی ویسا ہی خادم، کوئی عقلمند ہے تو عقل سے خطاب کیجئے، کوئی سادہ لوح ہے تو سادہ خطاب کیجئے، کوئی کٹ حجت ہے تو بحث سے خطاب کیجئے۔ اس کی نفسیات کو دیکھ کر آپ کو خطاب کرنا پڑے گا۔ وہ ضرور مانے گا مگر آپ کے دل میں جذبہ ہونا چاہیئے کہ کسی نے کسی طرح اس دین کو اس کے اندر پرونا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ سب سے پہلے یوں کہیں کہ صاحب آپ مسلمان بن جائیں، نہیں بلکہ ایسا طرز اختیار کریں کہ وہ خود اپنی زبان سے کہے کہ مجھے آپ اس دین میں داخل کرلیں اور وہ طرز ہے برتاؤ، اخلاق حسنہ اور عمدگی معاملات۔

وہ طریقہ اختیار کرو جس سے غیر مسلم بھی اسلام کی طرف لپکیں

سب سے پہلے ضرورت ہے کہ اسلامی اخلاق پیش کرو، مظاہرہ عمل کرو، تلقین بھی کرتے رہو، آپ کے عمل سے جب اخلاق کی نوعیت واضح ہوگی اور نمایاں ہوگی تو اس سے گرویدگی پیدا ہوگی۔ اس گرویدگی سے اس کے دل میں خود بخود داعیہ پیدا ہو جائے گا کہ مجھے اس دین کی تلقین کی جائے جس کے اندر یہ اخلاق موجود ہیں، تو آپ فضا ایسی بنائیں کہ وہ خود طالب بن کر آئے کہ آپ ہمیں بھی اپنا مذہب سکھلاؤ، مگر پہلے آپ خود اپنا عمل درست کرلیں اور دوسروں کے لئے عمل کا نمونہ بن جائیں۔ دنیا کی نقالی نہ کریں بلکہ اپنے کیریکٹر اور کردار پر چلیں جو اللہ اور رسول نے آپ کو بتلایا ہے۔ صلاح و تقویٰ جب آپ کے اوپر ہوگا تو آپ کا چہرہ مہرہ خود داعی اور مبلغ بن جائے گا۔

چہرہ بھی اسلام لانے کا سبب بن جاتا ہے

حضرات صحابہؓ سب سے پہلے جب ہندوستان میں آئے تو سندھ کے راستے سے داخل ہوئے ہیں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ سندھ کے بازاروں سے جب صحابہؓ گزرے ہیں تو ہزاروں کی تعداد میں لوگ صرف چہرہ دیکھ کر مسلمان ہوگئے ہیں کہ یہ چہرے جھوٹوں کے نہیں ہو سکتے ہیں جو ہمارے سامنے پھر رہے ہیں، ان کے چہرے مہروں سے ہی پہچان لیا کہ یہ حقانی چہرے ہیں۔ مرد حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے۔ پیش

ذی شعور مرد حقانی کا چہرہ ہی بتلا دیتا ہے کہ چہرہ سچے آدمی کا ہے۔اس کے چہرے سے سچائی برستی ہے تو سب سے پہلے ہمارا کردار اور عملی نمونہ درست ہونا چاہیئے اور پھر جذبہ ہو خدمت کا جو بھی ملے اس کی خدمت کریں اس میں بڑائی چھوٹائی کا فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ آپ بڑے سہی مگر اپنے چھوٹوں کی خدمت کریں اس سے چھوٹوں کے دل میں عظمت بڑھے گی پھر یہ کہ چھوٹوں کو تعلیم ملے گی کہ بڑائی کا راستہ یہ ہے کہ آدمی چھوٹا بنے،اس سے تعلیم کا طریقہ بھی معلوم ہوگا اور خدمت و خیر خواہی کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

حضرت عمرؓ کی خدمت کا ایک عجیب واقعہ

حضرت عمرؓ ایک مرتبہ چلے جا رہے تھے -راستہ میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک گھر میں چند بچے بلک بلک کر رو رہے ہیں اور ان کی ماں نے ہانڈی چولہے پر رکھ رکھی ہے۔ آپؓ نے اس عورت کو آواز دی اور دریافت فرمایا کہ یہ ہانڈی چولہے پر کیسی چڑھی ہوئی ہے اور یہ بچے کیوں رو رہے ہیں؟اس نے کہا مجھ پر تین چار وقت سے فاقہ ہے،ایک دانہ بھی میرے پاس نہیں۔بچے بھوک کے مارے بلک رہے ہیں۔ میں نے ان کو تسلی دینے کو ہانڈی میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دی ہے کہ اس میں کھانا پک رہا ہے تاکہ یہ سو جائیں اور رونا چھوڑ دیں۔ حضرت عمرؓ پر اثر ہوا کہ میری خلافت میں اتنے غرباء موجود ہیں کہ کئی کئی وقت کے فاقے گزر گئے۔ اسی وقت بیت المال میں تشریف لے گئے،وہاں سے کچھ غلہ،کچھ آٹا،کچھ دال کچھ اور چیزیں لے کر اپنی کمر پر لاد کر اس بڑھیا کے گھر تشریف لائے ہیں،امیر المومنین خلیفۃ المسلمین ہیں جن کے نام سے دنیا کانپتی اور دنیا کے سلاطین کانپتے ہیں اور وہ کمر پر لاد کر غلہ بڑھیا کے گھر پہنچا رہے ہیں۔وہاں جا کر خود ہی چولہا دھونکا،خود ہی آٹا گوندھا اور پکانا شروع کیا۔ پھونک مارتے جاتے تھے اور چولہا دھونکاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ عمر تو قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دے گا کہ تیری رعایا بھوکی مر رہی تھی اور تجھے خبر بھی نہ تھی۔ حضرت عمرؓ کے غلام اسلم ساتھ تھے وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ جس وقت چولہے میں پھونک مارتے تھے میں دیکھ رہا تھا کہ دھواں حضرت عمرؓ کی گنجان داڑھی میں سے چھن کر جا رہا تھا اور بڑھیا کہہ رہی تھی کہ عمرؓ کو لوگوں نے خواہ مخواہ خلیفہ بنا دیا وہ اس قابل نہیں تھا،تم اس قابل تھے کہ تم کو امیر المومنین بنایا جاتا۔لوگوں نے بڑی غلطی کی کہ عمرؓ کو خلیفہ بنا دیا جسے یہ بھی خبر نہیں کہ اس کی رعایا میں کتنے لوگ بھوکے مرتے ہیں؟

بہر حال حضرت عمرؓ پکا کر ان کو کھلا پلا کر جب گھر واپس آئے تو اگلے روز سے ہی بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، تو افادہ خلق اللہ میں چھوٹے بڑے کی رعایت نہیں، آپ بڑے عالم سہی لیکن خدمت کے وقت ایسے بن جائیں جیسے آپ سب سے چھوٹے ہوں کہ یہ ہی آپ کی بڑائی کی بات ہوگی اور یہ ہی آپ کو اونچا کرے گی۔

دعوت الی اللہ کے دو درجے

بہر حال دینی دعوت ہر مسلمان کے ذمے ہے اور اس دعوت کے دو درجے ہیں۔ایک تو تذکیر ہے کہ یاد دہانی کراؤ اور عمل سکھلاؤ وعظ سے تقریر سے،وہ تو اپنوں کے لئے ہے جیسے کہ تبلیغی جماعت ہے کہ

گھروں سے نکال کر مساجد میں لے جاتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں لے جاتے ہیں تا کہ ان سے عمل کرائیں اور گھریلو آرام اور راحت کی زندگی چھوڑ کر جفاکشی کی زندگی سکھلائیں۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ عمل ایسا بنائیں کہ غیر بھی آپ کی طرف جھکیں اور خود طالب بنیں کہ ہمیں بھی یہ چیز سکھلائیں تو پھر غیروں کو بھی دعوت دینے کا موقعہ ملے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ھو الذی ارسل رسوله بالھدی یعنی اللہ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت دے کر بھیجا اور ہدایت یہ نہیں کہ محض عقلوں کو سونپ دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ تم عقلمند ہو اس لئے تم خود بخود تجویز کر لو، میں تو صرف عقلی رہنمائی کے لئے آیا ہوں، ایسا نہیں بلکہ بالھدی کے ساتھ و دین الحق بھی فرمایا کہ سچا دین بھی لے کے آیا ہوں۔ یعنی طریقہ بھی بتلایا اور رہنمائی بھی فرمائی۔ حق کا راستہ دکھلایا، وجہ اس کی بیان فرمائی: لیظھره علی الدین کله تا کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب آئے اور چھا جائے، اس لئے کہ یہ دین فطرت کے مطابق ہے، اس کے اصول مصنوعی نہیں ہیں، دنیا مجبور ہو کر اس کے اصولوں کو مان لے گی کیونکہ جو چیز فطرت کے مطابق ہوتی ہے اس کو ہر شخص ماننے پر مجبور ہوتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے: لا یبقی علی ظھر الارض بیت مدر و لا وبر الا ادخله الله کلمة الاسلام بعز عزیز و ذل ذلیل یعنی زمین کی پشت پر کوئی کچا پکا اینٹ پتھر کا گھرانہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا حکم داخل نہ ہو جائے گا۔ فیکون الدین کله لله راوی کہتے ہیں کہ پھر تو پورے عالم میں ایک ہی دین بن جائے گا یہ حدیث شرح کر رہی ہے آیت لیظھره علی الدین کله کی، تمام ادیان پر یہ غالب آ جائے گا اور اس نے غالب آنا شروع بھی کر دیا ہے یعنی لوگ خواہ زبان سے اقرار نہ کریں مگر عملاً اسلام کو اور اسلامی جزئیات کو قبول کرتے جا رہے ہیں۔

دین کو عملاً قبول کرنے کی صورتیں...... وراثت غیروں کی نظر میں

مثلاً بہت سی اقوام کے یہاں عورتوں کی میراث نہیں، فقط لڑکوں کی میراث ملتی ہے، ان عورتوں نے پارلیمنٹ کے ارد گرد ایجی ٹیشن اور مظاہرے کئے کہ جس باپ کی اولاد لڑکے ہیں، اسی باپ کی اولاد ہم بھی ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں وراثت میں حصہ نہ ملے؟ لامحالہ گورنمنٹ کو جھکنا پڑا اور ماننا پڑا اور وراثت میں لڑکیوں کو حصہ دار بنایا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ لڑکیوں کی وراثت کا اصول یہ لگ کہاں سے لائے؟ یہ تو صرف اسلام میں ہی تھا اور دوسرے مذہب میں بالکل نہ تھا۔

تو اس کا مطلب یہ کہ یہ جزو اسلامی انہوں نے قبول کر لیا، ایسے ہی اب تک عموماً حکومتوں کے اندر گدی نشینی چلی آ رہی تھی، مگر اسلام نے اصول رکھا کہ اصلح قوم کا حاکم بنے یعنی جو شخص زیادہ صالح ہو اور قوم اسے زیادہ مانتی ہو اس کو امیر اور حاکم بناؤ، اسی اصول پر آج ہر جگہ بادشاہت ختم ہو رہی ہے اور گدی نشینی باقی نہیں رہی، الیکشن کے ذریعہ سے امیر اور صدر کا انتخاب ہوتا ہے بقول شخصے کہ اب دنیا میں صرف دو یا تین بادشاہ رہ گئے ہیں، ایک شطرنج کا بادشاہ کہ وہ اس میں موجود ہے اور ایک انگلستان کا اور ایران کا بادشاہ ورنہ سب ختم ہو گئے ہیں، گو دوسروں نے وہ اسلامی اصول اپنے ملکوں میں رائج کر لیا جو اسلام کا تھا یعنی انتخاب کہ اس

کے ذریعہ تم میں جو زیادہ قابل ہو اس کو منتخب کرو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اسلام میں قابلیت کا معیار دیانت و دین و تقویٰ ہے اور علم اور مقبولیت عند اللہ ہے اور آج کا عوامی معیار دوسرا ہے، مگر انتخاب کیا جاتا ہے خواہ معیار غلط ہو، پہلے یہ دستور تھا کہ عام ذہنوں میں متعین رہتا تھا کہ فلاں آدمی قوم میں بڑا متقی ہے اور ووٹنگ کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے، جدھر زیادہ آگئے اسی سے جان لیا جاتا ہے کہ لوگوں کا رجحان اسی طرف زیادہ ہے، یہ طریقہ ہے انتخاب کا خواہ وہ غلط ہو خواہ صحیح ہو، اس سے بحث نہیں مگر اسلام نے جو اصول رائج کیا تھا کہ ملوکیت اور گدی نشینی ختم کر کے خلافت رائج کی تھی وہ اصول رائج ہو گیا اور آج اسی اصول کو دنیا کی قومیں قبول کرتی جا رہی ہیں اور قبول کرنے پر مجبور ہیں، اسکے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں، نیز میراث کا مسئلہ قبول کیا۔

اسلام میں تعدد ازدواج اور غیر مسلموں کا سلوک

تعدد ازدواج کو غیروں نے بھی قبول کیا اور کمال تعجب یہ ہے کہ طعن بھی کرتے جا رہے ہیں اسلامی مسئلہ پر کہ تعدد ازدواج نہ ہو اور اس پر عمل بھی کرتے جا رہے ہیں، آج بھی اس ملک میں بعض غیر مسلم خاندان ایسے ہیں کہ ایک آدمی کے پاس سو سو بیویاں ہیں گویا اس کو فہرست رکھنی پڑتی ہے اپنی بیویوں کی، بسا اوقات ان کا نام یاد نہیں رہتا ہے کہ کون سی بیوی کا کیا نام ہے اور یہ تک بھی یاد نہیں رہتا ہے کہ یہ بیوی میری ہے یا دوسرے کی کیونکہ جب سو بیویوں کا لشکر سامنے سے گزرے گا تو کیا پتہ چلے گا کہ کون سی اپنی ہے کون سی دوسرے کی ہے، غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے تو آج بھی بعض خاندانوں میں ایک ایک کے پاس سو سو بیویاں موجود ہیں اور طعنہ اسلام پر کہ اسلام میں تعدد ازدواج ہے، جنگ عظیم میں جب مقتولین کی تعداد پر غور کیا تو تقریباً سات کروڑ کے قریب دونوں طرف سے آدمی قتل ہوئے۔ ان کی عورتیں بیکار رہ گئیں بلا مردوں کے وہ بدکاری کرتی پھرنے لگیں، ملک والوں نے مضامین شائع کئے کہ اس بدکاری سے بہتر یہ ہے کہ تعدد ازدواج اختیار کیا جائے اور کئی کئی بیویاں رکھے۔ تو طعنہ بھی کر رہے ہیں اور موافقت میں مضامین بھی شائع کر رہے ہیں اور عمل درآمد بھی ہوتا جا رہا ہے اور برا بھلا بھی کہتے جا رہے ہیں، اور قبول بھی کرتے جا رہے ہیں۔

گویا آج اندرونی طور پر اسلام داخل ہوتا جا رہا ہے، آج عملی مشق ہو رہی ہے اور کل کو دل میں اعتماد پیدا ہو جائے گا پھر پورے مسلمان بن کر دین میں داخل ہو جائیں گے اور یکون الدین کلہ للہ ہو جائے گی۔

غلبہ اسلام کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ کی پیشن گوئی

حضرت شاہ ولی اللہ نے پیشن گوئی کی ہے وہ تفہیمات الٰھیہ میں ان الفاظ سے فرماتے ہیں کہ والذی اعتقد یعنی جس چیز کا میں یقین رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر کسی مرحلے پر ہندوستان آزاد ہوا اور یہاں حکومت آئی تو یہاں کی اکثریت کے لیڈر دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے اور دوسرے سیاسی طور پر پیشین گوئی فرمائی ہے مثلاً جارج برناڈ شاہ نے پیشین گوئی کی ہے۔

اسلام کے متعلق جارج برناڈ شاہ کی پیشین گوئی

یہ جارج برناڈ شاہ یورپ کا بڑا فلسفی اور فلاسفر ہے۔ اور بہت بڑا ادیب بھی ہے۔ قوم نے اس کے ادب کی اس درجے قدر دانی کی کہ اس کا ایک لکھا ہوا جملہ بازار میں نوٹ کی طرح چلتا تھا یعنی اگر ان کا ایک ادبی جملہ لکھ کر دیں تو جس دکان پر لے جاؤ روپیہ مل سکتا تھا اتنی زبردست قدر دانی کی ہے قوم نے تو جارج برناڈ شاہ نے خود یہ پیشن گوئی کی ہے کہ میرا یقین ہے کہ سو سال کے اندر اندر پوری دنیا کا مذہب اسلام بن جائے گا۔

مذکورہ پیشن گوئیوں کی تائید میں حدیث رسول

اور حدیث میں یہ پیشن گوئی خود موجود ہے کہ لایبقی علی ظهر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخله الله كلمة الاسلام بعز عزيز و ذل ذليل روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھرانہ باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ نہیں پہنچ جائے گا۔ رغبت سے مانو یا مجبوراً، اور مجبوراً کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ مسلمان کسی کے گلے پر تلوار رکھیں گے اور کہیں گے کہ اسلام قبول کرو ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اسلام میں اس کی ممانعت ہے، صاف فرمایا کہ دین میں جبر نہیں ہوتا ہے۔ افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین یعنی اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے اسلام قبول کرنے پر اس سے معلوم ہوا کہ دین منوانے میں جبر نہیں ہے پھر یہ جو فرمایا کہ رغبت سے مانو یا مجبور ہو کر، یہ تلوار کا نہیں ہوگا بلکہ اصول کا ہوگا کہ ہر فرقے کو کہیں پناہ نہیں ملے گی، اگر ملے گی تو اسلامی اصول میں ملے گی جبکہ اس کو قبول کرلیں گے، جب گدی نشینی میں پناہ نہیں ملی تو انتخاب کا اصول اختیار کیا، جب لڑکیوں کی میراث کی مخالفت میں پناہ نہیں ملی تو لڑکیوں کی میراث کا مسئلہ اختیار کیا، تعدد ازواج کا مسئلہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے، اسی طرح مجبور ہو کر ہر اصول کو اختیار کرتے رہیں گے کیونکہ دین فطرت تو خود غالب آکر رہتا ہے۔

مسلمانو! انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو جاؤ

ایسے میں جبکہ طبیعتیں اسلام کی طرف مائل ہو رہی ہوں، انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہونا آسان بات ہے، آپ دعوت کے لئے کھڑے ہو جائیں زمانے کو اللہ نے سازگار بنا دیا ہے۔ آپ تھوڑی سی دعوت دیں گے تو بہت سے آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے، اس زمانے میں یہ حلوائے بہبود ہے، پچھلے زمانے میں تو بڑا مشکل تھا، تعصبات غالب تھے، لوگ قبول نہیں کرتے تھے، آج قلوب کی سلیٹ سے وہ تعصبات کی لکیریں مٹتی چلی جا رہی ہیں اور دنیا عالمگیر ہو رہی ہے۔ گویا ایک خاندان کی طرح بن گئی ہے، سواریاں ایسی کہ یورپ ایشیا، امریکہ سب ایک ہو گئے ہیں، دنیا اتنی قریب آگئی ہے کہ صبح کی خبر شام کو اور شام کی خبر صبح کو آ رہی ہے۔ سب جگہ وسائل نقل و حرکت اور وسائل علم و خبر اتنے پھیل گئے ہیں کہ ساری دنیا سمٹ کر ایک گھرانہ ہے، تمدن اور معاشرت میں اشتراک پیدا ہو گیا ہے لہٰذا قدرتی طور پر دلوں میں سوال پیدا ہوگا کہ جب سب کا تمدن ایک ہوتا چلا جا رہا ہے اور پلیٹ فارم ایک ہوتا جا رہا ہے تو مذہب بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور دین مذہب بھی وہی ہوگا جس میں جامعیت اور جس میں فطرت ہو اور جس میں حد بندیاں نہ

ہوں وہی دین پھیل سکے گا۔

اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس نے نفرت کو ختم کیا اور فرقہ بندی کی جڑ کاٹی، مگر لوگ پھر مبتلا ہو رہے ہیں ان افعال میں یہ ان کا فعل ہے۔ اسلام نے اصولاً ان چیزوں کو نکال دیا ہے۔ لہٰذا اسی دین میں پھیلنے اور عام ہونے کی تمام شرائط موجود ہیں۔ اسی بناء پر ہر قسم کی پیشین گوئی اسی دین کے بارے میں ہے۔ شرعی پیشین گوئیاں بھی ہیں اور سیاسی لوگوں کی پیشین گوئیاں بھی ہیں کہ یہ ہی دین غالب ہو کر رہے گا تو پھر دین والے اگر اس دین کو پھیلانے کی کوشش نہ کریں گے تو بدقسمتی کی بات ہوگی۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ تو حلوائے بہبود ہے، انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہو جاؤ۔ تو اب ہر شخص اس بات کے پیچھے لگ جائے کہ وہ ہر شخص کو دعوت الی اللہ کی طرف لائے گا۔ اپنوں کو بھی اغیار کو بھی، جیسا موقعہ ہو اسی کے مناسب لوگوں کو دعوت پیش کردے۔

غلبہ اسلام کے متعلق خداوند عالم کی شہادت

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی پیشین گوئی اور جارج برناڈ شاہ کی صریح پیشین گوئی اور دوسرے لوگوں کے خیالات اور پھر حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی لا یبقی علی ظھر الارض الخ اور غلبہ دین کے بارے میں اللہ رب العزت کی شہادت ان سب سے ظاہر ہے کہ خداوند عالم کا منشا رسول کو دین حق دے کر بھیجنے سے یہ ہی ہے کہ لیظھرہ علی الدین کلہ، تو پھر یہ دین کیوں نہ غالب آئے گا جبکہ لوگوں کا عملاً قبول کرتے چلے جانا وغیرہ ایسے تمام نشانات ہیں جو بتلا رہے ہیں کہ یہ دین ایک نہ ایک روز ضرور عالمگیر ہو جائے گا۔ کہ تمام دنیا اسی دین کو قبول کرلے گی۔ اسی لئے فرمایا کہ ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ اور اس کے بعد فرمایا کہ و کفی باللہ شھیدا یعنی اس پر اللہ اپنی گواہی ثبت فرما رہے ہیں کہ یہی دین ہے جو پھیلے گا، اور آگے فرمایا: محمد رسول اللہ یعنی اللہ کی گواہی سے اس کا حق ہونا واضح اور ثابت فرمایا ہے، جب اللہ گواہی دیں سچ ہونے کی اور نبی آئے پھیلانے تو پھر اس کے ماننے میں کیا اشکال ہے؟ سند اس کی مضبوط، روایت درایت اس کی مضبوط اور کیا چیز مانع اور رکاوٹ ہے اس دین کے قبول کرنے میں اور پھر اللہ کے رسول کو جو نعمت دی گئی ہے ان میں ایک بڑی نعمت یہ بھی ہے کہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا آپ کے ساتھی کفر پر شدید اور آپس میں رحیم و کریم ہیں اور حال ان کا یہ ہے کہ کبھی رکوع کر رہے ہیں اور کبھی سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فضل اور خوشنودی کی جستجو ان کا اہم مشغلہ ہے۔ رات دن اسی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ ہم وہ کام کرتے رہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو جائے، اسی نتیجے میں ان کو رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کا خطاب ملا یعنی اللہ تعالیٰ صحابہ کرامؓ سے خوش ہو گئے، دنیا میں اور آخرت میں بھی، تو بہت بڑی نعمت ہے جو حضور ﷺ کے صدقے اور طفیل میں صحابہؓ کو ملی اور سلسلہ بسلسلہ ہم تک پہنچ رہی ہے، مگر ملے گی ان کو جو اللہ کا فضل تلاش کر کے ایسے کام کرینگے جن سے اللہ تعالیٰ خوش ہو جائیں۔

اللہ نے حضور ﷺ وصحابہ کو منتخب فرمایا اور ہر ایک صحابی کسی نہ کسی نبی کی نسبت پر ہے

ان مذکورہ اوصاف ہی کے نتیجے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ سارے انبیاء کے صحابہ میں میرے صحابہ منتخب ہیں اور سارے زمانوں میں میرا زمانہ منتخب ہے، اور تمام خاندانوں میں میرا خاندان منتخب، تمام ذوات میں میری ذات منتخب، تو صحابہ بھی منتخب کر لئے گئے جو نبی کے ساتھ کمال مناسبت رکھتے تھے اور دین چونکہ جامع ہے اور تمام ادیان کا خلاصہ اور نچوڑ ہے اس لئے صحابہ میں ہر نوعیت اور ہر نسبت کے افراد موجود ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ بعض روایات میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار آتی ہے اور صحابہ کی تعداد بھی اتفاق سے ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے تو گویا ایک ایک صحابی ایک ایک نبی کی نسبت پر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت جلالی ہے۔ حضرت عمرؓ کو دیکھا جائے تو ان میں جلال موسوی نظر آئے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان جمالی ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کو دیکھا جائے تو وہ عیسائے امت ہیں اور ان کے بارے میں فرمایا بھی گیا ہے کہ ابوذر غفاریؓ عیسائے امت ہیں۔ صدیق اکبرؓ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ نسبت ابراہیمی پر ہیں، یعنی وہ انداز ہے ان کے قلب کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب کا تھا یعنی سلامتی کا تو ہر ہر صحابی ایک نسبت لئے ہوئے معلوم ہوتا ہے اور نبی کریم جامع النسبت ہیں کہ ساری وہ نسبتیں جو انبیاء کو دی گئی تھیں وہ ایک ذات بابرکات میں جمع کر دی گئیں، یہ نسبتیں اوپر کی طرف منعکس ہوئیں تو انبیاء علیہم السلام میں پہنچیں اور نیچے آپ ﷺ کے صحابہ میں تعلیم و تربیت سے وہ ساری نسبتیں پھیلیں اور پھر بعد میں درجہ بدرجہ اپنی نسبتوں کو لئے ہوئے بزرگ و مقدس ہستیاں پیدا ہوتی ہیں اور امت میں وہ سلسلہ برابر بدلتا رہا۔ بعض اولیاء اللہ جلالی شان رکھتے ہیں اور بعض جمالی شان رکھتے ہیں اور بعض اعتدالی شان رکھتے ہیں۔

غرض اولیاء اللہ کی نسبتوں کے رنگ مختلف ہیں مگر سب کی نسبتیں جا کر ختم ہوتی ہیں ذات بابرکات پر اور وہیں سے یہ سلسلہ چلا بھی ہے تو حضور جامع کمالات اور جامع نسبت ہیں اور آپ ﷺ ہی کی تعلیم و تربیت سے ان نسبتوں کے رنگ اور کمالات پیدا ہوئے، حضرات صحابہ میں تو ذات بھی اللہ نے یکتا پیدا کی اور ذات کے جو مصاحبین اور اصحاب ہیں وہ بھی یکتا پیدا کئے اور دین بھی آپ کو جامع دیا، دین لاوارث اور بے حجت نہیں ہے بلکہ سکہ ہے جو منظور شدہ ہے حکومت خداوندی میں، ہر ملک میں چلنے والا ہے بشرطیکہ چلانے والے موجود ہوں۔

طلبہ دین صورۃ مساکین ہیں مگر قلوباً سلاطین ہیں

بہر حال میں نے یہ عرض کیا کہ دین بھی جامع، پیغمبر بھی جامع، صحابہ بھی جامع اور جہاں یہ جامعیت دین حاصل ہوتی ہے وہ ہیں ہمارے مدارس اسلامیہ کیونکہ ان میں اسی دین کی تعلیم و تبلیغ ہوتی ہے اور قوانین و اصول شریعت سکھائے جاتے ہیں اور نائبان رسول پیدا کئے جاتے ہیں اور درحقیقت یہ مدارس اسلامیہ دیکھنے میں تو بہت ہی حقیر سے نظر آتے ہیں۔ یونیورسٹیوں کو دیکھو، لاکھوں کے سامان، لاکھوں کی عمارتیں موجود ہیں اور یہ مدارس بہت معمولی مگر حقیقت میں معنویت ان ہی کے اندر ہے ان مدارس میں پیدا ہونے

والے ظاہر میں مساکین ہیں مگر قلوب کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ سلاطین ہیں، صورت طالب علموں کی مسکین کی سی ہوتی ہے لیکن اگر صحیح معنوں میں طالب علم ہے تو وہ سلاطین کا علم رکھتا ہے، اس کے اندر غنا اور استغناء، علومرتبت اور غنا نفس یہ سب چیزیں ہوتی ہیں بشرطیکہ وہ طالب علم ہو اور ذی استعداد ہو وہ کسی کے بس کا نہیں ہے۔

حضرت عالمگیر اور ایک طالب علم کا دلچسپ واقعہ

ایک مرتبہ حضرت اورنگزیب عالمگیر دلی میں اپنے مثمن برج میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک طالب علم گزرا، طالب علم ہوتے ہی ہیں ایسے الول جلول کہ جوتیاں چٹخاتے جارہے ہیں۔ کتاب بغل میں لباس پھٹا ہوا، اورنگ زیب نے وزیر سے کہا یہ کون ہے جو جارہا ہے، وزیر نے تحقیر آمیز لہجے میں تعارف کرایا کہ یہ ایسی قوم کا فرد ہے جو نکمی ہے اور بے کار قوم ہے یعنی مولوی کی قوم، تو عالمگیر چونکہ خود عالم تھے اس لئے وہ جانتے تھے کہ اہل علم کی قدر ومنزلت، انہوں نے کہا کہ اگر یہ سچا طالب علم ہے اور واقع میں طالب علم ہے تو تم جیسوں کو بازار میں بیچ آئے گا اور تم کو خبری بھی نہ ہوگی، یہ تمہارے بس کا نہیں ہے۔ وزیر نے کہا کہ حضور یہ خوش اعتقادی ہے، بادشاہ نے کہا کہ اچھا امتحان کر، چوبدار کو بھیجا کہ اس طالب علم کو بلا لاؤ۔ وہ چوبدار اس طالب علم کے پاس پہنچا اور کہا کہ تم کو جہاں پناہ یاد کرتے ہیں۔ طالب علم اس کے ساتھ ہولیا۔ حلیہ یہ کہ پگڑی بھی پھٹی ہوئی اور کپڑے بھی ایسے ہی اور تمام لباس گرد آلود اور کتاب بغل میں اور ایسے الول جلول مگر وہ طالب علم ذی استعداد تھا۔ بہر حال وہ پیش کئے گئے بادشاہ کے سامنے، بادشاہ نے کہا کہ اچھا امتحان کرو تاکہ میری بات کی صداقت ظاہر ہو۔ تو اب وزیر اعظم نے کچھ سوالات کرنے شروع کئے مگر الجھے سوالات کے جو نہ کتاب سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ علم سے، ادھر ادھر کے سوالات کئے جسے انٹرویو کہتے ہیں، جس سے ذہن کا اندازہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور وزیر اعظم نے سوال یہ کیا کہ میاں صاحب زادے یہ جو حوض ہے جہاں جہاں پناہ بیٹھے ہوئے ہیں اس میں کتنے کٹورے پانی ہوگا؟ اب ظاہر ہے کہ یہ کوئی علمی سوال تو تھا نہیں کہ جس کا جواب دیا جاتا، صرف اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ مجھے کیا خبر ہے کہ اس میں کتنے کٹورے پانی ہوگا؟ چونکہ طالب علم ذہین تھا اس لئے اس نے کہا کہ حضور کٹورہ متعین کر دیجئے اگر حوض کا آدھا کٹورہ ہے تو اس میں دو کٹورے پانی ہے اگر تہائی ہے تو تین کٹورے پانی ہے اور اگر چوتھائی ہے تو چار کٹورے پانی ہے تو کٹورے کی مقدار آپ متعین کر دیں۔ پھر میں بتلادوں گا۔ یہ جواب سن کر بادشاہ ہنس رہے ہیں اور وزیر چپ ہیں۔ بس یوں کہیں کہ سارے سوالوں کو اسی پر لوٹا دیا ہے۔ اس کے بعد اس وزیر اعظم نے کہا کہ میاں صاحبزادے یہ تو بتاؤ اس زمین کا بیچوں بیچ کہاں ہے کہ چاروں طرف خط کھینچے جائیں تو وہ خط برابر چلے جائیں؟ وہ طالب علم کون سا ناپنے گیا تھا زمین کو مگر "ملا آں باشد کہ چپ نہ شود" طالب علم ذہین تھا اس نے ذہانت سے کام لیا، اپنی پگڑی اتاری اور زمین کو ناپنا شروع کیا، چار گز ادھر سے، چار گز ادھر سے اور وہاں کھونٹی گاڑی اور وہاں نشان لگایا اور چاروں طرف تھوڑی تھوڑی ناپ کر بیچ میں ایک کھونٹی گاڑ دی اور کہا کہ یہ ہے زمین کا بیچ اگر یقین نہ

آئے تو زمین کو اس کے چاروں طرف سے ناپ لو اگر کچھ کمی بیشی ہو تو پھر مجھ سے ذکر کیجئے گا۔ وزیر اعظم یہ بات سن کر حیرت اور تعجب کی وجہ سے چپ ہیں اور جہاں پناہ نے منہ پر رومال رکھ کر ہنسنا شروع کیا اور کہا اچھا پھانسا ہے۔ وزیر اعظم کو وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے چت کرلوں گا حالانکہ اس نے اسے چت کرلیا مگر اس قسم کی گفتگو وہی طالب علم کر سکتا ہے جو ذہین و فطین بھی ہو اور صفت غنا سے بھی متصف ہو۔

مدارس اسلامیہ کا مقصد حقیقی دعوت الی اللہ

تو ہمارے یہ مدارس دیکھنے میں تو بہت چھوٹے معلوم ہوتے ہیں مگر موتی اور ہیرے ان ہی سے پیدا ہو کر نکلتے ہیں جو داعی بن کر دنیا کے سامنے جاتے ہیں جو اصل غرض و غایت ہے ان کے قیام کی اور خیر ہمارا یہ مدرسہ باقیات الصالحات تو ماشاء اللہ ظاہر میں بھی بہت اونچا ہے، اس کی عمارتیں دیکھو تو معلوم ہوگا جیسے وائسرائے کی کوٹھی ہو یہ عمارت کے لحاظ سے بھی بہت اونچا ہے، مگر عام طور پر مدارس میں معمولی عمارتیں ٹوٹی چٹائیاں ہوتی ہیں مگر جو اس پر صحیح طور پر بیٹھ کر پڑھ کر فارغ ہو دماغ ان کا بادشاہوں جیسا ہوتا ہے قلب ان کا اونچا ہوتا ہے۔ اب یہ کہ طالب علم ہی محنت کر کے نہ پڑھے یا استاد ہی محنت کر کے نہ پڑھائے تو وہ قصور طالب علم کا یا استاد کا ہے، اگر طالب علم نے بھی محنت سے پڑھا ہے اور استاد نے بھی محنت کر کے پڑھایا ہے اور تعلیم و تربیت کی ہے تو ان ہی پھٹے پرانے کپڑوں میں لعل نکلتے ہیں اور ان گدڑیوں میں ہی ہیرے اور جواہرات پیدا ہوتے ہیں۔

تو بہر حال اصول اسلام اور دین کے ایسے ہیں **لیظهره علی الدین کله** ضرور مرتب ہو کر رہے گا اور دین ضرور غالب ہو کر رہے گا پہنچانے والے صحیح ہونے چاہئیں اور دل میں جذبہ ہو اور اپنے اپنے درجے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق ہر ایک کوشش کرے، تعلیم اپنی جگہ ہے وہ مدارس میں ہونی چاہیئے اور تربیت اپنی جگہ ہے وہ خانقاہ میں ہونی چاہیئے اور دعوت اپنی جگہ ہے، اس میں خانقاہ اور مدارس سب برابر ہونے چاہئیں، مشائخ بھی دعوت الی اللہ کے لئے اسی درجے آگے بڑھیں اور علماء بھی اسی درجے آگے قدم بڑھائیں اور محض علماء اور مشائخ کا ذمہ نہیں ہے بلکہ عوام کا بھی یہ ذمہ ہے کہ **کنتم خیر امة** میں مشائخ کی تخصیص ہے نہ علماء کی بلکہ پوری امت کو کہا گیا ہے کہ وہ خیر امت **تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر** کہ تمہارا کام ہے امر **بالمعروف** اور نہی **عن المنکر** تو ان مدارس سے حقیقی غرض دعوت الی اللہ ہے، کہیں تعلیم سے کہیں تبلیغ کے ذریعہ کہیں وعظ کے ذریعہ، کہیں تصنیف کے ذریعہ مگر ہونی چاہیے دعوت اور یہ دعوت اپنوں میں اور غیروں میں سب میں عام ہونی چاہیئے، کسی خاص طبقے تک محدود نہ رہے۔

جشن صد سالہ پر حضرت حکیم الاسلام کی طرف سے اہل مدرسہ کو مبارک باد اور ایک صدی گزرنے پر انقلابی حالات پر مختصر کلام

بہر حال میں اہل مدرسہ اور اہل جلسہ کو مبارک باد دیتا ہوں اس سو سالہ جوبلی پر جو انہوں نے منائی ہے اور صد سالہ جشن کیا، **الحمدللہ** کہ اللہ نے اس جشن کو کامیاب بنایا اور اس سے دین کی تجدید ہوئی اور یہ ایسا

ہی ہو گیا کہ جیسا حدیث میں فرمایا گیا ہے ان اللہ یبعث لھٰذہ الامۃ علی راس کل مأۃ من یجدلھا دینھا
کہ اللہ تعالیٰ ہر قرن میں اور ہر صدی میں ایک نہ ایک مجدد ضرور بھیجتا ہے جو دین میں نکھار پیدا کرتا ہے اور
دین کو تازہ بنادیتا ہے، لوگوں میں جہالت کی وجہ سے جو بدعات، خرافات منکرات پیدا ہو جاتے ہیں مجدد آ کر
ان کو نکھارتا ہے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیتا ہے۔ سنت کو بدعت سے ممتاز کر دیتا ہے۔ حق کو باطل
سے الگ کر دیتا ہے، عقائد حقہ کو عقائد باطلہ سے الگ کر دیتا ہے۔ اللہ نے ہر صدی میں ایسی شخصیت کے
بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک صدی درحقیقت مقدار ہوتی ہے ایک طبقے کے لئے یعنی سو
برس کے اندر اندر بنی آدم کا ایک طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور دوسری صدی میں دوسرا طبقہ شروع ہو جاتا ہے،
عمریں اس امت کی اوسطاً ساٹھ ستر کے لگ بھگ ہوتی ہیں، حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اعمار امتی مابین
ستین و سبعین میری امت کی عمریں ساٹھ ستر کے درمیان ہوں گی، اب کوئی آدمی ستر سے تجاوز کر جاتا
ہے تو کوئی ساٹھ سے بھی کم ہی رہ جاتا ہے مگر اوسط آخر امت کی عمروں کا یہ ہی کہتا ہے کہ امت کی عمریں
ساٹھ ستر کے درمیان ہیں، بہرحال سو برس کے اندر اندر ایک نسل ختم ہو جاتی ہے اور دوسری نسل آ کے
دنیا کو سنبھالتی ہے اور یہ ایک طبعی بات ہے کہ ہر سو برس کے بعد جب دوسری نسل آتی ہے تو فکر بھی بدلتا
ہے، نظریات بھی بدلتے ہیں اور اس میں اندیشہ تھا کہ کہیں نئے نظریات میں دین ضائع نہ ہو جائے۔
نظریات مل ملا کر دین وغیر دین مخلوط نہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے ہر صدی اور قرن کے شروع میں مجدد بھیجے
تاکہ نئے نظریات قائم ہونے کے وقت دین کو سنبھالے اور دین کو نکھار کر پیش کرے اور ان نئے
نظریات کا اثر دین پر نہ آنے دے اور دین کو پھر دنیا کے سامنے پیش کرے، اس لئے ہر صدی پر اللہ نے
مجدد دین کو بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ تو آپ کے مدرسے پر ایک صدی گزر گئی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک علمی
نسل پوری ہو کر دوسری نسل کا اس میں آغاز ہوا۔ لہٰذا جشن منانے کا مطلب ہے تجدید علم کی اور تجدید
مدرسے کے افکار کی اور تجدید مدرسہ کے منصوبوں کی تو گیا سو برس کے اندر اندر آپ تجدید کر رہے ہیں ان
منصوبوں کو جو بانیوں نے سامنے رکھے تھے۔ وہ حضرات جن منصوبوں پر اس درس گاہ کو قائم کر کے گئے ہیں
ممکن ہے ہماری طرف سے ان میں کچھ سستی ہوئی ہو اور کچھ خلط ملط ہوا ہو۔ اس جشن کے بعد پھر تجدید
ہو جائے گی اور وہی مقاصد پھر سامنے آ جائیں گے جو بانیوں کے تھے، پھر یہ مدرسہ جو بہ شکل دارالعلوم ہے نو
بہ نو ہو جائے گا، آپ کے اس جشن کو ایک گونہ تشبیہ حاصل ہو گئی۔ تجدید دین سے کہ وہاں بھی سو برس کی
قید ہی اور آپ بھی مدرسہ کا جشن مبارک سو برس میں منا رہے ہیں جس کے ذریعہ مدد یہ ہو رہی ہے اور ایک
نئی امنگ پیدا ہو رہی ہے علم کو تازہ کرنے کی اور اگر ایسے جشن منائے جاتے رہیں تو ایسے لوگوں کے دلوں
میں بھی امنگ پیدا ہوتی رہے گی جو علم سے بے گانے ہیں اور اس کے پاس تک نہ آتے ہیں اور نہ آنے دیتے
ہیں بلکہ اس علم دین کو فضول جانتے ہیں اس طرح سے یہ جلسے جلوس ذریعہ بن جائیں گے علم کے پھیلنے کا اور

لوگوں تک بات پہنچانے کا، اور دعوت الی اللہ دینے کا راستہ کھل جائے گا اس لئے یہ آیت میں نے تلاوت کی تھی اور طالب علمانہ انداز میں جو باتیں میرے ذہن میں آئیں وہ میں نے عرض کر دیں۔

دعاء

حق تعالیٰ شانہ اس مدرسہ جیسا کہ یہ مرکزی مدرسہ ہے اس مرکز کی شان کے مطابق آئندہ اس سے کام لے اور مرکزی طور پر ہی اس کے علوم و کمالات پھیلیں اور اس کے اساتذہ کے ذریعہ سے علم اور اخلاق کی، خدمت ہو اور قوم بلند ہو اور علم نبوت دنیا کے اندر پھیلے، اور حق تعالیٰ شانہ اس جشن کو اسلام کی طرف مائل ہونے کا ذریعہ بنا دی ان طبقات کے لئے بھی جو علم سے نا آشنا ہیں اور اللہ رب العزت ہمیں اور آپ کو اور اہل مدرسہ کو اور ہم سب کو علم و عمل کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارا خاتمہ بخیر فرمائے۔ آمین!

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمینo

اسلامی تمدّن

استفتاء اور سوال کرنے والوں کے لئے ضرورت ہے کہ وہ فکر کے ساتھ واقعات سامنے رکھیں۔ اسی طرح مفتیوں کے لئے بھی ضرورت ہے کہ وہ سارے واقعات کے ایک ایک پہلو کو سامنے رکھ کر حکم لگائیں۔ صرف اجمالی ذکر نہ کریں' تفصیلی واقعات کو سامنے رکھ کر فتویٰ صادر کریں ___ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس میں ایسی گنجائشیں نکلیں گی کہ قوم کو اپنے مفاد سے بھی محرومی نہیں ہوگی اور ناجائز و حرام کا ارتکاب بھی نہیں کرے گی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدّظلہٗ

الحمد للّٰہ وکفٰی وسلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

اما بعدؔ

بزرگان محترم!

اسلام کے پیش کردہ دو راستے

اسلام نے دنیا کے سامنے دو راستے پیش کئے ہیں۔ گویا اسلام دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک اقترابات' دوسرے ارتقاءات۔

اقترابات کا مطلب یہ ہے کہ وہ راستے جن سے آدمی اللہ کا قرب اور نزدیکی پیدا کر سکے اور اس کی نزدیکی کی یہ صورت نہیں ہے کہ جیسے ہم آپ کے نزدیک ہوجائیں کہ گز بھر کی بجائے آدھ گز یا آدھ گز کی بجائے بالشت بھر کا فاصلہ رہ جائے۔ اسے نزدیک کہیں گے مگر یہ نزدیک ہونا جسمانی ہے اور اللہ جسم نہیں ہے کہ اس کے نزدیک ہونے کا یہ مطلب ہو کہ ہم دو چار گز سرک جائیں یا دس پانچ میل آگے پہنچ جائیں ___ اس کی نزدیکی کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے مناسبت اور مضبوط تعلق پیدا کریں۔ اس کے اخلاق سے متخلق ہوں۔ اس کے کمالات سے باکمال بنیں۔ خدائی اوصاف ہمارے اندر نفوذ کریں تاکہ ہمیں خلافت اور نیابت خداوندی کا مقام حاصل ہو ___ اس چیز کا نام اسلام میں اقترابات یعنی قربِ خداوندی پیدا کرنے کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے عبادات نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ رکھی گئی ہیں۔

دوسری چیز ارتقاءات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باہمی میل جول' لطف و مدارات' تمدن و تعاون اور مدنیت و شہریت کے اصول و طریقے ہمارے سامنے ہوں کہ کس طرح سے ہم دنیا میں زندگی گزاریں۔ دنیا میں جیسے مساجد بنانے کی ضرورت ہوتی ہے' گھر بنانے کی بھی ضرورت ہے۔ جیسے گھر بنانے کی ضرورت ہے' بازار بنانے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ سلسلۂ ارتقاءات کے شعبے ہیں کہ آپس کا میل جول اور باہمی تمدن و تعاون' یہ ہم کس

طرح سے انجام دیں۔ اس کے لئے مختلف شعبے ہیں، جن کی تفصیلات اسلام نے کی ہیں۔ بہر حال یہ دو سلسلے ہیں، ایک اقترابات اور ایک ارتقاءات۔

اس لئے کہ ایمان کے دو شعبے ہیں۔ ایک "التعظیم لامرالله" اور ایک الشفقة علی خلق الله اللہ کے اوامر اور بھیجے ہوئے قانون کی عظمت اور اس کی مخلوق پر شفقت و مدارات اور رحم و کرم کرنا یہ ایمان کے دو شعبے ہیں۔ اس لئے علم کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔

علم کی دو قسمیں

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ العلم علمان، علم الابدان وعلم الادیان ۔ علم دو ہیں۔ ایک بدنی زندگی کا علم اور ایک روحانی زندگی کا علم۔ بدنی زندگی کے نیچے یہ تمام شعبے آتے ہیں۔ کھانا، پینا، گھر بنانا، بازار وغیرہ یہ تمام ضروریات۔

اور روحانی زندگی کے نیچے یہ شعبے آتے ہیں کہ کس طرح سے سجدہ کیا جائے، کس طرح اللہ کے سامنے جھکا جائے، کس طرح اس سے مناسبت پیدا کی جائے، تو جس طرح سے ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا دین و دیانت درست کریں، اسی طرح اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اپنی معاشرت و تمدن اور مدنیت کو بھی درست کریں۔

ہر ملّت کا ایک مزاج ہے

لیکن ہر قانون اور ہر ملت کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہودیت ایک ملت ہے، اس کا ایک مزاج ہے۔ نصرانیت ایک ملت ہے، اس کا خاص مذاق ہے۔ اسلام ایک ملت ہے، اس کا ایک مزاج ہے۔ اسلام میں بھی پھر ایک فرقہ اہل سنت والجماعت کا ہے، جس کو حق کہا گیا ہے۔ جتنے فرقے الگ الگ ہیں۔ ہر فرقے کا ایک مزاج ہے ــــ اہل تشیع کا ایک مزاج، سینوں کا ایک مزاج ــــ غرض جس طرح سے ہر ہر طبقے کا مزاج الگ الگ ہے۔ پوری ملت کا مزاج بھی الگ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنے مزاج کو باقی رکھ کر ہی اپنے اصولوں پر چل سکتے ہیں، اپنی بنیادیں قائم کر کے ہی اپنی تعمیر اٹھا سکتے ہیں۔ اگر ہم نے دوسروں کی بنیادوں پر تعمیر کھڑی کی، تو دوسرے کو حق ہے کہ وہ کل کو کہہ دے کہ میاں! زمین اور بنیاد میری ہے۔ تم اپنا ملبہ اٹھاؤ اور اپنی تعمیر ختم کرو۔ آپ بے بس ہوں گے، اپنا لگا لگایا سرمایہ آپ کو ختم کرنا پڑے گا ــــ لیکن اگر ذاتی بنیاد پر تعمیر اٹھائی ہے تو کوئی کہنے والا نہیں ہے کہ تم ملبہ لے جاؤ، بنیاد میری ہے۔ آپ کہیں گے کہ بنیاد، زمین اور تعمیر بھی ہماری ہے۔ بہر حال ہر ملت کا ایک الگ مزاج ہے جو اس کی تعمیر کی بنیاد ہے۔

دور جاہلیت کے تمدن کی بنیاد نفس پرستی پر اور اسلامی تمدن کی بنیاد حق پرستی پر ہے

آج اس چیز کی ضرورت ہے، جس کے لئے مسلمان دنیا میں آیا کہ اس تمدن کو یہ غالب کرے جس کو اسلام لے کر آیا ہے ــــ اس واسطے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانے میں مبعوث ہوئے تو دنیا میں دو بڑے بڑے تمدن قائم تھے۔ ایک طرف فارسیوں کا تمدن تھا، جس پر کسریٰ کی حکومت تھی۔ ایک طرف رومیوں کا تمدن تھا، جس پر قیصر کی سلطنت تھی۔ روم میں عیسائیوں کا اقتدار تھا اور فارس میں فارسیوں

کا اقتدار تھا۔ ان دونوں ملکوں اور حکومتوں نے تمدن کو انتہا تک پہنچادیا تھا ــــــ تاریخوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم اور آپ اس تمدن کے عشر عشیر تک بھی نہیں پہنچے، جتنا ان کا تمدن اونچا ہوچکا تھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ کوئی امیر اور رئیس اس وقت تک امیر نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کم سے کم ایک ایک لاکھ روپے کا لباس اور زیور اس کے بدن پر نہ ہو۔ پٹکا ہو تو کم سے کم دس ہزار روپے کا۔ اس طرح دیگر لباس۔ بہرحال مجموعی تعداد لاکھ ڈیڑھ لاکھ تک پہنچتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں، ہمارا بڑے سے بڑا رئیس اس مقام پر نہیں پہنچ سکا کہ صرف اس کے بدن پر ایک لاکھ روپے کا لباس ہو۔ یہ ممکن ہے کہ اس کی ساری جائیداد کار کو بھی لگا کر لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے زائد ہو۔ مگر یہ کہ بدن پر ایک لاکھ روپیہ لگا ہوا ہو، ایسا نہیں ہے۔ اور وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ زادے کے بدن پر ایک ڈیڑھ لاکھ روپیہ لگا ہوتا، تب وہ امیر سمجھا جاتا تھا اور سوسائٹی میں جگہ پانے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ یہی حال رومیوں کا تھا اور یہی فارسیوں کا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے اگر خالص تمدن مقصود ہوتا، تو اس سے بڑا تمدن آج تک نہیں پیدا ہو سکا، جتنا ہوچکا تھا۔ آج کی خصوصیات اپنی جگہ ہیں کہ مشینی تمدن ہے۔ یہ بے شک نہیں میسر نہیں تھا۔ لیکن مشینی حالات کو چھوڑ کر جہاں تک عمارات، غنا اور امیری کا تعلق ہے تو وہ بہت اونچے پہنچے ہوئے تھے۔ یہی چیز مقصود ہوتی تو اسلام اسی کی تائید کردیتا کہ فارسیوں کا اور رومیوں کا بھی تمدن حق ہے اور مقصود حاصل ہوجاتا۔ صحابہؓ کو اس کی ضرورت نہ پیش آتی کہ جنگیں لڑ لڑ کر اس تمدن کو ختم کر کے اسلامی تمدن کو جگہ دیں۔

اس کی بنا یہ تھی کہ ان تمدنوں کی بنیاد محض نفس کی آرائش پر تھی۔ اسلامی تمدن کی بنا رضاء خدا اور حق پرستی پر ہے، اس لئے دونوں کا مزاج بدل گیا ہے۔ اسے دنیا میں رائج کیا اور اس کے لئے بڑی بڑی محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں۔ اعلیٰ طریق تو یہ ہے کہ تمام مسلمان مل کر زمانے کی ضروریات سامنے رکھ کر، زمانے کے تقاضوں کو قطع نظر کر کے نہیں، بلکہ سامنے رکھ کر دینی طور پر اس تمدن کی بنیاد ڈالیں اور اسے غالب کریں۔ تاکہ دنیا کی قومیں ہمارے سامنے آئیں، جھکیں اور اسے قبول کرنے پر مجبور ہوں۔

دورِ حاضر کا تمدن جہاں اسلامی تمدن سے ٹکرائے تو اسلامی تمدن کو ترجیح دینی چاہئے

رہا یہ کہ زمانہ بدل چکا ہے ــــــ تو خوب کہا ہے لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے، وہ کہتا ہے کہ :

کیا ہوا آج جو بدلا ہے زمانے نے تجھے
مرد وہ ہے جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

مردانگی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہم جھک کر اپنے عجز کا اعلان کریں بلکہ ہم اپنا کردار اور کیریکٹر پیش کر کے دنیا کے سامنے اس کی خوبی اور برکت پیش کریں تاکہ دنیا ہمارے سامنے جھکنے پر مجبور ہو اور اس مشن کو لے کر آگے بڑھیں، جس مشن کو آگے بھیجنے اور پہنچانے کا ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ سے وعدہ کیا ہے۔

لیکن موجودہ حالات میں یہ ہمارے لئے دشوار ہے۔ ہم خواہ اپنی بدعملی سے یا تکوینی طور پر اس مقام پر آ گئے ہیں کہ دنیا کی قوموں کو جھکا نہیں سکتے۔ مگر کم سے کم یہ جذبہ تو سرد نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے تمدن ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی اچھی چیزیں لینے کا کوئی مضائقہ نہیں ــــــ دنیا میں جب کوئی نیا تمدن آتا ہے، اس کی ایک ہوا ہوتی ہے اور ہوا جب چلتی تو تنہائیوں میں بھی گھستی ہے۔ اس سے آدمی کو مفر نہیں ہو سکتا، اس

سے آدمی الگ نہیں رہ سکتا۔ اس سے متاثر ہونا ضروری ہے۔ مگر اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ کم سے کم ان مواقع کو دیکھیں جہاں اس تمدن کا اسلامی تمدن سے تصادم ہوتا ہو۔ اس میں ہم اپنے کردار اور اپنے مقاصد کو ترجیح دیں۔

دورِ جدید کے حوادث وواقعات سے اسلام صرف نظر نہیں کرتا

جیسے مثلاً فرض کیجئے آپ تجارت کر رہے ہیں اور تجارت کے سلسلے میں مالی تمدنی مشکلات بھی پیش آرہی ہیں۔ ان مشکلات کو آپ زیادہ سمجھتے ہیں۔ کچھ سنی سنائی ہمارے بھی سامنے ہیں۔ یقیناً مشکلات کا وقت ہے۔ لیکن جہاں ایسی چیزیں سامنے آرہی ہیں جو مشکلات کا باعث ہیں۔ انہی مشکلات میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں' جو ان کا بدل بھی ہو سکتی ہیں۔ ان چیزوں کو اختیار کر کے آپ کو غور کرنا ہو گا کہ کس حد تک یہ چیزیں اسلام سے موافقت کرتی ہیں اور کتنی مخالفت کرتی ہیں۔ پھر مخالف چیزوں میں بھی یہ دیکھنا ہو گا کہ کس حد تک اسلام گنجائش دیتا ہے اور کس حد تک نہیں دیتا۔ میرا یقین ہے کہ کیسا ہی تمدن اور کیسا ہی زمانہ آجائے' جو حوادث وواقعات پیش آتے ہیں' اسلام نے نہ پہلے کبھی ان سے قطع نظر کیا' نہ آج کرتا ہے اور نہ آئندہ کرے گا۔ ان کی رعایت کی جاتی ہے۔ ان کو سامنے رکھ کر اسلام ایسی گنجائشیں دیتا ہے کہ قوم کا مفاد ختم نہ ہو۔ کچھ تھوڑا تغیر کر دیا۔ کچھ تھوڑی سی ترمیم کر دی۔ بعض چیزوں کو بعینہٖ قبول کر لیا۔ کچھ تغیر' کچھ ترمیم' کچھ خلاف' کچھ قبولیت یہ مل کر کام چل سکتا ہے۔ ہمیں دنیا سے بہرحال الگ ہونا نہیں ہے۔

بعض چیزوں میں تھوڑا سا فرق پڑتا ہے ذرا سا طریقہ بدل دیں' فائدہ وہی کا وہی رہے گا۔ چیز بھی ضائع نہیں جائے گی اور حد جواز میں آجائے گی۔ ایسی صورتوں میں یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم خواہ مخواہ ایک ممنوع اور گناہ میں مبتلا ہو کر رہیں۔ جب کہ ایسا طریقہ بھی ممکن تھا کہ فائدہ بھی ہمارے ہاتھ سے نہ جاتا اور ہم کسی ناجائز چیز کے ارتکاب میں بھی مبتلا نہ ہوں۔

ہمارے ہاں میرٹھ میں حاجی عبدالغنی صاحب ایک تاجر تھے بڑے صالح اور نیک آدمی تھے۔ ان کے ہاں ٹوپیوں کی تجارت ہوتی تھی ___ ان سے دارالعلوم کے ایک فاضل نے فرمائش کی کہ مجھے دو ٹوپیاں بنادی جائیں جو خالص زری کی ہوں اور کام اتنا گھنا ہو کہ کپڑا نظر نہ پڑے۔ بس چاندی چاندی کا کام نظر پڑے کپڑا بالکل چھپ جائے۔

یہ اگلے دن پہنچے' انہوں نے کہا کہ ٹوپیوں کی تیس روپے قیمت ہے۔ پندرہ روپے کی ایک ٹوپی ہے۔ انہوں نے دیکھا تو ٹوپیاں بہت اعلیٰ اور ان کی مرضی کے مطابق بنی ہوئی تھیں ___ انہوں نے کہا دام کل کو بھجوادوں گا ___ حاجی صاحب نے کہا کہ بے اعتمادی کی بات نہیں ہے۔ چاہے ایک مہینے کے بعد بھجوادیں مگر آپ کے لئے یہ جائز بھی ہے؟ ___ انہوں نے کہا کہ اس میں ناجائز ہونے کی کیا بات ہے؟ کیا ادھار نہیں لیا جاسکتا؟

انہوں نے کہا کہ اس ٹوپی میں کپڑا بالکل نظر نہیں آتا۔ اسے موَرق کہتے ہیں اور موَرق کام کپڑے پر ہو تو وہ چاندی کے حکم میں بن جاتا ہے اور چاندی کی بیع وشرا میں ادھار جائز نہیں ہے۔

اب یہ بے چارے چپکے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ میں فاضل دیوبند ہو کر بھی نہیں جانتا اور تم دوکان پر بیٹھ کر بھی اتنے باریک مسائل جانتے ہو۔ مگر بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی' تو کہا کہ اچھا یہ معاملہ ختم۔ پرسوں دام لے کر آؤں گا۔

حاجی صاحب نے کہا کہ میں ایسی ترکیب نہ بتلاؤں کہ ادھار بھی ہو جائے، جائز بھی ہو جائے ــــ انہوں نے کہا وہ کیا ہے؟ کہا کہ آپ تیس روپے میرے سے قرض لے لو اور یہ ٹوپیاں نقد خرید لو۔ بعد میں قرض ادا کر دینا۔ اب یہ بے چارے بہت شرمندہ ہوئے ــــ خیر ان کو بات سمجھ آگئی اور انہوں نے بہت بہت ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ میں اس بات کو نہیں سمجھا تھا۔

بات وہی ہوئی کہ خریداری بھی ہوئی، ادھار بھی ہو گیا، مگر ذرا سے ردوبدل سے بات حد جواز میں آگئی۔ غرض بہت سے مسائل خواہ بینکنگ یا لاٹری سسٹم ہو یا انشورنس کا ہو۔ جہاں ان میں کچھ ناجائز چیزیں نکلیں گی، ایسی گنجائشیں بھی پیدا ہوں گی کہ اگر ذرا سا ردوبدل کر لیا جائے تو فائدہ تو ہاتھ سے نہ جائے اور چیز حد جواز میں آجائے اور ممنوع نہ رہے کہ جس سے آدمی گنہگار کہلائے اور کسی برائی کا مرتکب نہ ٹھہرے۔

دور حاضر کے پیش آمدہ واقعات میں مفتی اور صاحب واقعہ مل کر اعتدال کی راہ نکال سکتے ہیں

مگر اس کے لئے فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام آدمی کے لئے بھی فکر کی ضرورت ہے اور جو فتویٰ دینے والا مفتی ہے اس کے لئے بھی فکر کی ضرورت ہے کوئی سرسری چیز نہیں ہے۔ اگر آپ کوئی چیز اجمالاً پوچھیں گے تو فتویٰ اور ہو گا، تفصیل سے واقعات سامنے رکھ کر پوچھیں گے تو حکم اور ہو گا۔

اگر آپ مجھ سے یوں پوچھیں کہ ہم تجارت کر رہے ہیں۔ اس میں سودی کاروبار ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ میں کہوں گا حرام اور ناجائز ہے۔ سود کو اسلام نے حرام کیا ہے۔ قرآن میں صاف آیت موجود ہے۔ اجمالاً پوچھنے کا تو یہ جواب ہے۔

ــــ اور اگر آپ یوں کہیں گے کہ بینکنگ کا سسٹم جاری ہے۔ بین الاقوامی تجارت ہے، اس لئے اس میں پڑنا ناگزیر ہے۔ تجارت کرنے کی کوئی شکل نہیں ہے ــــ تو یا تو یہ فتویٰ دو کہ ہم سب چھوڑ چھاڑ کے جنگل میں جا کر بیٹھ جائیں اور چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں گزر کر لیں۔ دنیا کی قومیں بڑھیں گی ہم ان سے قطع نظر کر لیں گے کہ بھئی! بڑھتی ہیں تو بڑھ جائیں اور کل وہ ہمارے اوپر زیادتی کریں، تو ہم صبر کریں گے، مار کھائیں گے۔

اگر آپ یہ فتویٰ دیں تو ہم تیار ہیں ــــ اور اگر آپ یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ تمہیں دنیا کی قوموں کے دوش بدوش چلنا ہے۔ عزت و آبرو سے زندگی بسر کرنا ہے، بقدر ضرورت دولت بھی کمانا ہے۔ تو پھر اس مصیبت کا کیا علاج ہے؟ کہ اس سسٹم میں بعض چیزیں ناجائز بھی ہیں۔ آپ غور کریں۔ تو مجموعی حالت پر، جب آپ تفصیلی حالات سامنے رکھیں گے اور مفتی ان پر غور کرے گا، پھر حکم دوسرا ہو گا، پھر اس میں کچھ نہ کچھ گنجائش نکلیں گی۔ البتہ کچھ ایسی چیزیں بھی نکلیں گی جس میں آپ کو کچھ تغیر کرنا پڑے گا ــــ آخر شریعت یا دین کا قانون پبلک کے تابع تو نہیں ہو سکتا کہ جو آپ چاہیں، قانون ادھر ہی کو جھک جائے۔ وہ قانون کیا ہوا، وہ تو موم کی ناک ہو گئی۔ جدھر کو چاہو اسے پھیر دو۔ لوگوں کو ہی قانون کے تابع بننا پڑتا ہے۔

اسلام ابدی بین الاقوامی قانون ہے وہ بین الاقوامی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا

لیکن جب کوئی قانون بین الاقوامی ہوگا' وہ یہ بھی کہے گا میں ہر زمانے اور ہر ملت کے لئے یکساں قانون ہوں' میرا پیغام دنیا کی ہر قوم کے لئے ہے۔ تو اس قانون کو یہ رعایت بھی کرنی پڑے گی کہ کس قوم کی کیا ذہنیت ہے؟ اس کی کیا نفسیات ہیں؟ اس کا اصول کیا ہے؟ اس کا لین دین اور معاشرت کا کیا اصول ہے؟ اس کی رعایت کرنی پڑے گی۔

اسلام جب ایک جامع اور بین الاقوامی مذہب ہے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اندر رعایتیں نہ ہوں ــــ میں تو کہتا ہوں کہ بین الاقوامی تجارت کی نبیاد ہی اسلام نے ڈالی ہے۔ اس سے پہلے دنیا کو بین الاقوامی تجارت کی خبر نہیں تھی۔ تجارتیں بے شک بڑی بڑی تھیں۔ لیکن ایک ملک اور ایک شہر میں ہوتی تھیں۔ لیکن ایک ملک سے دوسرے ملک کو اور دوسرے سے تیسرے پھر پوری دنیا کو مال سپلائی ــــ اور پوری دنیا سے رقم اور روپیہ آئے اور جائے۔ یہ صورت نہیں تھی نہ ہی اس کے وسائل تھے۔ لیکن اسلام نے بنیاد ڈالی۔

قرآن کریم نے ایک دو نہیں بلکہ چھ سات قسم کے سفر بتلائے۔ تعلیمی سفر' تبلیغی سفر' اخلاقی سفر' تجارتی سفر اور سیاسی سفر وغیرہ۔ ان سفروں کی فضیلتیں بیان کیں اور ان سفروں کی نوعیتیں بیان کیں۔ تو بین الاقوامی مذہب نے بین الاقوامی راستے ڈالے اور چونکہ بین الاقوامی مذہب کو دنیا میں آنا تھا اور بھیجنے والا اللہ' جس کو ماضی اور مستقبل کی بھی اطلاع ہے۔ وہی جانتا تھا کہ بین الاقوامی مذہب اسی دور میں آنا چاہئے' جس میں بین الاقوامی وسائل بھی سامنے ہوں' نقل و حرکت کے بین الاقوامی وسائل ہوں' ایک ملک سے دوسرے ملک جانا آسان ہو۔ ایک ملک کی خبر دوسرے ملک میں پہنچانا آسان ہو۔ تو یہ ترتیب تھی کہ چونکہ تمدن بین الاقوامی ہونے والا ہے۔ تو دین بھی بین الاقوامی ہو تاکہ دین بھی دنیا کے سامنے آسکے۔ ایسا بین الاقوامی دین دنیا کی اقوام کی ذہنیتوں کو قطع نظر نہیں کر سکتا۔ ان کی نفسیات کی رعایت کرے گا۔ جب کہ اسلام کے خود اندرونی دائروں کے اندر بھی یہ چیز ہے۔ ہر قرن میں ہر موقع پر مختلف ذہنیتیں پیدا ہوئیں۔ بلکہ ہر سو برس کے بعد قوم کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔ جب ایک نسل ختم ہوتی ہے' دوسری نسل آتی ہے۔ تو دنیا میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ نظریات بدلتے ہیں۔ جب ایک جنگ ہو کر صلح کا وقت آتا ہے تو بھی نظریات تبدیل ہوتے ہیں۔ تمدن بدلتا ہے۔ اس لئے اسلام نے بھی یہ خبر دی کہ ہر سو برس کے بعد ہم مجدد بھیجیں گے جو دین کو نکھاریں گے اور اس کی تجدید کریں گے۔ چونکہ سو ہی برس کے لئے ان ضرورتوں کا انتظام ہوتا ہے۔ اس لئے بعد میں آنے والوں کے لئے کل دین کی ان کی مناسب حال' انہی کے رنگ میں' ان کی زبان میں تشریح کی جائے گی تاکہ وہ دین کو سمجھ سکیں۔

اگر قوم میں تصوف کا غلبہ ہوا تو اسلام نے اپنے کو صوفیانہ رنگ میں سامنے کیا تاکہ صوفی مشن لوگ سمجھ سکیں۔ صوفیانہ انداز میں تفسیریں لکھی گئیں ــــ جیسے محی الدین ابن عربیؒ اور امام غزالیؒ' ان لوگوں نے تفسیریں لکھیں۔ ایک زمانہ عقل پرستی کا آیا کہ لوگ بغیر عقل کی مدد کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ایسے مجدد پیدا ہوئے جنہوں نے قرآن و حدیث کو عقلی رنگ میں پیش کیا۔ امام رازی' شاہ ولی اللہ' امام غزالی رحمۃ

اللہ علیہم نے بھی یہ کام کیا کہ عقلی اصول پر تفسیریں لکھیں۔ قرآنی مسائل کو خالص عقل کے جالے میں سمجھا۔ ایک زمانہ آیا' اس میں طبعیات کا غلبہ تھا۔ تو طبعی رنگ میں قرآن وحدیث کو پیش کیا گیا۔ قرآن کی یہ جامعیت ہے کہ وہ ایسا حسین چہرہ ہے کہ جیسا لباس پہنادو، اتنا ہی حسین معلوم ہوتا ہے۔ جس رنگ کی کوئی قوم یا طبقہ سامنے آتا ہے، وہ اسی رنگ میں اپنے کو سامنے کرتا ہے۔ جیسے اسلام میں یہ جامعیت ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دنیا کے طبقات اور دنیا کی قوموں کی ذہنیت الگ الگ ہو۔ وہ سب کے لئے پیغام بنے اور سب کی نفسیات کی رعایت نہ کرے۔ اس میں ایسے جامع اصول موجود ہیں' وہ ضرور رعایت کرے گا۔

ایسی اشیاء جو اپنی ذات سے ممنوع ہیں خاص اوقات میں مشروع ہو جاتی ہیں

مگر ضرورت اس کی ہے کہ سوال کرنے والے اجمالی سوال نہ کریں۔ جن جن معاملات میں وہ مبتلا ہوں ان معاملات کو تفصیل سے واقعاتی رنگ میں پیش کریں۔ یوں نہ پوچھیں کہ فلاں چیز جائز ہے یا نہیں۔ بیمہ کرانا جائز ہے یا نہیں؟ انشورنش جائز ہے یا نہیں؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ناجائز ہے۔ اسلام کے اصول کے خلاف ہے۔ سود بھی ناجائز' انشورنش بھی ناجائز اور بیمہ کرانا بھی ناجائز۔ فلاں اور فلاں چیز بھی حرام۔

لیکن جب ان واقعات کی تفصیل پیش کریں گے اور مجموعی پہلو جب سامنے آئیں گے' تو حکم میں گنجائش نکلے گی۔ بلاشبہ اسلام میں شراب ناجائز ہے ___ خاص حالات میں اسلام کی تفصیلات پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن یہ حکم تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کوئی ایسا مریض ہو کہ ڈاکٹر کہہ دے کہ یہ اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک شراب نہ پئے۔ اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ شراب پئے' وہ اپنی جان بچائے۔ اسی طرح خنزیر ہے' اسلام میں بالکل نجس العین ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے گوشت پوست ہی نہیں بلکہ اس کا جوہر بھی ناپاک ہے۔ یہ ناجائز اور ممنوع ہے۔ لیکن اگر کوئی مررہا ہو' فاقے کی حالت میں ہو اور کوئی غذا نہ ملتی ہو' تو اسلام اجازت دے گا کہ اسے خنزیر کھلادو' اسے مردار کا گوشت بھی کھلادیں گے ___ کفر کا کلمہ کہنا اسلام کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی شرک کا کلمہ کہے ___ لیکن اگر ایک شخص تلوار لے کر مسلم کی گردن پر کھڑا ہو کہ یا کفر کا کلمہ کہہ' ورنہ ابھی تیری گردن قلم کردوں گا۔ اسلام اجازت دیتا ہے کہ دل سے ایمان پر مطمئن رہو' زبان سے کفر کا کلمہ کہہ دو۔ اب کوئی شخص ہم سے یہ سوال کرے کہ صاحب! کفر کا کلمہ جائز ہے یا ناجائز؟ ہم کہیں گے بالکل حرام ہے۔ آدمی کافر ہو جائے گا۔ لیکن اگر یوں کہے میں اصول نہیں پوچھتا' میں تو یہ واقعہ پوچھتا ہوں کہ میرے اوپر ایک شخص تلوار لے کر آیا ہوا ہے' کہ کہہ کفر کا کلمہ' ورنہ گردن قلم کردی جائے گی۔ اب یہ حکم ہو گا کہ تیرے لئے جائز ہے' کفر کا کلمہ کہہ دے۔

اس سے اندازہ ہوا کہ ایک شئے اپنی ذات سے بالکل ممنوع ہوتی ہے' لیکن حالات کے سامنے آنے سے اس میں گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ صورت خواہ انفرادی ہو یا قومی ہو۔ اسلام میں گنجائشیں نکلتی ہیں۔ اسلامی قانون میں لچک ہے۔ یہ اعتدال کا مذہب ہے۔ افراط و تفریط کا مذہب نہیں ہے۔ ایک درمیانی نکتہ پر ہے جس میں دونوں پہلوؤں کی رعایت نکلتی ہے۔

اس بنا پر میں عرض کررہا ہوں کہ مسئلے دو ہی ہیں۔ ایک دیانت کا ہے۔ جس میں عبادات آتی ہیں۔ ایک معاشرت کا ہے۔ جس میں تجارت' معاملات' بیع و شرا' نکاح و طلاق' زمین کی خریداری' ٹھیکہ' کرایہ داری اور محکمہ قضاء مقدمات' فوجداری اور دیوانی عدالت' یہ اس کے نیچے آجاتی ہیں۔ ان سب کے اصول بتلائے گئے ہیں جو معتدل ہیں اور جامع بھی ہیں۔ ہر قوم کے جذبات کو اپیل کرسکتے ہیں' لیکن جب' جبکہ قوم اس کی طرف

توجہ کرے یا خود سمجھے اور سیکھے یا پھر سیکھے ہوئے سے پوچھ کر اس پر عمل کرے، مگر شرط یہ ہے کہ تفصیل سے پوچھو ___ تو جس طرح سے استفتاء اور سوال کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ فکر کے ساتھ واقعات سامنے رکھیں۔ اسی طرح مفتیوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ سارے واقعات کے ایک ایک پہلو کو سامنے رکھ کر حکم لگائیں۔ صرف اجمالی ذکر نہ کریں۔ تفصیلی واقعات کو سامنے رکھ کر فتویٰ صادر کریں۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس میں ایسی گنجائشیں نکلیں گی کہ قوم اپنے مفاد سے بھی محروم نہیں ہوگی اور ناجائز و حرام کا ارتکاب بھی نہیں کرے گی۔

مفتی کے سامنے تفصیلی واقعات لانے سے ہی جدید مسائل میں گنجائشیں نکل سکتی ہیں

اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ سوالات کو آپ ہی مرتب کریں اور جوابات کے لئے ہم علماء کی کمیٹی بٹھادیں گے کہ ان واقعات پر غور کر کے آپ فتویٰ دیں کہ کیا حکم ہے؟ یا تو یہ کہیں کہ قوم تجارت کو چھوڑ دے اور بالکل بین الاقوامی دنیا سے نکل کر جنگلوں میں جاکے بسر کرے۔ لیکن اگر اس کو ایک سچا شہری بننا ہے تو پھر جب اس کی شہریت بدل گئی ہے، اس کے مناسب آپ بھی گنجائشیں نکال کر فتویٰ دیں۔ جتنی اسلام نے گنجائش دی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔

زیادہ سے زیادہ مفتی یہ کہے گا کہ تم مجرم ہو۔ تم ناجائز چیزوں کا ارتکاب کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں مجرم کے لئے بھی گنجائشیں دی جاتی ہیں۔ شبہ کا فائدہ مجرم کو دیا جاتا ہے۔

اگر شبہ نکل آئے تو مجرم کی سزا اٹھالی جاتی ہے۔ تو ہم مجرم سہی، مگر ساتھ ہی کچھ شبہات بھی ہیں۔ ان شبہات کا فائدہ بھی ہمیں پہنچے گا۔ گنجائش ہمیں ملے گی۔ مگر واقعات کو پیش کرنے والے کو چاہئے کہ وہ تفصیلی واقعات ذکر کرے۔ اس زمانے میں اجمال اور سرسری بات سے کام نہیں چلتا۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم ان چیزوں سے بالکل نابلد ہیں۔ ہم ان واقعات میں پڑے ہوئے نہیں۔ اب ہمیں کیا خبر کہ انشورنس میں کیا ہوتا ہے اور بیمے کس طرح سے کرائے جاتے ہیں، اس لئے کہ نہ تجارت کر رہے ہیں نہ انشورنس، آپ حضرات مطلع ہیں، آپ تفصیل سے بتائیں۔

حکم بتلانا ہمارا کام ہے، واقعات بتلانا آپ کا کام ہوگا۔ اگر آپ نے واقعات پر اجمال برتا۔ تو ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہم تو یوں کہہ دیں گے کہ تم جو کر رہے ہو وہ حرام ہے۔ لیکن اگر واقعات اچھی طرح سے سامنے آئیں تو پھر جامع فتویٰ آئے گا۔

اس واسطے اس مختصر مجلس میں میں اتنا عرض کر سکتا ہوں۔ حضرات محترم مقررین نے جو کچھ کہا، وہ بیشک ہم تفصیل سے نہیں سمجھے۔ لیکن بالاجمال ایک اندازہ ہوا کہ دین و دنیا ان دونوں کے اندر ہمیں بڑھنا ہے۔ دین کی بھی حفاظت کرنی ہے۔ اپنی تعلیم اور مدارس کی بھی حفاظت کرنی ہے اور ساتھ ساتھ اپنی تجارت کی بھی حفاظت کرنی ہے۔ تجارتی لوگ نہ ہوں تو نہ مدارس چلیں، نہ علماء کی کتابیں چھپیں نہ کام ہو۔ تو دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ بہرحال واقعات کو شریعت کے سامنے پیش کر کے حل کیا جائے، اور فتویٰ حاصل کیا جائے۔ تاکہ لوگ بھی مطمئن رہیں کہ ہم کسی ناجائز پر نہیں چل رہے ہیں اور دنیا بھی ہماری چل رہی ہے۔ اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ ہم علماء کی ایک جماعت بٹھادیں گے، جو غور فکر کر کے اس کے بارے میں احکام دے۔ آپ

کا کام ہو گا کہ تفصیل سے واقعات ہمارے سامنے رکھیں تاکہ ان پر حکم دیا جا سکے۔

اظہارِ تشکّر

یہ چند باتیں مجھے گزارش کرنی تھیں اور اخیر میں اپنے بزرگوں اور بھائیوں کا اور **مخلصین افریقہ** کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ایک ناچیز بھائی کی پذیرائی فرمائی۔ اتنی عزت افزائی فرمائی، جس کا میں واقعی مستحق نہیں تھا۔ یہ محض آپ لوگوں کا کرم ہے۔ ہم اس کے شکر گزار بھی ہیں اور دل میں اس کا ایک نقش لے کر جائیں گے۔

یہ زبانی شکریہ نہیں، بلکہ دل معترف ہے اور جہاں جائیں گے دل میں اس کی قدر رہے گی اور اقرار رہے گا۔

اور سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ اس ماحول میں رہ کر، ان حالات کے اندر بھی آپ لوگوں میں دینی جذبہ موجود ہے۔ گویا آپ جانتے ہیں کہ ہماری نسلوں کے اندر دین وایمان باقی رہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہر قوم کا کیریکٹر الگ ہوتا ہے۔ ہم اپنے قومی کیریکٹر کی خصوصیات چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اگر یہ جذبات موجود ہیں تو کام بالکل آسان ہو جائے گا۔ واقعات پیش کریں۔ فتویٰ ان کے اوپر ہو گا اور ان شاء اللہ پھر زیادہ دشواری نہیں پیش آئے گی۔ تھوڑی بہت اس میں آپ کو تبدیلی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ بعض چیزوں میں ہم اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان میں لوٹا کے پیچھے لانا پڑے گا۔ اسلام نے اتنا زیادہ آگے بڑھنا نہیں بتلایا ہے۔ جیسے رجعت نہیں بتلائی کہ رجعت پسند بن کے پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ بھی نہیں بتلایا کہ بالکل آگے بڑھ جاؤ۔ اعتدال کے نقطے پر قائم رہو۔

بہرحال یہ چیز قابل قدر ہے اور ہم دعا کرتے ہیں اور آئندہ بھی دعا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کی مشکلات کو آسان فرمائے اور سیدھا اور آسان روشن راستہ کھول دے اور آپ کی تجارتوں اور دین میں برکت عطا فرمائے۔ اس وقت نماز کا بھی وقت ہے۔ یہی چند ضروری کلمات عرض کرنے تھے اور میں شکریہ پر ختم کرتا ہوں۔

وأخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اشتراک مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائے گی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہو گا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں ــــ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو' اونچ نیچ نہ ہو۔ جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا' وہی کامیاب ہو گا۔

از حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةِ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــ اَمَّا بَعْدُ ــــ

اشتراک ذہن

بزرگان محترم!

اس وقت آپ جانتے ہیں کہ سائنس نے پھیلی ہوئی دنیا کو سمیٹ کر بہت مختصر بنادیا ہے۔ پوری دنیا ایک چھوٹا سا کنبہ بن گئی ہے۔ ایجادات نے ملنا جلنا اور چلنا پھرنا سہل بنادیا ہے۔ پہلے بیل گاڑی وغیرہ کے سفر میں بہت دشواری ہوتی تھی' خشکی کے راستے سے حج کے لئے پیدل چلنے میں دو تین سال لگتے تھے' دوسری سواریوں میں نو مہینے لگتے تھے' لیکن آج سائنس کے ترقیات نے سفر کو سہل بنادیا۔ رتھوں اور بیل گاڑیوں کی جگہ ریلیں چلیں اور اب تو ہوائی جہاز چلنے لگے جو بمبئی سے جدہ تک ۹ گھنٹے میں پہنچ جاتے ہیں' حالانکہ دریا کے راستہ سے یہ سفر (۹) دن میں طے ہوتا ہے اور اب تو ریڈیائی لہروں سے ہوائی جہاز چلانے کے بارے میں سوچا جارہا ہے یعنی انسان بالکل پرندوں جیسے ہو جائیں گے اور گھنٹوں کی مسافت منٹوں میں طے ہو گی اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ کوئی بات کہنے کے لئے کہیں جائیں' کسی شہر میں جلسہ ہو تو مقرر وہیں پہنچ کر تقریر کرے بلکہ ریڈیو کے ذریعے ساری دنیا سے خطاب کیا جاسکتا ہے۔ ان چیزوں نے پوری دنیا کو ایک کنبہ بنادیا ہے اور سارے ممالک محلوں کی حیثیت میں ہو گئے ہیں۔ ان ایجادات کا اثر یہ پڑا کہ ملکوں کی خصوصیات مٹتی چلی گئیں اور ایک ملک کا اثر اور اس کے رجحانات دوسری جگہ اثر انداز ہونے لگے۔ خیالات میں بھی اشتراک پیدا ہوتا

جارہا ہے یعنی جذبات ایک سے‘ افکار ایک سے‘ خیالات ایک سے یعنی ساری دنیا یہ چاہتی ہے کہ ہم سب ایک ہو جائیں برما کے وزیر صحت ہمارے یہاں آئے تھے‘ اس سے پوچھا گیا کہ آپ کا دہلی کیسے تشریف لانا ہوا تھا‘ تو انہوں نے فرمایا کہ ہمیں حکومت ہند سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ملک اپنے داخلی معاملات میں بھی خارجی ممالک کی پالیسی کے ماتحت ہے گویا کہ سیاست داخلی سیاست خارجی سے پوری طرح متاثر ہے۔ چنانچہ یونائیٹڈ نیشنل کا ادارہ (یو این او) یعنی مجلس اقوام متحدہ قائم ہے جو اشتراک ذہن کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ دنیا کی قوموں کے تعصبات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ حد بندیاں اور خصوصیات ختم ہو رہی ہیں۔

تبدیلیٔ اصول

چنانچہ اب یہ صدا اٹھ رہی ہے کہ اگر عالمی امن چاہتے ہو تو چھوت چھات مٹاؤ اور امتیازات کو ختم کرو‘ اسی وقت امن قائم ہوگا۔

گاندھی جی جب دلی میں آتے تھے بھنگی بستی میں قیام کرتے تھے۔ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے اب امتیازات ختم کرنے کا زمانہ آگیا ہے۔

پنڈت پنت صاحب جب رنکھنڈی میں آئے تو انہوں نے ایک ہریجن کے مکان پر قیام کیا اور اس کے گلاس میں دودھ پیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوا کہ تمام قوموں کے اصول بدل رہے ہیں۔

پہلے عوام تابع تھے خواص کے اور اب خواص تابع ہیں عوام کے‘ پہلے چراغ تلے اندھیرا تھا اب چراغ کے اوپر اندھیرا ہے۔ پہلے جو چیز چھپانے کی تھی وہ اب برسرعام آگئی‘ مثلاً دولت‘ عورت‘ پہلے خواص کی رائے اہمیت رکھتی تھی۔ اب عوام کی رائے کو اہمیت ہے‘ لہٰذا خواص کو نیچے اترنا پڑے گا اور عوام کو اوپر اٹھنا پڑے گا۔

اشتراک مذہب

حالات یہ بتلا رہے ہیں کہ جب ہماری تمدنی اور معاشرتی زندگی ایک جیسی ہو جائیگی تو پھر قدرتی طور پر یہ جذبہ پیدا ہوگا کہ ہماری روحانی زندگی بھی یکساں ہو اور مذہبی جذبات بھی یکساں ہوں۔ اس لئے لامحالہ آج کے قبول کئے جانے والے مذہب میں یہ بات ضروری ہے کہ اس میں تعصب نہ ہو‘ اونچ نیچ نہ ہو‘ جو مذہب ان تمام خصوصیات میں پورا اترے گا وہی کامیاب ہوگا۔

چنانچہ ایک مذہب نے اعلان کیا کہ :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى الخ۔

گویا تمام اقوام مل کر ایک بدن کے اعضاء ہیں۔ "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند الخ۔

"ہم نے تم میں قبیلے بنائے تاکہ پہچان باقی رہے نہ اس لئے کہ تفاخر کا ذریعہ ہو‘ تم میں نسل کے اعتبار سے کوئی بڑائی چھوٹائی نہیں‘ البتہ عمل کے اعتبار سے بڑائی چھوٹائی رہے گی‘ پیدائشی اعتبار سے کوئی چھوٹائی بڑائی نہیں" آفتاب اگر چمکتا ہے تو وہ روشنی تقسیم کرنے میں اونچ نیچ نہیں برتتا بلکہ سب اپنی اپنی اہلیت کے مطابق روشنی سے مستفید ہوتے ہیں‘ شیشہ اپنی قابلیت کے لحاظ سے روشن ہوتا ہے اور کالا توا اپنی صلاحیت کے لحاظ سے نمایاں ہوتا ہے۔ اس نے اعلان کیا کہ عبادت گاہیں کسی کے لئے مخصوص نہیں ہیں‘ جو زیادہ خشوع سے عبادت کریگا وہ بڑھ جائے گا اور جو ایسا نہ کرے گا وہ نیچا رہے گا۔

عمومی مساوات

حضورؐ نے فرمایا کہ اگر رسول کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) بھی چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹ دوں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ممبر پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ سنو اور مانوں ایک بڈھے نے کہا ہم ایسا نہیں کریں گے، تم خائن ہو۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ میں نے کیا خیانت کی؟ تو اس نے کہا، بیت المال سے سب کو ایک ایک چادر ملی ہے لیکن آپ کے بدن پر دو چادریں ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس کا جواب میرا بیٹا عبداللہ دے گا۔ عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنی چادر اپنے باپ کو دے دی تھی۔ معلوم ہوا کہ اگر امیر اعتراض کر سکتا ہے تو غریب بھی اپنے امیر پر اعتراض کر سکتا ہے۔ غور کی بات ہے کہ آج کے دور میں یہ اعلان مناسب ہو گا کہ اے انسانو! تم ایسے کام کرو جن میں سب کے لئے نفع سب کے لئے عزت سب کے لئے راحت ہو____ یا

یہ اعلان مناسب رہے گا کہ اے ہندیو! اے عربو! تم صرف اپنا نفع دیکھو، بہرحال اونچ نیچ جو کچھ بھی ہے عمل کے امتیاز سے ہے، لہٰذا وہی مذہب چل سکے گا جس میں عمومی مساوات موجود ہو۔ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس وقت دنیا نے اسی اصول مساوات سے استفادہ کیا ہے۔ لہٰذا اب زمانہ کا تقاضہ ہے کہ معاشی اور معاشرتی اور روحانی ہر اعتبار سے یکسانیت ہو، جو گروہ پہلے ہی سے اس ہمہ گیر ذہنیت کو لے کر چل رہا ہے اسے کسی سے لڑنے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی، وہ سب کو اپنے اندر سمو سکے گا۔

حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول

بہرحال تعصب سے بچنا پڑے گا۔ تعصب مختلف اسباب سے قوموں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض دفعہ اس سے بھی تعصب پیدا ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مقتداء کو برا کہا جائے لہٰذا سب سے پہلے اس آیت قرآنی میں یہی کہا گیا ہے کہ "ہم نے مان لیا اللہ کو اور اس کی کتاب کو جو ہماری طرف اتری ہے" لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ پہلوں پر نازل ہوا اس کو برا کہو بلکہ یہاں تک ہے کہ جو کچھ نبیوں، رشیوں، منیوں پر نازل ہوا ہم ان سب کو بھی ان کے وقت کے لئے سچا سمجھتے ہیں۔ حد بندیوں کے توڑنے کا واحد اصول یہی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں جتنی سچائیاں ہیں انہیں قبول کرے اور کتابوں کو سچا سمجھے اور جو کچھ ان لوگوں نے بعد میں اضافہ یا ترمیم کی ہے، اس کو رد کرے، قرآن کریم نے اعلان کیا ہے کہ ہم نے تمام اقوام میں رسول بھیجے ہیں، شام، دمشق، عرب وغیرہ میں پیغمبر آئے۔ پھر کیا ہندوستان میں کوئی پیغمبر نہیں آیا؟ ضرور آیا۔ سب سے پہلے تو حضرت آدم علیہ السلام ہی آئے جو لنکا میں اترے، گویا مذہب کی ابتداء ہندوستان سے ہوئی ان کی کنیت ابوالبشر ہے (یعنی مہادیو) ان کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کی قبر اجودھیا میں ہے، پھر ہر ملک اور قوم میں انبیاء علیہم السلام تشریف لاتے رہے، آخر میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عرب میں مبعوث ہوئے تو گویا ہندوستان سے پیغمبری کی ابتداء ہوئی اور عرب پر ختم ہوئی۔

مہاتما بدھ کی پیشین گوئی

حدیث میں ہے کہ اللہ کے نزدیک دو جگہیں بہت مقبول ہیں، ایک وہ جگہ جس میں حضرت آدم علیہ

السلام اترے' دوسری وہ جگہ جس میں کعبہ اللہ ہے۔ حضرت مولانا مناظر احسن صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "النبی الخاتم" اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مہاتما بدھ نے ہندوستان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حضورؐ کی بشارت دی تھی۔

چنانچہ بدھ کی جانکنی کے وقت بدھ کے ایک شاگرد ننداؔ نے ان سے پوچھا کہ تمہارے بعد اب ہماری راہنمائی کون کرے گا؟ تو مہاتما بدھ نے کہا کہ ہم سے پہلے بہت بدھ آچکے ہیں اور اب ایک آخری بدھ آئے گا جس کا لقب متریا ہوگا۔ اس کے بتلائے ہوئے طریقے پر چلنا چاہئے۔ متریا کے معنی ہیں رحمت کے۔ قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین کہا گیا ہے۔ چنانچہ بدھ مذہب والوں نے اکثریت سے اسلام کی تعلیمات قبول کیں۔

اجمالی ایمان

قرآن پاک میں ایک جگہ ایک پیغمبر کا نام ذوالکفل فرمایا گیا' مولانا مناظر احسن نے اسکے متعلق اپنے اس خیال کا بھی اظہار فرمایا ہے کہ یہ مقام کپل ہے اور کپل وستو اسی سے بنا ہے کفل اور کپل میں زیادہ فرق نہیں' ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ بہرحال مشرق ممالک نے اس بشارت کو قبول کیا اور مغربی ممالک مادیات میں پھنس کر تباہ ہوگئے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سرہند شریف کے متعلق فرمایا ہے کہ یہاں دو پیغمبر ہیں' حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ گنگا کے پانی میں خصوصی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس پر غور کیا کہ گنگا کہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس کی تلاش میں چل دیئے اور گنگوتری پہنچے' وہاں ایک ہفتہ قیام کیا اور واپس آکر فرمایا کہ جہاں گنگا کا دہانہ ہے وہاں کسی پیغمبرؑ کے انوار نظر آتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ گنگا کسی پیغمبر کی دعا سے نکلی ہو۔ جیسے زمزم کا چشمہ حضرت اسمٰعیلؑ کی برکت سے جاری ہوا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے لکھا ہے کہ رام چندر جی اور کرشن جی کو برا مت کہو' ممکن ہے یہ اپنے وقت کے پیغمبر ہوں' اس لئے نام لے کر انہیں کبھی برا نہ کہو۔ چنانچہ ان کے پیغامات میں بہت سی باتیں حق ہیں۔ ممکن ہے بعد کے لوگوں نے خلط ملط کردیا ہو۔ جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے اپنی تعلیمات میں خلط کردیا ہے۔ اسی لئے حکم ہے کہ جن کا نام قرآن وحدیث میں صراحۃً موجود ہے ان کا نام لے کرمانو اور جن کا نام نہیں آیا ان پر اجمالاً ایمان لاؤ۔

مذہب کی بنیاد

اس کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کی بنیاد ماننے پر ہے' یعنی تصدیق پر مدار ہے تکذیب پر نہیں۔ بخلاف اس کے یہودیوں کا مدار حضرت عیسیٰ کے انکار پر ہے اور عیسائیوں کا مدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار پر' مگر اسلام نے اپنی بنیاد ماننے پر رکھی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مذہب کی بنیاد ماننے ہی پر ہو سکتی ہے نہ ماننے پر نہیں' یعنی مذہب کی بنیاد مثبت پہلو پر ہونی چاہئے منفی پہلو پر نہیں۔

بہرحال چونکہ پوری دنیا ایک قبیلہ بن گئی ہے اس لئے اب حدبندیاں قائم نہیں رہ سکتیں' یہی حال روحانی خیالات اور عقائد کا بھی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تعصبات مٹانے پڑیں گے اور تفریق ختم کرنی ہوگی اور وطن کی حدبندی ختم کرنی ہوگا۔ مدار ملک کا کلی امور پر ہوتا ہے' جزوی امور پر نہیں ہوتا ___ اور کلی امور

عالمی امور ہیں، ان ہی پر ملک کا دارومدار ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے تیرہ سو سال پہلے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کسی ملک والے کو دوسرے ملک والے پر فضیلت نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

احترام انسانیت

انسانیت کا احترام اسی طرح ضروری ہے جس طرح مذہبیت کا للہذا چھوت چھات اور تعصب کو مٹانا پڑے گا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن ایہم شاہ غسان مسلمان ہو کر طواف کر رہا تھا، اس وقت کسی اعرابی کا پاؤں اس کی چادر پر پڑ گیا تھا۔ جبلہ نے اس اعرابی کے طمانچہ مار دیا۔ اعرابی نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے حکم دیا کہ یہ اعرابی اپنا بدلہ اس طرح لے سکتا ہے کہ جبلہ کے ایک طمانچہ لگائے۔
یہ وہی مساوات کا معاملہ تھا۔ جبلہ نے اس حکم کو سن کر کہا کہ مجھے مہلت دی جائے، جب اس کو مہلت دی گئی تو وہ بھاگ گیا اور پھر کفر کو اختیار کر لیا۔ لیکن اسلام نے بڑے اور چھوٹے، اونچ نیچ کے فرق کو مٹانے کے لئے کسی بات کی پرواہ نہ کی۔

مذہب واحد

بنی اسرائیل کو ہر طرح کی دولت اور حکومت دی گئی تھی۔ انہوں نے عیش پرستی میں زندگی گزارنی شروع کر دی، پیغمبروں نے بہت سمجھایا، مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر عراق کے بادشاہ بخت نصر نے چڑھائی کی اور ان کا قتل عام کیا اور کئی لاکھ بنی اسرائیل گرفتار کئے گئے۔ حضرت دانیالؑ پیغمبر بھی اسیروں میں سے تھے (ان کی دیانت وامانت وراست بازی صدق وصفا اور عبادت وزہد کو دیکھ کر حکام جیل ان کے گرویدہ اور معتقد ہو گئے اور کمال احترام سے پیش آنے لگے، اس حالت پر ایک عرصہ گزر جانے کے بعد) بخت نصر نے ایک خواب دیکھا جس سے اس کی دل میں گھبراہٹ اور بے چینی پیدا ہوئی۔ اس نے دربار کے کاہنوں اور ساحروں کو طلب کیا اور اپنی قلبی بے چینیوں کا ذکر کرتے ہوئے جو اس غیر معمولی خواب سے پیدا ہوئی تھیں، ان سے خواب کی تعبیر طلب کی، انہوں نے کہا کہ خواب بیان فرمائیے۔ کہا کہ خواب تو مجھے یاد نہیں رہا۔
انہوں نے کہا کہ پھر تعبیر کیسے بتلائیں؟ اس نے غضبناک ہو کر کہا کہ :

> "میں نے تمہیں اسی قسم کے انکشاف کے لئے تو دربار میں اس رتبہ تک پہنچایا تھا (جب تم ایسے امور کا بھی انکشاف نہیں کر سکتے تو تم کس مرض کی دوا ہو؟) جاؤ تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اگر تم نے اس مدت میں خواب اور تعبیر بتلا دی فبہا، ورنہ تم سب قتل کر دیئے جاؤ گے"۔

اس واقعہ کا چرچا ہو گیا شدہ شدہ یہ خبر جیل میں بھی پہنچی اور حضرت دانیال علیہ السلام کے کان میں پڑی۔ آپؑ نے جیلر سے فرمایا جو ان کا بہت زیادہ معتقد اور محسن تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بادشاہ سے میرا تذکرہ کر دے کیونکہ میرے پاس اس کے خواب کا علم ہے اور مجھے امید ہے کہ اس سے بادشاہ کے یہاں تیرا رتبہ اور منصب بڑھ جائے گا اور میری رہائی کی صورت نکل آئے گی (جس سے میری قوم اس قید وبند کے عذاب سے چھٹکارا پا سکے گی) جیلر نے کہا، مجھے آپ کے بارے میں بادشاہ کے بے پناہ غصہ کا ڈر ہے کہیں آپ جیل کے مصائب سے چھوٹنے کے لئے فرما رہے ہو، یا واقعی آپ کو علم ہے۔ حالانکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دنیا میں اگر کسی کو بادشاہ

کے اس فراموش شدہ خواب کا علم ہے تو وہ صرف آپ ہی کی ذات ہے ___ فرمایا 'تم میرا خوف نہ کھاؤ اور بے فکر ہو کر بادشاہ سے میرا تذکرہ کردو (میں قطعاً اس کے خواب اور تعبیر خواب کو جانتا ہوں) جس کی وجہ سے یہ ہے کہ میرا ایک رب ہے جو مجھے ان باتوں کی خبریں دے دیتا ہے 'جن کو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جیلر نے بادشاہ سے جا کر تذکرہ کردیا۔ بادشاہ نے اسی وقت حضرت دانیال علیہ السلام کو طلب کرلیا اور وہ شاہی دربار تک پہنچا دیئے گئے۔ دربار کا ضابطہ تھا کہ اندر داخل ہونے والا بادشاہ کو سجدہ کرے۔ لیکن دانیال علیہ السلام داخل دربار ہو کر کھڑے رہے اور سجدہ نہ کیا۔ تھوڑے وقفہ سے بادشاہ نے دربار برخاست کیا اور تخلیہ میں حضرت دانیال علیہ السلام سے گفتگو شروع کی۔

سب سے پہلے پوچھا کہ آداب دربار کے مطابق آپ نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ فرمایا 'اس کی وجہ ہے کہ میرا ایک رب ہے کہ میں اس کے سوا کسی کو سجدہ نہ کروں 'میں اس سے ڈرتا ہوں کہ میں تجھے سجدہ کراوں اور وہ اسی وقت یہ علم مجھ سے سلب کرلے 'تو میں تیرا خواب نہ بتلانے کے سبب تیرے ہاتھ میں قیدی بن کر رہ جاؤں اور تو مجھ سے اس علم سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور مجھے قتل کر ڈالے 'اس لئے میں نے ترک سجدہ قتل سے آسان سمجھا اور ترک سجدہ کے خطرہ کو اس خطرہ سے ہلکا سمجھا کہ تو ساری عمر اس بے چینی میں مبتلا رہے جس میں فراموش شدہ خواب کی وجہ سے اب مبتلا ہے 'پس میں نے ترک سجدہ تیرے اور اپنے دونوں ہی کے لئے مفید سمجھا۔

بخت نصر نے کہا کہ میرے نزدیک تجھ سے زیادہ اللہ و معبود کا وفادار اور دوسرا نہیں اور بلاشبہ وہی لوگ پسندیدہ ہیں جو اپنے رب کی عہد و میثاق کو پورا کرتے اور وفادار رہتے ہیں ___ ہاں تو کیا تیرے پاس میرے خواب اور اس کی تعبیر کا علم ہے؟ فرمایا 'ہاں ہے۔

"تو نے خواب میں دیکھا کہ زمین و آسمان کے درمیان ایک عظیم الشان بت معلق ہے۔ جس کے پاؤں زمین پر لگے ہوئے ہیں اور سر آسمان میں۔ اس بت کے اوپر کا حصہ سونے کا ہے 'درمیانی حصہ چاندی کا ہے اور نچلا حصہ تانبے کا ہے 'ٹانگیں لوہے کی ہیں اور قدم مٹی کے ہیں۔ تو اس کی خوبصورتی 'حسن و جمال اور بے نظیر ساخت کو حیرانی سے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک زبردست پتھر گرا اور اس بت کی ٹھوڑی پر آکر اس زور سے پڑا کہ یہ بت پاش پاش ہو کر سرمہ کی طرح پس کر رہ گیا اور اس کا سونا 'چاندی 'تانبہ 'لوہا اور مٹی سب ایک رل ہو کر اس طرح خلط ملط اور ڈھیر ہو گئے کہ یہ سب دھاتیں رل مل کر ایک ذات ہو گئیں اور کوئی دھات دوسری سے ممتاز اور جدا نہ رہی اور تو اس یقین پر پہنچ گیا کہ اگر دنیا کے تمام انسان اور جن بھی جمع ہو کر یہ چاہیں کہ ان دھاتوں کو الگ الگ کردیں تو نہیں کر سکتے۔ اگر اس حالت میں ہوا چل جائے تو (یہ دھاتیں پس کر اس درجہ سرمہ ہو گئی ہیں کہ) ہوا بھی ان ذرات کو اڑا سکتی ہے۔

اسی حالت میں تو نے دیکھا کہ وہ آسمان سے گرنے والا پتھر (اس بت کو پیس دینے کے بعد) اچانک فضائے آسمانی میں پھیلنا شروع ہوا 'اور پھیلتے پھیلتے اتنا بڑا ہو گیا کہ پوری زمین پر چھا گیا 'اور زمین اس سے چھپ گئی یہاں تک کہ آسمان اور اس پتھر کے سوا تجھے کچھ اور نظر نہیں آرہا تھا۔

بخت نصر نے کہا بالکل درست 'یہی تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا تھا۔ اچھا اب اس کی تعبیر فرمایئے!

حضرت دانیال علیہ السلام نے فرمایا (سنئے) وہ بت دنیا کی مختلف قومیں ہیں جو دنیا کے اول و آخر اور درمیانی زمانوں میں (مختلف درجات و مراتب کے ساتھ آئیں گی اور) موجود ہیں۔ سو اس بت کے سونے کا حصہ تو یہ موجودہ دور اور تیری قوم ہے جس پر تو حکمرانی کر رہا ہے اور چاندی کا حصہ تیرے بعد کی قوم ہے جس پر تیرا بیٹا

حکمرانی کرے گا ___ اور تانبے کا حصہ رومی ہے اور لوہے کا حصہ فارسی قوم ہے ___ اور مٹی کا حصہ دو اور قومیں ہیں جن پر دو عورتیں حکمرانی کریں گی۔ ایک مشرقی یمن اور ایک مغربی شام ہیں اور وہ پتھر جو اس خوشنما بت کے اوپر آسمان سے پھینکا گیا' وہ دین ہے جس کو نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) لے کر آویں گے وہ اور ان کی امت ان قومیتوں کے بت پر پھینک کر مار یگی تاکہ اس دین کو تمام اقوام کے ادیان پر غالب کردے قومیتوں کی اس اونچ نیچ کو ہمیشہ کے لئے فنا کردے) پس اللہ تعالیٰ ایک نبی امی کو عرب میں مبعوث کرے گا جو تمام امتوں' قومیتوں اور متخالف مذہبوں کو توڑ پھوڑ کر مذہب واحد کردیگا۔ جس طرح اس پتھر نے بت کی تمام اونچی نیچی دھاتوں کو توڑ پھوڑ کر ایک کردیا (اور پھر وہ آخری دین) اسی طرح پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔ جس طرح وہ پتھر بت کو توڑ کر خود ساری فضاء میں چھا گیا۔

حق تعالیٰ اپنے دین کو خالص کردے گا' باطل کا سرنیچا ہو جائے گا' راہ ہدایت سامنے آجائے گی۔ ضلالت گم ہو جائے گی۔ اللہ امیوں (ان پڑھوں) کو اس دین کی تعلیم دے گا اور دین کے ذریعہ ضعفاء کو (جنہیں اچھوت بنادیا گیا تھا) قوت عطاء کرے گا' ذلیل اس سے عزت پائیں گے اور کمزوروں کو اس سے مدد ہوگی۔

(بادشاہ کے دل میں یہ بات اتر گئی اور اس نے انتہائی عقیدت سے) عرض کیا کہ میں نے جب سے سلطنت سنبھالی ہے میری نظر سے آپ جیسا شخص نہیں گزرا' جس نے میرے دل پر چھائی ہوئی کسی کیفیت (دہشت و بے چینی) کو اس طرح چھانٹ دیا ہو اور اب میرے دربار میں آپ سے زیادہ کوئی بارتبہ نہ ہوگا۔ میں آپ کو اس احسان عظیم کی بقدر ہی صلہ دوں گا۔

دین خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم)

اس حدیث سے صاف واضح ہے کہ خاتم الانبیاء کا دین جو دنیا کے آخری دور میں ظاہر ہوگا (جیسا کہ ہو چکا ہے) ان تمام قومی' نسلی اور وطنی امتیازات کو پاش پاش کر ڈالے گا اور اس طرح دنیا کی متفاوت قومیتیں اور اونچی نیچی ذاتیں رل مل کر ایک ذات ہو جائیں گی۔ چھوت چھات کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے گا' وہی قومیں جن کا مذہب ہی اونچ نیچ اور چھوت چھات تھا' خود اپنے اس مذہب پر لعنتیں بھیجنے لگیں گی' حتیٰ کہ سارے رجعت پسند لیڈر مل کر بھی اگر ان امتیازات کو پھر لوٹانا چاہیں گے تو نہیں لوٹا سکیں گے اور اس طرح پوری دنیا میں ایک قوم ہوگی' ایک ازم ہوگا اور دنیا کی اس واحد قوم کی عالمی حکومت ہوگی۔

پھر جب یہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو چکی کہ دنیا کے سارے عقلاء مدبرین اصول مساوات کو تمدنی' معاشی اور معاشرتی حیثیت سے قولاً و عملاً و قلباً قبول کرتے جارہے ہیں اور اس کے فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں ___ تو جس اسلام میں اس کی مکمل تعلیم تیرہ سو برس سے موجود ہے۔ اس مذہب کے دوسرے اصول بھی قابل غور ہو جاتے ہیں اور میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ چیز پیش کر رہا ہوں کہ یقیناً اسلام کے تمام اصول اسی طرح مکمل اور بہترین ہیں۔ پھر جس طرح دنیاوی ضروریات کے لئے سب نے اصول اسلام کو قبول کرلیا ہے تو کیوں نہ روحانی حیثیتوں سے بھی اسلامی اصول کو تسلیم کیا جائے۔ تعصبات سے ہٹ کر سنجیدگی سے گہرائی کے ساتھ تحقیق کی جائے تو انشاء اللہ اسلام ہی ایسا مذہب ظاہر ہوگا جو شخصی جذبات کو تو نہیں لیکن سلیم الطبع ہر مدبر و سنجیدہ انسان کے قلب و دماغ کو مطمئن کر سکتا ہے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مذہب اور سیاست

قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علم نافع (حکمت نظری) خلق عادل (حکمت اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمت عملی تھے) جنہوں نے قوم کے ظلم و جہل اور بد نظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا' اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوۂ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان طاقتوں کے ذریعے سے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے' عباد کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح و رشد' امن و سکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

پیش نظر خطبۂ صدارت حضرت فخر الامت' امیر البیان حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ علیہ نے بحیثیت صدر اجلاس جمعیت علماء صوبہ سندھ ۱۵ر۱۶ر ۱۷ر اپریل ۱۹۴۴ء کو سندھ کے تاریخی شہر حیدر آباد میں ارشاد فرمایا تھا ___ اس اجلاس میں صوبہ کے مستند اور بلند پایہ علماء بہت بڑی تعداد میں تشریف فرما تھے' ان کے علاوہ مجلس احرار' مسلم لیگ اور جماعت خاکسار کے ارکان بھی موجود تھے۔

عام شرکاء میں ہر طبقہ و خیال کے افراد حاضر تھے۔ مگر خطبہ کے گرانمایہ علمی' عرفانی اصلاحی اور سیاسی مطالب سے سب کے سب یکساں طور پر متاثر تھے۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ خطبہ پڑھنے کے بعد اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا :

"میں خطبہ صدارت سننے ہی کے لئے شریک اجلاس ہوا تھا' اب میرا دل ٹھنڈا ہے۔
آپ نے اپنا خاندانی پیغام پہنچادیا"۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخلصانہ شکریہ

بزرگان محترم!

اللہ کی حمد وسپاس، اللہ کے آخری نبی پر درود وسلام اور آپ سب حضرات کے کرم فرمایانہ اعزاز پر جو صدارت کی صورت میں اس نالائق کو بخشا گیا ہے۔ مخلصانہ شکریہ کے بعد میں چند معروضات بطور یادداشت اس مقدس اجتماع میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ اکابر قوم اور ملک کے سنجیدہ افراد کو ان کے غور وفکر میں مدد دے سکوں۔

زمانۂ جنگ اور جنگ کی تباہ کاریاں

حضرات محترم!

آج ہم تاریخ کے نازک ترین مرحلہ پر ایک تاریخی صوبہ میں جمع ہوئے۔ دنیا اپنے بنائے ہوئے جال میں

؎ خطبۂ صدارت، اجلاس جمعیت علماء ہند صوبہ سندھ۔ منعقدہ اپریل ۱۹۴۴ء

الجھ رہی ہے' دنیا کے مدبر اپنی تدبیروں کو رو رہے ہیں۔ معمورۂ ارضی کے دو حصے جنہوں نے اپنے آسودہ حال ہونے پر شیطان سے خراج تحسین وصول کیا تھا' آج اس درجہ تباہ حال ہیں کہ ان پر انسانیت آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی ــــ انسانیت اپنے نشان مزار پر کھڑی ہوئی رو رہی ہے اور انسان قیامت سے پہلے قیامت کے ہو ناک نمونوں سے تھرا رہے ہیں۔ خدا نے اس دنیا کو اپنے بندوں کے لئے فردوس بندگی بنایا تھا' مگر شیطان اور اس کی ذریت نے اسے جنگ غلامی کا جہنم بنا دیا ہے۔

گزشتہ ایک سو سال میں اسی سیاست نے ایک عالمگیر جہنم تیار کیا تھا' آج اس کے شیدا اس میں جل رہے ہیں۔ امیر' غریب' مرد' عورت' بچے' بوڑھے' سب کراہ رہے ہیں اور ان کی کراہ مذہب کی چہار دیواری کے اندر صاف سنی جا رہی ہے۔ جو مذہبی رہنماؤں کی روح کو تڑپا رہی ہے۔

مذہب اور سیاست

وہ لوگ جو اس پریشان حال دنیا کے رہنما بنے ہوئے ہیں اور جنہوں نے مذہب اور سیاست کے مقدمہ میں مذہب کے لئے سزائے موت تجویز کی تھی' آج خدا سے آب حیات کا راستہ دریافت کر رہے ہیں اور جو لوگ خداوند عالم سے آسمان پر مقابلہ کا ارادہ اور پروگرام رکھتے تھے' زمین پر اس کی حقیر حقیر مخلوق کے مقابلہ میں ہار جیت کا کھیل' کھیل رہے ہیں۔ اس میں کسی ملک' کسی قوم اور کسی نسل کی تخصیص نہیں بلکہ وہ تمام قومیں شامل ہیں جو خدا کی زمین پر اپنے غرور کا سکہ چلانا چاہتی ہیں۔

عصری سیاست کا قافلہ مذہب سے جدا ہو کر آزادی' مساوات اور جمہوریت کے نعروں کے ساتھ روانہ تھا۔ آج جب اس کی واپسی عمل میں آ رہی ہے تو اس کے ساتھ کون ہے؟ آزادی کی جگہ غلامی' مساوات کی جگہ سیاسی اونچ نیچ اور جمہوریت کی جگہ جبر مطلق۔

جنگ کا آخری فیصلہ

جنگ ہو رہی ہے' یہ جنگ کا پانچواں سال ہے۔ کوئی بھی حتی کہ چرچل روزویلٹ اور ہٹلر تو جو بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کب ختم ہوگی' جنگ کی تباہ کاریاں صرف میدان جنگ تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ پوری دنیا اس کے شعلوں سے سلگ رہی ہے۔ عباد ہی نہیں بلاد بھی تباہ ہو رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ برطانوی سلطنت کے مدبر اعظم مسٹر بالڈون نے اپنی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں کہا تھا کہ :

"اگر جنگ ہوئی تو ہم ہی تباہ نہیں ہوں گے ہماری سلطنت اور ہمارا تمدن بھی برباد ہو جائے گا۔

واقعات سامنے رکھ کر دنیا اس قضیہ شرطیہ کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ جنگ جاری ہے اور ابھی جاری رہے گی۔ گو' ڈیلی میل نے اپنے مقالہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء میں لکھا ہے کہ :

"جنگ کے اچانک ختم ہو جانے کا امکان زیادہ واضح ہوتا جاتا ہے"۔

اور بلاشبہ یہ الفاظ پوری انسانیت کے دل کی پکار بھی ہیں۔ مگر واقعات ان پیشین گوئیوں اور پکاروں کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں کیونکہ دنیا کے دوا رب انسانوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے دنیا کے مدبرین ان کو بہم پہنچانے سے قاصر رہے ہیں۔

آزادی، جمہوریت اور شہنشاہیت

دنیا کو عالمگیر آزادی کی ضرورت ہے جس کی رو سے کسی کمزور قوم کی آزادی سلب نہ ہو سکے ___ دنیا کو کسی ایک ملک کی پارلیمنٹ کی بجائے عالمگیر پارلیمنٹ کی ضرورت ہے جو جمہوریت عامہ کی ترجمان ہو ___ دنیا کو اپنی ساری پیداوار پر کسی ایک ملک کے بجائے ساری دنیا کے انسانوں کو پہنچانے کی ضرورت ہے جس سے سب مستحقین درجہ بدرجہ حصہ پاتے رہیں ___ دنیا کو استعمار اور شہنشاہیت کے بجائے بین الاقوامی عدالت اور بین المللی قانون کی ضرورت ہے جو سب کو ایک رشتہ میں پرو سکے۔ اگر متحارب قومیں ان نکتوں کو تسلیم نہیں کرتیں تو جنگ جاری رہے گی اور اگر آج جنگ ختم بھی ہوگئی تو یہ خاتمہ ایک اس سے بھی بڑی جنگ کا مقدمہ ہوگا ___

___ ہاں! اگر جنگ کا فیصلہ دنیا کی حکومتیں نہیں خدا کی حکومت کرے گی اور اس کی ہمہ گیر حکومت ان چاروں نکتوں کو انسانیت سے منوا کر رہے گی۔

ہندوستان کی صورت حال

ہندوستان کا حال دنیا کے اس عام حال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ایک طرف اس ملک کی نہ ختم ہونے والی دردناک غلامی ہے جو اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایک صدی سے بہانے تلاش کر رہی ہے، دوسری طرف آزادی کی لہر ہے جس نے یہاں کی قوموں کو اپنے ہمہ گیر حصار میں لے لیا ہے اور پوری دنیا کی طرح وہ بھی ان چاروں نکات کے مطالبہ میں قوموں کا شریک ہے۔ اس سے زیادہ وہ ہنگامہ دلخراش ہے جس نے ہمارے سیاسی تدبر کو غلامی کی قوتوں کے سامنے مفلوج بنا دیا ہے اور سب سے آخر میں انہی نکات کے بارہ میں وہ طوفان مطالبات ہے جو علماء کے سروں پر سے گزر رہا ہے۔ ان مرکب مصائب کے آتشیں سایہ میں ہمیں یہاں جمع ہونے کا موقع میسر آیا ہے تاکہ ہم اس ہمہ گیر درد دکھ کا کوئی ہمہ گیر مداوا سوچیں اور اپنی شکستہ کشتی کو ان طوفانی پتھروں سے نکال لے جائیں ۔

گہے باشد کہ کار ناخدائی می کند طوفان
کہ از طغیان موجے کشتیم برساحل افتاد است

ان مہلک امراض کے کیا اسباب ہیں؟

میں ایک سیاسی آدمی سے زائد ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے علم و فہم کے مطابق جہاں تک غور کر سکا ہوں، دنیا میں قوموں کے لئے مہلک ترین امراض جنہوں نے اقوام کو ہمیشہ الٹ پلٹ کیا اور گھن بن کر ان کی فلک بوس عمارتوں کو پیوند خاک بنایا ہے، اصولاً کل تین ہیں جن میں سے دو بنیادی ہیں اور ایک ان دو کا قدرتی ثمرہ۔

۱۔ جہل ۲۔ ظلم ۳۔ اور غلامی۔

جہل

جہل سے حدود اشیا نامعلوم رہ جاتی ہیں۔ اچھے برے کی تمیز نہیں رہتی کوئی قانون زندگی سامنے نہیں آتا اور انسان اپنے اس امتیازی فرق کو مٹا دیتا ہے جو خدائے حکیم نے اس میں اور جانوروں میں بطور حد فاصل کے قائم فرمایا تھا' ظاہر ہے کہ ایک انسان بہائم میں مل جائے تو انسانی حلقوں میں اس کی کوئی پرسش نہیں ہو سکتی۔

ظلم

ظلم' عدل کی ضد ہے۔ اس سے میری مراد ظلم اخلاق یعنی اخلاق کا عدل و اعتدال پر قائم نہ ہونا اور جبلی افراط و تفریط ہے۔ جو ظلمت نفس ہے۔ چونکہ اخلاق ہی اعمال کی قوت ہیں۔ اس لئے ان غیر معتدل خلاق سے غیر معتدل ہی افعال کا ظہور ہوتا ہے اور ان اخلاقی بے اعتدالیوں سے قومی کریکٹر تباہ ہو جاتا ہے' قوم کی ساکھ اکھڑ جاتی ہے' خدا اور بندوں کی نگاہ سے یہ قوم گر جاتی ہے اور بالآخر ان بد اخلاقیوں کے جراثیم سے پھر یہ قوم اس قابل نہیں سمجھی جاتی کہ باعزت اقوام کی صف میں اسے جگہ دی جا سکے۔

غلامی

غلامی کی تباہ کاریاں فوضویت سے شروع ہوتی ہیں ___ فوضویت سے میری غرض یہ ہے کہ کسی قوم میں نظم نہ ہو' مرکزیت نہ ہو' اس کا کوئی سرگروہ باقی نہ رہے' قوم کا ہر ہر فرد مستقل حکمران بن بیٹھے' باہمی تعاون و تناصر ختم ہو جائے۔ اس سے اجتماعی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ طوائف الملوکی اور انتشار کی حالت میں جبکہ قوم میں اس جہل و ظلم کی بدولت جان نہیں رہتی تو دوسری طاقت ور اقوام اس پر خروج کر کے مسلط ہو جاتی ہیں اور اس فوضویت کا ثمرہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے جو ایک قوم کے لئے دنیا کا بدترین عذاب اور خدا کی طرف سے ایک انتہائی پھٹکار ہے اور پھر اس غلامی سے بالآخر یہ قوم اپنا قومی سرمایہ کلچر' تہذیب' تمدن اور اپنے علم و عمل کی خصوصیات کھو بیٹھتی ہے اور انجام کار اس قومی اختلال اور طبقاتی انتشار کے جراثیم اس کے قومی وجود کو اس طرح نسیت و نابود کر دیتے ہیں کہ بعد چندے دنیا میں کوئی اس کے نقش پا کا پتہ دینے والا بھی باقی نہیں رہتا۔

قرآن حکیم کا فیصلہ

قرآن حکیم نے یہود کے مہلک ترین امراض کا خلاصہ یہی تین چیزیں قرار دی ہیں جن میں سے ظلم و جہل کو اصل بتلایا اور غلامی کو ان کی فرع۔

ارشاد ربانی ہے :

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔

"جم گئی ان پر ذلت اور پستی اور مستحق ہو گئے وہ غضب الٰہی کے۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو ناحق اور یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں نے عصیان کیا اور حدود سے نکل نکل جاتے تھے"۔

ذلت و مسکنت کا فرد کامل یہ تھا کہ ان سے قیامت تک کے لئے سلطنت چھین لی گئی اور مختلف سلاطین کی غلامی کے لئے ان کی زندگیاں مخصوص کردی گئیں۔ کبھی یونانیوں اور کلدانیوں کے غلام، کبھی بخت نصر کے غلام، کبھی ایرانیوں اور مجوسیوں کے باجگذار، کبھی مسلمانوں کے زیر حکومت اور کبھی نصرانیوں کے، کہیں ہٹلر کے رحم و کرم پر اور کبھی امریکنوں کے لفظی ہمدردیوں پر۔

غرض دائمی غلامی ان کا قومی نشان قرار دی گئی۔ پھر جس قوم کے بھی غلام رہے اس نے کبھی ان کی کوئی ایسی بھی توقیر نہیں کی جو کم از کم آدمیت کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ آج جرمنی نے جس تذلیل کے ساتھ انہیں جلاوطن کیا ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے ایک ایک کا مال و اسباب ضبط، شہروں کے ہوٹلوں اور عام اجتماعات کے مواقع پر بورڈ چسپاں کئے گئے کہ کتا اور یہودی یہاں داخل نہ ہونے پائے۔ برطانیہ نے انہیں پناہ ضرور دی مگر ان کی کسی ادنیٰ توقیر کا وہ بھی روادار نہیں۔ کیونکہ برطانوی مدبروں کے انداز سے واضح ہے کہ وہ بھی اس قوم کو پرلے درجے کی ذلیل و رسوا قوم جانتے ہیں اور اسے دنیا کا خون چوسنے والی قوم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

اسی طرح امریکہ کا عمل ممکن ہے کہ ان کی ساتھ ہو مگر کوئی اچھی رائے ان کے ساتھ نہیں۔ پس غلامی کے ساتھ انتہائی ذلت و مسکنت اور رسوائی بھی ان کے لئے قرآن نے مخصوص کردی ہے۔ اس ذلت آمیز غلامی کا ایک سبب قرآن حکیم نے عصیان بتلایا ہے جو عمل سیہ کاری ہے اور اس کا سبب اعتداء فرمایا گیا۔ جس کی حقیقت حدود سے تجاوز اور تعدی ہے اور یہی وہ ظلم اور اخلاقی بے اعتدالی ہے جس سے تمام ظالمانہ حرکات سرزد ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ حدود سے تجاوز اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ یا حدود کا علم ہی نہ ہو یا ہو تو معاملہ ان کے ساتھ لاعلمی کا کیا جائے اور یہی وہ جہل ہے جس سے خیر و شر کی تمیز باقی نہیں رہتی۔

پس یہود کی ذلت و مسکنت کی ترتیب اب یوں قائم ہو جاتی ہے کہ ان میں غلامی آئی بدعملیوں سے اور بداعمالیوں کا منشاء ظلم اخلاق اور جہل نفس تھا۔ اس لئے وہ تینوں مہلک امراض جو کسی بڑی قوم کو برباد کرنے کے ضمانت دار ہیں، ظلم اور جہل اور غلامی نکلے اور تینوں کا ایک ہی آیت سے ثبوت بھی ہو گیا۔

دوسرے مواقع پر قرآن حکیم نے ان تینوں امراض کو الگ الگ مستقلاً بھی بیان فرمایا ہے۔ جس سے ان کی اصولی حیثیت واضح ہوتی ہے ـــــ مثلاً ایک جگہ انسان کو امانت الٰہیہ کا حامل بناتے ہوئے اس کی بنیادی شرط ان دو چیزوں ظلم و جہل کو قرار دیا ہے کہ انہی کی اصلاح کے لئے اس جذبۂ امانت کی ضرورت پڑی اور انسان اس کے سبب ساری کائنات پر فائق ہو گیا۔

ارشاد ربانی ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔

"ہم نے یہ امانت آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تھی، سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور بڑا جاہل تھا"۔

یعنی اس میں قوت علمیہ اور قوت عملیہ (اخلاق حسنہ) کا فقدان تھا۔ مگر یہ امانت اس میں علم اشیاء اور عدل اخلاق کی استعداد تھی جس سے وہ بڑا عادل اور بڑا عالم بن سکتا تھا۔

ایک جگہ اس طبعی ظلم و جہل کو مٹانے اور اس علمی و عملی استعداد کو بروئے کار لانے پر ہی آخرت کی نعمتوں کو

دائر فرمایا۔

ارشاد ربانی ہے:

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ۔

"یہ عالم آخرت ہم ان لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک ثمرہ متقی لوگوں کو ملتا ہے"۔

ظاہر ہے علو و کبر ثمرۂ جہالت ہے کہ اپنی گندی اصلیت سے آدمی بے خبر ہو اور فساد، ضد صلاح ہے اور صلاح و رشد کا فقدان وہی ظلم نفس ہے۔ خواہ علمی ہو، خواہ اخلاقی۔ پس آثار جہل و ظلم کو بتلا کر ان دونوں ملکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک جگہ بتلایا گیا ہے کہ اگر انسان کی خلافت میں کوئی چیز رکاوٹ سمجھی جاسکتی ہے تو وہی اس کا جہل و ظلم ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں اگر کوئی چیز اس میں غلامی اور پستی و زیر دستی پیدا کرسکتی ہے تو یہی ظلم و جہل۔ چنانچہ جب انسان کو خلافت ملنے لگی تو ملائکہ نے اس کی اسی جاہل و ظالم طبیعت کو محسوس کر کے اس کی خلافت کے بارہ میں خلجان ظاہر کیا تھا۔ جس کی حکایت حق تعالیٰ نے یوں فرمائی ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ۔

"اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں ضرور بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔ فرشتے کہنے لگے، کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگ جو فساد کریں گے اس میں اور خون ریزیاں کریں گے"۔

یہاں بھی وہی فساد کا لفظ بولا گیا ہے جو صلاح کی ضد ہے۔ جس سے کھلا اشارہ ظلم کی طرف ہے اور سفاکی، حقیقت ناشناسی اور جاہلانہ حرکت ہے کہ نہ آدمی اپنی جان کی کوئی قیمت سمجھے نہ دوسرے کی جان کی۔ یہ جہل کی طرف اشارہ ہے۔ پس ہر سعادت سے محرومی کی جڑ، بنیادیہی دو اصلیں ظلم اور جہل نکل آئیں۔

غلامی کے متعلق قرآن مجید کا حکم

ادھر قرآن حکیم نے اس تیسرے مرض غلامی کو دنیا کا بدترین عذاب شمار فرمایا ہے جو در حقیقت اسی ظلم و جہل کا ثمرہ ہے۔

بنی اسرائیل کی غلامی کے بارہ میں ارشاد ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ لَیَبْعَثَنَّ عَلَیْهِمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ یَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔

(القرآن الحکیم پارہ۹)

"اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے یہ بات بتلادی کہ وہ ان یہود پر قیامت تک ایسے لوگوں کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید کی تکلیف پہنچاتے رہیں گے"۔

یہ سزائے شدید اور اغیار کا تسلط وہی محکومی اور غلامی ہے جسے قرآن نے سوء عذاب یعنی بدترین عذاب

بتلایا ہے ___ بہر حال ان آیات سے واضح ہوگیا کہ اسلام کی نگاہ میں قوموں کی تباہی و بربادی کے یہ تین ہی اصول ہیں۔ ظلم و جہل اور غلامی اور تاریخ کی دنیا میں ہر تباہ شدہ قوم ان ہی تین مہلکوں سے پچھڑی ہوئی نظر آئے گی۔

عرب اقوام چودہ صدی قبل

آج سے چودہ صدی پیشتر عربی اقوام کے قومی جسم میں یہی تین جراثیم گھسے تو انہیں دنیا کی نگاہوں سے ایسا گرایا کہ وہ عالم کی کسی متمدن قوم ہی نہیں بلکہ مطلقاً کسی بھی پہلی قوم میں شمار کیے جانے کے قابل نہ رہیں۔ ان کی تو بر تو جہالت نے تو ان میں سے خیر و شر کی تمیز اٹھا دی' اچھے برے کا فرق مٹا دیا۔ حدود اشیاء ان کے قلوب پر مخفی ہو گئیں۔ وہ خالق و مخلوق تک کا فرق بھلا چکے تھے ___ مخلوقاتی صفات خدا میں اور خدائی خصوصیات بندوں میں مان کر انواع واقسام کے شرکوں میں مبتلا تھے۔ بندوں سے زیادہ خداؤں کا عدد ہو گیا تھا۔ کعبۃ اللہ سینکڑوں بتوں کا بت خانہ تھا جو انسانی زندگی کے مالک تصور کیے جاتے تھے۔ انہی سے مرادیں مانگی جاتی تھیں۔ ان ہی پر جانوروں کی بھینٹ چڑھائی جاتی تھی اور ان کے سامنے سرِ عبودیت خم کیا جاتا تھا۔ وہ نبی اور امتی کا فرق مٹا چکے تھے۔ رسوم آباء کو سنن انبیاء کا درجہ دیدیا تھا اور سنن نبیاء کو منکرات کا۔ دین اور غیردین کی تمیز اٹھ چکی تھی ___ دین کو غیردین سمجھ کر الحاد کا شکار تھے اور غیردین کو دین جان کر بدعات و محدثات میں گرفتار۔

ادھر ظلم اخلاق کے ماتحت معتدل اخلاق اور اخلاقِ فاضلہ کا ان میں کوئی شمہ باقی نہ رہا تھا' اخلاقی بے اعتدالیوں اور افراط و تفریط کی بدولت نہ ان میں حیا رہی تھی نہ غیرت نہ ہمدردی تھی نہ مروت نہ ایثار نہ تواضع نہ بے نفسی نہ للہیت نہ صبر و شکر نہ اعتماد نہ توکل ہاں رات دن کا شیوہ تھا' تفاخر و اتراہٹ' بے رحمی و قساوہ شیخی و رعونت' کبر و نخوت' سبعیت و بربریت' بے حجابی و بے باکی' ہوسناکی و خودستائی اور ان بداخلاقیوں سے جن بداعمالیوں کا ظہور ہوتا تھا' وہ لوٹ کھسوٹ' قتل و غارت' زنا و شراب' جوا اور قمار' قتل اولاد وغیرہ تھیں۔ جنہوں نے ان کی دینی و دنیوی زندگی کو تباہ کر ڈالا تھا۔

ادھر توضویت کا یہ عالم تھا کہ نہ ان میں کوئی مرکزیت تھی نہ سرگروہی' نہ قومی نظام تھا' نہ ملکی تمدن نہ شہریت تھی نہ شہری حقوق نہ زندگی کا کوئی ضابطہ نہ قاعدہ' پورا ملک خانہ بدوشوں کا ایک غیر منظم ریوڑ تھا جو جنگل جنگل مارا پھرتا تھا۔ بدویت و بربریت' طوائف الملوکی اور بدنظمی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ قومی اور ملکی انتشار اور رات دن کی خانہ جنگیوں نے بالآخر انہیں اسی ذلت وخواری اور محکومیت کے نتیجہ پر پہنچا دیا تھا جس پر ایسے انداز کی قومیں پہنچائی جاتی ہیں۔ کبھی رومیوں کے اسیر اور کبھی فارسیوں سے غلام' کبھی غیروں کے گرفتار اور کبھی خود اپنے شکار۔

غرض ظلم و جہل نے ان میں آثار نبوت مٹا دیئے تھے اور توضویت و غلامی نے ان میں آثار سلطنت محو کر دیئے تھے۔ یعنی اس قوم میں نہ دیانت باقی رہی تھی' نہ سیاست' جس کا خون انہی تین امراض ظلم و جہل اور غلامی کے سر تھا۔

رحمت الٰہی کا ظہور علم نبوت مکارم اخلاق' اسوۂ حسنہ

آخر کار رحمت خداوندی جوش میں آئی اور اس تاریک دل' تاریک پیکر' اور تاریک روش قوم پر ختم

نبوت کا آفتاب جہاں تاب چمکا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تین مہلک بیماریوں کے دفعیہ کے لئے تین ہی تیربہدف علاج پیش فرمائے۔ اپنا تبیانی علم جس سے جہل کا فور ہو۔ اپنا خلق عظیم جس سے ظلمت اخلاق دور ہو اور اپنا منظم اسوۂ حسنہ جس سے غلامی پاس نہ پھٹک سکے اور زندگی منظم ہو جائے' چنانچہ اپنی یہی تین شانیں تین جگہ انہی تین عنوانوں سے ظاہر فرمائیں۔ ایک جگہ بعثت کی غرض ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :

انما بعثت معلما۔

''میں بلاشبہ معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔

ایک جگہ اسی بعثت کی غرض ظاہر کرتے ہوئے فرمایا :

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

''میں بلاشبہ اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کردوں''۔

ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد الٰہی ہوا :

لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ ۔

''البتہ تمہارے لئے اللہ کے رسول میں (علم واخلاق وعمل کے) پاکیزہ نمونے ہیں''۔

اپنے علم قطعی کے ضمن میں آپ نے وہ قانون عمل پیش فرمایا جس سے عمل کی حدود واشگاف ہوئیں' حرام وحلال' جائز وناجائز اور روا ناروا کا امتیاز ہوا اپنے خلق عظیم سے عمل کی وہ اخلاقی طاقت پیش فرمائی جس سے جائز اعمال کے دواعی دلوں میں ابھریں' عملی جذبات پیدا ہوں اور آدمی کسی کے ٹھیلنے یا اکسانے سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی جذبے اور شوق سے عمل کی دنیا میں آجائے اور وہ سب کچھ کر گزرے جس کے کرنے کے لئے اسے نعمت حیات بخشی گئی ہے اور اپنے اسوہ حسنہ سے اس عمل اخلاق کا وہ عملی نظام زندگی پیش فرمایا جس سے پوری قوم میں حریت واستقلال کا ایک جامع اور محکم نظام پیدا ہو جائے۔ جس میں مرکزیت کے ساتھ اس علم واخلاق کی نشر واشاعت ہو اور اس کی پیروی ایک ایسی خاص ترتیب سے عمل میں آتی رہے جو پوری قوم میں وقار وشوکت مادی وروحانی طاقت اور غلبہ وتسلط کے ہمہ گیر آثار پیدا کردے۔

بہرحال قرن اول کی اصلاحی اسکیم کے یہی تین بنیادی اصول علم نافع (حکومت نظری) خلق عادل (حکمت اخلاقی) اسوۂ حسنہ (حکمت عملی) جنہوں نے قوم کے ظلم وجہل اور بدنظمی کو یکسر فنا کر کے دنیا میں ایک نئے حکیمانہ نظام کی بنیاد ڈالدی۔ علم سے انہوں نے دماغوں کو روشن کیا' اخلاق سے قلوب کو جگمگایا اور اسوہ حسنہ کی پیروی سے اپنے جوارح کو شائستہ بنایا اور ان تینوں روشن ہتھیاروں سے مسلح ہو کر جب وہ عالم میں نکلے تو دنیا نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان تین طاقتوں کے ذریعے سے خدا نے اپنے قرآنی وعدے کے مطابق ان کی خلافت ارضی کی جڑیں زمین میں جمادیں۔ بلاد فتح ہوئے۔ عباد کی گردنیں جھک گئیں اور صلاح ورشد' امن وسکون کا دنیا میں دور دورہ ہو گیا۔

مسلمان بحیثیت فاتح عالم

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی مکہ' خیبر' بحرین اور تمام جزیرۃ العرب اور پوری ارض یمن فتح ہو گئی۔ فارس کے علاقوں میں مجوس ہجر سے آپؐ نے خراج لیا اور بعض اطراف شام تک پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا۔ سلاطین عالم پر یہ اثر ہوا کہ ہرقل شہنشاہ روم۔ مقوقس' بادشاہ مصر' نجاشی بادشاہ

حبشہ اور ملوک عمان نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدایا بھیج کر اپنی گرویدگی کا اظہار کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت راشدہ ہی کے مختصر دور میں اسلامی فتوحات کا پھاٹک کھلا تو لسان نبوت کی پیشین گوئی کے مطابق وہ پھیلتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کے اکثر حصہ پر اس نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ دور صدیقی میں حضرت خالدبن ولیدؓ کے دست حق پرست پر بہت سے بلاد فارس' ابوعبیدہؓ کے ہاتھ پر متعدد بلاد شام' عمرو بنؓ عاص کے ہاتھ پر کتنے ہی بلاد مصر فتح ہوئے۔ دور فاروقیؓ آیا تو ان فتوحات کی تکمیل ہوئی۔ پورے دیار مصر' تمام اقلیم فارس اور روم و قسطنطنیہ تک اسلامی خلافت کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اسلامی شعائر بلند ہو گئے۔ دولت عثمانیؓ کا زمانہ آیا تو ان فتوحات نے سیلاب کی صورت اختیار کر لی زمین کے مشارق و مغارب تک یہ رو جا پہنچی۔

بلاد مغرب سے اقصاء اندلس' قبرص' قیروان' بلاد سبتہ اور بحر محیط تک۔ ادھر ناحیہ مشرق سے اقصائے بلاد چین۔ اقصائے ایران اور مدائن عراق و خراسان تک اسلامی قلمرو کا دائرہ وسیع ہو گیا اور ان تمام اقلیموں سے خراج جمع ہو کر مدینہ کی گلیوں میں پہنچنے لگا۔ اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور پیشینگوئی ارشاد فرمایا تھا کہ:

> ان اللّٰہ زوی لی الارض فرایت مشارقھا ومغاربھا وسیبلغ ملک امتی مازوی لی منھا۔ (ابن اثیر جلد ۶ صفحہ ۱۴۰)
>
> "اللہ نے ساری زمین مجھے دکھلائی تو میں نے تمام مشرق و مغرب کو دیکھا اور عنقریب میری امت کا ملک اس حد تک پہنچ کر رہے گا۔ جہاں تک زمین کو میں دیکھ چکا ہوں"۔

ظاہر ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران میں زمین کے سارے مشارق و مغارب تک فتوحات کا دائرہ وسیع نہیں ہوا بہت سے وہ ناحیئے باقی رہ گئے جن تک نگاہ نبوت پہنچ چکی تھی' اس لئے خلافت راشدہ کے بعد اسلامی ملوکیت کے زمانہ میں بھی فتح کا سیلاب بڑھتا رہا' چنانچہ ہندوستان' افغانستان' جزائر شرق الہند' جاوا' سماٹرا اور کتنے ہی یورپین ممالک کے خطے اسلامی تلوار سے فتح ہوئے۔ جن کے کلچر' تہذیب' تمدن' اور مذاہب کو بھی اسلام نے فتح کیا یا کم از کم ان کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ لیکن پھر بھی نگاہ نبوت کی وسعتیں ابھی باقی ہیں اور وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہر بیت وبر اور مدر (خیمے اور مکان) میں اسلام کا کلمہ داخل ہو کر پوری دنیا کو اپنی ہمہ گیر وسعتوں میں لے لے اور ساری دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے۔

> هُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۔ (سورۃ فتح پارہ ۲۶)
>
> "وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے (باعتبار حجت ودلیل بھی اور بلحاظ شوکت و سلطنت بھی جس کا ظہور قرن اول میں ہوا کیفاً۔ اور قرن آخر میں ہوا کماً)"۔

بہر حال یہ سب مادی و روحانی برکات اسی مقدس قوم کے دست حق پرست پر ظاہر ہوئیں۔ جنہوں نے برکات نبوت سے متبرک ہو کر اپنے ظلم کو عدل اخلاق سے' جہل کو علم نافع سے اور علم کو اسوۂ حسنہ کے منظم اعمال سے مستنیر کیا۔

زمانۂ جاہلیت

آج اگر سوچو تو قوم کی اکثریت تیرہ صدی بعد پھر اسی جاہلیت اولیٰ کے تین اصول ظلم و جہل اور غلامی کا بہت حد تک شکار ہو چکی ہے جس کا قبل از بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔

وفور جہل

وفور جہل کا یہ عالم ہے کہ آج مسلمانوں کی عام زندگی فتنۂ جہل سے لبریز ہے اسباب علم بڑھتے چلے جاتے ہیں اسی نسبت سے امت کا جہل ترقی کرتا جارہا ہے آج کے جہل نے بدیہیات دین کو نظری بنادیا ہے۔ اصول اعتقادات تک میں شکوک و شبہات کے جراثیم سرایت کر چکے ہیں۔ کسی کو خدا کے وجود ہی میں کلام ہے، کسی کو اس کی صفات میں، کسی کو نبوت کی ضرورت میں کلام ہے اور کسی کو آثار نبوت یعنی کلام الٰہی کے منزل من اللہ ہونے میں، کسی کو ختم نبوت میں کلام ہے اور کسی کو صحابیتؓ کے عدل و ثقہ میں، کسی نے پیغمبروں میں خدائی صفات سے علم کلی۔ احاطہ، حاضر و ناظر۔ نفی بشریت وغیرہ مان رکھی ہیں اور کسی نے خدائی خصوصیات کی نفی کا خدا ہی سے اعلان عام کیا ہوا ہے۔ کوئی معاد کے جسمانی ہونے کا منکر ہے اور کوئی سرے ہی سے اسے دل کے بہلاؤ کا سامان کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان بنیادی عقائد میں علم کی قلت اور جہل کی کثرت کا یہ عالم ہے تو فروعی اعتقادات اور اعمال کے سلسلے میں جہالت کی جو نوعیت ہوگی اس کا اندازہ خود کرلیا جائے۔

مسلمانوں کے علمی ادارے جس کسمپرسی اور بیکسی کے عالم میں ہیں۔ اس سے کوئی ناواقف نہیں۔ دس کروڑ نفوس کی تعداد کے لحاظ سے حساب لگایا جائے کہ کتنے مدارس کی ضرورت ہو سکتی ہے اور واقعی کتنے ہیں اور پھر جس قدر بھی وہ علمی افراد تیار کر رہے ہیں قوم کس حد تک ان کا خیر مقدم کررہی ہے۔ اگر فی لاکھ ایک دوان کی قدر کرتے ہیں تو فی صدی ۹۹ علم اور علماء کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے ہیں۔ کوئی انٹی ازم قائم کرکے اس مولویانہ سسٹم ہی کو ختم کرنے کی فکر میں ہے۔ کوئی مولوی کا غلط مذہب کہہ کر اس روش کو ہی اڑا دینا چاہتا ہے۔ کوئی علماء کے اثرات زائل کرنے کی تدبیر سوچ لینے کو انتہائی کامیابی سمجھ رہا ہے۔ کوئی علماء حقانی کی تکفیر اسلام کا اہم ترین مقصد خیال کررہا ہے۔ غرض اغیار نے اپنی مجموعی طاقتوں سے بھی وہ کچھ نہیں کیا تھا جو آج اپنے کررہے ہیں۔ اس ایک لاعلمی ہی کا رونا نہیں ہے بلکہ علم دشمنی اور علم و اہل علم سے بیزاری اس سے زیادہ مہلک مرض ہے جو مسلمانوں میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس صورت حال میں جہل اگر اپنی مہیب شکلوں کے ساتھ ان پر مسلط نہ ہو تو اور کیا ہو؟

اور ان حالات میں قوم پر شرعی مقاصد روشن ہوں تو کیونکر ہوں؟ اس افراط جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ ع

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ہر شخص کا ایک خیالی افسانہ اس کا مسلک ہے اور جبکہ خیالات میں قدرتی تفاوت ہے تو اختلاف خیالات سے مسالک بھی اور مسلکوں کے سالک بھی مختلف اور متصادم بن گئے۔ جس سے قوم میں گروہ بندی اور جماعت آرائی کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور اس سے جماعتی و اجتماعی طاقت میں روزبروز خلل اور اضمحلال بڑھتا جارہا ہے۔

فقدان اخلاق

ادھر اخلاقی بے مائیگی علمی تہی دستی سے بھی زیادہ ہے۔ اکثر و بیشتر اخلاقی ترتیب گاہیں رسمی گدیاں اور

تحصیل وصول کی چوکیاں بن کر رہ گئی ہیں۔ اس قسم کی رسوم گاہوں سے بجائے اس کے کہ اسلامی وظائف کے جذبات لے کر لوگ نکلیں۔ سنن اسلام سے ہٹانے اور شعائر دین سے برگشتہ کرنے کے دواعی لے کر نکلتے ہیں۔ پھر علم کتاب وسنت کا انہیں ذوق نہیں رہتا۔ علماء سے بیزاری بڑھ جاتی ہے۔ سنن انبیاء سے بدظنی قائم ہو جاتی ہے۔ عادت وعبادت کی بدعات ومحدثات میں طبائع الجھ جاتی ہیں۔ آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان تربیت گاہوں سے آنے والوں کی تربیت سے مسلمان صرف چند رسوم کی پابندی کو پورا اسلام سمجھ کر حقیقی اسلام کو کفر اور پورے مسلمان کو کافر سمجھنے اور سمجھانے کے مشغلہ میں لگ کر اصل دین سے محروم رہ جاتے ہیں۔ نہ ان میں اخلاق ربانی کی نمود ہی قائم ہوتی ہے نہ اخلاقی احوال وکیفیات اور نہ مقامات واقوال جبلی۔ پھر بداخلاقیاں حسد وریا کبر وحرص، اسراف وبخل، جبن ودوں ہمتی، جاہ پرستی وجاہ پسندی وغیرہ ہی ان میں راسخ ہو جاتی ہیں۔ نہ ان کی تعدیل ہوتی ہے نہ تکمیل وتتمیم جو مقصد نبوت تھا۔ اس کا ثمرہ یہ ہے کہ اصول کے بجائے نفسانی جذبات اور ان کا اظہار ہی سب سے بڑا کمال سمجھا جانے لگا ہے اور جب ہر طرف سے جذبات کا مظاہرہ ہو تو اس کا قدرتی نتیجہ سرپھٹول اور نااتفاقی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ علمی فتنہ سے جماعتی اختلاف اور گروہ بندی کا فتنہ پھیلتا ہے اور اس اخلاقی فتنہ سے انفرادی سرپھٹول، باہمی ناچاقی، ایک دوسرے سے بیزاری اور بے تعلقی پھیلتی رہتی ہے۔ آج امت اس میں بھی مبتلا ہے اور اس میں بھی اور مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کا اخلاص ان کے ہر عمل پر غالب ہو۔ عامۃً قوم کی رفتار جماعتی اور انفرادی نزاع وجدال ہی کی طرف بڑھتی جاتی ہے، توافق اور توافق کی راہ میں غم خواری۔ دوسروں کی دلداری کے لئے دل سوزی اور دوسروں کی بات بنانے کے لئے شفقت وایثار گویا دنیا سے عنقا ہو چکا ہے۔

ثمرات غلامی

ادھر فوضویت اور اس سے پیدا شدہ غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ حقیقی حریت سے نفرت اور قومی استقلال وخودداری سے بیگانگی کافی حد تک قوم میں موجود ہے۔ قوم میں کوئی اخلاقی طاقت منظم نہیں۔ نہ علمی اداروں کا کوئی ایک نظام ہے۔ نہ اخلاقی تربیت گاہوں کا کوئی نظم ہے نہ معاشرت کسی نظام کے تحت میں ہے نہ معیشت نہ تنظیم ہے نہ قومی وحدت۔ طبقاتی انتشار دھویں کی طرح افق قوم پر چھایا ہوا ہے اور سیاسی حلقوں میں جماعتی تفرق وتحزب کی اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر باوجود اتحاد مقصد کے محض طریقۂ عمل کا بھی اختلاف آجاتا ہے تو چونکہ اخلاقی اور علمی حالت کمزور ہے اس لئے یہ اختلاف نزاع وجدال بنے بغیر نہیں رہتا پھر یہ اختلاف کسی اصولی راہ سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی آراء وقیاسات سے پروگرام بنتے ہیں اور ہر شخص کا دستور اور رفار مولا خود اسی کا ساختہ پرداختہ ہوتا ہے اس لئے اسلامی رنگ سے عموماً بعید بھی ہوتا ہے اور مستقلاً ذریعۂ نزاع وجدال بھی بن جاتا ہے۔

دیانت وسیاست تباہ ہو جانے کے نتائج بد

بہر حال قوم کا نظام علم واخلاق جو مجموعہ دیانت ہے ایک طرف مختل ہے اور نظام آزادی جو خلاصہ سیاست ہے دوسری طرف مضمحل ہے۔ اس لئے آج مسلمانوں کی دیانت اور سیاست دونوں تباہی کے کنارے پر ہیں اور خود ان کے ہاتھوں میں نہیں ہیں۔ ان دونوں بنیادوں کے تزلزل سے جو آثار بد نمایاں ہونے چاہئیں تھے وہ ہو رہے ہیں اور نمایاں تر ہو چکے ہیں۔ تخریب وفساد مار دھاڑ اور جنگ نے دنیا کے کناروں کو چاروں

رف سے گھیر لیا ہے' امن وسکون گھروں' شہروں اور اقلیموں بلکہ پوری دنیا سے عنقا ہو چکا ہے' بے چینی اور طراب وپریشانی چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ انسانیت حد درجہ ذلت وخواری اور پستی میں آچکی ہے۔ چیزیں انسان کی خادم اور غلامی کے لئے تھیں آج وہ اس کے سر پر ایک جلاد کی حیثیت سے مسلط ہیں اور جو یں انسانوں نے اپنی راحت وعیش کی خاطر ایجاد کی تھیں وہی آج ان کے حق میں وبال جان بنی ہوئی ہیں نہ ج انسان کے لئے سطح زمین پر پناہ ہے کہ وہاں اسے آسمانی بم' زمینی گولیاں اور زہریلے گیس دم بھر نجات یں لینے دیتے۔ نہ اسے سنگین قلعوں میں پناہ ہے کہ قلعہ شکن توپوں کے کھلے ہوئے دہانے اپنی دھواں دار ادی بارش سے اسے سنگوا لیتے ہیں۔ نہ اسے سمندروں کے جگر میں پناہ ہے کہ تارپیڈو تحت الجریاں اسے اور یادہ تہ سمندر میں اتار دیتی ہیں۔ نہ اس کے لئے آسمانی فضاؤں میں پناہ ہے کہ ایروپلین شکاری اور طیارہ شکن میں اس کا شکار کر لیتی ہیں۔ غرض جمادات' نباتات' حیوانات سب اس کی دشمنی پر کمربستہ ہیں۔

پھر آج کا انسان اپنے گھر کی چہار دیواری میں پناہ لیتا ہے تو طرح طرح کے امراض ومصائب اس کے سر پر سلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے بھاگنے کی سعی کرتا ہے تو خوف اعداء اور قسم قسم کے افکار وپراگندگی سے اسے جات نہیں ملتی۔ غرض انسان کیلئے نہ آج انسان کارآمد ہے نہ غیر انسان' حاصل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ہی رتوتوں کے نتائج بھگت رہا ہے اور اس کے گلے پر اسی کے ہاتھ سے خنجر چلوائے جا رہے ہیں

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۔

”خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ ان کے بعضے اعمال کا مزہ ان کو چکھا دے تاکہ وہ باز آجائیں“۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ۔

”اور جو کچھ بھی تمہیں دکھ پہنچتا ہے سو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کے سبب سے“۔

اور ظاہر ہے کہ جب اس نے خود اپنے کو پناہ دینا نہیں چاہا تو اس کے لئے اس کے مالک ہی کے ہاں' یہاں ناہ کے دروازے کب کھلے رہ سکتے تھے؟ اسی کی قانون شکنی کا تو یہ اثر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ہر ایک چیز اس کی شمن ہو چکی ہے اور پورا خدائی کارخانہ اس کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ پس اس نے اپنے مالک کو کیا بھلایا کہ خود اپنے ہی کو بھلا دیا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۔

”اور تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے خدا کو بھلا دیا سو اللہ نے خود ان کی جانوں سے انہیں بھول میں ڈال دیا یہی لوگ نافرمان ہیں“۔ (پارہ ۲۸ ع ۶)

اور ظاہر ہے کہ ان تمام مہالک ومفاسد کی جڑ بنیاد وہی تین غلطیاں نکلیں گی جو زمانۂ جاہلیت کی تباہ کاریوں کی روح رواں تھیں۔ یعنی جہل' ظلم' اور غلامی اور دوسرے لفظوں میں بددیانتی اور بدسیاستی' اس لئے جو علاج جاہلیت عرب کے لئے مؤثر اور تیر بہدف ہوا تھا' وہی آج کی جاہلیت کو بھی دفع کر سکتا ہے بقول حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے کہ:

لا يصلح أمر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها۔

”اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی چیز سے ہو سکتی ہے جس سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی“۔

سو جب عرب جاہلیت کے ان امراض سہ گانہ جہل‘ ظلم اور غلامی کو ان کی تین اضداد علم احکام‘ عدل اخلاق اور اتباع اسوۂ حسنہ سے دفع کیا گیا تو آج کے بھی انہی امراض سہ گانہ میں یہی تین اجزا نفع بخش ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی لئے انہی تین اجزا کو قرآن نے مقصد بعثت قرار دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

هُوَالَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (پارہ ۲۸ ع ۱۱)

”وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھلاتے ہیں اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے“۔

تعلیم احکام‘ تہذیب اخلاق‘ تنظیم اعمال

آیت بالا میں تلاوت آیات کا ذکر فرما کر جس کا تعلق قرآن حکیم کی لفظی حیثیت سے ہے اس کی معنویت کے تین مقام ذکر فرمائے گئے ہیں۔ جس سے امت کی اصلاحی اسکیم کے تین تین بنیادی اصول پیدا ہوتے ہیں۔ اول مسئلۂ تعلیم جس کے معنی تمام احکام کو پیش کر دینے اور سکھلا دینے کے ہیں کہ جس پر امت کے علم و فکر کی تکمیل و ترقی موقوف ہے۔

دوسرا مسئلۂ تزکیہ یا تہذیب اخلاق جس کے معنی دلوں کی کلیں درست کر دینے کے ہیں کہ تمام باطنی کیفیات و مقامات کو سامنے لا کر جن پر قلب کی استقامت موقوف ہے‘ درست کیا جائے۔ تیسرا مسئلۂ تلقین حکمت جس کے معنی ایک تفسیر کے مطابق شارع کی مجموعی زندگی اسوۂ حسنہ امت کے سامنے لے آنے کے ہیں‘ جس کے مجموعہ پر امت کی زندگی کی تنظیم موقوف ہے۔

قرآن کا اصلاحی پروگرام

پس‘ قرآن کریم کے اصلاح پروگرام کے تین بنیادی اصول ہو گئے۔

۱۔ تعلیم احکام　　۲۔ تہذیب اخلاق　　۳۔ تنظیم اعمال

عرف عام میں اول کا لقب شریعت ہے‘ دوسرے کا طریقت اور تیسرے کا سیاست گویا یہ دین کے موالید ثلاثہ ہیں۔ جن سے دینی کائنات مرکب ہے۔ اسلام میں ان تینوں کے بغیر چارہ کار نہیں اور نہ ایک کے بغیر دوسرے کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

شریعت

شریعت سے تو راہ معلوم ہوتی ہے۔ اگر راستہ ہی سامنے نہ ہو تو قطع مسافت کیسے ممکن ہے؟ طریقت سے اس راہ پر چلنے کی اخلاقی قوت پیدا ہوتی ہے۔ اگر راہ روی کی طاقت نہ ہو تو محض راہ کی استقامت سے کیا ہوتا ہے اور سیاست سے راہ کے روڑے صاف ہوتے ہیں۔ اگر راستہ پر خار اور سنگ راہ سے لبریز ہو تو طاقت بھی

کیا کام دے سکتی ہے۔ اگر پھر بھی کام لیا جائے تو ساری طاقت راستہ ہی پر صرف ہو کر رہ جائے گی' منزل مقصود تک رسائی ہی مشکل ہو جائے گی۔ پس شریعت راہ ہے' طریقت قوت راہ روی ہے اور سیاست تصفیہ راہ ہے۔ قوت ہمیشہ مخفی چیز ہوتی ہے۔ راستہ ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے اور راستہ کی صفائی کا کام نمایاں ہی نہیں کافی شور و شغب بھی لئے ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی چیز ہے کہ :

طریقت

طریقت اور تصوف کی بنیاد یکسوئی اور انفرادیت پر ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مبانی واصول اور معانی و فروغ کے لحاظ سے انسان کو طبعاً تخلی وخلوت اور یکسوئی کی طرف کشاں کشاں لے آتی ہے ___ صوفی بحیثیت ایک صوفی کے ساری دنیا سے یکسو اور الگ تھلگ ہو جاتا ہے اسے صرف اپنی ذات اور اس کی صلاح وفلاح پیش نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر دوسروں سے ملتا بھی ہے تو انہیں بھی اپنا ہم مذاق بنا کر مخلوق سے منقطع کر دیتا ہے' بہرحال خلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت ہٹا نہیں سکتی جب تک کہ اس پر طریقت کا غلبہ ہو۔ لیکن شریعت کی بنیاد تعلقات کی کثرت اور اداء حقوق پر ہے۔ ہدایت وارشاد کی خاطر مخلوق میں گھسنا' ان کی اڑی کڑی جھیلنا اور لگی آگ میں گھس کر جلتے ہوؤں کو نکالنا۔ طریقت میں جس مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کی جاتی ہے۔ شریعت میں اسی مخلوق سے رابطہ جوڑا جاتا ہے وہاں فرار عن الخلق ہے اور یہاں ذہاب الی الخلق۔ پس ایک متشرع جس پر تشرع کا غلبہ ہو بحیثیت ایک شرعی فرد ہونے کے سارے انسانوں کی طرف دوڑ کر ان کی اصلاح کی فکر میں رہے گا۔ اسے درد ہوگا اپنے گھر' پھر اپنے قبیلہ کا' پھر شہر کی عام برادری کا اور پھر ساری دنیا کے انسانوں کا۔ پس اس جلوت پسندی سے اسے کوئی طاقت نہیں ہٹا سکتی جب تک کہ اس پر شرعی رنگ کا غلبہ ہوگا۔

سیاست

ادھر سیاست کے دائرہ میں تعلقات کی نوعیت اور بھی زیادہ شدید ومدید اور ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ وہاں شریعت کی رو سے تو آدمی اپنے نفس سے نکل کر عباد تک آیا تھا اور یہاں سیاست میں عباد سے نکل کر بلاد تک اور بلاد ہی نہیں صحراء وجبال' زمینوں اور ان کی پیداوار' دریاؤں اور ان کے بہاؤ' حیوانات اور ان کے منافع۔ غرض ساری کائنات کے اجزاء اور ان کی تنظیم تک ایک سیاسی کو بڑھنا پڑتا ہے۔ وہاں ایصال حقوق الگ ہے اور دفاع مظالم الگ۔ حدود وقصاص الگ ہے اور جہاد وجانبازی الگ' احراز غنائم الگ ہے اور اسارۃ محاربین الگ۔ غرض ایک شوکت کو توڑنا اور ایک کا جھنڈا بلند کرنا' مفسدوں کو دبانا اور مصلحوں کو سربلند کرنا' مبطلوں کا زور توڑنا اور محقون کو مدد دینا اور خلاصہ یہ کہ مادی وروحانی طاقتوں سے طرح طرح کے انقلاب کر کے سلطنتوں کو الٹ پلٹ کرنا اور نئے نئے نظاموں کی بنیادیں ڈال کر سارے عالم پر ایک شوکت قائم کرنا ایک سیاسی کا کام ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یکسوئی اور خلوت کہاں؟

یہاں تو عباد سے گزر کر بلاد' انسانوں سے گزر کر حیوانات' حیوانات سے گزر کر نباتات اور سب سے گزر کر ایک ایک چپہ زمین کے لئے اسی نفس کی ساعتیں صرف کی جاتی ہیں' جس کی ایک ایک گھڑی طریقت میں یکسوئی محض اور شریعت میں ایک خاص دائرہ تعلقات میں محدود تھی اس لئے طریقت خلوت محض ہے۔ سیاست جلوۃ محض ہے اور شریعت دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جو ان دونوں کو ملا کر خلوت در انجمن پیدا کر دیتی ہے۔

اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ شریعت کا خلوت در انجمن میں آنا جب ہی ممکن ہے کہ اس کے دائیں بازو پہ خلوت کا مخزن "طریقت" ہو اور بائیں بازو پر انجمن کا منبع "سیاست" ہو۔ ورنہ خلوت در انجمن اور دل بیار دست بکار کا وجود ہی نہیں ہو سکتا' ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان تین عنصروں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ان کے باہمی امتزاج کے مخلوط منافع منقطع ہو کر ایک ایک مخصوص مضرت سر پڑ جائے گی۔

اگر طریقت محض رہ جائے جس میں شریعت وسیاست نہ ہو تو وہ وحشت اور نجابت محض ہے۔ اگر شریعت محضہ ہو جس کے ساتھ طریقت وسیاست نہ ہو تو وہ شدت وجمود محض ہے۔ اگر سیاست کے ساتھ شریعت و طریقت نہ ہو تو وہ نخوت و تجبر محض ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں صفات کمال نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب میں کمال ہونے کی شان جامعیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بدرقہ اور مصلح ہے اور اسی لئے دین نے ان سب کو جمع کر کے اپنا نام دین رکھا ہے۔ جیسا کہ حدیث جبریل سے واضح ہے۔ پس طریقت کی وحشت کا بدرقہ شریعت وسیاست ہے۔ جن کی آمیزش سے شفقت علی الخلق اور تربیت عالم کا ظہور ہوتا ہے اور خلافت الٰہی نمایاں ہو کر نفسانی جبر و قہر فنا ہو جاتا ہے۔

پھر شریعت و طریقت کی کسمپرسی و بے بسی کا بدرقہ ہے سیاست جس کی مادی شوکت ان دونوں کے لئے سرمایۂ عظمت و حفاظت بنتی ہے۔

پس جب ایک طریقت اور تہذیب اخلاق کے ذریعہ نفس میں عدالت پیدا ہو گئی شریعت کے ذریعہ عالم احکام اور تعلیم غیر کا جذبۂ شفقت قائم ہو گیا اور سیاست وقوت کے ذریعہ اس علم احکام اور حسن اخلاق کے تنفیذ کی قدرت پیدا ہو گئی تو اب سیاست میں سے تو نخوت و تجبر نکل کر وقار و خودداری اور شہامت آجائے گی۔

طریقت میں سے رسم خلوت نکل کر حقیقت خلوت یعنی تعلق مع اللہ اور انقیاد احکام کا ملکہ پیدا ہو جائے گا اور ادھر اتباع شریعت میں خشکی وجمود' تنگ نظری اور تقشف سے نکل کر وسعت نظر' جامعیت ہمہ گیری' تعاون باہمی اور اتحاد ذات البین کے جذبات ابھر آئیں گے جس سے قوم کے مادی و روحانی عروج کا نقشہ خود بخود قائم ہو جائے گا۔

جس کے مجموعہ کو دین کہیں گے۔ جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ دین بغیر ان تینوں عنصروں کے جمع کئے ہوئے مکمل نہیں ہوتا اور خدام دین اس وقت تک صحیح معنی میں خدمت دین نہیں کر سکتے جب تک وہ بیک دم متشرع صوفی اور سیاسی نہ ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کی جارہی ہیں اور انکے حامل الگ الگ مستقل طبقات گنے جارہے ہیں اور اس طرح شریعت و طریقت اور سیاست کو الگ الگ مستقل منہاج سمجھ لیا گیا ہے اور نہ صرف اسی پر اکتفاء کیا گیا ہے بلکہ صوفی اپنے تصوف کی تکمیل اسمیں سمجھتے ہیں کہ وہ علماء کے مد مقابل آئیں۔ علماء صوفیوں کے مقابلہ پر ہوں اور سیاسی ان دونوں طبقوں کے بالمقابل کھڑے ہوئے ہوں اور یہ دونوں طبقے سیاسیوں کے۔

اس لئے قوم میں تین مستقل طبقے قائم ہیں اور وہ بجائے اس کے کہ مل کر کسی ایسی طاقتوں کے بالمقابل آئیں جس نے ان کا علم بھی غلط کر رکھا ہے اور عمل کا راستہ بھی غلط ڈال دیا ہے۔ اپنی اپنی طاقتیں اپنی ہی آویزشوں میں ختم کر دیتے ہیں جس سے تفرق انداز طاقت اور زیادہ قوی اور دلیر ہوتی جاتی ہے۔ میرے خیال میں جب تک یہ تینوں طبقے مل نہ جائیں اور نہ صرف افراد ہی مل جائیں بلکہ ان کے یہ تینوں فنون اس طرح باہم امیختہ نہ ہو جائیں کہ قوم کا ہر ہر فرد متشرع خالص' صوفی صافی اور سیاسی مخلص ہو جائے اس وقت تک قوم

بحیثیت مجموعی مکمل نہیں کہلا سکتی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کامیابی کا منہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔

اسلام میں دین سیاست سے الگ نہیں

وجہ یہ ہے کہ ان میں سے دو جز علم اور حسن اخلاق دیانت کے اساسی شعبے ہیں اور ایک جزو کمال نظم و اجتماعیت سیاست کا شعبہ ہے اور سیاست کو دیانت سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا جب ہی نہ حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دیانت، اگر دیانت نہ رہے تو سیاست اک کٹ کھنا اور جور و استبداد کا ملک ہو گا اور اگر سیاست نہ رہے تو دیانت بے کس، بے بس اور علی شرف الزوال ہو جائے گی۔ قانون محض اور کوری سیاست سے دنیا کبھی امن و چین کا منہ نہیں دیکھ سکتی اور نہ ہی عالم بشریت کی اصلاح و تنظیم ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو آج یورپ سب سے زیادہ صالح، سب سے زیادہ باہم مربوط اور ساری دنیا سے زیادہ پر امن ہوتا۔ کیونکہ وہاں قوانین سیاست کی دفعات برساتی کیڑوں کے عدد سے کسی طرح کم نہیں ہیں، کتنی ہی قانون ساز جماعتیں بارہ مہینے وضع قانون میں مصروف ہیں۔ ہاؤس قانونی بحثوں کے لئے وقف ہیں۔ نئی نئی ضروریات پر روزانہ قانون بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں لیکن جس حد تک سیاسی ضوابط بڑھتے جاتے ہیں اسی درجہ روابط باہمی گھٹتے جاتے ہیں۔ رقابتوں اور عداوتوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کی درندگی اور ہوسناکی قانون کے دائرہ میں رہ کر قانونی غارت گریاں اور آئینی ظلم و ستم خوب خوب سیکھتے جارہے ہیں اور یورپ کی ساری دنیا قتل و غارت اور ہوا و ہوس کا ایک جہنم زار بنی ہوئی ہے پس اگر سیاست محض اور روکھے قانون سے بشریت کی اصلاح و تنظیم ممکن ہوتی تو یورپ کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا کہ وہاں نہ سیاست کی کمی ہے نہ قوانین کی۔ وہاں اگر کمی ہے تو دیانت کی ہے۔ یعنی وہاں کی سیاست کے نیچے نہ اخلاق ربانی ہیں نہ مقاصد الٰہیہ کا علم ہے اور نہ ان کا کوئی نمونۂ عمل ___ اور جب سیاست کا محور ہی صحیح نہ ہو تو کوری سیاست اور خالی قانونی اتار چڑھاؤ سے امن نفوس اور سکون عالم کیسے نصیب ہو سکتا ہے۔

پس آج کی یورپین تباہ کاریاں اور عالم گیر سرپھٹول اور انسانیت کی یہ تباہی اور ذلت و خواری، فقدان سیاست سے نہیں بلکہ فقدان دیانت کے سبب سے ہے، جب آدمی ایک بے شعور درندہ بن جائے تو محض سیاست اس کے دل و دماغ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہ انقلاب ذہنیت صرف تہذیب اخلاق اور تعلیم کتاب اللہ سے ممکن ہے جو مجموعۂ دیانت ہے۔ ہاں مگر اسی طرح دیانت بلا سیاست اور علم و اخلاق بلا شوکت بے بس، بے کس اور عام نگاہوں میں بے وقعت ہو جانے کے سبب قبول عام اختیار نہیں کر سکتے اور نہ صرف یہی بلکہ اس ضعف آور صورت حال کے بڑھ جانے سے ان کی تحقیر و استہزاء اور تمسخر کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے شوکت پرست طبقہ میں ان کی حقارت ایک مشن اور مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ فساق و فجار طبیعتیں جو شوکت دین سے دبی رہتی ہیں۔ ان حالات میں کھل کھیلتی ہیں اور اسی استہزاء و تمسخر کی سنہ سیڑھ کو اور مضبوط بنا دیتی ہیں۔ ساتھ ہی وہ طبقہ جو گو فسق و فجور کا شکار نہ ہو مگر تقویٰ و تقدس کی طرف بھی کوئی خاص میلان نہ رکھتا ہو، وہ بھی فجور کا غلبہ و استیلاء دیکھ کر ادھر ہی مائل ہو جاتا ہے اور اب وہ خالص حقانی طبقہ جو علم و اخلاق کا سرمایہ لئے رہتا ہے بے کس، بے بس رہ جاتا ہے جن میں سے ضعفاء قلوب اس بے کسی کی مصیبت سے تنگ آکر بالآخر ادھر ہی جا ملتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ یہ دیانت بے سیاست اپنا وجود ختم کر دیتی ہے۔ غلامی اور محکومی کے منحوس آثار رفعت و شوکت کے سارے جذبات ختم کر کے خود ہی بلا شرکت غیرے غالب آجاتے ہیں۔ غلام آباد ہندوستان میں دیانت و راست بازی کی کمی نہیں بلکہ شاید وہ آزاد مسلم ممالک کی نسبت دینی

سرمایہ کا زیادہ امین ہے، لیکن اس کی دیانت بے یارومددگار اور زیر تشنیع وملامت ہے۔

مولوی کا غلط مذہب، جذبات، اینٹی ملازم، تکفیر اہل حق، ازالۂ اثرات علماء کی مساعی اور اس کے بالمقابل الحاد و شرک، بدعات، محدثات، منکرات وفواحش اور معاصی سے اہل دیانت کی ترغیم صرف اسی کا نتیجہ ہیں کہ دیانت اپنی ہے اور سیاست دوسرے کی، یعنی مسجد اپنی ہے اور قفل دوسرے کے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہے کھولدے اور جب چاہے بند کردے۔

پس اگر مغرب کی سیاست اس کے حق میں اس لئے مہلک ہے کہ اس کے ساتھ دیانت شامل نہیں تو مشرق کی دیانت اس لئے ناپائیدار اور غیر مستحکم ہے کہ اس کی پشت پر سیاسی طاقت نہیں۔ وہاں اگر فقدان دیانت سے مادی مصائب موت، ہلاکت، طوفان زلزلوں وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے تو یہاں فقدان سیاست سے روحانی خطرات، الحاد، دہریت بے دینی، شرک وبدعت وغیرہ کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ جب تک دیانت کے ساتھ سیاسی طاقت اور سیاست کے ساتھ علم واخلاق کی دیانت نہ ہو دنیا کبھی امن وچین کا سانس نہیں لے سکتی۔

اس لئے اسلام نے دین کی رہبانیت کو ختم کرکے تو اس کے ساتھ سلطنت ملائی اور سلطنت کی ملوکیت کو ختم کرکے اس کو خلافت الٰہی کا جامہ پہنایا، جس سے دیانت وسیاست کا ایک حکیمانہ امتزاج قائم ہوا کہ دیانت کی بے مونسی سیاست سے ختم ہوگئی اور سیاست کا جور واستبداد دیانت سے پامال ہوگیا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جامعیت کی طرف کھلے اشارے فرمائے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

الملک والدین توامان ۔

"ملک اور دین دو جڑواں بچے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے"۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

بعثت مرحمة وملحمة ۔ (حدیث نبویؐ)

"میں رحمت بنا کر بھی بھیجا گیا ہوں اور جنگ بنا کر بھی"۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

انا الضحوک القتال

"میں بہت ہنس مکھ بھی ہوں اور جنگ آور بھی ہوں"۔

ایک جگہ دوام دیانت کا وعدہ دیا اور ایک جگہ دوام سیاست کا:

لایزال من امتی امة قائمة بامراللّٰہ (ای الدین) حتی یاتی امراللّٰہ (ای القیامة) الجهاد ماض الی یوم القیمة ۔

"میری امت میں ہمیشہ ایک قوم تاقیامت دین کو برپا کرنے والی رہے گی (میری امت میں) جہاد قیامت تک باقی رہے گا"۔

قرآن نے نبوت کی بھی مدح درائی کی جو روحانی نعمتوں کا سرچشمہ ہے اور سلطنت کی بھی منقبت نوائی کی جو مادی نعمتوں کا سرمنشا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔ (القرآن)

"اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری

قوم تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے یاد کرو جب کہ اللہ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب سلطنت بنایا اور تم کو وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں"۔

دین 'سیاسی نظام کی حیثیت میں

اسلام نے جیسے دیانات کی بنیاد پانچ اساسی چیزوں کلمۂ توحید 'صلوٰۃ' زکوٰۃ' صیام' حج' پر رکھی ہے ایسے ہی سیاسیات کی بنیاد بھی پانچ ہی اصولی چیزوں پر قائم کی ہے 'جماعت 'سمع' طاعت 'ہجرت' جہاد۔

اسلام نے جہاں اخلاقی نظام قائم کیا جس سے انسانی نفوس' انسانی ذات البین اور قلوب وارواح کی اصلاح ہو اور اس سلسلہ میں عادات وعبادات' اخلاقیات اور معاملات وغیرہ کے ابواب قائم کئے وہیں سیاسی نظام بھی قائم کیا' جس سے بین الملی احوال درست ہوں' فتن کا استیصال ہو اور قانون الٰہی کے رواج پزیر ہونے میں کوئی قوی یا ضعیف رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس سلسلہ میں اس نے حدود وقصاص 'تعزیرات وکفارات' جہاد اور سد ثغور کے ابواب بھی پیش کئے۔

اسلام نے امیر المومنین کو جہاں سیاسی احکام کا منفذ نگراں اور امام بنایا وہیں اخلاقی اور دیاناتی امور کا بھی محافظ اور امام بنایا ہے۔ چنانچہ عدالت فوجداری' دیوانی' نظام عسکریت اور دفع مظالم کے ساتھ ساتھ امامت صلوٰۃ' امامت جنائز' ذاتیاتی احوال کی اصلاح اور اخلاقی تربیت بھی اس کے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس لئے امیر المومنین جہاں مسلمانوں کا بادشاہ ہو گا وہیں بمنزلہ باپ اور مربی واستاذ کے بھی ہو گا تاکہ ان کی دیانت وسیاست دونوں کی نگہداشت کرسکے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں کوئی سیاسی قانون بیان کیا گیا ہے وہیں آگے پیچھے کسی نہ کسی عنوان سے خشیت اللہ' خوف الٰہی' تقویٰ' طہارت اور توجہ الی اللہ وغیرہ کی طرف بھی متوجہ کردیا ہے تاکہ سیاسی الجھنوں میں پڑ کر دیانت سے غافل نہ ہو جائیں اور ایسے ہی جہاں دیانات کا کوئی شعبہ بیان کیا گیا ہے وہیں کوئی نہ کوئی سیاسی دھمکی اور تعذیب دنیا و آخرت کی کوئی نہ کوئی وعید بھی سامنے رکھدی گئی ہے تاکہ دیانات کے استغراق میں سیاسیات سے غفلت نہ ہو جائے۔

دین اور سیاست کی علیحدگی

بہر حال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی چیز ہے۔ یہ فرق انہی مذہب میں نکل سکتا ہے جنہوں نے صرف تعلق مع اللہ کے چند اصول پر بطور تصوف یا جوگیت تہذیب نفس کی سعی کی ہے اور انسان کو دنیا کے تعلقات ولذائذ سے الگ کرکے خدا سے ملانے کی صورت رکھی ہے' ان میں ترک دنیا بایں معنی اصل ہے کہ آدمی دنیا کے تمام معاملات' تمام لذتوں اور تمام روابط کو ترک کرکے گھربار' اولاد وبنیاد عزیز واقارب تک سے یکسو ہو کر کسی پہاڑ کے گوشے اور دریا کے کنارے بیٹھ کر یاد الٰہی میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے کہ وہاں تعلقات کی کثرت اور ہمہ گیری کب برداشت کی جاسکتی تھی۔ لیکن جس مذہب نے تعلق مع اللہ کے ساتھ تعلق مع الخلق اور تعلق مع النفس کے شعبے بھی اسی تفصیل سے پیش کئے ہوں' اس کے یہاں یہ قطع تعلقات اور ترک لذات کی رہبانیت ناتمام انسانیت سمجھی جاتی ہو اور ترک دنیا کا مفہوم گوشہ گیری نہ ہو بلکہ دنیا کے ہجوم میں رہ کر اداء حقوق ہو وہ

سیاسی اور معاشرتی تعلقات سے اپنے پیرووں کو کب علیحدہ رکھ سکتا تھا اور اسے رہبانیت کب برداشت ہو سکتی تھی؟

پس اس کے یہاں جیسے دیانات مذہب کا جزو اعظم ہے۔ وہیں سیاسیات بھی مذہب کا جزو اہم ہیں اور مذہب اور سیاست کے الگ الگ ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ مذہب اور سیاست کی یہ تفریق ایسے ہی غلط ہے جیسا کہ آج مذہب اور سائنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سائنس نے مذاہب کی بنیادوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اور یہ دونوں باہم جمع نہیں ہو سکتے حالانکہ سائنس انہی مذاہب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی جنہوں نے تمدن کو مٹا کر رہبانیت دنیا میں قائم کی۔ لیکن جو مذہب تمدنی حقوق' تمدنی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مناسب معاشرتی اقتصادی ضروریات کی تکمیل کا حامی ہو' اسے سائنس سے نقصان تو کیا پہنچتا سائنس اس کی ممد و معاون خادم ہے۔ ایسے ہی سیاست بھی دین کی خادم اور اس کا ایک جزو اہم ہے۔ البتہ اس سیاست کی معنی سیاست عصریہ کے نہیں بلکہ سیاست شرعیہ کے ہیں جس کی بنیاد علم و اخلاق' تقویٰ و طہارت اور فضائل اعمال پر ہے اور جو رذائل اخلاق و اعمال کو مٹانے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے نہ کہ ان کی تقویت کے لئے اور بالفاظ دیگر سیاست نبوت مراد ہے سیاست ملوکیت نہیں۔

یہ سیاست مذہب کا جزو اعظم ہے جس سے کسی حال قطع نظر نہیں کی جا سکتی' ہاں مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ ان دونوں میں دیانت اصل اور مقصود بالذات ہے اور سیاست اس کے بقاء و استحکام کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہزارہا انبیا علیہم السلام کے سلسلہ میں دیانات کے ابواب تو سب کو دیئے گئے مگر سیاسیات اور جہاد کی مشروعیت بعض کے لئے ہوئی اور بعض کے لئے نہیں۔ اگر ایک ہی درجہ کے دونوں مقاصد ہوتے تو یہ تفریق ناممکن تھی۔ اسی طرح جن اقوام کو دیانت اور سیاست دونوں دی گئیں جیسے بنی اسرائیل وہاں بھی اتنی تفریق عموماً دیکھی جاتی ہے کہ انبیاء کا سلسلہ الگ ہے اور سلاطین کا الگ۔ شاذونادر ہی ایک آدھ جگہ جمع ہوا ہے۔ مگر مقصودیت دیانات کی شان وہاں بھی نمایاں رکھی گئی کہ دیانات کا حکم نبی کی طرف سے ہوتا تھا اور اس کی تنفیذ سلاطین اور امراء عدل کے ہاتھ سے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ دونوں شانیں لا کر جمع کر دی گئیں۔ آپ بیک وقت خلیفہ اللہ فی الارض بھی تھے اور مربی دین عالم بھی مگر اصل دین تھا جو آپ کی سلطنت کا محور و مرکز رہا۔ یعنی آپ کی ساری اسلامی سیاست دین کے محور پر گھومتی تھی اور صرف اس لئے تھی کہ اس کی قوت سے اوامر دین نفاذ پذیر ہوتے رہیں اور اجراء و ترویج دین میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ جس سے دیانت کا مقصود بالذات ہونا اور سیاست کا اس کے حق میں وسیلہ ہونا صاف واضح ہو تا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس کی تصریح کی ہے :

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (القرآن)

"یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیں اور نیک کام کرنے کا آرڈر دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام تو خدا ہی کے اختیار میں ہے"۔

یہاں تمکین فی الارض یعنی سلطنت کی غرض و غایت دیانت کے شعبوں کو قرار دیا گیا ہے جس سے سلطنت کا ان امور کے حق میں وسیلہ ہونا ظاہر ہو تا ہے۔ جس کا راز یہ ہے کہ انبیاء کا مقصد دنیا میں امانت کا پھیلانا ہے تو ایمان اور امن کی زمین ہے اور جسے انسان کے سوا کائنات ارض و سماء کے کسی بڑے سے بڑے جزو نے جو

قبول کرنے سے کانوں پر ہاتھ دھر لیا تھا۔ اس امت کی ضد فتنہ ہے جو اس کے حق میں سرراہ ہوتا ہے۔ یہ فتنہ کبھی علم ہی کی راہ سے آتا ہے اور کبھی عمل کی۔

علمی فتنہ کا نام فتنۂ شبہات ہے اور عملی فتنہ کا نام شہوات ہے اور ظاہر ہے کہ فتنۂ شبہات جبکہ علم نافع میں مخل ہے۔ تو وہ جہل کی قسم سے ہوگا اور فتنہ شہوات جبکہ عمل صالح میں مخل ہے تو وہ از قسم ظلم ہوگا اس لئے فتنہ مجموعۂ ظلم و جہل ہے اور امانت مجموعۂ علم و اخلاق۔ انبیاء کا مقصد چونکہ امانت پھیلانا ہے۔ جس کی راہ میں یہ فتنہ خلل انداز ہوتا تھا۔ تو اس کا دفعیہ ضروری سمجھا گیا اور یہ فتنہ یعنی ظلم و جہل جبکہ انسان میں جبلی تھا تو جبلت کا بدل دینا اور لوگوں کے خلاف طبع شبہات و شہوات سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہ تھا کہ بغیر طاقت کے محض وعظ و پند سے پورا ہو جائے۔ اس لئے سیاسی قوت کی ضرورت پڑی پس طاقت دیانات کے مستحکم کرنے اور ان میں علم و اخلاق نبوت پیدا کرنے کا ایک آلہ اور ذریعہ ہوا تاکہ خلق خدا امن و سکون کے ساتھ اس علم و خلق سے اپنے مقصد زندگی یعنی طاعت و عبادت الٰہی کے فرائض انجام دیتی رہے۔

اسلامی سیاست اور عصری سیاست کا فرق

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی سیاست اور مسلمانوں کی کسی سیاسی جدجہد کا مقصد وہ کبھی نہیں ہو سکتا جو آج کی عصری سیاستوں میں پیش نظر رکھا جاتا ہے جس کا تمام تر خلاصہ صرف تین چیزیں ہوتی ہیں۔ زمین زر اور ذاتی اقتدار۔ آج کے سیاسی اور جنگی اقدامات کی آخری منزل اور حقوق طلبی کا آخری معیار اس کے سوا کچھ نہیں کہ فلاں فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے چونکہ فلاں ملک یا قوم کا حق ہے۔ لہٰذا اسے ملنا چاہئے یا فلاں فلاں رقبہ میں فلاں قوم کا تجارتی نظام۔ قومی یا نسلی یا وطنی حقوق کے ماتحت قائم ہونا چاہئے یا فلاں ریاست پر فلاں شہنشاہی کا اقتدار یا انتداب قائم ہونا چاہئے ورنہ پھر جنگ ہے۔

ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں زمین، دوسری صورت میں زر اور تیسری میں ایک قوم کا ذاتی اقتدار نکلتا ہے۔ جسے جنگ کے لئے وجہ جواز اور کافی حجت سمجھ لیا جاتا ہے۔ آج کی دنیا کی دو ثلث آبادی انہیں تین وجوہ جواز سے کٹ مرنے اور سر پھٹول کے عذاب میں مبتلا ہے۔

اسلامی نظام حکومت اور اسباب جنگ

اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ وجوہ جواز جنگ کی نہیں بلکہ حرمت جنگ کی ہیں کہ وہاں جنگ یا آویزش کسی خطۂ زمین، کسی تجارتی مفاد یا کسی انسانی اقتدار کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ اغراض اس کے نزدیک نہایت خسیس اور بے وزنی ہیں۔ اس کے نزدیک باہر کی زمین یا سرمایہ انسانی اقتدار کسی قوم اور کسی قبیلہ کا حق نہیں کہ اس پر ہجوم کرنے کا اسے حق ہو۔ زمین کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ۔

”بلاشبہ زمین خدا کی ہے جسے چاہے اس کا وارث بنائے۔“

یہاں زمین کی ملکیت اللہ کے لئے ثابت کی ہے۔ انسان کے لئے نہیں وہ صرف بقدر وراثت حصہ پا سکتا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۔

''میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں''۔

یہاں انسان کے لئے خلافتِ ارضی ثابت کی گئی ہے نہ کہ ملکیت ارضی یعنی مالک الملک خدا ہے اور یہ اس کی طرف سے نائب ہے' اس کی طرف سے زمین میں تصرف کر سکتا ہے' ذاتی طور پر نہیں۔
مال کے بارے میں فرمایا گیا :

وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْ اٰتَاکُمْ۔

''اور لوگوں کو اللہ کے اس مال سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے''۔

یہاں سارے مال کو خدا کی ملک بتلایا گیا ہے' جس کے حق میں انسان امین اور وکیل ہے۔ اللہ کی اجازت اور اباحت سے اپنے اور اپنے متعلقین پر خرچ کر سکتا ہے ذاتی موجبات سے نہیں۔ ایک جگہ فرمایا :

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ۔ (القرآن)

''اور خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تم کو دیا''۔

یہاں رازقیت اللہ کے لئے ثابت کی گئی ہے جو اس کے مالک ہونے کی دلیل ہے اور انسان کو منفق اور محض خرچ کنندہ کہا گیا ہے جو اس کے صرف خزانچی ہونے کی دلیل ہے۔

حکومت الٰہی

اسی طرح حکومت واقتدار اور انتداب کے بارے میں فرمایا گیا کہ :

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔

''حکم منصب سوائے خدا کے کسی کو نہیں''۔

اس سے ایک خدا کی حاکمیت ثابت ہو کر غیر اللہ کی حکمرانی منفی ہو جاتی ہے۔
ایک جگہ فرمایا :

وَمَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَھُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِھِمْ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِیْنًا۔

''اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا''۔

اس میں آمریت صرف اللہ کے لئے مخصوص کر کے انسان سے نہ صرف آمریت کی نفی ہی کر دی گئی ہے بلکہ اوامر الٰہی کے بعد بندہ کے چون وچرا اور لم وکیف کی گنجائش بھی سلب کر لی گئی ہے۔ یعنی امر الٰہی کا نہ ماننا تو بجائے خود ہے اس میں تامل کرنا بھی عصیان اور کھلی گمراہی بتایا گیا ہے۔

قرآن کے ان تینوں مقامات سے واضح ہے کہ مالکیت' آمریت' اور اقتدار' حکومت صرف خدا کے لئے ہے۔ ساری زمین اور سرمایہ صرف اسی کے حیطہ ملکیت میں آیا ہوا ہے۔ اس تعلیم کے بعد کسی مسلم قوم کو جو اس فطری تعلیم سے آشنا ہو ان اغراض کے لئے کسی سیاسی جدوجہد یا کسی جنگی اقدام کا حق نہیں پہنچتا۔ ہاں وہ اگر کسی زمین کا قصد کریں گے یا کسی قوم پر ہجوم کریں گے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے۔

الحکومت والجہاد

چنانچہ قرن اول کے جنگی اقدامات کی وجہ جواز یہ یادداشتیں نہ تھیں کہ فلاں خطہ جغرافیائی حیثیت سے عرب میں شامل ہونا چاہیے یا عرب انتداب کسی رقبہ پر ضروری ہے یا عرب تجارت کے لئے فلاں دریا کا کنارہ اس کے لئے مخصوص ہونا چاہئے ورنہ اعلان جنگ ہے بلکہ کسی رقبہ زمین پر وجہ جواز جنگ کے لئے تین چیزیں پیش کی جاتی تھیں۔ یا خدا کا دین قبول کرلو۔ یعنی اسلام میں داخل ہو جاؤ جو مجموعہ دیانت وسیاست اور چشمۂ علم واخلاق ہے یہ نہیں تو خدا کے دین کی شوکت قبول کرلو اور اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے قانون الٰہی کے اقتدار کے نیچے آجاؤ اور یہ اقوام پر اس لئے شاق بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ غیر اسلام میں کہیں مذہب وسلطنت ایک چیز نہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو خدائی اصول پر کوئی شریفانہ معاہدہ کرلو اور اپنے ملک میں آباد رہو ان میں سے کوئی بات بھی قبول نہ ہو تو یہ اوامر الٰہی سے کھلی بغاوت اور اعلان جنگ ہے اور خدا کے باغی کے لئے نائبان خداوندی کے پاس کوئی رعایت یا جان ومال کی حفاظت کی کوئی ادنیٰ ضمانت نہیں۔

اسلامی جہاد کی غرض وغایت

پس اسلامی جہاد اور اسلامی سیاست یا اسکے کسی سیاسی اقدام کی غرض وغایت زمین وسرمایہ یا اقتصادی نظام وغیرہ تو کیا ہوتا خود مسلمان کی اپنی حکومت قائم کرنا بھی نہیں ہوسکتا بلکہ اشاعت دین اور محض خدا کی حکمرانی دنیا سے منوانا' اس کے کلمہ کو اونچا کرنا اور صرف اسی کے مستند قانون کو دنیا میں پھیلانا اور اقوام کی صفوف میں نظام ملت کی شوکت قائم رکھنا ہے۔

"لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ الْعُلْيَا"

آپ اندازہ کریں کہ ان مقدس اور ہمہ گیر مقاصد۔ اشاعت دین الٰہی' اقامت حکومت الٰہی' حفاظت نظام الٰہی سے دنیا کی کونسی دانشمند قوم اعراض کرسکتی ہے اس میں کسی قوم کے اپنے اقتدار یا مفاد کا سوال ہی نہیں بلکہ صرف اقتدار خداوندی اساس مقاصد ہے۔ گریز اگر ہوسکتا ہے تو کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے ذاتی اقتدار کے تحت میں آنے سے ہوسکتا ہے اور ہونا چاہئے جبکہ انسان' انسان اور اقوام' اقوام سب برابر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم پر خواہ مخواہ اپنا اقتدار قائم کرے یا اسے غلام بنانے کے منصوبے گانٹھے لیکن جب ایک قوم اپنے اقتدار کا نہیں بلکہ انکسار کا اعلان کرکے یہ واضح کرے کہ وہ ذاتی اغراض یا مفاد کی خاطر مصروف جنگ ہونا نہیں چاہتی بلکہ صرف اس لئے کہ خدا کا صحیح اور مستند علم اور خدا کے پاکیزہ اخلاق سے دنیا آشنا ہو' اسے ملک گیری اور طمع جاہ وجلال سے کوئی علاقہ نہیں بلکہ وہ ہزار ملک فتح کرکے بھی اپنی ذوات کے حق میں درویش اور سادہ حال رہنا چاہتی ہے اس کا جنگی مقصد ہوس زر وجواہر نہیں بلکہ زہد وقناعت سے دنیا کو ہمکنار کرنا ہے' اس کا مقصد خود وہ نہیں بلکہ اس کا خدا ہے۔

تو یہاں کسی کے ذاتی یا قومی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو اس جنگی اقدام کے حق بجانب سمجھنے میں ذرا سا بھی شبہ دامن گیر ہو۔ پس بندوں کی حکومت بندوں پر تو موجب نزاع وفساد بن سکتی ہے لیکن خدا کی حکومت بندوں پر تو جب ہی وجہ نزاع بن سکتی ہے جب خدا ہی کے ماننے سے انکار کردیا جائے۔

ایک لمحہ غور و فکر

اس لئے آج بھی اگر مسلمان اپنی قومی حکومت، قومی اقتدار یا کسی خاص خطہ زمین پر مخصوص انف سرمایہ اور اقتصادی نظام یا کسی خاص وطن کا جغرافیائی سوال لے کر کھڑے ہوں گے تو قطع نظر اس کے مقاصد اسلامی نہ ہوں وہ کسی معقول طریقہ پر ان سوالات کو کسی سے منوا بھی نہیں سکتے اور نہ کسی وجد کی روشنی میں خود ہی اپنا اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ بہر حال کامیابی اور ناکامی تو خدا کے ہاتھ میں ہے نصب العین اور نظریہ اگر صحیح اور موجب اطمینان و تسلی ہو تو ہر اقدام پر کیف اور پر سکون ہو جاتا ہے مطمئن ہو کر آدمی دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اپنا نصب العین وہی قائم کرے اول کا تھا۔ یعنی قانون الٰہی کی ترویج اور اقتدار حق کی اشاعت اعزاز نظام دین جن کا خلاصہ وہی تین امو ہیں،

تعلیم احکام، تہذیب اخلاق اور تنظیم اعمال یعنی اتباع اسوۂ حسنہ تو ہمارے ہر دعوے میں معنی بھ ہو جائیں گے اور ہمارا ہر اقدام ذاتی مفاد کی تہمت سے پاک ہو کر دنیا کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جائے گ کامیابی کی منزل بھی قریب تر آجائے گی۔

خلافت راشدہ کے بعد

میں جہاں تک سمجھتا ہوں قرون خیر کے بعد اسلام کی بارہ سو سالہ عمر میں جس قدر بھی قومی انحطاط و ت اقدامات میں جس قدر بھی ناکامی کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، ان کا بنیادی سبب اکثر و بیشتر انہی تین ا چیزوں کی قلت یا قوم کے مزاج کا ان تینوں عنصروں کی آمیزش سے خالی رہ جانا یعنی فقدان جامعیت ہوا یعنی ناکامی یا علم کی قلت سے یا اخلاق کی کمزوری سے یا نظام کی ابتری سے پیدا ہوئی ہے۔

چنانچہ خلافت راشدہ اور اس کے تتمہ یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد (جو ان تینوں عنا جامعیت کا مکمل نقشہ اور طوفانی فتوحات کا حقیقی دور تھا) مسلمانوں کے تنزل کے سلسلہ میں اول فتو رکیں، پھر ملک ہاتھ سے نکلنے شروع ہوئے پھر اندرونی کمزوریاں ابھر کر نظم میں ابتری پھیلی اور پھر انجا پستی اور زیر دستی کے ایام آنے لگے۔

یہ محض اسی لئے کہ مسلمانوں کے سامنے منزل مقصود نہ رہی یا رہی تو راہ مقصود نامعلوم رہی یا ر معلوم ہوئی تو اس پر چلنے کی اخلاقی طاقت نہ رہی اور یا وہ بھی رہی تو کوئی چلانے والا مرکز اور امام نہ ہوا جو علم و خلق سے اسی مقررہ نظام پر انہیں لے چلے اور اگر کوئی ایسا فرد بھی ہوا تو گروہی تعصب نے اس کی پیرو اجازت نہ دی۔ غرض ان تینوں عنصروں علمی قوت، اخلاقی قوت اور انتظامی قوت کا زوال ان نتائج بد کا م بنتا رہا ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا زوال

تفصیلات کا موقع نہیں، لیکن اصولی طور پر اب اس کے مان لینے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہئے کہ ہندو کی باگ ڈور بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے انہی تین عناصر کے زوال سے شروع ہوئی۔ عالمگیری دور اور

عالمگیری کے فقہی نظام کے بعد بتدریج ان تین بنیادوں میں نقصان آیا تو رفتہ رفتہ اس ملک پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ملک کی جہالت ناتربیتی اور بدنظمی کے سبب بالآخر یہ ملک کلیۃً ہاتھ سے نکل گیا۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ

۱۲۴۶ھ میں اللہ کے چند مخلص بندے حضرت سید صاحب شہید بریلوی اور حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب شہید رحمتہ اللہ علیہ کی قیادت میں اٹھے، بڑھے اور شہید بھی ہو گئے مگر تمام قوم کی لاعلمی اور ناتربیتی ناکامی کا باعث ہوئی اور اپنے ہی اجزاء ذریعہ شکست بن گئے۔

حضرت قاسم العلوم والخیراتؒ

۱۸۵۷ء میں پھر ایک جدوجہد ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت اقدس حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی قیادت میں اٹھے اور فتوحات کی لائن پر پڑ بھی گئے۔ مگر وہی قوم کی بے بصیرتی، ناتجربہ کاری اور ناتیاری سامنے آئی۔ ملک تعلیم وتربیت سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ اس لئے نتیجہ صفر کے درجہ میں رہا۔

عصر شیخ الہندؒ

۱۳۳۹ھ میں حضرت مولانا شیخ الہند کھل کر میدان تحریکات میں آئے۔ قوم کی طرف سے جوشیلا استقبال ہوا۔ عظمت رفتہ کی بازیافت کیلئے حقیقی تڑپ کے ساتھ قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر تعلیم وتہذیب اخلاق کی قلت نے نتیجہ پھر پردہ عدم ہی میں مستور رکھا اور فتن ومصائب بڑھتے ہی گئے اور آج جبکہ قدرتی انقلاب کے تحت اقوام کی قسمتوں کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ کوئی قوم ابھر رہی ہے اور کوئی گر رہی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت علم واخلاق اور نظم سے اتنی ہی دور ہے جس قدر کہ سو برس پہلے تھی۔

تحریض عمل

اس سے انکار نہیں کہ جذبات وعواطف اور میلانات میں تغیر ضرور ہو رہا ہے، رفتار زمانہ نے انہیں جھنجھوڑ کر کچھ بیدار بھی کر دیا ہے اور خواب غفلت چھوڑ کر بیداری کی طرف آ بھی رہے ہیں۔ لیکن محض نیند سے جاگ اٹھنا تو کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اٹھ کر منزل مقصود کا راستہ نہ پکڑا جائے اور گامزنی شروع نہ کر دی جائے اس لئے ضرورت ہے کہ تعمیری رنگ میں انہی عرض کردہ تین بنیادوں کو جو قرن اول کا اصلاحی پروگرام ہے مضبوطی سے پھر سنبھالا جائے۔ یعنی :

تعلیم کتاب، تہذیب اخلاق، تکمیل اسوۂ حسنہ۔

جس کو ذرا اور عام عنوانات سے یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اشاعت دین الٰہی، اقامت حکومت الٰہی، تنظیم حیات انسانی۔

اشاعت دین الٰہی

تعلیم :

اشاعت اسلام اور حفاظت دین کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز تعلیم ہے۔ جس مذہب کی تعلیم باقی نہ رہے وہ مذہب کبھی باقی نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں ایک مکمل تعلیم ہے جس سے جامع علماء پیدا ہوں اور اسلام کی حفاظت ومدافعت ہر ڈھنگ اور ہر رنگ سے کر سکیں۔ یہ تعلیم مدارس ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ جس کا تکفل اہل مدارس نے کیا ہوا ہے۔ ایسے دینی مدارس ملک میں قائم ہیں مگر کم۔ کمی حوصلہ افزائی کی کمی کی وجہ سے ہے۔ اگر قوم اس ضرورت کا احساس کرے تو شہر میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے دینی مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جس میں جامع علماء مسند درس پر بیٹھ کر مسلمان نونہالوں کو کتاب وسنت اور اس کے فقہی قانون سے واقف بنائیں اور ہر فتنہ کی مدافعت کر سکیں۔

قاسمی علوم اور فلسفہ

میں اس میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ تعلیم کے قدیم منہاج کو باقی رکھ کر نئی ضروریات نظرانداز نہ کی جائیں اور انہیں سامنے رکھ کر تعلیم کا پروگرام بنایا جائے۔ صورت ایسی ہو کہ دعاوی قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ پرانے دعاوی نئی دنیا کے دماغوں میں اتر سکیں۔

مرکز علوم دار العلوم دیوبند

ہم اپنے تجربہ اور سالہاسال کے نتائج فکر کے لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا جدید فکر جس میں منقول اسلام کو معقول اور پھر معقول کو محسوس کر کے دکھلادیا گیا ہو' اس جدید دور میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانئ دار العلوم دیوبند نے پیش فرمایا ہے جو خاندان ولی اللہی کی حکومتوں کا نچوڑ اور اس حکومت کو اگر قصر فرض کیا جائے تو یہ اسمیں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔ یہ فکر شریعت' طریقت اور سیاست کے مجموعی امتزاج سے پیدا شدہ ہے اور اس کے منہاج پر چل کر ذہن میں اسلام کا جامع تصور قائم ہوتا ہے ___ اس جامع تصور کا تعلیمی مرکز دار العلوم دیوبند ہے' ان بزرگوں کے عام فکر کے ساتھ خصوصی طور پر ان کی مخصوص کتابیں جیسے حجت اللہ البالغہ اور تقریر دلپذیر وغیرہ داخل درس بھی ہیں۔

مستقبل کا تعلیمی پروگرام

اس حکمت شرعیہ کے ساتھ وہاں کے ذمہ داروں کا یہ بھی قصد ہے کہ حکمت عصریہ کے ضروری مضامین مثل قدیم علم السیاست' مبادیات سائنس' سیاست حال کے اصول' اقتصادیات وغیرہ بھی داخل نصاب کردیئے جائیں تاکہ طلبہ اپنی مخصوص حکمت کے ساتھ رائج الوقت نظریوں میں بھی بصیرت پیدا کر کے صحیح طور سے ان پر رائے زنی کر سکیں۔

بہر حال یہ کام مدارس کا ہے۔ قوم کی طرف سے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح

الخیال اور صحیح الاحوال علماء پیدا ہوں اور قوم کی رہنمائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔

مسجدی تعلیم

مگر یہ ظاہر ہے کہ مدارسی تعلیم کا دائرہ بہر حال محدود ہے' نہ ہر شخص مکمل عالم بننا چاہتا ہے اور نہ اس کی ضرورت بھی ہے۔ اس لئے مدارسی تعلیم کے علاوہ ایسی ابتدائی تعلیم کی ضرورت پھر بھی باقی رہتی ہے جس سے عوام مسلمین کے تمام بچے مستفید ہو سکیں اور ضروریات دین کا علم ہر مسلم گھرانے میں پہنچ جائے۔ اس مسئلہ کا حل ابتدائی مکاتب ہیں جو ہر محلہ کی مسجدوں میں قدیم طریقہ پر قائم ہوں اور ان کا تعلق بڑے اداروں سے رہے۔ ایسے مکاتب نہ صرف شہروں اور شہروں کے تمام محلوں ہی میں ہوں بلکہ دیہات میں بھی جابجا قائم ہونے ضروری ہیں۔ مسلمان زمیندار اپنے اثرات سے دیہات کی تمام مساجد میں ایسے مکاتب قائم کردیں جن میں قرآنی تعلیم کے ساتھ اردو کے ایسے مختصر رسالے داخل درس کردیئے جائیں جو ضروریات دین' عقائد فرائض' اخلاقیات' معاملات ومعاشرات اور ابتدائی حساب کتاب کے مسائل پر حاوی ہوں۔

درس قرآن

بہر حال خواص کی تعلیم مدارس سے اور بچوں کی تعلیم مکاتب سے پوری ہو جاتی ہے لیکن عوام رہ جاتے ہیں۔ اس لئے اس کی شکل مساجد میں درس قرآن حکیم کی ہے جس میں قرآن کریم کا عام فہم اور سلیس ترجمہ سنایا جائے اور بہ ذیل ترجمہ فقہ کے عملی مسائل موقعہ بموقعہ بیان کئے جائیں تاکہ عوام بھی غافل محض اور جاہل صرف نہ رہ جائیں اور ان میں علم کا شوق اور عمل کا جذبہ پیدا ہو۔

تبلیغ

لیکن تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب ومساجد کی بہر حال پھر ایک محدود دائرہ رکھتی ہے اور صرف اسی حالت میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کہ طالب علم ان اداروں اور مکاتب میں آئیں اور کچھ لے کر جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے قوم کی تعلیم عام اور دین کی صلائے عام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے کے ساتھ اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ معلمین دین لوگوں کی طلب کا انتظار ترک کر کے خود ہی تعلیم دین کی طلب لے کر نکلیں اور لوگوں کے کانوں تک کلمۂ حق پہنچائیں اسی کو شرعی اصطلاح میں تبلیغ کہتے ہیں' جو دین کا ایک اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور انبیاء علیہم اسلام کا اصلی اور حقیقی ورثہ ہے۔

تبلیغ ایک اجتماعی مؤثر کی حیثیت میں

تبلیغ ہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ہمیشہ اقلیت واکثریت کا فیصلہ کیا ہے۔ مکہ میں کلیت کفار کی تھی' تبلیغ نبوی سے اولاً مسلم اقلیت پیدا ہوئی پھر اکثریت اور پھر کلیت بن گئی۔ مدینہ میں بھی کلیت غیر مسلموں کی تھی۔ ابتداءً جمرۂ عقبہ والی تبلیغ سے اقلیت بنی' پھر اکثریت ہوئی اور رفتہ رفتہ کلیت۔ یہاں تک کہ حجاز میں اقلیت واکثریت کا سوال ہی باقی نہیں رہا اور تبلیغ نے قدرتی طور پر اس کا حل کر دیا۔

ایران میں فتوحات ملکی کے ساتھ تبلیغ داخل ہوئی تو وہی مسلم اقلیت سے اکثریت اور پھر کلیت پیدا

ہوگئی۔ غرض جن ملکی فتوحات میں تبلیغ دین اور نشر و اشاعت اسلام کا مقصد سامنے رہا ہے وہیں مسلمان، مسلم و غیر مسلم کشاکشی سے نجات پا گئے اور جہاں محض ملکی فتوحات ہو کر رہ گئیں اور روحانی فتوحات سے آنکھیں بند کر لی گئیں جو تبلیغ سے ممکن تھیں وہیں یہ کشمکش قائم ہے۔

مسلم سلاطین کا قصور

اگر مسلم سلاطین ہند اس بنیادی مسئلہ کو سامنے رکھتے تو آج صوبوں کی اقلیت واکثرت کے وہ متنازع فیہ مسائل پیدا نہ ہوتے جو ہو رہے ہیں اور جنہوں نے مسلم غیر مسلم آویزش ہی نہیں بلکہ باہم مسلمانوں میں بھی اختلاف کی ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔

نقطہ اتحاد

بہرحال اس کا حل بھی مسئلۂ اقلیت پر بحث سے نہیں بلکہ تبلیغ سے نکل آئے گا۔ اگر کام شروع ہو جائے تو کام کی برکات نتائج خود ہی سامنے لے آئیں گی۔ کاش مسلم جماعتیں اسی ایک مسئلہ کو اپنا مابہ الاتحاد بنالیں اور مل کی متحدانہ عمل شروع کر دیں۔ بہرحال اتحاد کسی متحدہ نصب العین سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر مسلمانوں کی تعلیم اور تبلیغ کا مسئلہ متفق علیہ ہے۔ جس سے کسی مسلمان فرد یا جماعت کو اختلاف نہیں ہو سکتا تو کیا اتحاد کے دائرہ میں آنے کے لئے یہ عرض کردہ مسائل مقدمہ اور تمہید نہیں بن سکتے۔ میرے خیال میں بن سکتے ہیں اور انہیں بنالیا جائے اور اسی سے تنظیم ملت کا آغاز کر دیا جائے جو آئندہ دوسرے مسائل میں بھی اجتماعی زندگی کے راستے ڈال دے گی۔

ان مبلغین دین کے لئے اگر استغناء کی صورتیں پیدا کر دی جائیں تو وہ ان کی تبلیغ میں موثر ہوں گی۔ انبیاء علیہم السلام کے تبلیغی اسوہ کا جزء اعظم یہ اعلان ہوتا تھا کہ :

وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍاِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

"اور میں اس تبلیغ پر تم سے کوئی اجرت نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اللہ رب العالمین پر ہے"۔

اس کے لئے قوم کے سرمایہ دار حضرات تعلیمی مکاتب کے ساتھ کچھ معمولی صنعتی مکاتب بھی قائم کر دیں جس سے مسلم عوام اپنے خطہ کے مناسب ایسی صنعتیں سیکھ سکیں جن کی مقامی تمدن میں ضرورت ہے اور اس سے اپنے استغناء کی حفاظت کر سکیں۔ اسی کے ساتھ ان مکاتب صنائع کو اگر تجارتی اصول پر قائم کیا جائے اور اس کی تدریجی آمدنی میں اس کی بھی رعایت رکھی جائے کہ جو مبلغ کسی صنعت میں مہارت پیدا کر کے نکلے اور حاجت مند ہو تو اسی فنڈ سے اسے اتنا سرمایہ بطور قرض دیا جائے جس سے وہ اپنا کاروبار مختصر پیمانے پر کھول سکے اور اسی ضمن میں تبلیغ کے فرائض انجام دیتا رہے۔ تو یہ صورت بہت حد تک تبلیغ میں معین ثابت ہوگی اور مبلغین کے وقار کے لئے محافظ بن جائے گی۔

طریق تبلیغ

تبلیغ میں اسی اسوۂ حسنہ کے نقش قدم کو مشعل راہ بنایا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً

اختیار فرمایا اور قرآن حکیم نے اسے اصولاً پیش کیا یعنی ___ تبلیغ الا قرب فالا قرب کے قاعدہ سے ہو۔ اولاً ایک شخص اپنے نفس کو اسلام سے آراستہ کرے، پھر اپنے اہل بیت کو، پھر اہل قرابت کو، پھر اہل شہر کو، پھر مضافات کو اور پھر ملک کو۔

یہ صورت حال اسی طرح سہل ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کی ہر بستی میں یہ اصول پہنچ جائے اور ہر بستی کا مبلغ اسی تدریجی اصول تبلیغ کو اختیار کرے تو ہر جگہ یہ تدریجی رفتار قائم ہو کر تبلیغ کو ہمہ گیر بنا دے گی۔ یہ تبلیغ جلسوں کی صورت میں نہ ہونی چاہیے بلکہ خاموش طریقہ پر عملی شکل میں۔

تذکیر

اسی کے ساتھ تذکیر سے بھی اغماض نہ کیا جائے یعنی عام جلسوں کے ذریعہ مقرر تقریریں کر کے اصل مقصد کی یاد دہانی کریں۔ موعظت و نصیحت کا بازار گرم ہو کہ

وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (القرآن)

"بار بار یاد دہانی کرو۔ کیونکہ یاد دہانی ایمان داروں کو نفع دیتی ہے"۔

لیکن یہ تعلیم خواہ مدارس کی ہو یا مکاتب کی، مساجد کی ہو یا تبلیغی رنگ کی۔ بہرصورت اس میں ایک جزء اہم اور لازمی رکھا جائے اور وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی سے باخبر کرنا اور ان کی شاندار روایات سلف سے انہیں آشنا بنانا، جس کا مرکز و محور سیرت مقدسہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور اسی کے ساتھ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی زندگی ان کے سامنے لائی جائے۔

یہ دو صورتیں ان کے دل ودماغ اور روحوں میں انقلاب پیدا کر دیں گی اور ان میں آگے بڑھنے کا ولولہ خود بخود ابھر جائے گا، بشرطیکہ پڑھانے والا ان سیرتوں سے خود متاثر اور ان کے بنیادی نقطوں سے واقف کار ہو۔

دوسرا اہم جزء جس کا خصوصیت سے ان بچوں اور بڑوں کو تعلیم و تبلیغ اور درس و تذکیر میں سکھلایا جانا ضروری ہے یہ ہے کہ :

"دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" ___ اور "دنیا میں اسلام سے روکنے کی کیا کیا تدابیر عمل میں لائی گئیں"؟

ان دونوں مضمونوں کا قدرتی ثمرہ ایک تو یہ ہوگا کہ نوجوانوں میں اشاعت اسلام کا جذبہ پیدا ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ اشاعت دین کے ڈھنگ اور تبلیغ کی بنیادیں معلوم ہوں گی اور اسی کے ساتھ موانع تبلیغ کی تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی، جن پر قابو پالینے کا راستہ بہ سہولت سامنے آسکے گا۔

عسکریت

ان تمام تعلیمات کے سلسلہ میں مدارس ومکاتب وغیرہ میں ایک اہم الاہم جزء کی اشاعت و ترویج بلکہ عملی مشق وریاضت کرائے جانے کی شدید ضرورت ہے۔ اور وہ عسکریت کی روح ہے جو مسلمانوں کا قدیم اور روایتی جوہر ہے۔ مگر جسے آج کے عیش افزاء تمدن اور مخالف طاقتوں کی پالیسیوں نے سست اور مضمحل بنا دیا ہے۔

اسی سلسلہ میں جہاں جسمانی حیثیت سے ورزش، سپہ گری، لکڑی بازی، نیزہ بازی، گدکا اور بنوٹ وغیرہ سکھلائے جانے کی ضرورت ہے وہیں نظری حیثیت سے نظری اسلحہ بازی پر بھی کماحقہ، مطلع ہونے کی

ضرورت ہے کیونکہ آج کل کی جنگ اعصابی جنگ ہے۔ خیالات پر اثر ڈال کر صلح وجنگ کا میدان ہموار کیا جاتا ہے اس لئے نوجوانوں میں سیاسی اور نظری حیثیت سے ایسا شعور پیدا کئے جانے کی ضرورت ہے۔ جس سے وہ خیالاتی حربوں سے متاثر ہونے کی بجائے ان کی بنیادوں کو سمجھ سکیں اور یہ پرکھ سکیں کہ کون سے خیالات کہاں سے آرہے ہیں اور کون سا پروپیگنڈہ کہاں سے چلا ہے۔ اس کا منشا کیا ہے اور وہ کس رخ پر مسلمانوں کو ڈالتا ہے اور اس کا دفعیہ کیا ہے۔

پس آج کی عسکریت کے لئے جہاں بقدر ضرورت استطاعت عملی فنون حرب یا بدنی استعداد بہم پہنچانے کی ضرورت ہے وہیں ان نظری فنون جنگ سے بھی باخبر ہونے کی ضرورت ہے۔ جنہیں آج کی اصطلاح میں ڈپلومیسی اور اسلام کی اصطلاح میں خدعہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی اطلاع تاریخ سیاست پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے اور اس کی تقویم اور اصلاح تاریخ شریعت پر عبور کرنے سے ہوسکتی ہے، جس کی معلومات کم از کم معلمین، مبلغین، مذکرین اور مدرسین کو ایک حد تک ہونی ضروری ہے یہ تعلیمی نوعیتوں کا اجمالی نقشہ ہے جس سے قرآنی نظریات امت میں پھیل سکتے ہیں۔ لیکن علم کے بعد عمل اخلاقی طاقت سے ہوتا ہے۔

تزکیۂ نفوس اور اصلاح عالم

اس لئے تہذیب اخلاق تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر اخلاقی کریکٹر بلند نہ ہو تو علم کی روشنی ہی کیا نفع پہنچا سکتی ہے۔ اخلاق عمل کی مخفی طاقت ہیں اگر یہ طاقت مضمحل ہو تو علم بلا عمل کیا کار آمد ہوسکتا ہے؟

اس لئے اخلاق تربیت ناگزیر ہے۔ جس کے لئے مسلمانوں کو مجاہدہ اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے اعتدال کے لئے محنت ومشاق کی حاجت ہے۔ جس کے طریقے اور تدابیر فن تصوف میں مدون ہیں اور جن کو مشائخ حقانی ہی بروئے کار لاسکتے ہیں جبکہ ان کے اپنے قلوب مزکی اور اس راہ تزکیہ پر چلے ہوئے اور پڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی تبلیغ اور اسلام کی اشاعت میں جس قدر بھی حصہ ہے وہ اخلاقی کریکٹر کا ہے۔ مسلمانوں کا صدق وعفاف، للہیت وبے نفسی، ایثار وتواضع اور معاملات کی صفائی دیکھ کر قلوب ان کی طرف خود بخود جھک جاتے تھے۔ آپ کا یہ سندھ ہندوستان میں اسلام لانے کا پہلا دروازہ ہے۔

صورت کا اثر سیرت پر

مؤرخین لکھتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وتابعین جب سندھ کے بازاروں سے گزرتے تھے تو لوگ ان کی صورتیں دیکھ دیکھ کر اسلام قبول کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "یہ چہرے جھوٹوں کے چہرے نہیں ہوسکتے"۔

اس لئے اشاعت دین الٰہی کے لئے کردار اور کریکٹر اصل چیز ہے جو بغیر تہذیب اخلاق کے ناممکن ہے۔ ادھر ممالک کا انقلاب بھی درحقیقت اخلاقی انقلاب کے تابع ہے۔ اگر ذہنیتوں میں سے غلامی نکل جائے تو باہر سے بھی دفع ہوجائے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔

"خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ اپنی حالت بدلے"۔

خانقاہیں

پس نفوس کی اصلاح عالم کی اصلاح ہے اور اس کے معنی اخلاق نفسانی کی تہذیب اور تعدیل کے ہیں جس کے لئے مجاہدہ و ریاضت درکار ہے۔ یہ کام خانقاہوں میں ہوتا تھا۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل خانقاہیں باستثناء چند عامۃً دوکانداری کے اصول پر قائم ہو گئی ہیں' رسمی گدیاں ہیں جن میں مریدوں سے تحصیل وصول کے سوا کسی تربیت کا کوئی کام جاری نہیں۔ حضرات مشائخ کے لئے اولاً تو یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفوس کو تمام مادی آلائشوں سے صاف کر کے اپنے متوسلین کو حقیقی تہذیب سے آراستہ کریں۔ لیکن اگر رسمی مشائخ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر میں عوام کو مشورہ دوں گا کہ وہ ان کے نذرانے بدستور قائم رکھ کر کہ بہرحال ان کے بزرگوں کی نسبتوں کا بھی حق ہے کہ ان کی اولاد کی خدمت کی جائے' ایسے مشائخ حقانی کی طرف رجوع کریں جو اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کا کام کرتے ہوں۔ یعنی نذریں تو انہیں ہی دیں مگر مسائل طریقت حقیقی مشائخ سے دریافت کر کے اپنے باطن کی اصلاح کریں۔ بیعت وارشاد کے سلسلہ کو قائم کریں۔ ذکر اللہ سے غافل نہ رہیں۔ توبہ واستغفار کو حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرح اپنا شعار بنائیں۔ اپنے اعمال کا تفقد اور نفوس کا محاسبہ کریں۔

اغراض نفسانی سے نفوس کو صاف کریں تاکہ قوم کی گاڑی آگے چلے' ورنہ اس وقت علم کی کثرت کے باوجود اخلاقی کمزوریوں' جاہ وجلال کی ہوس' نفاق تملق اور چاپلوسیوں کی خوئے بدنے پوری قوم کو گندہ بنا رکھا ہے۔

اس لئے تہذیب نفس کو کوئی رسمی بات خیال نہ کیا جائے بلکہ حقیقی پیمانہ پر انجام دیا جائے کہ یہ بھی تعلیم کتاب کا شعبہ اور ایک اہم اسلامی فریضہ ہے۔ لیکن ابتدائی اور ہمہ گیر کام امر بالمعروف سے ہوتا ہے۔

یعنی ہر ایک مسلمان اپنے اور دوسرے مسلمان کے ایمان کا تفقد اور تحفظ کرے جزوی خرابیوں پر روک ٹوک کرتا رہے۔ خلاف شریعت امور دیکھ کر صبر نہ کرے بلکہ پیار و محبت سے نصیحت کرے اور مخاطب کے دل کی راہ درست کرنے کی ہمدردانہ سعی سے دریغ نہ کرے۔ ایسی روک ٹوک اور دیکھ بھال میرے نزدیک ایک مسلمان سیاسی کی سیاست ہی کا جزء اصلاح اخلاق ہے ورنہ اس کی سیاست بھی اپنے حقیقی نتائج تک نہیں پہنچا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن فلسفی ریفارمروں نے سیاست کی بحثیں کیں اور وہ عملاً سیاست میں پڑے۔ انہوں نے بھی اپنے سیاسی پروگراموں کا ابتدائی باب عقائد واخلاق کی اصلاح کو قرار دیا ہے۔ یہ جداگانہ بات ہے کہ انہوں نے طریق اصلاح میں الہام کے بجائے محض اپنی عقل کو کافی سمجھا ہے۔ پس سیاسی مساعی میں تہذیب نفس سے چارہ کار انہوں نے بھی نہیں دیکھا۔

خلاصۂ نقاط بحث اور قرآن حکیم

بہرحال یہ ضروری شعبے اشاعت دین الٰہی کے عنوان کے نیچے آجاتے ہیں جن کی بنیاد تعلیم کتاب ہے۔ قرآن نے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ سے تعلیم کی ضرورت' بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ سے تبلیغ کی ضرورت' وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ سے تذکیر کی ضرورت اور وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ سے تعلیم عسکریت کی ضرورت اور وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَكُمْ اور يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ

سے تعلیم صنعت و حرفت کی ضرورت جو آج کی سائنس کا عملی موضوع ہے۔ وَيُزَكِّيهِمْ سے تصفیہ عباطن کی ضرورت وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ سے خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کے دفع کرنے کی ضرورت اور حدیث الدین النصح لکل مسلم سے جزئی روک ٹوک اور نصیحت کی ضرورت کھلے الفاظ میں ظاہر فرمادی ہے جس پر صرف عمل ہی کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ پروگرام بنا بنایا موجود ہے۔ ہاں پروگرام کے لئے سب سے پہلی چیز نصب العین ہے تاکہ قلوب کے لئے کوئی نظری مرکز پیدا ہو جائے اور وہ یکسو ہو کر عمل دنیا میں آسکیں۔

اقامت حکومت الٰہی

سو ظاہر ہے کہ ہر ایک نصب العین میں رائیں دو ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس نصب العین میں ایک کے سوا دوسری رائے کی گنجائش نہیں کہ ہم سب کا حاکم و بادشاہ خدا ہے۔ اس نظریہ سے اختلاف وہی کر سکتا ہے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کا منکر ہو۔ اس لئے قومی اتحاد کے پروگرام کا جامع نقطہ اس کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے پہلے اللہ کی ذات واحد کو بطور مرکز قلوب پیش کیا تاکہ تمام قلوب سب سے کٹ کر اس ایک پر جمع ہو جائیں کہ توحید سب سے بڑا مرکز اتحاد ہے۔ آج کے اختلافات درحقیقت توحید اعتقادی یا توحید عملی ہی کی کمزوری سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اگر ہر عمل میں انسان سب سے بیگانہ بن کر صاف ایک خدا کے لئے اپنا مرنا اور جینا متعین کرلے تو وہ سب سے متحد ہو جائے گا اور سب اس سے متحد بن جائیں گے۔

ورنہ جس حد تک شرک آتا جائے گا اسی حد تک انسانوں میں پراگندگی بڑھتی رہے گی۔ کیونکہ مرکز قلوب واحد نہ رہے گا۔ اس لئے اس کی واحد ذات' اسی کے واحد کلام' اسی کے وحد کعبہ' اسی کے واحد رسول کی طرف تمام امت کو علمی' اعتقادی اور عملی دعوت دی گئی ہے تاکہ دلوں پر اور پھر دلوں سے باہر پورے عالم بشریت پر ایک اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جائے۔ پس پورے دل و دماغ سے ذات الٰہی پر جماؤ حکومت الٰہی کا پہلا قدم ہوگا کہ جس کے بغیر اقامت حکومت الٰہی کا دعویٰ محض زبانی دعویٰ ہوگا جس کی کوئی اصلیت نہ ہوگی۔

پھر قانون الٰہی "کتاب اللہ" کی پیروی اور اخلاق الٰہی سے متخلق ہو کر اس قانون پر چلنا اور اسے چلانا حکومت الٰہی کا دوسرا قدم ہے کیونکہ جب تک بادشاہ کے اقتدار اور قانون کا علم نہ ہو اس کی حکومت پوری طرح دلوں پر مسلط نہیں ہو سکتی اور نہ ہر شعبۂ زندگی میں وہ مشعل راہ ہی بنایا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ پھر اپنی خصومات اور منازعات میں اسی کو حکم بنانا حکومت الٰہی کا تیسرا قدم ہے۔ جس کی شکل یہ ہے کہ ہر محلّہ میں غیر رسمی طور پر اسلامی عدالت قائم ہو' ایک مستند عالم جو فقہ اسلامی کا ماہر ہو۔ ہمارے روزمرہ کے نزاعات میں فیصلہ کردے۔ اس تحکیم سے جب کہ ہم نے مالک الملک کو حکم بنادیا ہو' آپ اندازہ کریں کہ فیصلہ کس قدر اطمینان بخش اور کتنا سہل اور مالی مصارف اور کچہری کی بادوڑی سے کس درجہ پاک ہوگا؟ البتہ مہم مسائل جو قوت کے بغیر طے نہ ہو سکیں' گورنمنٹ سے محکمۂ قضا کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے جس کے لئے متحدہ سعی کی ضرورت ہے۔ حکومت الٰہی کا چوتھا قدم ہے۔

حکومت الٰہی اور قانون الٰہی

کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے جب کہ ہم حکومت الٰہی کے مدعی ہوں کہ ہم قانون الٰہی کو جو حکومت الٰہی کا

مظہر اتم ہے۔ نماز روزہ سے زیادہ نکاح وطلاق تک محدود نہ رکھیں بلکہ اپنے گھر بار، جائداد واملاک اور عام معاشرتی واخلاقی سلسلوں میں بھی اسی مقدس قانون کو مشعل راہ بنائیں؟ اور اس کے بالمقابل رواج کی جہالتوں میں نہ پھنسے رہیں۔ اگر حکومت الٰہی کے ادعاء کے بعد بھی ہم اپنی طرف سے بطوع ورغبت رواج پسندی اور شرعی قانون سے لاپرواہی قائم رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا نام قانون الٰہی سے بغاوت نہ رکھا جائے۔

پس ایسی صورت میں جب کہ ایک قوم خود اپنے بادشاہ کے قانون سے منحرف اور بغاوت میں ملوث ہو وہ حکومت الٰہی کے عنوان کی دعویدار کس منہ سے ہوسکتی ہے؟

حکومت الٰہی کے سلسلہ میں یہ چارا ابتدائی قدم ہیں۔ ان کے ذریعہ عمل کا نقش قدم قائم ہو کر آئندہ دوسرے قدم بھی اس سلسلہ میں اٹھائے جاسکتے ہیں جس سے شعائر اللہ کی عظمت کا دنیا میں سکہ رواں ہو۔ مگر

ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مکانے دارد

حفاظت نظام زندگی

"آزادی"

اس نصب العین (حکومت الٰہی) کے ماتحت اب سوال زندگی گزارنے کا ہے، سو اس کے لئے سب سے مقدم اور سب سے آخری چیز جذبۂ آزادی ہے، جو دلوں کے رگ وپے میں خون کی طرح دوڑ رہا ہو۔ کیونکہ غلامی کے جذبہ یا اس پر قناعت کے ساتھ کوئی نصب العین اور کوئی نظریہ بھی بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔ جذبۂ آزادی کے بعد زندگی کو آزاد، ضمیر کو آزاد اور عمل کو ہر رسمی ماحول کے اثرات سے آزاد کردینے والا پروگرام وہی اسوۂ حسنہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظم اور مقدس زندگی کا ایک شرعی عنوان ہے۔ یہ پاک زندگی حکومت الٰہی کا عملی نمونہ اور ایک کی غلامی کرکے سب سے آزادی حاصل کرلینے بلکہ سب پر آقا ہوجانے کا ایک مکمل نقشہ ہے۔ ساری آزادیاں اس میں پنہاں ہیں۔ آزادئ ضمیر اس کا پہلا قدم ہے کہ قلب پر غیر اللہ کا کوئی رعب اور کوئی ادنیٰ خوف باقی نہ رہے۔

> اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا لَا یَخَافُوْنَ (فِی اللّٰہِ) لَوْمَۃَ لَآئِمٍ۔ (القرآن)
>
> "یہ (انبیاء) سب ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے اور اللہ حساب لینے کیلئے کافی ہے۔ پھر سچ قول اور سچ عمل کے اظہار میں کسی کی ملامت کا خطرہ باقی نہ رہے۔ (دشمنان حق کے مقابلہ میں کوئی ادنیٰ رقت یالین محسوس نہ کریں)"۔
>
> اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ (القرآن پارہ ۲۶ ع۱۲)
>
> "کفار پر سخت اور آپس میں مہربان"۔

بہرحال صلہ رحمی، تعاون باہمی، ایثار ومروت، ہمدردی ومحبت، غریبوں کی مدد، چھوٹوں پر رحمت، بڑوں کی توقیر، علماء سے حیا، ربانیوں کی تعظیم، اطعام طعام، تحیہ وسلام، عبادت الٰہی، درحقیقت علی الخلق، پڑوسیوں کی خبرگیری، یتامیٰ ومساکین کی اعانت، بیماروں کی عیادت، جنازوں کی مشایعت، مظلوموں کی دادرسی ظالموں کی بیخ

کنی 'ادائے حقوق' دفع مظالم' سادگی و بے تکلفی' قناعت و زہد' حب آخرت' طلب حق 'انصاف و حق پرستی' امت مرحومہ کے جماعتی مفاد کی کلی حفاظت وغیرہ' وہ ابواب ہیں جو اسوہ حسنہ اور مقدس زندگی کی موٹی موٹی سرخیاں ہیں اور جن کا شیریں پھل آزادی و تنظیم ہے۔

اس اسوہ حسنہ کی خاصیت یہی ہے کہ قومی منزلی شخصی اور جماعتی انتشار رفع ہوتا ہے۔ غلامی کافور ہو جاتی ہے۔ آزادئ مذہب' آزادئ ضمیر اور آزادئ علم و عمل حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر اس اسوۂ حسنہ کے عالم جو علماء امت ہی ہو سکتے ہیں اپنی جماعتی قوت سے امت کو منظم کرنا چاہیں تو اسی اسوۂ حسنہ کو سامنے لا کر با آسانی کر سکتے ہیں کہ وہی اس حقیقی تنظیم کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اگر اس نظم زندگی کے ساتھ ابتدائی دو عنوانوں "اشاعت دین الٰہی" اور "اقامت حکومت الٰہی" کی عرض کردہ دفعات شامل کر لی جائیں تو قوم اسی طرح عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ جس پر ایک دفعہ قرون اولیٰ میں پہنچ چکی ہے۔

پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے۔ جس کا تمام تر رنگ شرعی ہے۔ مگر وقت کے تمام سیاسی مسائل میں اس سے راہ مل سکتی ہے۔ اگر اسے زیر نظر رکھا جائے۔

دفاع ملی

دفاع ملی کا شعبہ ایک مستقل شعبہ ہے جس پر اب تک کام ہوتا رہا ہے ۱۹۱۹ء جب سے کہ تحریک خلافت نے حکومت سے سیاسی زور آزمائی شروع کی' آج تک مختلف قسم کے دفاعی پروگرام بنے اور ان پر عمل درآمد ہوا' جمعیت العلماء نے کسی وقت بھی مسلمانوں کی راہنمائی سے گریز نہیں کیا۔ اس کے ربع صدی کے کارنامے ملک کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

جمعیت علماء ہند کے پچیس سال

اس دوران میں آج تک کونسی تحریک ہے جس میں جمعیت علماء کے مجاہدوں نے صحیح خدمات انجام نہیں دیں۔ آخر وہ کون تھا جس نے ۱۹۲۲ء میں خلافت تحریک کو چاٹگام سے لے کر سرحد یاغستان تک پہنچا دیا جس نے کانگریس کے جلسوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور کانگریس کو بیس سال تک صحیح راہ پر چلایا جس نے سب سے پہلے اسلامی حقوق کی صحیح آواز بلند کی جس نے شدھی کی تحریک **سنگھٹن** کے ہنگاموں' نہرو رپورٹ کی بے انصافیوں اور سارد ابل کی مداخلت فی الدین کا مقابلہ کیا؟ کیا وہ جماعت جمعیت علماء ہند ہی کی نہ تھی؟

چونکہ یہ جماعت مستقل جماعت تھی' اس کا نصب العین مستقل' اس کا نظام عمل مستقل تھا۔ اس لئے کانگریس اور حکومت دونوں کے افعال اور نظریوں کو اپنے اصول پر پرکھ کر اس نے رائے قائم کی۔ کسی ادارہ سے اس کی موافقت یا مخالفت کسی اتباع یا پیروی کے معیار سے کبھی نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اصول کے معیار سے ہوئی ہے۔ وہ جس طرح کانگریس کی ہر ایسی اصولی چیز ماننے کو تیار ہو سکتی ہے۔ جو اصول شرعیہ پر پوری اترتی ہے۔ ایسے ہی لیگ اور دوسری جماعتوں کی بھی ہر وہ بات ماننے کے لئے آمادہ ہے جو اس کے سمجھے ہوئے شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو۔ اس پرواز پر اس نے دفاع ملی کا ۲۵ برس کامیاب کام کیا اور اب بھی بقدر استطاعت کر رہی ہے۔ جب کہ اس کے کارناموں کو دفن کرنے کی فکریں کی جا رہی ہیں۔

بہر حال جمعیت العلماء کوئی آج کی جمعیت نہیں ہے۔ اس کی تشکیلات بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن اس کا قوام

آج کے سارے سیاسی اداروں سے قدیم ہے۔

جمعیت علما ہند تاریخ کے آئینے میں

جمعیت علما ہند دہلی کے لال قلعہ کے ویران شدہ کھنڈروں میں ایک سرسبز، شاداب درخت کی مانند ہے جس کے پھولوں اور پھلوں سے ہمارے مقاصد زندگی اور عزائم کو بعون اللہ حیات تازہ ملتی ہے۔ اس جماعت کے سلسلے کے ابتدائی بزرگوں نے جن کا دور رسمی تشکیلات سے پہلے کا ہے۔ بالاکوٹ (سرحد) کے میدانوں میں اسلام کی مخالف طاقتوں کا مقابلہ میدان جہاد میں کیا اور شہادت کی رسم کہن کو زندہ کرکے زندہ جاوید ہونے کی سند حاصل کی، اسی جماعت کے اکابر تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آتشیں کے موقعہ پر اپنے سوز سے آپ پگھل گئے۔ خانماں برباد ہوئے اور اس وقت جیل کی مشقتوں سے دوچار ہوئے۔ جب ہندوستان کی سیاسی دنیا جیل کے نام سے آشنا نہ تھی۔ یہ ماضی قریب کی تاریخ حال کے لئے میراث ہے۔ کیونکہ ماضی وحال ہمارے ایک ہی سلسلہ کی تاریخ کے دو پہلو ہیں۔ ہم ایک کی وجہ سے دوسرے کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔

بزرگان دیوبند

حال کے ہنگاموں اور اپنوں بیگانوں کی صبر آزما مخالفتوں کے ہجوم میں ہم بالاکوٹ کے اس سرحدی مقام کو فراموش نہیں کرسکتے جہاں خاندان ولی اللہی کی چشم وچراغ چند جانباز ہستیاں رداء شہادت اوڑھے ہوئے آرام فرما ہیں۔ نہ ہمیں وہ ویران بستیاں فراموش ہوسکتی ہیں جہاں حجت الاسلام قاسم العلوم والخیرات بانیٔ دارالعلوم دیوبند ۱۸۵۷ء کے پرآشوب دور میں وارنٹ نکلنے پر گرم نگاہوں سے روپوش رہے۔ نہ مظفر نگر کی جیل بھلائی جاسکتی ہے جہاں شمس العلوم حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قید وبند سے دوچار رہے۔ نہ شیخ الہند مولانا محمد الحسن صاحب قدس سرہ کی مجاہد جلیل شخصیت فراموش کی جاسکتی ہے جس نے جہاد حریت کے سلسلے میں پانچ برس مالٹا میں اسیری کی زندگی گزار دی اور ہندوستان میں جدید مذہبی سیاست کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو آج جمعیت علماء ہند کی صورت میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ جس کی روح نے بہت سی مردہ اور افسردہ جماعتوں کو جگایا۔

۱۹۱۴ء کے مجاہدین

۱۹۱۴ء کے مجاہدین علم وعمل میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ علیہ کے امین اسرار حضرت مولانا حبیب اللہ خود آپ کے سندھ کی مقدس یادگاریں ہیں۔ جن کا چہرہ زمانہ کے دردناک مصائب پر گواہ ہے۔ آپ حضرات کا ناز پروردہ دل کوٹھیوں میں بیٹھ کر ان مصائب کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ جو ممدوح نے سرحد افغانستان سے لے کر متمدن یورپ اور وہاں سے چل کر حرم کعبہ کے سنگریزوں پر سر رکھ کر اٹھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں میرے برادر معظم اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے محبوب ترین شاگرد مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری آج کابل میں اپنی جلاوطنی کی دردناک راتیں صبح امید کے طلوع ہونے کی امید میں گزار رہے ہیں۔ انہوں نے حجاز، افغانستان اور بخارا کا انقلاب دیکھا۔ روس کا انقلاب ماسکو پہنچ کر دیکھا اور جب ترکی میں انقلاب ہو رہا تھا تو وہ انگورہ کے خزاں رسیدہ درختوں کے نیچے تھے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی فوج میں صرف اس ایک سپاہی کا ایک لمحہ اس ساری سیاست کا جواب ہے۔ جس کی رو سے کتنے ہی سیاسی رہنما

علماء کے وجود کو ختم کر دینے کا چیلنج دیتے ہیں۔

حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ الہند کی اس سیاسی اولاد اور جمعیت علماء ہند کے ذمہ دار رہنماؤں کے سلسلہ میں آپ کی نگاہیں حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی کو بھی یہاں تلاش کر رہی ہیں اور آپ کے قلوب ان کی ذات سے لگے ہوئے ہیں۔ اور وہ کتنی ہی مختلف جیلیں کاٹنے کے بعد آج نینی تال جیل بیٹھے ہوئے اللہ کی تقدیر مبرم کا انتظار کر رہے ہیں۔ حضرت محترم اس وقت جمعیت العلماء کے صدر اور مسلمانوں میں قافلہ آزادی کے سالار کارواں ہیں۔

حضرت ممدوح اس وقت حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ علیہ بانی دارلعلوم کے پیدا کردہ جذبات کے امین، حضرت مولانا حاجی امداد اللہ قدس سرہ مہاجر مکی کے مجاز، حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے خلیفہ اور حضرت شیخ الہند کے شہرہ آفاق شاگرد و جانشین ہیں۔ ان کے عزم اور قربانیوں سے کوئی ناواقف نہیں۔ ممدوح کے سیاسی خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ان کے جذبۂ اخلاص وایثار سے ان کے مخالف بھی انکار نہیں کر سکتے۔

حضرت مفتی اعظم رحمۃ اللہ علیہ

اسی سلسلہ میں حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم ہمارے سر پر سایۂ فگن ہیں۔ حضرت ممدوح سیاست کی تاریکیوں میں علم وتدبر کا روشن مینار ہیں جن کو دیکھ کر ہماری ہمتیں بلند ہو جاتی ہیں اور ہم ان کی رہنمائی سے وقت کی مشکلات میں راہ پالیتے ہیں۔ حضرت محترم کی ذات جمعیت علماء ہند کی چوتھائی صدی کی تاریخ کا مرقعہ ہے اور زمانہ ان کی خدمات پر غلاف نہیں ڈال سکتا۔ بہرحال جمعیت علماء کی رسمی اور غیر رسمی تاریخ ایک صدی اوپر سے شروع ہوتی ہے جس کی ابتداء حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں اور انتہاء ذمہ داران وقت علماء کی مقدس جماعت ہے۔ بہرحال جمعیت علماء اور اس کے مقدس افراد کی جماعت اسی ساعت سے آزادی کے لئے جہاد حریت کرتی آرہی ہے۔ جب سے مسلمانوں کی آزادی غلامی کی صورت میں تبدیل ہوئی گو اس کی خدمات کے رنگ ہر زمانہ کے مناسب جدا جدا رہے۔ آج کے دور میں اس کی وہی جدوجہد عسکری رنگ کے بجائے علمی اور تحریکاتی رنگ میں ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے میرے نزدیک دفاع کلی کے سلسلہ کی تفصیلات پیش کرنے سے یہ زیادہ بہتر تھا کہ میں جمعیت العلماء کا یہ پچیس سالہ طرز عمل پیش کردوں اور اپنی اس تحریر میں تعمیری پروگرام ہی پر زیادہ زور دوں اور وہ بھی جمعیت کے سامنے پیش کرنے کے لئے تاکہ ذمہ داران جمعیت اس پر غور و فکر کر کے مناسب اجزاء کا انتخاب کر سکیں۔ پروگرام کا یہ حصہ تعمیری ہے اور شرعی رنگ میں تمام سیاسی مسائل کے لئے اس میں راہ مل سکتی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

تعمیری اور تعلیمی پروگرام کا خلاصہ

اشاعت دین الٰہی کے سلسلہ میں تعلیم خواص، تعلیم عوام اور شہرودیہات میں اس کی ہم گیری، درس قرآن، تاریخ سلف، تعلیم سپہ گیری، تعلیم سیاست عصر، تعلیم طرق اشاعت اسلام، مسئلۂ تبلیغ، مسئلۂ تذکیرو

موعظت، تہذیب اخلاق اور تذکیۂ نفوس، مخصی تربیت، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔

اقامت حکومت الٰہی کے سلسلہ میں نصب العین کی تعیین، توحید اعتقادی و عملی، قانون الٰہی کی تنفیذ۔ فصل خصومات محکمۂ قضاء شرع، حفاظت نظام حیات کے سلسلہ میں حصول آزادی کی تڑپ کے ساتھ اتباع اسوہ حسنہ، توحید مطلب عام شعب ایمان کی عملی ترویج جس سے بد نظمی اور انتشار دفع ہوتا ہے وغیرہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالآخر اسی پروگرام پر آنا ہے وہ خود نہ آئیں گے تو زمانہ لائے گا، لیکن اسے چلانے والی طاقت صرف مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اشتراک عمل کی قوت ہو سکتی ہے اور اتحاد اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم اختراعی اور قیاسی پروگراموں کو چھوڑ کر کسی ایسے نصب العین کا دامن سنبھالیں جو اختراعات کی دنیا سے بالاتر علم و یقین کی قطعیت لئے ہوئے ہو اور ساری دنیا کے سارے ہی پروگراموں کو اپنی لپیٹ میں لے سکے۔

ظاہر ہے کہ ایسا نظریہ خدائی نظریہ ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہر انسانی نظریہ میں دوسرے انسان کی رائے کا تزاحم ممکن ہے لیکن الٰہی نصب العین کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر انسان سے اوپر کی چیز ہے اس لئے سارے انسان اس پر جمع ہو سکتے ہیں کہ وہاں ایجاد و اختراع کا کوئی دخل بھی نہیں۔ اسلام نے اپنا نصب العین اسی خدائی قانون اور الٰہی پروگرام کو رکھا ہے۔ اس نے تمام بنیادی ازم مثلاً نیشنلزم، فاشزم، کیمونزم وغیرہ رد کر کے ایک اور صرف ایک خدائی ازم یا اسلام ازم رکھا ہے۔ جس کے پلیٹ فارم پر دنیا کی ساری قومیں جمع ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اسلام نے نہ قومیت کا اعلان کیا کہ قومیں، قومیں سب برابر تھیں اس نام پر ہر قوم جمع نہیں ہو سکتی تھی۔ نہ بادشاہت کا اعلان کیا کہ انسان، انسان سب برابر تھے۔ پھر ان میں حاکم و محکوم کی تفریق کیسی؟ اور کی جاتی تو وہ نوع و رعیت سے چل کیسی سکتی تھی بلکہ اس نے لامحدود بادشاہت یعنی حکومت الٰہی کا اعلان کردیا، جس کا قانون اسلام اور عرض کردہ پروگرام ہے۔ پس اس سے بہتر ذریعۂ اتحاد مسلمانوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے؟

اس لئے اگر مسلمان خلوص دل سے متحد ہونا چاہتے ہیں تو اس عنوان کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی قوتوں کو منظم کر کے کچھ کر کے دکھلائیں اور مسلمانوں پر رحم کھائیں اور اختراعی اور جدل آفریں نصب العین سامنے لالا کران کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کردیں۔ لیکن پروگرام کتنا ہی معقول اور ہمہ گیر کیوں نہ ہو اس کے چلانے کے لئے بہرحال جماعت اور اس ساتھ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ ہم اس کو کس پلیٹ فارم کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں اگر نظر پڑ سکتی ہے تو جمعیت العلماء پر۔

کانگریس اور لیگ

کانگریس اور لیگ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ کانگریس کو انگریزوں نے قائم کیا، اعتدال پسند ہندو اور مسلمانوں نے پروان چڑھایا۔ خلافتی مسمانوں اور سوراجی ہندوؤں کے اشتراک عمل سے اس کو پھل پھول لگے۔ گاندھی جی کے دماغ نے اسے مبہم اور غیر منقح آزادی کے سوانیزہ تک پہنچایا اور بالآخر پنڈت مالویہ اور سوامی شردھانند نے اسے فرقہ پرستی کے بحر ظلمات میں لے جا کر غرق کردیا۔

کانگریس کی تاسیس

کانگریس کا قیام درحقیقت ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کا کامیاب انتقام تھا، حکومت برطانیہ عظمیٰ بننا چاہتی تھی اور اسے مقصد کے لئے لال قلعہ کی شاہی کی جگہ ایک ایسی طاقت پیدا کرنی تھی جو ہندوستان کے انقلابی

رجحانات کا رخ آئینی اور دفتری تحریکات کی طرف منتقل کردے۔ نتیجہ صحیح برآمد ہوا۔ چار کروڑ انسانوں کی سفید فارم قوم (انگریز) چالیس کروڑ انسانوں (اہل ہند) پر حکمران ہو گئی اور کانگریس ۱۹۱۴ء تک آئینی شکل میں تجویزیں پاس کرتی رہی۔

کانگریس ۱۹۱۶ء میں

۱۹۱۶ء میں کانگریس کی رگوں میں نوجوان خون داخل ہوا۔ ۱۹۲۰ء کے مسلمانوں نے اسے زندگی کا نصب العین دیا اور آزادی کا پُرجوش ولولہ عطا کیا۔ مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ کی زمین دوز سیاست کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اگر کانگریس کو برطانیہ کی بیٹی مان لیا جائے تو ۱۹۰۶ء کی لیگ کو کانگریس کی بیٹی اور برطانیہ کی نواسی کہدیا جانا بے جانہ ہوگا۔ مسلم لیگ ہندوستان کی سیاسی ترازو کا دوسراپلہ تھا اور یہ اس کے موجد کا کمال تھا کہ اس کے دونوں پلے نصف صدی گزارنے اور سوبار ــــ پاسنگ کرنے کے بعد بھی کبھی برابر نہ ہوئے۔

کانگریس نے ۱۹۲۰ء کے بعد سے آزادی کے لئے جو کچھ جدوجہد کی ہیں' اس کی سیاسی قدروقیمت کا اعتراف کرتا ہوں اور لیگ نے اپنے جدید دور میں مسلمانوں کے حقوق طلبی اور تنظیم کے سلسلے میں جو نام پیدا کیا' مجھے اس سے بھی انکار نہیں لیکن مجھے برملا کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں تاریخی جماعتوں کی محنتوں کا حاصل یہ ہے کہ مسٹر چرچل اور ایمری اس کا پھل کھارہے ہیں اور ہندوستان والے اور پاکستان والے دونوں چھلکوں پر لڑرہے ہیں 'مگر کماحقہ پھلوں کی فکر نہیں کرتے۔

ایک واقعاتی لطیفہ

یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستانی فوج برطانیہ کے جھنڈے کے نیچے ایک صدی سے متحد ہو کر دنیا سے لڑرہی ہے اور دوسری طرف ہندوستانی قوم آزادی کے محاذ پر آپس میں دست وگریبان ہے یعنی اس فوجی میدان میں وہی قوم اتحاد کا مظاہرہ کررہی ہے جو قومی میدان میں باہم لڑرہی ہے جس سے یہ اندازہ کرلینا کچھ مشکل نہیں کہ اس مختلف العناصر قوم میں توافق اور اتفاق بحالات موجودہ بھی ناممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر قومی مفاد کے سلسلے میں یہ ممکن ناممکن ہے تو اس کے معنی یہ ہیں' ہندوستان ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں مخالف ہوا کے جھونکوں سے خود آپس میں ٹکراتی ہیں' دوسروں کے لئے اپنا پھل جھاڑتی ہیں اور خود پھل سے خالی رہ جاتی ہیں۔ یا ہندوستانی سیاست ایک ایسا جھولا ہے جس میں ایک طرف ہندو ہیں اور دوسری طرف مسلمان اور یہ جھولا برطانوی مفاد کے لئے ہلتا رہتا ہے اور جب ہندوستان کی آزادی کا وقت آتا ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے ــــ ہندو ایک طرف نظر آتے ہیں اور مسلمان دوسری طرف۔ آج یہ جھولا پاکستان پر آکر رکا ہوا ہے۔

مسئلۂ پاکستان

ظاہر ہے کہ پاکستان ایک نظریہ ہے۔ ایک سیاسی تصور اور ایک اسکیم ہے 'الہام نہیں ہے۔ دنیا میں جب کوئی اسکیم ابھرتی ہے تو اس کو رائے عامہ کبھی منظور کرتی ہے اور کبھی مسترد کردیتی ہے۔ بلاشبہ پاکستان نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں نمایاں اہمیت حاصل کرلی ہے۔ کل تک یہ تصور تھا اور آج عقیدہ اور نصب

العین ہے اور بہت سے مسلم لیگی خلوص کے ساتھ اسے اپنے اندر لئے ہوئے ہیں جن کا خلوص بہر صورت قابل قدر ہے، لیکن میں ایک تعلیمی خادم کی حیثیت سے یہ عرض کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ کم از کم میرے لئے پاکستان ایک مبہم اور غیر منقح تصور ہے۔ جس کی بحالات موجودہ مخالفت بھی خطرناک ہے اور موافقت بھی۔

تاہم پھر بھی میں پاکستان کے مجوزین سے تو یہ عرض کروں گا کہ اس گول مول پاکستان کی شرح و تنقیح کی تکلیف گوارہ فرما کر اس کی تمام دفعات واضح کردیں اور پھر نہ صرف خود ہی اسے سمجھ لینے پر قناعت کریں بلکہ مسلمانوں کی تمام ذمہ دار جماعتوں کی ایک مشترک مجلس (مسلم کنونشن) میں اسے غور و بحث کے لئے پیش کردیں تاکہ جن مسلمانان ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے وہ بھی اسے سمجھ لیں اور مطمئن ہو کر اس کی طرف کوئی عملی قدم بڑھا سکیں۔

مخالفین پاکستان

ادھر پاکستان کے مخالفین سے یہ عرض کروں گا کہ جب کہ مسٹر ایمری اور لارڈ ہالیفکس اور مسٹر چرچل سب ہندوستان سے چشمک کر رہے ہیں اور لارڈ ارون صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں کہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان کی نااتفاقی اور اختلاف ہے، جب تک تمام ہندوستانی متحد نہ ہوجائیں ہم ہندوستان چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں اگر فی الحقیقت اتحاد کا اصول خزانہ جس سے ہم آزادی کی متاع گرانمایہ حاصل کرسکیں۔ اس پاکستان کے ماننے ہی سے مل سکتا ہے تو انہیں بلا کسی کھٹکے اور تردد کے اس عنوان کو قبول کرلینا چاہئے۔ فی الحقیقت اس نظریہ میں پاؤں چلنے کی کوئی صلاحیت ہے تو یہ چل جائے گا اور اسے چلتا ہوا دیکھ کر ماننے والوں کو بھی کسی پشیمانی سے دوچار ہونا نہ پڑے گا۔

اور اگر یہ لفظ ہی لفظ ہے جس کے نیچے معنی کا کوئی ذخیرہ نہیں، اس لئے اس میں آگے بڑھنے کی کوئی سکت ہی نہ ہوگی تو وہ خود ہی رہ جائے گا۔ محض آپ کے مان لینے سے اس کی کوئی ہستی قائم نہیں ہوجائے گی۔ جب تک کہ خود اس کی اپنی بنیادیں استوار نہ ہوں۔

بہر حال یا اس کی توضیح و تشریح سامنے آئے تاکہ اسے اجتماعی بصیرت کی کسوٹی پر جانچا جاسکے اور یا اس کے ابہام و اجمال کے باوجود اس کی کسی کھلنے والی معنویت پر بھروسہ کرکے اس اختلاف کی خلیج کو پاٹ دیا جائے تاکہ منزل مقصود سامنے آئے اور اس کی حقیقت کو خود کھولنے کے بجائے اسی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ آپ کھل کر یا دنیا کے سر آنکھوں پر آجائے یا اس کے قدموں سے پامال ہوجائے۔ محض اس مبہم لفظ پر ایک دیوار بنا کر آگے بڑھنے کا راستہ بند کردیا جانا خواہ منوانے کی ضد کے ساتھ یا نہ ماننے کی ضد کے ساتھ سوائے منزل کھوئی کرنے کے اور کس عنوان سے تعبیر کیا جائے؟ البتہ یہ میں پھر عرض کروں گا کہ ان دونوں صورتوں میں ذمہ داری بہر صورت مجوزین پاکستان ہی پر عائد ہوگی۔ کیونکہ اگر پاکستان کو اس ابہام کے ساتھ محض ان کی خاطر یا بوجہ الاتحاد قبول کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ مستقبل کے نفع و ضرر کے وہ ہی ذمہ دار ہوسکتے ہیں جو اسے کھولنا نہیں چاہتے۔ اور اگر اسے اس ابہام کی وجہ سے رد کردیا جائے تو اس تردید کے معقول ہونے کی بناء پر پھر بھی ذمہ داری انہی پر ہے جو نہ اسے واضح کھلی منڈی میں کھول کر رکھنا چاہتے ہیں کہ لوگ اس کے صحت و سقم کو ہر پہلو سے الٹ پلٹ کر جانچ سکیں۔ البتہ اگر مسلمانوں کی طبقاتی رائے عامہ اسے اجتماعی حیثیت سے قبول کرلے تو پھر بلاشبہ اجتماعی حیثیت سے ذمہ داری مشترک رہتی ہے۔ جس کا الزام تنہا مجوزین پر عائد نہیں ہوسکے گا۔ ایسی

صورت میں مجوزین پاکستان اسے کھول دینے یا گول مول منوانے کے اصرار پر مزید غور و فکر کرلیں مگر آزادی وطن کے اصل مقصد کو زیر نظر رکھ کر۔

لیکن لیگ اور کانگریس اگر پاکستان پر متحد بھی ہوجائیں تو قوم کی اسلامی تعمیر اور شرعی سیاست کی تکمیل کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا اور وہ پروگرام جس کو تعمیری حیثیت سے میں نے عرض کیا ہے بدستور محتاج تکمیل رہتا ہے جس میں پاکستان کے قبول و عدم قبول سے کوئی فرق نہیں پڑتا یا بالفظ دیگر حقیقی آزادی اور صحیح معنی میں مسلم قوم کی آزادی کا رخ روشن پھر بھی پنہاں ہی رہتا ہے جس کو پاکستان کا آئینہ بھی نمایاں نہیں کرسکتا۔

جماعت اور جماعتی پلیٹ فارم

اس لئے ناگزیر طریقہ پر اس شرعی تعمیری پروگرام کی تکمیل کے لئے جماعت اور پلیٹ فارم کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل وہی جماعت کرسکتی ہے جو مسلم اقوام کی اسلامی تعمیر کی لائنوں سے ہمیشہ گزرتی رہی ہے جس نے اسوقت مکمل آزادی کو مسلمانوں کا شرعی اور مذہبی حق بتلا کر عملی راہنمائی کی جبکہ ملک کی دوسری جماعتیں محض رسمی اور سیاسی طور پر آزادی کا نام لے رہی تھیں اور جس نے ہندوستان کے مسلم عوام کو شرعی طور پر اس لئے آمادہ کیا کہ آزادیٔ ملک کی نعمت اگر آج عسکری جہاد سے حاصل نہیں کی جاسکتی ہے تو سیاسی جہاد سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جماعت بجز جمعیت العلماء کے اور کون ہے جو ان مقاصد کی شرعی تکمیل کی اہل ہو؟ اس لئے بھی کہ تجربہ اور عمل پیہم اس کے ساتھ ہے اور اس لئے بھی کہ مسلمانوں کا ہر ایک پروگرام کتاب وسنت کے سوا اور کسی مأخذ سے مأخوذ نہیں ہوسکتا اور کتاب وسنت کے صحیح علم کے لئے اسی جماعت کو منجانب اللہ موفق کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اپنی اس بضاعت مزجاۃ کو اسی مقدس جماعت کے سامنے مستفیدانہ طریق پر پیش کرتا ہوں کہ وہ اس کے کھرے اور کھوٹے کو جانچ کر مناسب سمجھے تو ان عرض کردہ اصول اصلاح اور اصلاح پروگرام پر مسلمانوں کی تعمیری خدمت شروع کردے کہ صحیح معنی میں وہی مسلمانوں کی دینی اور سیاسی قیادت کرسکتی ہے۔ اس نے اب تک جس طرح دفاع ملی کی زریں خدمات انجام دی ہیں جنہیں تاریخ کے صفحات سے کبھی محو نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اب بلحاظ وقت ومصالح وہ تعمیری کاموں کا بھی سلسلہ چھیڑ کر اپنے قدیم قائدانہ جذبات کو عمل میں لائے۔

جمعیت علماء ہند کی قدر و قیمت

ضرورت ہے کہ اولاً علماء حق کی تنظیم خالص کتاب وسنت کے اصول پر ہو اور پھر اسی تنظیم کے ماتحت اصول مذکورہ پر عوام کی تنظیم کی جائے۔ بلاشبہ ان تنظیمات کے سلسلہ میں موانع دواعی سے زیادہ ہیں۔ لیکن جبکہ اس پر حوصلہ جماعت نے ہمیشہ موانع ہی کے ہجوم میں کام کیا ہے اور بالآخر اس کے مخلص افراد کی للہیت و بے نفسی موانع شکن ثابت ہوئی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج کے موانع کو سامنے رکھ کر ہم اس مقدس قوم کی پچھلی تاریخ بھول جائیں یہ پیغام میں اس مقدس صوبہ میں دے رہا ہوں جو ہندوستان میں اسلام کا سب سے پہلا گہوارہ ہے اور اسلام کی تام و کامل دولت ہند کو سندھ ہی کی بدولت نصیب ہوئی کیا ہندوستانی مسلمانوں کے اسلام کی سیاسی تجدید بھی اسی صوبہ سے شروع ہو اور یہیں سے اسلام کا تعمیری پروگرام پھلتا پھولتا نظر آئے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ آخر میں مکرر مخلصانہ شکریہ عرض کرتا ہوں کہ جمعیت علماء صوبہ سندھ کے مقدس ارباب حل و عقد نے مجھ ناچیز کو اس کا موقعہ دیا کہ میں اپنے طالب علمانہ خیالات کو مستفیدانہ انداز

سے ان کے سامنے رکھ سکوں۔

ورنہ کہاں میں اور کہاں مداوائے امت کا علمی میدان۔ یہ محض ان کی کرم فرمائی تھی کہ ایک ذرہ بے مقدار ان کی وسعت ظرف سے اس اوج پر نظر آرہا ہے۔

گدا بہ تخت نشانند و بادشاہ گیرند

حق تعالیٰ اس جماعت مقدسہ کو اس کے شرعی مقاصد میں کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اخلاص و للہیت سے ان کے اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور امر الٰہی کی مخالفت اور اس کے آثار بد سے محفوظ رکھے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَدْ يَعْلَمُ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔

محمد طیب غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۱۵ر اپریل ۱۹۴۴ء

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام

میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب وسنت سے پیش کئے جائیں۔ میرے خیال میں جو شرعی راہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام عصری سیاست کے ڈھچر پر اور اس سے اخذ کر کے نہ لیا جائے۔ یہ پرفریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے جس نے دنیا کا امن وسکون برباد کر دیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے ___ البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے۔ اس کو سمجھ کر پھر صرف شرعی سیاست سے ہمارے پروگراموں کا تعلق ہونا چاہئے۔ جس سے اس پُر مکر عصری سیاست کی ظلمت دُور ہوسکے اور قلوب پر سے اس کا استیلاء اُٹھ جائے۔

(از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی ۝ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ۝ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ۝ ھٰرُوْنَ اَخِی ۝ اُشْدُدْ بِہٖٓ اَزْرِیْ ۝ وَاَشْرِکْہُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۝ کَیْ نُسَبِّحَکَ کَثِیْرًا ۝ وَّنَذْکُرَکَ کَثِیْرًا ۝ اِنَّکَ کُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ۝

قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰمُوْسٰی ۝ (ثم قال تعالٰی)

وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ ۝ اِذْھَبْ اَنْتَ وَاَخُوْکَ بِاٰیٰتِیْ وَلَا تَنِیَا فِیْ ذِکْرِیْ ۝ اِذْھَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّہٗ طَغٰی ۝ فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی ۝ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَآ اَوْ اَنْ یَّطْغٰی قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی ۝

فَاْتِیٰہُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ ۝

وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ۝ إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۔
صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۝

(ترجمہ) "اے موسیٰ تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے عرض کیا اے میرے رب میرا حوصلہ فراخ کیجئے اور میرا کام آسان فرمادیجئے اور میری زبان پر سے بستگی ہٹادیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں ___ اور میرے واسطے میرے کنبہ میں سے ایک معاون مقرر کردیجئے یعنی ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں ان کے ذریعہ سے میری قوّت مستحکم کردیجئے اور ان کو میرے کام میں شریک کردیجئے تاکہ ہم دونوں آپ کی خوب کثرت سے پاکی بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں بلاشبہ آپ ہم کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

ارشاد ہوا کہ تمہاری درخواست منظور کی گئی اے موسیٰ (پھر آگے حق تعالیٰ نے فرمایا) اور میں نے (اے موسیٰ) تم کو اپنے لئے منتخب کیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یادگاری میں سُستی مت کرنا۔

دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل چلا ہے۔ پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔

دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔ ارشاد ہوا کہ تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سُنتا ہوں اور سب دیکھتا ہوں۔

سو تم اس کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔ سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور ایسے شخص کے لئے سلامتی ہے جو راہ پر چلے۔ ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ عذاب اس شخص پر ہوگا جو جھٹلائے اور روگردانی کرے۔

میری سب سے بڑی عزّت وسعادت

بزرگانِ محترم!

آپ حضرات نے ایک سال بعد پھر مثل سابق میری عزّت افزائی فرماکر مجھے اسی جگہ لابٹھایا ہے جس جگہ گزشتہ سال مجھے بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس حوصلہ افزائی پر آپ سب بزرگوں کا شکریہ ادا کروں :

فجزاکم اللّٰہ عنّی خیرا

لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری سب سے بڑی عزت افزائی یہ ہے کہ خواہ میری ذات کو حقیر ترین سمجھا جائے جیسا کہ واقعہ میں وہ ہے لیکن اس پیام کو گوشِ ہوش سے سن کر دل کی گہرائیوں میں جگہ دی جائے

جو میں اس کرسی پر بیٹھ کر دینا چاہتا ہوں تو یہی میری سب سے بڑی عزت و سعادت ہوگی۔ گو ذات کسی نگاہ سے بھی دیکھی جائے۔

سلاطین کا پیغام عام پبلک کے کانوں تک عموماً بھنگی کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے لیکن اس کے قبول کرنے میں بھنگی کے ذاتی حقارت کبھی مانع نہیں آتی۔

میرے بزرگو!

مجھے آپ ختمی مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کا ایک ادنیٰ بھنگی تصور کریں۔ بلکہ وہاں کے بھنگی کا مرتبہ بھی یہاں کے سلاطین سے بڑھ کر ہے۔ میں کیا چیز ہوں، تاہم ایک معمولی بھنگی کی بے حیثیتی اگر پیغامِ حکومت ماننے سے مانع نہیں ہو سکتی تو میری کم حیثیتی بھی پیغامِ خدا اور رسول سننے اور ماننے سے مانع نہ ہونی چاہئے۔

میں اپنے لئے اس وقت وہی مثال دے سکتا ہوں جو ایک تبلیغ خاص کے موقع پر مولانا اسمٰعیل شہید کی ہوئی کہ وہ طوائفوں کو تبلیغ حق کرنے پہنچ گئے تو ان کے خُدّام و متوسلین نے یہ کہہ کر روکا کہ حضرت ایسے بدنام گروہ کے سامنے تبلیغ کے لئے جانا علم کی عزت کو گھٹانا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا تھا کہ :

> ”خدا کی قسم اگر اسمٰعیل کو گدھے پر سوار کر کے اس کا منہ کالا کیا جائے اور جوتیوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا جائے اور اس کے پیچھے بچے ہرلو دیتے ہوئے اسے شہر سے باہر نکال رہے ہوں اور اسمٰعیل قال اللہ و قال الرّسول کہتا ہوا جا رہا ہو تو یہی اس کی انتہائی عزت و سربلندی ہے۔ جس کے بعد اسے کسی عزت کی ضرورت نہیں“۔

تو میں اس سے زیادہ کیا کہہ سکتا کہ آپ اگر کسی درجہ میں بھی میری کوئی توقیر نہ فرماتے اور اپنے اخلاقِ کریمانہ کا کسی درجہ میں بھی ثبوت نہ دیتے مگر اس پیغام کی عظمت کرتے جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں تو بلاشبہ یہی میری ایک انتہائی عزت افزائی ہوتی کہ اس کے بعد مجھے کسی عزت کی ضرورت نہیں۔

تذکیرِ قدیم

حضرات! مجھے جمعیّت العلماء صوبہ بمبئی کے اس پلیٹ فارم سے کوئی نیا اور انوکھا پیغام دینا نہیں ہے جو اب تک نہ دیا گیا ہو کیونکہ اوّل تو پیغام قرآنی ہے اور قرآن چودہ صدی کی پُرانی کتاب ہے تو اس کا پیغام نیا کب ہو سکتا ہے؟

پھر قدامت کی یہ محدُود مدّت بھی قرآن کے کلامِ لفظی ہونے کے لحاظ سے کی ہے۔ جس کی عمر چودہ سو برس ہے۔ ورنہ کلامِ نفسی کے درجہ میں تو کلام اللہ اور اس کا پیغام اَزلی اور قدیم مطلق ہے کہ صفتِ الٰہیہ ہے جس کی قدامت کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتاپا قدم اور اَزلی محض ہے اس لئے میرے پیغام میں کوئی ادنیٰ جِدّت نہ ہوگی۔

اور پھر اس پُرانے پیغام کو بھی دینے والے بارہا دے چکے ہیں کہ اس چودہ صدی میں قرآن اور اس کے ضمن میں یہ پیغام ہر عالم و عامی کی زبان پر ہزار بار آیا ہوا ہے۔ اس لئے بلحاظ تبلیغ بھی یہ پیغام نیا نہیں۔ ہاں صرف عنوانِ بیان اور طریقِ استدلال کے لحاظ سے شاید نیا ہو اور اس لحاظ سے بھی نیا نہ ہو تو نہ سہی۔ مقصود اصلی تو تذکیر ہے اور تذکیر ہمیشہ پرانی ہی بات کی ہوتی ہے۔

اِجمالی پیغام

یہ پیغام قرآن حکیم کی مرقومہ بالا آیتوں سے چند نمبروں میں پیش کرنا چاہتا ہوں جنہیں آیات مذکورہ کے الفاظ اور سیاق و سباق سے استنباط کر کے نمبروار مرتّب کر دیا گیا ہے۔ تفصیلات سے پہلے پیغام کا اجمالی خلاصہ یہ ہے کہ ہم غلامی کے مصائب میں گرفتار ہیں۔ ہمیں مکمل آزادی کی نعمت حاصل کرنی چاہئے۔ اس لئے میری اس ساری عرضداشت کا حاصل غلامی اور آزادی کی شرعی بحث شرعی حیثیت سے غلامی اور آزادی کا مفہوم دونوں کے اثرات حصول آزادی کی ضرورت اور طریقہ حصول وغیرہ کی تفاصیل چند نمبروں میں عرض کرنا ہے۔

پیغام اور اس کی نمبروار دفعات

برطانیہ کی سَرکشی

آیات مندرجہ عنوان کا ترجمہ آپ نے سمجھ لیا اب سلسلہ وار ان آیات کے مدلولات پر غور کیجئے۔ بنی اسرائیل کو فرعون اور قبطیوں کی غلامی کرتے ہوئے جب ایک مدت گزر گئی تو رحمتِ خداوندی جوش میں آئی اور موسیٰ علیہ السلام کی ذات بابرکات کو یہ غلامی شکن حکم ملا کہ :

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔

"اے موسیٰ! فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے"۔

اس حد سے نکل جانے کی سب سے بڑی صورت یہ تھی کہ اس نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔

(۱) پس قرآن کا اس غلام سازی کو اور فرعون کے استعبادی جذبہ کو طغیان سے تعبیر کرنا اس کی واضح دلیل ہے کہ کسی قوم کا کسی قوم کو اپنا غلام بنانا خالقِ کائنات سے بغاوت اور سرکشی ہے جو موردِ قہر و عتاب ہے کیونکہ طغیان موردِ غضب ہی ہو سکتا ہے نہ کہ موردِ رحمت و شفقت' اس سے یورپ کی ان اقوام کی پوزیشن سامنے آجاتی ہے جن کے شب و روز کا ذکر و فکر اور مشغلہ ہی دنیا کی اقوام کے گلے میں یورپ کی غلامی کے پھندے ڈالتے رہنے کی اسکیمیں سوچتے رہنا اور انہیں عمل میں لاتے رہنا ہے۔ جس میں برطانیہ کو بالخصوص یدِطولیٰ حاصل ہے اسی کو قرآن نے فساد انگیزی سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے :

اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ يُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ۔

"فرعون سرزمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف قِسمیں کر رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا واقعی وہ بڑا مُفسِد تھا"۔

اسبابِ غلامی

(۲) اسی سے دوسرا مسئلہ یہ بھی واضح ہو گیا کہ عِندَ اللہ خود غلامی بھی قابلِ نفرین چیز ہے کیونکہ جب اس کے برپا کرنے والے کو طاغی اور سرکش کہا گیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اس کی برپا کردہ چیز (غلامی) کسی درجہ میں بھی

مستحسن اور پسندیدہ ہو۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی غلامی قوموں کے لئے ہر ممکن بے عزتی کی جڑ اور ہر محتمل بے وقعتی کی بنیاد ہے کیونکہ دنیا میں ایک قوم کے لئے اسباب عزت چار ہوتے ہیں۔

○ ایک اس کا اپنا اساسی علم جس سے اس کی معنویت قائم ہوتی ہے۔

○ دوسرے اس کی اقتصادی اور مالی حیثیت جس سے اس کی مادیت بنتی ہے۔

○ تیسرے اس کی عُرفی حیثیت جس سے اس کا وقار قائم ہوتا ہے۔

○ چوتھے اس کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کی نوعیت جس سے اس کے حلقۂ اثر میں وسعت اور بنیادوں میں مضبوطی آتی ہے۔

ایک مسلط قوم جب کسی ملک یا قوم کو اپنا غلام بنالیتی ہے تو غلام قوم کی عزت کے یہ چاروں سوت بند کردیتی ہے جس سے اس قوم کی معنویت، مادیت، وقعت اور نیک شہرت سب ختم ہو جاتی ہے اور پھر نتیجہ کے طور پر اس محکوم قوم میں پستی اخلاق و کردار کے ایسے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں کہ وہ مخلوق ہی کی نہیں خالق کی نگاہوں سے بھی گر جاتی ہے۔ تا آنکہ غیرت خداوندی جوش میں آئے۔ اس کا حال زبوں اور بد سے بدتر ہوتا رہتا ہے۔ اس کے اپنے قومی علم کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ جس سے نہ اسے اپنی قومی روایات یاد رہتی ہیں نہ قومی مذاق ملحوظ رہتا ہے اور نہ قومی مزاج ہی باقی رہتا ہے اور اگر اسے علم کی تلاش بھی ہوتی ہے تو فاتح قوم کا علم سیکھ لینا ہی اس کے نزدیک سب سے بڑا فخر بن جاتا ہے۔ جس کے لئے وہ مجبور کردی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فاتح قوم ہی کے علم وفن کو وہ اپنا علم سمجھ کر اس قوم کی ہمنوا بن جاتی ہے ___ اور اب اگر اس جدید علم کی نا پر اس کی کوئی رسمی عزت ہوتی ہے تو وہ درحقیقت خود اس کی قومی عزت نہیں بلکہ حکمران قوم ہی کی عزت کا ایک ظلّ ہوتی ہے۔

ساتھ ہی ساتھ اس کی مالی حیثیت کچل دینے کے لئے ایسے قوانین بنادیئے جاتے ہیں کہ روز بروز محکوم م افلاس کے گڑھے میں گرتی رہے اور اس کی سیر چشمی استغناء اور غیرت وحمیت کا خون اس گڑھے کے کناروں پر بہتا رہے تا آنکہ اس افلاس و بے مائیگی کی بے چارگیوں میں اس کا ایمان سستے داموں خرید لیا جائے رانجام کار خودداری واستغناء کا اس میں تصور بھی باقی نہیں رہتا۔ جب تک کہ وہ خود مشکلات کا مقابلہ کر کے ے باقی رکھنے کی کوشش نہ کرے۔ حیثیت عرفی اور ساکھ مٹانے کے لئے اس کے قوائے عمل کم مرتبہ امور رذیل پیشوں میں مصروف کردیئے جاتے ہیں۔ ملک کی اونچی سوسائٹی اور بلند عہدوں میں نہ خود اس کی جگہ ہتی ہے نہ اس کا اپنا علمی واخلاقی سرمایہ ہی کوئی اونچا مقام حاصل کرسکتا ہے ___ اور آخر کار اس غلامی کی اکردہ جہالتوں اور بداخلاقیوں نیز حکمران قوم کی مخفی خواہش ومساعی کی بدولت محکوم قوم کے باہمی روابط بھی اب ہو جاتے ہیں اور بیرونی تعلقات بھی مضمحل پڑجاتے ہیں اسے اپنوں سے منقطع کر کے ایسا بے دست وپا دیا جاتا ہے کہ کوئی اس کا ہمنوا باقی نہیں رہتا اور اس کی ساری زندگی حکمران قوم کے رحم وکرم پر دائر ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کے داخلی اور خارجی وسائل منقطع ہو جائیں جس کی بقا وترقی کے مادی ومعنوی باب مفقود ہونے لگیں۔ اس کے مریض جسم وروح کے گھل گھل کر قریب بہ مرگ ہو جانے میں تامل کسے ہو سکتا ہے؟

چونکہ غلامی یہ چار مہلک اسباب اپنے ساتھ لاتی ہے جس سے قوموں کے تختے الٹتے ہیں۔ اس لئے ن حکیم نے غلامی کو بدترین عذاب فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کی اس غلامی کا جو فرعون اور قبطیوں کی آقائی

سے پیدا ہوئی۔ قرآن نے ذیل کے الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے :

وَاِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔ (القرآن)

”وہ وقت یاد کرو (اے بنی اسرائیل) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی جو کہ تمہیں بدترین عذاب (غلامی) کا مزہ چکھاتے“۔

علم کی تباہی

چنانچہ فرعونی قوم نے فاتح بن کر بنی اسرائیل کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کیا جو ہر آقا قوم اپنی غلام قوم کے ساتھ اختیار کرتی ہے۔ یعنی غلامی کے عناصرِ اربعہ پورے ہو کر رہے۔ سب سے اول بنی اسرائیل کا آبائی علم ختم ہوا۔

فرعون کو کیا ضرورت تھی کہ بنی اسرائیل کی روایتی تعلیم کو رواج دیتا۔ اس کی اشاعت کے لئے مدارس جاری کرتا یا ابراہیمی اور اسرائیلی طریق زندگی کے مطابق تربیت گاہیں قائم کرتا ورنہ اس کی خدائی کو کب فروغ حاصل ہوتا؟ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہونا تھا کہ ان کے اسلاف اوّلین جب تک زندہ رہے پیغمبروں کی پند ونصائح بھی ان کے ذہنوں میں زندہ رہیں۔ جوں جوں وہ رخصت ہوتے گئے اسی حد تک وہ روایتیں بھی ختم ہوتی رہیں تاآنکہ بنی اسرائیل کے اُفق پر جہالت کی گھنگھور گھٹا چھا گئی جسے فرعون نے بڑھا چڑھا کر انتہاء کو پہنچادیا تاکہ وہ اپنی خاندانی روایات کو سرے سے بھول جائیں اور ان میں قومی خود اختیاری کا احساس پیدا نہ ہو۔

یہی تو وجہ ہے کہ غلامی سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے ایک قانونِ زندگی کے علم وعمل کی درخواست کی اور تورات لا کر دی گئی جس سے واضح ہے کہ ان کے پاس کوئی قانون اور اس کا علم باقی نہ تھا ورنہ اس درخواست کی ضرورت نہ ہوتی۔ چنانچہ یہی برس ہا برس کی جہالت اور مصری بُت پرستوں کی صحبت جو زمانہ غلامی کی یادگار تھی۔ باوجود صحبتِ موسوی کے پھر بھی جاہلانہ حرکات پر انہیں گ دبیگہ آمادہ کردیتی تھی۔ اریحاء پر گزر ہوا اور گائے کی صورت کے پیتل کے بُت بجتے ہوئے دیکھے تو جھٹ فرمائش کردی کہ :

يَا مُوْسَى اجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ

”اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایسا ہی خدا بنادیجئے جیسے (ان اریحاء والوں) کے خدا ہیں“۔

جس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان کی جہالت کا پردہ یہ کہہ کر فاش کیا کہ :

اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۔

”تم ایسی قوم ہو جو جہالت کی باتیں کرتے ہو“۔

اس پر بھی جہالت کا یہ عالم تھا کہ جب سامری نے سونے چاندی کا بچھڑا بنایا تو قوم کا ایک بڑا حصہ اسی کی پوجا پاٹ میں مصروف ہوگیا۔ نہ انہیں موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں یاد رہیں نہ ان کے توحیدی پند ونصائح کا کوئی دھیان رہا۔ ایمان باللہ کے لئے کہا گیا تو کہنے لگے کہ ہم تو اس وقت تک ایمان نہیں لاسکتے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

کلامِ الٰہی کی خبر دی گئی تو بولے کہ ہم کلامِ خداوندی کو کیسے مانیں جب تک کلام خود نہ سُن لیں ـــــ تو ریت لا کر دی گئی تو عبادت کے لئے آمادہ نہ ہوئے حتیٰ کہ پہاڑ سروں پر لا کھڑا کیا گیا کہ مانو ورنہ کُچل دیئے جاؤ گے۔ تب کہیں عمل پر آمادہ ہوئے۔

غرض برس ہا برس کی جہالت کا یہ اثر تھا جو زمانہ غلامی کی یادگار تھا کہ ان کا تصور جب کبھی جاتا تو اللہ کے بجائے غیر اللہ ہی کی طرف جاتا تھا۔ معنویت کے بجائے صورت و حسیات کی طرف اور لطیف و خبیر خدا کی جگہ محسوس و مصوّر خدا ہی کی طرف طبائع چلتی تھیں جو لاعلمی کا قدرتی نتیجہ ہے۔

حیثیتِ عُرفی کی بربادی

اُدھر جب کہ اپنا علم نہ رہا اور ہوتا تو اس کی حوصلہ افزائی نہ ہوتی جب کہ حکومت اس علم کی نہ تھی تو مالی حیثیت کیسے درست رہ سکتی تھی۔ مفلس و نادار ہوئے۔ احساس خودداری نہ رہا۔ اولاً تو مجبور ہو کر اور بعد میں خود طبیعت کی جدید اُفتاد سے ذلیل خدمات سے پیٹ پالنا شروع کیا۔ یعنی چپراسی ' خانساماں ' بہرہ ' مزدُور وغیرہ بن کر گزران کی اور اونچی سوسائٹی میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ رہی حتیٰ کہ وہ اسی کو بہت کچھ جاننے لگے۔

فرعون کی سیاست نے صورت حال یہ کر دی کہ **قبطیوں** کے لئے تمام اونچے عہدے تھے بڑی بڑی تنخواہیں تھیں۔ زمینداریاں تھیں اور **سبطیوں** کے لئے یہ ذلیل خدمات تھیں۔ وہ مثل اچھوت کے تھے جیسا کہ آیت گزشتہ میں یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ کا یہی مفہوم سامنے آچکا ہے۔ ہاں **سبطیوں** میں سے اگر کوئی ترقی پا سکتا تھا تو نہ اپنے خاندانی علم و روایات کے لحاظ سے بلکہ وہی فرعونی حکومت کے قانون کے علم سے۔ چنانچہ قارون بنی اسرائیل میں سے تھا اور ایک روایت کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کے بنی اعمام میں سے تھا۔ فرعون کا پیش کار بنا۔ اس کا علم کوئی پیغمبری علم نہ تھا۔ ورنہ اس علم سے اسے یہ عہدہ فرعونی حکومت میں کیسے مل سکتا تھا بلکہ وہ علم وہی غیر سماوی علم تھا جو فرعونی ماحول کا نتیجہ تھا۔ قرآن نے اسی علم کی طرف قارون کے قول میں اشارہ فرمایا جب کہ اس نے کہا تھا :

اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔

" یہ مال و دولت مجھے میرے علم و ہنر کی بدولت دیا گیا ہے جو خود میرا اپنا ہے "۔

جو ظاہر ہے کہ فرعون کے عہد کے رائج شدہ رسمی علم کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا تھا ورنہ یہ عزت افزائی ممکن نہ تھی بلا شبہ اس کے لئے مال اور خزائن کے دروازے کھل گئے اور اس نے بے شمار مال سمیٹا جس کی قرآن نے شہادت دی ہے اس سے واضح ہے کہ مسلّط طاقت چونکہ اپنا تمدن اپنا کلچر اور اپنا علمی سرمایہ پھیلاتی ہے' اس لئے مفتوح اقوام کے علوم کی حوصلہ افزائی کے دروازے بند کر کے اعزاز و تکریم سب اپنے ہی رائج کردہ علم کے لئے مختص کر دیتی ہے تاکہ اس کا کلمہ گھر گھر میں داخل ہو جائے اور محکوم قوم کی حیثیتِ عرفی ' حیثیت اقتصادی سب اسی نئے علم کے تابع ہو جائے اور محکوم قوم اس علم سے عزت بھی پائے تو اپنی نہیں بلکہ فاتح کی عزت کا سایہ حاصل کرے۔

اِقتصادی تباہی

اور اسی غلامی کی بدولت بنی اسرائیل کی عام اقتصادی حالت بھی تباہ ہوئی۔ چنانچہ بنی اسرائیل جب مصر سے بھاگ کر نکلے تو اپنے قبطی محلہ داروں سے ہی ان کا زر و زیور لے کر باہر جانے کی ان میں ہمت ہوئی جو بنام

قرض وعاریۃً لیا گیا ورنہ اگر خود اپنا مال و متاع کافی ہوتا تو انہیں اسے ہی منگوانے سے فرصت نہ ملتی، اگر ان کی اپنی اقتصادی حالت اعلیٰ ہوتی تو کیا وہ اسی طرح مفلس وقلاش ہوتے جس کا انہوں نے مصر سے ہجرت کرتے ہوئے ثبوت دیا۔

خارجی تعلّقات سے محرومی

پھر بیرونی تعلقات بھی بنی اسرائیل کے منقطع تھے حتیٰ کے خود ان کا اصلی وطن اور ابراہیم علیہ السلام کا مدفن (شام اور بیتُ المقدس) تک ان کے لئے اجنبی ہو گیا تھا اگر وہ خود اپنے وطن جاسکتے اور وہاں کا رابطہ قائم رہتا تو موسیٰ علیہ السلام کو اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کے فرمان پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی پس نہ وہ جاسکتے تھے نہ عزت سے رہ سکتے تھے اور اسی لئے بعدِ نجات فتح بیتِ المقدس کے لئے انہیں مستقلاً ارض مقدس پہنچنے پر آمادہ کیا گیا اور کہا گیا :

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ۔

"اے قوم! ارضِ مقدس میں داخل ہو جسے اللہ نے تمہارے حصہ میں لگایا ہے"۔

بہرحال فرعون کی حکومت نے بنی اسرائیل کو غلام بنا کر ان کی علمی حیثیت اور تعلیمی منصب کو برباد کیا جس سے ان میں قومی روایات باقی نہ رہیں۔ ان کی منصبی حیثیت باطل کی جس سے اس میں احساسِ خُودداری باقی نہ رہا۔ ان کی اقتصادی حالت برباد کی جس سے ان میں استغناء نہ رہا جو اخلاقِ فاضلہ کی اساس ہے۔ ان کے تعلقات ساری دنیا سے منقطع کئے رکھے حتیٰ کہ ان کے وطنِ اصلی سے بھی انہیں منقطع کر دیا جس سے ان میں غُربت اور بے کسی قائم ہو گئی۔

بَرطانیہ کا طرزِ عمل

اگر حقیقتاً یہ چار چیزیں غلامی کے عناصرِ اربعہ ہیں اور ضرور ہیں کہ قرآن حکیم نے ان کی طرف اشارے دیئے ہیں تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا ہندوستان کے مسلمان غلام نہیں ہیں؟ اور کیا ان پر ایک اجنبی شہنشاہی مسلط نہیں؟ ضرور ہے اور جب ایسا ہے تو کیا فی الحقیقت مسلمان بلکہ تمام ہندوستانی باشندوں کے ہاتھ پیروں میں غلامی کے انہی ارکانِ اربعہ کی چار میخیں ٹھکی ہوئی نہیں ہیں؟ ضرور ہیں اور بلاشبہ خصوصیت سے مسلمانوں کو ان چار مقاصد کے لحاظ سے اس وجہ سے زیادہ کچلنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حکومت ان کے ہاتھوں سے چھینی گئی تھی۔

پس سب سے پہلے مسلمانوں کی روایتی تعلیم برباد کرنے کی کوشش کی گئی؟ کہا گیا کہ جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے ان کا مذہبی جُنون کم نہیں ہو سکتا، جب تک اسلامی روایات ان کے ذہنوں میں زندہ ہیں یہ احساسِ خودداری سے بیگانہ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ ابتدائے عہد حکومت میں تو مسلّط حکومت نے مسلمانوں ہی کا طرزِ تعلیم جاری رکھا۔ لیکن رفتہ رفتہ جدید طریق تعلیم رائج کر کے قدیم تعلیم اور طرزِ تعلیم کو فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔

مسلمانوں کا نظامِ تعلیم برباد کرنے کی برطانوی سازش

اس سلسلہ میں خود انگریزوں کی شہادت زیادہ وقیع ہو سکتی ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک

کیا ہے اور چہار گانہ شعبہ ہائے زندگی میں انہیں کس درجہ تک کچلا ہے۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر آئی۔ سی۔ ایس بنگال نے ۱۸۷۱ء میں کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" لکھ کر اس سلسلہ کے بہت سے حقائق سرکاری کاغذات سے واشگاف کردی ہیں۔ موصوف مسلمانوں کی تعلیمی سلسلہ کی بابت ایک جگہ لکھتا ہے :

"ہم اپنے دورِ حکومت کے پچھلے ۷۵ سالوں میں انتظامِ ملک کی خاطر اسی طریقہ تعلیم (مسلمانوں کے طرزِ تعلیم) سے متواتر فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران میں ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کردیا تھا۔ پھر جونہی ایک نسل اس نئے طریقہ کے ماتحت پیدا ہوگئی۔ ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیرباد کہہ دیا جس سے مسلمان ان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری (سیاسی) زندگی کا دروازہ بند ہوگیا"۔

(ہمارے ہندوستان مسلمانی صفحہ ۲۴)

پھر اسی ہنٹر کی کتاب سے واضح ہوتا ہے کہ :

مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا دارومدار معافیات اور اوقاف پر تھا جو اسی مقصد تعلیم کے لئے مسلمان امراء اور حکام وقف کرجاتے تھے۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ :

"صوبہ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال (مسٹر جیمز گرانٹ) کا بیان ہے کہ اس وقت تخمیناً صوبہ کی آمدنی کا ایک چوتھائی حصہ (جو ان معافیات کے سلسلہ میں تھا) حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا ۱۷۷۲ء میں وارن ہیسٹنگز کے ان علاقوں کی واپسی کی مہم شروع کی مگر ناکام رہی۔ ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے پھر اس معاملہ کو اٹھایا مگر اس وقت کی طاقتور حکومت بھی اس پر قابو نہ پاسکی۔ بیالیس برس بعد ۱۸۱۵ء میں حکومت نے پھر اس معاملہ کو زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرأت نہ ہوئی۔ آخر کار ۱۸۳۸ء میں ۸ لاکھ پونڈ کے خرچ مقدمات چلا کر ان معافیات اور اوقاف تعلیم پر حکومت نے قبضہ پالیا اور صرف ان معافیات سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ گویا تقریباً ۴۵ لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا۔"

یہ آمدنی جب مسلمانوں کے قدیم صیغہ تعلیمات کے ہاتھ سے نکل گئی اور تعلیم قدیم کا اسٹاف اس سے محروم ہوگیا تو ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ :

"سیکڑوں پرانے خاندان تباہ ہوگئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار انہی معافیات پر تھا' تہ وبالا ہوگیا۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے اٹھارہ سال کی اس مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مِٹ گئے"۔ (کتاب ہمارے ہندوستانی مسلمان صفحہ ۲۵۷)

آگے چل کر لکھتا ہے :

"لیکن مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا۔ اس حقیقت کے چھپانے سے کیا فائدہ کہ مسلمانوں کے نزدیک اگر ہم اس جائیداد کو جو اس مصرف کے لئے ہمارے قبضہ میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں ان کے پاس آج بھی نہایت اعلیٰ اور شاندار تعلیمی ادارے موجود ہوتے"۔ (ایضاً صفحہ ۲۵۸)

اندازہ کیجئے کہ اسلامی حکومت میں جب ایک صوبہ میں تعلیمات پر ۴۵ لاکھ روپیہ صرف ہوتا تھا تو دوسرے صوبوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا اور جب ۴۵ لاکھ کی رقم ایک صوبہ سے اُڑائی گئی تو دوسرے صوبوں سے آمدنی کیا کچھ ہوتی ہوگی اور اس سے جدید تعلیم کی ترویج میں کس درجہ مدد ملی ہوگی۔

پھر جدید تعلیم اور جدید طریقۂ تعلیم رائج کیا گیا اس میں مسلمانوں کے رُجحانات کی رعایت کرنے کے کوئی معنیٰ ہی نہیں ہوسکتے تھے۔ انگریز اپنے رُجحانات رائج کرتے یا مسلمانوں کے رُجحانات کی پرواہ کرتے جن کے مٹانے ہی کے لئے قدیم تعلیم مٹائی گئی تھی۔ اس لئے مذہبی تعلیم کا کوئی جزو اس تعلیم میں نہیں رکھا گیا ہنٹر ایک جگہ اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبہ کی غیر معمولی قلّت کی وجوہات گناتے ہوئے لکھتا ہے :

> ”تیسرے ہمارے طریقۂ تعلیم میں نوجوان مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں“۔ (کتاب مذکور صفحہ ۲۵۲)

آگے چل کر اس سے زیادہ صاف لفظوں میں کہتا ہے کہ :

> ”ایک اعلیٰ افسر لکھتا ہے کیا اس کے بعد بھی یہ کوئی تعجّب کی بات ہے کہ مسلمان اس طریقۂ تعلیم سے پرہیز کررہے ہیں جو ان کے طبعی رُجحانات کے لئے کوئی رعایت نہیں رکھتا۔ نہ اس تعلیم کا کوئی انتظام کرتا ہے جس کو وہ اپنے لئے ازحد ضروری سمجھتے ہوں بلکہ جو قطعی طور پر ان کے مفاد کے خلاف ہے اور ان کی جماعتی روایات کے بالکل برعکس ہے“۔ (کتاب مذکور صفحہ ۲۵۳)

بہرحال مسلمانوں کی قدیم تعلیم مٹاکر اور جدید تعلیم کو اسلامی رُجحانات سے کلیۃً خالی رکھ کر مسلمانوں کو جس تعلیم میں لگایا گیا اس کا مقصد لارڈ میکالے کے مشہور الفاظ میں اس کے سوا کیا تھا کہ :

> ”ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا ہے جو رنگ، اور نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں اور دل ودماغ کے لحاظ سے انگریز ہوں“۔

چنانچہ یہ ثمرہ نمایاں ہوگیا۔ آج اس تعلیم کے بعد کون سا ہندوستانی ہے جو مشرقیت یا ایشیائیت کا دلدادہ ہو۔ تہذیب انگریزی، تمدّن انگریزی، لباس انگریزی، خیالات انگریزی، عقائد انگریزی اور مذہب تک انگریزی ہے۔

برطانیہ کی لُوٹ کھسُوٹ

بہرحال مسلمان علم سے تو یوں گئے اب مالی حیثیت ہوسکتی تھی جس سے دنیا میں انہیں فراغ بالی ہوسکتی تو اس کو ختم کرڈالنے کی انتہائی سعی یہ کی گئی کہ صوبہ بنگال کے متعلق ہنٹر کہتا ہے :

> ”آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے بنگال کے خاندانی مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ غریب ہوں لیکن آج کل یہ ناممکن ہے کہ وہ بدستور امیر رہیں“۔ (کتاب مذکور صفحہ ۲۲۱)

آگے چل کر لکھتا ہے :

> ”گزشتہ پچھتر سال سے بنگال کے مسلمانوں کے گھرانے (وسائل دولت منقطع کردیئے جانے کے سبب) یا تو صفحۂ ہستی سے بالکل نابود ہوگئے ہیں یا ان لوگوں کے مقابلہ میں حقیر

اور پست ہیں جن کو ہماری حکومت نے (وسائل دولت سے) سربلند کیا ہے"۔

اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۶ پر ۱۷۹۳ء کے دوامی بندوبست کے بارے میں جو اس وقت مسلمانوں کو کچلنے کے لئے حکومت کی ایک خاص پالیسی کے تحت میں کیا گیا۔ لکھتا ہے :

"بایں ہمہ سب سے کاری ضرب جو ہم نے پرانے طریق پر لگائی وہ اس قدر پر فریب تھی کہ اس کا پیش از وقت اندازہ نہ مسلمانوں کو ہوسکا نہ انگریزوں کو"۔

اس پر فریب پالیسی کا اثر کیا ہوا؟ خود کہتا ہے :

"اس بندوبست نے ہندو کلکٹروں کو جو اس سے پہلے معمولی عہدوں پر مامور تھے ترقی دے کر زمین دار بنادیا ہے ان کو زمین کی ملکیت کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اس دولت کو سمیٹ رہے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کا حق تھا"۔

(صفحہ ۲۲۷)

آگے آخری نتیجہ لکھتا ہے جو اس سارے تغیر و تبدل کا انتہائی مقصد تھا۔

"مثلاً خود مختار تعلق داروں کی علیحدگی ہی سے بہت سے مسلمان خاندانوں کی عظمت خاک میں مل گئی"۔ (صفحہ ۲۲۷)

اس دور میں مسلمانوں کی آمدنی کے دو ہی بڑے ذرائع تھے محکمۂ فوج اور محکمۂ دیوانی دونوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کیے گئے تاکہ وہ مالی حیثیت سے انتہائی طور پر پست ہو جائیں۔ ہنٹر لکھتا ہے :

"ہم نے مسلمان امراء کو فوج میں داخل نہیں کیا کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ ہماری عافیت ان کو بے دخل کردینے ہی میں ہے ہم نے ان کو دیوانی کے منفعت بخش محکمہ سے اس لئے خارج کردیا کہ ایسا کرنا حکومت اور عوام کی بہتری کے لئے ازحد ضروری تھا"۔

(صفحہ ۲۳۸)

آگے ملازمتوں اور عہدوں کا ایک نقشہ دیا ہے جس میں مسلمانوں کو دوسری اقوامِ ہند کے مقابلہ میں صفر کے برابر کردیا گیا۔ جب ان پر خود ان کے علم کے دروازے ہی بند کردیئے گئے اور دولت بھی ان کی پر فریب طریقوں اور کھلے اندازوں سے چھین لی گئی تو ظاہر ہے کہ ان کا وقارِ منصب اور حیثیتِ عرفی کیا باقی رہ سکتی تھی۔ چنانچہ ہنٹر لکھتا ہے کہ :

"دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے والے کے سوا کوئی اور ملازمت حاصل کرسکیں"۔ (صفحہ ۲۳۶)

وہاں جو ان کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر دل و دماغ انہیں دینے پر پختہ ہو گیا اور اس نے حکومت کی ڈگریاں حاصل کرلیں وہ بلاشبہ ان کا منظورِ نظر ہوا۔ اس نے مالی حیثیت سے ترقی کی اور غلامی کے باوجود کچھ مناصب پائے، جیسا کہ قارون بھی فرعون کے دربار میں بار پا گیا تھا۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہنٹر نے یہ احوال صوبہ بنگال کے متعلق پیش کئے ہیں۔ ہندوستان کے بقیہ خطوں کو ان پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ چونکہ اولاً صوبہ بنگال ہی کی سرداری انگریزوں کے قبضہ میں آئی، اس لئے انہوں نے سب سے

اوّل صوبہ بنگال ہی کو تباہ وپامال کیا اور غدّاری سے تباہ کیا۔ جس کا ہنٹر کو کھلا اقرار ہے۔ جب ان کی رَوِش ایک صوبہ میں یہ رہی اور ایک مقرّر شدہ پالیسی کے ماتحت یہ صورتیں عمل میں آئیں جو حکومت کی پالیسی تھی تو کیسے ممکن تھا کہ یہ پالیسی دوسرے صوبوں میں بدل جاتی۔ للٰذا جہاں بھی یہ حکومت پہنچتی وہ ایسا ہی کرتی چنانچہ اس کا جواب ہنٹرہی اپنے الفاظ میں دیتے ہوئے لکھتا ہے :

> ”میں یہ بھی بتادوں کہ میرے بیانات کا تعلق جنوبی بنگال سے ہے کیونکہ یہ وہ صوبہ ہے جسے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں اور جہاں تک مجھے علم ہے مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے ماتحت سب سے زیادہ یہیں نقصان اٹھایا ہے۔ پھر میں اگر دوسروں کو یہ یقین دلاؤں اور خود میرا بھی خیال ہے کہ یہ بیانات تمام مسلمانانِ ہند پر راست آتے ہیں تو مجھے اس پر معاف کیا جائے“۔ (صفحہ ۲۱۰)

اس سے واضح ہے کہ یہ حال صرف صوبہ بنگال ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا ہے۔ بنگال صرف نقشِ اوّلین کا محل رہا ہے۔ نقشِ ثانی اس سے بھی زیادہ مکمّل ہو کر دوسرے صوبوں میں پڑا۔

ہندوستانی مسلمانوں کو عالمِ اسلام کی حمایت سے محرُوم رکھنے کے لئے برطانیہ کا گھناؤنا کردار

بہرحال ہندوستان کے مسلمانوں کی داخلی حالت تو علمِ ”دین“ دیانت، منصب، دولت کے لحاظ سے اس طرح برباد کی گئی۔ مگر خارجہ پالیسی اس سے بھی زیادہ برباد کن رہی ہے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ وہ مسلمانوں کے بیرونی تعلّقات اس داخلی پالیسی پر کسی وقت اثر انداز ہوتے۔ کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلّق بیرونی دنیائے اسلام سے بھی تھا اور افغانستان سے لے کر ترکی تک مسلمانوں کی حکومت کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا احتمال تھا کہ وہ باہر سے ان کے لئے کوئی وزن دار آواز اٹھاتے یا کسی قسم کی اخلاقی یا مادی مدد دیتے۔ اس لئے پوری دنیائے اسلام کو کمزور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے گئے اور ان کے لئے بہت سے ایسے غم مہیّا کئے گئے جن میں وہ مُبتلا رہیں۔

چنانچہ اختلافات وغیرہ کی جو خلیج داخل ملک میں حائل کی گئی وہی پوری دنیائے اسلام کے لئے بھی رائج کی گئی۔ کہیں ایران وافغانستان کا مسئلہ، کہیں ایران وترکی کا مسئلہ، کہیں ترکی وعربستان کا مسئلہ، کہیں شام وفلسطین کا مسئلہ، کہیں خلافتِ اسلامیہ کا مسئلہ۔ چنانچہ اس آپس کی آویزش سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف ترکی کے حصے بخرے ہوتے رہتے تھے۔ دوسری طرف خلافتِ اسلامیہ کے مٹانے کا مسئلہ چھڑا رہتا تھا۔ کہیں افغانستان پر دانت رہتا تھا۔ کہیں ایران جو بالآخر ہضم ہو کر رہا خلافت بٹ کر رہی۔ ایسے ایسے مسلمان کھڑے کئے گئے جو ان مسائل کو خود اٹھاتے اور آخر میں فیصلہ برطانیہ کے ہاتھ میں آجاتا۔ برطانوی شہنشاہی سے دوستی کے رنگ میں وہ احکام صادر ہوتے جس سے نہ مدّعی باقی رہتا نہ مدّعا علیہ بلکہ دونوں کی میراث جج کے ہاتھ میں آجاتی ____

آزادی پسند مسلمانوں کو بَدنام کرنے کی اسکیم

ادھر ہندوستان میں جن دردمندوں نے دین اور ملک کی آزادی کے لئے آواز اٹھائی اور کھڑے ہوئے تو

ان کے تعلقات عام مسلمانوں سے منقطع کرنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی گئیں۔ سو وہ ہنٹر کی کتاب دیکھنے سے واضح ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ادنیٰ درجہ کی تدبیر یہ تھی کہ ان آزادی پسند جماعتوں کو حسب بیان ہنٹر انگریزوں کی طرف سے باغی اور آخر میں وہابی کا لقب دے کر بدنام کرنے کی مہم جاری کی گئی جس کی تفصیلات اس کتاب کے پڑھنے سے واضح ہو سکتی ہیں۔ یہ اسکیم عملاً آج تک جاری ہے۔ اب کیا کوئی اس کے خلاف بھی یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان اور بیرونِ ہند کی پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی حکومت، ثروت، شوکت، حشمت اور دولت اور دیانت و دین اندرون و بیرونی تعلقات میں جو گھن لگا اور وبالاُخر ان تمام چیزوں کو کھا گیا وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کے نظامِ حکومت کے سوا کوئی اور چیز تھا؟

پس فرعون نے جو معاملہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا کہ انہیں ان کے علم سے بے بہرہ کیا پھر ان کی دولت کے چشمے خشک کئے پھر ان کی حیثیتِ عرفی زائل کر کے انہیں قلی، چپراسی، اور معمولی خدمات گاروں کے درجہ پر پہنچایا اور پھر ان کے تعلقات باہمی و بیرونی منقطع کئے وہی معاملہ برطانوی شہنشاہی نے مسلمانوں کے ساتھ کیا جس کی تفصیلات میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب سے خود انگریزوں کے مسلّمات پیش کر چکا ہوں۔ غلامی کے ان اثرات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ غلامی پر کسی غلام قوم کا قناعت کئے رہنا موت کے مترادف نہیں ہے؟ اس لئے قرآن نے اسے بدترین عذاب اور اسے برپا کرنے والوں کو بدترین طاغی اور سرکش کا لقب دیا ہے۔ جیسا کہ آیت بالا کے ابتدائی کلمات ہی سے واضح ہو گیا۔

بُنیادی مسئلہ

ساتھ ہی یہ چیز بھی نمایاں ہو گئی کہ مسلمانوں کے لئے بنیادی مسئلہ نہ رفع جہالت کا ہے نہ اقتصادیات کا نہ اپنے اور ابنائے وطن کے تعلقات کا نہ منصبی اور عُرفی حیثیت کا بلکہ اصل مسئلہ ان سب مصائب کی بنیاد کو اُکھاڑ پھینکنے کا ہے اور وہ غلامی ہے۔ جس کا ایک سرا ہندوستان کے مسلمانوں کے گلے میں پڑا ہوا ہے اور دوسرا سرا پوری دنیائے اسلام کے گلے میں ہے۔ آج ہندوستانی مسلمانوں اور پوری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر قانونی اور بین الاقوامی قوانین کی جکڑ بندیوں اور ساتھ ہی اندرونی ریشہ دوانیوں کی پھانسیاں لگی ہوئی ہیں جو دنیائے اسلام کو پنپنے نہیں دیتیں۔ جس میں بلاشبہ ایک ہی ہاتھ کام کر رہا ہے اور وہ برطانوی شہنشاہی اور استبداد واستعباد ہے۔ جس کی گرفت کھول دینے کی ضرورت ہے۔

اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے نہ اولاً تورات اُترنے کی دعا کی جس سے ان کا تعلیمی مسئلہ متعلق تھا نہ ان کی اقتصادی حالت کی طرف کچھ زیادہ توجہ فرمائی جس سے مالی حالت درست ہوتی نہ اور امُور کی طرف زیادہ اِلتفات فرمایا جن سے حیثیت وعزت کا تعلق تھا بلکہ سب سے اوّل ان مفاسد کے سرچشمے (غلامی) کی جڑ پر تیشہ لگایا اور فرعون کو خطاب کیا کہ :

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ۔

"بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ بھیج"۔

تاکہ یہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں اور اپنی مذہبی اور سیاسی تعمیر باختیار خود کرنے پر قادر ہو جائیں۔

پس آج بھی ہندوستانیوں کے لئے بنیادی مسئلہ آزادیٔ ہند اور آزادی دنیائے اسلام کا ہے جو آزادیٔ ہند سے متعلق ہے تاکہ مسلمانانِ عالم اپنے دین ومذہب، اپنی سیاست اپنی اقتصادی ومعاشرتی حالت کو اپنی مرضی کے مطابق درست کر سکیں۔ پس مسلمانوں کے لئے حصولِ آزادی کی جدوجہد کوئی رسمی سیاست نہیں بلکہ

ایک مذہبی فریضہ ہے۔ جس کے لئے انہیں اپنی پوری اجتماعی قوت صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

جدّوجہدِ آزادی ایک مذہبی فریضہ

(۳) ادھر جب کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا یعنی ان کی بعثت کی اوّلین غرض ہی یہ تھی کہ فرعون کے پاس جاکر کہو :

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ۔

"کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے اور غلامی کے عذاب سے انہیں نجات دے"۔

تو آیت سے صراحۃً یہی واضح ہوا کہ غلامی سے استخلاص اور اس کے لئے جدّوجہد ایک مذہبی فریضہ ہے جس کے لئے مستقلاً ایک اُولوالعزم پیغمبر کی معیّت عمل میں آئی۔ کیا اس آیت کی رُو سے ہمارے لئے استخلاص اور تحصیلِ آزادی کی جدوجہد تقریباً ضروری اور ایک دینی وظیفہ نہیں ٹھہرتی؟ اگر اس وقت کی مصر کی اجنبی حکومت سے بنی اسرائیل کی آزادی تقریباً ضروری تھی تو آج ہندوستان کی اجنبی حکومت سے بھی مسلمانوں کی آزادی مذہباً ضروری ہے۔

بہرحال اس آیت اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ غلامی کا اپنی ذات اور آثار کے لحاظ سے امرِ قبیح ہونا بھی واضح ہوا اور ساتھ ہی اس کے دفعیّہ کی جدّوجہد کا مشروع اور وظیفۂ شرعی ہونا بھی نمایاں ہوگیا۔

حصُولِ آزادی کا پروگرام

اس کے بعد حصولِ آزادی کے پروگرام کا سلسلہ رہ جاتا ہے تو قرآن نے انہی آیات میں اصولاً اس پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ چنانچہ اسی خطابِ خداوندی اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ سے جو بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے سلسلہ میں موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ازالۂ غلامی کی تدبیر کے وقت اولاً غلام قوم کو اس مرض کے سرچشمہ کی طرف نظر دوڑانی چاہئے کہ یہ غلامی کے جراثیم چلتے کہاں سے ہیں؟

آیت نے واضح کیا کہ بنی اسرائیل کی غلامی کا سرچشمہ فرعون کا طغیان تھا۔ جس کے رکن تھے استبداد اور استعباد۔ استبداد کے ماتحت اس نے اپنی شخصی حاکمیّتِ مطلقہ کا جال پھیلا رکھا تھا جس کا انتہائی ثمرہ اس کا دعوائے اُلوہیّت تھا جس میں حاکمیتِ مطلقہ کے تمام حقوق اس نے اپنے لئے ثابت کئے اور کہا :

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی۔

"میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں"۔

پھر اپنے سوائے ہر ایک غیر سے اس منصب کی نفی کرتے ہوئے کہا :

ماعلمت لکم من الٰہ غیری۔

"میں اپنے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں سمجھتا ہوں"۔

پھر جس ذاتِ بابرکات کا یہ واقعی تنہا حق تھا یعنی حق جلّ مجدہٗ اس سے نہ صرف مقابلہ ہی کی ٹھانی بلکہ معاذ اللہ اس کی اُلوہیت کو بزعمِ خود مٹانے پر تُل گیا اور اپنے وزیر ہامان سے کہا :

فاوقد لی یٰھامان علی الطین فاجعل لی صرحاً لعلّی اطلع الیٰ الٰہ موسیٰ و انّی لاظنّہ من الکٰذبین۔

"تو اے ہامان! تم ہمارے لئے مٹی کو آگ میں پکواؤ (یعنی پختہ اینٹیں بنواؤ) پھر میرے واسطے ایک عمارت بنواؤ تاکہ میں موسیٰ کے خدا کو دیکھوں بھالوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

اور استعباد کے ماتحت بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھنے کا جذبہ تھا جو فرعون میں کام کر رہا تھا۔ قرآن نے موسیٰ علیہ السلام کے مقولہ کے ضمن میں اس کی بھی حکایت فرمائی اور کہا :

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۔

"اور (مجھے پرورش کرنے کا احسان جتلانا)"۔

سو وہی یہ نعت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ (اس کے بدلہ میں) تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا (حالانکہ وہ نعمت نہیں وہ بھی تیرے ظلم ہی کا نتیجہ تھا نہ تو بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرتا نہ میری ماں مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہاتی نہ وہ تیرے محل میں پہنچتا اور نہ تو مجھے پرورش کرتا۔ پس میری پرورش کا منشاء قتلِ اولادِ بنی اسرائیل تھا جو تیرا انتہائی ظلم تھا۔

بَرطانیہ کا جمہوری اِستبداد

ان آیات سے واضح ہے کہ استعباد (بنی اسرائیل کی غلام سازی کا) منشاء فرعون کا استبداد یعنی اس کی شہنشاہی تھا جس پر موسیٰ علیہ السلام کو اِنَّهٗ طَغٰی سے متنبّہ فرمایا گیا۔

اسی طرح آج غلام ہندوستان کو محسوس کرنا چاہئے کہ اس کی غلامی کا منشاء برطانوی شہنشاہی اور اس کا استبداد ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں استبداد شخصی تھا یہاں قومی ہے۔ وہاں انفرادیت تھی یہاں اس پر جمہوریت کا پردہ پڑا ہوا ہے مگر استبداد و استعباد کا جذبہ وہی ہے جو فرعون میں کارفرما تھا۔ فرعون نے اگر ملکِ مصر کی سلطنت پر مغرور ہو کر خدائی کا دعویٰ اور خدائے برتر سے مقابلہ کی ٹھانی تو آج کی یورپین مغرور بدمست قومیں بھی اسی سریر آرائی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر خدائے حقیقی کے مقابلہ پر پڑی ہوئی ہیں۔ بولشویک کے ہاتھ میں طاقت آئی تو انہوں نے بالفاظِ خود اپنی سلطنت میں خدا کا داخلہ ممنوع قرار دیئے جانے کا اعلان کیا ـــــ جرمنوں کے ہاتھ میں خدا کی بخشی ہوئی حکومت آئی تو انہوں نے وطنی تعصّب کے جذبہ سے کہا کہ اگر خدا جرمن ہوتا تو جرمن قوم اُسے مان سکتی تھی۔ برطانیہ کے ہاتھ میں وسیع ملک آیا تو اس کے بعض ذمہ داروں نے اپنی سلطنت کے طول و عرض کو دیکھ کر کہا تھا کہ اگر آسمان بھی ہمارے ملک پر گرنا چاہے گا تو ہم اپنی سنگینوں کی نوک پر اسے رکھ لیں گے۔

غرض یہ استبدادی دعوے وہی ہیں جو فرعون نے کئے تھے۔ ادھر جو استعبادی جذبہ اس کا تھا وہی آج کی بدمست اقوام کا بھی ہے جس کے ماتحت آج دنیا کی اقوام کو غلام بنائے رکھنے اور بنائے جانے کے منصوبے گانٹھے جاتے رہتے ہیں اور اس معاملہ میں آپس میں سودا بھی ہوتا رہتا ہے جو کہیں کھلے قبضہ کی صورت میں کہیں اِنتداب کی صورت میں اور کہیں مداخلت اور داخلی اثرات کی صورت میں نمایاں ہے اور یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ کا وہی ظہور ہو رہا ہے جو فرعون کے وقت میں ہوا تھا۔ غرض سرچشمہ غلامی یہاں سے متعیّن ہو جاتا ہے۔

پیغمبرانہ قیادت کی ضرورت

⑤ بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کا انتخاب اور مبعوث مِن اللہ ہونا اور انہیں اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ کا حکم دیا جانا اس کی صاف دلیل ہے کہ آزادی کی جدوجہد کے لئے پیغمبری سے مدد لیا جانا ضروری ہے یعنی پیغمبر کی قیادت میں حصول آزادی کا راستہ طے کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر اختراعی راستے نہیں بتاتا بلکہ وحیِ الٰہی سے پیش کرتا ہے جس سے خدا کا بتلایا ہوا پروگرام سامنے آتا ہے۔ اس نکتہ کے ماتحت حصولِ آزادی کے تمام سیاسی نظریات و فکریات جو اختراعِ محض سے مَنصّۂ ظہور پر آتے ہیں اور آرہے ہیں۔ ختم ہو جاتے ہیں اور منشاء خداوندی یہ نکلتا ہے کہ اس سلسلہ کی لیڈر شِپ کسی فلسفی یا طبیعی یا معاشی عالِم کے ہاتھ میں ہونے کے بجائے کسی ربّانی اور حقّانی فرد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو وحیِ الٰہی کی مدد سے پروگرام بنانا جانتا ہو تاکہ وہ قوم کو نجات دلانے کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح بھی کر سکے جس کے فساد ہی سے یہ غلامی کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں ورنہ بِلا اصلاح نفوس نجات کے بعد اس مرض کے عَود کر آنے کا خطرہ پھر قریب ہی رہتا ہے۔

پس جو شخص بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے حصولِ آزادی کی تدبیر کی پہلی کڑی صرف یہ ہو سکتی ہے کہ وہ نبوّتِ وقت یعنی حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی قیادت میں گامزن ہو۔ جس کا واضح ترین پروگرام یہ قرآن اور اس کی مدوّنہ شریعت ہے جس کا ایک بازو اس کی اوّلین تفسیریہ حدیثِ رسول اور دوسرا بازو اس کی فقہی تشریحات ہیں۔ لہٰذا مسلمان کسی ایسی قیادت کو تسلیم نہیں کر سکتے جو کتاب وسنت سے الگ کوئی نیا راستہ بناتی ہو۔

ہاں کتاب وسنت کے معیار پر پرکھ کر بِلا شبہ اس کے ردو قبول کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ:

غاصبؔ قوم سے حکمِ جہاد

⑥ اب حصولِ آزادی کے لئے نبوّت کا لایا ہوا پروگرام ظاہر ہے کہ اصولاً دو ہی نوعوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ تشدّد اور عدمِ تشدّد۔ سو اس کے مواقع اور محل میں تفصیل ہے اگر فاتح قوم نے مفتوح قوم کو اس کے وطن سے نکال باہر کیا ہو اور اس کے ملک ہی نہیں املاک پر بھی قبضہ کر لیا ہو جس سے وہ بے یار ومددگار ہو کر وطن سے بے وطن ہو کر دربدر بھٹکتی پھر رہی ہو تو اس صورت میں استخلاصِ وطن کی صورت بقیادتِ پیغمبری تشدّد ہے کہ قِتال وجہاد کے ذریعہ اس ظالم اور غاصب قوم سے نبرد آزما ہوا جائے اور اپنا وطن واپس لیا جائے۔ چنانچہ ارضِ مقدّسہ (بیت المقدس) کے استخلاص کے لئے (جس پر عمالقہ نے قابض ہو کر بنی اسرائیل کو بے وطن بنا دیا تھا) جہاد کا حکم ملا مگر بنی اسرائیل نے اس کی تعمیل نہ کی اور چالیس برس تک میدان تِیہ میں سرگردانی اور حیرانی کی زندگی بسر کرنے کی سزا بھگتی جیسا کہ قرآن پاک نے چھٹے پارہ میں اس کی پوری تفصیلات بیان فرما دی ہیں یا جیسے حضرت سموئیل کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے وطن پر جب جالوت نے قابض ہو کر انہیں ان کے دیار سے نکال باہر کیا تو بحکمِ پیغمبر طالوت کی قیادت میں انہیں استخلاص وطن کے لئے قِتال وجہاد کا حکم ملا:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ

ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا۔

"(اے مخاطب) تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تحقیق نہیں ہوا؟ جب ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیجئے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔ ان پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے کہ اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کون سا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں۔ حالانکہ اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کردیئے گئے ہیں"۔

یا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرنِ خیر میں جبکہ آپ کو مکہ سے نکالا گیا اور آپ وطن سے ہجرت پر مجبور ہوگئے تو مدینہ سے قوت فراہم کر کے استخلاصِ وطن کے لئے قتال کا حکم ملا تاکہ مکہ کو کفار سے آزاد کرایا جائے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ۔

"ان لوگوں کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کردینے پر پوری قدرت رکھتا ہے جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے"۔

بہرحال بے وطنی کی صورت میں استخلاصِ وطن کی صورت بعد فراہمی قوت تشدد ہے جو پیغمبر یا مامورین پیغمبر کی قیادت میں کیا جائے۔

عدمِ تشدد کے ذریعہ احتجاج

لیکن اگر فاتح قوم نے محض سلطنت و حکومت چھینی ہے محکوم قوم کو ان کے گھروں سے نہیں نکالا وہ بدستور اپنے وطن میں آباد ہیں مگر غلام بن کر نہ انہیں باختیار خود باہر جانے دیا جاتا ہے اور نہ داخلی آزادی سے انہیں زندگی بسر کرنے دی جاتی ہے تو اس کا حل بقیادتِ پیغمبر عدم تشدد ہے یعنی پُرامن رہ کر حصولِ آزادی کی جدوجہد کی جائے۔

فرعون کی شہنشاہی میں بنی اسرائیل کی یہی نوعیت تھی کہ نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن یوسف علیہ السلام کے وقت سے حکومت مصران کی تھی۔ مصران کا تھا جس پر فرعون نے قبضہ پایا اور بنی اسرائیل کو غلام بنالیا۔ انہیں مصر سے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام یہ خواہش کیوں کرتے کہ:

أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ۔

"(اے فرعون بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے)"۔

اور مصر میں امن وراحت سے رہنے کی بھی اجازت نہ تھی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کیوں فرماتے کہ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ (اور بنی اسرائیل کو ستامت)۔

پس ایسے ہی برطانوی شہنشاہی میں بھی جبکہ مسلمانوں کے لئے نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن، تو استخلاصِ وطن کے لئے بھی موسوی طریقہ عدمِ تشدّد اختیار کرنا پڑے گا اور حکومت سے احتجاج کیا جائے گا کہ انہیں آزاد کردو۔

عدمِ تشدّد کے پانچ ہتھیار

(۷) مگر جس طرح تشدّد کے اسلحہ تیر وتفنگ اور توپ وبندوق ہیں ایسے عدمِ تشدّد کے بھی کچھ اسلحہ ہیں۔ جو اس جنگ آزادی کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل ذکرہٗ سے طلب فرمائے اور اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى کی تعمیل کے لئے جواب میں عرض کیا کہ مجھے چند اسلحہ درکار ہیں۔ جو اس جابر بادشاہ کے مقابلہ کے لئے ناگزیر ہیں جن کو رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ سے شروع فرمایا۔ آیت کا ترجمہ صفحہ اوّل پر دیکھئے۔

یہاں صرف ان معنوی اور اخلاقی اسلحہ کی تفصیل پر نظر ڈالئے جو آیت عنوان میں موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے طلب فرمائے ہیں۔ یہ عدمِ تشدّد کے پانچ ہتھیار ہیں جو مانگے گئے۔

پہلی چیز شرحِ صدر ہے کیونکہ جب تک کسی مقصد کے لئے سینہ نہ کھل جائے اور وہ مقصد دل کے اندرونی داعیہ اور جذبہ سے نہ ابھرے حوصلہ بلند نہ ہو آدمی زورِ قوت اور وزن دار آواز سے اسے پیش نہیں کرسکتا۔

دوسری چیز تیسیرِ امر ہے کیونکہ اگر باوجود انشراحِ صدر کے ادھر سے اعانت وتوفیق اور تہیأ اسباب ووسائل نہ ہو تو محض جذبہ اندرون کام نہیں دے سکتا۔

تیسری چیز حلِّ عُقدۂ لسان ہے کہ اگر بلیغ انداز میں مافی الضمیر کی ادائیگی پر قدرت نہ ہو کلام میں فصاحت اور شیرینی نہ ہو تو مخاطب پر مقصد کا اثر نہیں پڑسکتا اور اس اجتماعی مقصد میں نہ اپنوں کی جمعیت بن سکتی ہے نہ دشمن کی سوسائٹی ٹوٹ سکتی بلکہ وہ تصدیق کے بجائے اور تکذیب پر آمادہ ہوجاتی ہے۔

چوتھی اعانت کار اور اشتراکِ عمل ہے کہ اگر کام میں اشتراکِ عمل نہ ہو اور کوئی بھروسہ کا معین ویاور ساتھ نہ ہو تو انفراد کے ساتھ یہ اجتماعی کام نہیں چل سکتا۔ نیز طبع بشری تنہائی کے ساتھ جب کہ وہ بے معین ومددگار ہو قرار بھی نہیں پکڑسکتی۔ ساتھ ہی قلبی وباطنی مقاصد میں انفراح واستقلال بھی میسّر نہیں آسکتا؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عمرین میں سے ایک عمر کے اسلام کی دعا فرمائی تھی جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہٗ کے حق میں مقبول ہوئی کہ انہی سے حضورؐ کی ایک وزارت کا قلمدان مکمل ہونے والا تھا۔

اور پانچویں چیز جو ان سب کی روح اور معنوی قوت ہے وہ ذکر اللہ اور ذات بابرکات حق کی تسبیح وتقدیس ہے کیونکہ اگر توجّہ الی اللہ نہ ہو تو نہ شرحِ صدر ہو نہ تیسیرِ امر نہ حلِّ عُقدہ ہو نہ اشتراکِ عمل کی توفیق وتاثیر۔

یورپ کی غلامی سے نجات کا راستہ

(الف) اس سے صاف ظاہر ہے کہ استخلاصِ وطن کی مساعی کا آغاز ذکر اللہ، دعا، یادِ حق اور توجّہ الی اللہ سے ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ کے اجتماعات کی تقریریں مکالمے وغیرہ سب میں ذکرِ حق کی روح دوڑی ہوئی ہونی چاہئے

اور ساری جدّوجہد کا رجوع اور رُخ بالآخر ذات حق کی طرف ہونا چاہئے تاکہ اس اخلاص کی بدولت یہ کام نتیجہ خیز بھی ہو اور ظاہروباطن کی صلاح وفلاح کی راہیں خدا کی طرف سے کھلتی رہیں۔

خلاصہ یہ کہ استخلاصِ وطن کی مہم دینی رنگ اور اسلامی ڈھنگ سے شروع کی جائے نہ کہ یورپ کی نقالی اور نمائشی مظاہروں سے'کام ٹھوس ہونا چاہئے نہ کہ رسمی۔ ورنہ جس غلامی سے گلوخلاصی کے لئے حرکت کی جائے گی وہی غلامی اور گلوگیر ہوجائے گی۔ گویا یورپ سے بچنے کے لئے یورپینت کا پھندا گلے میں آپڑے گا جو بچنا نہیں کہلائے گا بلکہ اور پھنسنا کہلائے گا اور ثمرہ یہ ہوگا کہ ظاہری غلامی کے ساتھ باطن کی غلامی بھی سر پر پڑ جائے گی۔

اِشتراکِ عمل کی ضرورت

ان مُرادوں میں کچھ چیزیں تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کے لئے طلب کیں جیسے شرح صدر' تیسیرِ امر' حلّ عُقدۂ لِسان۔ لیکن جو چیز سب سے اہم طلب کی وہ اَشْرِكْهُ فِىْٓ اَمْرِىْ ہے یعنی میرے اس کام میں میرے بھائی کو شریک کردیا جائے جس سے واضح ہے کہ سعی آزادی کے سلسلہ میں اشتراکِ عمل اوّلین منزل ہے اور وہ بھی اپنوں کے ساتھ۔ اس سے یہ مسئلہ صاف ہوجاتا ہے کہ آج مسلمانوں کو باہمی اشتراک عمل کی اَشد ضرورت ہے۔ غیروں سے پہلے انہیں اپنوں کو اپنانا چاہئے۔ جمعیت العلماء سے زیادہ کون اس کا حق دار ہے کہ وہ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی طرف وِداد و محبت کا ہاتھ بڑھائے اور درمیانی رکاوٹوں کو آئینی اور رسمی انداز سے نہیں بلکہ واقعاتی انداز سے دُور کرکے ٹوٹے ہوؤں کو ملانے کے لئے خود اقدام کرے۔ معاذیر نہ پیش کرے۔ بلکہ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اجتماعیت کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی دے اور خود جھک کر دوسروں کو اپنے سامنے جھکادے۔ خواہ وہ لیگی ہوں یا احراری۔ حق تعالیٰ نے یہ تمام باطنی اسلحہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمادیئے اور ارشاد ہوا :

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى۔

"فرمایا بلاشبہ تمہاری مراد تمہیں دی گئی اے موسیٰ"۔

اور اس کے بعد تسلّی آمیز کلمات فرماکر پھر اس ابتدائی حکم کو اس طرح دہرایا گیا :

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِىْ وَلَا تَنِيَا فِىْ ذِكْرِىْ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔

"اور میں نے تم کو (اے موسیٰ) اپنے لئے منتخب کرلیا تم اور تمہارے بھائی دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ اور میری یادگاری میں سُستی مت کرنا۔ دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت چل نکلا ہے"۔

معیارِ قیادت

(۸) اس سے واضح ہوا کہ اس اجتماعی کام کے شرکاء اور وہ بھی منصب دارانِ قیادت ذاکرین کی جماعت ہوں' غافلین کی نہ ہوں جنہیں نہ اللہ کی معرفت ہو نہ اس کی محبت ہو اور نہ اس کے طریق اور راہ سے واقفیت ہو کہ وہ مسلمانوں کے کام اسلامی حیثیت سے کبھی نہیں بناسکتے۔ مگر ساتھ ہی اسے فراموش بھی نہ کرنا

چاہئے کہ قوم میں جو لوگ کسی نہ کسی ہیئت سے بڑائی پیدا کر چکے ہوں اور مخلص بھی ہوں ان کی ادنیٰ توہین یا بے وقعتی بھی گوارا نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ اجتماعی کام میں افراد ہی کا نہیں اجتماعات کا وابستہ رکھا جانا بھی ناگزیر چیز ہے۔ ورنہ اجتماعیتِ عامہ پیدا نہیں ہو سکتی جو قومی حریت کے لئے اوّلین زینہ ہے۔ ہاں ان کی تقویم اور غلط روشی کی اصلاح، شفقت و محبت اور خلوص کے ساتھ ضروری ہے تاکہ وہ بھی بلا کسی جھجک کے امرِ حق کی طرف جھک آئیں اور لاعلمی کے سبب ان میں جو بُعد سوءِ اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا وہ مبدل بہ قرب ہو جائے۔

غرض اس طرح سے دو پیغمبروں کو قائد بنا کر فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا۔

مذاکرات کی بُنیاد

(۹) یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حکمران کے پاس جانے والے (جو آزدی مانگنے کے لئے جا رہے ہوں) بحیثیتِ فرستادہ خدا جائیں نہ کہ ذاتی تقاضے سے روانہ ہوں جیسے موسیٰ وہارُون از خود نہیں گئے، بھیجے ہوئے گئے۔ اس کا ثمرہ یہ ہو گا کہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری حکومتِ الٰہی پر عائد ہو جائے گی۔ قوم پر کوئی بُرائی اور آنچ نہیں آئے گی۔ غرض ان تمام کیفیات کے ساتھ ارشاد ہوا کہ فرعون کے پاس پہنچو۔ اسی موقع کے لئے دوسری جگہ قرآن میں یوں ارشاد ہے :

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰۤى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۙ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۔

”اور جب آپ کے ربّ نے موسیٰ کو پکارا کہ تم ان ظالم لوگوں یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ۔ کیا یہ لوگ نہیں ڈرتے“۔

حکومت اور قوم سے افہام و تفہیم کی ضرورت

(۱۰) اس سے واضح ہوا کہ سعیِ آزادی کے سلسلہ میں نہ صرف حکمران ہی کے پاس جانے کی ضرورت بلکہ حکمران قوم کے پاس بھی جانے اور ان سے مل کر گفت و شنید کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ حکومت اپنے غرور میں مدعا پر کان نہیں دھرتی مگر حکومت کی قوم سمجھ جاتی ہے اور کبھی برعکس بھی ہو جاتا ہے۔ بہرحال حکومت اور قوم دونوں سے اس بارے میں گفت و شنید ضروری ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو ان دونوں احکام سے دو خطرے لاحق ہوئے جن کو انہوں نے صفائی سے عرض کر دیا۔ حکومت سے تو زیادتی اور تعدّی کا کہ فرعون کوئی جابرانہ کارروائی نہ کر بیٹھے کیونکہ اس کے ہاتھ میں طاقت تھی تو عرض کیا :

قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَاۤ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۔

”دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے“۔

اور قوم سے خطرہ ہوا تعصّب اور ہٹ دھرمی کا کہ بات نہ مانے اور مجھے چھوڑ دے کیونکہ وہ مستغنی تھی تو عرض کیا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۔

”کہا اے میرے پروردگار مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلانے لگیں“۔

حق تعالیٰ نے جواب میں تسلّی دیتے ہوئے فرمایا :

قَالَ لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی -

"ارشاد ہوا تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سُنتا ہوں اور دیکھتا ہوں"۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا :

کَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ -

"کیا مجال ہے سو تم دونوں ہمارے احکام لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں"۔

اس سے واضح ہوا کہ اگر فرستادۂ خدا ہونے کی حیثیت سے احکام اور حکمران قوم سے ملا جائے گا تو مضرت کی ذمہ داری اللہ پر ہوگی۔

یعنی کام خدا کے نام اور اس کے دیئے ہوئے پروگرام پر شروع کیا جائے تو پھر اس کے اثرات ونتائج دوسرے ہوں گے۔ اگر ہم اپنے اختراعی پروگراموں اور خود اپنی ذوات کے بل بوتہ پر کام شروع کریں تو اس کے نتائج اور ہیں۔ ان میں وہ قوت نہیں آسکتی جو پہلی صورت میں ممکن ہے۔

شعارِ قیادت

(۱۲) اس لئے آیت بالا میں موسیٰ وہارون علیہما السلام کو نہ صرف یہی حکم دیا گیا کہ بحیثیتِ فرستادۂ خدا ہونے کے دربار فرعونی میں جاؤ۔ اپنی طرف سے مت جاؤ اور نہ صرف یہی کہ ہمارا ہی پیغام پہنچاؤ اپنی طرف سے کچھ نہ کہو یعنی اختراعی پروگرام مت اختیار کرو بلکہ یہ بھی ارشاد ہے اندازِ پیام رسانی بھی ہمارا ہی متعین کردہ اختیار کرو بطورِ خود طریقِ ابلاغ بھی متعین نہ کرو اور وہ یہ کہ :

قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا

"پھر اس (فرعون) سے نرمی کے ساتھ بات کرنا"

یعنی مکالمہ میں بھی تشدد کا پیرایہ نہ آنے پائے۔ جبکہ یہ جنگ عدمِ تشدد کی جنگ ہے۔ یہ اس لئے فرمایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو اس جنگِ آزادی کے قائدِ اعظم تھے طبعاً تیز مزاج تھے اور ان کی شانِ جلالی واقع ہوئی تھی۔ اُفتادِ طبع میں حدت اور شدّت تھی۔

چنانچہ اس تشدد پسندی کے چند واقعات بھی ان سے ظاہر ہو چکے تھے۔ قبطی کو جوش میں تھپڑ مارا تو اس کی گردن الگ جا پڑی اور مرگیا۔ بچپن میں فرعون کا دعوائے اُلوہیت سُن کر ایک دو چپت بھی رسید کئے اس کی داڑھی پکڑلی وغیرہ تو اندیشہ تھا کہ فرعون کے بے باکانہ اور گستاخانہ جوابات سُن کر موسیٰ علیہ السلام اپنی طبعی رفتار پر کہیں اکھاڑ پچھاڑ کرکے نہ چلے آئیں اور نصیحت وشفقت یا اتمامِ حجت کا معاملہ ہی درہم برہم ہو جائے۔

اس لئے بہ تاکید دونوں حضرات کو شیریں زبانی اور نرم گوئی کا حکم دیا گیا تاکہ یا دشمن اس خوش اخلاقی سے مسخر ہو جائے اور یا پھر برملا اس کی تعدی واضح ہو کر کھلے بندوں اس پر حجت تمام ہو جائے۔

کون نہیں جانتا کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ جوش وخروش عیاذاً باللہ نفسانی نہ تھا کہ نبوت کی بارگاہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ بُغض فی اللہ تھا جو شرعاً مطلوب ہے لیکن موقعہ کی نزاکت اور اجتماعیات کی تکمیل کے سلسلہ میں ضروری تھا کہ اس جذبہ کو اگرچہ وہ دینی تھا مستور کرکے دوسرے دینی جذبہ رأفت فی اللہ اور صبر وتحمل کو بروئے کار لایا جائے کیونکہ مقصود اصلی صرف اتنا ہی نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام تبلیغ کرکے اپنا ذمہ بری کرلیں اور فرعون کو کہہ سن کر فارغ ہو جائیں بس فرض تبلیغ ادا ہو جائے۔ آگے فرعون اور فرعونی جنت میں جائیں یا

جہنم میں، نہیں بلکہ مقصود اصلاح اور تکمیل کار تھی اور فرعون کے پاس اس جذبہ کے ساتھ جانا تھا کہ وہ کسی طرح راہ راست پر آجائے نہ یہ کہ ہم پیام پہنچا کر بریٔ الذمہ ہو جائیں۔

اور ظاہر ہے کہ قصدِ اصلاح و تربیت کے ساتھ مخاطب کے احوال کی رعایت کی جاتی ہے نہ کہ اپنے احوال کی۔ اس صورت حال سے یہ مسئلہ نمایاں ہوتا ہے کہ آج بھی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے قائد اور زعماء کا خواہ وہ کسی اجتماعی ادارہ کے ذمہ دار ہوں یا خود اپنے کام کے 'شعار رأفت و رحمتہ ہونا چاہئے۔ قول لین اور نرم گوئی ان کی شان غالب ہو تاکہ اپنے ٹوٹنے نہ پائیں اور غیر بیگانے نہ رہیں۔ غلظتِ قلب اور شدت ہمیشہ قطع کا باعث ہوتی ہے اور رأفت و لینت ہمیشہ وصل وملاپ کا سبب بنتی ہے بشرطیکہ اس میں مداہنت اور استرضاء غیر اللہ نہ ہو۔ پس زعماء مسلمین زیادہ احق ہیں کہ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کے مصداق بنیں اور اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ ہو کر حکمت اور رأفت اور نصیحت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

اِقتدار کے فرعون سے طرزِ گفتگو

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں حکومت متسلّط کے مظالم اور آئینی انداز کی چیرہ دستیاں مسلمانوں کی شوکت کو تباہ کرنے کی وسیع کاریاں بلادِ اسلامیہ کو چُن چُن کا پامال کرنا اور اسلامی شوکت کو مٹا کر نصرانی عظمت وانتداب کو قائم کرنا۔ مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کرنا۔ ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدوں اور وعدوں کو پس پشت ڈال کر ان کی صریح خلاف ورزی کرنا' ہندوستانی اقوام سے جھوٹے وعدے کر کے انہیں احمق بنانا اور اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہنا' انہیں لڑا لڑا کر حکومت کی بنیادیں استوار کرنا وغیرہ وہ امور ہیں کہ حمیّتِ اسلامی کے ماتحت ان پر مسلمانوں اور ان کے زعماء کو جس قدر بھی جوش ہو کم ہے اور جس قدر بھی وہ غیظ و غضب کا اظہار کریں انہیں حق ہے ___ فانّ لصاحب الحق مقالا لیکن ساتھ ہی یہ پہلو بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں کہ مقصودِ اصلی جوش کا مظاہرہ کرلینا نہیں بلکہ اپنی آزادی اور متقابل قوم کو حق سے متاثر کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ مخاطب میں تأثر اور سیلانِ اظہار غضب سے پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ رقتِ ولین سے۔ موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ ہم بُغض فی اللہ کے حامل نہیں ہوسکتے۔ لیکن انہیں بھی عدمِ تشدد کی جنگ کی صورت میں قولِ لین کا حکم دیا گیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون بُغض فی اللہ سے متخلّق ہو سکتا ہے اور وہ بھی بمقابلۂ مشرکین مکہ جنہوں نے اللہ کے رسولؐ کو ایذائیں پہنچانے میں کوئی کسر اُٹھا کر نہیں رکھی حتیٰ کہ آخر کار وطن اور گھر بار تک سے محروم کردیا لیکن مکہ کی زندگی میں جو عدمِ تشدد کی زندگی ہے۔ خود حضور کو بار بار حکم ملتا رہا کہ صبر سے کام لو، تحمل کرو، کسی جذبہ کا اظہار نہ کرو۔ شفقت وخیر خواہی خلق اللہ کو ہاتھ سے رہا مالیاں کھا کے بے مزہ مت ہو۔

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوالْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّھُمْ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِءِیْنَ۔

”سو آپ صبر کیجئے جیسے اُولوالعزم انبیاء نے صبر سے کام لیا اور جلدی نہ کیجئے ___ سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کیجئے۔ غرض آپ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کو صاف صاف سنادیجئے اور ان مشرکوں کی پرواہ نہ کیجئے یہ لوگ جو ہنستے ہیں“۔

چنانچہ آپؐ کا خطاب ہی رحمت اللعالمین ہوا۔ آپؐ کا لقب ہی رحمۃ مھداۃ ہوا اور اس کے بعد آپؐ

کی شفقت اور خیر خواہی خلق اللہ کا یہ عالم ہوا کہ حق تعالیٰ کو اس غیر معمولی شفقت سے روک کر اس کی تعدیل فرمانی پڑی کہ :

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔

”شاید آپؐ ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دے دیں گے“۔

بہر حال یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ اس عدمِ تشدّد کی جنگ میں دشمنوں اور فرعون صفت دشمنوں کے سامنے قولِ لین کی ضرورت ہے نہ کہ اظہارِ غیظ و غضب کی اور خود انہیں بھی ہدایت کرنے کی ضرورت ہے نہ تنہا اپنی گلوخلاصی کی۔ اس پر بھی موسیٰ علیہ السلام نے خطرہ ظاہر کیا کہ فرعون ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے۔ یعنی باوجود اس نرمی اور لینت کے بھی اس سے مان جانے کی توقع نہیں۔ بلکہ تمرّد اور ڈھٹائی کا ہی خطرہ ہے گویا ایسے سرکش کے لئے پھر نرمی کی کیا ضرورت ہے؟ مگر پھر بھی ارشاد ہوا کہ اس کے ذمّہ دار ہم ہیں کہ تم پر اس کی کوئی زیادتی اثر انداز نہ ہوگی۔ ہم دیکھتے سنتے ہیں اور سب کچھ جانتے ہیں۔ تم تو ناصحانہ اور مشفقانہ انداز ہی سے بات کرو۔ مصلحت اور حکمت یہی ہے۔

بلند بانگ دعووں کی ممانعت

(۱۴) اسی سے یہ بھی واضح ہوا کہ جنگِ آزادی کے سلسلہ کے قائدین متواضع اور بے تکلف ہونے چاہئیں جو اپنے دل کی ہر کھٹک کا بے تکلف اظہار کر سکیں۔ حتیٰ کہ اپنی کمزوری صاف صاف کہہ سکیں اور کوئی رسمی وقار انہیں اظہارِ حال سے مانع نہ ہو یہ کہ **فخور** و شیخی خورے ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے بایں قوّتِ نبوت اپنے خوف کا اور دشمن کی طرف سے متوقع زیادتیوں کا جو خطرہ دل میں گزرا اس کا برملا اور بے تکلف اظہار فرمادیا کہ مجھے فرعون سے زیادتی کا خطرہ ہے اور اس کی قوم سے تکذیب اور ہٹ دھرمی کا۔

اس لئے آج ہمارے لئے بھی جبکہ ہم ایک جابر حکومت کے سامنے مطالبے لے کر جانے کا ارادہ رکھتے ہوں اِدّعاء اور فخریہ لب ولہجہ یا شیخی کے کلمات کا اظہار کسی طرح مناسب نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لئے یہ دعوے کبھی زیب نہ دیں گے کہ نہ ہم حکومت سے ڈرتے ہیں نہ ہم پھانسی سے خوف کھاتے ہیں نہ ہمیں جیل کا ڈر ہے۔ ہم یہ کر ڈالیں گے اور وہ کچھ کر گزریں گے۔ خدا کرے ہمارے قلوب غیر اللہ سے ایسے ہی نڈر اور بے باک ہوں لیکن اِدّعاء تو پھر بھی ممنوع ہے جب تک کہ اِدّعاء کی کوئی شرعی ضرورت ہی پیش نہ آجائے۔ ہمیں عموماً ہر حالت میں اور بالخصوص قوی دشمن کے سامنے پڑ کر اللہ کے لئے اعلانِ تواضع اور اعترافِ ناتوانی میں ہرگز کوئی ادنیٰ باک نہ کرنا چاہئے اور پروردگار کے سامنے بلا ریب و شک اپنی صحیح حالت کا نقشہ رکھ کر ادھر سے امداد کی استدعاء کرنی چاہئے۔ کیونکہ نہ تصنّع کی بہادری کار آمد ہے نہ تصنّع کا مظاہرہ ہمارا راستہ حقیقت واقعہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ آیت بالا میں موسیٰ علیہ السلام کے اُسوہ سے واضح ہے تاکہ ساری ذمّہ داری حکومت حق پر رہے اور ہم محض خدا کے ایک کارندے اور کارگزار کی حیثیت سے حکومت متقابل کے سامنے پیش ہوں۔

مُسلِم قیادت کا اوّلین فرض

ان ابتدائی معاملات کے طے ہو جانے کے بعد موسیٰؑ وہارونؑ کو حکم ہوا :

فَأْتِيَاهُ فَقُوْلَا اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ۔

"سو تم دونوں (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں"۔

(۱۴) اس سے واضح ہوا کہ قائدوں کی جماعت دربار حکومت اور حکمران قوم کے ایوانوں میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنی پوزیشن صاف صاف واضح کردے کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں؟ موسیٰ وہارون علیہما السلام کو حکم ہوا کہ جاتے ہی پہلے فرعون کو یہ بتلاؤ تم کون ہو؟ یعنی صاف صاف کہہ دو کہ ہم رسول ہیں اور فرستادۂ خدا ہو کر آئے ہیں یعنی ہم از خود نہیں آئے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ ہم کسی اسرائیلی کی حیثیت سے قومیت کے جذبہ کے ماتحت نہیں آئے بلکہ دینی افراد کی حیثیت سے آئے ہیں ہم مذہبی پیغام لے کر آئے ہیں۔ اپنی کوئی رائے یا اپنی جماعت کی کوئی پاس کردہ تجویز پیش کرنے نہیں آئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان قائدوں کا جو اوصافِ مذکورہ سے متصف ہوں اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ اربابِ حکومت اور حکمران قوم سے ملتے وقت صفائی سے اپنی پوزیشن واضح کردیں کے ہم مسلمان ہیں یعنی ہم بحیثیتِ ہندوستانی کے وطنی جذبہ سے نہیں آئے بلکہ بحیثیتِ مسلمان ہونے کے مذہبی جذبات سے آئے ہیں۔ ہم اوّل و آخر مسلمان ہیں نہ کہ اوّل مسلمان اور پھر ہندوستانی۔ ہم مذہبی اشارات پر آئے ہیں نہ کہ آراء و اختراعات پر۔ ہم ذاتی افکار و قیاسات سے کوئی پاس کردہ رزیولیوشن لے کر نہیں آئے بلکہ اس مذہب کی دفعات لے کر آئے ہیں جو خدائے حاکم اور مَلِکُ الملوک کا بھیجا ہوا ہے اور جس کے آزاد رکھنے کے تم بھی اپنی زبان سے مدّعی ہو۔

اس صورتِ حال کا سب سے بڑا مفاد تو یہ ہوگا کہ ہماری پوزیشن وزنی اور مؤثر ہوجائے گی کیونکہ ترجمانی حق کی پوزیشن کا جو اثر مخاطبوں پر پڑسکتا ہے وہ خود ہماری اپنی بنائی ہوئی رسمی پوزیشن کا خواہ وہ انفرادی یا اجتماعی ہو نہیں پڑسکتا۔ کیونکہ اسلامی پوزیشن بے ساختہ اور قدرتی ہے اور غیر اسلامی پوزیشن بہرحال بنائی ہوئی ہے اور بہ تکلّف اپنے اندر پیدا کی جاتی ہے اور وہ بھی انہی غیروں کی نقّالی سے جن کے سامنے ہم احتجاج کررہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مخاطب اس سے کسی عظمت و میلان کا اثر نہیں لے سکتے۔ بلکہ تضحیک کا جو ہمارے لئے مفید ہونے کے بجائے مُضر اور سخت خطرناک ہے کہ اس میں ہَوا خیزی ہے' کا اثر لے لیں گے۔

قیادت' علماء کے لئے کیوں ناگزیر ہے

نیز اسلامی اور خالص دینی پوزیشن لے کر جانے اور اسے صاف لفظوں میں پہلے ہی واضح کردینے کا دوسرا مفاد یہ بھی ہوگا کہ قیادتِ عامّہ مخلوط نہ رہے گی بلکہ نکھر جائے گی اور قدرتی طور پر اس نوع کی قیادت اور دعوت لے کر وہی اٹھ سکیں گے جو حقیقتاً اس پوزیشن کے اعلان کی قوّت اور اہلیت رکھتے ہوں گے۔ ہر کس و ناکس کو اس کی جرأت نہ ہوگی کہ وہ پیغام بردارِ الٰہی بن کر اپنے یا اغیار کے پلیٹ فارم پر پیش ہو اور اس قیادت کی اہلیت صرف انہی افراد میں پائی جاسکے گی جو دینی اور روحانی رنگ میں اس پیغام کے اِثبات و اِیضاح اور اس کی طرف سے دفاع کی قدرت اور عملی ہمّت رکھتے ہوں گے۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں ایک طالب علم یا علماء کا نام لیوا ہونے کی حیثیت سے کسی جماعتی تعصّب سے کام لے رہا ہوں اور خواہ مخواہ علماء کی قیادت اور مطاعیّت کا پروپیگنڈہ کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ الزام اس وقت صحیح ہوسکتا ہے کہ میں امّت کو علماء کی ذوات کا پابند ہوجانے کی دعوت دوں۔ حالانکہ میری غرض علماء کی ذوات کی اطاعت پر مجبور کرنا نہیں اور نہ مجھے اس کا حق ہے بلکہ میں علماء حق کی زبان پر جاری شدہ قانونِ الٰہی

کی اطاعت پر مجبور ہو جانے کی دعوت دے رہا ہوں۔ اس صورت میں قیادت قانونِ الٰہی کی آنکلتی ہے نہ کہ علماء کی۔ مگر چونکہ قانونِ علماء کی ہی زبان سے مسموع ہوتا ہے اور کتابِ الٰہی کی صحیح ترجمانی وہی کر سکتے ہیں اس لئے ضمناً ان کی اطاعت و قیادت بھی نکل آتی ہے مگر نہ بالذات بلکہ بالغیر۔

ساتھ ہی تعصب کا الزام دینے والے اس پر بھی غور کریں کہ علماء کا کوئی مخصوص خاندان یا قبیلہ نہیں کہ دوسرے قبائل کو ان کی طرف جھکنے پر مجبور کیا جائے۔ علمِ الٰہی کا دروازہ ہر مسلمان کے لئے کھلا ہوا ہے اور ہر مسلمان ہر وقت عالمِ دین بن سکتا ہے پس اگر کسی غیر عالم کو کسی عالم کی اطاعت سے عار آئے تو اس کا علاج یہ نہیں کہ قانونِ الٰہی کو رد کرنے لگے بلکہ یہ ہے کہ خود عالم بن کر قائدوں کی جماعت میں شامل ہو جائے اور قانونِ حق کی اطاعت کر کے دوسروں سے اطاعت کرائے مگر بہر صورت مسلمان رہتے ہوئے قوانینِ الٰہی کی اطاعت کرنا ناگزیر ہے۔ خواہ عالم ہو یا غیر عالم۔

پس جہاں میں غیر علماء کو پابندی قانونِ الٰہی کی دعوت دے رہا ہوں وہیں وہ دعوت علماء کے لئے بھی ہے۔ اس لئے تعصب کا الزام بے معنیٰ ہو گا۔

ترجمانِ رسالت حاملِ معرفت ہونا چاہئے

(۱۵) یہاں سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جب موسیٰ وہارون علیہما السلام **بفحوائے** :

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّکَ

"ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں"

فرعون کے سامنے بحیثیتِ رسول کے پیش ہوئے نہ کہ بحیثیتِ اسرائیلی ہونے کے اور رسول مربیِّ مخاطبین اور ناصحِ اقوام ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اپنی قوم کی گلوخلاصی چاہتا ہے۔ اسی طرح مخاطب اقوام کی بہبود وفلاح کی فکر بھی ہمہ روانہ کرتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام جس طرح بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھڑانے کے لئے فرعون کے پاس گئے اسی طرح خود فرعون اور فرعونیوں کی اصلاح و بہبود بھی ان کے پیش نظر تھی کیونکہ رسول کے معنیٰ ہی مربیِّ خلائق اور ناصحِ مشفق کے ہیں تو اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہوا کہ مسلمانوں کے جو قائد بحیثیتِ ترجمانِ رسالت حکومت کے سامنے پہنچے وہ صرف اپنی قوم کی گلوخلاصی پیش نظر نہ رکھیں بلکہ حکمران قوم کی اصلاح و بہبود بھی ان کے سامنے رہے اور وہ جس طرح پیغامِ الٰہی کے واسطے سے وہاں پہنچیں اسی طرح اس پیغامِ الٰہی سے خود اس قوم کو بھی آشنا اور متاثر بنانے کی فکر کریں وہ صفائی سے مگر بحکمت یہ کہیں کہ ہم جس اسلام کو اور اس کے واسطہ سے مسلم قوم کو آزاد کرانے آئے ہیں، اسی اسلام کا تحفہ خود تمہارے لئے بھی لے کر آئے ہیں۔ مغلوب کا محارب کی صورت سے سامنے آنا اور اثر رکھتا ہے اور اپنی خیر جوئی کے ساتھ مقابل کی اصلاح کا پرواز اختیار کرنا اور اثر رکھتا ہے۔

آج کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ حکمران قوم تک محکوم قوم کے پیغامات اور مطالبے یا پہنچتے ہی نہیں یا پہنچتے ہیں تو کورے سیاسی رنگ میں پہنچتے ہیں اور وہ سیاسی رنگ بھی خود حکمران قوم کا ہوتا ہے جس سے حکمرانوں پر ان مطالبات کی اصلی دینی حیثیت واضح ہی نہیں ہوتی اور کسی درجہ میں ہوتی بھی ہے تو صرف ادعاء کے رنگ میں نہ کہ کیفیت اور حال کے درجہ میں یا کم از کم استدلال کے درجہ میں جو انہیں اس حیثیت میں متاثر کر سکے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مطالبات پہنچانے والے جو مسلمانوں کی نمائندگی کا فخر اپنے قلوب میں محسوس کرتے ہیں نہ خود دین سے واقف ہوتے ہیں نہ دین کا کوئی رنگ اور حال و کیفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔

اس لئے مسلم قوم کے اصلی مزاج اور اُفتادِ طبع کے مطابق وہ پیغام پہنچانے پر قادر ہی نہیں ہوتے بلکہ جیسے اور مختلف اقوام کی سیاسی پارٹیوں کے مطالبات رسمی طور پر حکومت کے کانوں تک پہنچتے رہتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کے مطالبات بھی قومی اور سیاسی رنگ میں انگریزیت کے ساتھ انگریز کے سامنے آجاتے ہیں جن میں کوئی حقیقی اسلامی روح نہیں ہوتی جو دوسروں کو متأثر کرے۔

پس جو لوگ حکومت کے کانوں تک قوم کا پیغام لے کر جاتے ہیں وہ دین سے ناآشنا اور انگریز سے اس کی زبان میں بات چیت کرنے کے عادی اور ادھر جو لوگ دین سے واقف اور اس کا رنگ ڈھنگ لئے ہوئے ہیں وہ انگریز کی زبان اور اس کی ذہنیت سے ناواقف پھر اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ دونوں طبقے ایک دوسرے سے بعید اور الگ تھلگ جن میں باہم کوئی سنگم نہیں بلکہ ہے تو بے اعتمادی باہمی ہے اور اسے بھی بڑھاتے رہنے کی کوششیں اپنوں اور اغیار کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں نہ کہ کم کرنے کی۔ ادھر ایسے جامع افراد مفقود ہیں جو دونوں رخوں کی پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اس لئے نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا صحیح پیغام اپنے اصلی رنگ میں مُدّعیانِ حکومت کے سامنے نہیں پہنچتا۔

طرزِ نبوّت اپنانے کی ضرورت

ہاں ان سب کا نعم البدل یہ ہے کہ علماء میں سے صرف وہ افراد جو عالِم باللہ اور عالم بامرِ اللہ یعنی عارف ہوں روحانیت سے بھرپور ہوں' باخدا ہوں۔ اس پیغام کو لے کر اٹھیں اور اپنے مخلصانہ اور بے غرضانہ رنگ میں بطرزِ انبیاء اس پیغام کو اپنوں اور متسلّطہ اقوام کے دلوں میں اُتارنے کا عزم باندھ لیں اور عامّہ علماء ان کے نقشِ قدم پر چلیں تو پھر وہ جس زبان میں بھی کہیں گے تأثیر نمایاں ہوگی۔ دل معترف ہوں گے۔ خواہ زبانیں اعتراف کریں یا نہ کریں ؎

پارسی گو گرچہ تازی خوشتر است
عشق راخود صد زبانِ دیگر است

بوئے او دلبر چو پرّاں مے شود
ایں زباں ہا جملہ حیراں می شود

پس اگر صحابہؓ کی طرح عُرفاء اس میدان میں آجائیں اور استدلال کے بجائے حال سے کام لیں' رسمیات کے بجائے حقائق استعمال میں آنے لگیں اور رسمی لوگ ان کی پیروی کریں۔ تو زبانوں اور ذہنیتوں کی بحثیں ہی درمیان سے اُٹھ جائیں گی' لیکن یہ ضروری ہے کہ اس صورت میں تحریکات کا قالب اور ڈھانچہ کچھ بدل جائے گا اور روح بھی اس میں اسی کے مناسب پیدا ہو جائے گی اور پھر انداز حضرات صحابہؓ کی مساعی کا ہو جائے گا جس میں جذب و کشش باہمی بھی پیدا ہوگی اور دشمنوں پر ہیبت بھی پڑے گی۔

بہرحال جب تک کسی اسلامی تحریک میں تبلیغی رنگ اور ناصحانہ و رحیمانہ انداز نہ ہو اور دین کو آگے بڑا کر رسمیانہ انداز مغلوب نہ کیا جائے' اسلامی رنگ کا نتیجہ نہیں نکل سکتا مگر صد حسرت کہ یا اب ایسے افراد عنقا ہیں یا سامنے نہیں ہیں یا ان کی پرسش نہیں ہے۔

قوت کے گھمنڈ میں جائز مطالبات تسلیم نہ کرنے والوں کا انجام

(۱۶) پھر اس پیغام اور مطالبہ کا ابلاغ کیا ایک آدھ دفعہ کافی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے اس تبلیغ میں برسہا برس گزارے اور مختلف اندازوں سے مدّعا سمجھایا اور واضح کیا۔ اسے ثابت کر کے خدا کی طرف سے اتمامِ حجت کیا اس مستمر اور مسلسل مطالبہ و تبلیغ کا اثر یہ ہوا کہ حق مختلف جہتوں سے واضح ہو گیا۔ منکر فرعون اور فرعونیوں پر خدا کی حجت تمام ہوتی گئی اور بالآخر پھر بھی اس کے انکار و جحود پر خدا کی طرف سے تنبیہات اور عذابوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ قحط سالیاں اور مال و دولت وغیرہ کی تباہیوں نے فرعون پر یہ واضح بھی کر دیا کہ یہ ساری بلائیں ان شرعی اور خدائی مطالبات نہ ماننے ہی سے نازل ہو رہی ہیں۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے وقتاً فوقتاً اعترافِ قصور کر کے فرعون دعا اور معافی کا طالب بھی ہوا مگر ساتھ ہی چرچل کی پوالیسی پر جما رہا اور سارے ہی مطالبے ٹھکرا دیئے جس سے موسیٰ اور موسویوں کے صبر و استقلال میں کوئی فرق نہ پڑا اور ان کی مظلومیت سورج سے زیادہ نمایاں ہو گئی۔ آخر کار قبطیوں اور سبطیوں دونوں کے اعمال کے مطابق نتائج دونوں کے سامنے آگئے ضعیف قوم غلامی سے رہا ہو کر برسر اقتدار آئی اور قوی قوم غلامیٔ نفس میں گرفتار ہو کر دنیا و آخرت کے مصائب کا شکار ہوئی۔ قرآن حکیم نے اس سلسلہ کے واقعات کا جو جامع نقشہ کھینچا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے اور ترجمہ غور سے دیکھئے جو درحقیقت حاصل مطلب اور مختصر سی تفسیر ہے۔ ارشادِ ربّانی ہے:

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ○ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

”اور ہم نے فرعون والوں کو مبتلا کیا قحط سالی میں اور پھلوں کی کم پیداواری میں تاکہ وہ سمجھ جائیں۔ سو جب ان پر خوشحالی آجاتی تو کہتے یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے اور اگر ان کو کوئی بدحالی پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے، یاد رکھو ان کی نحوست اللہ کے علم میں ہے لیکن ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے تھے اور یوں کہتے تھے کہ کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ ہم پر جادو چلاؤ جب بھی ہم تمہاری بات ماننے والے نہیں“۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِیْنَ۔

”تو پھر ہم نے (کثرتِ بارش کا) طوفان بھیجا (اس سے گھبرا کے موسیٰ سے فرعونیوں نے عہد و پیمان کیا مگر طوفان کھلنے پر پھر اسی انکار پر اڑے رہے تو ہم نے ان پر) ٹڈیاں مسلّط کیں جو کھیتوں کو چاٹ گئیں پھر عہد و پیمان کئے مگر یہ بلا دور ہونے پر پھر بدستور اسی سرکشی پر جمے رہے تو ہم نے لائے ہوئے غلہ میں گھن کا کیڑا پیدا کر دیا (پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور یہ بلا دور ہو کر جب مطمئن ہوئے کہ اب غلہ پیش کر کھائیں گے تو ہم نے ان

پر) مینڈک مسلط کئے (جو ہجوم کر کے کھانے اور برتنوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہونے لگا اور گھروں میں رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ پھر پینا یوں مشکل ہو گیا کہ ان کا پانی خون ہو جاتا یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے سو وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ"۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ۔

"اور جب ان پر کوئی عذاب واقع ہوتا تو یوں کہتے کہ اے موسیٰ ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے اگر آپ اس عذاب کو ہم سے اٹھا دیں تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو (آزاد کر کے) آپ کے ساتھ کر دیں گے"۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلٰى أَجَلٍ هُمْ بَالِغُوْهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۔

"پھر جب ان سے اس عذاب کو ایک وقتِ خاص تک کہ اس تک ان کو پہنچنا تھا اُٹھا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ ___ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۔

"پھر ہم نے ان سے بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا اس سبب سے کہ وہ ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے اور ہم نے ان لوگوں کو جو بالکل کمزور شمار کئے جاتے تھے اس زمین کے پورب پچھم کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ___ ان کے صبر (یعنی مصائب سے نہ گھبرانے اور احکامِ نبوت پر جمے رہنے) کی وجہ سے پورا ہو گیا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا"۔

فرعون اور بنی اسرائیل کے معاملات کا یہ قرآنی نقشہ سامنے رکھئے پھر برطانیہ اور ہندوستان کے کمزور غلاموں کے باہمی معاملات پر غور کیجئے۔ جس درجہ میں انہوں نے غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے میں مطالبات اور احتجاج سے کام لیا گو کہ وہ عشر عشیر بھی ابھی تک زیر عمل نہیں آیا اور نہ ہی کچھ پورے صحیح اُسلوب پر پیش کیا گیا تاہم جس حد تک بھی کیا اور اس میں قید و بند کی مصائب کو جھیل کر صبر و استقلال سے کام لیا گیا۔ اسی حد تک ظالم قوم پر حجت قائم ہو کر خدا کی طرف سے تنبیہات اور ظالم قوم کی طرف سے تھوڑا بہت مڑ مڑ کر دیکھنے اور کبھی کبھی جھک جانے کا ظہور ہوتا رہا گو ساتھ میں انکار و جحود بھی بدستور قائم رہا۔

گزشتہ جنگِ عظیم اور موجودہ جنگِ اعظم تنبیہات کا ایک سلسلہ اپنے اندر رکھتی ہیں۔ موجود جنگ کے ذریعہ فرعونی دور کی طرح حکمران قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں اور صنعت گاہوں کو وقتاً فوقتاً تباہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کی اونچی اونچی سربفلک عمارتیں زمین بوس بھی کی گئی ہیں۔

ان کے لاکھوں بڑوں اور چھوٹوں کو دریا برد بھی کیا گیا اس سلسلہ میں جب کبھی شکست کا رخ سامنے آتا ہے تو یہ قوم فوراً مڑ کر غلام ہندوستان کی طرف دیکھنے بھی لگتی ہے اور دفع الوقتی کے طور پر کچھ پارلیمنٹری پارٹیاں آزادی ہند کا مسئلہ بھی چھیڑ دیتی ہیں۔ ہندوستانیوں کی ہمدردی بھی حاصل کی جانے لگتی ہے۔ کبھی کرپس صاحب نمائشی آزادی کا کھلونا بھی لے کر ہندوستان کی طرف دوڑنے لگتے ہیں۔ کبھی سیاسی اسیروں کی رہائی کا مسئلہ بھی زیر غور آجاتا ہے۔ کبھی ہندوستان کو طفل تسلّی دینے کے لئے انہیں اختتام جنگ پر کسی حد تک نام کی آزادی کے وعدے بھی دے دیئے جاتے ہیں لیکن جوں ہی شکست کا پہلو کمزور ہو کر فتح مندی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو پھر وہ سارے عہد و پیمان سارے رجوع ایسے کافور ہو جاتے ہیں کہ گویا کسی زبان و قلم پر کبھی آئے ہی نہ تھے اور وہی ایک چرچلی رَٹ اور ہٹ سامنے رہ جاتی ہے۔ یعنی جب عذاب سامنے آتا ہے تو فرعونیوں کی طرح مظلوموں کی طرف دیکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ :

وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ

"ہم عنقریب آزادی دینے والے ہیں"۔

اور جب وہ ایک تھوڑی سی مدّت کے لئے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور یہ قوم اطمینان کا سانس لیتی ہے تو اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ پھر وہی عہد شکنی اور الغاءِ مواعید۔ لیکن اس لَیْتَ و لَعَلَّ اور ان حقیقت پوشیوں سے خدا کا آخری انتقام ٹلنے والا نہیں ہے۔ ضرور بالضرور یہ ہو کر رہے گا کہ جو لوگ کمزور شمار کئے جا رہے ہیں انہی کو اس زمین کے پورب اور پچھم کا مالک بنایا جائے گا۔ مکمل آزادی ظاہر ہو کر رہے گی اور جو قوت پر گھمنڈ کر کے کسی مطالبہ پر غور نہیں کرتے ان کے ساختہ پرداختہ کارخانۂ کلیہ درہم برہم ہوں گے۔ ان کی اونچی اونچی بلڈ نگیں سرنگوں ہو کر رہیں گی اور خدا کا نیک وعدہ کمزور اقوام کے حق میں پورا ہو کر رہے گا ___ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى

بشرطیکہ ان اقوام نے اُسوۂ موسوی اور اُسوۂ محمدی سے روگردانی نہ کی۔

جُہدِ مسلسل سے ہی نتائج یقینی بنتے ہیں

اور وہ یہی کہ خدا کے بھروسہ پر اور اس کے بتائے ہوئے رنگ ڈھنگ پر تبلیغ واحتجاج اور اظہار مطالبات میں ایک آدھ دفعہ پر قناعت نہ کی جائے بلکہ موسوی انداز پر تسلسل کے ساتھ یہ مساعی زور اور ہمتِ باطنی کے ساتھ جاری رکھی جائیں۔ غرض تبلیغ پیغام میں اگر تسلسل اور دوام پیدا ہو جائے اور مطالبات کا زور بندھا رہے ادھر اپنی قوم کی تعمیر بھی ممکنہ حد تک ہوتی رہے تو قدرتی طور پر اتمامِ حجت اور فیصلہ کن نتائج کی ایسی صورتیں سامنے آجائیں گی جن کا فی الحال بظاہر اسباب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ

میں یہ نہیں کہتا کہ علمائے حقّانی کے بتلائے ہوئے قرآنی پروگرام پر چلنے سے پہلے ہی دن کامیابی سامنے جائے گی یا ساری مشکلات اگلے ہی دن ختم ہو جائیں گی یا مشاق و متاعب سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس پر صبر و استقلال کے ساتھ جم جانے سے غیبی امداد ساتھ ہوگی اور نتائج یقینی اور قطعی ہوں گے۔ اُسوۂ موسوی میں اس حقیقت کو بھی دیکھئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا :

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ

مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔

"موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ خدا کا سہارا رکھو اور مستقل رہو۔ یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک بنادیں اپنے بندوں میں سے اور آخیر کامیابی انہی کو ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہیں"۔

اس پر قوم موسیٰ نے ذرا گھبرا کر بے صبری سے کہا جیسے آج بھی کمزور دل کے انسان کہنے لگتے ہیں :

قَالُوْا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا۔

"قوم کے لوگ کہنے لگے کہ ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (یعنی آپ کی پیروی سے آخر نتیجہ کیا نکلا؟ غلامی بھی بدستور باقی ہے اور فرعونی چیرہ دستیاں بھی)"۔

تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا :

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ۔

"موسیٰ نے فرمایا بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کریں گے اور بجائے ان کے تم کو اس سرزمین کا مالک بنادیں گے۔ پھر تمہارا طرز عمل دیکھیں گے یعنی ایسے کاموں میں جلدبازی نہ چاہئے کام کئے جاؤ اور غیبی لطائف کے منتظر رہو"۔

پس آج بھی بنی اسرائیل کی طرح پیروی نبوّت کے سلسلہ میں ابلاغ عام اور مسلسل مطالبات اور ضروری جدّوجہد کی طویل مدّت سے نہ گھبرانا مناسب ہے نہ تبلیغ کے تسلسل میں سستی دکھانا مفید وعدۂ الٰہی پر بھروسہ اور اس کے جوارح کی حیثیت سے جنگِ آزادی میں حصہ لینا اور لیتے رہنا اور دینی انداز میں آگے بڑھنا اپنی قوم کی گلو خلاصی کے ساتھ مقابل قوم کو خدا کا سچا پیغام مؤثر پیرایوں میں پہنچاتے رہنا ہی اصل مشن ہے۔ جس پر وعدۂ الٰہی کے مطابق کامیابی یقینی ہے۔

دینی پیشواؤں کی قیادت میں آکر اگلے ہی دن کہنے لگنا کہ :

اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا۔

"آپ کی رہنمائی سے قبل بھی یہی مصائب تھیں اور آپ کی رہنمائی کے بعد بھی ان میں کچھ فرق نہ پڑا"۔

منشاءِ نبوّت کے بھی خلاف ہے اور فطری اُسوۂ حسنہ (صبرواستقلال) کے بھی خلاف ہے پس خدا پر بھروسہ کرکے اور رسمیات سے گزر کر حقائق کا دامن سنبھالتے ہوئے احتجاج تبلیغی اُسوہ اور تسلسل تبلیغ کی ضرورت ہے تاکہ اُمّتِ اسلامیہ کا پیغام ہر کان میں گونج اُٹھے اور گونجتا رہے۔

مُطالبۂ آزادی کے ساتھ تبلیغ کی ضرورت

آج ہم تبلیغی سلسلوں میں اگر سوچتے بھی ہیں تو صرف اسی حد تک کہ اپنی قوم کو تبلیغ مسائل کرکے اس کی اصلاح کی فکر کریں اور بلاشبہ یہ بھی اہم فرائض میں سے ہے یا کوئی اونچا قدم اٹھاتے ہیں تو یہ کہ یورپ وامریکہ میں ہمارے مبلغ پہنچنے چاہئیں اور کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بھی مضائقہ نہیں لیکن کیا ہمیں یہ سوچنے

کی ضرورت نہیں کہ سارے یورپ وامریکہ کا خلاصہ جو ہندوستان اور اس کی اقوام کو جونک بن کر چوس رہا ہے اور دیمک کی طرح چاٹ گیا ہے۔ ہماری بدبختی سے ہندوستان ہی کے تختہ پر جمع ہے کیا وہ اس کا مستحق نہیں کہ اس کے کان حقیقی انسانیت کے پیغام سے آشنا کئے جائیں تاکہ وہ خود بھی اس انسان نما حیوانیت کے دَلدَل سے باہر آئے اور اسی کے واسطے سے پھر پورا یورپ وامریکہ بھی متأثر ہو۔ کیا آج ہمیں ضرورت نہیں کہ جس اسلام کو ہم دنیا کا جامع ترین قانون سمجھتے ہیں اور جسے ہم محض دیانتی دین ہی نہیں بلکہ سیاسی دین بھی جانتے ہیں ہم اسی شدومد سے اسے آج کی سیاست کے بنائے ہوئے اڈوں تک بھی پہنچائیں اور ڈپلومیٹک دماغوں میں بھی اسے اتارنے کی کوشش کریں جنہوں نے دنیا کو فطری سیاست سے ہٹا کر عیاری اور فریب بازیوں کی مصنوعی اور مہلک سیاست کے کیچڑ میں پھانس دیا ہے؟

ضرورت ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں جہاں اپنی قوم کو سیاسی ابھار دیں اور سیاسی جمود و تعطل کو دور کرنے کی فکر کریں وہیں ایک مستقل مِشن اور مقصد کی حیثیت سے ان کا دائرہ عمل یہ بھی ہو کہ قوم کے قابل افراد کرسی حکومت پر بیٹھنے والوں کے کانوں کا نہ صرف مطالبۂ آزادی ہی سے بلکہ اس خدائی قانون سے بھی آشنا کرتے رہیں۔ یعنی تبلیغ دین بھی کریں اور نہ صرف دس بیس دن بلکہ مطالبۂ آزادی اور احتجاج کے تسلسل کے ساتھ یہ پیغام رسانی بھی اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ان مطالبوں کے نتائج خاطر خواہ بر آمد نہ ہو جائیں۔

اگر مثلاً دس پانچ برس مسلسل طریق پر اسلام کے قانونی اور سیاسی پہلو اس کے ساتھ دینی وروحانی پیغام اخلاقی رنگ میں ان کے ذہنوں میں ڈالے جاتے رہے اور اس تسلسل تبلیغ کے طبعی اثر سے دیانتدارانہ طور پر یہ سمجھ جائیں کہ امنِ عالم کا راز اسی قانونِ الٰہی کے اجراء میں مخفی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خود حکمران قوم کے بہت سے فہیم افراد دل سے ہمارے ہمنوا بن جائیں؟

اور پھر وہ کام جو حکومت سے باہر رہ کر ہم انجام دے رہے تھے خود حکومت کے دفتروں سے انجام پانے لگے اور جو امور قومی پلیٹ فارم سے ہم بمشکل حکومت کے دل میں اتار سکتے تھے وہ حکومت ہی کے اپنے امور بن جائیں۔ ہاں اگر اپنی ان تھک مساعی کے باوجود پھر بھی ایسا نہ ہو یعنی فرعونی حکومت کی طرح موجودہ حکومت کا انحراف واستکبار ہی بڑھتا رہے تو پھر یہ ہو کہ اس تسلسل پیغام رسانی سے مِن اللہ اتمامِ حجت ہو کر ایسی غیبی صورتیں نمودار ہوں کہ یہ قوم یا جھک جائے یا اس کا کروفریک لختِ خاک میں مل جائے اور وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جائے اور اس وعدۂ الٰہی کا ظہور ہو جائے کہ :

فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (سورۂ روم)

"سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکب جرائم ہوئے تھے اور ایمان والوں کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا"۔

لیکن یہ منصوبہ صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ترجمانِ ملت خود دینی اور اخلاقی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ ان کے کردار اور رفتار و گفتار نیز وضع وقطع وغیرہ سے بندگی کے آثار نمایاں ہوں۔ چہروں پر قلبی صداقت چمک رہی ہو اور زبان پر کلماتِ حق وحکمت جاری ہوں۔ وہ اپنے ظاہر سے فرشی ہوں اور باطن سے عرشی ہوں اور پھر ان کا دیا ہوا پیام سیاسی اُتار چڑھاؤ ڈپلومیسی اور قول کے خلاف قلب کے مخفی اغراض لئے ہوئے ہونے کے بجائے واضح صداقت وحقانیت اور دیانت وللّٰہیت کا نشان لئے ہوئے ہو جس میں واقعی طور پر اپنی اور ساری اقوام عالم کی سچی خیر خواہی ملحوظ خاطر ہو جیسا کہ اُسوۂ موسوی سے ابھی واضح ہو چکا ہے کہ

فرعون اور فرعونیوں کے پاس حصولِ آزادی کے لئے بھی جارہے ہیں اور ساتھ ہی کمال روحانیت وتقدّس کے ساتھ پیغام الٰہی خود فرعون کو بھی پہنچارہے ہیں اور اسے ربوبیتِ الٰہی سے آشنا بنارہے ہیں اس کے دلائل ذکر فرمارہے ہیں کہ :

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۔

رسالت کی حقیقت سمجھارہے ہیں۔ پھر فرعون سے شفقت فرمارہے ہیں اور دلی خیرخواہی سے فرمارہے ہیں جس میں کسی رسمیت اور ضابطہ پری کا ادنیٰ شائبہ نہیں۔

فرعونانِ وقت کو قیادتِ موسوی ہی شکست دے سکتی ہے

پھر عنوان بیان میں کوئی ادنیٰ جابرانہ یا تحکمانہ انداز نہیں کہ :

هَلْ لَّکَ اِلٰٓی اَنْ تَزَکّٰی ۝ وَاَهْدِیَکَ اِلٰی رَبِّکَ فَتَخْشٰی ۔

"کیا تجھ کو اس کی خواہش ہے کہ تو درست ہوجائے اور میں تجھ کو تیرے رب کی طرف راہنمائی کروں تو تو ڈرنے لگے؟"۔

ظاہر ہے کہ اس صاف وصریح اور مقدّس طریق خطاب کا جو اُسوۂ موسوی، اُسوۂ محمدی اور اسوۂ جمیع انبیاء وناںبانِ نبوّت ہے جو قدرتی اثر عام صلاحیت مند قلوب پر پڑسکتا ہے وہ ہمارے سیاسی اُتار چڑھاؤ کا کبھی نہیں پڑسکتا کہ ان رسمی طریقوں میں دشمن ہم سے زیادہ ماہر اور زیادہ سے زیادہ چالاک واقع ہوا ہے چنانچہ ارشاد نبوی ہے :

انکم لن تسعوهم باموالکم ولکن تسعوهم باخلاقکم۔

"تم اقوام دنیا پر اپنے مالوں (یعنی مادی وسائل) سے غالب نہیں آسکتے البتہ اپنے اخلاق (یعنی معنویت) سے غالب آسکتے ہو"۔

پس ایک شخص کی رائے یا ایک جماعت کی پاس کردہ تجویز پھر انفرادی واجتماعی ڈپلومیسی زیر بحث لائی جاسکتی ہے لیکن خدائی پیغام میں جو صاف وصریح ہو آسانی اور معقولیت سے کوئی بحث پیدا نہیں کی جاسکتی۔ آراء وقیاسات کے اختراع کردہ پروگراموں کے سلسلہ میں ایسے سرکاری افراد کھڑے کئے جاسکتے ہیں جو ان تجاویز میں بحثیں اٹھانے، انہیں رلانے کے لئے اپنی دماغی قابلیتیں جو اسی دن کے لئے ان میں پیدا کی جاتی ہیں صرف کریں یا ان کے خلاف مطالبات لے آئیں تاکہ حکومت کو گریز کے لئے سہارا مل جائے لیکن مذہب کے صاف وصریح پیغام کا جب کہ وہ ہمہ گیر اصلاحی رنگ اور روحانیت لئے ہوئے ہو ان رسمی افراد سے معارضہ کرایا جانا آسانی سے ممکن نہیں۔

ہاں اس صورت میں یہ ضرور ممکن ہے کہ استبدادی شان سے سرے سے پیغام ہی رد کردیا جائے اور فرعون کی طرح موسیٰ صفت افراد کو یہ کہہ کر سامنے سے ہٹادیا جائے کہ :

وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْکٰذِبِیْنَ ۔

"میں تو موسیٰ کو جھوٹا سمجھتا ہوں"۔

یا فرعون کی طرح یہ کہہ کر آزادی خواہوں کو دھمکادیا جائے کہ :

لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ ۔

"ہم تمہیں جیل بھیج دیں گے"۔

یا یوں کہہ دیا جائے کہ :

وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِىْ جُذُوْعِ النَّخْلِ۔

"تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر پھانسی لگوا دیں گے"۔

یا یہ دھمکی دی جائے کہ :

سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ۔

"ہم ابھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے کیونکہ ہم کو ہر طرح کا غلبہ حاصل ہے"۔

یہ سب کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا اور کیا گیا لیکن حقیقی حجت کو حجت سے رد نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس صورت سے پیغام کی جڑیں اور مضبوط ہوتی ہیں اور مخاطب قوم کی جڑیں غیر محسوس طریق پر کھوکھلی ہوتی رہتی ہیں۔

چنانچہ فرعون نے اگر مذکورہ دھمکیاں دیں تو اس سے خدائی پیغام یا پیغام لے جانے والے کا سر کب نیچا ہوا؟ بلکہ یہ ساری شکست و مغلوبیت آخر کار اسی فرعون کے حصہ میں آئی جو قہر و غلبہ کا دعوے دار تھا۔

پس اگر آج بھی اُمتِ اسلامیہ کا پیغام اسی کے قائد موسیٰ صفت بن کر فرعونانِ وقت کے پاس لے جائیں اور لے جاتے رہیں تو یہ ممکن ہے کہ انہیں جیل، پھانسی، قتل وغیرہ کی دھمکیاں دی جائیں لیکن اس سے خدائی پیغام اور پیغام بروں کا سر نہیں نیچا ہو سکتا اور نہ پیغام میں کوئی معقول حجت نکالی جا سکتی ہے بلکہ یہ امت کی جیت اور ان کے دشمنوں کی کلی ہار ہوگی جس سے غیبی نتائج کا برملا ظہور ہوگا اور یہ حقیقت کھل جائے گی کہ :

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ۔

"پس حق ظاہر ہو گیا اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا سب اکارت گیا پس وہ لوگ ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے"۔

خلاصہ یہ کہ عدمِ تشدد کی جنگ کے سلسلہ میں سب سے بڑا ہتھیار مطالبہ آزادی کے ساتھ مخاطب قوم کو پیغامِ حق مسلسل طریق پر پہنچاتے رہنا اور مقابل کی بھبکیوں سے اور ہم چشموں کے استہزاء و تمسخر سے بے نیاز ہو کر نبوی رنگ میں ہدایت دیتے رہنا ہے جس کے نتائج قطعی موعودۂ حق ہیں اور ساتھ ہی نصرتِ غیبی یقینی ہے۔

اسلام میں آزادی کی غرض وغایت

بہر حال موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کو رسولِ الٰہی بتلا کر تعارف کرانے اور اپنی پوزیشن واضح کر دینے کے بعد فرعون کو اوّلین پیغام یہ پہنچایا کہ :

فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ۔

"(اے فرعون) بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ کر دے۔ انہیں آزادی کر دے اور انہیں مت ستا"۔

(۱۷) اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام کی محکوم قوم کو حکمران قوم کے سامنے مکمل آزادی کا مطالبہ پیش کرنا اور غلامی کے بدترین عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا فرض ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کے لئے ہی اللہ نے ایک اُولوالعزم پیغمبر کو مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے فرعون کے بھرے دربار میں

پیچ کر یہ مطالبہ صاف و صریح الفاظ میں پیش کیا جیسا اس کی تفصیل عرض کی جا چکی ہے۔

(۱۸) اس موقع پر ایک نکتہ اور سمجھ لینا چاہئے اور وہ یہ کہ اس قومی استخلاص یعنی بنی اسرائیل کے آزاد کرانے کی غرض کوئی وطنی یا قومیت کی آزادی نہ تھی بلکہ مذہب کی آزادی تھی قوم کو بھی آزاد کراتا تھا تو مذہب ہی کی آزادی کے لئے بالفاظِ دیگر اس آزادی سے کوئی دنیوی ترفہ یا لذائذِ دنیا کی تحصیل و تکمیل یا کسی قسم کا رسمی جاہ و منصب مقصود نہ تھا کیونکہ اوّل تو حصول آزادی کے لئے پیغمبر کا انتخاب کیا گیا اور ظاہر ہے کہ پیغمبر سراپا دین ہوتا ہے اس کے افعال بھی دین اور ان کی غرض و غایت بھی دین۔ اس لئے پیغمبر کا آزادی مانگنا دنیوی اغراض کی خاطر قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ اس کو عنوان آیت سے یوں سمجھئے کہ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ___ میں ارسال بنی اسرائیل کو دعوائے رسالت پر بذریعۂ فا کے متفرع فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ میں پیغمبر ہوں اس لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتا ہوں اس سے واضح ہوا کہ مطالبۂ آزادی کا منشاء پیغمبری ہے اور ظاہر ہے کہ دنیوی آزادی یعنی آزاد ہو کر متاعِ دنیا سے آزادانہ انتفاع خطوطِ دنیا کی ہوسناکیاں، تعیش اور ترفہ وغیرہ کی آزادی پیغمبری کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اس لئے پیغمبر ایسی آزادی کا مطالبہ بھی نہیں کر سکتا۔

اس سے یہ مسئلہ صاف نکل آتا ہے کہ اسلام میں حصولِ آزادی کی غرض و غایت نہ روٹی ہے نہ مال و منال۔ اگر آج ہم اپنے اسٹیجوں سے روٹی اور معاشی رفاہیت کی خسیس اغراض لے کر اُٹھیں اور انہی فانی اور چند روزہ بہاروں کی کمزور بنیادوں پر اپنی مساعی کی عمارتیں کھڑی کرنے لگیں تو وہ دن دُور نہیں ہے کہ ہمیں اس بے جڑ تعمیر سے نادم ہونا پڑے گا اور ہم عیاذاً باللہ اس کے مصداق ٹھہریں گے کہ :

اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔

یہی وجہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے استخلاصِ قوم کی مساعی کا آغاز تبلیغِ دین سے شروع کیا۔ ربوبیت و رسالت کا پیچ لا کر آزادی کا مطالبہ کیا گویا غم و غصہ اس کا نہ تھا کہ ہماری دنیا آزادی نہیں بلکہ اس کا تھا کہ دین آزاد نہیں، ربوبیت و رسالت کے شعائر بلند نہیں ہیں۔ ربوبیت و رسالت کے منکر دنیا پر غالب آگئے۔ انہوں نے لادینی کا فساد دنیا میں برپا کر دیا جس سے دنیا مادّیت کی خسیس اغراض میں پڑ کر سرکشی اور بغاوت حق میں مبتلا ہو گئی۔ ادھر ان دونوں دینی بنیادوں کے ماننے والے مغلوب ہو گئے جس سے دیانت و امانت بے کس ہو گئے اور وہ دیانت کے احکام کو دنیا میں پھیلانے سے عاجز رہ گئے اور دین کے اجراء میں دست و پابستہ ہو گئے ہیں۔ پس یہ شکایت نہ تھی کہ ہماری دنیوی راحت و آرام یا روٹی اور رہائش میں فرق پڑ گیا ہے۔

ہمیں کوٹھی اور بنگلے میسّر نہیں رہے۔ ہمارے گھروں پر موٹر کاریں کھڑی ہوئی دکھلائی نہیں دیتیں یا ہم اقلیت میں ہیں اور اکثریت ہمیں فنا کر دے گی۔ یا ہماری توہین ہو رہی ہے اور عزت و جاہ دوسروں کے حصہ میں آگئی ہے بلکہ شکایت فی الحقیقت صرف دیانت کے مغلوب ہو جانے اور آزاد نہ رہنے کی تھی اور جس حد تک اکثریت کی طلب یا عزت و جاہ کی طلب یا غلبہ و اقتدار کی طلب تھی وہ بھی صرف غلبۂ دین کی خاطر تھی ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کو تو مشاغلِ دنیا کے انہماک کی وجہ سے عذابِ خداوندی سے ڈراتے اور پھر خود ہی اپنے مطالبۂ آزادی کی غرض و غایت وہی شغلِ دنیا قرار دیتے عیاذاً باللہ۔

پس موسیٰ علیہ السلام کے مطالبۂ آزادی کا حاصل یہ ہوا کہ اور فرعون! چونکہ تو خدا پرست نہیں اس لئے تیری ماتحتی میں بنی اسرائیل بھی خدا پرست نہیں رہ سکتے نہ ان کا شرعی علم باقی رہ سکتا ہے نہ ان کی روایات مذہب قائم رہ سکتی ہیں نہ ان کے عملی شعائر بلند ہو سکتے ہیں نہ ان کے مادی وسائل باقی رہ سکتے ہیں جو تقویت

دین میں استعمال ہوں۔ اس لئے بنی اسرائیل کو آزاد کر اور میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں خدا پرستی کی راہ پر پختہ کر سکوں اور تو بھی اپنے رب اور اس کے فرستادہ رسول کو پہچان اور مان۔

اس سے صاف واضح ہوا کہ مسلمانوں کے مطالبہ آزادی میں شکایت دنیا یا مصائب دنیا یا اقلیت واکثریت کی بحثیں یا روٹی اور بوٹی کے مقاصد کا دخل نہ آنا چاہئے اگر یہ باتیں آئیں بھی تو غلبۂ دین کے وسائل کی حیثیت سے نہ کہ مقاصد کے درجہ میں۔

مطالبۂ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر ہونا چاہئے

پس مسلمانانِ ہندوستان کو صاف و صریح الفاظ میں مطالبۂ آزادی مذہبی آزادی کے نام پر کرنا چاہئے ان کے نزدیک مصائب دین اہم ہونی چاہئے نہ کہ مصائب دنیا کہ وہ دینی مصائب زائل ہونے پر خود بخود زائل ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اغیار کے تسلط واقتدار کو اگر ہولناک باور کرایا ہے تو وہ دینی مصائب کی وجہ سے نہ کہ دنیوی مصائب کی بناء پر۔ چنانچہ ذیل کی دعاء نبوی میں گو اقلیت واکثریت اکرام وتوہین اور غلبہ ومغلوبیت کا ذکر ہے مگر مقصود اوّلین مصائب دین کے ازالہ کو قرار دیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہے کہ ان ساری دنیوی مصائب کو بھی اگر تکلیف دہ سمجھا ہے تو دین کی خاطر نہ کہ دنیا کی خاطر۔ ارشادِ نبوی ہے :

ربّ لاتجعل مصیبتنا فی دیننا ولا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا غایت رغبتنا ولاتسلّط علینا من لایرحمنا۔

"اے پروردگار ہمارے دین میں مصیبت نہ ڈال اور دنیا کو ہمارا اہم مقصود نہ بنا اور نہ اسے ہمارا مبلغ علم بنا (کہ اس کی مادی اکتشافات واختراعات اور دنیوی زندگی کے جوڑ توڑ ہی کو سب سے بڑا علم سمجھنے لگیں) اور نہ ہماری رغبتوں کی آخری حد دنیا کو کر اور ہم پر کسی ایسے کو مسلّط نہ فرما جو ہم پر رحم نہ کھائے"۔

اللّٰھم زدنا ولا تنقصنا واکرمنا ولاتھنّا واثرنا ولا توثر علینا۔

"اے اللہ ہماری تعداد زیادہ کر کم نہ کر ہمیں اکرام نصیب فرما' توہین سے بچا' ہمیں غالب کر مغلوب نہ کر"۔

ذیل کی حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ روٹی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور فقر وفاقہ کوئی بنیادی مصیبت نہیں اصلی مصیبت یہ ہے کہ دنیا کے دروازے کھل کر دین ضائع ہو جائے ارشادِ نبوی ہے :

واللّٰہ ما اخشی علیکم الفقر ولکن مما اخشی علیکم من بعدی زھرۃ الدنیا تفتح علیکم فتھلککم کما اھلکتھم۔

"خدا کی قسم مجھے تمہارے فقر وفاقہ کا کوئی ڈر نہیں لیکن جو چیز مجھے اپنے بعد خائف بنا رہی وہ ہے دنیا کی سرسبزیاں ہیں جو تم پر کھلیں گی اور تمہیں اس طرح ہلاک کریں گی جس طرح پچھلی اقوام کو انہوں نے ہلاک کیا (اور جیسے آج کی قوموں کو برباد کر رہی ہے)"۔

اس حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر ظاہر فرمایا جبکہ ایلاء کے موقعہ پر

آپؐ ایک ماہ تک خانہ نشین رہے ہیں اور حضرت نے حاضر ہو کر دیکھا کہ بیتِ نبوّت میں کل سامان ایک چمڑے کا مشکیزہ ہے جس میں کچھ شہد ہے اور ایک چٹائی ہے۔ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں اور اس کی تیلیاں بدن مبارک پر اکھڑ آئی ہیں تو آزردہ ہو کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ یہ قیصرو کسریٰ دشمنانِ حق تو نرم نرم گدیلوں پر آرام کریں اور اللہ کے رسولؐ کو چارپائی بھی میسّر نہ ہو۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر کشائش فرمائے تو حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو خطاب فرماتے ہوئے تنبیہ کے طور پر فرمایا:

الی شکٌ انت یا ابن الخطاب؟ ھولاء الذین عجلت لھم طیباتھم فی الحیوۃ الدنیا ولاخلاق لھم فی الاٰخرۃ (او کما قال)

"اے خطاب کے بیٹے! کیا تو ابھی تک شک میں پڑا ہوا ہے (یہ قیصرو کسریٰ) تو وہ لوگ ہیں جن کی نعمتیں دنیا ہی میں دے کر ختم کر دی گئی ہیں اور آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے (کیا یہ بھی اس قابل ہیں کہ ان پر رشک کیا جائے)۔"

اہل اللہ چونکہ وارثانِ نبوّت ہوتے ہیں اس لئے ان پر بھی انبیاء ہی کی یہ شان غالب ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کو جب مکّہ کے حرم محترم میں برطانیہ کے کارندوں نے اسیر کیا اور گرفتاری کا پروانہ دیا گیا تو فرمایا کہ الحمدللہ:

بہ مصیبتے گرفتار آمدم نہ بہ معصیتے

"خدا کا شکر ہے کہ میں مصیبت میں گرفتار ہوا نہ کہ معصیت میں"۔

جس سے واضح ہے کہ معصیت دینی مصیبت ہے اس لئے اس میں مبتلا نہ ہونے پر شکرِ الٰہی ادا فرمایا۔ اس سے نمایاں ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دنیا کی مصیبت کوئی چیز نہیں نہ وہ کوئی قابل شکایت امر ہے کہ تغیّراتِ دنیا ہیں اور منجانب اللہ بنی آدم کی ہی مصالح کے لئے بھیجی جاتی ہیں۔ کبھی ان سے کفارۂ سیات مقصود ہوتا ہے اور کبھی ترقیٔ درجات۔

اہم مصیبت دینی مصیبت ہے اور دینی مصیبتوں کا انتہائی اور جامع درجہ یہ ہے کہ دین آزاد نہ رہے اور دین دار غلامی میں مبتلا ہو کر شعائرِ دین کو آزادانہ برپا نہ کر سکیں ___ پس آج بھی جبکہ ہندوستان میں دین آزاد نہیں۔ اس کے شعائر کو مسلمان خاطر خواہ قائم نہیں کر سکتے نہ اپنے اختیار سے شعائرِ دین کو بلند کر سکتے ہیں۔ تو آیتِ بالا کی رُو سے حسبِ اُسوۂ موسوی ان کا اسلامی فرض ہے کہ مکمل آزادی کی جدوجہد کریں دین کے نام پر کریں۔ دینی رنگ میں کریں، دینی افراد کے ذریعہ کریں، عام افراد میں دین اور دین کی اہمیت کے جذبات پیدا کریں کہ مطالبۂ آزادی کی غرض و غایت ہی اسلام میں دین کی آزادی ہے۔ جس پر دنیا کی آزادی بطورِ خاصیت کے خود بخود مترتّب ہوتی ہے۔

اسلامی آزادی کے دو راستے

چنانچہ اسلام میں حصول آزادی کے دو ہی راستے ہیں۔ جہاد اور ہجرت۔ پھر ان دونوں کے دو دو فرد ہیں۔ جہاد بالسّنان یعنی اسلحہ سے جنگ کرنا اور جہاد باللّسان یعنی کلمۂ حق ظالم بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دینا۔ ایسے ہی ہجرت کے بھی دو ہی فرد ہیں۔ ایک ہجرتِ مکانی یعنی دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف منتقل ہو جانا اور دوسرے ہجرتِ ارکانی معاصی چھوڑنا اور موطن طبیعت سے منتقل ہو کر موطن شریعت میں جانا ظاہر ہے کہ ان دونوں امور جہاد اور ہجرت میں سے کسی ایک کی غرض وغایت بھی روٹی یا لذائذ دنیا یا رفاہیت و تنعّم یا

خطوطِ عاجلہ نہیں بلکہ صرف دین کی آزادی و برتری کا قیام ہے۔ جہاد کی غرض تو واضح ہی ہے کہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہے جیسا کہ کتاب و سنت کی سینکڑوں تصریحات اس بارے میں موجود ہیں۔ ہجرت بھی اس لئے نہیں کرائی گئی کہ لوگوں پر وسائل معاش تنگ ہو گئے تھے اور ان کی روٹیوں میں گھاٹا آنے لگا تھا تو انہیں دارالکفر ترک کر دینے کا حکم مِلا ہو بلکہ صرف اس لئے کہ ان کے دین پر مصیبت آنے لگی تھی۔

چنانچہ اوائلِ اسلام میں دو ہی ہجرتیں ہوئی ہیں۔ ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ۔ مگر دونوں کی غرض مشترک تحفظِ دین تھی نہ کہ تحفظِ معاش۔

چنانچہ ہجرتِ مدینہ میں چونکہ یہ غرض زیادہ عُلوِ مرتبہ کے ساتھ نمایاں ہوئی اس لئے ہجرتِ مدینہ، ہجرتِ حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ ہجرت حبشہ میں تو مہاجرین کو صرف اپنا دین محفوظ کرنا تھا اور اس کی صورت فرار عن الفِتَن کی تھی یعنی دین میں فتنہ مخل ہوتا تھا تو جائے فتنہ کو چھوڑ دیا گیا تاکہ دین محفوظ رہ جائے اور ہجرتِ مدینہ میں نصرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دین کی شوکت کا مقصد سامنے تھا یعنی محض اپنا دین بچا لے جانا مقصود نہ تھا بلکہ شوکت کے ساتھ دوسروں تک دین کی منادی اور تبلیغ کر دینا بھی مقصود تھا بلحاظ مقصد دونوں ہجرتیں محمود و مستحسن تھیں کہ محض اپنا دین محفوظ رکھ لینے کی خاطر دارالکفر کو چھوڑنا بھی عین دین ہے اور دین کو سربلند کرنا بھی دین ہے۔ لیکن پہلی صورت میں ایک حد تک اپنے ضُعف اور کمزوری کا اعلان بھی ہے جس کو براہِ راست اِعلاءِ کلمۃ اللہ نہیں کہہ سکتے اور دوسری صورت میں نصرت نبی کی خاطر گھر بار چھوڑنا ہے۔ جو بِلاواسطہ اعلاءِ دین ہے۔ اس لئے یقیناً ہجرت مدینہ ہجرتِ حبشہ سے افضل ثابت ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہجرت کا لفظ بول کر تبادر کے ساتھ علیَ الْاطلاق ہجرت مدینہ ہی سمجھی جاتی ہے کہ وہی ہجرت کا فردِ کامل ہے۔ غرض کوئی سی بھی ہجرت لے لی جائے کسی ایک کا مقصد بھی تنگی معاش سے بچنا یا مصائب دنیا سے تنگ آکر گھر چھوڑنا نہ تھا اور کسی حد تک یہ چیزیں اگر پیش نظر بھی ہوئیں تو صرف دین کی غرض سے ہوئیں اس لئے ہجرتین کا مقصد بھی آخر کار وہی اعلاء کلمۃ اللہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نے ہجرت فرماتے ہوئے اس کا کوئی افسوس ظاہر نہیں فرمایا کہ میرا آبائی وطن اور جدی گھر مجھ سے چھوٹ رہا ہے۔ عزیز و اقرباء چھوٹ رہے ہیں۔ مانوس سرزمین چھوٹ رہی ہے بلکہ بیت اللہ کو حسرت سے دیکھ کر یہ فرمایا کہ:

”اگر میری قوم مجھے وطن سے نہ نکال دیتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا“۔

جس سے واضح ہے کہ ہجرت کے سلسلہ میں نہ حضور کو وطن پیش نظر تھا نہ قبیلہ و خاندان بلکہ اللہ اور بیت اللہ مکہ کا شہر یا ملک حجاز اور قوم بھی اگر کسی درجہ میں نگاہوں کے سامنے تھی تو وہ اللہ اور ذکر اللہ یعنی دین اور اعلاءِ دین کے لئے تھی نہ کہ براہِ راست اور بالذات۔

خلاصہ یہ کہ جہاد اور ہجرت حسّی ہوں یا معنوی اور ان کا کوئی سا فرد ہو صرف اس بنا پر عمل میں آئے ہیں کہ لادین قومیں جمعہ و جماعات، تبلیغ و موعظت، اقامتِ حدود اور سدِّ ثُغور وغیرہ میں حارج ہوئیں اور دین کے سربلند ہونے میں آڑے آئیں نہ اس لئے کہ وسائل معاشی کی تنگی روٹی اور ٹکڑے کی گرانی۔ عیش و لذّت، راحت کی کمی اور اس کی تحصیل و تکمیل میں فرق آگیا تھا اور اس سے بچنا مقصود تھا۔ اگر اس سے بچنا مقصود ہوتا تو اسلام میں فقر و فاقہ اور خشونت عیش کے فضائل ہی کیوں بیان کئے جاتے۔

اس لئے آج جو جہادِ اکبر یعنی اعلاء کلمۂ حق اور کلمۂ حق عند سلطان جائر کا مقصد لے کر مسلمان کھڑے ہوں اور کھڑے ہیں تو اس میں بھی ایک لمحہ کے لئے ان کے قلوب میں شکایت معاش یا شکایت ترفہ و تنعم پیش نظر نہ رہے۔ صرف تحفّظ دین اور اعلاء کلمۂ حق ملحوظ رہنا چاہئے اور وہی ساری جد و جہد کی غرض و غایت ہو

جسے غیر مشتبہ الفاظ میں بھی واضح کردیا جائے۔ پھر ایسے ہی تدابیر کے سلسلہ میں اقلیت واکثریت یا اہانت وتکریم کا سوال پیدا نہ ہونا چاہئے یعنی ان رسمیات سے مغلوب نہ ہونا چاہئے بلکہ ان پر غالب آنا چاہئے جس انداز سے بھی ممکن ہو جیسا کہ آیت بالا کے اشارہ اور نصوص وحدیث سے واضح کردیا گیا ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی دربار میں جو کچھ بھی نیابت الٰہی میں ارشاد فرمایا وہ حجت ودلیل سے فرمایا اور اپنی رسالت پر خدا کی آیات پیش کیں یعنی معجزے دکھلائے۔ عصاء موسوی دکھلائی جو لاٹھی سے سانپ اور سانپ سے لاٹھی بن جاتی تھی۔ ید بیضا دکھلایا جو گریبان میں ڈالنے سے سورج کی طرح روشن ہو جاتا تھا اور پھر اصلی حالت پر لوٹ آتا تھا جس کی جواب دہی سے فرعون عاجز ہوا اور اس کے سوا اسے کچھ بھی جواب نہ بن پڑا کہ موسیٰ علیہ السلام پر جادوگری کا الزام لگائے۔ چنانچہ یہی کیا اور ملک کے جادوگر جمع کر کے مقابلہ کرایا۔

اور انہوں نے بھی اس لاٹھی کے سانپ کی شکل کے ہزار ہا سانپ جادو کے زور سے بنائے مگر چوں کہ ان میں حقیقت کچھ نہ تھی اس لئے جادوگر سب کے سب عاجز ہو گئے اور انہیں تسلیم ورضا کے سوا چارہ نہ رہا۔

مطالبۂ آزادی میں اعجازی حجت کی ضرورت

(۱۹) اس سے صاف ظاہر اور واضح ہوا کہ آج بھی جبکہ استخلاصِ قوم کے لئے متسلط اقوام کے حلقوں میں قائدین اسلام جائیں تو ہر دعوے کے ساتھ حجت بھی پیش کریں اور وہ بھی معجزہ کی تاکہ مخاطب قومیں اس کے ماننے پر عقلاً مجبور ہو جائیں اور جواب نہ لا سکیں۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون کے سامنے معجزۂ موسوی پیش کیا گیا تھا جو لاٹھی کا تھا اور فرعونانِ وقت کے سامنے معجزۂ محمد پیش کرنا چاہئے جو کہ قرآن کریم ہے اور تمام دلائل وبراہین کا مجموعہ ہے۔ ''تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً'' کیونکہ فرعون کا رنگ حاکمانہ تھا تو وہ لاٹھی ہی سے قائل ہو سکتا تھا اور فرعونانِ وقت کا رنگ حکیمانہ ہے تو علم وحکمت سے ہی قائل ہو سکتے ہیں۔

فرعون نے اپنے ملکی جادوگروں کو تقریب درباری' کرسی اور انعام واکرام کے وعدوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں ڈال کر عصاء موسوی کے سانپ کے ہم شبیہ لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنوائے مگر وہ محض ''تخیلاتی'' تھے۔

فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ۔

''بس یکایک ان جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں (جو سانپوں کی صورت میں) ان کی نظر بندی سے موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے چلتی دوڑتی ہوں''۔

اس لئے یہ سب کید ومکر ختم ہو گیا اور سارے سانپوں کو موسوی اژدھا نگل گیا۔ معجزہ کے سامنے سب جادوگروں نے سپریں ڈال دیں۔

بعینہٖ آج بھی یہی صورت ہوگی کہ جب فرعونانِ وقت کے سامنے معجزۂ محمدی (قرآن) کے دلائل وبراہین پیش کئے جائیں گے یا پیش کئے گئے ہیں تو انہوں نے اسی ملک کے جاہل مولویوں مگر جادو بیان لیکچراروں کو کھڑا کر دیا کہ وہ مضامین قرآن ہی کے ہم شبیہ مضامین اور اسی کے استنباطات کے مشابہ وجوہِ مستنبط پیش کر کے تلبیس ابلیس کریں جس پر ان کے لئے انعام واکرام اور ہر قسم کی سرکاری رعایتوں کے وعدے ہوتے ہیں۔ مخفی نالیوں سے اس روپیہ کا یہ گندہ پانی ان کے گھروں میں بہتا ہوا پہنچتا رہے۔ ان ائمۂ مضلین سے فرقے بنتے ہیں وہ کتاب وسنت ہی کے نام پر اہل حق کے مقابلہ پر آتے ہیں اور عصاء قرآنی کے مشابہ ہزار ہا عصیٰ

(لاٹھیاں) تخیلاتی بنا بنا کر میدان میں پھینکتے ہیں۔ ہزاروں ٹریکٹ رسالے اور تفسیریں ' قرآنی تفسیروں اور فقہیات کے مشابہ سامنے آتی ہیں۔ حتی کہ نبی قرآن کی طرح انبیاء بھی کھڑے کر دیئے جاتے ہیں جو اہل حق کو کذاب و مبطل کہہ کر اپنی گورنمنٹ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری بعثت ہی اس حکومت کی حمایت کے لئے ہوئی ہے۔ ہم اگر اس کے فضائل بیان کریں تو پچاس الماریاں بھر جائیں۔

کوئی کہتا ہے کہ قرآن میں مؤمن قانت ' متقی وغیرہ کے الفاظ کا مصداق ہی موجودہ گورنمنٹ کے افراد واجزاء ہیں۔ ان جادوگروں اور ان کی مدیان میں ڈالی ہوئی ان لاٹھیوں اور سانپوں سے جو اہل حق کے خیال میں کبھی کبھی چلتی دوڑتی دکھلائی دینے لگتی ہیں۔ مسلمانوں میں خیالات کا تشتّت اور تفرق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی دل جمعی خاک میں مل کر قوت منتشر ہو جاتی ہے اور حکمرانوں کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ حکومت کے قدم کچھ اور جم گئے۔ لیکن جب یہ ثعبان قرآنی اپنی پوری شان کے ساتھ کسی موسیٰ صفت عالم کے ہاتھ پر نمایاں ہوتا ہے تو بالآخر ان سارے سانپوں کو نگل لیتا ہے اور **فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَاكَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** کا ظہور ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی یہ جادو بیان لیکچرار گورنمنٹ سے کٹ کر حق کے سامنے سر بھی جھکا دیتے ہیں اور اعلان کر دیتے ہیں کہ ہم اب تک غلطی اور تلبیس میں پھنسے ہوئے تھے **اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى** جس سے اس قسم کی تلبیسات کا آئے دن پردہ چاک ہوتا رہتا ہے۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ آزادی خواہ طبقہ جو مطالبہ اور جو نصیحت بھی فرعونی درباروں میں پیش کرے ' سلف کے انداز میں پیش کرے۔ اس تمسک واستدلال کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہونی چاہئے کہ اس کے ہر ہر جملہ کی دلیل کتاب وسنت ہو تاکہ اس کا منجانب سرکار الٰہی ہونا ظاہر ہو جائے اور اس کی بات مذہبی سمجھی جائے جس کا کسی سے بھی نہ بن پڑے جواب دیا تو جواب کی جادوگری کا پردہ اسی آیتِ الٰہی سے چاک ہو جائے۔

پس ہمارے لئے اس میں کوئی فخر نہ ہونا چاہئے کہ ہم نے اپنی تقریر و تحریر کو عین اس سیاسی اور معاشی انداز میں پیش کیا جس انداز سے عصری سیاست کے وُکلاء اپنے مقالے پیش کرتے ہیں۔ جن کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان میں قرآن وحدیث کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہوتا نہ تنصیصاً نہ استنباطاً اور محسوس ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ مقالہ کسی طالب علم اور منہمک کتاب وسنت کا ہے کیونکہ اس کا آغاز وانجام قومیت محضۂ ' معاش ' خالص ملکی مفاد اور صرف رسمی تعاون سے ہوتا ہے بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ ہمارے اوّل و آخر اور ظاہر وباطن کی ہر ایک جُنبش صرف کتاب وسنت اور اس کے صحیح استنباط سے ہو اور یہی رنگ ہماری طرف خواص وعوام میں منسوب ہو جائے کیونکہ ان کے ہر خطاب وابلاغ ہر پیام اصلاح وتہذیب اور ہر ایک مطالبہ واحتجاج کے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ :

قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى۔

"ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے نشان لائے ہیں اور سلامتی ایسے شخص کے لئے ہے جو راہ پر چلے"۔

یعنی نہ خود آئے نہ کوئی اختراعی حجت لے کر آئے بلکہ دونوں چیزیں من اللہ ہیں اور اسی لئے صحیح وسالم وہی رہے گا جو اس رسالتِ الٰہی کی پیروی کرے گا ورنہ ہمارے ہی ہاتھ پر اس کی تباہی من اللہ نمایاں ہوگی کیونکہ :

اِنَّا قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى۔

"ہمارے پاس خدا کی طرف سے یہ حکم پہنچا ہے کہ (قہرِ خداوندی) کا عذاب اس شخص پر

ہوگا جو جھٹلاوے اور رُوگردانی کرے"۔

بہرحال موسیٰ علیہ السلام نے اس ساری پیغام رسانی میں جو منجانب اللہ اور بامراللہ تھی، اوّلین مقصد فرعون سے یہ بھی ظاہر فرمایا کہ اَرْسِلْ مَعِیَ بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج ___ اور اپنے پنجہ ظلم سے انہیں رہا کر کے انہیں آزادی دے)

ظاہر ہے کہ اس اِرسالِ بنی اسرائیل اور انہیں موسیٰ کے ساتھ بھیج دینے کا یہ مطلب نہ تھا کہ انہیں مصر سے شام بھیج دے یا ہم ملک مصر چھوڑنے کے لئے بنی اسرائیل کو تجھ سے لینے آئے ہیں بلکہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو اپنا پابند اور غلام رکھنے کے بجائے میرے ساتھ ہونے دے تاکہ وہ میرے ساتھ ہو کر جس طرح چاہیں آزادی سے زندگی بسر کر سکیں۔

اِنتخابِ امیراور تشکیلِ مرکزیت

(۲۰) اس سے واضح ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام قوم بنی اسرائیل کے اوپر سے فرعون کی اِمامت ہٹا کر رسول خدا کی امامت و امارات قائم فرمانا چاہتے تھے کیونکہ فرعونی امارت سے ان میں غیراللہ کی پرستش کے مہلک جراثیم سرایت کر جاتے اور موسوی امامت سے ان میں صرف خدائے واحد کی اطاعت و عبادت کے پاک جذبات گھر کرتے۔ تو کیا اس سے یہ مسئلہ واضح نہیں ہوتا کہ حصول آزادی کے سلسلہ میں مسلمان اپنا ایک امام اور امیر منتخب کریں جو ایک طرف تو حسبِ استطاعت اطاعتِ شریعت کے ساتھ ان کی دینی تربیت کرے ان کی اسلامی تنظیم کرے ان کے معاملات و محاکمات کو شرعی دائرہ میں رکھے اور ایک طرف دشمنانِ دین سے جائز مطالبات بھی کرے اور نہ صرف اپنے مامورین بلکہ ان ناجائز آمرین کو بھی راہ حق دکھلائے۔ ربِ اعلیٰ اور اس کی رسالتِ حقّہ سے انہیں بھی آشنا بنائے۔ اگر مسلمان فوضویّت اور لامرکزی کی زندگی بسر کرتے رہے تو نہ ان کا دینی تشتّت زائل ہوسکے گا نہ دنیوی تفرّق۔ یہ غرض نہیں کہ مسلمان اس مغلوبیت کے عالم میں خلیفۃُ المسلمین اور امیرُ المؤمنین بنائیں کہ اس کے لئے طاقت اور قہر غلبہ شرط ہے بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ ایک مرجعُ الامر تسلیم کرلیں جو ان میں دینی تشتّت اور افتراق نہ ہونے دے اور حتیٰ الاِمکان ان کو اخلاقی قوّت سے معاملاتِ شرعیّہ پر جمائے رکھے تاکہ وہ جب بھی غلبہ پائیں تو انہیں اس انقلاب کے تشویش ناک دَور میں از سرِ نو کسی نظام اور مرکزیت کی تشکیل کرنی نہ پڑے بلکہ پہلے ہی سے ان کا ایک قائم شدہ نظام کا ڈھانچہ بنا بنایا موجود ہو اور وہ اسی میں حسبِ غلبہ وطاقت، طاقت کی روح پھونک دیں۔ چنانچہ آزادی کے سلسلہ میں چونکہ خدا کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کو مصر چھوڑنا پڑا تو موسیٰ علیہ السلام کی زیرِ قیادت ان کے نظام کی تشکیل ایسی قائم شدہ موجود تھی کہ ایک اشارۂ موسوی پر چھ سات لاکھ بنی اسرائیل نے راتوں رات مصر چھوڑدیا اور صبح ہوتے ہوتے وہ بحرِ قلزم کے کنارے پر تھے۔

پھر فرعون اور فرعونیوں کے غرقابی کے بعد جب کہ بنی اسرائیل کی طاقت کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ انہیں کوئی نیا نظام بنانا نہ پڑا تھا۔ امام موسیٰ علیہ السلام تھے جن سے قوم میں مرکزیت قائم تھی اور مقتدی سارے بنی اسرائیل تھے جس سے سمع وطاعت کا نظام قائم تھا، ڈھانچہ موجود تھا۔ روح آتے ہی وہ زندہ ہوگیا اور پھر جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں موجود ہے۔

اسی طرح آج کے دَورِ غلامی میں اَشد ترین ضرورت ہے کہ حسبِ طاقت مسلمان بھی اپنے لئے کسی ایک شخصیت کو پہلے ہی سے امیر تسلیم کئے رہیں اور اس کے ذریعہ اپنی شرعی تنظیم کئے رہیں۔ آج وہ اخلاقی ہے کل

کو وہ رسمی ہو جائے گا جس میں قہر و غلبہ پیدا ہو جائے گا۔

صفاتِ قیادت

(۲۱) مگر ہاں اسی سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ امیر موسیٰ صفت ہونا چاہئے یعنی دورِ نبی کے بعد امیر و امام نائب نبی اور وارث نبی ہونا چاہئے جس میں اوصافِ نبوّت کا پورا پورا ظِلّ ہو اور ظاہر ہے کہ نبی کے بے شمار اوصافِ کمال کا خلاصہ دو چیزیں ہوتی ہیں۔

ایک علم لَدُنّی جس پر نبوّت کا مدار ہے یعنی وہ علم اکتسابی اور کتابی نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے بلاتوسّطِ اسباب القاءِ خدا ہوتا ہے جس کا چشمہ نبی کے قلب سے پھوٹتا ہے جو محسوساتی علوم کے اوہام وظنون اور شبہات سے پاک ہوتا ہے اور قطعیت ویقین کی ٹھنڈک لئے ہوئے ہوتا ہے جس سے سینے معمور ہو جاتے ہیں اور سکون وطمانیت قبول کرتے ہیں۔

دوسرے معصومیت کہ نبی کی ہر نقل وحرکت حظِّ نفس سے پاک ہوتی ہے ہر چیز اللہ کے لئے کی جاتی ہے جس میں غیر اللہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ نہ گمراہی کا شائبہ ہوتا ہے نہ ضلالت کا۔ غرض علم خدائی ہو جو اسی کے مخفی راستوں سے آیا ہو اور عمل عبدیتِ خالصہ کا ہو جس میں ضلالت نہ ہو تو یہی کمالات نبوّت کا سر منشاء ہے جس سے آگے تمام کمالات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے پس حقیقی ورثہ انبیاء جبکہ بنصِ حدیث :

العلماء ورثة الانبياء۔

"علماء وارثانِ نبی ہیں"۔

علماء ہیں تو ان سے اس قیادت وامارات کے سلسلے میں وہی علماء مراد ہو سکتے ہیں جن میں یہ دونوں باتیں حسبِ درجہ واستعداد پائی جاتی ہوں جن کا علم لَدُنّی ہو، جن میں علم کے ساتھ معرفت بھی ہو، جن کا قلب موردِ علمِ خفی ہو، وہ اسرار تشریع کے مفکّر اور مبصر ہوں اور علوم ظاہری کے ساتھ انہیں علوم باطنی سے بھی کافی مناسبت ہو، وحی کے بجائے القائے ربانی اور الہام باطنی ان کا مربّی ہو اور ساتھ ہی نبض شناس امت بھی ہوں۔ حوادث ووقائع اور مخاطبین کی ذہنیتوں پر انہیں عبور حاصل ہو اور جو مصداق ہوں حضرت عارف رومی کے اس شعر کے ؎

بینی اندر خود علومِ انبیاء
بے کتاب وبے معید اوستا

گویا مطلقاً عالِم ہونا یا کتابوں کے درس وتدریس پر قادر ہونا کافی نہیں بلکہ بایں معنیٰ ان میں وراثتِ نبوّت کی شان ہونی چاہئے کہ ان کا علم خود بینی اور تردّدات سے بالا تر ہو۔

ادھر ان علماء میں عصمت کی شان بصورت محفوظیت پائی جاتی ہو۔ تقویٰ وطہارت اور احتیاط وحزم کی وجہ سے ان کا رویّہ نہ ذاتی گمراہی کا ہو نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کا ہو وہ ضلّوا واضلّوا دونوں قسم کی ناپاکیوں سے پاک ہوں۔ پھر جبکہ ان دونوں اوصاف انکشافِ باطن اور محفوظیت کے علماء کوئی اجتماعی شان بھی پیدا کرلیں تو ان میں فی الجملہ عصمت کی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ :

لاتجتمع امتی علی الضلالة۔

"میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی (یعنی ساری امت کامل کر کسی گمراہی پر اجماع کرلینا

ناممکن ہے بلکہ ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی وہی جماعت منصور ہوگی)"۔

جس سے واضح ہے کہ اہلِ حق اور ان میں بھی علمائے حق کہ جن کی بدولت لوگ اہل حق بنتے ہیں اور ان میں بھی پھر جماعت علماء جبکہ خود ایک اجتماعی شان بھی پیدا کرلے یعنی اپنی جمعیّت بنالے وہ انشاء اللہ سب کے سب مل کر امّت کو گمراہی کی لائن پر نہیں ڈال سکتے۔

پس اس سے صاف کھل جاتا ہے کہ حقیقی معنیٰ میں نبی کا صحیح قائم مقام پوری امتِ اجابت اور اس امت میں بھی اس کی بقاء کی اصلی روح علماء ربّانی کی جماعت ہوتی ہے اور اسی کو امّت کا امام یا امیر کہنا چاہئے لیکن مرکزیت قائم کرنے کے لئے اگر یہی جماعت اپنے میں سے کسی ممتاز شخصیت کو امیر بنالے اور خود اپنے اسی محفوظ بلکہ ایک حد تک معصوم اجتماعی علم وفہم سے اس کی مشیر ومعین ہوجائے تو صحیح معنیٰ میں یہی امیر بواسطۂ جماعت نائب اور وارثِ رسول ہی کہلائے گا جو ماتحت جماعت کی اجتماعی نصرت و تفہیمات کے سبب کمالاتِ جماعت کا مجموعہ اور اس جامعیت کمالات کے سبب نبی کے ان دونوں اوصاف کمالِ باطن اور عصمت کا وارث ہوگا۔ اسے حق ہوگا کہ امت کی قیادت اور شرعی تربیت کرے اور ان کا امیر کہلائے۔

پس امّت کے لئے سہل علاج یہی ہے کہ متبصّر اور مفکّر اور تقویٰ وطہارت کے پیکر علماء ربّانی کی قیادت میں رہے اور ان کے زیر سایہ یہ اپنی شرعی زندگی بسر کرے۔

صالح قیادت سے رُوگردانی کی پاداش

یہ جماعت اگرچہ نبوّت کی سی معصومیت نہیں رکھے گی چہ جائیکہ ان میں کوئی ایک شخصیت' البتہ اس کی شانِ محفوظیت کا یہ ثمرہ قدرتی ہوگا کہ وہ جو امر بھی طے کرے حظِ نفس اور ذاتیاتی مفادات کے لئے نہ کرے بلکہ لوجہ اللہ اور مفاد مسلمین کے لئے کرے پھر بھی اگر اس کے فیصلوں میں کوئی گوشہ خطاء فکری کا نکل آئے تو مسلمانوں کے لئے کسی حالت میں بھی یہ زیبا نہ ہوگا کہ وہ اس خطاء کے سبب اس کے سارے صوابات سے محرومی اختیار کرلیں اور اصل جماعت ہی کو غیر معتبر ٹھہرا کر سرے سے اس کی قیادت ہی سے باہر آجائے بلکہ مزید برآں وقار کو زائل کرنے کے منصوبے باندھنے لگیں اور اگر چند نااہلوں میں اس بے توقیری کی مقبولیت ہوجائے تو اس پر فخر کرنے لگیں۔ نعوذ باللہ مِن ذٰلک۔

اگر وہ ایسا کرکے جماعت علماء یا ان کے منتخب کردہ صدر وامیر کی قیادت سے باہر ہوں گے تو اس کی پاداش میں ان کے لئے ناگزیر ہوگا کہ وہ جماعت جہلاء یا فُسّاق وفجار کی امارات کے تحت میں آجائیں اور اپنا رہا سہا دین بھی کھو بیٹھیں۔ پس یہ کیا کم حیرت کی بات ہوگی کہ جو لوگ کسی ایک آدھ جزیہ کی مزعومہ خطا تک کو معاف نہیں کرسکتے تھے اب انہیں اپنی خوشی سے کلیاتی خطاؤں اور عمومی فسق وفجور کی حکومت وقیادت کو بطوع و رغبت قبول کرلینا پڑے گا اور اب وہ اسی کے زیر سایہ ساری زندگی غیر شرعی طور پر بسر کرنے لگے۔

میرے خیال میں علماء صالحین کے برملا تخطیہ کی ایک کھلی سزا ہے کہ ایک ایک جزیہ میں تقویٰ وطہارت کے طالب کلّی طور پر فسق وفجور کی امامت کے نیچے جائیں اور پھر انہیں خطا وصواب کا احساس بھی باقی نہ رہے۔ اصول دانش کی رو سے ایسی جزئیاتی خطا بہتر ہے کہ جس کو ترک کرنے سے کلیاتی معاصی میں ابتلاء ہوجاتا ہو۔

پس ضروری ہے کہ امتِ اسلامیہ زیرِ قیادت صلحائے امّت وجماعت (جس کا رسمی نام جمعیّت العلماء رکھ لیا جانا کوئی مذموم بات نہیں ہے) شرعی زندگی گزارے منہیات شرع سے ہجرت کرکے مأموراتِ شرعیّہ کی

حدود میں رہے۔ جہالت رفع کرے۔ فقہ فی الدّین پیدا کرے۔ اپنے سیاسی مستقر اور حقیقی امارت کو جو علماء حقانی کا جامعہ ہو جس میں دینی رنگ کا غلبہ قوی اور وسیع سے وسیع تر کرے، جزئیات مسائل پر لڑنا جھگڑنا ترک کر کے بنیادی مقاصد میں خلل نہ ڈالے۔ عمل میں رواداری قائم کرے تو پھر حقیقی امارات وامامت قائم ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگ سکتی۔

مخلوط معاشرہ میں جمعیتِ مُسلمہ کے دو اصول

اس جامع علم و تقویٰ جماعت کے اصولاً دو کام سب سے بڑے اور سب سے اہم ہو جانے چاہئیں ایک یہ کہ کسی جماعت میں مدغم ہوئے بغیر جب مسلمانوں کے حقوق کا سوال آئے خواہ کسی بھی پلیٹ فارم سے اٹھے تو وہ ان کی غیر مشروط حمایت کرے اور نُصرت کے لئے اپنی پوری قوت عمل سے کھڑی ہو جائے اور جب آزادی ملک کا سوال اٹھے خواہ کسی غیر مسلم پلیٹ فارم ہی سے اٹھے تو اس کی غیر مشروط حمایت کرے اور اپنی پوری قوّت ادراک و عمل سے اس کو آگے بڑھائے کہ اس ملک کے تمام مادی و نفسانی امراض کی اصلی جڑ صرف غلامی ہے اور اس کی حقیقی بہبود و فلاح صرف آزادی ہے۔

اس طرزِ عمل سے اس جنگِ آزادی کے سلسلہ میں تو باہم ربط واتحاد قائم رہ سکتا ہے جو حصول آزادی کے لئے رکنِ اوّلین ہے اور غیر مسلم جماعتوں سے تصادم ونزاع قائم نہیں ہو سکتا۔ جو حصول آزادی کے لئے شرطِ اوّلین ہے اور ظاہر ہے کہ نہ رکن کی خاطر شرط سے قطع نظر کی جاسکتی ہے اور نہ شرط میں لگ کر رکن چھوڑا جاسکتا ہے۔ رسمی لفظوں میں اس حقیقت کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جمعیت العلماء کا تمام آزادی پسند مسلم جماعتوں کو اپنے سے وابستہ رکھنا بھی ضروری ہے اور نوائے آزادی میں غیر مسلم آزادی خواہ جماعتوں کا ہم نوا رہنا بھی ازبس ضروری ہے۔

غیر مُسلم سے اشتراکِ عمل

غیر مسلم جماعتوں سے اشتراکِ عمل شرعاً ممنوع یا حرام نہیں ہے جبکہ حُدودِ شرعیّہ میں ہو، آج ملکی معاملات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ہندو مسلم اشتراک عمل نہ ہو پھر ملکی آزادی جیسے عظیم مقصد میں ہندو مسلم اشتراک عمل ممنوع و حرام کیوں بن جاتا ہے۔ جب کہ ایک طرف تو ملک تمام جزوی امور میں عملاً اسی اشتراکِ عمل کی تائید میں ہے اور دوسری طرف حکومت نے بھی اس کا کھلا اعلان کر دیا ہے کہ وہ آزادی ہند کے بارے میں کسی مشترکہ اور متفقہ مطالبہ پر ہی غور کر سکتی ہے۔

تو کیا ان حالات میں شرعاً یا سیاستہً یہ چیز ناجائز یا ممنوع ٹھہر سکتی ہے کہ تمام اقوام ہند باہمی اعتماد و رَواداری کے ساتھ بیک آواز اس موجودہ شہنشاہی اور نظام حکومت سے کھلی بیزاری اور نفرت کا اعلان کرتے ہوئے ملک کی آزادی کا مطالبہ کریں اور اس سلسلہ میں اندرون حدودِ اشتراک عمل کریں اگر غیر مسلم سے اشتراک عمل ممنوع ہے تو گورنمنٹ کے ماتحت ہر سیاسی ادارہ میں ممنوع رہنا چاہئے کیونکہ اصول ہر جگہ اصول ہے۔ ہاں حدود وقیود کی ہر جگہ ضرورت ہے کہ غیر محدود عمل ہمیشہ مضرتوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

پس اس بارے میں بھی باہمی معاہدہ سے حدود عمل کی اصولی دفعات ایسی ضرور مشخص کر لی جائیں کہ ان دو قوموں میں نزاعات وہ اعتراضات کا سدِّباب ہو جائے جو آئے دن باہمی بے اعتمادی اور آپس کی سر پھٹول کا باعث ہوتا رہتا ہے اور خصوصیت سے جمعیت العلماء خدشات واعتراضات کا مورَد بنی رہتی ہے۔ پھر یہ معاہدہ

بھی دفاع اور جنگ کی حد تک ہونا چاہئے۔ تعمیری معاہدوں کے لئے آزادی کا زمانہ موزوں ہوتا ہے نہ کہ غلامی کا۔

ہمہ گیر مقصد کے حصول کا طریقِ کار

بہرحال جمعیت العلماء کو اپنے ہمہ گیر مقصد اور بلند پایہ منصب کے لحاظ سے ملک کی ہر قومی جماعت سے درجہ بدرجہ تعلق قائم رکھنا ضروری ہے۔ مسلم جماعتوں سے یگانگت واتحاد کا اور آزادی پسند غیر مسلم جماعتوں سے اشتراکِ عمل کا۔ مگر ساتھ ہی خود اپنے پروگرام اور اپنے پلیٹ فارم کا استقلال محفوظ رکھنا بھی اس کا عقلی و شرعی فریضہ ہے ایک منٹ کے لئے نہ اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ جمعیت العلماء اپنی خصوصیات فنا کر کے اپنا استقلال کھودے اور کسی دوسری مسلم یا غیر مسلم یا نیم مسلم جماعت میں مدغم یا اس کے پسرو ہونے کا دھبہ اپنے دامنِ تقدس پر لگائے اور نہ کسی حالت میں اس کی حمایت کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے محدود جماعتی استقلال میں محو ہو کر ہر دوسری جماعت سے مستغنی ہو جائے اور اپنے یا دوسروں کے تعلق منقطع کر دینے پر آسانی سے صبر کر کے بیٹھ جائے کیونکہ پہلی صورت میں اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کی منصبی حیثیت ختم ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے ایک ہمہ گیر راہنما اور قائد ہونے کے صرف ایک چھوٹی سی پارٹی بن کر رہ جاتی ہے۔ پس اسے اپنا مستقل اور غیر تابع وجود قائم رکھ کر دوسروں کی طرف ملاپ اور اشتراک کا ہاتھ بہر صورت بڑھاتے رہنے ہی کی ضرورت ہے۔ پھر خصوصیت سے مسلم اداروں سے تو اسے وداد و تعلق کی خاطر دوڑ دھوپ کرنے کے ساتھ اخلاقی لجاجت و ساجت سے بھی کام لینا پڑے اور شدید سے شدید تعدیوں پر بھی جو اس کی ذات پر کی جائیں مسامحت سے کام لینا پڑے تب بھی اسے ہرگز گریز نہ کرنا چاہئے کہ یہ خود اس کی اخلاقی عظمت اور عمومی راہنمائی کا ایک جزء لاینفک ہے کہ ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ کا صحیح نقشہ علماء کی جماعت بھی نہ کھینچے گی تو پھر اس کا سلیقہ اور کس میں تلاش کیا جائے گا؟ اگر انبیاء علیہم السلام اپنی عالمگیر اخلاقی شفقت سے کفار تک کو اپنا کر انہیں مسلم و قانت بنا سکتے ہیں تو کیا نائبان انبیاء اسی شفقت و رحمت کے ظل سے اپنوں کو بھی اپنا نہیں بنا سکتے؟

باہمی ربط و تعاون کی بنیاد اتحادِ مقصد اور تقسیمِ عمل پر ہونی چاہئے

مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس سلسلہ میں بعض اوقات جبکہ لوگوں کے قلوب پر غرض مندیوں یا غلط فہمیوں کی گھٹا چھا جاتی ہے اور وہ اپنے ہی مربیوں اور مصلحوں کے خلاف عناد تک کا مظاہرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تو علماء کو تعاون اور تعلق سے مایوسی تک کی نوبت بھی آجاتی ہے لیکن پھر بھی فرائض نصیحت و موعظت اور روابط شفقت و رحمت قطع کرنے کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوتی الا یہ کہ شفقت و موعظت کے تمام مراحل سے گزر کر قلوب دیانہ اس یاس پر شاہد ہو جائیں اور یکسوئی کے سوا چارہ کار باقی نہ رہے تو سکوت میں مضائقہ نہیں لیکن انقطاع تعلق یا طنز آمیز نکتہ چینیاں پھر بھی شان علم اور وراثتِ نبوت کے منافی رہیں گی ﴿أصتقین ولعتقین﴾ (کیا سچائی کی علمبرداری بھی اور طعن و تشنیع بھی؟ یہ دو چیزیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟) بہرحال جیسے جمعیت العلماء کا قیام اور اس کی منصبی حیثیت کے وقار کا وجود امت کے لئے ضروری ہے ایسے ہی

دوسری جماعتوں سے حسبِ حیثیت و مرتبت اس کا تعلق اور اشتراکِ عمل ضروری ہے۔ اِدھر اپنے شرعی نظریوں کی تبلیغ اور امّت کو رحمت ویُسر کے ساتھ ان پر لانا بھی اَزبس ضروری ہے۔ اس سے میرا یہ منشاء ہرگز نہیں کہ جمعیّت العلماء کی قیادت کے یہ معنیٰ ہیں کہ دوسری مسلم جماعتیں توڑ دی جائیں اور یہ ممکن بھی کب ہے جبکہ آزادی جیسے بُنیادی مقصد کے لئے اور بھی بہت سے مبادی اور مقاصد طبعی طور پر ضروری ہیں جنہیں سب کو نہ تنہا جمعیّت العلماء انجام دے سکتی ہے اور نہ بہت سے وظائف کی انجام دہی اس کی منصبی حیثیت پر چسپاں ہی ہوتی ہے۔

اس لئے جب تک ان مختلف مقاصد کے لئے اتحادِ مقصد کے اور تقسیم عمل کے اصول پر دوسری جماعتیں بھی موجِد نہ ہوں اور ان کا اور جمعیّت کا باہمی ربط و تعاون نہ ہو اصل مقصد کی تکمیل دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔

جمعیّت العُلماء کا شرف و امتیاز

ہاں مگر یہ بھی میں ضرور کہوں گا اور شرعی راہنمائی کی روشنی میں کہوں گا کہ یہ تمام دوسری مسلم جماعتیں جمعیّت العلماء کے سامنے مستفتی ہوں گی نہ کہ مفتی۔ نہ بلحاظِ ذوات علماء بلکہ اس لحاظ سے کہ امّت کے ہر مرض کی دَوا بالآخر کتاب وسنت ہے اواس کی حامل حقیقۃً یہی علماء کی جماعت ہے جبکہ وہ اپنے علمی وقار، فکر صحیح اور اخلاق کی بلندیوں کو محفوظ رکھ کر خالص کتاب وسنت کی روشنی امّت کے سامنے پیش کرتی رہے۔ ایسی صورت میں افرادِ امّت ہوں یا جماعاتِ امّت انہیں سمع وطاعت کے سوا چارہ کار نہیں کہ ارشادِ ربانی ہے :

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

"اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں کہ جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دے دیں کہ ان کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں پڑا"۔

پس تمام مسلم جماعتوں کا فرض ہوگا کہ وہ ہر ایسے مسئلہ میں جمعیّت العلماء کی شرعی راہنمائی بالضرور حاصل کریں جس میں ذرا بھی اصول یا فروعِ اسلامی سے ٹکرا جانے کا کوئی احتمال ہو بلکہ ان کے لئے بہرحال یہی ضروری اور مصلحت ہے کہ وہ صرف جمعیت العلماء ہی کی طرف رجوع کرے تاکہ مسلم مجالس سے ربط باہمی قائم ہونے کے ساتھ ان کے تمام مسائل بھی جمعیت کے علم میں آتے رہیں اور خود جمعیت کی بھی کوئی چھوٹی بڑی تجویز ان مجالس کی تجاویز سے متصادم نہ ہو سکے۔

پھر اگر جمعیت العلماء کی کسی تجویز سے کسی مسلم جماعت کو کوئی ادنیٰ سا بھی اختلاف پیدا ہو تو وہ جب تک کہ اس میں جمعیت سے آخری حد تک رجوع کر کے مسئلہ صاف نہ کرلے کتابت وخطابت سے کوئی ادنیٰ پہلو تہی نہ کرے یعنی ابتدا ہی مایوسی کو اپنے اوپر غالب نہ کرلے اور انتہا کسی انقطاع یا بے گانگی یا بے مروّتی کا معاملہ نہ کرے اور اِدھر جمعیت بھی فراخ دلی اور کشادہ پیشانی سے اپنے خلاف تنقید سننے اور معقول و منقول تنقید کو مان کر اس کی تلافی کے لئے تیار رہے کہ :

كلمة الحكمة ضالة المؤمن حيث وجدها فهو احق بها۔

"کلمہ حکمت مؤمن کی گم کردہ پونجی ہے جہاں مل جائے وہ اس کا مستحق ہے"۔

افہام و تفہیم کا راستہ اپنانے کی ضرورت

خلاصہ یہ کہ جس طرح موسیٰ وہارون علیہما السلام نے امامِ قوم بن کر جب کہ بنی اسرائیل کی تربیت و تعمیر کی اور ان کا وکیلِ شرعی بن کر فرعون سے ان کی آزادی کے بارے میں گفت و شنید اور مطالبہ و احتجاج کیا اور تمام بنی اسرائیل نے جن میں اسباط کی متعدد جماعتیں تھیں۔ سمع و طاعت سے کام لے کر موسیٰ وہارون کی مشترک و مختصر جمعیت پر اعتماد کیا جس کی بدولت بالآخر وہ آزاد ہوئے۔ اسی طرح آج کے دور غلامی میں بھی مسلمان افراد اور جماعات نائبان نبی کی اجتماعی قیادت میں اور اگر وہ اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کرلیں تو اس کی امارت میں اس کی تعمیر و تربیت پر اعتماد کریں اور شک اندازوں یا خود غرضوں کی تفرقہ پردازیوں سے جزئیات میں پڑ کر اصل مقصد کو ہاتھ سے نہ کھوئیں تاکہ جماعت یا امیر یا جماعت ان کی آزادی کے لئے بانبساطِ خاطر پوری جدوجہد کریں اور آزادی کو ان کے قریب لے آئیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جمعیت العلماء نے ان وظائف کو اپنے مقدور بھر ادا کیا ہے اور ادا کرتی رہے گی۔ مگر یہ کارخانۂ بشری ہے اس لئے فروگذاشت یا اجتہادی خطا ممکن ہے۔ سو جن حضرات پر بھی ایسی کوئی خطا واضح ہو وہ اعتراض و مطاعن اور اخباری پروپیگنڈوں کا راستہ چھوڑ کر دل سے جمعیت کی طرف رجوع کریں اور جذبات کے بجائے دلائل واصول سے افہام و تفہیم کرلیں اور ابتدا سے فریقین میں نیتِ مناظرہ کے بجائے تحقیقِ مسئلہ کا عزم ہو تو بات نہیں بڑھ سکتی :

اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آج ہندوستان کا سب سے گہرا اور بنیادی مرض غلامی ہے جس کی جڑوں کو ایک پردیسی حکومت رات دن مضبوط کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے جس نے شعائرِ اسلامیہ ہی کو نہیں شعائرِ انسانیت کو بھی مٹادیا ہے۔ اس غلامی سے ہماری تعلیم' روایات' مذہب' اقتصادیات' تہذیب و تمدن' قومی وقار' آبرو اور اندرونی و بیرونی تعلقات سب برباد ہوچکے ہیں۔ قرآن نے اس غلامی کو بدترین عذاب قرار دیا تھا اور اس لئے ہمارا اوّلین فریضہ ہے کہ اس مہلک مرض سے بعجلتِ ممکنہ نجات حاصل کرکے آزادی کے مقام رفیع تک پہنچیں جیسا کہ اس کی فرضیت و ضرورت ابتدائی نمبروں میں عرض کی گئی تھی۔

حصولِ آزادی کا مختصراً پروگرام

حصول آزادی کے پروگرام کا حاصل یہ ہے کہ :

(۱) سب سے اوّل غلامی کے منشاء کو سمجھنا چاہئے کہ وہ برطانوی شہنشاہی اور اس کی استبدادی پوالیسی ہے۔

(۲) حصول آزادی میں نبوّت کے وقت سے مدد لینی چاہئے تاکہ پروگرام اختراعی نہ رہے بلکہ اِلہامی ہوجائے اور قیادت وحی الٰہی کی قائم ہو۔

(۳) پہلے اپنوں سے اتحاد اور اشتراک عمل ضروری ہے۔ پھر غیروں سے بقدرِ حاجت اشتراکِ عمل مگر حدود وقیود و شریعت میں رہ کر اور اس کا بصورتِ معاہدہ ہندو مسلم اعلان کرکے۔

(۴) موجودہ صورتِ حال میں جنگِ آزادی عدم تشدّد سے لڑی جاسکتی ہے جس کے اسلحہ اخلاقی ہیں۔ ذکر اللہ'

دعا، رجوع اِلی اللہ، استعدادِ باہمی واتحاد اور احتجاجی ومطالباتی جدّوجہد، نیز مسلمانوں کی تنظیم۔

(۵) باہمی اشتراکِ عمل میں شرکاء عمل کا عاقل وباخُدا ہونا ضروری ہے، غافل اور چالاک ہونا مُضِر ہے۔

(۶) اس اخلاقی جنگ میں بحیثیتِ حزب اللہ اور فرستادۂ خدا کام کرنا چاہئے نہ کہ حظِّ نفس سے۔

(۷) متسلّط قوم سے خطاب میں نرمی برتنی چاہئے نہ کہ تشدّد اور اظہارِ غیظ۔

(۸) خطاب کُنندہ قائدوں کا متواضع اور بے تکلّف ہونا ضروری ہے جن کی نظر اپنی کمزوریوں اور عیُوب پر بھی ہو اور متکبّر یا رسمی وقور ہونا مضر ہے۔

(۹) قائدوں کی جماعت کو متغلب قوم کے درباروں میں پہنچ کر اپنی اسلامی پوزیشن اور اپنی تحریک کی دینی پوزیشن علی الاعلان واضح کردینی چاہئے۔

(۱۰) آزادی کی طلب مذہب کے لئے کرنی چاہئے نہ کہ ترفّہ وتنعّم دنیوی کے لئے۔

(۱۱) آزادی خواہ ذمّہ داروں کا عاقل، ’یم ہونا‘ دین سے متأثّر ہونا اور دین دار ہونا ضروری ہے ورنہ مذہبی آزادی حاصل نہیں ہوگی۔ جو مقصود بالذّات ہے بلکہ صرف قومی آزادی ملے گی جو مقصودِ اصلی نہیں ہے۔

(۱۲) اپنوں کی اصلاح وتعمیر ان کی اخلاقی تربیت اور جزئیات عمل کی تہذیب مسلم جماعتوں کی تقویم از بس ضروری ہے کہ ناتربیت یافتہ فوج بالآخر تباہی اور ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

(۱۳) متسلّط قوم کو بھی تبلیغ دین ضروری اور تاحصولِ آزادی مسلسل ضروری ہے کہ اس سے نصرت غیبی اور ذمّہ داری حق تعالیٰ ہوجاتی ہے اور مطالبات کی جڑ مضبوط ہوجاتی ہے۔

(۱۴) مصائب دنیا کی شکایت زبان پر نہ آنی چاہئے بلکہ عنوان مطالبات موانع دین کی شکایت ہونی چاہئے کیونکہ اسلام میں آزادی کی ضرورت صرف دین کے لئے ہے۔ دنیا تابع محض ہے۔

(۱۵) ہر مطالبہ اور احتجاج کی حجّت قرآنی معجزہ یعنی کتاب وسنت کے براہین سے پیش کی جائے۔

(۱۶) شرعی امارت اور دینی قیادت کا قیام ضروری ہے تاکہ قوم میں مرکزیت آجائے۔ ایک مرجع الامر مشخص ہو کر پوری قوم کو بجائے تشتّت وپراگندگی کے تعمیل شرائع میں یکسوئی نصیب ہوجائے اور قلوب میں تشویش کی جگہ سکون وطمانیت پیدا ہوسکے۔

(۱۷) قاعد علماء مفکّر ومبصر، دانایانِ مسائل ودلائل، عارفانِ حوادث ووقائع مستند وجیّد اور ساتھ ہی صُلحاء واتقیاء ہونے چاہئیں نہ کہ محض خطیب اور زعیم۔

(۱۸) علماء مفکّرین کی حیثیتِ اجتماعی کا وجود ضروری ہے جس کا رسمی نام جمعیت العلماء ہے۔ مگر ضرورت اس کی ہے کہ اس کے اہلِ حلّ وعقد مستند علماء ہوں۔ رسمی یا متکلّف علماء نہ ہوں جن کے سامنے آنے سے غیر شرعی چیزیں باور ہونے لگیں اور تلبیسِ حق بالباطل کا بازار گرم ہوجائے۔

(۱۹) اس وقت جمعیت العلماء کا بڑا کام حقوق مسلمین کی غیر مشروط حفاظت اور آزادی ملک کی غیر مشروط حمایت کرنا ہے۔

(۲۰) ہر آزادی خواہ کی حمایت وہم نوائی کی جائے مگر اپنا پروگرام مستقل رکھا جائے۔ معاہدہ کے ساتھ غیر مسلم اقوام سے اشتراکِ عمل بحالاتِ موجودہ ضروری ہے۔ اس اشتراک سے وہ بھی اسلام سے قریب لائی جاسکتی ہیں۔ اپنے استقلال تام کی صورت میں سب ہمارے ساتھ ہوں گے اور ہم صرف خدا کے ساتھ، یہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم سب کے ساتھ ہوں اور ہمارے ساتھ کوئی نہ ہو۔

(۲۱) حصولِ آزادی کی جدوجہد کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام اَشد ضروری ہے کیونکہ اللہ نے موسیٰ

وہارون علیہما السلام کو تحصیلِ آزادی کے لئے بھیجتے ہوئے فرمایا :

وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي۔

''میرے ذکر میں سستی مت کرنا''۔

اور ذکر اللہ کا فردِ کامل نماز ہے :

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي۔

''میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو''۔

اور اقامتِ صلوٰۃ کا جزءِ اعظم جماعت ہے۔

فانّ تسوية الصفوف من اقامة الصلٰوة۔

''جماعت کی صفوں کو سیدھا رکھنا اقامتِ صلوٰۃ میں سے ہے''۔

اور ظاہر ہے کہ تسویۂ صفوف بلا جماعت کے ناممکن ہے۔ اس لئے حصولِ آزادی کی جدّوجہد کے وقت تعلق مع اللہ اور اکمل فرد نماز باجماعت ناگزیر ہے تاکہ نصرتِ غیبی شامل حال رہے۔

(۲۲) تبلیغی مساعی کی منظم طریق پر ضرورت ہے۔ تبلیغ دین سیاسی پلیٹ فارموں سے ہونی چاہئے اور حکومت ورعایا کے کانوں میں مساوی طور پر اسلام کی آواز پہنچنی چاہئے جس سے دیانات کے ساتھ اسلامی قوانین وسیاسیات کو بھی اُصولی طور پر کرسی نشینوں کے کانوں تک پہنچایا جائے تاکہ ان کے مقصد سے دشمنوں میں بھی ہمدردی پیدا ہونے کا راستہ پڑ جائے اور حصول مقصد دور نہ رہے۔

بہرحال یہ بائیس نکات ہیں جو تلاوت کردہ آیات سے مستنبط ہوتے ہیں جن میں غلامی کی قباحت وشناعت ازالۂ غلامی کی فرضیت طریق احتجاج ومطالبات اور اس کی نوعیت، آزادی کی برکات، حصول آزادی کی سعی، سعی میں خلوص وللّٰہیت۔

حصولِ آزادی کا پروگرام، دشمنانانِ آزادی کا انجام اور غلام وضعیف قوم کی کامیابی وغیرہ کے مہمّات ارشاد فرمائے گئے ہیں۔

میں نے اپنی ضعیف بساط کے مطابق یہ مضامین آیاتِ بالا سے استنباط کر کے عرض کئے ہیں جن میں اصولی طور پر مسائلِ حاضرہ کی بحث بھی موقع بموقع آگئی ہے مگر سیاسی زبان کے بجائے دینی اور قرآنی زبان میں آئی ہے اور یہ زبان سیاسی اور غیرسیاسی افراد کے لئے یکساں مقبول اور جاذبِ توجّہ ہے۔ اہلِ تفکر اور اَذکیاء علماء اس سے بہت زیادہ حقائق ان آیات سے نکال سکتے ہیں کہ آخر کلامِ الٰہی ہے جس کی گہرائیوں کی کوئی حدود نہایت نہیں ہوسکتی۔

سیاستِ شرعیّہ کی عظمت

میں نے کوشش کی ہے کہ آزادی کے پروگرام کے اجزاء صرف کتاب وسنت سے پیش کئے جائیں۔ میرے خیال میں جو شرعی راہنمائی سے قائم شدہ ہے ضروری ہے کہ کوئی بھی پروگرام عصری سیاست کے ڈھچر اور اس سے اَخذ کر کے نہ لیا جائے یہ پُرفریب سیاست رد کرنے کے قابل ہے۔ جس نے دنیا کا امن وسکون برباد کردیا ہے نہ کہ معمول بنانے کے لائق ہے۔ البتہ سمجھ لینے کے قابل ضرور ہے اس کو سمجھ کر پھر صرف شرعی سیاست سے ہمارے پروگراموں کا تعلق ہونا چاہئے جس سے اس پر مکر عصری سیاست کی ظلمت دُور ہوسکے اور قلوب پر سے اس کا استیلاء اُٹھ جائے، کیونکہ آج اس کی مخالفت کرنے والے بھی بوجہ اس کی

شوکت کے وقع اسی کو سمجھتے ہیں اور اسی میں خود اپنی شوکت بھی محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے مزے لے کر اس کا ذکر اور اس کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ صرف کتاب وسنت کے منصوص پروگراموں سے ہی یہ عظمت زائل ہو کر حقیقی عظمت خدائی پروگراموں کی قائم ہو سکتی ہے۔

تعمیری سلسلہ کا پروگرام میں کافی تفصیل کے ساتھ اپنے خطبۂ صدارت جمعیت العلماء صوبہ سندھ میں پیش کر چکا ہوں۔ اگر اس کی تمام دفعات ان ۲۲ نمبروں کے ساتھ شامل کر لی جائیں تو دفاعی اور تعمیری پروگرام کی تمام مہم اور بنیادی دفعات سامنے آجائیں گی جو نصوصِ کتاب وسنت سے ماخوذ ہوں گی۔

بزرگانِ محترم! میں نے بہت سا وقت آپ کا لیا جس کی میں معذرت کرتا ہوں اور اس تمغۂ صدارت پر جو آپ حضرات کی ذرّہ نوازی نے مجھے عطا فرمایا ہے مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

فجزاکم اللّٰہ عنّا خیر الجزاء

ہندوستان آزاد' اسلام زندہ باد' جمعیت العلماء آباد

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ ربّ العلمین وصلّی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیّدنا ومولانا محمّد وّعلٰی اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین' برحمتک یا ارحم الرّاحمین۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اسلام اور آزادی

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا۔ پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی تاکہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضا پر محیط ہو جائے ___ اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا منادہے جس نے رسمی اور معنوی، صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

آزادی کا مفہوم

بزرگان محترم!

اسلام، آزادی کا سب سے بڑا حامی اور علمبردار ہی نہیں بلکہ وہی اور صرف وہی حقیقی جامع اور مکمل آزادی کا پیغام لے کر دنیا میں آیا ہے۔ اگر دنیا اسلام سے روشناس نہ ہوتی تو آزادی کا مفہوم ذہنوں میں اور اس کا کوئی عملی نقشہ آنکھوں میں نہ سما سکتا۔ کیونکہ عقل کی تگ و تاز کی حد تک آزادی کے معنی کوٹھی، بنگلہ، کیک پیسٹری، توس مکھن، کھیل تماشا، گانا بجانا، آلات لہو ولعب، نفسانی عیش و نشاط، ملکوں میں آمدورفت، ہوائی یا بری و بحری سیروسیاحت، پارٹی فیلنگ اور اس سے حریفوں کی شکست، استعمار اور جوع الارض مخصوص مفادات کو سامنے رکھ کر وضع قانون اور قانونی داؤ پیچ کے پردوں میں اقوام وطبقات کو بے بس اور بے حق ٹھیرا دینے کے نہیں ہیں ورنہ غلامی اور غلام سازی کے لفظ کے لئے کوئی معنی باقی نہ رہیں گے بلکہ آزادی کے معنی حق و صداقت، عدل و انصاف اور ایثار و رواداری کے سچے جذبات کے تحت بے بسوں کی بے بسی رفع کرنے، ضعیفوں کو ابھارنے، بے کسوں کو سہارا دینے، ظالموں سے دبے ہوؤں کا اٹھا دینے اور حدود سے گزر کر

ابھرے ہوؤں کو اتار دینے اور بالفاظ دیگر اونچ نیچ کا فرق اٹھا کر سب کو حقوق کے لحاظ سے مساوی سطح پر لے آنے کے ہیں تاکہ ضعیف مظلوم نہ بننے پائے اور قوی کو ظلم وزیادتی کا موقع نہ ملے۔ پس آزادی کا حاصل بلا روک ٹوک پوری قوت وقدرت کے ساتھ ادائے حقوق نکل آتا ہے جس سے ظالم کے ہاتھ کٹ جائیں اور مظلوم کی بے دست وپائی ختم ہو جائے۔

آزادی کا اسلامی نصب العین

آزادی کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اسلام کا نصب العین دیکھئے تو وہ یہ ہے کہ :

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ اِنَّهٗ کَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ وَنُمَکِّنَ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَنُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا کَانُوْا یَحْذَرُوْنَ۔

”فرعون زمین میں بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف (پارٹیاں) بنا رکھا تھا کہ ان میں سے ایک جماعت کا زور گھٹا رکھا تھا‘ ان کی بیٹوں کو ذبح کراتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھا واقعی وہ بڑا مفسد تھا اور ہم کو یہ منظور تھا کہ جن لوگوں کا زمین میں زور گھٹایا جارہا تھا‘ ہم ان پر احسان کریں اور ان کو پیشوا بنادیں اور ان کو مالک بنادیں اور ان کو زمین میں حکومت دیں اور فرعون اور ہامان اور ان کی اہالی وموالی کو (زوال قوت وشوکت کے) وہ واقعات دکھلا دیں جن سے وہ بچاؤ کررہے تھے“۔

اس کا حاصل وہی نکلا کہ ضعیفوں کو ابھارا جائے اور ظلم پسند زور آوروں کو گرایا جائے۔ ضعیفوں کے جو حقوق طاقت وروں نے زور قوت کے بل بوتے پر سلب کررکھے تھے وہ ان کے دانتوں کے نیچے سے نکلوائے جائیں اور ضعیفوں کو واپس کئے جائیں تاکہ کمزور‘ آزادی کا سانس لے سکے اور وقت کے فرعون وہامان اپنی اصلی حد پر آجائیں ورنہ ختم ہو جائیں۔

اگر آزادی کے یہی معنی ہیں اور شوکت وقوت کا یہی مقصد ہے اور بلاشبہ یہی ہے نہ کہ فراعنہ وقت کے وہ نفسانی مقاصد جن کے عنوانات کی فہرست ابھی سطور بالا میں گزری) تو پھر اسلام کے سوا کون ہے جو اس مقصد کو دیانت واخلاق کیساتھ دنیا میں لے کر آیا ہو؟

اس سے انکار نہیں کہ دنیا کی کسی ملت نے بھی غلامی کا پروگرام اپنے افراد کو نہیں دیا۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ آزادی کے نعرہ کے بعد حقیقی آزادی کے مکمل پروگرام پیش کرنے کی بھی کسی ملت نے زحمت نہیں اٹھائی۔

پس ملتوں کے دعوے کچھ بھی ہوں لیکن ان کے پاس آزادی کا وہ جامع پروگرام ہی موجود نہیں جس سے آزادی کا ذکر کردہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسلام نے اگر ایسی آزادی کا دعویٰ کیا ہے تو اس کے عین مطابق عملی اور اخلاقی پروگرام سامنے رکھا ہے۔ اس لئے دعوائے آزادی میں اسی کو سچا مدعی کہا جائے گا جو دعوے کے ساتھ عملی ثبوت بھی پیش کرے۔

آزادیٔ ضمیر

اگر غور کیا جائے تو حقیقی آزادی وہی ہو سکتی ہے جس میں بے جا دباؤ سے کلیۃً چھٹکارا میسر ہو اور یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے انسان کا دل ودماغ اور ضمیر آزاد ہو، ضمیر کی آواز اور رائے آزاد ہو، عقل وفہم اور شعور وادراک آزاد ہوں تاکہ جو کچھ وہ سمجھے خود اپنی بصیرت سے سمجھے، دوسرے کے دباؤ اور جبر وقہر سے نہ سمجھے اور پھر جو کچھ اس سمجھے ہوئے کے مطابق عمل در آمد کرے وہ اسی کا عمل در آمد کہلائے۔ انسان کی ساری آزادیوں کے سلسلے اسی باطن انسان سے چلتے ہیں۔ یہ آزاد ہے تو اس کی پوری دنیا آزاد ہے۔ ورنہ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور اس کی پوری دنیا غلام ہے۔

اسلام نے سب سے زیادہ زور انسان کے باطن کی آزادی پر صرف کیا ہے اور اس کے عقل وفہم کو اس حد تک آزادی بخشی ہے کہ خود اسلام کے منوانے میں بھی اس کے باطن پر کسی خارجی اثر کا دباؤ ڈالنا گوارا نہیں کیا، مادی طاقتیں تو بجائے خود ہیں۔

معجزہ جو خدا کا فعل ہے اور جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے اس بھی دلیل نبوت تو ٹھہرایا ہے لیکن دلیل صداقت مسائل نہیں بنایا۔ کیونکہ مسائل کی حقانیت استدلال اور حجت وبرہان سے واضح ہوتی ہے، خوارق سے ظاہر نہیں ہو سکتی۔ بغیر حجت ودلیل محض خوارق کے زور سے کسی چیز کو منوانا طاقت کے زور سے منوانا ہے جسے اکراہ واجبار کہا جاتا ہے جس سے مسئلہ کی حقیقت واضح نہیں ہو سکتی کہ اس کے ردو قبول کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایک شخص یہ دعویٰ کرے کہ نماز اور زکوٰۃ حق ہے، حج اور روزہ ضروری ہے۔

نکاح وطلاق کا فلاں طریقہ صحیح ہے، بیع وشراء کا فلاں ڈھنگ درست ہے اور فلاں ناجائز، امن وجنگ کے یہ اوقات ومواقع مناسب ہیں اور وہ مناسب نہیں، اور دلیل یہ بیان کرے کہ میں آنکھ کے اشارے سے بلڈ نگیں منہدم کر سکتا ہوں یا میں مردے زندہ کر سکتا ہوں یا میں پرندوں کی بولیاں سمجھتا ہوں، تو ظاہر ہے کہ ان خوارق سے اس کی معنوی قوت ضرور کھل جائے گی، مگر مسائل کی معقولیت اور غیر معقولیت کا اس سے فیصلہ نہ ہوگا، کیا ضروری ہے کہ دیواروں کے انہدام، احیاء موتیٰ اور منطق الطیر کے سمجھ لینے سے مسئلہ میں معقولیت بھی آجائے۔ ظاہر ہے کہ محض دیوار گرادینے سے کسی مسئلہ کو منوانا عقل پر دباؤ ڈالنا ہے کہ وہ بلا دلیل مسئلہ کو تسلیم کرلے۔ کیونکہ مسئلہ کی معقولیت کا تعلق دلیل سے ہے نہ کہ خوارق کے ظہور سے۔ خوارق سے پیغمبر کا منجانب اللہ ہونا تو ضرور واضح ہو جائیگا لیکن یہ ضروری نہیں کہ پیغمبر کے لائے ہوئے مسائل کی معقولیت بھی ان خوارق سے ذہن میں آجائے بلکہ ان کا معقول اور موافق فطرت ہونا دلائل سے واضح ہوگا۔ معجزات سے نمایاں نہ ہوگا۔

آزادیٔ عقل وفہم

پس اگر خوارق ہی سے مسائل کی معقولیت کو بھی زبردستی منوایا جاتا ____ اور عقلی بصیرت کو استدلال کی راہ سے گزر کر مسئلہ کی معقولیت تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جاتی تو بلاشبہ یہ عقل پر ایک بے جا دباؤ ہوتا جس سے عقل کی آزادی میں فرق آجاتا۔ حالانکہ اسلام نے عقل کو آزادانہ سوچ بچار کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس لئے خوارق کو نبی کی نبوت کی دلیل تو کہا گیا لیکن مسائل کی معقولیت سمجھنے کے لئے انہیں دلیل نہیں ٹھہرایا گیا بلکہ اس کے لئے کسی کے مبعوث من اللہ اور فرستادۂ خدا ہونے کے لئے معجزہ اور خرق عادت ہی بہترین دلیل بن سکتا تھا۔ حجت وبرہان اور فراست ووجدان کا راستہ کھولا گیا کہ مسائل کی صداقت تولنے کے لئے یہی حقیقی ترازو اور قرطاس مستقیم ہے، چنانچہ قرآن نے ایک ماننے والے کا پاکیزہ وصف یہ نہیں بیان کیا کہ وہ محض کسی

قوت یا محض معجزہ اور خوارق کے دباؤ سے مسائل کو تسلیم کرتا ہے۔ خواہ اسے غیر معقول بھی جانتا ہو بلکہ یہ بیان کیا گیا کہ :

وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّ عُمْیَانًا۔ (القرآن)

”اور (یہ مومن بندے) ایسے ہیں کہ جس وقت ان کو اللہ کے احکام کے ذریعے سے نصیحت کی جاتی ہے تو ان پر بہرے، اندھے ہو کر نہیں گرتے (بلکہ عقل وفہم کے ساتھ) متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ماننے کے ساتھ ان کا سمجھ لینا بھی ساتھ ساتھ رہے“۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہدینے کا ارشاد ہوا کہ :

قُلْ ھٰذِہٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔ (القرآن)

”آپ فرمادیجئے کہ یہ میرا طریق ہے میں خدا کی طرف سے اس طور سے بلاتا ہوں کہ میں دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے ساتھی بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں (کہ کسی آبائی رواج پر پچھلوں کی ریت کو بے دلیل مانے اور منوائے جاؤں)“۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اپنی صداقت اور مبعوث من اللہ ہونے کی دلیل میں بردو سلام کا معجزہ پیش کیا وہاں خدا کی توحید منوانے کے لئے بجائے خرق عادت کے نمرود سے استدلال بحث ومناظرہ فرمایا جو حجت وبرہان کی لائن تھی۔ کسی معجزہ سے اسے چپ کرنے کی سعی نہیں فرمائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جہاں عصاء اور ید بیضا کے چمکتے ہوئے خوارق عادت نشان پیش کئے تاکہ ان کا پیغمبر ہونا واضح ہو جائے، وہاں مسائل سمجھانے کے لئے کسی معجزے کو استعمال نہیں کیا، بلکہ فرعون سے مکالمہ حجت وبرہان سے کیا جس کی تفاصیل قرآن حکیم میں محفوظ ہیں ___ ٹھیک اسی عنوان پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ہزار ہا معجزات دکھلائے ہیں وہاں مسائل کے باب میں صرف ایک معجزہ پیش کیا اور وہ قرآن تھا جو حجت وبرہان اور عقلی وحسی طرق استدلال سے بھرپور ہے۔ بس آپ کو بوجہ خاتم الانبیاء ہونے کے طریق استدلال معجزانہ ہی انداز کا دیا گیا۔ جس سے واضح ہے کہ مسائل کا قابل فہم اور قابل سماعت ہونا فطری اور بدیہی دلائل سے واضح ہوتا ہے نہیں، خوارق سے نہیں، خوارق اور معجزات کے زور سے مسائل کا منوانا، ایک ایسا دباؤ ہوتا جس سے عقل وخرد کی آزادی سلب ہو جاتی اور انسان کو عقل اور فکر کا دینا نہ دینا برابر ہو جاتا۔

پس اسلام نے آزادی کا سبق باہر ہی باہر سے نہیں پڑھایا بلکہ انسان کے اندرون کو سب سے پہلے آزادی کی دولت بخشی ہے۔ اس کے ضمیر کو آزاد کیا، اس کی عقل کو آزاد کیا، اس کے فہم وفکر کو آزاد کیا اور بالفاظ مختصر انسان کی حقیقت میں آزادی کا تخم بو دیا اور اسے مجسم آزادی بنادیا۔ بہرحال ضمیر کی آزادی اسلام کا پہلا قدم ہے جسکے اوپر سے اس نے تمام خارجی اثرات حتیٰ کہ خدائی افعال (معجزات) تک کے دباؤ کو بھی باقی نہیں رکھا۔

آزادئ رائے

آزادئ ضمیر کے بعد مافی الضمیر یعنی رائے کی آزادی کا مقام آتا ہے۔ اگر دیانتاً ضمیر ایک بات کو حق مان

رہا ہے تو اسے برملا اظہار کا حق دینا بھی اسلام ہی کی بلند حوصلہ فطرت کا کام تھا ضمیر کی آواز دل کی مخلصانہ رائے ایک اپیل ہے جو بند رہنے کے لئے دل میں نہیں ابھاری جاتی بلکہ کھلنے اور کھل کر سامنے آنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی چیز کو حق نہیں دیا گیا کہ وہ ضمیر کی آواز اور سچے دل سے ابھری ہوئی رائے کے اظہار پر کوئی پابندی عائد کردے' اس کی تصدیق وتکذیب یا تصویب وتردید کا حجت کے ساتھ ہر ایک کو اختیار ہے' لیکن اسے ابھرنے نہ دینے کا کسی کو حق نہیں۔ اگر رائے کو آزاد نہ کہا جاتا تو ضمیر کی آزادی کے کوئی معنی نہ تھے۔ حد ہے کہ عام انسانی رائے پر پیغمبر کی رائے کو بھی رائے کی حیثیت سے اثر انداز ہونے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ آنحضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بریرہؓ کو ارشاد فرمایا کہ وہ حضرت مغیثؓ سے نکاح کا تعلق منقطع نہ کریں' بریرہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ' یہ امر ہے یا مشورہ؟ فرمایا' نہیں مشورہ و رائے ہے۔ عرض کیا تو میں آزاد ہوں۔ یہ رائے مانوں یا نہ مانوں اور بالآخر نہیں مانیں۔ ایک طرف پیغمبرؐ کی رائے ہے جو خاتم الانبیاء ہونے کے علاوہ اعقل الناس بھی ہیں' دوسری طرف ایک عورت کی رائے ہے جس کی جنس ناقص العقل شمار کی گئی ہے لیکن اسلام کی بخشی ہوئی آزادی رائے کا مقام اس حد تک بلند ہے کہ ایک عورت کی رائے پر پیغمبر کی رائے کسی ادنیٰ دباؤ ڈالنے کی مجاز نہیں ٹھہرائی گئی۔

بہرحال اسلام کی آزاد فطرت نے انسان کی آزادی کے لئے سب سے پہلے اس کے باطن کو آزادی بخشی ہے۔ اس کی عقل' اس کے ضمیر اور اس کی رائے کو آزاد رکھا ہے اور اس پر کسی ایسے دباؤ کو گوارا نہیں کیا جو اس کے فطری ابھار اور تقاضوں کو پامال کردے۔

ظاہر ہے کہ جو اسلام انسانی باطن پر نبوت اور معجزات یعنی فعل نبوی اور فعل خداوندی کے دباؤ کو بھی برداشت نہیں کرتا تاوقتیکہ انسانی ضمیر خود ضمیر ہی کے رجحان اور اپنے ہی اندورنی دباؤ سے اسے واجب القبول نہ سمجھ لے تو وہی اسلام اسی انسانی ضمیر اور بشری باطن پر اینٹ پتھر کے دباؤ' سونے چاندی اور زرد جواہر کی ڈھیریوں کے دباؤ' تیروتفنگ اور بم وگیس کے دباؤ' کسی کی رسمی قربانی یا ہنگامی اقتدار کے دباؤ کو کب گوارا اور برداشت کرسکتا ہے اور تو اور وہ تو خود اپنے کو بھی نہ تلوار کے زور سے کسی کے اندر اتارنا چاہتا ہے اور نہ کسی کو کسی قسم کے رسمی دباؤ سے اپنے اندر گھس آنے اور اتر پڑنے کی اجازت دینا چاہتا ہے۔ اس نے صاف اعلان کردیا ہے کہ :

لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔

''دین میں زبردستی نہیں' ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے''۔

پیغمبرؐ کو ہدایت دی گئی کہ :

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔

''سو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرسکتے ہیں کہ وہ ایمان لے ہی آویں''۔

پس جو اسلام دین تک کے بارے میں دلوں اور ضمیروں کو آزادی بخش رہا ہے وہ رائے اور طبیعت کے اصلی تقاضوں کو کب پابند اور غلام رکھنا پسند کرے گا؟ پس سب سے پہلے اسلام نے اندرون انسان ہی میں آزادی کا دیا روشن کیا اور انسانی ضمیر' انسانی رائے اور انسان کے دل کی آواز کو دل میں ابھرنے اور ابھر کر باہر نکلنے میں آزادی دی۔

ظاہری آزادی' باطنی آزادی کے تابع ہے

ظاہر ہے کہ بیرونی آزادی اندرونی آزادی کے تابع ہوتی ہے۔ اگر ضمیر آزاد ہے تو اس کا بیرونی ماحول بھی آزاد ہو کر رہتا ہے بشرطیکہ ضمیر میں واقعی حریت و آزادی اتری ہوئی ہو اور وہ ضمیر کی آواز بنی ہوئی ہو' لفظی ترجمانی نہ ہو' جس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

پس آزادی ہو یا غلامی پہلے اندرون نفس میں آتی ہے پھر اس کا بیرون آزاد یا غلام بنتا ہے قرآن حکیم نے سائنٹیفک حقیقت واشگاف فرمادی کہ :

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (القرآن)

"واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں فرماتے جب تک وہ لوگ خود اپنے نفوس (کے اندرونی احوال) کو نہیں بدل دیتے"۔

پس باہر آزادی جب ہی نمایاں ہوتی ہے' اندر آچکتی ہے' باہر انقلاب جب ہی رونما ہوتا ہے جب اندر آلیتا ہے' باہر غلامی اس وقت آتی ہے جب نفوس کے اندر سرایت کر چکتی ہے۔

اگر ایک قوم آزاد ہونا چاہتی ہے تو پہلے اسے اپنے من میں آزاد ہو جانا پڑے گا پھر جس نوع کی آزادی اندر آئے گی اسی نوع کی باہر نمایاں ہوگی۔ اس لئے اسلام نے باہر آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لئے پہلے اندرون انسان میں آزادی اور جرأت کی فضا پیدا کی تاکہ اسی جرأت و بے باکی سے اس کی بیرونی آزادی بھی فضاء پر محیط ہو جائے اور اس طرح اسلام صرف رسمی آزادی کا داعی اور علمبردار نہیں بلکہ باطنی اور بنیادی آزادی و حریت کا منادی ہے جس نے رسمی اور معنوی' صوری اور حقیقی دونوں قسم کی آزادیوں کا انسانوں کو سبق دیا ہے۔

باطنی آزادی

پس باطن میں تو اسلامی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کا باطن اور ضمیر ہر ماسوٰی سے آزاد ہو کر حق کا پابند ہو جائے۔ ہر غیر اللہ کی حکمرانی اور قہرمانی سے آزاد ہو کر حق کی حکمرانی کے نیچے آجائے۔ اگر یہ اختیار حق اور رد باطل ضمیر کا جوہر بن چکا ہے جو حقیقی آزادی کا ماحصل ہے تو ایسے ضمیر سے اسی قسم کی آزادی باہر بھی پھیلے گی۔ پرستاران حق کا غلبہ ہو جائے گا اور پرستاران باطل کی شکست' صدیقوں اور صالحوں کی روش پھیل جائے گی اور فرعونوں اور ہامانوں کے طور طریقے مسدود ہو جائیں گے۔

ذلیل قسم کی غلامی

لیکن اگر حق سے آزاد ہو کر نفس کی پیروی اور غیر اللہ کے دباؤ کے آثار سے دل اور ضمیر شکست کھا چکا ہے یعنی ضمیر خود اپنے سے مطمئن نہیں بلکہ بیرونی اثرات سے متاثر اور اپنی موت سے خود ہی خجل ہے گویا حق سے آزاد اور باطل کا غلام ہے (جو اسلامی آزادی کی ضد ہے) تو اس نوع کی آزادی باہر نمایاں ہوگی۔ فرعون وہامان برسراقتدار ہوں گے' صلحاء و صدیقین بے یار و مددگار بن جائیں گے اور یہ آزادی یقیناً عالم کی آبادی نہ ہوگی بلکہ بربادی ہوگی۔ جس کو احادیث صحیحہ میں علامت قیامت (جن کا دوسرا نام فتن ہے جو اقوام عالم اور عالم کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جبریل علیہ السلام نے علامت قیامت دریافت کیں تو آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

ان تلد الامة ربها وان ترى الحفاة العراة رعاء الشاء يتطاولون فى البنيان۔
”(قیامت اور عالم کی تباہی اس وقت قریب ہوگی جب) باندی اپنی مالکہ کو جننے لگے یعنی لڑکیاں تک ماں پر حکومت کرنے لگیں جو لڑکوں سے کہیں زیادہ ماں کی مطیع ہوتی ہیں (یہ تباہی ہے معیشت منزلی کی) اور سیاست مدن یعنی ملکی معاملات کی بربادی کی صورت یہ ہے کہ تم دیکھو کہ ننگ پیرے ننگ سرے (ذلیل قسم کے لوگ) بکریاں چرانے والے اہیر یعنی کمینہ قسم کے لوگ اونچی اونچی بلڈنگوں میں شیخیاں مارنے لگیں“۔

یعنی کمینے برسراقتدار آجائیں اور حکمت پسند شرعاً جوتیاں چٹخاتے نظر آئیں۔ تو یہ اقتدار بظاہر آزادی ہوگا، مگر بنگاہ غور ذلیل قسم کی غلامی ہوگا جو غلامی حق کے بجائے غلامی نفس کی دلدل میں پھنسا کر انجام کار عام تباہی کی طرف ملتوں کو دھکیل دے گا۔

بہرحال اسلام کی نگاہ میں آزادی باطن کے معنی ضمیر کی آزادی، عقل و خرد اور فہم و فکر کی آزادی ہے جس سے انسان بذات خود اپنے ضمیر کی آواز اٹھانے میں جری اور بے باک ہو جائے اور آزادیٔ ظاہر کے معنی ضمیر کی اس آواز کے مطابق عملی اقدام میں ایسی جرأت و قوت پیدا ہو جانا ہے جو امر حق کے نافذ کرنے میں کسی پس و پیش کی شکار نہ ہو اور انسان کو نہ لومۃ لائم کی پرواہ رہے نہ نصح ناصح کی۔

صرف اسلام ہی آزادی کا علمبردار ہے

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام آزادی لے کر ہی نہیں آیا بلکہ آزادی کا مفہوم سمجھانے کے لئے بھی آیا ہے۔ اسلام ظواہر ہی کو آزاد کرانے نہیں آیا بلکہ بواطن اور ضمائر کو بھی آزادی بخشنے کے لئے آیا ہے۔ اسلام نے آزادی کے معنی سمجھاتے ہوئے پہلے غلامی کے معنی سمجھائے ہیں کہ وہ نفس وشیطان کی پیروی کا ایک مختصر عنوان ہے۔ خواہ کوئی فرد اس پیروی کا شکار ہو یا جماعت۔ پھر اس منفی پہلو سے آزادی کے معنی سمجھائے کہ وہ حق کی غلامی کا دوسرا نام ہے۔

پس اس نظریہ پر جو حق کا غلام ہوا وہی آزاد ہوا اور جو اس سے آزاد ہوا وہی غلام ہوا۔ اس سے واضح ہوا کہ آزادی کے معنی اسلام میں شتر بے مہار ہونے کے نہیں بلکہ حجت و برہان سے پابند حق بن جانے کے ہیں۔

آزادی کا معیار

آج کے دور میں کوئی بھی قوم یا ملک اگر آزاد ہو تو اس کی آزادی اور غلامی کا فیصلہ اسی اصول سے کیا جائے گا کہ اگر وہ آزادی کے بعد اپنے ضمیر کی سیدھی سچی آواز کے تحت مخلوق خدا سے اونچ نیچ اٹھانے میں بے باک ہے، اسے ضعیف کو قوی کرنے اور اس کے حقوق واپس دلانے اور زور آور ظالم کے پنجہ استبداد کو توڑ کر اس سے غصب کردہ حقوق نکال لینے میں کوئی جھجک اور کوئی رکاوٹ سد راہ نہیں ہوتی تو وہ آزاد ہے ورنہ غلام ہے۔ اگر اتفاق سے کسی غیر کا نہیں تو اپنے ذلیل نفس اور اس کی ہواء و ہوس کا غلام ہے اور ظاہر ہے یہی اندرونی غلامی چند ہی دن میں بیرونی غلامی کو بھی اپنے طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس لئے وہ ظاہری آزادی بھی دیرپا

ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں اگر آزاد شدہ ملک کا ضمیر آزاد ہے اور اس کی عدل و مساوات کا سچا جذبہ اور اس پاکیزہ جذبہ کے بے لاگ اقدامات کسی بیرونی دباؤ کو نہیں مانتے اور کسی ملامت سے متاثر نہیں ہوتے تا آنکہ اس راہ عدل و مساوات میں قومیت، رنگ، نسل، وطن، ہوس زر، ہوائے اقتدار اور غلط قسم کا ماحول کوئی بھی اس کے جذبہ و عمل میں خلل انداز نہیں ہوتا تو وہ ملک آزاد اور وہ قوم آزادی سے بہرہ مند ہے اور بلاشبہ ضمیر کی یہ آزادی باہر کی اس آزادی کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سے زیادہ دیرپا بناتی رہے گی۔

پس حقیقی آزادی وہی ہوگی جس میں ظاہر و باطن یکساں طریق پر آزاد ہوں، اس کے برعکس مقابلہ نہ ہو کہ ظاہر بظاہر آزاد ہو اور دلوں میں غلامی کا چور نقب زنی کر رہا ہو یا زبانی حقیقی آزادی کے ادعاء میں رطب اللسان ہوں، مگر دلوں میں اس کے برعکس جذبات کا طوفان بپا ہو۔ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۔

اسلامی آزادی کے آثار

اسلام بھی جامع آزادی لے کر دنیا میں آیا اور جونہی اس نے آزادی کا یہ غلغلہ بلند کیا اور اس کی آواز پر پاک ضمیر انسانوں نے اپنے ضمیر کی آواز سے لبیک کہا وہیں پسماندہ ابھر پڑے، پست بلند ہو گئے اور بلند نیچے کی طرف آ گئے، غلام اور آقا میں فرق نہ رہا، یتیم بے کسی کا لبادہ اتار کر ناز و نعم کے خلعت جاں بخش میں آ گیا، مظلوموں کی فریادیں عرش سے ٹکرانے لگیں، صنف نازک باندیوں سے حرہ ہو گئیں، بے کس اور لاوارث دوسروں کے مورث بن گئے، جنہیں سونے کے لئے فرش خاک بھی مشکل سے میسر آتا تھا وہ کتان کے رومالوں سے ناک صاف کرنے لگے اور جو خود ہل کر اپنی خدمت کرنا بھی عار جانتے تھے، وہ خادم خلق اللہ بن گئے، غرض اسلام نے آزادی سے جو انقلاب برپا کیا، وہ اونچ نیچ اور من وتو کے امتیاز کا انتہا ب نہ تھا بلکہ اونچ نیچ مٹانے اور من وتو کے قصے ختم کرنے کا انقلاب تھا۔ قانونی مساوات۔ تعلیمی یکسانی، مالی توازن، جاہی ہمرنگی، امیر غریب کے سنگ، اونچے اور نیچے کے ملاپ، آقا و غلام کی ہم آہنگی، شاہ و گدا کی یک منظری کا انقلاب تھا جو اس کے بغیر ناممکن تھا کہ یہ امیر و غریب، شاہ و گدا اور اونچ نیچ افراد بجائے ایک دوسرے کو دیکھنے کے سب مل کر کسی ایسی ذات کو دیکھنے لگیں جو ان سب سے بالاتر ہے اور اس طرح ان کا رخ ایک دوسرے کی طرف ہونے کی بجائے صرف ایک مرکز کی طرف ہو جائے جو واحد و قیوم ہو۔

پس اسلام نے آزادی اور آزاد روشی کی یہ حقیقت جس میں مساوات کے ساتھ ایک دوسرے کی خدمت بلکہ فدویت کا جذبہ کار فرما تھا، خود انسان کے نفس کی عظمت اصطلاحی خودداری سے نہیں ابھاری بلکہ ہر ہر نفس کی مخفی عظمت کو مٹا کر حق کی عظمت دل میں سمو کر پیدا کی۔ اس لئے اسلامی آزادی کے معنی غلامی نفس یا غلامی غیر اللہ کے نہیں بلکہ غلامی حق کے ہیں۔ پس آزادی کا لفظ تو اسلام اور غیر اسلام میں مشترک ہے، لیکن اس کے معنی اسلام اور غیر اسلام میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور باہم بعید تر ہیں۔

"اسلام اور آزادی" کا عنوان جب سامنے آئے تو اس تفصیل کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ دوسروں کی لفظی آزادی سے اسلام کی حقیقی آزادی متمیز ہو سکے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

سائنس اور اسلام

یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلت نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ و مجاہدہ جن سے استغناء وعزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام کا موضوع عمل ہیں تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلت نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے اور اسلام انجام کار اسے عزت اور فلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے ___ پہلی صورت یعنی مادیات اور غلو اور سائنس کا بحران روح کی پامالی اور مادہ کے غلبہ کی ہے، جس سے عزیز تو ذلیل اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے، جو قلب موضوع اور دونوں کے لئے موجب ہلاکت ہے ___ اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف روح کی سربلندی اور مادہ کی محکومی ہے جس سے عزیز مسند عزت پر اور ذلیل اپنی حد ذلت و مقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عین عدل اور دونوں کے لئے دارین میں موجب فلاح و بہبود ہے، بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی ماہیتوں کا اجمالی خاکہ۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

تقریظ

از حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ صدر مہتمم

(دار العلوم دیوبند)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برادر محترم مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے چند ماہ پیشتر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک معرکۃ الآراء تقریر کی تھی جسے بعد میں منضبط کر کے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر دیا گیا اور اس کا نام "سائنس اور اسلام" رکھا گیا۔

چھپنے سے پہلے برادر ممدوح نے بھی مجھے اس کے مطالعہ کا موقع دیا۔ میں اس مضمون کے مطالعہ سے بے حد محظوظ و مسرور ہوا اور دل سے مؤلف کے حق میں دعاء نکلی۔

یوں تو اس موضوع پر مختلف مذاق کے لوگ سینکڑوں مضامین لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہیں گے لیکن یہ مضمون اپنی نوعیت میں نرالا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب مضمون، حجت الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ علیہ کی صرف نسبی اولاد ہی نہیں، ان کے علمی وارث بھی ہیں۔ جدید تعلیم کے اس بڑے مرکز علی گڑھ میں صحیح اور موزوں تبلیغی خدمت کا جو گہرا اور خوشنما نقش آپ کی اس تقریر نے چھوڑا وہ مسلمانوں کے اصلاح کی ایک خوش آئند اور درخشاں علامت ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے نو تعلیم یافتہ بھائیوں کو بار بار اس طرح کے افادات سے استفادہ کی توفیق بخشے۔

(شبیر احمد عثمانی، ۳ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تقریظ

از حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب، سابق شیخ الادب والفقہ

(دار العلوم دیوبند)

حامداً ومصلیاً ومسلماً۔ اما بعد

اس رسالہ کے اوراق اس مقبول عام تقریر کے حامل ہیں جو عالی جناب مولانا الحاج المولوی محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم نے "اسلام اور سائنس" کے خشک مگر ضروری عنوان پر بمقام علی گڑھ کالج اسٹریچی ہال میں فرمائی تھی۔

خالص علمی اور خشک عنوان پر تقریر اور ایسے شخص کی تقریر جس کو کتب عربیہ کے مطالعہ عربی طلبہ کے ہجوم میں عربی الفاظ و مصطلحات کی مزاولت سے فرصت ہی نہ ملتی تھی اور وہ بھی ایسے مجمع میں جہاں اس کے برعکس انگریزی زبان اور اس کے محاورات مادری زبان کے حکم میں آگئے ہوں۔ یقیناً اضداد کے اجتماع کے حکم میں تھی اور اگر ضب (گوہ) اور نون (ماہی) کی ضدیت اور بعد مکانی کا صحیح مشاہدہ ہو سکتا تھا تو یہاں ہونا چاہئے تھا، لیکن بیان کی سلاست، مضامین کے ارتباط اور دقائق علمیہ ظاہرانہ انداز سے روزمرہ کے محاورہ میں ادا کرنے نے ایسا سہل الحصول صعب بنادیا ہے کہ اس کے شروع ہو جانے کے بعد ختم کلام سے پہلے سیری ہی نہیں ہوتی تھی۔

پھر یہی نہیں کہ صرف سائنس اور اسلام کے ہر ہر گوشہ پر مقرر ممدوح نے روشنی ڈال کر اس پتھریلے اور سنگلاخ زمین کو طریقۂ بیضاء بنادیا بلکہ اس کے ساتھ بہت سے دوسرے معارف اور دقائق علمی و اسلامی بھی نہایت سہولت کے ساتھ اہل بصیرت اور ارباب نظر کے پیش نظر کردیئے اور قابل تحسین یہ امر ہے کہ جس جگہ کوئی ایسا دقیقہ علمیہ سمجھانا ہو جس کو سمجھنے کے لئے علوم قدیمہ سے واقفیت مصطلحات فنونیہ کا تداول شرط تھا یا فی الحقیقت اس میں مقرر کے لئے دلچسپی پیدا کرلینا ضروری تھا تاکہ اذہان میں نشاط پیدا ہو۔ اس کو اگر ایک جگہ معمولی معمولی مثالیں دے کر کالشمس فی نصف النہار کردیا تو دوسری جگہ ادیبانہ تشبیہات و استعارات، لطائف و ظرائف سے مزین بنا کر ذہن نشین کردیا۔

پس یقیناً یہ تقریر اگر ایک جانب حقائق اسلامیہ، معارف شرعیہ کا آئینہ ہے تو دوسری طرف ادبی دلچسپیوں کا ذخیرہ بھی ہے ۔

در کفے جام شریعت در کف سندان عشق
ہر ہوسنا کے نداند جام وسندان باختن

پس اگر یہ امر قابل تعجب نہیں کہ مشک ان دماغوں کو معطر کردیتا ہے جو ماؤف نہ ہوں تو یہ بھی شایان تعجب نہیں کہ نزدیکان بے بصر کے علاوہ تمام قلوب اس تقریر سے مستفید ہوئے اور اگر یہ لائق حیرت نہیں کہ

آفتاب افق مشرق سے طلوع کرنے کے بعد اپنے مقابل زمین کے ہر ہر گوشہ کو منور کردیتا ہے تو یہ بھی موجب حیرت نہیں کہ اس تقریر نے مسئلہ مبحوث عنہا کے کسی گوشہ کو روشن کئے بغیر نہ چھوڑا اور اگر یہ صحیح ہے کہ ٹھنڈا اور میٹھا غیر مکدر پانی پیاسوں کی پیاس کا ازالہ اس طرح کردیتا ہے کہ ان کے رونگٹے رونگٹے سے تشنگی کی اذیت، یبوست کی تکلیف زائل ہو جاتی ہے تو پھر یہ بھی صحیح ہے کہ اس تقریر نے عنوان بالا سے متعلق تشنگان کمال کی تشنگی اسی دلچسپی کے ساتھ زائل کردی جو پیاسے کو پانی سے ہوتی ہے۔ قاسمی فیضان کی وجہ سے میرے نزدیک تو نہ یہ تقریر قابل تعجب ہے اور نہ مقرر ممدوح کی دسری تقریریں یا تالیفات اگر کسی ناواقف کو تعجب ہو تو وہ جانے اس کا کام ؎

عجیب فی الزمان وماعجیب
اتی من ال سیار عجیبا

محمد اعزاز علی غفرلہ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تقریظ

از جناب ڈاکٹر محمد ذکی الدین صاحب شیخ الطبعیات

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

حضرت الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام مسلمانان ہند کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ آپ نے سائنس اور اسلام کے سے اہم موضوع پر ایک نہایت عالمانہ خطبہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اسلامی تاریخ وتمدن کے سامنے فرمایا اب وہی خطبہ شائع کیا جارہا ہے تاکہ لوگ اس سے استفادہ حاصل کریں۔

سائنس اور مذہب کی بحث اور فلسفہ اور مذہب کی بحث مدت سے چلی آتی ہے سائنس اور مادیات کی وجہ سے مذہب کو (اسلام اور عیسائیت کو خاص طور پر) سخت نقصان پہنچا۔ ساتھ ساتھ علماء کی یہ کوشش رہی کہ ان نقصانات کی تلافی کی جائے۔

ڈریپر نے ایک کتاب سائنس اور مذہب کے عنوان سے لکھی ہے۔ اس کتاب میں اسلام اور سائنس کے متعلق مختلف سلسلہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ جمال الدین افغانیؒ نے پیرس جاکر مشہور معروف فلسفی رینان سے بحث کی اور یہ ثابت کردیا کہ اسلام سائنس کی مخالفت نہیں کرتا۔ اس کے بعد وہ اس موضوع پر کوئی مضامین بھی شائع کرچکے ہیں۔ ان کے بعد ان کے شاگرد علامہ محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا نے مسلسل اس موضوع پر قلم اٹھایا۔

ہندوستان میں سرسید نے اسلام اور سائنس کے متعلق بہت کچھ لکھا۔ اسلامک ریویو میں خواجہ کمال الدین نے بہت سے مضامین شائع کئے۔ مولانا عبدالعلیم صدیقی اور دیگر علماء نے متعدد خطبات اور مضامین اس سلسلہ میں دیئے۔ علماء کی کوشش یہ تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ

۱　سائنس اسلام کے مخالف نہیں۔

۲　جب مسلمان عروج پر تھے تو انہوں نے بہت سی سائنس کی ایجادات کیں جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ سائنس اسلام کی مخالفت نہیں کرتا۔

مصر میں علامہ طنطاوی نے "تفسیر جواہر" ۲۲ جلدوں میں شائع کی ہے اس میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن شریف کی آیتوں کا تعلق سائنس سے دکھایا جائے اور ایک حد تک اس میں علامہ موصوف کو کامیابی بھی ہوئی۔

پچھلی صدی میں یہ ایک شوق پیدا ہوگیا تھا کہ سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو قرآن مجید کی آیتوں سے ثابت کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ایک نہایت ہی فاش غلطی علماء سے سرزد ہوئی، وہ یہ کہ انہوں نے سائنس کے اصولوں اور نظریوں کو ابدی سمجھ لیا اور وہ بالکل بھول گئے کہ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے سائنس کے نظریوں اور اصولوں کی خامیاں ظاہر ہوتی جاتی ہیں اور اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان میں وقتاً فوقتاً

زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں کی جائیں۔ ساتھ ساتھ ہمارا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن شریف خدا کا پیغام ہے جو ہمیشہ کے لئے آیا ہے جو دو متضاد چیزیں ہیں۔

حضرت مولانا کا یہ فاضلانہ خطبہ آپ کے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس سے پورے طور پر مستفید ہوں گے اور یہ خطبہ ہماری ان نوجوان کے لئے جن کے دماغ میں سائنس اور الحاد مترادف ہے، مشعل ہدایت ہو گا۔

(زکی الدین)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ۔ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔ وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ○ اَمَّا بَعْدُ:

فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْاَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيْدُ فَخَلَقَ الْجِبَالَ فَقَالَ بِهَا عَلَيْهَا فَعَجِبَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ شِدَّةِ الْجِبَالِ فَقَالُوْا يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْجِبَالِ؟ قَالَ نَعَمْ! اَلْحَدِيْدُ۔ فَقَالُوْا يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْحَدِيْدِ؟ قَالَ نَعَمْ، اَلنَّارُ! فَقَالُوْا يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ النَّارِ؟ قَالَ نَعَمْ، اَلْمَاءُ! فَقَالُوْا يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الْمَاءِ؟ قَالَ نَعَمْ، اَلرِّيْحُ! فَقَالُوْا يَا رَبِّ! هَلْ مِنْ خَلْقِكَ شَيْءٌ اَشَدُّ مِنَ الرِّيْحِ؟ قَالَ نَعَمْ! اِبْنُ اٰدَمَ تَصَدَّقَ صَدَقَةً بِيَمِيْنِهٖ يُخْفِيْهَا مِنْ شِمَالِهٖ

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو کانپنے اور ڈولنے لگی تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو پیدا کیا اور ان سے زمین پر جم جانے کے لئے فرمایا۔ ملائکہ نے پہاڑوں کی شدت وصلابت پر تعجب کیا اور کہنے لگے کہ اے پروردگار! تیری مخلوق میں کوئی چیز پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ فرمایا ہاں لوہا ہے۔ اس پر ملائکہ نے عرض کیا اے پروردگار تیری مخلوق میں لوہے سے بھی کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں آگ ہے پھر عرض کرنے لگے کہ الٰہی آپ کی مخلوق میں آگ سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں پانی ہے۔ پھر انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں پانی سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں ہوا ہے۔ تو پھر ملائکہ نے عرض کیا کہ اے پروردگار تیری مخلوق میں ہوا سے بھی زیادہ کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا ہاں' آدم کی اولاد ہے جو دائیں ہاتھ سے اس طرح چھپا کر صدقہ کرے کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو"۔

تمہید

صدر محترم' بزرگان قوم و برادران عزیز طلبہ! مجھے اس وقت جس موضوع پر تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس کا عنوان "سائنس اور اسلام" ہے۔ مجھے جس طرح اس پر تعجب ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں جس میں ایک مرکزی جگہ پر قوم کے منتخب فضلاء مختلف علوم وفنون کے ماہر اور مخصوص ارباب کمال جمع ہیں' تقریر کے لئے مجھ جیسے بے بضاعت طالب علم اور ناکارہ علم و عمل کا انتخاب کیا گیا' اسی طرح بلکہ اس سے بھی بدرجہا زائد اس پر تعجب ہے کہ تقریروں کے اہم موضوعات میں سے اس اہم تر بلکہ مشکل ترین موضوع کو مجھ ناچیز کے سر پر عائد کیا گیا ہے۔ عنوان مذکور حقیقتاً ایک غیر معمولی عنوان ہے جس کے لئے معمولی قابلیت کافی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ عنوان "سائنس اور اسلام" اپنی لفظی حیثیت میں جس قدر سہل اور مختصر ہے' اسی قدر اپنی معنوی وسعت اور وقت کے لحاظ سے طویل اور صعب ترین ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ عنوان تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک سائنس' دوسرے اسلام' تیسرے ایک درمیانی عطف' اس لئے قدرتی طور پر اس کے ماتحت تین امور کی تشریح مقرر کے ذمہ عائد ہو جاتی ہے۔ ایک سائنس کا مفہوم اور اس کی حقیقت' دوسرے اسلام کا مفہوم اور اس کی حقیقت' تیسرے ان دونوں کی باہمی نسبت اور اس کا حاشیتین سے ارتباط اور پھر ایک چوتھی چیز ان تین سے خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ان تین امور کا مقتضی ہے۔ یعنی اگر سائنس اور اسلام اور ان کی درمیانی نسبت واضح ہو جائے تو یہ ایک واقعہ کا اثبات ہوگا۔ مگر ہر واقعہ محض ایک واقعہ کی حیثیت سے ایک افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جب تک کہ اس سے کوئی عمل کوئی حکم اور کوئی طلب نہ پیدا ہو۔ اس لئے چوتھا مقصد یہ ہوگا کہ ان تین ثابت شدہ حقائق کا ہم پر تقاضا کیا ہے اور یہ واقعات ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس تقریر کے موضوع سے تین مقصد پورے ہو جاتے ہیں جن پر اس مضمون کی بنیاد ہوگی اور سائنس اور اسلام کی حقیقت' سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت اور اسلام اور سائنس سے پیدا شدہ موعظت۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں امور جس قدر اہم ہیں اسی قدر میری نسبت سے صعب اور مشکل ہیں' اول تو اسلامی حقائق ومقاصد ہی پر سیر حاصل روشنی ڈالنا ایک بے مایہ طالب علم کے لئے یقیناً دشوار گزار ہے۔ تاہم اگر اس حیثیت سے کہ مجھے علماء کی ایک مرکزی جماعت (علماء دارالعلوم دیوبند) کی جوتیوں میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور هم القوم لایشقی جلیسهم کے قاعدے کے مطابق میں کوئی ایک آدھ جملہ اسلام کے

مقاصد کے متعلق کچھ بھی دوں تو بہرحال سائنس تو میرے لئے ہر صورت میں ایک نئی چیز اور اجنبی ہے۔ نہ میں اس کے اصول سے واقف ہوں نہ فروع سے باخبر اور نہ فنی حیثیت سے مجھے اس کے مبادی اور مقاصد سے کوئی تعارف حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ جملہ کے اطراف میں سے اگر ایک طرف بھی گوشہ چشم سے ایک طرف رہ جائے تو طرفین کی درمیانی نسبت پر روشنی ڈالنا کس قدر مشکل ہے؟ تاہم جب کہ ایک محترم جماعت کی طرف سے مجھے مامور کیا گیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ من اللہ ایک طلب ہے اس لئے غیبی امداد کی توقع پر جرأت ہوتی ہے کہ عنوان زیر نظر پر اپنی بساط کے موافق کچھ کلام کروں اور سامعین سے اپنی اغلاط کے سلسلہ میں عفو و مسامحت کی درخواست کر کے امیدوار تسامح رہوں۔

حضرات! اس وقت جو حدیث میں نے تلاوت کی ہے وہ عنوان مذکورہ کی تینوں جہات پر انتہائی جامعیت کے ساتھ حاوی ہے اور اس میں میرے علم و فہم کے مطابق پہلے سائنس کی جوہری حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ گویا اس کا مغز اور لب لباب کھول کر سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اسلام کی اصلیت واشگاف فرمائی گئی اور پھر ان دونوں چیزوں کی باہمی نسبت اس انداز سے آشکارا کی گئی ہے۔ جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے مقصودیت کی شان کس کو حاصل ہے اور وسیلہ محض ہونے کی کس کو؟ اور پھر یہ کہ اس وسیلہ سے اس کے مقصود کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور پھر حصول مقصد کے بعد اس پر کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں جن کی توقع پر تحصیل مطلوب کی سعی کی جائے۔

ہاں مگر حدیثی حقائق کھولنے سے پیشتر مناسب ہے کہ میں سائنس کا موضوع متعین کردوں تاکہ اس پر انضباط کے ساتھ بحث کی جاسکے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ فن سائنس کے موضوع کی تعیین فن کی حیثیت سے میری قدرت میں اس لئے نہیں کہ میں نے اس فن کی تعلیم نہیں پائی۔ البتہ اس کے مشہور اور زبان زد آثار کو سامنے رکھ کر اپنی ذہنی سعی سے سائنس کا جو کچھ موضوع متعین کر سکتا ہوں اسی کو عرض کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ اگر میں اس میں غلطی کروں گا تو اس مرکز کے اہل فن اور سائنس دان استاذ مجھے اس غلطی پر قائم نہ رہنے دیں گے۔

فن سائنس کا موضوع

حضرات! اس دور ترقی میں جب تمدنی ایجادات اور مادیات کے نئے نئے انکشافات کا چرچا ہوتا ہے تو بطور تکملہ سائنس کا ذکر بھی ساتھ ہی ساتھ ہوتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ دور حاضر نے اپنی اعجازی کروٹ سے دنیا کو دیوانہ بنا دیا۔ مثلاً وسائل خبر رسانی کے سلسلہ میں ٹیلیفون اور ٹیلیگراف سے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا' ریڈیو اور لاسلکی اور دوسرے ایسے ہی برقی آلات سے عالم کو مبہوت کر دیا تو ساتھ ساتھ سائنس کا ذکر بھی ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کے سنہری آثار ہیں یا مثلاً وسائل نقل و حرکت کے سلسلہ میں جب ریل' موٹر' ہوائی جہاز اور دوسری بادپا سواریوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو ساتھ ہی سائنس کا نام بھی لیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اسی کا طفیل ہے یا مثلاً صنائع و حرف کے سلسلہ میں لوہے لکڑی کے خوشنما اور عجیب و غریب سامان تعمیرات کے نئے نئے ڈیزائن اور نمونے سیمنٹ اور اس کے ڈھلاؤ کی نئی نئی ترکیبیں اور انجینئری کی نت سے نئی اختراعات جب سامنے آتے ہیں تو سائنس کا نظر فریب چہرہ بھی سامنے کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب اسی کے خم ابرو کی کارگزاریاں ہیں' اس طرح نباتاتی لائن میں زراعتی ترقیات' پھل اور پھول کی افزائش کے جدید طریقے اور نباتات کے نئے نئے آثار و خواص کے متعلق انکشافات کا نام جب لیا جاتا ہے تو وہیں سائنس کا نام بھی پورے احترام کے

ساتھ زبانوں پر آجاتا ہے۔

اسی طرح حیوانی نفوس میں مختلف تاثیرات پہنچانے کے ترقی یافتہ وسائل اور آپریشنوں کی عجیب و غریب پھر تیلی صورتیں، کیمیاوی طریق پر فن دوا سازی کی حیرتناک ترقی، تحلیل و ترکیب کی محیر العقول تدبیریں، بجلی کے ذریعہ معالجات کے صورتیں جب زبانوں پر آتی ہیں کہ یہ سب اسی کے درخشندہ آثار ہیں۔ اس سے میری ناقص عقل نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا ہے کہ موضوع عمل موالید ثلاثہ، جمادات، نباتات اور حیوانات کے دائرے سے باہر نہیں ہے۔

پھر چونکہ ان ہر سہ موالید کی ترکیب عناصر اربعہ، آگ، پانی، ہوا، مٹی سے ہوتی ہے جو تقریباً ایک مسلمہ چیز ہے اور اس لئے اس پر کسی استدلال کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے گویا سائنس کا موضوع بلحاظ حقیقت عناصر اربعہ ٹھہر جاتے ہیں۔ جن کی خاصیت اور آثار کا علماً سمجھنا اور پھر کیمیاوی طریق پر ان کی تحلیل و ترکیب کے تجربات سے عملاً نئی نئی اشیاء کو پردہ ظہور پر لاتے رہنا سائنس کا مخصوص دائرہ علم و عمل ہو جاتا ہے۔ پس سائنس کی یہ تمام رنگ برنگ تعمیریں درحقیقت انہی چار ستونوں (عناصر اربعہ) پر کھڑی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد اگر اس تفصیلی حقیقت کا مختصر عنوان میں خلاصہ کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کا موضوع "مادہ اور اس کے عوارض ذاتیہ" سے بحث کرتا ہے اور بس جو بھی مادیات میں زیادہ سے زیادہ منہمک رہ کر ان کے خواص و آثار سے کام لینے والا ثابت ہو گا وہی سب سے بڑا سائنس دان اور بہترین ماہر سائنس کہلائے جانے کا مستحق ہو گا۔

موضوع متعین ہو جانے کے بعد اب سائنس کے اس چورنگ مادہ، آگ، پانی، ہوا، مٹی پر جس کا مرتب بیان حدیث زیب عنوان میں کیا گیا ہے، ایک ذرا سا غور فرمایئے تو محسوس ہو گا کہ

عناصر کی قوتوں کا باہمی تفاوت اور اس کا اصولی معیار

ان چاروں عنصروں کے خواص و آثار اور ذاتی عوارض یکساں نہیں بلکہ کافی حد تک متفاوت ہیں اور نہ صرف عوارض و آثار ہی میں تفاوت ہے بلکہ خود ان کی جوہری طاقتیں بھی ایک درجہ کی نہیں ہیں۔ ان میں کوئی عنصر ضعیف ہے، کوئی قوی، کوئی قوی تر ہے اور کوئی اقوی تر ہے۔ اور پھر یہ قوت و ضعف کا تفاوت بھی بے جوڑ یا اتفاقی نہیں، بلکہ معیاری ہے۔ وہ معیار یہ ہے کہ ان عناصر میں سے جس میں بھی لطافت بڑھتی گئی ہے، اسی قدر اس کی طاقت بھی بڑھتی گئی ہے اور پھر طاقت ہی کے اندازہ سے اس میں غلبہ و تسلط اور اقتدار کی شان قائم ہوتی گئی ہے اور جس حد تک لطافت کم ہو کر کثافت کے لئے جگہ خالی کرتی گئی ہے اسی قدر اس عنصر میں کمزوری آتی گئی ہے۔ پھر کمزوری کی قدر اس میں بے بسی، مغلوبیت اور ذلت و پستی بھی نمایاں ہوتی گئی ہے۔

راز اس کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ لطافت ایک وصف کمال ہے جو کثافت کی ضد ہے اور ہر وجودی کمال کا مخزن حضرت واجب الوجود کی ذات بابرکات ہے۔ اس لئے لطافتوں کا منبع بھی وہی ہے اور اسی قاعدہ سے بوجہ لطافت طاقتوں کا منبع بھی وہی ہے۔ چنانچہ اس کی بے انتہائی لطافت کا عالم تو یہ ہے کہ آنکھوں سے او جھل حواس و خیال کی حدود سے بالاتر اور ادراک و انکشاف کی حد بندیوں سے وراء الوراء ہے۔ پھر ان کی بے انتہا طاقت کا کرشمہ یہ ہے کہ تمام جہانوں پر اپنی اور صرف اپنی شہنشاہی کا نظام محکم کئے ہوئے ہے۔ اس لئے جس

چیز میں بھی لطافت کا کوئی کرشمہ ہے وہ در حقیقت اسی کی ذات وصفات کا کوئی پرتو ہے۔ جس کا اثر بقدر استعداد اس نے قبول کرلیا ہے اور جب کہ قبول اثر بغیر کسی مناسبت کے نہیں ہوتا' اس لئے یہ کہا جانا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ ہر لطیف شی کو بقدر لطافت حق تعالیٰ سے مناسبت ہے اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی کسی چیز کو ذات بابرکات کے ساتھ قرب وتناسب قائم ہوگا وہ اسی قدر قوی' غالب اور بااقتدار بنتی جائے گی۔ ادھر کثائف کو اس کی ذات سے بے انتہا بعد اور بیگانگی ہے کہ وہاں کثافت کا نشان نہیں۔ اس لئے جو چیز بھی بقدر کثافت اس لطیف وخبیر سے دور پڑتی جائے گی' اسی وجہ سے پست مغلوب اور ذلیل ہوتی جائے گی اور اس میں سے غلبہ واستیلاء کی شان نکلتی جائے گی۔ بلکہ اسی طرح جس طرح پانی سے کوئی چیز قریب ہوجائے تو اس میں پانی کے آثار برودت ورقت وغیرہ سرایت کرتے چلے جائیں گے۔ آگ سے قریب ہوجائے تو حرارت و سخونت وغیرہ آثار راسخ ہوجائیں۔ مٹی سے قریب ہوجائے تو یبوست اور خشکی کے آثار گھر کا جائیں۔

اسی طرح جو چیز کسی وصف کے ذریعہ بھی ذات بابرکات حق سے قرب ومناسبت پیدا کرلے گی' وہ اسی حد تک بقدر استعداد شؤن ربانی اور صفات کمالیہ کا مرکز و محور بنتی چلی جائے گی اور ضرور ہے کہ اس میں استیلاء واستغناء کا ظہور ہوا اور وہ قوی تر' غالب تر اور رفیع المنزلت ہوتی جائے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ حسیات میں قرب بھی حسی ہوتا ہے اور آثار قرب بھی محسوس طریق پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر اس کی بارگاہ رفیع میں حس کی رسائی نہیں۔ اس لئے اس کا قرب بھی حسی ہونے کے بجائے وصفی ہوتا ہے۔ یعنی جو چیز اخلاقی واوصاف کے لحاظ سے قرب ومناسبت کا درجہ حاصل کرلے گی وہی اسکے کمالات سے بقدر استعداد حصہ پانے لگے گی اور اسی حد تک غلبہ وتسلط اور استغناء واستیلاء اس کے حصہ میں آجائے گا۔

عنصر خاک

اس معیار کے ماتحت جب ہم عناصر اربعہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے زیادہ کثیف عنصر "مٹی" نظر آتا ہے' جس کا مخزن یہ زمین ہے۔ یہ خاک کا ڈھیر کثیف ہی نہیں بلکہ کثافت آور بھی ہے۔ ساری چیزوں میں اگر کثافت وغلاظت آتی ہے تو اس مٹی ہی کی بدولت آتی ہے۔ آگ نے آج تک کسی چیز کو گندہ اور غلیظ نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ آگ پر پکانے کی وجہ سے کسی چیز میں غلاظت آجائے۔ سو یہ غلاظت آگ میں سے نہیں آتی بلکہ آگ اس شے کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے جس سے اس کا اصل مادۂ غلیظہ باقی رہ کر نمایاں ہوجاتا ہے اور شے غلیظ معلوم ہونے لگتی ہے۔ سو آگ اس میں کوئی چیز ڈالتی نہیں بلکہ اس سے کچھ نکال لیتی ہے۔ پس یہ غلاظت آگ میں سے نکل کر نہیں آتی بلکہ خود اس شے کی ذات میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے' جب کہ آگ اس کا جوہر لطیف کھینچ لیتی ہے' اسی طرح پانی کسی چیز کو مکدر اور غلیظ نہیں بناتا بلکہ اس کی بدولت تو غلاظتیں اور کدورتیں صاف کی جاتی ہیں کہ اس کی اصلیت پاکی اور پاکبازی ہے۔

اسی طرح ہوا بھی کسی چیز کو مکدر اور گندہ نہیں کرتی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہوا میں غیر محسوس طریقہ پر اجزاء ارضیہ ملے ہوئے چلے آئیں اور کسی شے کو مکدر بنادیں تو پھر یہ کدورت بھی زمین ہی کا فیض ہوگا نہ کہ ہوا کا۔ اس لئے انجام کار ساری کثافتوں کی جڑ یہ خاک دھول بنتی ہے' جس کو لطافت سے دور کی بھی کوئی مناسبت نہیں۔ اس لئے عام عناصر میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ آپ ساری ہی زمین کے اس طویل وعریض کرہ کو لے لیجئے اس میں بجز پامالی اور ذلت ومسکنت کے اور کوئی جوہر دکھائی نہ دے گا۔ یہ زمین رات دن روندی جاتی ہے' مگر ذلت وپستی کا یہ عالم ہے چوں تک نہیں کرسکتی۔ نہ اس میں ادراک ہے نہ احساس نہ غلبہ

ہے نہ اقتدار اگر غلبہ ہے تو دوسرے تمام عناصر کا خود اسی پر ہے۔ گویا سارے ہی عناصر کا قدم اس کے سر پر ہے اور ہر ایک عنصر کا یہ کھلونا ہے۔ ہوا اسے اڑائے پھرتی ہے' پانی اسے بہائے پھرتا ہے' آگ اسے جھلستی رہتی ہے مگر یہ ذرا بھی زور نہیں دکھاسکتی کہ زور ہو تو دکھائے۔ طاقتیں تو اس کی کثافت مطلقہ نے سلب کر رکھی ہیں' زور آئے تو کہاں سے آئے؟ پھر فقدان لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس کا مادہ بھی کثیف اور صورت بھی کثیف' اسے کتنا ہی صیقل کرو' مگر سطح پھر بھی کرکری ہی رہے گی' نہ چکناہٹ قبول کرے گی نہ چمکاہٹ۔ پھر نہ صرف کثیف المادہ اور کثیف الصورت ہی ہے' بلکہ کثیف الطبع بھی ہے۔ ایک ڈھیلے کو کتنا ہی زور سے اوپر پھینکو' جب تک پھینکنے والے کا عارضی زور اس کے ساتھ رہے گا وہ اونچا ہوتا جائے گا' لیکن جب اس کی اصلی حالت اور عرضی طبیعت عود کرے گی تو پھر نیچے ہی آپڑے گا۔ بہر حال جب کہ زمین کے مادۂ صورت اور طبیعت میں کسی جہت سے بھی لطافت نہیں گویا اسے ذات اقدس سے اس وصف میں بعد مطلق حاصل ہے تو ضعف مطلق اور ذلت مطلقہ بھی اسی عنصر کے حصہ میں آنی چاہئے تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے زمین کو ذلیل ہی نہیں' بلکہ ذلول فرمایا ہے۔ جو ذلت کا مبالغہ ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا۔

ہاں اس زمین کا ایک جزء پہاڑ بھی ہیں۔ جن کی مٹی یعنی ریت نے بہ نسبت غبار کے کچھ لطافت و ستھرائی قبول کر کے کدورت و کثافت سے قدرے بعد پیدا کر لیا تو اس کی شان اسی حد تک مٹی سے فائق ہو گئی۔ چنانچہ خشک ریت کو اگر جھاڑ دو تو بکھر جاتی ہے۔ پانی ڈالو تو کیچڑ نہیں بنتا۔ اس کے ذرات کو دیکھو تو چمک بھی اٹھتے ہیں۔ اس پر نظر ڈالو تو خاکی بہ نسبت نظر فریب بھی ہے۔

حتی کہ بعض اوقات اس کی صاف ستھری صورت اور اس کی آب و تاب دیکھ کر پانی اور دریا کا بھی شبہ ہو جاتا ہے غرض جس حد تک اس میں لطافت و ستھرائی آئی تھی' اسی حد تک وہ بہ نسبت غبار کے عزیز الوجود بھی ہو گیا۔ اس کی قدر و قیمت بھی بڑھ گئی اور پھر اس کی ترکیب سے اگر پتھر اور پتھروں کی ترکیب سے پہاڑ بنے تو ان کی عظمت و شان اور قدر و قیمت زمین کی سطح سے کہیں دوبالا ہو گئی۔ چنانچہ مٹی کی نسبت سے پتھروں کی طاقت کا یہ عالم ہے کہ مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں بلکہ مٹی کی پختہ سے پختہ اینٹوں کو ایک پتھر سے چکنا چور کر دیا جاسکتا ہے۔ لیکن مٹی کے تودے پتھروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر پہاڑ کی کوئی چٹان زمین پر آگرے تو زمین دہل جاتی ہے اور دب جاتی ہے اور اس میں گہرا غار قائم ہو جاتا ہے لیکن اسکے برخلاف مٹی کا منوں ڈھیر بھی اگر کسی سنگین چٹان پر آپڑے تو اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ اسے شکستہ بنائے۔ نہ وہ ہلتی ہے اور نہ اس میں غار پڑتا ہے۔ پھر انہی پتھروں میں بھی جوں جوں صفائی ستھرائی اور جلا بڑھتی جاتی ہے ان کی قیمت اور معنوی طاقت بھی ترقی کرتی جاتی ہے ___ سنگ خارا عام پتھروں سے قیمتی' سنگ مرمر اس سے زیادہ قیمتی' جواہرات اور لعل و یاقوت اس سے زیادہ قیمتی ہیرا اس سے قیمتی۔ فرق ہے تو وہی لطافت و کثافت اور غلاظت و صفائی کا ہے۔ زمین کی سطح تو اس حد تک کثیف تھی کہ اسے کتنا ہی صیقل کرو' لیکن ہاتھ پھیرنے سے کامل چکناہٹ کبھی محسوس نہیں ہو سکتی۔ لیکن پتھروں میں بوجہ لطافت مادہ یہ قابلیت ضرور ہے کہ اگر انہیں صیقل کرو تو مسکہ کی طرح املس اور چکنے ہو جاتے ہیں۔ پھر بعض میں چمک پیدا ہو جاتی ہے اور بعض جھٹمٹا سا عکس بھی دکھلانے لگتے ہیں۔ پس پتھروں نے جس حد تک بھی صفائی قبول کی اسی حد تک ان میں شدت و قوت پیدا ہو گئی۔

بہرحال پہاڑ اور ان کا مادہ بہ نسبت زمین اور اس کے غبار کے لطیف ہے اس لئے طاقتور بھی ہے اور زمین سے کہیں زیادہ شدت وصلابت اور قوت کا مالک ہے۔ پس وجۂ شدت وقوت وہی لطافت و ستھرائی نکل آئی ہے۔

لیکن یہی پہاڑ اور ان کے شدید القوی پتھر جن کی شدت کے سامنے زمین تھر تھرا بھی نہیں سکتی تھی اور پامال محض تھی' اسی وقت تک شدید ہیں جب کہ زمین کی خاک دھول سے ان کا مقابلہ ہو تا رہے۔ لیکن اگر کہیں پہاڑوں کی ان شدید ومدید چٹانوں کا سامنا لوہے سے ہو جائے تو پھر ان کی یہ ساری سنگدلی ہوا ہو جاتی ہے۔ لوہے کی ایک بالشت بھر کھدال بڑی بڑی چٹانوں کا منٹوں میں فیصلہ کر دیتی ہے۔ وزنی وزنی پتھروں کو چکنا چور ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ریل کی پٹڑیوں پر یہ دو طرفہ لاکھوں من پتھروں کے ڈھیر انہی پہاڑی پتھروں کے جگر پارے ہیں جو چھوٹی چھوٹی کھدالوں کی برکت سے مٹی اور لائن دبانے کی خدمت پر لگا دیے گئے اور اپنی بے انتہاء رفعت سے گر کر اس بے انتہا پستی پر آ گئے تھے۔ ان پتھروں پر لوہے کی کھدالیں اس طرح پڑتی ہیں' جیسے ایک بے دست وپا قیدی کے سر پر کوڑے اور بید پڑتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ لوہا پتھروں سے زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ کیوں؟ راز اس کا بھی وہی لطافت ہے۔ لوہے کے اجزا نے خلقی طور پر پتھروں کے ریتہ سے زیادہ صفائی اور ستھرائی قبول کی ہے اور اس میں مٹی تو کیا ریت جیسی بھی کثافت نہیں ہے۔

لوہے کا برادہ اڑتا نہیں پھرتا کہ چیزوں کو آلودہ کر دے۔ ریتہ اگر پانی میں بھی پڑ جاتا ہے تو بہرحال اسے کسی نہ کسی حد تک مکدر کر دیتا ہے کہ آخر کار خاک ہی ہے۔ مگر لوہے کے اجزاء اگر برادہ کر کے بھی پانی میں ڈال دیئے جائیں تب بھی اس کی جلا اور رقت وسیلان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر لوہے پر پالش کر دی جائی تو چاندی کی طرح چمک اٹھتا ہے بلکہ اسے صیقل کر دو تو آئینہ بن جاتا ہے جو باریک سے باریک خدوخال تک کا عکس دکھلانے لگتا ہے لیکن پتھر میں نہ ایسی پالش قبول کرنے کی استعداد ہے اور نہ وہ اس طرح کے صیقل ہونے کی صلاحیت ہی اپنے اندر رکھتا ہے۔ پس اگر پتھر منجمد ہو کر اشیاء کی ذات کا سراپا کسی حد تک نمایاں کر سکتا تھا تو لوہا اس سراپا کی تمام باریک سے باریک خوبیاں بھی عیاں کر سکتا ہے۔ اس لئے لوہے کی لطافت پتھروں سے کہیں زیادہ نکلی۔ بس اسی لطافت کی بنا پر لوہا تو پتھروں پر گراں اور طاقتور ہے اور پتھر اپنی کثافت کی بنا پر اس کے سامنے ذلیل وخوار ہے۔ بس بڑے سے بڑا پہاڑ بھی اپنے اس نمایاں عظمت وہیبت کے باوجود ذرا سے لوہے کے سامنے اپنے عجز کو نہیں چھپا سکتا۔

عنصر آتش

لیکن یہی طاقتور لوہا جس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا بڑے بڑے پہاڑوں نے لوہا مان رکھا ہے۔ جب ہی تک طاقتور ہے جب تک کہ پتھروں کے سر پر ہے لیکن اگر اسی لوہے کو کہیں آگ چھو جائے یا لوہے کا بڑے سے بڑا ٹکڑا کسی لوہار کی بھٹی میں پہنچ جائے تو اس کا رنگ روپ متغیر اور چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی صورت نوعیہ اور ذاتی خاصیت تک کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ آگ اس کے جگر تک میں گھس کر اسے ہم رنگ آتش بنا ڈالتی ہے۔ پھر اگر اس غریب لوہے کو آگ کی بھٹی سے تھوڑی دیر اور نہ چھڑایا جائے تو آگ اسے گلا کر پانی کی طرح بہا دیتی ہے اور اس کی شدت وصلابت کی کچھ بھی پیش نہیں جاتی۔ کوئی اب اس لوہے سے کہے کہ پہاڑ کی ایک چھوٹی سے چھوٹی ٹکڑی کا ہی سر کچل دے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگ لوہے سے بھی زیادہ شدید اور طاقتور ہے۔ غور کرو تو اس کا راز بھی وہی عقلی اور طبعی اصول ہے کہ آگ میں لوہے سے بھی زیادہ لطافت موجود ہے اور لوہا اس کے مقابلے میں کثیف ہے۔ لوہے میں اگر اتنی لطافت تھی کہ وہ باوجود پتھروں کی طرح کثیف المادہ ہونے کے عوارض کے سبب رقت وسیلان قبول کر لیتا تھا تو آگ اپنی ذات سے کوئی ٹھوس جسم نہیں رکھتی، جس میں کوئی چیز گھس نہ سکے۔ ادھر تو ہر چیز آگ کے جگر میں گھس سکتی ہے اور ادھر آگ بھی ہر چیز کے جگر تک میں سرایت کر جاتی ہے۔ جس کی صلاحیت لوہے میں نہیں پھر لوہا اگر کسی وقت چمک کر باہر سے نورانی شعاعیں قبول کر لیتا تھا تو آگ کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ اس میں خود بخود شعاعیں پھوٹتی ہیں۔ یعنی لوہا دوسروں کی روشنی قبول کرتا ہے اور آگ اپنی روشنی خود دوسروں پر ڈالتی ہی۔ خود بھی روشن ہے اور دوسری تاریک چیزوں کو بھی روشن کر سکتی ہے۔ پھر صیقل شدہ لطیف لوہا جسے آئینہ کہتے ہیں اس لطافت صورت کے باوجود پھر بھی اتنا ثقیل الجسم اور کثیف المادہ ہے کہ اگر اس پر ہاتھ مارو تو اس کی متکاثف جسم سے ہاتھ ٹکرا کر واپس آجاتا ہے لیکن آگ کی جسمانی لطافت کا عالم یہ ہے کہ اس کے جسم میں سے ہاتھ آرپار نکل جاتا ہے اور پھر اس کا جسم بھی نہیں ٹوٹتا۔ پھر صیقل شدہ لوہا تو صرف عکس ہی قبول کرتا ہے لیکن آگ اصلی جسم ہی کو قبول کر لیتی ہے اور پھر بھی اس کے جسم میں پھٹن نہیں پائی جاتی اور وہ کسی دوسرے جسم کے تداخل سے مانع نہیں ہوتی اس لئے وہ لوہے سے زیادہ شدید اور زیادہ طاقتور ہے بلکہ وہ اسی لطافت کی حد تک اس کا حلقہ اثر بھی کثیف الاشیاء کی نسبت وسیع ہو گیا ہے۔ پتھر اور لوہا جہاں رکھا ہوا ہے اتنی ہی جگہ اس سے پر ہو جاتی ہے اور اس حد سے باہر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن آگ جس مکان میں ہے اس سے باہر تک اس کے اثرات، نورانیت و حرارت پہنچتے ہیں اور اگر آگ اور اس کا مکان نگاہوں سے اوجھل بھی ہو تب بھی اس کے پھیلنے والے آثار اس کے وجود کی خبریں دور دور تک پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس لئے آگ لوہے پر غالب ہے اور اسے فنا کے گھاٹ اتار ڈالتی ہے۔

عنصر آب

لیکن یہی دہکتی ہوئی آگ اور اس کا یہ کروفر جب ہی قائم ہے جب تک اس کے آس پاس کہیں پانی کا نشان نہ ہو۔ اگر پانی کے چند قطرات بھی اس پر آگریں تو آگ کی چمک دمک اور یہ تعلی و ترفع سرنیچا ہی نہیں کرتی بلکہ سب ختم ہو جاتی ہے۔ پانی اس کے وجود ہی کو باقی نہیں چھوڑتا کہ وہ کچھ ابھر سکے۔ بلکہ جس لکڑی کو کچھ دیر آگ سے اپنی جان بچانا ہے وہ پانی کی چادر اوڑھ لے یا نمناک ہی ہو جائے۔ آگ چمک مار کر رہ جائے گی، لیکن اس کا گیلی لکڑی پر کوئی بس نہ چلے گا۔

بہرحال جہاں پانی موجود ہو، آگ کے پر نہیں جم سکتے۔ خواہ پانی آگ پر چھڑک دو یا آگ پانی میں گرادو آگ کی خیر نہیں رہتی۔ بڑے سے بڑا انگارہ پانی پر گرادو تو اس کے گرتے ہی پانی ادھر ادھر ہٹ جائے گا اور پھر اچانک چاروں طرف سے سمٹ کر اس انگارے کو دبوچ لے گا تو وہ غریب روسیاہ ہو کر رہ جائے گا۔

غرض یہ اس کے سامنے آئے یا وہ اس کو سامنا کرے، ہر صورت میں پانی کی طاقت کے سامنے آگ کی شعلہ زنی کچھ کارگر نہیں ہوتی۔ جس سے پانی کی شدت وطاقت آگ پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن اس غلبہ و مغلوبیت کی روح یہاں بھی وہی اصول ہے جس کو ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں، آگ اپنی لطافت جسم کے سبب کسی شے کی ذات کو اپنے اندر کھپا لیتی تھی، لیکن اس کا چہرہ اتنا صاف نہ تھا کہ اشیاء کا عکس قبول کر سکے۔ مگر پانی عکس اور اصل دونوں کو اپنے اندر کھپا لیتا ہے کہ وہ فقط لطیف المادہ ہی نہیں بلکہ لطیف الصورت بھی ہے۔

یعنی کچھ ہی اس میں ڈال دو ہر چیز اس کے قعر اور جگر میں سما جائے گی۔ پھر اس رقت و سیلان کے باوجود اس کا چہرہ یا سطح اس قدر صاف اور شفاف ہے کہ آئینہ کی طرح صورت بھی دکھلا سکتا ہے۔ پانی کی یہ صفت کہ ہر چیز اس کے آر پار نکل جاتی ہے گو آگ کو بھی میسر ہے۔ لیکن پانی کا کمال لطافت یہ ہے کہ نگاہ تک بھی اس سے پار ہو جاتی ہے۔ جو آگ میں ممکن نہیں۔ پس پانی لوہے کی تصویر کشی اور آگ کے عدم تکاثف دونوں لطافتوں کا جامع ہے اس لئے اس کی قوت بھی آگ اور لوہے کی قوت سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تو آگ اور لوہے دونوں کو ختم کر سکتا ہے، لیکن یہ دونوں اس پر غالب نہیں آسکتے اور اسی لئے پانی کا حلقہ اثر بھی آگ سے زیادہ وسیع ہے۔ آگ کا اثر اگر اسے کسی بند اور محدود مکان میں روشن کیا جائے، اسی مکان کی چہار دیواری تک محدود ہوگا۔ لیکن پانی جس مکان میں مسدود ہے، اس سے باہر بھی دور دور تک نمی اور رطوبت کے آثار پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ شہر کے ارد گرد تالاب اور نہریں ہوتی ہیں، تو آب وہوا ہی نہیں، لوگوں کے مزاج تک مرطوب ہو جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب اس کی لطافت اور سرعت نفوذ کے کرشمے ہیں، لوہا اور آگ مسامات میں نہیں گھستے، لیکن پانی بوجہ لطافت خاص باریک سے باریک منفذ میں گھر کر لیتا ہے اور جب کہ غلبہ وطاقت بقدر لطافت ہے تو پانی کی طاقت بھی بلاشبہ آگ سے کہیں بڑھ کر رہی۔

عنصر ہوا

اب آگے چلو، یہی پانی جو آگ کا تہس نہس کر دیتا ہے، ہوا کے سامنے یہ مسکین بھی عاجز اور ناتواں ہے اور اس کی کچھ پیش بھی نہیں جاتی۔ وہ چلتی ہوا میں اگر سکون سے رہنا چاہے تو نہیں رہ سکتا۔ ہوا کے جھکڑ جب چلتے ہیں تو تالاب اور جھیلیں ہی نہیں بڑے بڑے سمندر تہ وبالا ہو جاتے ہیں۔ پانی کی موجیں بلکہ فوجوں کی فوجیں ایک دوسرے پر گرتی پھرتی پڑتی ہیں۔ سمندر کے عظیم الشان کرہ کو بایں عظمت وہیبت قرار نہیں ہوتا۔ ٹھہرا ہوا پانی ہو تو ہوا اسے خشک کر ڈالتی ہے اور اڑا دیتی ہے۔ اگر پانی کا کوئی مخزن و منبع نہ ہو جو اس کی مدد کرے تو پانی کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا پانی پر بھی غالب اور حکمران ہے وجہ وہی اصول ہے کہ ہوا سب عناصر سے بڑھ کر لطیف و شفاف ہے۔ چنانچہ اس کے جسمانی لطافت کا تو عالم ہے کہ نگاہ جیسی لطیف چیز بھی اس کی لطافت کے سامنے لطیف ہے، جو اس پر جم نہیں سکتی اور ہوا کو دیکھ نہیں سکتی۔ بدن کو لگ کر گو ہوا محسوس ہو جائے جس سے اس کے جسم ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اور کوئی لطیف سے لطیف حاسہ حتی کہ تار نگاہ بھی جو الطف ترین اجسام ہے، نہ اس میں نفوذ کر سکتا ہے نہ اس کا ادراک ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہوا اپنی شدت لطافت کے سبب رنگ و روپ کو بھی قبول نہیں کرتی کہ یہ چیزیں بہر حال نگاہ وبصر ہی سے متعلق ہیں اور وہ بصر ہی کو قبول نہیں کرتی، تو محسوسات بصر تک کیا نوبت پہنچ سکتی ہے۔ ہاں آواز اور خوشبو جیسی لطیف اشیاء جن کی نہ کوئی حسی شکل ہے نہ ہیئت ہوا سے ساز کر لیتی ہے اور اپنی لطافت کی بدولت ہوا میں سما جاتی ہے۔ جنہیں ہوا قبول کر کے ادھر سے ادھر منتقل کر دیتی ہے۔

پھر اثر کا یہ عالم ہے کہ فوق و تحت کے گوشہ گوشہ اور ایک ایک منفذ میں موجود جہاں آگ کی روشنی اور پانی کی نمی نہیں پہنچ سکتی، وہاں ہوا قائم اور دائم ہے ذرا بھی کہیں خلا پیدا ہو جائے تو ہوا کو آتے دیر نہیں لگتی، پانی کو بھی لاؤ تو نالی بناؤ، نشیب پیدا کرو اور پھر بھی اس کی نقل و حرکت میں تدریج۔ لیکن ہوا کو نہ نشیب کی ضرورت نہ فراز کی، جگہ ہوئی اور وہ دفعۃً آئی۔ گویا پہلے سے موجود تھی۔ غرض ہوا لطیف تر تھی تو قوی تر اور غالب بھی ہوئی جو تمام عناصر پر حکمران سب سے بالا و فوق اور پھر سب میں ساری و جاری ہے۔

جامع العناصر انسان اور اس کی طاقت

لیکن اگر ان سارے عناصر اور ان کے تینوں موالید' اور موالید کی بھی بے انتہا شاخوں کو ایک طرف رکھ کر تنہا انسان کو ایک طرف رکھو تو نظر آتا ہے کہ انسان ان سب ہی سے زیادہ اشد' اقویٰ اور ان پر غالب و متصرف ہے۔ یہ سب عناصر اپنی کارگزاری میں اس کے محتاج اور اس سے مغلوب ہیں۔ لیکن وہ ان میں سے کسی کے زیر تصرف اور کسی سے مغلوب نہیں کیونکہ اولاً تو عناصر کی باہمی اور نسبتی طاقت جو ایک دوسرے کے مقابل آنے سے کھلتی ہے' اپنے جزئیاتی ظہور میں انسان کی محتاج ہے۔ لوہا خود بخود پتھروں کو کچلتا نہیں پھرتا۔ آگ جگہ جگہ لوہے کو خود گرماتی اور پگھلاتی نہیں پھرتی۔ پانی خود بخود آگ بجھانے نے نہیں جاتا۔ ہوا کی یہ جزوی متصادم حرکات خود بخود نہیں ہو جاتیں بلکہ انسان کے لئے ہوتی ہے۔ وہی کھدالیں بناتا ہے اور پتھر توڑتا ہے' وہی بھٹیاں بناتا ہے اور لوہے کو تپاتا ہے' وہی مشکیزے اور ظروف میں پانی لاتا ہے اور چولہے ٹھنڈے کرتا ہے' وہی ہوا کو قید کرتا ہے اور سیالات کو اڑاتا ہے۔ پس عناصر کی یہ متغلبانہ کارفرمائی بہت حد تک انسانی افعال کی دست نگر ہے۔ اگر انسان ان میں دخل نہ دے تو عناصر اربعہ اپنے اپنے خزانوں میں پڑے ہوئے جیسے چاہیں اینٹھتے رہیں' لیکن میدان مقابلہ میں پہنچ کر ان جزوی افعال میں اپنا تغلب نہیں دکھلا سکتے۔ پس جس پر کسی غالب کا غلبہ موقوف ہوا اور جس پر کسی قوی کی فتح و نصرت معلق ہو' ظاہر ہے کہ وہ ان سب پر غالب ہوگا اور اس کی اشدیت کی یہی سب سے بڑی دلیل ہوگی۔

عناصر میں انسانی تصرفات

۲: پھر یہی نہیں کہ انسان ان کی باہمی نسبت کھول دینے ہی کا ایک ذریعہ ہے نہیں بلکہ ان کی یہ تمام طاقتیں بھی اس کے پنجہ تصرف و تسخیر میں قید ہیں' زمین کا قلب و جگر چاک کر دیا' کنوئیں بنائے' راستے بنائے' تہ خانے تیار کئے' ارضی معدنیات' سرمہ' ہڑتال' سونا' چاندی اور پیتل وغیرہ کے خزانے اس سے چھین لئے' پہاڑوں کو تراش کر تہ بتہ مکانات بنائے' پہاڑوں اور برفانی چوٹیوں کو جہاں درندوں کو بھی پناہ نہ ملتی تھی' اپنی بستی منا کر ان میں راستے نکالے انہیں برما کر ان میں سرنگیں بنائیں' ان میں سواریاں دوڑائیں وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا زمین کے خزائن و دفائن کا راز فاش کر کے اثقال زمین کو عالم آشکار کر دیا اور زمین اور اس کے اجزاء سے برابر نوکروں چاکروں اور غلاموں کی سی خدمت لے رہا ہے۔

پانی کو لو تو زمین کی تہ میں سے اسے کھوج نکالا' کنوئیں کھود کر ڈول رسی کے جال سے اسے پکڑا' نل لگا کر سینکڑوں فٹ نیچے سے اوپر کھینچ نکالا۔ دریاؤں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ نہروں اور نالیوں میں بہا کر کھیت سیراب کئے۔ مکانات ٹھنڈے کئے۔ پی کر کلیجے ٹھنڈے کئے۔ جمنا اور گنگا جگہ جگہ ماری پھرتی ہے اسے واٹر ورکس کے ذریعہ گھر گھر رسوا کیا۔ وہ مائی تھی تو جگہ جگہ اس بچہ نے اس سے گو موت دھلوا کر چھوڑا۔ پانی جیسا آزاد عنصر ٹنکیوں میں قید نلوں میں بند اور نکلنے میں براسکاک کی حرکت کا محتاج۔ یہ سب انسان کی تسخیر کا نتیجہ ہے' وہ غریب اپنے طبعی میلان سے نیچے کو جاتا ہے یہ اسے بیس بیس منزلہ مکانوں میں اوپر چڑھا لے جاتا ہے اور پھر وہاں سے نیچے دیتا ہے۔ کبھی برف بنا کے اسے جما دیا' کبھی بھاپ بنا کر اڑا دیا' کبھی آگ دکھا کر گرما دیا غرض وہی پانی جس سے آگ جیسا قوی عنصر بھی پناہ مانگتا تھا' انسان کے سامنے ایسا بے بس اور بے یار و مددگار ہے کہ اسے سنبھلنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔

پانیوں کا سب سے بڑا گھر اور ابو السیاہ سمندر اعظم کہ جس کی بے پناہ عظمت سے ڈر کر دنیا کا ربع مسکون گویا ایک طرف پڑا ہوا ہے اور جس کی کوہ پیکر موجوں کا لگا تار سلسلہ خشکی کے کناروں پر اس طرح حملہ آور محسوس ہوتا ہے کہ گویا ابھی کرہ زمین کو نگل جائے گا۔ بایں ہیبت و عظمت بھی انسانی دست برد سے نہ بچ سکا۔ انسان نے سمندروں کے جگر چیر ڈالے۔ اس میں جہاز چلائے' تار دوڑائے۔ آبدوز کشتیوں سے اس کی گہرائیوں پر قبضہ کیا۔ اس کے مدفون مورچوں کے خزانے اگلوائے۔ اس کی تہ کی چھپی ہوئی چیزیں بازاروں میں رسوا ہو رہی ہیں۔ خود سمندر کے نمکین پانی کو بھی تحلیل کر ڈالا۔ ان کا نمک الگ کر دیا رطوبت الگ۔ گویا پانی کا خون تک پی گیا اور پھر اس کے سب نکلے الگ کر لئے۔ غرض یہ قوی تر پانی زمین کی تہ میں جا کر چھپتا ہے تو اسے پناہ نہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو اس کو رستگاری نہیں۔ مجبور بھی ہے' قید بھی۔ پھر ذلیل سے ذلیل خدمتیں اس سے لی جا رہی ہیں۔ نجاستوں کا دھونا' ظروف صاف کرنا' میلے کپڑے پاک کرنا وغیرہ اس کے سر ہیں جس سے اندازہ کر لیا جائے کہ انسانی طاقت نے کس درجہ اس لطیف عنصر کو اپنا غلام اور پابند قیدی بنا لیا ہے۔ آگ جیسے خونخوار عنصر کو دیکھو تو وہ انسان کے سامنے ایک خاکسر غلام کی طرح مجبور ہے۔ وہ لوہے اور پتھروں میں جا کر چھپتی ہے تو انسان لوہے اور پتھر کو ٹکرا کر آگ کی مخفی چنگاریاں کھینچ لیتا ہے۔ وہ آفتاب میں جا کر چھپتی ہے انسان نے آتشی شیشوں کے ذریعہ ان کو گرفتار کیا اور پھر جب خود اسے چھپانے اور قید کرنے پر آیا تو ایک ذرا دیا سلائی کے سرے پر رتی برابر مسالہ میں قید کر دیا۔ جب چاہا دیا سلائی کا سرا رگڑا اور اس قیدی کو نکال باہر کیا۔ گویا وہ آگ جو سر نیچا ہی نہ کرتی تھی انسان کے سامنے تنکے چننے لگی اور اس کی وہ رفعت و تعلی خاک میں مل گئی۔ کہیں چولہوں میں انسان کی خدمت کر رہی ہے' کہیں انگیٹھیوں میں محبوس ہے' کہیں اس کا تزکیۂ نفس کیا تو آگ کا گیس بنا دیا جس کا دھواں اور دخان سب رخصت ہو گیا۔ غرض آگ کا عنصر بھی انسان کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے۔ جب چاہا اور جس طرح چاہا الٹ پلٹ کر دیا۔ جسے کسی حالت میں بھی چین نہیں۔

ہوا بہت زیادہ لطیف اور مخفی تھی' جس پر انسان کی نگاہ تک فتح نہ پا سکی تھی' مگر اس کی یہ پردہ نشینی بھی انسان کی زد سے اسے نہ بچا سکی اور اس اڑتے ہوئے پرندہ کو بھی انسان کے ہاتھ میں کھلونا ہی بننا پڑا۔ ہوائی فضا میں انسانوں کے جہاز اڑ رہے ہیں اور اپنے کندھوں پر انہیں سوار کئے پھر رہی ہے ہوا گیا ہے انسان کا ایک ہوائی گھوڑا ہے۔ جس پر بے لگام اس نے سواری کس رکھی ہے۔

انسان کی خبر رسانی کی خدمت پر جدا مجبور ہے۔ مشرق سے مغرب تک انسان کے افسانے دوڑ رہے ہیں اور ہوا اپنی مخفی طاقتوں سے انہیں لئے پھر رہی ہے۔ گویا انسان کی ایک چھٹی رسان ہے جو بلا اجرت غلامی کر رہی ہے۔

ادھر برقی پنکھوں کو حرکت میں لانے کے لئے جدا ناچ رہی ہے تاکہ انسان کا پسینہ خشک کرنے کی خدمت انجام دے۔ غرض خدمت گزاری کے فرائض میں چاکروں کی مانند مصروف ہے اور چون و چرا نہیں کر سکتی۔ پھر انسان اسے قید کرنے میں اترا تو موٹروں کے پہیوں میں وہ بند' سائیکلوں کے ٹائروں میں وہ قید' برتنوں میں وہ گرفتار اور ربڑ کی گیندوں میں وہ محبوس۔

غرض یہ نادیدہ طاقت جس نے سمندروں کو تہ و بالا کر رکھا تھا' پھنسی تو ایسی پھنسی کہ انسان کے ہاتھ میں ایک قیدی محض بن کر رہ گئی۔ جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

عناصر میں انسانی ایجادات

۳ : پھر اس ظالم انسان کو اسی پر قناعت نہیں کہ عناصر کو باقی رکھ کر ہی ان سے کام لیتا رہے' نہیں اپنی ایجاد پسندی کے جذبہ میں انہیں فنا کر کر کے اور انہیں باہم لڑا لڑا کر بھی ان سے نئی نئی چیزیں عالم آشکارا کرتا رہتا ہے تاکہ کائنات کے دوسرے مدفون خزانوں سے بھی اپنی غلامی کرائے۔ آگ پانی کے درمیان لوہے کا پردہ حائل کر کے آگ کو دھونکا۔ آگ تو جوش میں پانی کو اڑا دینا چاہتی ہے اور پانی کھول کھول کر آگ کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا ہے۔ دونوں اپنی جگہ غیظ و غیظ میں ہیں اور انسان ان کے جوش و خروش سے اسٹیم کی طاقت پیدا کر کے انجن اور مشینیں چلا رہا ہے' لاکھوں ٹن لوہا اس بھاپ کی مخفی طاقت پر ناچ کر رہا ہے۔ مل چل رہے ہیں' مشینیں گھوم رہی ہیں' انجنوں میں کوئلہ کی کانیں پھنک رہی ہیں' مشینوں میں غلہ اور زمین کی پیداوار پس رہی ہے۔ گویا ساری کائنات چکی جا رہی ہے۔ مٹ رہی ہے مگر اف نہیں کر سکتی کہ ایک انسان کا بچہ مشین کی کل دبائے کھڑا ہے جس کی انگلی کی ہر کت سے عناصر اربعہ اور موالید ثلاثہ پر یہ طوفان بپا ہو رہے ہیں۔

پھر پانی کو پانی سے ٹکرایا اور برق پیدا کر لی گویا پانی میں آگ لگا دی۔ پھر وہ بجلی جو سیکنڈوں میں اقلیموں کی خبر لیتی اور آسمان و زمین ایک کر ڈالتی ہے' اسے تانبے اور جست کے ایک پتلے سے تار میں اس طرح باندھ رکھا ہے کہ وہ بایں زور و طاقت اس گرفت سے باہر نہیں جا سکتی۔ ایک ذرا سی پیتل کی گھنڈی جسے سوئچ کہتے ہیں اس کا قفل ہے۔ اسے نیچے کو ہلا دو تو بجلی آموجود اور اوپر کو اٹھا دو تو غائب۔ گویا برقی رو کی ایک عظیم الشان فوج ایک دبلے پتلے سپاہی کی قید میں گرفتار ہے' اور وہ پوری فوج اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر یہ مصنوعی ہی بجلی نہیں' آسمانی بجلی کی گرفتاری کے لئے بھی انسان ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لئے تیار ہے۔ بڑی بڑی بلڈنگوں پر چھپٹے تار چڑھائے ہوئے ہیں کہ اگر یہ جہاں سوز بجلی عمارت پر آپڑتی ہے تو یہی معمولی سا تار اسے الجھا دیتا ہے۔ اور وہ عمارت کو ذرہ برابر آنکھ محض دکھا نہیں سکتی بلکہ اس تار میں غلطاں پیچاں ہو کر رہ جاتی ہے۔

پیٹرول جیسی سیال اور بہتی چیز میں آگ لگا دی۔ آگ اور تیل لڑ رہے ہیں جس سے گیس پیدا ہو رہا ہے اور حضرت انسان کی موٹر چل رہی ہے' ہوائی جہاز اڑ رہے ہیں۔

غرض ساری کائنات کے ناک میں دم ہے۔ ایک مشت استخوال سے کائنات کا ذرہ ذرہ عاجز ہے۔ عناصر نے باہم اپنی طاقتوں کے کیا جوہر دکھائے تھے جو اس مجموعہ عناصر نے کر دکھایا۔ بحر و بر اور خشکی و تری کی ساری ہی کائنات اس ظالم انسان کی بدولت ایک مصیبت میں گرفتار ہے کہ اسے کسی وقت چین نہیں اور انسان ہے کہ رات دن ان عناصر کے الٹ پھیر میں انتھک طریق پر لگا ہوا ہے۔ جس سے ساری کائنات کا دم بند ہے اور سارے جماد و حیوان قید و غلامی میں مقید ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ ایک شیر نے اپنے خورد سالہ بچہ کو نصیحت کی تھی کہ انسان سے بچتے رہنا۔ یہ بڑی چیز ہے۔ وہ انسان کے شوق دید میں تھا۔ کچھ شعور پا کر انسان کی تلاش میں نکلا کہ دیکھوں آخر یہ کیا بلا۔ جس سے سلاطین صحرا بھی اپنے دار السلطنت میں بیٹھ کر کپکپاتے ہیں' چلا تو پہلے اتفاق سے گھوڑے پر نظر پڑی۔ جس کی جسامت اور پھرتی و چالاکی کو دیکھ کر اسے شبہ ہوا کہ شاید یہ ہی انسان ہے' پوچھا تو گھوڑے نے کہا کہ مجھ بیچارے کی کیا مجال ہے کہ میں انسان کے سامنے ٹھہر سکوں چوبیس گھنٹے گلے میں رسی پیروں میں بیڑیاں اور اصطبل کا جیل ہے اور جب حضرت انسان کا جی چاہا تو میری پیٹھ پر سوار منہ میں لگام اور اوپر سے تڑاتڑ کوڑوں کی مار۔ جیسی مجھ پر گزرتی ہے میں ہی جانتا ہوں۔

شیر کا بچہ سہم گیا کہ یا اللہ کیا بلا ہے انسان کہ عناصر ہی نہیں۔ موالید بھی گرفتار بلا ہیں۔ آگے بڑھا تو

اونٹ نظر پڑا جو گھوڑے سے دوگنا اور عجیب الخلقت تھا۔ اسے یقین آ گیا کہ ہو نہ ہو یہی انسان ہے یہ گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے اس سے دریافت کیا تو اسے بھی انسان سے دوہائی دیتے ہوئے سنا' وہ بولا کہ میرے اس قد و قامت پر نہ جاؤ۔ انسان نے بایں جسامت و قامت میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ میں کیا سینکڑوں مجھ جیسے میرے بھائی بند' صرف ایک نکیل میں گرفتار اور ایک خوردسال بچہ ہمیں جنگل در جنگل لئے پھرتا ہے۔ منوں بوجھ کمر پر ہے۔ ہم بلبلاتے ہیں مگر شنوائی نہیں۔ انسانوں کے لئے ہماری گردنیں سیڑھیاں ہیں۔ جب چاہتا ہے کمر پر دھرا جاتا ہے۔ پھر ایک نہیں دو نہیں تین تین آدمی لد جاتے ہیں اور نہ صرف خود لدتے ہیں' بلکہ بڑے بڑے پلنگ ہماری کمروں پر کس کر براجمان ہوتے ہیں۔ ہم چپ چاپ کان دبائے منزلیں قطع کرتے رہتے ہیں۔ راتوں چلتے ہیں اور دنوں بلبلاتے ہیں۔ مگر کوئی مخلص نہیں نکلتا۔

غرض ہماری یہ ساری مصیبت و غلامی صرف اسی انسان کی بدولت ہے۔ بھلا ہم انسان تو کیا ہوتے' ہم تو اس کا نام بھی بے خوف ہو کر نہیں لے سکتے۔

شیر کا بچہ اور بھی زیادہ ہراساں ہوا کہ خدا جانے انسان کیسے ڈیل ڈول کی چیز ہو گی جس سے ایسے عظیم الخلقت جانور پناہ مانگ رہے ہیں۔ آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی پر نظر پڑ گئی۔ جو ایک عظیم الشان بلڈنگ کی طرح سے سامنے سے آتا ہوا نظر پڑا۔ جس کی عمارت چار بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی ہوئی تھی' اسے یقین محکم ہو گیا کہ یہ بالضرور انسان ہے اور یہی ایسی ہستی ہے جو اونٹوں اور گھوڑوں پر غالب آ سکتی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے کہا کہ غالباً جناب ہی کا نام نامی انسان ہے؟

ہاتھی نے نہایت حیرت سے بچۂ شیر کو دیکھا اور کہا کہ بیٹا تم نا سمجھ ہو۔ کس بری بلا کا نام لے رہے ہو' مجھ ایسے لمبے ڈول کی جو گت اس ظالم انسان نے بنائی ہے' خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ گھوڑے کے منہ میں لگام تو دے دیتا ہے' اونٹ کی ناک میں نکیل تو پہنا دیتا ہے' لیکن مجھ پر تو بے ڈھانٹی سوار ہوتا ہے لگام میرے نہیں' نکیل میرے نہیں' مگر پھر بھی ایسا گرفتار اور مجبور محض ہوں کہ اس ظالم کے آگے چوں تک نہیں کر سکتا۔ ہر وقت میری گردن پر سوار لوہے کا آنکس ہاتھ میں' ذرا چوں کروں تو سر پر اتنے پڑتے ہیں کہ کھایا پیا بھول جاتا ہوں۔ میری کیا مجال ہے کہ انسان کے سامنے اف بھی کر سکوں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے باپ کی وصیت پر عمل پیرا رہیں اور اپنی جنگل کی بادشاہت کی حرمت قائم رکھیں' اس انسان کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ ورنہ یہ شاہزادگی ساری کرکری ہو جائے گی اور کوئی پھر فریاد کو بھی نہ پہنچے گا۔

شیر کا بچہ حیران تھا کہ انسان آخر کس تن و توش کا ہو گا' جس کے غلبہ و تسلط کا چار دانگ عالم میں یہ شہرہ اور شور نشور برپا ہے۔ آخر کار اس نے بے نیل و مرام واپسی کا قصد کر لیا۔ لوٹ رہا تھا کہ ایک بن میں ایک بڑھئی کے بچہ کو دیکھا کہ وہ ایک بڑے شہتیر کو آرے سے چیر رہا ہے اور جتنا چیر چکا ہے اس میں ایک کھونٹی گاڑ رکھی ہے' بچۂ شیر کا التفات بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہی انسان ہے لیکن پتہ لینے کے لئے اس سے سوال کیا کہ جناب انسان سے واقف ہیں؟ اس نے کہا کہ آپ کو کیا کام ہے؟ کہا کہ میں اس کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا بندہ ہی انسان کہلاتا ہے۔ شیر نے حقارت و تعجب سے دیکھ کر کہا ارے کیا تو ہی وہ انسان ہے۔ جس سے شیر' گھوڑا' اونٹ سب لرزتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں واقعہ تو یہی ہے' بچۂ شیر نے کہا کہ او دشمن تو ہے کیا؟ تیرا کام تو میں ابھی اپنے ایک طمانچہ سے ختم کئے دیتا ہوں۔ بڑے ہی بیوقوف میرے آباؤ اجداد تھے جو تجھ سے کانپتے رہے اور بڑے احمق وہ تھے جنہوں نے راستے میں مجھے خوامخواہ سہما دیا۔ اس لاف زنی کے ساتھ بچۂ شیر آگے بڑھا تاکہ قوت آزمائی کرے۔ بڑھئی کے بچے نے سمجھ لیا کہ وقت آ پڑا ہوا۔ اب تدبیر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کہا کہ واقعی آپ بڑے بہادر ہیں' میں بے چارہ کیا چیز ہوں' آپ جو چاہیں فرمائیں' اس وقت

میرا ایک کام درپیش ہے جسے میں اپنے ضعف کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتا۔ خدا نے آپ جیسا قوی اور بہادر بھیج دیا۔ پہلے وہ کام کر دیجئے‘ پھر میرے ساتھ جو چاہے سلوک فرمائیے اور وہ یہ ہے کہ اس شہتیر میں سے یہ کھونٹی سرکانا چاہتا ہوں۔ ذرا اپنا ہاتھ اس شہتیر کے شگاف میں ڈال کر اسے تھام لیجئے تاکہ میں کھونٹی سرکادوں۔ شیر صاحب اس مدح وثناء سے مسحور ہو کر بے تکلف آگے بڑھے اور ایک نہیں دونوں ہاتھ شگاف میں ڈال دیئے۔ بڑھئی کے بچہ نے کھونٹی نکال لی۔ کھونٹی کا نکلنا تھا کہ شہتیر کے دونوں پلٹ مل گئے اور شیر صاحب کے دونوں ہاتھ اس میں پھنس کر رہ گئے‘ اب شیر صاحب نے تو چیں چیں کرنا شروع کیا اور بڑھئی کے بچہ نے ہنسنا شروع کیا کہ فرمائیے انسان کو دیکھ لیا؟ اس وقت شیر نادم ہوا کہ واقعی تجربہ کاروں اور بڑوں کی نصیحت سے روگردانی کا انجام برا ہوتا ہے۔ مگر پھر سوچنے لگا کہ ظاہر میں تو یہ انسان بڑا ہی کمزور اور حقیر ہے۔ اس کا جثہ تو قطعاً طاقتور نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں کوئی اندورنی طاقت ہے جس سے اس نے مجھے اس وقت بے بس کر دیا اور ساری کائنات کو پچھاڑے رکھا ہے۔ یہ حکایت عبرت اور انسانی طاقت سامنے لانے کے لئے بس کرتی ہے۔ ان مشاہدات کی رو سے ماننا پڑتا ہے کہ انسان میں ان عناصر سے کہیں زیادہ طاقت موجود ہے جب ہی وہ ایک چھوٹے سے جثہ میں کم سے کم ہونے کے باوجود بھی عناصر کے مخزنوں اور موالید کے جثوں پر بھاری ہو رہا ہے اور ان کے غلبہ کے ساتھ ہر قسم کے تصرفات اور حاکمانہ کارروائیاں کرنے میں کسی سے مغلوب نہیں‘ اور جب یہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں لطافت بھی عناصر سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ کیونکہ پہلے یہ اصول ثابت ہو چکا ہے کہ طاقت درحقیقت لطافت ہی میں ہے کہ کثافت میں بجز ضعف ودرماندگی کے اور کچھ نہیں۔

پس انسان میں جب ہوا سے بھی زیادہ طاقت ہے جو الطف العناصر تھا تو ناگزیر ہے کہ اس میں لطافت بھی ہوا سے کہیں زیادہ ہو تاکہ وہ اس پر اپنی یہ طاقتور حکمرانی برقرار رکھ سکے۔

انسانی طاقت وتسخیر کا راز اس کی روح میں مضمر ہے

مگر یہ ظاہر ہے کہ انسان کے ظاہر میں تو کوئی لطیف چیز محسوس نہیں ہوتی نہ وہ صیقل شدہ آئینہ یا صاف پانی کی سی چمک رکھتا ہے کہ اس میں منہ نظر آنے لگے نہ وہ خود ہی ایسا روشن ہے کہ فضا میں اس سے شعاعیں پھوٹتی ہوں اور روشنی نکلتی ہو نہ وہ ہوا کی طرح غیر مرئی ہے۔ پھر اس میں یہ لطافتوں کو زیر کر دینے کی لطافت آخر کہاں مخفی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ طاقت اور لطافت اس کے بدن کی نہیں ہو سکتی کہ بدن تو وہی آگ‘ پانی‘ مٹی‘ ہوا کا مجموعہ ہے۔ اگر اس بدن میں کوئی طاقت بھی ہو تو پھر بھی وہ بے چارہ اس تھوڑے سے آگ پانی سے سارے جہان کے اس آگ پانی پر کیا غلبہ حاصل کر سکتا تھا۔ یہ بدنی آگ پانی تو خود آفاقی آگ پانی سے لیا ہوا ایک قلیل سا جزء ہے اور جزء قلیل اپنے کل پر کیا غالب آ سکتا ہے۔ ایک قطرہ دریا کو کیا مغلوب کر سکتا ہے؟ ایک چنگاری کرہ نار پر کیا تسلط جما سکتی ہے؟ ایک ذرہ کرۂ ارض پر کیا حکومت کر سکتا ہے؟ بلکہ اس صورت میں تو قصہ برعکس ہونا چاہئے تھا کہ یہ مادی جہان خود انسان پر ہر حیثیت سے غالب رہتا اور اسے دم بخود رکھتا‘ چہ جائیکہ اس مشت خاک سے ساری کائنات آپ وگل مسخر ہو جائے اور خود اسی کا دم اس ضعیف البنیان کے سامنے بند ہو؟ پس یہ تسخیر یقیناً اس کے بدن اور بدنی آب وآتش یا ہوائی لطافتوں کا کام نہیں ہو سکتی‘ بلکہ انسان کی یہ غلبہ پانیوالی قوت بلاشبہ ایسی ہونی چاہیے جو آگ پانی تو کیا ہوا سے بھی لطیف تر ہو کہ ہوا جیسی غیر مرئی چیز کی ٹکر تو انسان کو محسوس بھی ہوتی ہے‘ اس کی لطافت وہ ہو کہ باوجود انسان کے رگ وپے میں سمائے

ہوئے ہونے کے کبھی اس کا دھکا تک انسان کو نہ لگا ہو۔ بلکہ کبھی اس کی لمس ومس تک کا بھی اسے احساس نہ ہوا ہو۔ وہ متصل تو اتنی ہو کہ انسان اس سے ملے بغیر اپنی ہستی کو باقی نہ رکھ سکے اور منفصل ایسی ہو کہ انسان کے کسی حاسہ کی رسائی اس تک نہ ہو۔ خود اس پر کوئی سرد وگرم نہ پہنچ سکے۔ اس لئے وہ فقط اپنے بدن پر ہی نہیں بلکہ جہان کے عناصر اربعہ پر غالب آجائے اور ظاہر ہے کہ بدن کو چھوڑ کر انسان میں روح کے سوا اور کون سی چیز ہو سکتی ہے، جس کی یہ صفات ہوں کہ ان دو ہی سے انسان مرکب ہے۔ یعنی انسان میں یہ طاقت نہیں۔

روح انسانی کی لطافت اور حسی نورانیت

یہ کرشمے ہیں تو دوسرے ہی جزو میں ہو سکتے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ روح عناصر اربعہ ہی نہیں۔ تمام مادی عالموں سے بھی زیادہ لطیف چیز ہے۔ پھر روح کی یہ لطافتیں نہ صرف معنوی اور غیر مرئی ہی ہیں بلکہ حسی طور پر بھی اس کی لطافتیں عالم آشکارا ہیں۔ خود عناصر میں جتنی اقسام کی لطافتیں تھیں، اگر غور کرو تو وہ بھی سب کی سب روح میں جمع ہیں۔

اگر صیقل شدہ آئینہ یا شفاف پانی صورتوں کا عکس اتار لیتا تھا تو انسان کی آنکھوں کو روح نے ایک ایسی چمک دے رکھی ہے کہ جدھر اٹھ جاتی ہے ادھر کے تمام نقشے، فوٹو اور سیزیاں اپنے اندر اتار لیتی ہے۔ آئینہ کا فوٹو تو بے اصل محض ہے کہ پشت آئینہ خالی ہے، لیکن آنکھ کا فوٹو بے اصل نہیں کہ اس کے پیچھے حس مشترک میں اس کا پورا مصور علم قائم ہے۔

اگر آگ سے تار شعاع پھیلتے ہیں تو آنکھوں سے تار نگاہ منتشر ہوتے ہیں جو ان شعاعوں سے کسی طرح کم نہیں، کیونکہ یہ تار شعاع سے تو چیز کی صورت محض آنکھ ہی کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں اور تار نگاہ سے یہ سب چیزیں دل کے سامنے روشن ہو جاتی ہیں جو ان کی حقیقت پر بھی غور کر سکتا ہے۔

اگر پانی غایت لطافت سے اجسام میں نفوذ کر جاتا ہے اور سخت سے سخت جسم بھی اس کے سریان سے نہیں بچ سکتا، جب کہ اس سے اتصال قائم ہو جائے تو روح بھی جسم کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہوتی ہے حتیٰ کہ سخت سے سخت ہڈیاں بھی اس سے تازگی لئے ہوئے ہوتی ہیں، پھر پانی تو اپنے سریان سے اپنے محل کو محض ٹھنڈا ہی کئے ہوئے رہتا ہے اور روح اپنے دوران سے اپنے محل کو زندہ کئے ہوئے ہوتی ہے۔

اگر ہوا غایت لطافت سے دکھلائی نہیں دے سکتی تو روح بھی اپنی لطافت بے غایت سے آج تک نادیدہ ہے، اور جیسے ہوا کا رنگ وبو غیر محسوس چیز ہے یا ہے ہی نہیں۔ ایسے ہی روح بھی ان خواص سے بری ہے۔

غرض عناصر میں لطافت کے جو جو کمالات اور لطافت کے جس قدر مراتب و درجات تھے، وہ سب روح میں موجود ہیں۔ اس لئے اگر عناصر کو حق تعالیٰ سے جزوی مناسبتیں تھیں اور اس بنا پر وہ قوی تھے تو روح کو بحیثیت مجموعی اس سے یہ ساری مناسبتیں قائم ہیں۔ اس سے وہ عناصر سے زیادہ قوی ہونی چاہیے اور جو کام عناصر کر سکتے ہیں وہ سب اس سے بے تکلف سرزد ہو جانے چاہئیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ عناصر کو تو ____ ان کی طاقتوں کی بنا پر درجہ بدرجہ اشد کہا جائے اور روح کو اشد ترین نہ کہا جائے۔ اس لئے عنصری اور مادی طاقتوں پر روحانی طاقتوں کے فوقیت لے جانے کی ایک یہی وجہ کافی ہو سکتی ہے کہ عناصر جزوی لطافتیں رکھتے ہیں اور روح ان کی ساری لطافتوں کا جامع ہے اور انہیں ذات بابرکات سے جزوی مناسبتیں ہیں، تو روح کو کلی مناسبت ہے۔

روح انسانی کی معنوی لطافت وطاقت

لیکن اگر مزید غور کرو تو روح کو حق تعالیٰ سے محض عناصر ہے کی سی مناسبت نہیں یا بالفاظ دیگر محض مناسبت ہی نہیں بلکہ ایک جہت سے ایسی مماثلت بھی حاصل ہے کہ وہ اس کے مخصوص اوصاف وکمالات کے لئے بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے اور عناصر اس کے لگ بھگ بھی نہیں رہ سکتے کہ وہ سرے ہی سے ان کمالات سے عاری اور کورے ہیں۔ مثلاً حق تعالیٰ اگر غیر مرئی طریق پر تمام عالم کا قیوم اور مدبر ہے تو اسی طرز پر روح کائنات بدن کی قیوم اور مربی ہے۔ وہ ذرا اپنی توجہ ہٹالے تو کائنات بدن درہم برہم ہوجائے جیسا کہ موت کے وقت ہوجاتا ہے۔

پھر جس طرح حق تعالیٰ کے انوار ساری کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ افروز ہیں اور ہر ہر خطہ اور اس کے ہر ہر جزو سے اس کے مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجود اس ظہور تام کے پھر بھی آج تک کسی آنکھ نے اسے نہیں دیکھا۔ اسی طرح روح کے انوار بدنی کائنات میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں کہ ہر ہر عضو سے اس کے مناسب کام لے رہے ہیں اور باوجودیکہ بدن کی رگ رگ میں روح کا ظہور ہے' آنکھ کی چمک میں' رخسار کی سرخی میں' بالوں کی سیاہی' دانتوں کی سفیدی میں' بدن کی تازگی میں اسی کا جلوہ ہے۔ وہ نہ ہو تو یہ سارے جلوے ایک آن میں ختم ہوجائیں۔ مگر باوجود اس ظہور تام کے پھر بھی آج تک ایسی نادیدہ ہے کہ خود اپنا نفس بھی اس کے دیدار سے محروم ہے۔

بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ سے جلوہ آشکار
اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

پس جیسے وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ ایسے ہی روح ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ پھر جس طرح اس ساری کائنات کی زندگی اور زندگی کی ہر نقل وحرکت سے ذات حق اول اور اقدام ہے کہ وہی تو معطی وجود ہے اور وجود سے پہلے کوئی بھی اقدام ممکن نہیں۔ آپ عالم کا کوئی اقدام ایسا نہیں پیش کرسکتے کہ وہ ہوجائے اور ذات حق تعالیٰ اس کے بعد آئے۔ اس کے بغیر تو کائنات کی زندگی ہی نہیں اور بلا زندگی اس کی کوئی نقل وحرکت ہی ممکن نہیں' تو مخلوق خالق سے پہلے کیسے ہوسکتی ہے؟ ضرور ہے کہ ہر مخلوق اور مخلوق کے ہر فعل سے خالق کی ذات مقدم ہو۔ پھر اسی طرح کائنات کی ہر نقل وحرکت کا منتہیٰ بھی اس کی ذات ہے۔ آپ عالم کا کوئی اقدام بھی ایسا پیش نہیں کرسکتے کہ وہ ذات حق سے گزرتا ہوا آئے' پہنچ جائے اور ذات حق کو ادھر ہی چھوڑ آئے۔ کیونکہ جب ذات حق ہی سے اس کائنات کی زندگی قائم ہے۔ تو یہ دعویٰ ایسا ہوگا کہ کائنات اپنے افعال کرتی ہوئی زندگی کی حد سے گزر جائے اور پھر بھی اس کے افعال جاری رہیں جو عقلاً ناممکن ہے۔ پس عالم کے ہر حرکت وسکون کا منتہیٰ بھی اس کی ذات نکلتی ہے۔ اس کے آگے اور بعد کچھ نہیں۔ وہی ہر چیز کا اول بھی ہے اور وہی آخر بھی۔ جیسے کہ وہی ظاہر تھا اور وہی باطن بھی۔ ٹھیک اسی طرح بدنی کائنات کی ہر نقل وحرکت بلکہ اس کی نفس ہستی ہی سے روح اول بھی ہے اور آخر بھی' کیوں کہ جب روح ہی بدن کے لئے باعث ہستی وحیات ہے تو کسی زندہ کا کوئی اقدام زندگی سے قبل کیسے ہوسکے گا۔ پس ہر کام بلکہ بدن کے ہر کام کے اول روح آتی ہے۔ اور اسی طرح جب کہ روح ہی بدن کے لئے باعث حیات ہے تو کائنات بدن کا کوئی اقدام بھی حیات سے مؤخر نہیں ہوسکتا بلکہ آخر اور منتہائے حیات بھی یہی رہے گی۔ پس روح ہی اس بدن عالم کے لئے

اول بھی ہوئی اور آخر بھی۔ جیسا کہ وہی ظاہر تھی اور وہی باطن بھی۔ پھر جیسا کہ ذات حق عالم سے متصل تو اتنی ہی ہے کہ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ اور وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَمَا كُنْتُمْ اور پھر منفصل بھی اتنی کہ وراء الوراء ثم وراء الوراء، مخلوق ظلمت محض اور وہ نور مطلق ہے

اے برتر از خیال وقیاس وگمان و وہم

ٹھیک اسی طرح روح بھی بدن سے متصل تو اتنی ہے کہ زندہ بدن کی کسی رگ کا کروڑواں حصہ بھی اس سے الگ نہیں ورنہ زندہ نہ رہے۔ لیکن دور بھی اتنی ہے کہ اس کی پاکیزگیاں بدن سے کوئی لگاؤ ہی نہیں رکھتیں۔ لطیف و کثیف میں کیا تناسب اور کیا رشتہ؟ کجا یہ مشت خاک اور کجا وہ جوہر پاک' چراغ مردہ کجا نور آفتاب کجا؟

صفات روح سے الہیات پر استدلال

ان مماثلوں کے سبب جس طرح ہم تشبیہ کے سلسلہ میں ادھر سے ادھر آئے ادھر سے ادھر بھی جا سکتے ہیں۔ یعنی اپنی ہی روحانی کائنات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی یکتائی اور بے چونی پر استدلال بھی کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح یہ ہماری بدنی کائنات بلا اس غیر مرئی مدبر یعنی روح کے موجود اور باقی نہیں رہ سکتی اسی طرح یہ ساری کائنات عالم بھی بلا کسی مدبر حکیم کے موجود اور بقا پذیر نہیں ہو سکتی۔ پس روح کی بدولت وجود صانع پر ہمارے ہی اندر سے دلیل نکل آئی۔

پھر جس طرح بدن میں ایک ہی روح تدبیر بدن کر سکتی ہے۔ اگر دو ہوں تو کائنات بدن فاسد ہو جائے کہ ایک میان میں دو تلواریں اور ایک اچکن میں دو انسان نہیں سما سکتے۔ اسی طرح کائنات عالم میں ایک ہی واحد و قیوم اور حکیم و مدبر کی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے ورنہ لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا کا ظہور ہو جائے گا۔ پس روح کے طفیل ہمارے ہی نفوس میں سے توحید صانع کی دلیل بھی پیدا ہو گئی۔

پھر جس طرح بدن کے قعر تک میں گھس جانے سے روح کا کوئی کم و کیف کوئی لون و رنگ اور کوئی سمت وجہت نہیں دکھائی دے سکتی اسی طرح وہ ذات بابرکات بھی بے چون و بے چگون اور سمت و سمات سے مبرا اور رنگ و لون سے منزہ ہے کہ رنگ برنگ کے جلوے تو اس سے ہیں' مگر وہ ہر رنگ سے بری و بالا ہے۔ پس روح کی بدولت اس کی شان تنزیہ و تقدیس بھی ہمارے ہی اندر سے ہویدا ہو گئی۔

پھر جس طرح روح بدن کے ذرہ ذرہ میں موجود اور بدن کی رگ رگ سے اس کا تعلق وابستہ ہے۔ مگر تعلقات کی شدت وضعف کا یہ تفاوت بھی ناقابل انکار ہے کہ جو تعلق قلب سے ہے وہ دماغ سے نہیں۔ جو دماغ سے ہے وہ کبد و معدہ سے نہیں اور جو ان سے ہے وہ عام جوارح بدن سے نہیں۔ اسی لئے قلب و دماغ کی ادنیٰ ایذاء یا توہین سے روح میں غصہ و جوش پیدا ہو جاتا ہے اور ان اعضاء رئیسہ پر ادنیٰ سی ضرب بھی پڑ جانے سے روح اپنی حیات کو سمیٹ لے جاتی ہے۔ بخلاف عام اعضاء کے کہ اگر ہاتھ پیر بھی کاٹ دیئے جائیں تو کمال زندگی خواہ چھن جائے مگر نفس زندگی مسلوب نہیں ہوتی۔

اسی طرح ذات بابرکات کا جلوہ جہانوں کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ مگر مواضع کے تفاوت سے تعلق کی شدت و ضعف میں بھی تفاوت ہے کہ جو تعلق اس کی ذات کو عرش عظیم سے ہے وہ اور مقامات سے نہیں کہ مرکز استواء ہے' پھر جو تعلق بیت المعمور سے ہے اور سماوی مواضع سے نہیں کہ وہ قبلہ ملائکہ ہے' پھر جو تعلق

بیت اللہ اور مسجد اقصیٰ یا حرم نبوی سے ہے وہ اور جگہوں سے نہیں ہے۔ اس لئے اگر ان کی کوئی توہینی کا یا جارحانہ اقدام ہو تو روح اعظم کا غضب بھڑک اٹھتا ہے۔ عالم میں ہیجان شروع ہو جاتا ہے اور دنیا کی زندگی خطرہ میں پڑجاتی ہے۔ حتیٰ کہ بیت اللہ کی اینٹیں اکھڑ جانے پر بھی اس عالم سے زندگی کھینچ لی جائے گی۔ پس روح کی بدولت ہم پر اللہ کے تعلقات کی نوعیت بھی منکشف ہوگئی۔

پھر جس طرح ہر شخص اپنی روح کی پکار اور حقانی دعوت کو دل کے کانوں سے بے تکلف سنتا ہے اور اس کی نصیحتوں کو قلب کے واسطہ سے ادراک کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے کلام میں نہ لفظ ہیں نہ آواز۔ یہی شان حق تعالیٰ کے کلام کی ہے کہ کلام بھی ہے' اس میں حقائق بھی ہیں' اس میں سماع بھی اور اسماع بھی ہے۔ اور مخصوص افرادِ بنی آدم (انبیاء علیہم السلام) جو بنی نوع انسانی میں مثل قلب کے ہیں' اسے سنتے بھی ہیں' پر نہ وہاں الفاظ کے حد بندیاں ہیں نہ الفاظ و تلفظ کی قیود گو ظہور کے بعد مخلوق میں پہنچتے پہنچتے یہ ساری تحدیدات نمایاں ہو جائیں۔ پس روح کی بدولت ہمیں ذات کے کلام نفسی اور کلام لفظی کا بھی فی الجملہ ادراک ہوا۔

پھر اگر تم آنکھ بند کرلو تو روح کا دیکھنا بند نہیں ہوتا اور کان بند کرلو تو اس کے سننے میں فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ آنکھ کان بند کر کے تصور کے لامحدود عالم میں یہی روح دیکھنے کی چیزوں کو اور زیادہ بے تکلفی کے ساتھ دیکھتی ہے اور سننے کی چیزوں کو اور زیادہ بے غائلہ سنتی ہے۔ حالانکہ نہ آواز روح سے ٹکراتی ہے اور نہ کسی صورت کا رنگ و روغن اور جسم اس کے آس پاس پھٹک سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ ذات بے چون و چگون ہر چیز کو سنتی اور دیکھتی ہے۔ مگر نہ وہاں رنگ و روپ اور مادیت کو قرب نصیب ہوتا ہے اور نہ آوازوں کے نغمے ہی اس کی سمع سے ٹکر کھاتے ہیں۔ پس اپنی ہی روح کی بدولت ہمیں اللہ کی سمع و بصر کے بے کیفی اور بیچونی کا بھی ایک گونہ اندازہ ہوا۔

اسی طرح جب ہم اس پر نظر کریں کہ بدن کی حیات تو روح کی زندگی سے قائم ہے۔ مگر روح کے لئے کسی اور روح کی حاجت نہیں۔ وہ خود اپنے ہی معدن حیات کی ایک موج ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ عالموں کی زندگی تو ذات بابرکات کی حیات سے قائم ہے اور خود اس کی حیات کے لئے کسی اور ذات کی حاجت نہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی حیات سے حی ہے جس میں کوئی فرق نہیں آسکتا اور اس طرح ہم پر اللہ کی صفت حیات کے ذاتی اور خانہ زاد ہونے کا اندازہ بھی اپنے ہی اندر سے ہوگیا۔

بہرحال روح کو ذات بابرکات سے مناسبتیں ہی نہیں بلکہ فی الجملہ مماثلتیں حاصل ہیں جس سے حق تعالیٰ کے لامحدود کمالات کی مثالیں ہمارے نفوس میں پہنچ گئی ہیں اور ہم اپنے اندر ہی سب کچھ عیاناً دیکھنے پر قادر ہوگئے اس لئے روح کی اس سے زیادہ جامع تعریف اور کچھ نہیں ہو سکتی' جو قرآن کریم نے فرمایا کہ:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔

غرض روح اس ساری تفصیل سے ایک لطیفۂ ربانی ثابت ہو جاتی ہے اور جسم محض ایک کثیف ظلماتی۔ لیکن جب کہ یہ بدنی عناصر جو عالم خلق کی چیزیں ہیں' اس روح سے تھوڑی سی مناسبت اور واجبی سالگاؤ پیدا کر کے' ایسے قوی ہو سکتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی طاقت پر ناچنے لگتی ہے تو خود روح جو عالم امر کی چیز ہے اور اس کی مناسبت مع اللہ بلکہ مماثلت کی گہرائیوں کی کوئی حد نہیں۔ اللہ جل ذکرہ سے اس قوی مناسبت و مماثلت کی بدولت کیا کچھ قوی اور غالب و متسلط نہ ہوگی۔ اگر ڈھنگ سے اس کی قوتوں کو استعمال کیا جائے تو کیا پھر کائنات اس کا تحمل کر سکے گی؟

پس بچۂ شیر کے قول کے مطابق انسان اگر پانی اور مٹی سے کہیں زیادہ قوی ہے تو وہ بدن کی بدولت نہیں

کہ بدن تو وہی آگ پانی کا ایک مختصر مجموعہ ہے۔ یہ بے چارہ قلیل و حقیر بدن اپنے عظیم وکثیر مخزن پر کیا غالب آسکتا ہے۔ بلکہ انسان کی یہ غیر معمولی قوت اور قوت کی یہ غیر معمولی کرشمہ آرائیاں درحقیقت اس کی روح کی بدولت نمایاں ہو رہی ہیں کہ روح کی لطافتوں کی کوئی حد نہیں اور وہ مجموعۂ لطافت سفلی وعلوی ہے۔ جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ روح تمام مادیات اور تمام عناصر سے اقویٰ واشد ہے۔ پس جہاں ذات بابرکات حق نے عالم آفاق میں اپنی مثالیں رکھی تھیں تاکہ اس کے کمالات ظاہرہ در آیات بینہ کا کسی حد تک ادراک واحساس ہو سکے۔ اسی طرح بلکہ ان سے بدرجہا زائد، جو مخصوص مثالیں ہمارے انفس میں رکھ دیں تاکہ ان شئون باطنیہ اور کمال بطون در بطون تک ہم بقدر استعداد کچھ رسائی پاسکیں۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

”ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گردونواح میں دکھائیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ حق ہے۔ کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے“۔

غرض مادی سائنس کی یہ کرشمہ سازیاں جن کی طرف تمہید میں میں اشارہ کر چکا ہوں، دیکھنے میں بدن اور بدنی عناصر سے نمایاں ہو رہی ہیں۔ مگر بلحاظ حقیقت یہ سب کچھ روح کا طفیل ہے جس کی مخفی طاقتیں اس چورنگ مادہ کو نچاتی رہتی ہیں اور مزدور کی طرح چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔

روح کی طاقتوں کا غلط استعمال

لیکن سوال یہ ہے کہ روح نے اپنے یہ باطنی کمالات صرف کرنے میں جس قدر بھی جدوجہد کی اور ترکیب وتحلیل کے ذریعہ آگ، پانی، ہوا، مٹی کی جس قدر بھی عجائبات موالید ثلاثہ میں نمایاں کئے۔ اس سے خود روح کو کیا نفع پہنچا؟ اور روح کو بحیثیت روح اس جدوجہد سے کیا شرف حاصل ہوا۔

ظاہر ہے کہ اول تو ان تمام سائنسی ایجادات کا نفع روح کو کچھ نہیں، صرف بدن ہی کو پہنچا۔ بدن کی راحت اور جسمانی عیش ہی میں اضافہ ہوا۔ سردی میں آگ کی حرارت، گرمی میں پانی کی تبرید، برسات میں ہوا تفریح بدن ہی کے لئے ہے، روح نہ سردی کی محتاج نہ گرمی کی کہ حرارت وبرودت روح کی اوصاف ہی نہیں۔ اسی طرح ہوائی جہاز نے اگر فضا میں اڑایا تو بدن کو، ورنہ روح جیسی لطیف چیز اڑانے کے لئے اس وزنی اور کثیف طیارہ کی حاجت ہی نہ تھی۔ مرنے کے بعد وہ نامعلوم کہاں کہاں اڑتی ہے تو کون سے ہوائی جہاز اس کے لئے جاتے ہیں۔ پھر سوچو کہ خود ہوا کے اڑانے کے لئے کسی ہوائی جہاز کی ضرورت ہے؟ ہوا تو خود ہی جہاز کو اڑاتی ہے۔ تو جو روح ہوا سے بھی لطیف تر ہے اور جس نے خود ہوا ہی کو مسخر اور قید کر رکھا ہے بلکہ ہوا کے خلاف طبع اسے جگہ جگہ اڑا رکھا ہے وہ اپنے اڑنے میں اس کی کیا محتاج ہوتی؟ اور جب اس کی محتاج نہیں تو اس کے بھی محتاجوں یعنی طیاروں کی محتاج کیسے ہو سکتی ہے؟

اسی طرح ریلوں اور موٹروں سے روح کو کیا فائدہ؟ ریل اور موٹر اپنے وجود ظہور میں خود ہی روح کے محتاج ہیں تو روح کو ان کی احتیاج کیا ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان تمام مادی کرشمہ آرائیوں اور سائنسی ایجادات کا نفع اگر ہو سکتا ہے تو صرف بدن ہی کے لئے، نہ روح کے لئے۔ ریل اور موٹر میلوں کو منتقل کر سکتے ہیں تو بدن کو برق اور گیس اگر ضیاپاشی کر سکتے ہیں تو اجسام پر، نہ کہ ارواح پر، جن کے نور سے خود ہی وہ ظہور میں آئے۔

گراموفون، ٹیلیفون، ٹیلی گراف اور لاسکی وغیرہ اگر منقطع کر سکتے ہیں تو اجسام کو، ورنہ روح اپنی حقیقی قوتوں کے لحاظ سے ان اپنے پروردوں کی کیا محتاج ہو سکتی ہے۔ پس ان تمام اسباب راحت کی راحت رسانی بدن تک محدود نکلی اور بدن کیا ہے؟ وہی عناصر اربعہ کا مجموعہ اور آگ، پانی ہوا، مٹی کا گھروندہ، تو یوں کہو کہ آپ نے ان آگ پانی کی ایجادات کے ذریعہ آگ پانی ہی کو نفع پہنچادیا۔ بالفاظ دیگر آپ نے باہر کا آگ پانی لیا اور اندر کے آگ پانی تک پہنچادیا اور اب روح کا کام یہ رہ گیا کہ وہ اپنے علم و ادراک کا سرمایہ آفاقی آگ پانی پر خرچ کرتی رہے اور یہ بیرونی آگ پانی بدن کے آگ پانی کو دیتی رہے۔ یعنی جسم کی خدمت گزاری میں ہمہ وقت مصروف رہے۔ اس کے صاف معنی یہ نکلتے ہیں کہ آپ نے روح کو جو ان عناصر سے لطیف تر اور بالاتر تھی اور جو ان پر حکمرانی کر رہی تھی، آپ نے دھوکہ دے کر اسے جسم جیسی کثیف چیز یا بعنوان دیگر عناصر کا غلام بنا دیا۔ ایک لطیف چیز کو کثیف کے تابع کردیا اور بہ تعبیر دیگر آپ نے لطیف روح کو خود اسی کی لطافت مٹانے میں استعمال کیا جو قلب میں موضوع ہے۔ پس اب اس مسکین روح کی مثال ایسی ہوگئی، جیسے ایک عالم و فاضل بادشاہ جس سے ملک و قوم کو بڑے بڑے منافع کی توقع ہو اور جس کے حسن سیاست اور کمال تدبیر سے ملک کے دفاع و بہبود کی ہزارہا امیدیں وابستہ ہوں، باوجود اس علم و فضل کے اس کے مزاج میں کوئی چالاک اور کمینہ غلام دخیل ہو کر رسوخ پالے اور اپنی ذاتی اغراض و منافع میں بادشاہ کو استعمال کرنے لگے اور ملک کا پیٹ کٹوا کر صرف اپنا تنور شکم بھرنے کی فکر میں لگا رہے۔ ادھر بادشاہ غلام کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر اسی کا کہا کرنے لگے۔ وزراء لاکھ سمجھائیں نصائح کریں اور منت و سماجت سے بادشاہ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں لیکن یہ کمینہ غلام کسی کی نہ چلنے دے بلکہ اور الٹا وزراء سے بدظن کردے اور بادشاہ کے وسیلے اور ذرائع معلومات کو چہار طرف سے مسدود کر کے صرف اپنے ہی ڈھنگوں پر لگالے گویا زمام سلطنت بظاہر تو بادشاہ کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن حقیقتاً بادشاہ کے پردہ میں یہ کمینہ غلام حکومت کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں حکومت کا قضیہ برعکس ہو جاتا ہے۔ جو حاکم تھا وہ محکوم ہو گیا اور جو محکوم تھا وہ حاکم ہو گیا۔

اور سب جانتے ہیں کہ ایسی مملکت جس میں کمینے برسراقتدار آجائیں اور اشراف دھکے کھاتے پھریں، دیرپا نہیں ہو سکتی بلکہ ایسے ملک کی تباہی کے آثار ہی جلد سامنے آنے لگیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بادشاہ معزول کر دیا جائے گا اس کی عمارت و سلطنت چھن جائے گی۔ ادھر آپ خود سمجھ لیں کہ انقلاب سلطنت کے بعد اس کمینہ ملازم کا کیا حشر ہوگا؟ وہی اس کے وسائل عمل اور اعضاء کار جو ان خود غرضیوں میں اس کے ہمنوا اور مددگار تھے، خود اسی کے خلاف گواہی دیں گے اور اپنے کو تباہ ہوتے دیکھ کر پہلے خود اسی کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے جس سے ہر صورت میں سب سے زیادہ یہی کمینہ گردن زدنی قرار پائے گا اور اس کے لئے ملک کے کسی گوشہ میں پناہ نہ ہوگی۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ روح ایک عالم فاضل فرمانروا ہے، جس میں محسوسات، معقولات اور وجدانیات کے پاکیزہ ملکات ودیعت ہیں جو کائنات بدن ہی میں نہیں بلکہ اس کے واسطہ سے کائنات عالم پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عقل اس کا وزیر اعظم ہے اور نقل اس کا قانون ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کا ایک کمینہ اور بدذات خادم بھی ہے۔ جس کے واسطے سے ملک میں شاہی احکام جاری ہوتے ہیں تاکہ وزراء و عمائدان کا نفاذ کریں۔ وہ کمینہ خادم یہ بدن ہے جو عناصر اربعہ کا مجموعہ ہے۔ کمینہ اس لئے ہے کہ جس قدر بھی اس کی اجزاء ترکیبی ہیں، سب بے شعور، لایعقل، جاہل اور بے تمیز ہیں۔ جن میں اچھے برے کا کوئی امتیاز نہیں۔ کمینگی کی یہ حالت کہ جو ان سے زیادہ محنت کر کے ان کا قرب حاصل کرے اسی کے سب سے زیادہ دشمن اور قاتل بن

جاتے ہیں۔

ایک انسان مٹی کی مورتوں اور پتھر کے وزنی بتوں کے سامنے کتنے ہی طویل زمانہ تک سجدے کئے جائے' لیکن اگر وزنی مورت اوپر سے آ گرے تو پہلے اپنے اس مقرب پوجاری کا سر پھوڑے گی۔ اسے قطعاً خیال نہ ہو گا کہ یہ میرا محب اور عبادت گزار بندہ ہے مجھے اس کا سر نہ کچلنا چاہئے بلکہ میرا یہ معاملہ صرف ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے جو مجھ سے بعید تر ہیں اور معبودانہ عظمت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اسی طرح ایک شخص اگر سینکڑوں برس بھی کسی دریا کے پانی کے سامنے ڈنڈوت کرے' ناک رگڑے اور عابدانہ التجائیں کرے کیونکہ جب بھی سیلاب کی رو آئے گی تو پہلے اسی کو غرق کرے گی جو اس سے زیادہ قرب حاصل کئے ہوئے ہو گا۔ اسے قطعاً یگانے اور بیگانے کی تمیز نہ ہو گی۔ ایک مجوسی برسہا برس بھی اگر آتش کدہ میں سربسجود رہے۔ لیکن آگ اس کی اعانت نہیں کر سکتی بلکہ اس کی پہلی لپٹ اپنے اسی مقرب کو پہلے پھونکے گی۔ ہوا پرست ہزار ہوائی باتوں میں رہیں لیکن ہوائے نفس کے جھکولے پہلے صاحب ہوا ہی کو غارت کریں گے دوسروں تک نوبت کہیں بعد میں آوے گی۔

آپ تمدن کے سلسلہ میں ہی دیکھ لیں کہ جو زیادہ سے زیادہ مادیات کے عاشق ہیں' وہی مادیات کے ہاتھوں زیادہ تباہ و برباد بھی ہیں۔ مشینوں کی لپیٹ میں وہی زیادہ آتے ہیں۔ جو مشینری میں رات دن مبتلاء عمل ہیں۔ ہوائی جہازوں سے زیادہ وہی تباہ ہوتے ہیں' جو ان سے زیادہ مزاولت اور مقاربت رکھتے ہیں۔

ڈریڈناٹ اور وزنی آلات جنگ سے وہی لوگ زیادہ ختم ہو رہے ہیں' جو ان آلات کے سامنے سربسجود ہیں' گیس اور زہریلے ٹینک رائفلیں اور ریوالور کارتوس اور بارود سے انہیں کا خاتمہ زیادہ ہو رہا ہے جو ان کے عشق میں جان باختہ ہیں اور کبھی بھی مادیات کے ان روشن آثار کو ادھر التفات نہیں ہوتا کہ جو ہمارے موجد اور غلام بے درہم ہیں اور جنہوں نے اپنی جانوں ہی کو نہیں بلکہ ایمانوں کو بھی ہم پر نثار کر دیا ہے' کم از کم انہیں تو اپنا نشانہ نہ بنائیں۔ انہی کو جا کر تباہ کریں جو بے لگاؤ رہ کر ہم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

پس اس سے زیادہ مادیات کی کمینگی اور سفلہ پن اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہیں نہ صرف دوست دشمن ہی کا کوئی بھی امتیاز نہیں بلکہ جو ان کا زیادہ دوست ہے' اس کے زیادہ دشمن ہیں' پھر سفلہ پن کی اسی پر حد نہیں۔ بلکہ مزید برآں یہ بھی ہے کہ جو ان کا دشمن ہے' الٹے اس کے قدموں میں پڑ کر دعوی دوستی کرتے ہیں پس ان کی اطاعت شعاری علم و شعور سے نہیں' فاضلانہ اخلاق سے نہیں' بلکہ جوتے کے زور سے ہی اور یہ واضح رہے کہ اخلاق کے جہان میں دباؤ کی اطاعت کو اطاعت نہیں کہا جاتا۔ پس جن عناصر کے سفلہ پن کی یہ حالت ہو ان سے مرکب شدہ بدن سے کب کسی خیر کی توقع کی جا سکتی ہے؟ اور ایسے بدن کے لئے اگر کمینہ کا لقب اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے؟

قوائے روح کے غلط استعمال کا نتیجہ حرمان و خسران ہے

بہرحال اس نالائق اور کمینہ غلام (بدن) نے اپنے ذاتی تعیش کی خاطر روح کو اپنے ڈھب پر لگالیا' عقل دوراندیش سے برسرپیکار کر دیا' قانون نقل کو طاق نسیان پر پھینکوا دیا' حظوظ نفس کی تحصیل اور عاجل منافع سے لاپرواہ بنا دیا اور اس غفلت زدہ روح نے اپنے تمام کمالاتی قوتوں سے وہ حظوظ حاصل کرنے شروع کر دیے' جن کا نفع فقط اس چورنگ مادہ یا کمینہ غلام ہی کو پہنچ سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بدن کو تو کچھ مل گیا' مگر روح خالی ہاتھ رہ گئی بلکہ جو کچھ بھی اس نے حاصل کرنے کا عزم باندھا تھا' اس میں بھی خود اس غلام ہی کی

محتاج ہو گئی۔ وہ روح جو کہ کمالات ربانی کا نمونہ ہونے کے سبب استغناء کی اعلیٰ شان رکھتی تھی اور کسی کی محتاج نہ تھی وہ اپنے اس لایعقل بدن کی محتاج ہو گئی۔ جو ہر جہت سے خود اس کا محتاج تھا۔ وہ غنی روح جس سے ان تمام وسائل کار کا وجود تھا' وہ اپنے ہر عمل میں خود ان وسائل کے ہاتھوں کو دیکھنے لگی اور وہ روح جو کبھی مسجود ملائک بنی تھی' آج عبد الاسباب بن کر اپنے ہی باندی غلاموں کو سجدے کرنے لگی اور اس درجہ عناصر کی غلام بن گئی کہ اگر مادی وسائل اس کے ہاتھ میں نہ ہوں تو وہ بیکار اور اپاہج ہے۔ اندریں حالات اس روح نے اپنی علمی طاقتوں سے مادی منافع کا ایک تمدن تو قائم کیا مگر اپنے ان جوہری کمالات کو کھو کر جو اس کے جزو نفس ہوتے اور ہر موقعہ پر اس کے ساتھ رہتے' وہ شہر میں ہوتی یا جنگل میں' اسباب کے ہجوم میں ہوتی یا بے وسیلہ ہر جگہ اپنا جوہر نمایاں کر سکتی۔ لیکن یہ غلام اور غلامی پسند روح محتاجگی کے اس درجہ پر آ گئی کہ اگر شہر میں ہے اور شہر بھی وہ جہاں بجلی سسٹم اور اسٹیم کی طاقت مہیا ہو تو باکمال ہے۔

ریڈیو سے خبر بھی دے سکتی ہے' ٹیلیفون کر سکتی ہے' ٹیلیگراف سے آواز بھی پہنچا سکتی ہے' کیمرہ ہو تو فوٹو بھی اتار سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ دیہات میں ہو' جہاں ان مادی وسائل کا وجود نہ ہو یا شہر ہی میں ہو مگر بجلی فیل ہو جائے یا دشمن بڑھ کر برقی تاروں کو کاٹ دے تو یہ پھر روح اپاہج اور نکمی ہے۔ اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا نکلتا ہے کہ یہ روح اپنے اصلی اور جوہری کمالات لوہے پیتل کے حوالہ کر کے خود کوری ہو بیٹھی جو محتاجگی اور غلامی کی بدترین مثال ہے۔

حالانکہ روح تو وہ تھی جو شئون ربانیہ کی جامع تھی' وہ علم اور معرفت کا ایک خط وافر لے کر آئی تھی' وہ لطافتوں اور طاقتوں کا خزانہ تھی۔ اس کا استغناء اور کمال غیرت تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ اپنے کسی فعل میں بھی اپنے باندی' غلاموں اور ان بے شعور اور اپاہج مادوں کی محتاج نہ ہوتی۔ وہ اگر دیہات میں بیٹھ کر جہاں نہ بجلی کا فون ہوتا نہ گیس کا خزانہ اگر آواز نکالتی تو وہ آواز مشرق سے مغرب تک پہنچ جاتی' وہ اگر ایسی جگہ نقل وحرکت پر آتی' جہاں نہ ریل ہوتی نہ موٹر اور طیارہ' تو سیکنڈوں میں ہزارہا میل کا سفر طے کر لیتی۔ وہ اگر دیکھنے پر آتی تو ایک تنگ و تاریک کونہ میں بیٹھ کر ساری دنیا ہی کی نہیں عرش عظیم تک کی کائنات کا معائنہ کر لیتی۔ زمین اس کے لئے سمٹ جاتی' ہوائیں اس کے لئے مسخر ہوتیں' زمانہ اس کے لئے سمٹ جاتا' وہ سیرابی و تری میں دریاؤں کے رحم و کرم کی محتاج نہ ہوتی بلکہ دریا خود ہی اپنی روانی اور طغیانی میں اس کے اشاروں کو دیکھتے۔ وہ جنگ و قتال میں لوہے اور ہتھیاروں کی محتاج نہ ہوتی بلکہ جس پر ہاتھ ڈالتی وہی اس کے لئے ہتھیار ہو جاتا اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا کہ یہ مادی اور عنصری آلات جب کہ اس عنصری لطافت پر ایسی طاقتوں کے کام کر سکتے تھے تو روح نہ صرف ان سب لطافتوں کی جامع ہی تھی بلکہ ان سے ہزارہا گنا بڑھ چڑھ کر لطافتوں کا ایک عمیق خزانہ تھی اور انہی لطافتوں کے سبب اس مالک الملک کی ذات پاک سے مناسبت تامہ رکھتی تھی۔ جو اپنے کسی کام میں وسائل کا محتاج نہیں بلکہ وسائل ہی اپنے وجود میں اس کے محتاج ہیں۔ تو ضرور تھا کہ روح ربانی کی شان بھی ایسی ہوتی ہو کہ وہ اپنے کاروبار میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان مادی وسائل کی محتاج نہ ہو۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ بجلی تو پل بھر میں آسمانوں پر چڑھ جائے اور جو روح بجلی کو مسخر کرنے کی طاقت رکھے وہ زمین سے ایک انچ بھی بجلی کی مدد کے بغیر اوپر کو نہ اٹھ سکے۔

کیا وجہ ہے کہ ایک انجن تو اپنی آگ' پانی کی اندرونی طاقت سے مشرق و مغرب کو ایک کر ڈالے اور جو انسان خود انجنوں میں یہ طاقت مہیا کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ ایسی سریعانہ حرکتوں میں ایک قدم بھی نہ اٹھا سکے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تار اور ٹیلیفون کی برقی رو تو ہزارہا میل کی خبریں منٹوں میں لے آئے اور وہ انسان جو

مشینریوں میں خود بجلی کی روح کو پھونکتا ہے' ایک میل بھی از خود اپنی آواز نہ پہنچا سکے۔

بہر حال اگر مادیات سے ایسے عجائبات کا ظہور ہو سکتا ہے اور وہ بھی بہ طفیل روح' تو خود روح اور روحانیت سے تو ایسے ہی نہیں' بلکہ ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر عجائبات کا کارخانہ کھل جانا چاہئے تھا تاکہ اس غیر محتاج روح کے استغناء وغیرت کا پورا پورا ظہور ہو سکتا' ورنہ یہ کیسی الٹی بات ہے کہ مستعیر تو طاقت ور اور مالک کلیۃً ضعیف ولاچار غلام تو حکمران اور باشادہ مجبور و بے بس۔

روحانی طاقتوں کے محیر العقول کارنامے

آپ اسے کوئی خیالی بات یا محض کوئی علمی نظریہ نہ سمجھیں' بلکہ حقیقتاً روح جب بھی اپنی اصل فطرت پر چلی ہے تو اسے بلاواسطہ اسباب ایسے ہی عجائبات کا ظہور ہوا ہے اور اس نے مادوں سے اپنی غلامی کرا کر انہیں اپنی روحانیت کے بل بوتہ پر خوب خوب نچایا۔

فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ممبر نبویؐ پر خطبہ پڑھتے ہوئے اچانک **"یا ساریۃ الجبل"** کی صدا مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک عراق میں پہنچادی حالانکہ اس وقت تک لاسلکی کا خواب بھی کسی کو نہ آیا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام نے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر اعلان حج کی ندا دی تھی وہ عالم کے گوشہ گوشہ میں ہی نہیں بلکہ ماؤں کے رحموں میں چھپے ہوئے بچوں کے بھی کانوں میں گونج گئی حالانکہ وہ کسی مکبر الصوت آلہ کے ذریعہ نہیں دی گئی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے ایک نئے دروازہ کے کھلنے کا تڑاکہ زمین پر بیٹھے بیٹھے سن لیا جو یقیناً کسی برقی آلہ کے ذریعہ نہیں سنایا گیا تھا۔

آپ نے جہنم کے قعر میں ایک پتھر کے گرنے کا دھماکہ دنیا ہی میں سن لیا جو ستر برس میں اس کی تہ تک پہنچا تھا حالانکہ یہاں بھی کوئی حسی اور مادی آلۂ صوت استعمال میں نہیں لایا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث ابن ابی خرار کے فدیہ کے اونٹ اور لونڈیاں مع تعداد اس کے بتلانے سے پیشتر ہی بتلادیں حالانکہ وائرلیس کے ذریعہ بعید کی خبریں دینے کی کوئی بھی ایجاد اس وقت تک نہیں نہ ہوئی تھی۔

آپ نے وحی الٰہی سے پتہ دیا کہ کسی بشر کی زبان سے کوئی کلمہ نہیں نکلتا کہ وہ محفوظ نہ کرلیا جاتا ہو **مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ**۔

حالانکہ اس وقت ریڈیو کی برقی لہروں کے ذریعہ جو کی آوازیں جذب کرنے والوں اور ان کے نظریوں کا کوئی نشان بھی نہ تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ موتہ کے پورے نقشۂ جنگ کو مسجد نبویؐ کے ممبر ہی سے معائنہ فرما کر حاضرین کو پتہ دے دیا حالانکہ وہاں آج کے آلات خبر رسانی کی بو دو نمونہ نہ تھی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے حرم میں بیٹھے ہوئے مسجد اقصیٰ کی محرابیں طاق تک دیکھ کر گن دیے حالانکہ اس وقت تک دوربین کی کوئی ایجاد کسی کے حاشیہ خیال میں نہ تھی۔

اس سے آگے بڑھ کر صلوٰۃ خوف میں انہی عرب کی وادیوں میں آپ نے جنت ونار کا مشاہدہ فرمالیا۔ عرفات کے میدان میں شیطان کو ویل وثبور کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ یوم بدر میں ملائکہ مسومین کی فوجوں کے پرے مشاہدہ فرمالئے اور ایک شب تار میں غیبی حقائق یعنی فتن وآلام کے نزول تک کا معائنہ فرمالیا' حالانکہ وہاں مادی شیشوں کی کوئی دوربین درمیان میں نہ تھی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے تختِ سلیمانی پر فضا میں پروازیں کیں اور ہوائیں ان کے اشاروں پر چلیں حالانکہ آج کے ہوائی جہازوں کی ساخت کی طرف اس وقت کوئی ادنیٰ التفات بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف فضاء آسمانی بلکہ سارے ہی آسمانوں کا سفر لمحوں میں طے فرمالیا۔ حالانکہ وہاں کسی پٹرولی طیارہ کا واسطہ اس سیر میں نہ تھا کہ طیاروں کا تخیل بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا اور طیارے ہوتے بھی تو انہیں آسمانی سیر سے کیا علاقہ ہوتا۔ اس طرح کے ہزارہا واقعات بطونِ تاریخ میں منضبط ہیں۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ روحانی قوتوں کے مالک مادوں کے غلام کبھی نہیں ہوئے۔ بلکہ مادیات ہی نے ان کے اشارۂ خم ابرو پر ہمیشہ کام کیا اور ان کی غلامی کی۔

خلاصہ یہ ہے کہ روح کی اصلی شان استغناء ہے کہ وہ اپنے منبع وجود ذاتِ حق سے وابستہ رہ کر اور اسی کے ساتھ اپنی مناسبتوں اور مماثلتوں کو بحال رکھ کر اپنے کسی فعل میں ان مادیات کی جو اس سے بدرجہا کمتر ہیں، محتاج نہ ہو۔ جیسا کہ اس کی فطری لطافتوں کا تقاضا ہے اور جس کی متعدد مثالیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامات و خوارق سے پیش کی گئیں جن میں ایک لمحہ کے لئے مادیات سے کوئی مدد نہیں لی گئی بلکہ وہ محض روحانی آثار کے مظاہرے ہیں جن میں مادیات کو روحانیت کے سامنے جھکنا پڑھتا ہے۔

مادی تصرف کوئی حقیقی کمال نہیں

بہرحال روحانی اقتدار کی ان ثابت شدہ نمونوں اور خوارق کی ان سچی مثالوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ایک باکمال روح کا اصل کمال درحقیقت مادیات سے مستغنی ہونے اور مادی وسائل کی گرفت سے آزاد ہوجانے میں پنہاں ہے ورنہ کسی روح کا مادیات میں مادی وسائل کے ذریعہ تصرفات کرلینا خود روح کا کوئی مخصوص کمال اور ممتاز کارنامہ نہیں ہے۔ یوں تو ایک مادہ بھی مادہ میں بلاواسطہ روح تصرف کرلیتا ہے۔

کہیں مٹی اور غبار اڑ اڑ کر بھی چند صدیوں میں دریا کو خشکی بنادیتا ہے۔ رواں پانی نشیب میں نئے نئے نکاس نکال کر بر کو بحر اور بحر کو بر کردیتا ہے۔ وہ آتش فشاں پھٹ کر خنک فضاء کو کرۂ نار بنادیتا ہے۔ ہوائیں چل چل کر تالابوں اور جھیلوں کو خشک کردیتی ہیں۔ پس مادہ میں تصرفات کرلینا اگر کوئی کمال ہے تو یہ کمال تو خود مادی قوتیں بھی کر دکھاتی ہیں۔ جہاں روحانیت کا کوئی توسط نہیں ہوتا پس اگر انسان کی انسانیت ان عناصر سے بدرجہا افضل ہے اور ضرور ہے اور اگر وہ عناصر کے تینوں موالید میں اعلیٰ و اشرف ترین نوع ہے، بلاشبہ ہے تو اس کا مابہ الفخر یا مابہ الامتیاز کمال وہ نہیں ہو سکتا، جو اس سے ارذل ترین اشیاء سے بھی سرزد ہو سکتا ہو۔ خصوصاً جب کہ روح کے یہ تصرفات بھی ان مادیات ہی کے واسطہ سے ہوں۔ گویا روح ان کی وساطت کے بغیر اس تصرف پر بھی قادر نہ ہو تو پھر روح کے لئے یہ بے کمال ہی نہیں بلکہ ایک کھلا ہوا عیب ہو گا کہ اپنے سے ارذل ترین اشیاء کی محتاج بن جائے اور اپنا کمال ان سے ڈھونڈنے لگے۔ کیونکہ کسی کامل کے لئے عیب کی جڑ استکمال بالغیر ہے۔ جب کہ وہ غیر اپنے سے ارذل اور کمتر ہو، ہاں اپنے سے برتر سے استکمال کرنا عیب کی بجائے ایک بہترین ہنر ہے۔ کیونکہ بلا استکمال بالغیر اپنی ذات سے خود بخود باکمال ہونا صرف ایک ذات بابرکات حق کی ہی شان ہو سکتی ہے جو ہر عیب سے منزہ اور ہر کمال کا منبع و مخزن ہے۔ مخلوق کسی حال میں بھی بے عیب محض نہیں ہو سکتی اور بھی کچھ نہیں تو مخلوقیت کا عیب تو اس سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ جس کی حقیقت عدمِ اصلی نکلتا ہے اور جب کہ مخلوق ذات کے درجہ میں معدوم نکلی تو ناگزیر ہے کہ درجۂ ذات میں کمالات سے عاری بھی ہو کہ عدم ہی تمام نقائص و عیوب کا منبع ہے اور ظاہر ہے کہ پھر اس عیب دار کے باکمال بننے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ اسی منبع وجود ذات (یعنی حق جل مجدہ) کی طرف رجوع کرکے استکمال کرے، جو کمالات کا

مخزن اور عیوب سے مبرا ہے۔ نہ یہ کہ حصول کمال کے لئے اپنے سے ارذل ترین چیز (مادہ) کی طرف جھکنے لگے کہ مادیت انسان کے لئے نہ مابہ الشرف ہے نہ مابہ **الفخر** کیونکہ مادیت تو اس کی بھی وہی ہے جو گدھے اور بیل کی ہے۔ اس لئے واضح ہے کہ اگر وہ حصول کمال کے لئے اپنے بدن یا مادیت کی طرف جو مجموعہ عناصر ہے' رجوع کرے۔ گویا آگ' پانی' ہوا' مٹی سے کمال کا جویا ہو تو وہ استکمال نہیں بلکہ ازالہ کمال اور استحصال نقص ہے کہ اپنے سے ارذل کی احتیاج وغلامی ہے اور گویا سلاطین کا غلاموں کی بندگی کرنا ہے جو خود ایک بدترین اور شرمناک عیب ہے۔ پس اگر سائنس کی حقیقت یہی ہے کہ انسان مادہ کے ذریعہ مادوں میں تصرفات کرنے پر قادر ہو جائے تو اس صورت میں انسان آگ پانی کے گھروندہ سے باہر ہی نہیں نکلتا کہ اسے حقیقی انسانیت کا حامل بھی کہا جائے بلکہ ایک ناقص اور عیب دار انسان ثابت ہوتا ہے۔ جس کا عیب بھی حد سے گزر کر شرمناک ہو' ورنہ کم سے کم کوئی ایسا ہنر تو کسی سے بھی ثابت نہیں ہوتا جس سے انسانیت کی کوئی امتیازی شان ہویدا ہوتی ہو۔

انسان میں محتاجگی کی اصل مادہ ہے

ہاں اگر مادہ میں کچھ بھی استغناء کی شان ہوتی' تب بھی ممکن تھا کہ اس کی غلامی سے تھوڑا بہت استغناء ہی ہاتھ لگ جاتا۔ لیکن جب کہ خود اس کی اصل اور ذاتی صفت ہی محتاجگی اور پابستگی ہے اور گویا مجبوریت ہی اس کی شان امتیاز ہے تو اس کی غلامی سے استغناء تو کیا حاصل ہوتا' حاصل شدہ استغناء بھی فنا ہو جائے گا اور مجبوری در مجبوری پیدا ہو جائے گی جو تمام ذلتوں کی جڑ ہے۔ پس روح جیسے مستغنی جوہر کا مادہ جیسے مجبور و محتاج عنصر کی دلہیز پر جھکنا حقیقتاً اپنی امتیازی شان کا فنا کر دینا ہے۔

عناصر اربعہ کے اخلاق اور ان کی محتاجانہ خاصیتیں

ہاں اب یہ معمہ حل طلب رہ جاتا ہے کہ اس چورنگ مادہ میں یہ ذاتی محتاجگی کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ ہر چیز کی خیر و شر اس کے طبعی اخلاق سے پھوٹتی ہے۔ اس چورنگ مادہ کے جبلی اور طبعی اخلاق ہی سراپا احتیاج وغلامی ہیں۔ اس لئے انسانی نفس جس حد تک بھی مادہ اور مادیات کا شغل قائم رکھے گا۔ اسی حد تک محتاجگی اور غلامی کا اکتساب کرتا رہے گا۔ چونکہ انسان کے نفس امارہ کا نشو ونما اور امتزاج انہی عناصر اربعہ سے ہے۔ اس لئے وہ انسان کو پستی و دنائیت اور محتاجگی کی طرف لے چلتا ہے۔ جو درحقیقت عناصر کی طبعی اور خاموش رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر اس انسانیت پر روحانیت کا نور فائز نہ کیا جائے یا وہ اپنی روحانیت کی پناہ میں نہ آئے تو یہ چورنگ مادہ اور اس کے جبلی اخلاق ایک لمحہ کے لے بھی اسے محتاجگی اور بے بسی کی دلدل سے نہیں نکلنے دے سکتے کہ مادہ کی خلقت و جبلت ہی بے بسی اور محتاجی ہے۔

مٹی اور اس کے جبلی اخلاق

چنانچہ اولاً مٹی ہی کو لے لیجئے اور غور کیجئے کہ اس کی جبلی اور بنیادی خاصیت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کی حسی خاصیت تو پستی اور تسفل ہے اور معنوی یا اخلاقی خاصیت قبض اور بخل ہے۔ چنانچہ جو چیز بھی زمین میں رکھ دی جائے' اسے دبالے گی اور جب تک آپ اس کا جگر چاک کر کے خود ہی نہ نکالیں' نہ دے گی' آدم کی اولاد کے نامعلوم کس قدر خزانے اور کتنے دفینے اس نے اپنے بطن حرص و آز میں چھپا رکھے ہیں اور اس کا پیٹ چاک کر کے نکال لو تو فبہا' ورنہ از خود اطلاع نہ دیگی۔ نہ چیز دے گی۔ آپ زمینی کشت زار کو دیکھ کر خیال نہ کریں کہ زمین تو بڑی فیاض ہے' جو ایک کے سو کر دیتی ہے اور کھیتوں کے ذریعہ اس کے جود و سخا کی داستانیں

سنانے لگیں' کیونکہ دانہ خود آپ کا ہے۔ جس میں زمین کا دخل نہیں اور اگر وہ زمین سے حاصل شدہ بھی ہے تو وہ بھی کسی ڈالے ہوئے دانے کا طفیل ہے نہ کہ خود زمین نے دانے اور بیج کی ایجاد کی ہے اس سے واضح ہے کہ سب سے پہلی اور ابتدائی کھیتی کا بیج یقیناً باہر سے زمین میں ڈالا گیا ہے نہ کہ زمین نے ابتدا کی ہے۔ پس دانہ یقیناً آپ کا ہے نہ زمین کا۔ اس لئے داد و دہش کی ابتداء زمین سے نہیں ہوئی بلکہ انسان سے ہوئی پھر دانہ ڈال کر اس کو محفوظ رکھنے' بڑھانے اور پھر نکالنے کے سامان بھی آپ ہی طرف سے ہیں۔ اگر پانی نہ دیا جائے تو زمین اصل بیج کو بھی سوخت کر دیتی ہے۔ چہ جائیکہ اسے باقی رکھ کر بڑھائے۔ پس پانی دینا در حقیقت بیج کو باقی رکھنا' بڑھانا اور بڑھا کر اس میں سے دوسرا دانہ کھینچ لینے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے زمین نے نہ محض از خود بیج کو بڑھانہ دیا' بلکہ پانی کا لشکر بھیج کر آپ نے جبراً اس سے راس المال مع سود کے منگوالیا۔ اس لئے زمین کا ذاتی خاصہ قبض و بخل بحالہ ثابت شدہ رہا۔

اب جب کہ یہی قابض اور بخیل مادہ انسان کا جزو اعظم ہے اور وہ مشت خاکی کہلایا۔ تو جبلی طور پر اس کے نفس میں پہلا خلق یہی قبض اور بخل کا سرایت کرتا ہے چنانچہ پیدا شدہ بچہ کر ذرا بھی ہوش آتا ہے تو وہ قبض اور بخل یعنی لینے اور ہضم کرنے کے لئے چیختا ہے نہ کہ دینے اور ترک کرنے کے لئے۔ آپ جو چیز بھی بچہ کے سامنے ڈال دیں گے' اسے اٹھائے گا اور طبعی تقاضا سے منہ کی طرف لے جائے گا تاکہ اسے قبض کر کے ہضم کر جائے۔ اسے دیتے رہو تو خوش رہے گا' چھیننے لگو تو چلائے گا۔ پس جبلی طور پر اس کی طبیعت سخا اور ایثار کی طرف نہیں جاتی' بلکہ قبض اور بخل کی طرف کہ اس کے عنصر خاکی کا غالب خلق یہی قبض و بخل ہے اور ظاہر ہے کہ قبض و بخل جس کا منشاء حرص و طمع ہے محتاجگی اور غلامی پیدا کرتے ہیں۔ غناو استغناء سے انہیں کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ بخیل اول تو خود اس شے کا محتاج ہوا جس میں بخل ظاہر ہوا۔ پھر اس شخص کا محتاج ہوا جس کی شے ہے۔ پھر اس کی عطا کا محتاج جس کی بدولت یہ شے اس کے پاس آئے گی۔ پھر اگر معطی اور عطا اور عطیہ نہ ہو تو یہ بخیل اس درجہ محتاج ہے کہ اپنے بخل کا بھی پوری طرح اظہار نہیں کر سکتا۔ اس لئے ایک بخیل کسی چیز کے لینے سے پیشتر تو معطی کا محتاج ہے اور لینے کے بعد اس عطیہ کا محتاج ہو جاتا ہے کہ اپنے قلب و قالب کو اس سے جدا کر لینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اس لئے بخیل کے اول و آخر محتاجی اور غلامی ہی نکلتی ہے اور زمین میں چونکہ یہی وصف ایک امتیازی وصف ہے۔ اس لئے اس کی محتاجگی و ذلت بھی سارے ہی عناصر سے زائد ہے۔ اس لئے یہ خاکی انسان خاکی رہتے ہوئے جبلی طور پر بخل کے رذیلہ میں گرفتار رہتا ہے۔ جو سراپا احتیاج (نمایاں ہو) ذلت ہے اور قبض و بخل کے بجائے سخاو ایثار پیشہ بن جائے تو اس کا ثمرہ استغناء ہے جو سراپا عزت و محبوبیت ہے اور اس میں کسی غیر کی احتیاج و غلامی نہیں بلکہ غیر ہی سے اپنی غلامی کراتا ہے۔

آگ اور اس کے جبلی اخلاق

اسی طرح آگ کو لو تو اس کی طبعی خاصیت اور جبلیت ترفع ہے کہ سرنیچا ہی نہیں کرتی۔ کسی داخلی مصلحت سے بھی دباؤ تو نہیں دبتی۔ گویا آگ خاک کی ضد ہے کہ وہ ہمہ تن پستی ہے اور یہ سرتاپا تعلی' ناری شیطان نے یہی کہہ کر آدمؑ کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا کہ **خلقتنی من نار وخلقتہ من طین**۔ ظاہر ہے کہ انسان میں آگ کا بھی ایک کافی حصہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی بدنی حرارت اور بعض اوقات بخار کا ہیجان اس کی کافی دلیل ہے۔ اس لئے ہوش سنبھالتے ہی اس میں جبلی طور پر وہی ترفع و تعلی' شیخی اور انانیت کا جذبہ ابھرتا ہے جو حقیقت میں ناری اثر ہے۔ چنانچہ تعلی اور شیخی سے مغلوب ہو کر جب انسان میں جوش و غضب اور غصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے اس کی رگیں پھول جاتی ہیں اور چہرہ پر آگ کی سرخی

آجاتی ہے۔ تو عرف میں یہی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص آگ بگولا ہو گیا۔ فلاں میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں میں غصہ کا پانی بہ گیا یا غصہ کی مٹی بکھیرنے لگا۔ بلکہ مٹی ہو جانا' اس کے ٹھنڈے ہو جانے کی علامت شمار ہوتی ہے کہ مٹی درحقیقت آگ کی ضد ہے۔ بہرحال انسان کا یہ ترفع و تعلی اور انانیت درحقیقت وہی ناری خلق ہے۔ اب اس خلق پر غور کرو تو یہ بھی سراپا احتیاج وذلت نظر آئے گا۔ کیونکہ تعلی اور ترفع کا حاصل دوسرے پر بڑا بننے اور اپنے آپ کو ان کے نظروں میں بڑا دکھانے یا ان کے خیال پر نکلا۔ جس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اگر دوسرے ہی نہ ہوں یا ان کا خیال اس کی بڑائی کی طرف نہ آئے یا اگر ہٹ جائے تو اس کی بڑائی کی عمارت منہدم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ محتاجگی اور کیا ہو گی کہ عزت ہماری ہو اور قابو میں دوسرے کے ہو' رفعت ہماری ہو اور دوسرے کے خیالات کی بہنے والی رو میں بہتی جا رہی ہو کہ دوسرے کے پاس بھی اسے ٹھکن اور استقرار نصیب نہیں۔

اسی بنا پر تعلی وتفاخر کے لئے مدارات ناس اور تملق بھی لازمی ہے تاکہ ان کا خیال بدلنے نہ پائے۔ اور یہ ترفع کا بھوکہ ان کی نظروں میں سبک نہ ہونے پائے۔

پس جو خلق ایک انسان کو ہزار ہا انسانوں کا محتاج بناتا ہو اس سے زیادہ ذلت آمیز اور احتیاج خیز خلق اور کونسا ہو گا؟ ہاں اس کے بالمقابل تواضع کا خلق ہے۔ جس کی حقیقت بلا مجبوری و پابندی محض اپنے قصد و ارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم آپ کے اس خیال کے محتاج نہیں کہ آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ آپ جو کچھ بھی ہمیں سمجھیں' وہ سمجھیں مگر ہم تو اپنی اصلیت پر ہیں جو آپ کے سمجھنے نہ سمجھنے سے کسی حال بھی تبدیل نہیں ہو سکتی۔ پس تواضع کا حال استغناء اور ترفع کا حاصل محتاجگی اور غلامی نکل آیا۔ نیز تواضع کے سلسلہ میں بلند اور رفع ہوتے ہوئے قصد و ارادہ سے جھکنا اعتماد علی النفس کی دلیل ہے کہ اس پر خود کو قابو ہے کہ وہ اپنی ناریت سے مرتفع ہونا چاہتا تھا اور ہم اسے حاکمیت سے جھکا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نفس پر قدرت اور قابو مالکیت کی دلیل ہے جو محتاجگی کے منافی ہے۔ کیونکہ محتاجگی ہمیشہ مملوکیت میں ہوتی ہے نہ کہ مالکیت میں۔ ادھر شیخی میں انسان کو اپنے اوپر قدرت نہیں رہتی جو مجبوری اور محتاجگی ہے۔ پس تواضع سے استغناء اور ترفع ونخوت سے احتیاج و غلامی پیدا ہونا اس جہت سے بھی تواضع ہے۔

غرض جب تک انسان اس ناریت کے جال سے رہا نہ ہو' یہ ناری خلق اسے محتاج اور ذلیل ہی بنائے رکھتا ہے کہ احتیاج کی خاصیت ہی ذلت و مسکنت ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ آگ بھی اپنی جبلت سے محتاجگی کا ثمرہ پیدا کرتی ہے نہ کہ غناء کا۔

ہوا اور اس کے جبلی اخلاق

اسی طرح ہوا کو لیجئے کہ اس میں انتشار اور پھیلاؤ کی خاصیت ہے کہ وہ ہر جگہ موجود رہے' ہر جگہ گھسی رہے' ہر جگہ بھری رہے' ذرہ ذرہ اس سے وابستہ رہے۔ گویا اسے پہچانتا رہے۔ انسان میں ہوائی جزو بھی ہے۔ جیسے ریاح اور سانس وغیرہ سے نمایاں ہے تو وہ بھی چاہتا ہے کہ میں ہر جگہ موجود رہوں ہر جگہ گھسا رہوں' ہر زمان اور ہر مکان میں میرا وجود رہے۔ مگر چونکہ اس کا مادی نفس اتنا پھیلاؤ نہیں رکھتا کہ وہ خود ہر جگہ رہے۔ اس لئے وہ انتشاریت' شہرت اور ہوا بندی چاہتا ہے کہ لوگ جگہ جگہ میرا چرچا کریں۔ میرا ذکر پھیلائیں اور اپنے ذکر و تذکرہ کے ذریعہ میں ہر جگہ موجود رہوں۔ پس ہوائے شہرت انسان میں اسی ہوائی جزو کا اثر ہے۔ غور کرو تو اس شہرت پسندی کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی ہے۔ کیوں کہ انسان کی یہ خواہش بھی اس کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی کہ پہلے دوسرے ہوں پھر وہ اسے پہچانیں اور اس کے بعد اس کی ہوا بندی بھی کریں'

اس کا پروپیگنڈہ بھی کریں اور چرچا بھی کریں اور اسے اڑاتے بھی رہیں۔ پس اس خلق کا حاصل بھی وہی غیروں کا احتیاج نکل آئی۔ اس لئے شہرت پسندی بھی کوئی عزت آفرین نہیں بلکہ ایک ذلت افزا ملکہ ہے جو اپنے مقاصد کو دوسروں پر معلق کردیتا ہے' برخلاف شہرت پسندی کی ضد کے' جسے اخفاء وتستر کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت میں خود بخود مگن رہنا اور دوسروں سے ہمہ تن مستغنی اور بے پرواہ ہو جانا ہے حالانکہ اس غناء پر جو قدرتی شہرت کا ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ اس مصنوعی اور جعلی شہرت سے بدرجہا ہوتا ہے۔ بہرحال ہوا کے خلق کا حاصل بھی وہی محتاجگی اور جگہ جگہ مارے مارے پھرنا آیا۔

پانی اور اس کے جبلی اخلاق

اسی طرح پانی کو لو تو اس کا طبعی فعل ہے' عدم الکف اور عدم الضبط' یعنی پانی میں اعتماد علی النفس کا نشان نہیں۔ وہ اپنے نفس کو خود نہیں روک سکتا۔ ہر طرف سے آپ روک لگائیں' رک جائے گا اور جہاں بند ٹوٹا یا برتن پھٹا' وہیں پانی بکھرا' سیدھا چل رہا ہے اور جہاں ذرا نشیب آیا وہیں بہ گیا۔ ذرا کسی نے زمین کھود ڈالی' اور وہ اپنا مستقر چھوڑ کر وہیں آرہا۔ انسان میں بھی چونکہ پانی کا جزو موجود ہے' جیسا کہ تھوک' سنک' بلغم' پیشاب وغیرہ سے واضح ہے۔ اس لئے اس میں بھی ضبط نفس کا پیدائشی طور پر نشان نہیں ہوتا ذرا کسی کی اچھی چیز دیکھی بکھر پڑے' کسی کی عورت پر نظر پڑ گئی تو گھورنے لگے' کوئی قبول صورت چیز پڑ گئی اس کے پیچھے ہوئے' کوئی عمارت اچھی دیکھ لی تو وہیں للچائی نظروں سے اسے دیکھنے لگے کہ کاش یہ بلڈنگ ہماری ہوتی۔

غرض ذرا سا نشیب سامنے آنے سے بکھر پڑنے کا مادہ انسان میں آبی جزو سے آیا ہے۔ مگر اس کا حاصل بھی وہی احتیاج اور بے بسی ہے۔ کیونکہ غیر کو دیکھ کر قابو میں نہ رہنا اور اپنے نفس کو سنبھال نہ سکنا' عدم قدرت اور عجز کی دلیل ہے اور عجز جڑ ہے محتاجگی کی۔ ہاں ضبط نفس اور اچھی سے اچھی چیز دیکھ کر بھی اس سے بے نیاز رہنا خود کو قابو میں رکھنا اور گرنے سے بچالینا قدرت کی دلیل ہے' جس کا حاصل بھی وہی استغناء نکلتا ہے۔ اس لئے پانی کی طبعی خاصیت بھی وہی احتیاج اور غلامی نکل آئی۔

رذائل نفس کے چار اصول

پس اس طرح ان مادی یا رذائل نفس کے چار اصول نکل آتے ہیں۔ قبض' بخل' تعلی وترفع' شہرت پسندی وانتشاریت' عدم ضبط نفس یعنی حرص وہوا جو آدمی کو سراپا احتیاج وغلام بنادیتے ہیں۔

فضائل نفس کے چار اصول

ہاں پھر یہیں سے استغناء وخودداری کے اصول پر روشنی پڑ جاتی ہے کہ وہ ان اخلاق چارگانہ کی ضد ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ قبض وبخل کی ضد سخاوت ایثار ہے' کبرو نخوت کی ضد تواضع وفروتنی ہے۔ شہرت پسندی اور نام آوری کی ضد اخفاء وتستر ہے۔ حرص وہوا اور بکھر پڑنے کی ضد ضبط نفس اور قناعت ہے اور جب کہ یہ چارگانہ اضداد مادہ کے چارگانہ اخلاق کی ضدیں ہیں۔ تو یقیناً انہیں مادی اخلاق بھی نہیں کہا جاسکتا' بلکہ اس روح کے روحانی اخلاق شمار کئے جائیں گے جو مادہ کی ضد ہے اور اس طرح اگر مادہ کے جوہر میں سے رذائل نفس کے چار اصول نکلے تھے تو روح کے جوہر میں سے فضائل نفس کے بھی چار ہی اصول نکل آئے' ایثار' تواضع' اخفاء' قناعت۔

اخلاق کا ظہور اعمال کے بغیر ممکن نہیں

لیکن یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ اخلاق کے جبلی آثار افعال ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اگر ان اخلاق کے مناسب افعال سرزد نہ ہوں تو اخلاق کے طبعی آثار ظہور پذیر ہی نہیں ہو سکتے جیسے مثلاً خلق شجاعت کی تاثیرات بغیر فعل مقاتلہ و مقابلہ کے کبھی نہیں کھل سکتیں۔ خلق تواضع کی کیفیات بغیر انکساری کے اور جھکاؤ کے سامنے نہیں آسکتیں۔ یہی حال اور تمام اخلاق کا بھی ہے۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ ان مادی اخلاق کے اثرات محتاجگی اور روحانی اخلاق کے آثار کو ظاہر کرنے والے افعال کون سے ہیں؟

مادی اخلاق کا مظہر فعل امساک ہے

سو مادی اخلاق کے آثار پر جہاں تک غور کیا' ان کا حاصل بجز خود غرضی اور خود طلبی کے اور کچھ نہیں نکلتا۔ بخل ہو یا حرص' شہرت پسندی ہو یا تعلی' سب کی بنیاد نفس کی اس خواہش پر ہے کہ مال وجاہ سب کا سب ساری دنیا سے کٹ کر تنہا اسی کے دامن ہوس میں سمٹ آئے۔ گویا ہر چیز کا اوروں سے روک کر اپنے لئے مختص کر لینا ان نفسانی اخلاق کا مقتضٰی ہے۔ چنانچہ قبض اور بخل میں اپنی مقبوضہ چیز اوروں سے رد کی جاتی ہے۔ حرص وہوس میں دوسروں کی مقبوضہ چیز ان سے روک کر اپنے لئے پسند کی جاتی ہے۔ تعلی وترفع میں ہر درجہ کمال کو دوسروں سے منفی کر کے اپنے سے مختص ظاہر کیا جاتا ہے۔

شہرت پسندی اور نام آوری میں اوروں کی نمود روک کر صرف اپنا نام چاہا جاتا ہے بس ان سب اخلاق میں کسی نہ کسی جہت سے اوروں سے رکاوٹ اور اپنا اختصاص کارفرما رہتا ہے۔

اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کے طبعی آثار کو جو فعل بطور قدر مشترک کے کھولتا ہے' وہ امساک ہے' بخل وحرص میں یہ امساک مالی ہوتا ہے اور تعلی ونام آوری میں امساک جاہی۔ مگر حب جاہ ہو یا حب مال' دونوں کا مظاہرہ اس فعل امساک ہی سے ہوتا ہے۔

گویا ان اخلاق کے طبعی آثار خود غرضی ومحتاجگی بغیر فعل امساک کے نمایاں نہیں ہو سکتے۔

روحانی اخلاق کا مظہر فعل انفاق ہے

ادھر روحانی اخلاق چونکہ ہر حیثیت سے مادی اخلاق کی ضد ہیں اس لئے ان کے طبعی اثرات اور ان اثرات کو ظاہر کرنے والے افعال بھی مذکورہ افعال کی ضد ہی ہو سکتے ہیں چنانچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جیسے مادی اخلاق کا اثر خود غرضی تھا۔ روحانی اخلاق کا اثر بے غرضی ہے۔ چنانچہ ایثار وتواضع ہو یا اخفاء وقناعت' ان میں سے کسی ایک خلق کی بنیاد بھی نفس کی اس خود غرضانہ خواہش پر نہیں ہے کہ سب کچھ تنہا اسی کو مل جائے۔ بلکہ اس پر ہے کہ اپنا واجبی حق بھی دوسروں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ سخاوت میں اپنی چیز دوسروں کو دی جاتی ہے۔ قناعت میں دوسروں کی چیز انہی کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے۔ تواضع میں اپنی عزت دوسروں پر نثار کی جاتی ہے اور اخفاء میں دوسروں کی عزت کے لئے پورا میدان دے دیا جاتا ہے۔

غرض ان تمام اخلاق کی بنیاد دوسروں سے روکنے یا چھیننے پر نہیں' بلکہ دوسروں کو دینے اور عطاء ونوال پر ہے' اس لئے واضح ہوتا ہے کہ جو فعل ان روحانی اخلاق کے طبعی آثار کو کھولتا ہے' وہ فعل امساک نہیں بلکہ اس کی ضد انفاق ہو سکتا ہے۔ سخاوت وقناعت میں یہ انفاق مالی ہوتا ہے اور تواضع واخفاء میں انفاق جاہی۔ مگر استغناء مالی ہو یا استغناء جاہی' بغیر فعل انفاق کے کھل نہیں سکتا اور یہ ایک مشاہدہ ہے کہ جاہ ومال سے یہ بے

نیازی ایک طرف تو غیروں سے غنی بنادیتا ہے اور دوسری طرف اپنے میں بے غرضی مستحکم کر دیتی ہے' جس سے وسعت صدر اور فراخ دلی کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی امر ہے اس لئے ان روحانی اخلاق کا اثر وسعت حوصلہ' استغناء' وقار' خود داری و بے نیازی اور بے احتیاجی نکلتا ہے' جس کے ظہور کا ذریعہ انفاق ثابت ہوتا ہے' شریعت کی اصطلاح میں اس انفاق ہی کا نام صدقہ ہے جس کے معنی جان ومال' آبرو اور قول وعمل کو مالک الملک کے لئے دینے اور خرچ کرنے کے ہیں۔ پھر صدقہ کرنے میں چونکہ محبوبات نفس اور لذائذ طبع کو ترک کرنا پڑتا ہے جو نفس پر بالطبع شاق ہے اس لئے اس کا دوسرا نام مجاہدہ بھی ہے۔ اس لئے خلاصہ یہ نکلا کہ طبعی امساک کے ذریعہ انسان میں جو محتاجگی اور تنگی قائم ہوتی ہے اس کے مٹانے اور اس کی جگہ استغناء و خود داری کی دولت جاگزین کرنے کا ذریعہ صرف صدقہ و مجاہدہ اور انفاق فی سبیل اللہ ہے۔

گویا انفاق کا جو درجہ بھی امساک کے مقابلہ پر آتا رہے گا' اسی درجہ نفس انسانی میں محتاجگی وغلامی مٹ کر استغناء کے مراتب قائم ہوتے رہیں گے کیونکہ صدقہ سے وہ مادی اخلاق مضمحل اور کمزور پڑنے جائیں گے' جن کی بدولت امساک کے افعال نمایاں ہوتے تھے۔

صدقہ سے غنا کس طرح حاصل ہو سکتا ہے

چنانچہ ایک صدقہ دینے والا جب اپنے محبوب مال متاع کو اپنے سے کھودیتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس نے قبض و بخل کی تو جڑ کاٹ دی' جو ارضی خلق تھا' ورنہ غلبۂ بخل کے ہوتے ہوئے یہ متاع جدا ہی کب کی جاسکتی تھی اور ظاہر ہے کہ جس حد تک بھی قبض و بخل کا رذیلہ سست پڑے گا جو محتاجگی کی جڑ تھا' اسی حد تک سخاو ایثار کا ملکہ راسخ ہوگا' جو ذریعۂ استغناء ہے اور اس طرح استغناء کے ایک بڑے درجہ پر فتح ہو جائے گا۔

پھر جب کہ ایک صدقہ دہندہ کو عطاء ونوال میں لطف محسوس ہونے لگا تو ظاہر ہے کہ اب وہ دوسروں کی چیز پر نہ نگاہ حرص ڈال سکے گا نہ کسی کی چیز دیکھ کر بکھر سکے گا بلکہ اس کے عطاء وتصدق کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ کم سے کم پر اپنے نفس کو تھامے رکھنے کا خواہشمند ہے' جسے قناعت کہتے ہیں۔ پس اسی صدقہ وانفاق کے ذریعہ حرص کا بھی خاتمہ ہو گیا جو آبی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک دوسرا مقام طے ہو گیا۔

فرق اگر ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر اپنی چیز کی محبت قطع ہوئی تھی' جس سے بخل قائم تھا اور دوسرے مقام پر پہنچ کر غیر کی چیز سے محبت جاتی رہی' جس سے حرص قائم تھی اور اس طرح ایک انسان مالی سلسلہ میں نہ اپنا غلام رہا نہ دوسروں کا' پھر جب کہ یہ صدقہ اخفاء کے ساتھ کیا گیا' جس میں نام ونمود کی کوئی خواہش نہیں ہو سکتی ورنہ چھپانے کی کیا ضرورت تھی تو اس سے شہرت پسندی اور نام آوری کی جڑ کٹ گئی جو ہوائی خلق تھا۔ اس عظیم محتاجگی کی جڑ کٹ جانے سے جس کی تفصیلات آچکی ہیں استغناء کا ایک اور مقام میسر آگیا۔

پھر ظاہر ہے کہ یہ صدقہ دہندہ اپنے اس عمل کو چھپانے کی سعی جب ہی کر سکتا ہے جب کہ اسے اپنا یہ عمل دوسروں کے عمل سے کم نظر آئے اور وہ اپنے عمل کی دوسروں کے عمل کے مقابلہ میں کوئی برتری اور بڑائی اپنی نگاہوں میں محسوس نہ کرے۔ ورنہ وہ اس عمل کو مخفی رکھنے کے بجائے دوسروں کے عمل سے برتر اور فائق تر ظاہر کرنا اور جابجا اس کا چرچا کرنا پسند کرتا' لیکن جب کہ وہ اپنے صدقہ کو دوسروں کے صدقات سے نسبت تک دینے سے رک رہا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے عمل کے تفوق وبرتری کے خیال سے بھی جدا ہو چکا ہے اور اس طرح دوسروں کی نسبت خود اپنی ذات کی برتری اور تعلی سے بھی بیزار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اخفاء صدقہ سے تعلی اور ترفع کی جڑ بھی کٹ گئی' جو آتشی خلق تھا اور اس طرح استغناء کا ایک چوتھا مقام میسر ہو گیا۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اپنی نیکی کے اخفاء میں مبالغہ اور وہ بھی اس حد تک کہ اپنے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ

چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کس کو دیا گویا خود اپنے نفس کو بھی خبر نہ ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نیکی پر خود اپنے ضمیر میں بھی اسے کوئی فخر وناز محسوس نہ ہو' وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اس نیکی کی بمقابلہ غیر ہی نہیں بلکہ بحیثیت اپنے فعل ہونے کے بھی ذرہ برابر وقعت وعظمت نہ ہو' بلکہ وہ اسے محض ادائے فرض کہہ کر کرے' نہ کہ ادائے حق جان کر کرے' ظاہر ہے کہ صدقہ کے اس اخفاء تام سے خود پسندی اور عجب کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ جس سے استغناء کا ایک بہت ہی دقیق اور اہم مقام میسر آجاتا ہے۔

استغناء کے یہ آخری تین مقامات جاہ کے سلسلے میں محتاجگی سے بچاتے تھے۔ ان تین مقامات میں باہمی فرق وتفاوت ہے تو یہ کہ پہلے مقام پر پہنچ کر صدقہ دہندہ دوسروں سے طالب جاہ نہیں رہتا۔ دوسرے مقام پر اپنے عمل سے کاسب جاہ نہیں رہتا اور تیسرے مقام پر خود اپنے نفس سے بھی تخیل جاہ قائم کرنے کا روادار نہیں رہتا اور اس طرح ان پانچوں مقامات کے ذریعہ مال وجاہ دونوں کے سلسلہ میں اس محتاجگی اور پابستگی سے آزاد ہو کر جس نے اسے ذلت وپستی کے حضیض میں گرا رکھا تھا' غیر سے بھی غنی ہو جاتا ہے اور خود اپنے سے بھی مستغنی۔

مادیات سے استغناء ہی تعلق مع اللہ کی بنیاد ہے

الحاصل اس مادہ پرست اور مادی نفس کے دو رذیلے بخل اور حرص تو نفس صدقہ ہی سے ختم ہو گئے اور تین رذیلے تملق' نام آوری اور خود بینی اخفاء صدقہ کی قید سے ختم ہو گئے اور ظاہر ہے کہ جب ایک شخص بخیل نہ رہا' سخی ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنی دولت کی بھی پروانہ نہ رہی' حریص نہ رہا بلکہ قانع ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے غیروں کی دولت کی بھی پروانہ نہ رہی۔ شہرت پسند نہ رہا بلکہ عزلت پسند ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے لوگوں کی مدح وذم کی بھی پرواہ نہ رہی' شیخی پسند اور خود بین نہ رہا بلکہ خود گزار ہو گیا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اسے اپنے نفس کی بھی پرواہ نہ رہی۔ تو اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی اخلاق کی بدولت جو اس نے صدقہ سے حاصل کئے ہیں عالم میں کسی کا غلام نہ رہا اور اسے ہر چیز سے کامل آزادی اور حریت میسر آگئی اور یہ سب جانتے ہیں کہ ساری کائنات سے بے پرواہ ہو کر اب اگر اس کا رشتہ نیاز کسی سے جڑ سکتا ہے تو صرف اسی خالق کائنات سے جس کی خاطر اس نے یہ اپنا مال' اپنی آبرو اور اپنا نفس سب کچھ تج دیا تھا اور جس کے اخلاق سے اس نے یہ تخلیق کیا' اندریں حالات اسے مناسبت پیدا ہوئی تو اس غنی عن العالمین سے اور لگاؤ پیدا ہوا تو صرف اسی ذات بے نیاز سے جو اپنے کاموں میں کسی کا محتاج نہیں' بلکہ ہر چیز اپنے وجود وظہور میں اسی کے دست نگر ہے۔

تعلق مع اللہ کی قوت ہی سے روحانی عجائبات اور خوارق کا ظہور ہوتا ہے

اور اس صورت میں ضروری ہے کہ اس مردِ متصدق اور بندہ مجاہد یا تارک ماسوی اللہ سے بھی جس نے اس غنی مطلق سے نسبت قائم کرلی ہے۔ غناء کامل کا ظہور ہو اور وہ بھی اپنے کسی کام میں ان مخلوقاتی وسائل یعنی مادی ذرائع کا محتاج نہ رہے بلکہ خود یہ وسائل ہی اس کی چشم وآبرو کو دیکھنے لگیں' اس کے تصرف بلاوسائل زمین تک ہی نہیں آسمانوں تک بھی پہنچنے لگیں۔ وہ اوپر جائے تو طیاروں کا محتاج نہ ہو اور زمینی مسافت طے کرے تو ریلوں اور موٹروں کا پابند نہ ہو۔ وہ عالم میں اپنی صدا پہنچائے تو ہوا وبرق کا دست نگر نہ ہو اور عالم کی صدائیں سننا چاہے تو ریڈیو اور ٹیلیفون کا محتاج نہ ہو۔

غرض اس کے ہاتھوں پر وہ سب کچھ ظاہر ہو' جسے دنیا کے سارے فلسفی اور سائنس دان مل کر بھی ظاہر نہ کریں۔ ورنہ کم سے کم غنا کا یہ درجہ تو اسے ضرور حاصل ہو جائے کہ علم واعتقاد کے درجہ میں ان وسائل کو مؤثر حقیقی نہ سمجھے اور عمل کے درجہ میں اسے ان اسباب ووسائل سے کوئی شغف باقی نہ رہے بلکہ عادت کے

طور پر محض حیلہ کے درجہ میں اور وہ بھی امرِ خداوندی سمجھ کر انہیں استعمال میں لاتا رہے پس پہلا درجہ توکل وغنا کا اعلیٰ مقام ہے، جس میں ترکِ اسباب پر پوری قدرت محسوس ہونے لگے اور دوسرا درجہ ثانوی ہے جس میں گویا قدرت نہ ہو، مگر معرفت صحیح ہو جائے اور اختیارِ اسباب میں غلو اور انہماک باقی نہ رہے۔

بہرحال اب پوری طرح کھل گیا کہ مادہ میں بجز محتاجگی اور ذلت نفس پیدا کر دینے کے کوئی جوہر نہیں کہ اس کے اخلاق کی خاصیت ہی احتیاج وغلامی ہے۔ جس کا ظہور فعل امساک سے ہوتا ہے اور روح میں بجز عزت نفس پیدا کرنے کے دوسرا کوئی جذبہ موجود نہیں کہ اس کے فطری اخلاق کی طبیعت ہی استغناء وغنا ہے، منشاء عزت وعظمت ہے۔ جس کا ظہور فعل انفاق سے ہوتا ہے، جسے صدقہ کہتے ہیں۔

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ مادی اور روحانی اخلاق ان کی زینتوں اور ان کے خواص و آثار میں تضاد کی نسبت ہے کہ خود روح ومادہ ہی میں تضاد کی نسبت ہے۔

روح ایک لطیفۂ ربانی ہے اور جسم ایک کثیفہ ظلمانی، وہ مائل بہ علو ہے، یہ مائل بہ سفل، وہ انسان کو عرشی بناتی ہے یہ فرشی، وہ اسے سربلند کرتی ہے، یہ سرنگوں گویا ان دونوں کی مثال ترازو کے دوپلوں کی سی ہے کہ جتنا ایک کو جھکا دیا جائے دوسرا اسی قدر اٹھ جائے گا۔ اس لئے آپ ان مادی تصرفات کے ذریعہ مادی اخلاق کو جس قدر بھی قوت اور رسوخ دیں گے، روحانی اخلاق اسی قدر مضمحل ہوتے رہیں گے اور اسی حد تک استغناء نفس مٹ کر احتیاج وذلت نفس کی زنجیریں مضبوط ہوتی رہیں گے جس کو دوسری تعبیر سے یوں سمجھ لیجئے کہ روح جیسا فاضل بادشاہ جس حد تک جسم جیسے کمینہ اور بے شعور غلام کے زیرِ اثر بسر کرتا رہے گا، اسی حد تک اپنی ساری فرمانروائی کی عزت وشوکت برباد کرتا رہے گا اور نتیجہ انجام کی تباہی وبربادی دونوں ہی کو گھیرتی رہے گی۔

لیکن اگر صدقہ ومجاہدہ یعنی مادیات اور مادی لذات سے بے نیازی کے ذریعہ ان روحانی اخلاق کو قوۃ ورسوخ کا موقع دیتے رہیں گے تو احتیاج وغلامی مٹ کر اسی حد تک استغناء وکمال کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی، جس سے کائنات بدن میں روح کی حکمرانی قائم ہو جائے گی اور بدن کا غلام ہر آن اس کے سامنے دست بستہ حاضر رہ کر محض بجا آوری احکام کے لئے رہ جائے گا، جس سے دونوں اپنے اپنے منصبی کاموں میں بھی لگے رہیں گے۔ دونوں کی عزت بھی بقدر مرتبہ قائم ہوگی اور اقلیم جان کا عدل بھی استوار رہے گا۔

اور جب کہ یہ پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ یہی مادی تصرفات جن سے احتیاج اور ذلت نفس کا ثمرہ پیدا ہوتا ہے، سائنس کا موضوع عمل ہیں اور یہ ہی روحانی تصرفات یعنی صدقہ ومجاہدہ جن سے استغناء وعزت نفس کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے، اسلام کا موضوع عمل ہیں، تو یہ نتیجہ خود بخود نکل آیا کہ سائنس تو انجام کار انسان کو ذلت نفس اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔ اور اسلام انجام کار اسے عزت وفلاح دارین کی طرف بڑھاتا ہے۔

پہلی صورت یعنی مادیات کا غلو اور سائنس کا بحران روح کی پامالی اور مادہ کے غلبہ کی ہے، جس سے عزیز تو ذلیل، اور ذلیل عزیز ہو جاتا ہے، جو قلب موضوع اور دونوں کے لئے موجب ہلاکت ہے۔

اور دوسری صورت یعنی روحانیت کا شغل اور اسلام کا شغف روح کی سربلندی اور مادہ کی محکومی کی ہے، جس سے عزیز مسند عزت پر اور ذلیل اپنی حد ذلت ومقہوریت پر باقی رہتا ہے جو عین عدل اور دونوں کے لئے دارین میں موجب فلاح وبہبود ہے بس یہ ہے سائنس اور اسلام کی ماہیتوں کا اجمالی خاکہ جو اپنی بساط علم کی قدر، میں نے آپ کے سامنے عرض کر دیا ہے اور یہی اس تقریر کے تین مقاصد میں سے پہلا مقصد تھا جو الحمد للہ کہ اتمام کو پہنچ گیا۔

سائنس اور اسلام میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے

اب اس پر غور کیجئے کہ یہ چورنگ مادہ ہے اور اس سے تیار شدہ بدن ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کی زندگی روح سے ہے اور روح اسے زندہ رکھ کر اپنے علوم و کمالات کو اسی کے ذریعہ عملاً نمایاں کرتی ہے پس بدن کمالات روح کے ظہور کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔ چنانچہ روح اپنے مقررہ عمل سے فارغ ہر کر جب اس مقام معلوم تک پہنچ جاتی ہے جو ازل سے اس کے لئے طے شدہ تھا جب ہی اس ڈھانچہ اور وسیلہ کو روح سے جدا کردیا جاتا ہے۔ پس جسم حقیقتاً فاعل نہیں بلکہ محض قابل ہے اور اصل نہیں بلکہ محض وسیلہ ہے۔

اگر اس جسم کو بالاستقلال مقصودیت کا درجہ دے دیا جائے تو یہ فی الحقیقت لاشہ کو مقصود بنالینا ہے، جس کا انجام سڑنے گلنے اور دماغوں کو پراگندہ کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اور جب کہ سائنس کا موضوع محض یہ جسمانیات اور مادی چیزیں ہی ہیں اور مادیات ڈھانچہ اور وسیلہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، تو خود بخود حل ہوگیا کہ سائنس کے تمام کرشمے بھی اصولاً وسائل سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھ سکتے اور جب کہ اسلام کا موضوع بالاصالہ روحانیت اور روحانی افعال ہیں اور روح اصل ہے تو یہ بھی خود بھی واضح ہوگیا کہ اسلام کے تمام امور بھی مقصودیت کے درجہ سے کسی طرح نہیں گرسکتے۔ ان دوں صورتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ صاف نکل آتا ہے کہ جیسے بدن روح کے لئے وسیلۂ عمل ہے ایسے ہی سائنس اصولی طور پر اسلامی کارناموں کے لئے ایک وسیلہ وذریعہ اور ایک ڈھانچہ ہوگی۔ جس کی زندگی اور روح اسلامی اخلاق وافکار اور اسلامی اقوال وافعال ہوں گے اگر یہ روح اس ڈھانچہ میں نہ ہو تو یہ پوری سائنس اور اس کی تشکیلات ایک لاشہ ہوں گی، جس کا انجام بجز پھولنے پھٹنے اور سڑ گل کر صحیح دماغوں اور سچے قلوب کو پراگندہ کرنے اور صاف فضا کو خراب کردینے کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ ایسی سائنس جس کا حاصل تعیش محض اور عناصر اربعہ کے خزانوں کو بلادینی روح کے استعمال میں لانا ہے اور جسے اصطلاح میں دنیوی زندگی پکارا جاتا ہے قرآن کی زبان میں لاشۂ بے جان اور چند دن اپنی سطحی چمک، دمک اور زینت دکھا کر خاک کا ڈھیر ہوجانے والا ایک لاشہ ہے۔ جس پر حقیقت سے بے بہرہ لوگ ہی ریجھ سکتے ہیں۔

اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا۔

”تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو ولعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال واولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے جیسے مینہ کہ اس کی پیداوار کاشت کاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے، پھر وہ خشک ہوجاتی ہے، سو تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہوجاتی ہے“۔

اس غیر ضروری تعیش یا تعیش محض اور جمع وسائل کا نام اسلام کی زبان میں دنیا ہے، جس کے دلدادہ کو احمق اور بے وقوف کہا جاتا ہے:

الدنيا دار من لادار له ولها يجمع من لاعقل له۔

”دنیا گھرے کا گھر ہے اور اس کی جمع پر وہی پڑے گا، جس میں عقل کا نشان نہ ہو“

بہر حال حسی، عقلی اور نقلی طور پر یہ واضح ہو گیا کہ جس طرح جسم اور مادہ روح کے لئے وسیلہ، عمل ہیں، خود مقصود و اصل نہیں۔ اسی طرح مادی تصرفات، جن کا نام سائنس ہے، روحانی تصرفات کے لئے جن کا نام اسلام ہے، اصولاً محض وسیلہ اور ذریعہ کا درجہ پیدا کر سکتے ہیں، خود مقصودیت کی شان کبھی نہیں پیدا کر سکیں گے

اور ظاہر ہے کہ جب سائنس وسائل میں سے ہوئی تو پھر یہ ایک عقلی اصول ہے کہ وسیلہ مقصود میں معین ہو، یعنی بقدر ضرورت ورنہ بالا صالۃ اس میں انہماک رکھنا اس میں مقصودیت کی شان قائم کرنا ہے، جو قلب موضوع اور خلاف عقل ہے، اس لئے عقلاً ہی یہ بھی واضح ہوا کہ مقصود اصلی یعنی دین سے جدا رہ کر سائنس محض میں انہماک پیدا کرنا کوئی عاقلانہ فعل قرار نہیں پا سکتا بلکہ اسے وسیلہ کی حد تک اور بمقدار ضرورت ہی اختیار کرنا دانائی ہوگی۔

اس لئے دنیائے سائنس اور محفل چار عناصر کے تصرفات کو اسی حد تک حاصل کرنے کی اجازت زبان نبوی پر دی گئی ہے، جس حد تک مذہبی مقاصد میں ان کی ضرورت ہو۔

ارشاد نبوی ہے :

اعمل للدنیا بمقدار بقائک فیھا واعمل للآخرۃ بمقدار بقائک فیھا۔

''دنیا کے لئے اتنا کرو جتنا دنیا میں رہنا ہے اور آخرت کے لئے اتنا کرو، جتنا وہاں رہنا ہے''

خلاصہ

یہ ہے کہ سائنس کا درجہ وسیلہ کی حد سے آگے نہیں بڑھتا کہ اس کا معمول اصلی مادہ ہے اور مادہ روح کے لئے محض وسیلہ ہے اور اسلام کا درجہ مقصودیت سے گر نہیں سکتا کہ اس معمول اصلی روح ہے اور روح مادہ کے لئے اصل مقصود ہے۔

اس تقریر سے الحمدللہ پوری طرح ''سائنس اور اسلام کی درمیانی نسبت'' بھی واضح ہو گئی اور کھل گیا کہ ان میں وسیلہ و مقصود کی نسبت ہے، جو موضوع تقریر کا دوسرا مقصد تھا، اور جس کا حاصل یہ ہے کہ سائنس کے کارنامے جب تک مذہب کے لئے بطور وسیلہ استعمال ہوں گے، خواہ ترقی کی کسی حد پر ہی پہنچ جائیں ان کا انجام خوش کن ہوگا اور جب تک اس سے جدا ہو کر خود مقصودیت کی شان لے لیں گے یعنی روحانیت ترک ہو کر مادیت **محضہ** مقصود کی جگہ لے لے گی خواہ وہ کم سے کم بھی ہو، جب ہی انجام خطرناک اور ذلت آمیز نکلے گا۔

سائنس اور اسلام کی حقیقتوں کا ہم پر تقاضہ کیا ہے

اسی سے آپ یہ بھی سمجھ لیں گے کہ آپ کی ترقی کا میلان کیا ہونا چاہئے؟ جس کے شور سے آج فضاء دنیا گونج رہی ہے۔ اس کا فیصلہ بھی وہی عقل سلیم کر سکتی ہے۔ جس نے ان میں سے ایک کو وسیلہ اور ایک کو مقصود باور کرایا ہے کہ آیا ترقی وسائل میں کی جاتی ہے یا مقصد میں؟ اور ترقی کی دوڑ راستہ کے لئے ہوتی ہے یا منزل مقصود کے لئے؟

پس اگر سائنس وسیلہ ہے اور بہ شہادت عقل و نقل ضرور ہے، جیسا کہ ثابت ہو گیا تو پھر عقل ہی کی شہادت سے وہ کبھی مطلقاً میدان ترقی بھی قرار نہیں پا سکتی کہ وہ تو راہ محض ہے، منزل مقصود نہیں اور اگر اسلام مقصود اصلی ہے اور ضرور ہے جیسا کہ عقل و نقل سے ثابت ہو چکا ہے تو اسی کو دوڑنے اور ترقی کرنے کا میدان بھی بنایا جا سکتا ہے کہ وہ راہ محض نہیں، شہر مطلوب ہے۔ جس میں پہنچنے کے لئے ساری جدوجہد تھی،

چنانچہ قرآن کریم نے ترقی کو روکا نہیں بلکہ انسان کو دنیا میں بھیجا ہی ترقی کرنے کے لئے ہے۔ ہاں وسائل میں ترقی کرنے کو اضاعت وقت کہا ہے اور مقاصد میں جس کا عنوان خیرات و مبرات رکھا ہے، ترقی کرنا نہ صرف روا ہی بتلایا ہے بلکہ ضروری اور واجب قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ربانی ہے :

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ـ

"ہر قوم کے لئے ایک قبلہ مقصود ہے، جس کی طرف وہ رخ کرتی ہے۔ سو تم ایک دوسرے سے بھلائیوں میں سبقت کرو!"

دوسری جگہ نعیم آخرت کا ذکر فرما کر جو تمام خیرات و مبرات کا مقصود اصلی ہے، ارشاد فرمایا :

وَفِي ذَالِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ـ

"اور حرص کرنے والوں کو ایسی ہی چیز کی حرص کرنی چاہئے"

پس ایک جگہ سبقت باہمی اور ایک جگہ حرص باہمی کے عنوان سے مسلمانوں کو ترقی کے لئے ابھارا گیا اور مامور کیا گیا ہے لیکن یہ ترقی اسی میدان کی ہے جس کی فطرۃً ہونی چاہئے، یعنی مقاصد کی، کیونکہ وسائل میں ترقی ترقی نہیں بلکہ بے عقلی ہے۔ اس اصولی حقیقت کے پیش نظر اب آپ اپنا جائزہ لیجئے کہ آپ نے کس طرح اس موضوع کو الٹ دیا ہے۔ مقصود کو وسیلہ اور وسیلہ کو مقصود، بادشاہ کو غلام اور غلام کو بادشاہ بنادیا ہے، کو تابع محض اور رسمی و اسمی کر ڈالا ہے اور سائنس کو مقصود حقیقی اور مطلوب اصلی قرار دے لیا ہے۔ پھر ساتھ ہی اس کے انجام بد کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ ان حالات میں یہ مادہ کا کمینہ غلام آپ کو حرمان و خسران کے کس گڑھے میں لے جا کر گرائے گا، جیسا کہ اب تک اقوام کو گراتا آیا ہے۔ اللہ کے نذیر مبین صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خالص نمائشی کروفر اور مادیات کی اسی چمک دمک پر جس کا نام شریعت کی اصطلاح میں زینت اور زہرۃ ہے، خوف کھاتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :

واللّٰہ ما اخشی علیکم الفقر ولکن مما اخشی علیکم من بعدی زھرۃ الدنیا تفتح علیکم فتھلککم کما اھلکتھم۔

"خدا کی قسم، مجھے اپنے بعد تم پر فقر و فاقہ پڑجانے سے کوئی خوف نہیں، خوف ہے تو اس کا کہ میرے بعد تم پر دنیا کی چمک دمک کھلے گی۔ اور تمہیں اس طرح ہلاک کر ڈالے گی جس طرح اس نے تم سے پہلوں کو ہلاک کیا ہے"۔

مادیات محضہ کی مضرتیں

ہاں مادیات کی یہ ہلاکت آفرینیاں پہلے علم کے میدان میں قدم جماتی ہیں جس سے اعتقادات بگڑتے ہیں اور پھر عمل کے میدان میں چھا جاتی ہیں۔ جس سے ہمت عمل ختم ہو جاتی ہے۔ علمی میدان میں اس طرح کہ مادیات خود بے شعور ہیں، چنانچہ آگ، پانی، ہوا، مٹی میں سے کوئی ایک مادہ بھی عقل و ہوش نہیں رکھتا ورنہ انسانوں کے ہاتھ میں اس طرح بے بس ہو کر مسخر نہ ہوتا۔ اس لئے ان جہالت کے کھلونوں سے رات دن کھیلنا، ظاہر ہے کہ جہل سے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ نیز یہ مادیات چونکہ خود محسوسات کی انواع ہیں، اس لئے ان کا دالدادہ انسان زیادہ سے زیادہ حس ہی کی گہرائیوں تک رسائی پا سکتا ہے اور حس کا تعلق حواس خمسہ آنکھ، ناک، کان وغیرہ سے ہے۔ اس لئے ایک چشم و گوش کا بندہ مشاہدات چشم و گوش ہی میں گھرا رہتا ہے۔ علوم

قلب اور علوم ارواح اور علوم حقائق تک اس کی رسائی ہونے ہی نہیں پاتی اور ظاہر ہے کہ جس علم کی راہ سے آدمی ناواقف محض ہو اور ناواقفی کے ساتھ ادھر کا رخ بھی کرے تو اس کا مبلغ پرواز بجز اوہام وخیالات اور شکوک وشبہات کے علوم ومعارف کب ہو سکتے ہیں؟

اسی لئے مادی انسانوں کو روحانی میدان میں شکوک وشبہات ہی گھیرے رہتے ہیں' جو درحقیقت مادیات میں انہماک وشغف رکھنے کا ایک معمولی ثمرہ ہے اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ روحانیت کی طرف رجوع کرکے جو منشاء علوم و ادراکات ہیں' قلب میں علم کی شمع روشن کی جائے جس سے اوہام و وساوس کی یہ اندھیریاں رفع ہوں۔

طلبائے یونیورسٹی کو خطاب موعظت

مگر مجھے معاف کیا جائے' اگر میں نیازمندانہ طریق پر یہ عرض کروں کہ آج مسلمانوں میں اور آپ برا نہ مانیں تو آپ جیسے نئی ذہنیت کے افراد میں اس علمی اور عرفانی روشنی کا سرے سے ہی پتہ نہیں ملتا جو شکوک و شبہات کا تریاق اور وساوس واوہام کا بدرقہ ہے بلکہ قلوب میں ریب وارتیاب اور تحیر نے جگہ پکڑ کر اصل حقیقت ہی سے بیگانہ بنادیا ہے اور جب کہ ایمان کی وہ شفاف روشنی جو ظلمات جہل اور جہل سے پیدا شدہ شبہات کو دفع کرتی ہے اور مشاہدۂ حق کو وہ تجلی ریزی جو ہر سوال کا جواب بنتی ہے' قلوب میں پیوست ہی نہیں تو محض علمی تعبیرات سے آپ قلوب کو کب تک پھسلاتے رہیں گے؟

یہ علمی عجائبات جو تقریروں کے ذریعہ آپ سننا چاہتے ہیں' اس وقت کا مشغلہ ہیں' جب کہ اصل علم کا راس المال ہاتھ میں ہو' یہاں ایمان ہی کی خیر نظر نہیں آتی' تا بہ اسلام و عمل چہ رسد؟

مادیات کی مضرتیں رفع کرنے کا طریقہ

اس لئے میری صلاح تو یہ ہے اور نہ میری صلاح بلکہ اسلام کی حقیقت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ میرے عزیز بھائی اوپر کی ٹیپ ٹاپ اور مرہم پٹی کو چھوڑ کر اس مادہ فاسد کا تنقیہ کریں' جو مادی سائنس کے غیر ضروری انہماک اور غلو نے پیدا کردیا ہے۔ اور فلسفہ کے علم نما جہل نے اس کی آبیاری کی ہے۔ ان حالات میں ان کا فرض ہے کہ وہ جسم کے بجائے روح کو ابھرنے کے قابل بنائیں کہ وہ ہی انسان میں علم کا منبع ہے جس کی پہلی کڑی یہ ہے کہ جواء نفسانی اور مادی خواہشات کے بے شمار مقاصد سے ذرا ایک طرف ہو کر اس منبع جود وکمال ذات حق کی طرف رجوع کریں۔ جس سے علم ومعرفت کی روشنی چلتی اور شبہات و وساوس کی دنیا کو تنگ بنادیتی ہے۔

استحکام توحید

گویا دوسرے لفظوں میں تعدد مطالب یا شرک کو چھوڑ کر توحید پر استقامت اختیار کی جائے جو اسلام کی روح اور اصل اصول ہے' اس کی تدبیر بجز اس کے اور کیا ہو سکتی ہی کہ کلمہ توحید کو باربار اور بکرات ومرات دہرایا جائے تاکہ قول کا اثر قلب پر پڑے اور توحید راسخ ہو۔

ارشاد نبوی ہے: جددوا ایمانکم بقول لاالہ الا اللہ

پھر اس لا الہ الا اللہ میں ایک توحید ذات ہی کا تصور نہ کریں بلکہ توحید صفات کا دھیان بھی اسی کلمہ سے کریں۔ یعنی اللہ کے سوناموں یا سو صفات کی توحید بھی اسی کلمہ سے حاصل کریں۔ گویا الوہیت کا اثبات ونفی اس ترکیب سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسی ہی رحمانیت' نافعیت' ضاریت وغیرہ کا اثبات ونفی بھی اس طرح

کیا جائے۔ لارحمن الا اللّٰہ لامالک الا اللّٰہ لانافع الا اللّٰہ' لاملک الا اللّٰہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر جب قلب میں یہ ذہن نشین ہو جائے گا کہ مالک بھی ایک وہی ہے' نافع بھی وہی اور ضار بھی وہی ہے' عظمت و جبروت والا بھی وہی ہے اور ذوالجلال والاکرام بھی ایک وہی ہے تو اس کا قدرتی ثمرہ یہ ہوگا کہ قلب سے سب عظمتیں مٹ کر صرف ایک ذات واحد کی عظمت رہ جائے گی اور یہی کسوٹی اور یک رُخی قلب کی قوت ہے۔ ایک غلام دو آقاؤں کو بیک دم خوش نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ متفکر متردد اور مذبذب رہے گا۔ جس سے قلب میں کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ لیکن جو اس یقین پر ہے کہ میرا ایک ہی آقا ہے اور وہ بھی ایسا جو علی الاطلاق ہر چیز کا مالک اور اس پر قابض و متصرف ہے۔ تو وہ متردد رہنے کے بجائے متیقن اور مطمئن ہو جائے گا اور یقین و اطمینان ہی قوت قلب کی بنیاد ہے۔ جس سے اس کی قوت فکری سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور پھر اس سے عجائبات فکر اور غرائب علوم پیدا ہوتے ہیں اور انسان کی بصیرت و معرفت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی قوت یقین کے ماتحت حضرات صحابہؓ اور سلف کے وہ محیر العقول کارنامے ہیں جنہوں نے متمدن دنیا کو آج تک حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

ان کی ترقیات اور طوفانی کارنامے روپیہ پیسہ اور دھن دولت کے رہین منت نہ تھے بلکہ دولتیں خود ان کے کارناموں سے بنتی اور بگڑتی تھیں۔ اس لئے سب سے پہلے اپنے توحیدی اعتقاد درست کیجئے کہ یہی ہر خیر و کمال کی بنیاد ہے۔

یادِ حق اور اس کا ابتدائی آسان طریقہ

ہاں پھر اس توحیدی فکر کو پختہ اور راسخ کرنے کے لئے طمانیت قلب کی حاجت ہے۔ ورنہ وساوس و خطرات اور تشویشات فکر اس صاف حقیقت پر قائم نہیں رہنے دیں گے۔ اس لئے قرآن کریم نے طمانیت قلب پیدا کرنے کا موثر ذریعہ فرمایا کہ الابذکر اللّٰہ تطمئن القلوب ۔

"یاد رکھو! اللہ کی یاد ہی سے دل چین پاتے ہیں"

اس سے مقصود ذکر قلبی ہے۔ مگر ذکر قلب میں راسخ نہیں ہوتا' جب تک کہ زبان سے اس کا بار بار تکرار نہ کیا جائے۔ چنانچہ طالب علم اپنے سبق کو قلب میں محفوظ کرنے کے لئے زبان ہی سے اس کو بار بار دہراتا ہے اور رٹتا ہے اس لئے اولاً زبان کو ذاکر بنانا چاہئے تاکہ قلب ذاکر بن جائے اور یہ ایمان و توحید دل میں اپنی جڑیں چھوڑ دے اور قلب اس پر قانع اور مطمئن ہو جائے۔

اسی لئے شریعت نے ذکر حق کی مختلف صورتیں تجویز کی ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ آج ان کا استعمال تو بجائے خود رہا ان کا علم تک بھی مسلمانوں اور اس طبقہ کو نہیں ہے' جو تعلیم یافتہ کہلاتا ہے۔

شریعت نے سب سے پہلے فرائض رکھے جو ذکر اللہ کا اعلیٰ مظہر ہیں اور ہر چھوٹے بڑے پر لازم کئے۔ اس لئے فرائض علوم و صلوٰۃ وغیرہ کی پابندی کیجئے پھر اوقات مخصوصہ کی دعائیں یاد رکھیں تاکہ چلتے پھرتے بھی خدا کی تسبیح و تہلیل آدمی کی زبان پر جاری رہے' اس لئے اس قسم کے اذکار کو یاد کرنے کی فکر کیجئے۔ پھر مختلف مواقع کلام کے محاورے اسلامی زبان نے ایسے رکھے ہیں کہ ان میں بلا ارادہ بھی ذکر اللہ زبان پر جاری رہے۔

بسم اللّٰہ' الحمد للّٰہ' جزاک اللّٰہ' انا للّٰہ' ماشاء اللّٰہ' انشاء اللّٰہ' استغفر اللّٰہ' الا اللّٰہ' سبحان اللّٰہ وغیرہ۔ آپ کی زبان کے رات دن کے محاورے ہیں۔ اگر آپ استعمال کریں اور اغیار کی زبانوں سے شغف پیدا نہ کریں۔ آپ کی زندگی کا کوئی ایسا کام جس سے کلام کا تعلق ہو' ایسا نہیں ہے۔ جس کے متعلق کلام میں اللہ کا نام داخل محاورہ نہ ہو۔

گویا اسلامی معاشرت میں رہ کر کلام کرنے والا بے ارادہ بھی ہر وقت اللہ کا نام لینے پر مجبور ہے۔ لیکن آج مسلمان اپنی دینی زبان سے جس کی بدولت وہ ارادہ و بے ارادہ ہر وقت خدا کا نام لینے کی توفیق پاتے تھے، نہ صرف بے پرواہ ہی ہیں بلکہ اسکے مٹانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اسلام نے عربیت اور عربی محاورے قائم رکھنے پر اسی لئے کافی زور دیا تھا کہ زبان کا اثر تہذیب، کلچر، تمدن اور عام احوال زندگی پر پڑتا ہے۔ چنانچہ انگریزی اقتدار کے آغاز کے وقت علماء وقت اور خصوصاً اکابر دارالعلوم دیوبند نے مسلمانوں کی فہمائش کی تھی کہ وہ اپنی عربیت کو تھامے ہوئے غیر زبان کی ترویج و تقویت پر اس ذوق و شوق سے زور نہ دیں کہ وہی زبان ان کی بنیاد اور قبلہ مقصود بن جائے، مگر مسلمانوں نے ان مبصروں کا کہنا نہ مانا اور بالآخر آج وہ اس کے نتائج بد سے دوچار ہوئے کہ ان کی تمدنی صورت و سیرت ہی مسلمانوں جیسی نہ رہی، چہ جائیکہ ان کا عملی دین اصلی رنگ میں محفوظ رہتا۔

مگر بہر حال رجوع کے لئے کسی وقت کی تخصیص نہیں۔ اگر آپ پوری تندہی سے آج ذکر اللہ کے پابند نہیں ہو سکتے تو کم از کم عربیت کو زبان ہی کی حیثیت سے باقی رکھنے کی سعی کیجئے اور اس کے دینی محاورات ہی کو زبان زد کرتے رہئے تاکہ اسی بہانہ سے خدا نام زبانوں پر جاری رہے۔ نام حق کی یہ زبانی مشق اگرچہ بے ارادہ بھی ہو پھر بھی انشاء اللہ قلوب میں ایک حد تک ذکر اللہ کو قائم کرتی رہے گی۔

صحبت صلحاء اور اہل اللہ سے رابطہ

مگران امور کی توفیق اس کے بغیر مشکل ہے کہ اسباب توفیق بھی اس کے ساتھ جمع کئے جائیں اور ان میں مؤثر ترین سبب سچوں کی صحبت و معیت ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ۔

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کی معیت اختیار کرو"

چنانچہ صحبت یافتہ جاہل بعض اوقات غیر صحبت یافتہ عالم سے بدرجہا زائد مقاصد دین کو سمجھتا ہے اور دینی رنگ سے رنگین اور متصبغ ہو جاتا ہے اس لئے اہل علم اور اہل اللہ کے پاس آمدورفت کو ایک مستقل مقصد کی حیثیت سے قائم رکھیے۔ برد یقین اور ثلج صدر استدلال سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

اکبر نے خوب کہا ہے ۔ فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

آگے حصول یقین و دین کی تدبیر کے بارہ میں کہتا ہے کہ ۔

نہ کتابوں سے نہ وعظوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کے نظر سے پیدا

اس لئے میں نیاز مندانہ التماس کروں گا کہ میرے عزیز بھائی! اہل اللہ اور اہل دین سے بیگانہ نہ رہیں، بلکہ ان سے وابستگی پیدا کرنے کی صورتیں نکالیں تاکہ انہیں دولت دین و یقین حاصل ہو اور شکوک و شبہات، تردوات کا مادۂ فاسدہ ختم ہو جائے۔ ورنہ محض تقریروں اور وہ بھی ایسے کلی مسائل کی تقریروں سے جو خالص علمی حقائق پر مشتمل ہوں، اصلاح نفوس کی راہیں استوار نہیں ہوتیں، یہ اس وقت کا مشغلہ ہے جب ذوق

یقین سے قلوب معمور ہو چکے ہوں۔ دین کا رنگ قوت عمل اور صحبت صلحاء ہی سے قلوب پر چڑھ سکتا ہے۔ پس آپ حضرات کا فریضہ ہونا چاہئے کہ مادیت کے اس ہجوم میں روحانیت کو فراموش محض نہ کر ڈالیں۔

خلاصۂ بحث

بہر حال اس تقریر سے اسلام کی حقیقت اور اس کی غرض وغایت بھی واضح ہو گئی کہ وہ انسان کو روحانی میدان میں دوڑا کر اسے دائمی رفعت وعزت اور طمانیت وبشاشت کی منزل تک پہنچا دیتا ہے کہ دائمی رفعت وعزت روحانیت ہی میں ہے اور پھر ساتھ ہی سائنس کی حقیقت اور اس کی غرض وغایت بھی سامنے آ گئی کہ وہ انسان کو مادی میدانوں میں چھوڑ کر انجام کار اسے ذلت وخسران کی طرف دھکیل دیتی ہے کہ محض مادیات کا انجام فنا وذلت کے سوا کچھ نہیں اور آخر کار ایک سائنس زدہ نہ اپنے مادی منافع ہی کو باقی رکھ سکتا ہے اور نہ اسے روحانی منافع ہی نصیب ہوتے ہیں' نیز "سائنس اور اسلام" کی باہمی نسبت بھی واضح ہو گئی کہ ان میں وسیلہ ومقصود کی نسبت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تک سائنس کے کارنامے مذہب کے لئے خادم اور ذریعہ تحصیل نہ بنیں گے' ان کا انجام خوش کن نہ ہو گا اور اسی کے ساتھ بطور ثمرہ یہ مقصد بھی حل ہو گیا کہ جب اسلام مقصود ہے اور سائنس اس کا وسیلہ' تو اسلام کی مقصودیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ترقی کا میدان اسلام کو بنایا جائے نہ کہ سائنس کو کہ ترقی ہمیشہ مقاصد میں کی جاتی ہے نہ کہ ذرائع اور وسائل میں۔ یعنی سائنس کے معمولات اسی حد تک اختیار کئے جائیں' جس حد تک اسلام کو ان کی ضرورت ہے۔

مباحث تقریر کا ربط حدیث زیب عنوان سے

یہی وہ مقاصد سہ گانہ تھے' جن کی تشریح کا حدیث زیب عنوان کے دائرہ میں رہتے ہوئے میں نے ابتداء تقریر میں وعدہ کیا تھا کہ الحمد للہ ان مقاصد کی ایک حد تک توضیح وتشریح ہو چکی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد کی اس طوالانی بحث کو سمیٹ کر اور حدیث عنوان پر منطبق کر کے یہ واضح کروں کہ تقریر کی یہ تمام تفصیلات جو عرض کی گئی ہیں' اسی حدیث کے چند جامع اور بلیغ جملوں کی شرح ہیں اور صرف اسی کی تعبیرات سے مستنبط ہیں۔

سو بغور سنئے کہ اس حدیث کی ابتداء میں اولاً تو ملائکہ کے سوال پر عناصر اربعہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ جو عالم کا مادہ اور اس کے موالید ثلاثہ (جمادات' نباتات' حیوانات) کی اصل ہے۔ جن سے یہ دنیا پیدا کی گئی ہے۔

پھر یہ تذکرۂ عناصر ایک ایسے بلیغ پیرایہ میں فرمایا گیا کہ ان کی شدت وضعف کے باہمی مراتب پر بھی ایک سیر حاصل روشنی پڑ گئی ہے کہ ان میں سے مثلاً مٹی سب سے زیادہ ضعیف ہے۔ اس سے قوی لوہا ہے' جو اجزاء ارضیہ میں سے ہے۔ اس سے اشد آگ ہے۔ اس سے اشد پانی ہے اور اس سے اشد ہوا ہے۔ یہ بیان قال نعم الریح تک چلا گیا ہے۔

پھر ان مادی عنصروں سے منتقل ہو کر ان کے مرکب موالید کی طرف رخ فرماتے ہوئے موالید کے اعلیٰ ترین جزو انسان کی طرف توجہ فرمائی گئی اور بتلایا گیا کہ ان سب سے زیادہ اقویٰ اور اشد انسان ہے جس کا ذکر قال نعم ابن ادم کے جملہ سے فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ میں نے انسانی افعال دکھلا کر واضح کر دیا ہے کہ انسان ہی وہ نوع ہے جس کے اشاروں پر تمام مادیات اور سارے ہی موالید ناچ رہے ہیں۔

پھر ان مادیات سے منتقل ہو کر روحانیت کی طرف حدیث مبارک کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ ابن آدم علی الاطلاق اشد اور اقویٰ نہیں بلکہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ روحانی بنے اور مادی نہ رہے یعنی مادیات کو ترک

کرتا ہو جس کا بیان تصدق صدقۃ میں فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ صدقہ ہی ترک ماسواء یا ترک مادیات کا نام ہے۔

پھر روحانیت سے منتقل ہو کر روح کے بھی اعلیٰ مقامات تجرد خالص اور غوائل نفسانیہ سے برأت اور کثافت اخلاق سے پاکی' پھر لطافت اخلاق سے آراستگی کی طرف حدیث کا رخ ہوا اور بتلایا گیا کہ انسان کا محض صدقہ دے دینا مادیات سے انقطاع کر لینا بھی کوئی چیز نہیں۔ جب تک کہ اس میں خلوص اور قطع ریاء نہ ہو اور اسی کا نام اخفاء صدقہ ہے۔ جس کا بیان یخفیھا میں فرمایا گیا ہے۔ یعنی محض صدقہ دہندہ سے وہ مخلص صدقہ دہندہ قوی اور شدید ہوتا ہے جس کے صدقہ میں ریاء و نمود کا دخل نہ ہو۔ گویا یہ صدقہ یا ترک مادیات محض حسبۃً للہ ہو اور یہ متصدق بجائے مادی ہونے کے روحانی بن کر صدقہ دے رہا ہو۔

پھر فرمایا گیا کہ مخلوق سے چھپا کر صدقہ کرنا بھی قوت و شدت کے لئے کافی نہیں جب تک کہ خود اپنے نفس سے بھی اس کو مخفی نہ رکھا جائے۔ یعنی اس میں خود بینی اور اعجاب و ناز بھی شامل نہ ہو اور خود اپنے نفس میں اس کو کوئی چیز بھی نہ سمجھ رہا ہو۔ گویا صدقہ دہندہ نفسانی ہونے کے بجائے خالص ربانی بن کر صدقہ کرے تو وہ تمام عناصر اربعہ' تمام موالید' تمام انسانوں' تمام صدقہ دہندہ انسانوں پھر تمام مخلص اور بے ریا صدقہ دہندوں سے بھی اشد واقویٰ ہوگا۔ اسی مقام کی طرف یخفیھا من شمالہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ یعنی اس درجہ مخفی صدقہ ہو کر بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا اور کسے دیا؟

پھر ظاہر ہے کہ استغناء اور ترک کی یہ کامل شان کہ آدمی نے دنیا ہی کو نہیں خود اپنے نفس کو بھی چھوڑ دیا ہو۔ جب کہ دنیا اور اپنے نفس کے دکھاوے کے لئے نہیں' تو ظاہر ہے کہ بجز خدا کے اور کس کے دکھلانے کے لئے ہو سکتی ہے اور جب کہ خدا کہ طرف لئے ہوئے' یعنی اس کامل للہیت نے یا بالفاظ دیگر صدقہ کی نسبت خدا کی طرف ہو جانے نے اس ضعیف البنیان صدقہ دہندہ میں وہ غیر معمولی طاقت پیدا کر دی کہ اس نے ساری مادیات اور ان کے عناصر و موالید کو مسخر کر لیا۔ تو اس سے صاف واضح ہو گیا کہ حقیقتاً قوی مطلق اور شدید مطلق صرف خدا ہی کی ذات ہے اور یہ کہ اسی کی طرف دوڑنے یا اسی کی نسبت پیدا کرنے میں ساری قوتیں اور شدتیں پنہاں ہیں۔

ادھر حدیث ہی کی ترتیب بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قوت و طاعت بقدر لطافت ہوتی ہے۔ تو یہ بھی حدیث ہی کی دلالت سے نکل آیا کہ جو خدا قوت و طاقت اور شدت کا مخزن ہے وہی لامحدود لطافت کا بھی مخزن ہے۔ چنانچہ اس کی لامحدود لطافت کا یہ عالم ہے کہ اسے نگاہیں بھی نہیں پا سکتیں۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔

"اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے"۔

اس لئے حدیث سے گویا یہ اصول بھی مستنبط ہو گیا کہ قوی و متین صرف اللہ کی ذات ہے۔ پھر جو اس سے مناسبت پیدا کرنے کا طریقہ مادیات سے ہٹ کر ___ روحانیت کی طرف آتا ہے' جس کا طریق صدقہ ہے۔ چونکہ مخلص متصدق جو بلا اعجاب نفس اور بلا ریاء خلق صدقہ دے رہا ہے۔ اس سے کامل مناسبت پیدا کر لیتا ہے۔ اسی لئے وہی کامل لطافت کا حامل اور سب سے بڑھ کر طاقتور ہو جاتا ہے۔

مباحث حدیث کے لطیف نتائج

بہر حال حدیث کے اس مرتب بیان سے کہ ہر کثیف کو پہلے بیان کیا اور ہر لطیف کو اس کے بعد اور پھر ہر

پچھلے کو پہلے سے اشد اور اقویٰ فرمایا۔ یہ ثابت ہو گیا کہ معیار شدت و قوت یہ وصف لطافت ہی ہے اور اس کی ترتیب طبعی یہی ہو سکتی تھی کہ مٹی سے لطیف لوہا' لوہے سے لطیف آگ' آگ سے لطیف پانی' پانی سے لطیف ہوا' ہوا سے لطیف انسان' عام انسانوں سے لطیف تارک الدنیا اور عام تارکین دنیا سے وہ لطیف تارک مخلص اور زاہد بے ریا' انسان ہے' جس کا قلب شواغل دنیا سے پاک' مادیات کی محبت سے بالاتر' مادی کثافتوں سے نفور' روحانی لطافتوں کا محور ہو۔ گویا وہ روحانی اور ربانی انسان ہی کامل لطافت کے حامل بن سکتے ہیں۔ جو بدنوں کے پالنے میں منہمک نہ ہوں بلکہ روحوں کی تکمیل میں لگے ہوئے ہوں اور مادی تصرفات کے بجائے روحانی اعمال ان کا شعار بن گئے ہوں۔

لطافت روح مذہبی بننے میں مضمر ہے

اور یہ سب جانتے ہیں کہ ربانی بننے کے طریقے اور روحانی شعائر برپا کرنے کے ڈھنگ سکھلانا مذہب کا موضوع ہے نہ کہ سائنس کا۔ اس لئے اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ لطیف تر اور قوی تر انسان وہی ہو سکتا ہے جو مذہبی ہو اور جس کا اوڑھنا اور بچھونا مذہب ہی مذہب ہو چکا ہو۔ اس لئے حدیث سے جہاں قوت وشدت کا معیار مستفاد ہوا کہ وہ لطافت ہے وہیں حصول لطافت کا طریقہ بھی مستفاد ہوا کہ وہ مذہب ہے جو روحانیت کو مستحکم کر کے لطافت پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح روح بادشاہ ٹھہر جاتی ہے۔ جو اس کا حقیقی منصب ہے۔ نفس اس مملکت کا خاکروب ٹھہرتا ہے جو تقویٰ کے وسیلے سے سیئات کا کوڑا کرکٹ صاف کرے۔ چوریاں اور ڈکیتیاں کرتا نہ پھرے۔ عقل اس کا وزیر ٹھہر جاتی ہے جو مفید مشورے دے۔ وحی الٰہی اس کا حتمی قانون ٹھہر جاتی ہے۔ جس سے راہ ملے اور اس طرح روح کی منظم حکمرانی سے روحانیت کا عدل چاردانگ اقلیم بدن میں پھیل جاتا ہے۔ چور اور ڈاکو مقید ہوتے ہیں' جن سے بدامنی پھیلتی تھی' پھر ایسے مامون اور مضبوط ملک میں جس کا فرمانروا بیدار' وزیر دانشمند' قانون روشن اور عدل وانصاف کے سبب پوری اقلیم منظم ہو' نہ تو بیرونی دشمنوں کو حملہ کی ہمت ہوتی ہے کہ اس اقلیم میں گھس کر فتنہ وفساد مچائیں اور نہ اندرونی خائنوں اور چوروں کو جرأت ہوتی ہے کہ بدنظمی پھیلائیں۔ بیرونی دشمن' یعنی شیطان کے بارہ میں تو قرآن نے فرمایا کہ

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔

''یقیناً اس (شیطان) کا قابو ان لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان رکھتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں''۔

اور اندرونی دشمن یعنی نفس امارہ کے بارے میں فرمایا کہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر خود ہی قانون کے تابع ہو جاتا ہے اور اسی پر مطمئن اور راضی بن جاتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۔

''اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش''۔

اسلام کی بنیادی حقیقت

اب اس تمام مضمون کا حاصل یہ نکل آتا ہے کہ یہ سارا عالم دو حصوں میں تقسیم شدہ ہے "مادیت اور روحانیت" یا "سائنس اور اسلام" "اسلام اور روحانیت کی بنیاد بفحوائے حدیث دو اصول پر ہے۔ ایک ترک ماسوی اللہ جسے صدق سے تعبیر کیا گیا ہے' ایک اخلاص جسے اخفاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پہلے اصول کا حاصل یہ ہے کہ خدا کے سوا دنیا ہو یا اپنا نفس اور ہوائے نفس سب کی وہ الفت قلب سے نکال پھینکنا جو الفت حق میں خلل انداز ہو اور دوسرے اصول کا حاصل یہ ہے کہ اس ترک ماسوی میں خالص اسی ایک محبوب حقیقی کے راضی کرنے کا جذبہ کام کر رہا ہو جو اس ارض و سماء کی محفل کا خالق ہے۔ اس بارے میں نہ خود بینی ہو نہ خود نمائی نہ خودی ہو نہ خود ستائی۔

سائنس کی جڑ بنیاد کیا ہے؟

اس کے بالمقابل سائنس کی بنیاد جو اسلام کے متقابل ہے۔ خود بخود ان دو اصولوں کی ضدوں پر نکل آتی ہے۔ ترک ماسویٰ کی ضد حب ماسویٰ ہے اور اخلاص کی ضد نفاق ہے۔

حب ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ ہر غیر اللہ اور ہر باطل کی محبت ہو اور نہ ہو تو خدا اور حق کی محبت نہ ہو۔ چونکہ غیر اللہ کی محبت کے سلسلہ میں اپنا نفس سب سے مقدم ہے۔ اس لئے گویا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محبت اپنے نفس سے ہو اور نفس کو چونکہ تمام مادی لذائذ سے محبت ہے۔ اس لئے بواسطہء نفس سارے مادی لذائذ سے محبت ہو جس کا نام دنیا ہے۔ گویا جب ماسویٰ کا حاصل یہ ہے کہ نفس جاہل بوجہ حقیقت ناشناسی کے انہی مادی لذائذ کو جن کی صورت آراستہ ہے اور انجام گندہ ہے' اپنا منتہائے مقصود ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

لیکن جب کہ فی نفسہ یہ مادی لذائذ کسی برتری اور انجام کی خوبی نہ رکھنے کے سبب اہل بصیرت کی نگاہوں میں باوقعت نہیں بنتے اور وہ ایسے دنی مانوس کو قابل ملامت ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ نفوس اپنے خسیس مطلوبات پر اصول اور شائستگی کا پردہ ڈال کر انہیں معقول باور کرانے کی سعی کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے تمام نفسانی جذبات کو جن سے مذاق سلیم کتراتا ہے' کمالات کا لباس پہنا کر سامنے لاتے ہیں تاکہ اپنے ان خسیس مطلوبات کو عام نگاہوں میں کچھ باوقعت بنا سکیں۔ مثلاً عام لہو و لعب اور بازاری رقص و سرور کو فنون لطیفہ کے عنوان سے پیش کرتے ہیں۔ منظم عیاشیوں اور بدکاریوں کو قانونی رنگ میں لے کر تہذیب و تمدن کا عنوان دیتے ہیں۔ استعمار اور جوع الارض کو خوشنما الفاظ میں پیش کر کے ترقی کا عنوان دیتے ہیں۔ جنگی آلات کے بے پناہ خون ریزیوں اور تباہی انسانیت کو جنگ حق و صداقت اور قیام امن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

وسائل عیش و طرب کی فراہمی کو سوسائٹی کی بلندی اور برتری سے تعبیر کرتے ہیں' پرستش اپنے نفس اور ہوائے نفس کی کرتے ہیں اور الفاظ کے چکر سے اسی کو حق کی پرستش دکھلاتے ہیں۔ عقیدت و اطاعت اپنے جذبات کی ہوتی ہے اور نام سچائی کی عقیدت کا لیتے ہیں۔

غرض یہ مادی نفوس اچھے عنوان سے فائدہ اٹھا کر اپنی ہوسناکیوں کو چھپانے اور انہیں خوبصورت لباس میں دکھلا کر باوقعت بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ نفاق کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ اندر کچھ ہو اور دکھلایا کچھ جائے' باطن گندہ ہو اور ظاہر کو آراستہ کیا جائے اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کو دھوکہ اور فریب دیا جائے۔

مادی تمدن کی انہی خوشنمائیوں اور گندم نما جو فروشیوں کو قرآن کریم نے زینت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کی حقیقت یہی ہے کہ اندر کچھ نہ ہو، مگر ٹیپ ٹاپ اور سطحی آرائش سے اس میں دلفریبی کافی پیدا کر دی جائے۔ ارشاد حق ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ والحديث ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۔

”خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کی محبت، مرغوب چیزوں کی عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نمبر لگے ہوئے گھوڑے ہوئے، مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی۔ یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی اور انجام کار کی خوبی تو اللہ ہی کے پاس ہے“۔

اس میں شہوت پرستیوں، مالی ہوسناکیوں، اسباب مفاخرت و ریاست غرض مالی تکاثر اور جاہی تفاخر کو زینت دنیا فرما کر بتلایا گیا ہے کہ ان تمام چیزوں زن، زر، زمین وغیرہ میں محض سطحی عاجلی اور ناپائیدار لذت ہے۔ ورنہ ان کی اندرونی حالت تیرہ و سیاہ ہے اور ان سب کی وابستگی کا انجام کدورت اور تلخی ہے۔ اگرچہ اس پر کتنے ہی پردے خوشنما اور دلفریب عنوانات کے لباس پڑے ہوئے ہوں۔ جس کا حاصل وہی بے حقیقت دکھلاوا ہے، جسے اصطلاحی لباس میں نفاق کہتے ہیں۔

اب اگر آپ غور کریں تو سائنس کے ان دونوں اصولوں، حب ماسویٰ اور نفاق کی حقیقت باطل نکلتی ہے۔ نفاق کا باطل ہونا تو اس لئے ظاہر ہے کہ باطل کے معنی ہی یہ ہیں کہ دیکھنے میں بہت کچھ ہو اور حقیقت میں کچھ بھی نہ ہو۔ اوپر سے چمک رہا ہو اور اندر سے تاریک ہو۔ پس جب کہ نفاق کی بھی یہ ہی کیفیت ہے کہ اندر کچھ ہو اور اوپر کچھ ہو تو نفاق کا باطل ہونا واضح ہے۔

ادھر ماسوی اللہ بھی باطل ہی کا ترجمہ ہے۔ کیونکہ ہر ماسوی اللہ کی ہستی ظاہر ہے کہ اللہ ہی کے وجود دیئے سے قائم ہوتی ہے۔ نہ وہ از خود قائم ہے اور نہ از خود موجود ہے۔

اس لئے حقیقتاً ماسوی اللہ کی ذات میں کوئی وجود یا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے ذریعہ محض وجود حق اور کمالات حق کا مظاہرہ ہوتا ہے اور جب کہ ماسوی اللہ کا خواہ وہ نفس انسانی ہو یا دوسرے موالید عناصر اربعہ ہوں یا دوسرے اجزائے کائنات، خود ہی کوئی وجود نکلا، تو وہ بظاہر تو موجود ہیں مگر کوئی ہستی ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کل کا کل ماسوی اللہ بھی اپنی ذات سے باطل ہی نکلا۔

الا کل شیئ ماخلا اللّٰہ باطل

اور جب کہ سائنس کی بنیاد انہی دو باطلوں پر تھی۔ ایک خدا سے قطع ہو کر ماسوی اللہ پر جو آفاقی باطل ہے۔ ایک نفاق پر جو انفسی باطل ہے تو پوری سائنس کی حقیقت بجز باطل ہونے اور باطل پسندی کے اور کچھ نہ ہوئی جس پر سائنس دانوں کا یہ ناز اور شور و شغب ہے کہ اس سے ساری زمین اور آسمانی فضا گونج رہی ہے۔

ہاں اس کے بالمقابل اگر ماسوئی اللہ کو ترک کر کے اللہ کو اختیار کیا جائے تو وہ حق ہے اور نفاق کو ترک کر کے اخلاص کو اختیار کیا جائے تو وہ بھی حق ہے اور اللہ کے ساتھ اسی مخلصانہ تعلق قائم کرنے کا ہی نام اسلام ہے۔ تو اسلام کی بنیاد ایسے حق پر نکلتی ہے جس میں باطل کا نشان نہیں۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سائنس تو ایک شور بے بنیاد اور باطل کا نام ہے، اسلام ایک حقیقت ثابتہ اور حق کا نام ہے، جس کی جڑیں مستحکم اور

دائی ہیں۔ باطل کا کلمہ بے بنیاد' حق کا کلمہ اپنی بنیادوں پر راسخ ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جارہی ہوں وہ خدا کے حکم سے ہر فصل میں اپنا اپنا پھل دیتی ہوں اور اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے واسطے اس لئے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ خوب سمجھیں اور گندہ کلمہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خراب درخت ہو کہ وہ زمین کے اوپر ہی اوپر سے اکھاڑ لیا جائے اس کو کچھ ثبات نہ ہو"۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

مگر اس تقریر سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ میں نفس سائنس اور اس کی ایجادات کو روک رہا ہوں یا سائنس کی تعلیم پر حرمت کا فتویٰ دے رہا ہوں یا اس میں اشتغال کلیۃً باطل ہے بلکہ مقصود وہی ہے جو مختلف عنوانوں سے تقریر کے ذیل میں آچکا ہے کہ میں اسے قبلہ مقصود اور کعبہ مطلوب بنانے سے منع کر رہا ہوں۔ اگر یہ ساری جدوجہد جو آج سائنس کے سلسلہ میں کی جارہی ہے' کسی حقیقی مقصود کے لئے ہو وہ نہ صرف جائز ہی ہے بلکہ آج کے دور میں مطلوب ہے اور وہ مقصود نہ ساری دنیا ہے کہ وہ تو خود وسیلہ ہے نہ مادی راحت و آرام ہے کہ وہ بھی وسیلہ ہے بلکہ ایک مسلمان کے لئے آخرت اور اس کی مذہبی دیانت ہی ہو سکتی ہے کہ وہی مقصود اصلی ہے اور اسی کے لئے انسان کی تخلیق عمل میں آئی ہے

پس سائنس مذہب سے بے تعلق رہ کر کلمہ خبیثہ ہے جس کے لئے کوئی ثبات و قرار نہیں اور مذہب کے ساتھ بحیثیت ایک خادم اور ذریعۂ مطلوب کے وابستہ ہو کر وہ بلا شبہ نافع اور کار آمد ہو گی اور کلمہ طیبہ ہی کے ذیل میں آجائے گی جس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں۔

لیکن میں جہاں تک محسوس کرتا ہوں آج سائنسی جدوجہد ایک حقیقی مقصود کی سی نظر آرہی ہے' لوگ اس پر اسی کی خاطر جھک پڑے ہیں اور نہ صرف یہی کہ اس کے ردو قبول کا معیار مذہب کو نہیں بنایا گیا بلکہ بیشتر مواقع میں اسے مذہب کے خلاف استعمال کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ سائنس نے مذہب کی بنیادیں ہلادی ہیں۔ اور گویا سائنس ایک ایسا مقصود ہے کہ مذہب اس کا وسیلہ تک بھی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چہ جائیکہ اس کا مقصود قرار پائے۔

بہت ممکن ہے کہ دنیا کے قدیم مذاہب کے لئے سائنس نے کوئی ایسا ہی تخریبی اقدام کیا ہو۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کے جس مذہب کے ایک ایک جزو کے ساتھ سائنس ساتھ رہ کر چل سکتی ہے وہ نہ صرف مذہب فطرت یعنی مذہب اسلام ہے۔ اگر اس کی تفصیلات دیکھنی ہوں تو میں نے اس پر ایک مستقل رسالہ "تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام" لکھا ہے۔ جسے "ندوۃ المصنفین" دہلی نے شائع کیا ہے۔ جس میں دلائل واضحہ سے دکھلایا گیا ہے کہ سائنس کی تمام ایجادات درحقیقت اسلام کی معنویتوں کا مادی رخ ہیں اور

اس دور میں اسلام کے تفہیم اور اس کے اقرب الی الفہم کرنے کے لئے ہی تکوینی طور پر سائنسی ترقیات کا وجود عمل میں آیا ہے۔ پس جو شخص سائنس کو اسلام کا وسیلہ بنا کر استعمال کرے گا وہ اسلام کو قوت پہنچائے گا اور جو اسے مستقلاً مقصود بنا کر عمل میں لائے گا وہ اپنے نفس کو ضعف اور ضرر پہنچائے گا، مگر اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

طلبائے یونیورسٹی کے لئے مقام عبرت

بہر حال جب کہ سائنس محض یعنی بلاتوسط مذہب کلمۂ خبیثہ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں اور اسلام کلمہ طیبہ ہے جس کی جڑیں مستحکم اور ہستی پائیدار ہے تو نیک نہاد اسلام فرزندوں کے لئے اس میں سے عبرت و موعظت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوقات عزیز کا سائنس محض کے معلومات میں اس طرح نہ گنوائیں کہ وہ مقصود اصلی قرار پائے اور اس کی فانی لذات اصل ہو جائیں کہ یہ انجام کی ندامت کا سبب ہوگا۔ نیز وہ ان اقوام کی ظاہری چمک دمک اور ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ نہ ہوں جنھوں نے آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے گھروندہ میں سے کچھ چمکیلی چیزیں بنا کر دنیا کے لہو ولعب میں اضافہ کر دیا ہے کہ اس کی چمک دمک کی عمر بہت قلیل اور ہمیشہ قلیل ہی رہتی ہے۔

یہ سائنسی تمدن اور شہرت کی مکر چاندنی ایک متاع قلیل اور اس تمدن میں منہمک رہنے والی اقوام کی زندگی بہت محدود اور چند روزہ ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا کہ چمکیلی تہذیب اپنے ہی تمدن سے ٹکرائے اور اپنے ہی متمدنوں کو اس اندرونی تصادم اور ٹکر سے ختم کر ڈالے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ۔

"تم کو ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے چند روز بہار ہے۔ پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور بری ہی آرام گاہ ہے"۔

دیکھنے میں عناصر اربعہ بھی نہایت نظر فریب ہیں۔ آگ نہایت چمکیلی با کروفر اور حرارت کے دور رس اثرات کی مالک ہے۔ پانی دیکھنے میں چاندنی کی طرح شفاف اور نمناکی کے پھیلنے والے اثرات کا حامل ہے۔ ہوا بظاہر لطافت کے سبب نہایت رقیق الجسم اور ہر جگہ بذات خود منتشر اور موجود ہے۔ کرہ زمین بحیثیت مجموعی نگاہوں میں نہایت باعظمت اور شکوہ اور تا حد نظر پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اپنے جبلی اخلاق و آثار کی بدولت یہ چاروں ہی عناصر محتاج پسماندہ اور بے حد ذلیل ثابت ہوئے اور ان کی یہ ظاہری چمک دمک ان کی جوہری پستی کو نہ مٹا سکی۔ جیسا کہ مفصل ثابت ہو چکا ہے۔

ٹھیک اسی طرح سمجھ لو کہ جس قوم یا سوسائٹی یا فرد پر ان مادی اخلاق کا غلبہ ہو اور وہ رات دن مادیات ہی کے جوڑ توڑ میں لگی رہے تو وہ قوم یا سوسائٹی گو بظاہر آگ کی سی چمک، پانی کا ساگورا رنگ، ہوا کی سی دور رسی اور پھیلاؤ اور زمین کی سی ٹھوس عظمت کی مالک نظر آ رہی ہو۔ مگر اپنے ان مادی اخلاق کے سبب جو اس میں مادی اشغال کی بدولت رہ چکے ہوں اپنے کو انجام کی ذلت و خواری سے کسی طرح نہیں بچا سکتی جو آخرت سے پہلے دنیا ہی میں اس کے سامنے آ کر رہے گی۔ کیونکہ جس مادہ کی قسمت میں بدء فطرت ہی سے کوئی عزت نہیں لکھی گئی، اس کی بنائی ہوئی قومی عمارتیں جتنی بھی زیادہ سر بفلک ہوں گی، اتنی ہی جلدی منہدم ہو جائیں گی۔

خاتمہ کلام اور خلاصہ نصیحت

پس اے عزیزان ملت! آج کی نام نہاد و متمدن اقوام کی ظاہری شوکت پر نہ جاؤ۔ ان کا ہلاکت آفرین انجام عنقریب ہی سامنے آنے والا ہے۔ ایسا نہ ہو کے خدا نہ کرے ان کی نقالی ور تقلید سے تم بھی اس انجام کی لپیٹ میں آجاؤ۔ ان اقوام کی طاقت آپ کے ضعف میں مضمر ہے نہ کہ ان کے کسی جوہر میں۔ روحانیوں نے میدان چھوڑ دیا تو مادیوں نے اسے آدبایا۔ ورنہ جب دور اسلاف میں روحانیوں کی کثرت اور روحانی قومیت قائم تھی تو دنیا جانتی ہے کہ انہوں نے مادی عظمتوں کو کسی طرح نیچا دکھایا اور مادی رفعتوں کی کیا گت بنائی ہے۔ اگر آج بھی آپ اپنی حقیقت پہچان کر حقیقت پسند بن کر جائیں تو وہ سابقہ عظمت لوٹ سکتی ہے ورنہ یہ صورتوں کی نمائشیں زیادہ دیرپا ثابت نہ ہو سکیں گی۔ بہرحال حدیث کی ایک حد تک شرح ہو چکی ہے اور سائنس اور اسلام کے موضوع کے عوارض یعنی دونوں کی حقیقت' دونوں کی غرض وغایت دونوں میں مقصود و وسیلہ کی تعیین' دونوں کے طبعی اخلاق وخواص' دونوں کا انجام اور پھر دونوں کا مقتضا میں نے اپنی بساط کے موافق اس حدیث سے استنباط کر کے آپ کے سامنے پیش کردیا اور جس عنوان کا بیان آپ حضرات نے مجھ پر عائد فرمایا تھا۔ الحمد اللہ کہ میں اس سے ایک حد تک عہدہ برآء ہو چکا ہوں۔ اس لئے دعائے توفیق واستقامت پر اس بیان کو ختم کرتا ہوں۔

والحمد للہ اولاً وآخراً

احقر محمد طیب غفرلہ ولوالدیہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۷ر اگست ۱۹۳۸ء مطابق ۸ر جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ (یوم یکشنبہ)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

مسلم پرسنل لاء

آج اگر سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو "اسلامی معاشرت" ہے، ہم اسے قائم کر کے رہیں گے..... سارے مل کر اگر عمل کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے، زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل درآمد ہو اس کے اوپر ___ اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دیدی جائے کہ اس قانون میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کر سکتے ہیں۔ ہماری جانیں جا سکتی ہیں۔ مگر اس قانون پر آنچ نہیں آ سکتی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ______ اَمَّا بَعْدُ ______

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا وَّھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ اِلَیْکُمُ الْکِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۔

حسن مقام

بزرگان محترم!

آپ کے اس عظیم الشان شہر میں جو اپنے حسن و خوبصورتی، فضا کی وسعت، آب و ہوا کے اعتدال اور مناظر کی خوبی کے لحاظ سے ہندوستان کے شہروں میں ایک ممتاز ترین شہر ہے۔ اس کی طرف قدرتی طور پر قلوب اور طبائع کی کشش ہوتی ہے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے ایک دفعہ کہا کہ اگر میں وزارت عظمیٰ سے ریٹائرڈ ہوا تو بنگلور میں جا کر قیام کروں گا، اس سے بہتر ہندوستان میں دوسرا شہر نہیں ہے۔ بہر حال یہ اپنی خوبیوں اور خصوصیات کے لحاظ سے ایک

ممتاز شہر ہے۔

مرکز جہاد و شہادت

سلطان ٹیپو کا یہ وطن ہے، انکے مجاہدانہ کارناموں کا یہ مرکز رہا ہے۔ ان کی شہادت اسی مقام پر ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک سلطان وقت کی شہادت تنہا ایک کی شہادت نہیں ہوتی، معلوم نہیں کتنے افراد کو انہوں نے جام شہادت پلایا ہو گا اور کتنے لوگ یہاں شہید ہوئے ہوں گے۔ ان ہی شہداء کی اولاد آپ ہیں یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کے جذبات آپ کے اندر نہ ہوں۔

وہ ولولہ، وہ جوش جہاد، وہ شہادت کا ذوق آبائی ہے جو آپ کے اندر موجود ہے خواہ آپ کو احساس نہ ہو "الولدسر لابیہ" باپ کے جو جذبات ہوتے ہیں وہ قدرتی طور پر اولاد میں منتقل ہوتے ہیں۔ تو اپنی معنویت کے لحاظ سے یہ زمین جوش اور جذبہ اور دینی ولولہ بھی رکھتی ہے۔

اکرام ضیف

اسی کے ساتھ ساتھ جو چیز ہم لوگوں کے سامنے آئی وہ آپ کے اخلاق کی وسعت ہے۔ ہم لوگ حاضر ہوئے۔ یہ واقعہ ہے کہ مہمانوں کی مدارات میں، ضیافت میں، اکرام اور توقیر میں یہاں کے لوگوں نے جذبہ دکھلایا ہے وہ ایک ممتاز قسم کا جذبہ ہے، جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ۔

"جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اس کو چاہئے کہ وہ مہمان کی عزت کرے"۔

اس تعلیم نبوت کے ماتحت آپ نے مدارات میں انتہاء کی خوش سلیقگی کے ساتھ، نظم کی خوبی کے ساتھ مہمانوں کا قیام، ان کی آمد، ان کی توقیر، یہ ایک ممتاز صورت رہی ہے۔

یہاں اس سے بھی بڑھ کر عالی ظرفی کی بات یہ ہے کہ آنے والوں کا آپ شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں اور محض ظاہر داری کے طور پر نہیں بلکہ دلوں کے جذبہ سے حضرت مولانا ابوا لسعود صاحب جو صدر استقبالیہ ہیں، انہوں نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں آپ کی طرف سے، اپنی طرف سے بھرپور الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ تو حیرت یہ ہے کہ مالی قربانیاں آپ نے دیں، جانی محنت آپ نے کی، مہمانوں کو راحت پہنچانے میں انتہاء آپ نے کی۔ اوپر سے شکریہ بھی ادا کر رہے ہیں یہ عالی ظرف اور قدر شناسی کی انتہاء ہے کہ آدمی کچھ کرے اور پھر یہ کہے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔

ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ بادل وہ ہے جو برسے اور گرمادے یعنی برس کر گرماتا ہے کہ وہ پھر آمادہ ہے برسنے پر اس کا جذبہ یہی ہے کہ میں مخلوق کو پانی دوں اور حیات بہم پہنچاؤں، دوسرا مصرعہ ہے کہ سخی وہ ہے جو دیوے اور شرماوے تو سب کچھ دے رہے ہیں اور شرما بھی رہے ہیں۔ ندامت کا بھی اظہار کر رہے ہیں۔ یہ کام تو ہمارا تھا کہ ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے۔ لیکن ہمارا فریضہ بھی آپ ہی نے ادا کر دیا اب ہم سوچتے ہیں کہ ہم کیا چیز ادا کریں اور ادا کریں بھی تو واقعہ یہ ہے کہ جتنے جامع طریق پر آپ نے مہمانداری فرمائی، جلسہ کو کامیاب بنایا ہمارے پاس الفاظ جامع نہیں ہیں کہ جو حاوی ہو جاویں آپ کے شکریہ کے اوپر۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا طریق شکر

لیکن شکریہ کا ایسا طریقہ کیا ہو کہ جب انعام اور نعمت تو ہو بے انتہاء اور شکریہ کے الفاظ ہوں محدود۔ ایسے موقع کے لئے خود شریعت نے ہمیں بتلادیا کہ لامحدود شکریہ کس طرح ادا کردیں۔

ایک طریقہ تو حضرت داؤد علیہ اسلام نے بتلایا۔ حق تعالیٰ نے جب ارشاد فرمایا :

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا

"اے داؤد! میری نعمتوں کا شکرادا کرو"۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کلام کو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ حقائق الٰہیہ کی جو سمجھ اور فہم انبیاء علیہم السلام کو دیجاتی ہے۔وہ کسی کو نہیں دی جاتی بلکہ جتنی باتیں آتی ہیں وہ سب ان ہی کی جوتیوں کے صدقے سے آتی ہیں اور ان ہی کی برکت سے آتی ہیں۔ تو داؤد علیہم السلام کو حکم دیا گیا کہ میرا شکرادا کرو۔ انہوں نے عرض کیا "یا اللہ! کس طرح ادا کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا اس لئے کہ جب شکرادا کرنے بیٹھوں گا تو اس شکرادا کرنے کی توفیق بھی تو آپ ہی دیں گے۔ جب ہی تو شکرادا کرسکوں گا۔ اس کی طاقت بھی تو آپ ہی دیں گے تو یہ توفیق دینا' طاقت دینا خود ایک مستقل نعمت ہوگئی' پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں اور اس کا جب شکرادا کروں گا تو اس کی توفیق بھی آپ ہی دیں گے تو پھر ایک نعمت پہلے نکل آئی' پھر میں اس کا شکریہ ادا کروں۔ تو ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے۔ تو میں عاجز ہوں کہ شروع کس طرح سے کروں شکریہ کو اور ادا کس طرح سے کروں' ہر شکر سے پہلے ایک شکر اور ہر شکر سے پہلے ایک شکر۔ تو میں عاجز ہوں شکرادا کرنے سے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا :

اے داؤد جب تم نے عجز کا اعتراف کرلیا اور تم شکرادا کرنے سے عاجز ہو تو یہی ہمارے شکر کی ادائیگی ہے کون ہے جو شکر کا حق ادا کرسکے۔

نعمتیں لامحدود اور شکر ہمارا محدود' طاقتیں ہماری محدود' ممکن نہیں کہ اللہ کا شکر کماحقہ ادا کرسکیں۔ اس لئے صورت یہی ہے کہ اپنے عجز کا اظہار کرے اور اپنے قصور کا اعتراف کرلے کہ بھئی ہم شکر کو ادا نہیں کر سکتے تو یہی ادائیگی شکر ہے۔ یہ تو طریقہ داؤدی ہے جو انہوں نے ارشاد فرمایا۔ کہ جب شکر بہت سالازم ہو جائے اور ادا کرنے سے عاجز ہوجائے تو اعتراف کرلو عجز کا کہ بھائی! عاجز ہیں۔ نہیں ادا کرسکتے شکر کو' یہی شکر کا قائم مقام ہوجائے گا۔

طریق شکر نبوی (علیہ الصلوٰۃ والسلام)

ایک طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر نعمتیں لامحدود ہوں تو تم بھی لامحدود شکریہ ادا کرو۔ مگر بندہ ہے محدود' وہ لامحدود شکریہ ادا نہیں کرسکتا۔ تو الفاظ ایسے ارشاد فرمادیئے کہ وہ لفظ اس شکر کو لامحدود بنادیں۔ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور شکرادا کیا کہ :

اللھم لک الحمد حمدا دائما مع دوامک ۔

"اے اللہ! تیرے لئے حمد ہے اور دائمی ہے جب تک کہ تو دائم ہے"

اور تیرے دوام کی کوئی حد نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی حد نہیں۔

اور فرمایا کہ :

ولک الحمد حمداً خالداً مع خلودک۔ (الحدیث)

"اور تیرے لئے حمد ہے جب تک کہ تو رہنے والا ہے اور تو ہمیشہ رہنے والا ہے"۔

تو میری حمد بھی ہمیشہ رہے گی تیرے ساتھ۔ اور فرمایا کہ :

ولک الحمد حمدا لامنتهی له دون مشیتک۔

"اور تیرے لئے حمد ہے ایسی حمد جو تیری مشیت کے ساتھ ساتھ چلے"۔

اور تیری مشیت کی کوئی انتہاء نہیں تو میری حمد کی بھی کوئی انتہاء نہیں۔ تو آدمی جب پوری حمد اور پورا شکر ادا نہ کر سکے تو اعتراف عجز کے بعد یہ بھی کہدے کہ یہ حمد دوامی ہے تو اللہ ان لفظوں کو دوامی بنا دیتے ہیں اور وہ شکر بھی دوامی بن جاتا ہے۔

اظہار تشکر

اس لئے کہ اگر ہم آپ لوگوں کا اس مہمانداری پر شکریہ ادا کریں، اس لیاقت پر اور اس جلسہ کو کامیاب بنانے پر، تو ایک تو یہ عرض کریں گے کہ ہم عاجز ہیں آپ کا شکر ادا کرنے سے ___ یہ تو ہے داؤدی، اور ایک یہ عرض کریں گے کہ جب تک آپ باقی ہیں، آپ کی نسلیں باقی ہیں ہمارا شکریہ آپ کے ساتھ ہے، تو یہ دوامی شکر ہو گیا۔ اپنی طرف سے عجز کا اظہار بھی ہے اور دوامی شکریہ بھی ہے۔ پھر انشاء اللہ دوامی طور پر ساتھ بھی رہے گا۔

پرسنل لاء کا مفہوم

بہر حال اس عظیم الشان شہر میں جس کے اندر ظاہری اور باطنی خصوصیات ہیں جس کے باشندوں کے اندر اخلاقی بلندیاں ہیں اس عظیم الشان پنڈال میں یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جا رہا ہے جس کا موضوع ہے مسلم پرسنل لاء، یہ جلسہ ہے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء کا، میں ابھی اپنے بزرگوں سے پوچھ رہا تھا کہ پرسنل کے حقیقی معنی کیا ہیں؟ اس لئے کہ لفظ انگریزی کا ہے، ہم تو پوری طرح انگریزی جانتے نہیں۔

تو میں نے تحقیق کی کہ پرسنل کے معنی کیا ہیں تو یہ سمجھ رہے تھے کہ مخصوص قانون جو کسی قوم کے ساتھ مخصوص ہو اسے پرسنل لاء کہتے ہیں۔ مگر کہا گیا کہ پرسنل کے معنی ذاتی کے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کا ذاتی قانون، مسلمانوں کا شخصی قانون۔ ان کے احوال شخصیہ کے بارے میں مذہبی ہدایات پر مبنی قانون اس میں ذاتی قانون آجاتا ہے، ذاتی افعال واحوال کے متعلق بھی باتیں آجاتی ہیں۔ خاندانی اور عائلی واقعات بھی آجاتے ہیں۔ نکاح ہو، طلاق ہو، ہبہ ہو، میراث ہو، یہ سب چیزیں اس میں آجاتی ہیں تو مسلم پرسنل لاء کے معنی یہ نکلے کہ مسلمانوں کے شخصی قوانین، ذاتی قوانین، خاندانی اور عائلی قوانین یہ ہیں جن کا تحفظ آپ کو مقصود ہے۔ یہ مسلمانوں کا قانون کہا جاتا ہے۔

دنیائے انسانیت کا قانون

لیکن میں عرض کروں گا کہ مسلمانوں کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون ہی نہیں۔ قانون درحقیقت اسلام

کا ہے مسلم قوم کا کوئی قانون ہی نہیں جو مان لے۔ اس کا نام مسلم ہے۔ جو نہ مانے اس کا نام غیر مسلم ہے۔ لیکن قانون خود مسلمانوں کا شخصی نہیں۔ نہ انہوں نے کوئی قانون وضع کیا ہے نہ کے ساتھ مخصوص ہے ـــــ قانون اسلام کا ہے اور اسلام کا قانون پوری دنیائے انسانیت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کسی مخصوص قوم کیلئے نہیں بھیجا گیا۔ یہ آپ کا قانون نہیں بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کا قانون ہے ـــــ ان لفظوں سے کہ ''مسلمانوں کا قانون'' ایک تعصب اور ایک حد بندی ٹپکتی ہے۔ تو غیر مسلم کہے گا کہ مجھے اس سے کیا تعلق یہ تو مسلمانوں کا قانون ہے۔ اس سے تعصب چلے گا' وہ غور کرنے کی طرف بھی توجہ نہیں کرے گا۔ چونکہ مسلمانوں کا قانون ہے میرا قانون نہیں۔ مجھے اس پر غور و فکر کی کیا ضرورت ہے ـــــ لیکن جب ہم یہ کہیں گے کہ مسلم قوم کا بحیثیت قوم کے کوئی قانون نہیں وہ تو خدا کا قانون ہے جیسے ہمارے لئے آیا ہے تمہارے لئے بھی آیا ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

كان النبي يبعث الى قومه خاصةً وبعثت الى الناس كافةً

ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ کسی پیغمبر کا دائرہ عمل خاندان ہوتا تھا جیسے بنی اسرئیل کے انبیاء کہ وہ بنی اسرئیل کے خاندان کے لئے آتے تھے۔ غیر اسرئیلی سے انہیں تعلق نہیں تھا۔

حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :

''میں تو اسرئیلی بھیڑوں کو جمع کرنے کے لئے آیا ہوں باقی دنیا سے مجھے کوئی تعلق نہیں نہ اور قوموں سے میری غرض ہے۔ میں تو اسرائیلیوں کے اصلاح کے لئے آیا ہوں''۔

تو بعض انبیاء تو خاندان کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے اور بعض انبیاء وطنوں کی اصلاح کے لئے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کہ چار شہروں کی اصلاح ان کے سپرد فرمائی تھی۔ تو **كان النبي يبعث الى قومه خاصةً**

ہر پیغمبر اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجا گیا ـــــ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

وبعثت الى الناس كافةً

''میں دنیا کی تمام اقوام کے لئے بھیجا گیا ہوں' سارے انسانوں کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہوں''۔

اسی واسطے قرآن مجید میں جگہ جگہ جہاں عبادت عامہ کی ہدایت فرمائی یا ایمان لانے کی ہدایت فرمائی تو اس جگہ انسانوں کا لفظ استعمال فرمایا :

''يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ''۔

''اے دنیا کے انسانو! اپنے رب کی عبادت کرو''۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔

''اے دنیا کے انسانو! جو آج موجود ہیں یا آئندہ جو تمہاری نسلیں آئیں گی ان سب کے لئے میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔

تو آپ کسی خاص قوم کی طرف مبعوث نہیں ہوئے کسی خاص وطن کی طرف مبعوث نہیں ہوئے بلکہ دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آئے ہیں۔

مبنائے تعصب

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی قوموں میں جو تعصبات ہیں اس کا مبنیٰ یہی ہے کہ ان کا دین و مذہب ہی اس قوم کے لئے مخصوص ہو کر آیا ہے تو وہی خاندان اپنے دین کو لئے بیٹھا رہا ہے۔ دوسرے خاندان والوں نے کہا کہ ہمیں اس سے کیا تعلق، ان کے وطن کا ایک قانون ہے۔ یہ اس پر عمل کریں، لیکن جب یہ اعلان کیا گیا کہ میں کسی خاص وطن یا خاص قوم کی طرف نہیں آیا میں تو دنیا کے سارے انسانوں کے لئے آیا ہوں تو اب دنیا کے قوموں کو دعوت مل گئی فکر کی کہ جب ہمارے لئے بھی یہی قانون ہے تو ہم بھی اس میں فکر کریں اور اطاعت کریں۔ اب کوئی مانے یا نہ مانے یہ اس کی محرومی ہوگی۔ پیغام اللہ کی طرف سے عام ہے دنیا کی تمام اقوام کو خواہ کوئی کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔

قانون فطرت

بہرحال میں عرض کر رہا ہوں کہ مسلم پرسنل لاء کا اگر یہ مطلب ہے کہ شخصی قوانین تو مسلمان کا من حیث القوم نہ کوئی شخصی قانون ہے اور نہ کوئی ذاتی قانون ہے۔ وہ خدا کا قانون ہے۔ ہم اس قانون کو دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کریں گے۔ مسلم پرسنل لاء کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ ہم اپنے قانون کو بچالے جائیں نہیں ہم اس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ دنیا کی قوموں کو بھی دعوت دیں گے کہ تم بھی اس پر عمل کرو خواہ وہ شخصی چیز ہو خواہ خاندانی چیز ہو، اس لئے کہ وہ قوانین فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسان کے طبعی جذبات کے مطابق ہیں۔ وہ زبردستی کے قوانین نہیں کہ عقل نہ مانتی ہو اور دل نہ مانتا ہو اور زبردستی اس کے اوپر ڈالا جائے۔ یہ بات نہیں بلکہ آدمی جب غور کرے گا فطرت کے مطابق پائے گا۔ اس لئے ایک انسان کی زندگی اسی میں ہے۔ اس ماننے والے انسان کا نام ہے مسلمان اور مسلمان کی زندگی مہد سے لے کے لحد تک اور پیدائش سے لے کر موت تک اور اس کے درمیان میں جتنے اس کے افعال اور احوال ہیں سب پر اسلام کا قانون لاگو ہے اور جتنی ہدایت ہیں وہ سب خدا کی طرف سے ہیں۔ وہ کوئی موضوع قانون نہیں کہ ہم نے بنالیا ہو۔

ذات انسان پر نفاذ قانون

افعال کو چھوڑ کر انسان کی ذات پر اس وقت سے اسلامی قانون لاگو ہو جاتا ہے کہ اسے عقل بھی نہیں، شعور بھی نہیں، تمیز بھی نہیں۔ آج پیدا ہونے والا بچہ جو بالکل ہی مضغہ گوشت ہے نہ اسے عقل ہے نہ تمیز، مگر اسلام کا قانون اس پر لاگو ہوا کہ پیدا ہوتے ہی نہلا دھلا کر اس کے داہنے کان میں اذان دو اور بائیں کان میں تکبیر کہو۔ سب سے پہلے اللہ کا نام اس کے کان میں پہنچاؤ اور کہو کہ اللہ اکبر، اللہ ہی بڑا ہے اور کسی میں بڑائی نہیں ہے اس کے دل میں بٹھا دیا جاتا ہے کہ عظمت خداوندی یہ تیرا جوہر ہے۔

اشهد ان لا اله الا الله۔

”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں“۔

اشهد ان محمدا رسول الله۔

”محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں“۔

جب آدمی ان بنیادی عقیدوں پر آگیا اور یہ بات ایک بچے کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب آگے عمل ہے۔ فرمایا گیا کہ حی علی الصلوٰۃ سب سے بڑا عمل یہ ہے کہ عبادت خداوندی ادا کرو۔ جب یہ بھی اس سے

دل میں جمادیا آپ نے، آگے عام زندگی کے بارے میں ہے "حی علی الفلاح" عام فلاح و بہبود کی طرف آؤ۔

ذاتِ انسان پر نفاذِ قانون کی حکمت

اب رہا یہ کہ وہ بچہ سمجھتا ہے یا نہیں۔ آپ کو فائدہ کیا ہے کہ دائیں کان میں اذان کہیں اور بائیں کان میں تکبیر یہ ایسا ہے جیسے آپ نے کسی دیوار کے سامنے وعظ کہہ دیا، وہ دیوار کیا سمجھے گی لیکن یہ چیز غلط ہے، بیشک اس بچے کو عقل نہیں شعور نہیں، لیکن اس بچہ کا قلب ایک سفید تختی کی مانند ہے جو اس پر چھاپو گے وہی چھپ جائے گا اور جب ہوش سنبھالے گا تو وہی کلمات کہتا ہوا ابھرے گا۔ جو آپ نے اس کے دل پر چھاپ دیئے ہیں۔ تو اگرچہ عقل و شعور نہیں مگر استعداد قبولیت کی ہے جو کلمہ اس کے کان میں ڈالیں گے وہ چھپ جائے گا اس کے دل کی سفید تختی پر۔ جیسے یہ ریکارڈنگ مشین ہے، ہم جو تقریر کر رہے ہیں وہ اس میں چھپتی جارہی ہے، اسے نہ عقل ہے نہ شعور ہے۔ ایک جامد محض چیز ہے لیکن ساری تقریر اسمیں جم جائے گی۔ جب آپ اس کی کل اینٹھیں گے وہ ساری اگل دے گی جو اس کے اندر بھری ہوئی ہے۔

تو کیا ایک انسان کے بچے کا دل اس مشین سے بھی گیا گزرا ہے۔ انسان نے اپنی عقل سے اس کی تخلیق کی ہے تو وہ عقل خود کتنی بڑی ہوگی اور اس بچے میں عقل تو ہے مگر نشوونما پائی ہوئی نہیں ہے لیکن جوہر موجود ہے جو آپ اس کے کان میں ڈال دیں گے وہ اس کے دل میں چھپ جائے گا۔

دورِ تربیت

اس سے امام غزالیؒ نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ بچے کی تربیت کا زمانہ یہ نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں کہ پانچ برس کا ہو تو مکتب میں بٹھا دو اب تربیت شروع ہوتی ہے۔ نہیں، فرماتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی تربیت شروع ہو جاتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ مخاطب نہیں بن سکتا ہے۔ مگر ماں باپ کا کام ہے کہ ڈالیں اس کے اندر ایسی چیزیں کہ جو حقی اور سچی ہوں۔

تو امام لکھتے ہیں کہ دودھ پیتے بچے کے سامنے کوئی برا کلمہ نہ کہیں جو کلمہ کہیں گے وہی اس کے قلب میں چھپ جائے گا، وہی نشوونما پا کر ابھرے گا اس لئے جو بات بھی اس کے سامنے کریں وہ حقی اور سچی کریں، عمدہ کریں تاکہ اس کے دل میں وہی باتیں چھپ جائیں اسی طرح سے اس کی آنکھیں ایک آئینے کے مانند ہیں اس کے دل میں گو شعور و احساس نہیں لیکن آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں۔ تو امام لکھتے ہیں کہ ماں باپ بچے کے آگے کوئی بے حیائی کی حرکت نہ کریں۔ اگر بے حیائی کے کام کرتے ہیں تو وہی اس کی آنکھ کے راستے سے جا کر اس کے دل میں چھپ جائیں گے اور جب وہ ہوش پائے گا تو وہی بے حیائی اور بے غیرتی کی باتیں کرتا ہوا ابھرے گا۔ تو کان میں اچھی بات ڈالو اور آنکھ کے سامنے اچھے نقش پیش کرو۔ خیالات اس کے دل میں اچھے جماؤ تاکہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ اچھا بنے، اقوال بھی اس کے اچھے ہوں، افعال بھی اس کے اچھے ہوں تو تربیت کا زمانہ یہ نہیں کہ پانچ چھ برس کے بعد آتا ہے بلکہ پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

نہایت مختصر زندگی کا نہایت جامع قانون

فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں مخاطب ہیں ماں باپ کیونکہ اس کے بچے کے اندر مخاطب بننے کی صلاحت

نہیں ہے۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ اسلامی قانون ایک انسان کے صرف افعال پر لاگو نہیں ہوتا' بلکہ ذات پر بھی لاگو ہے۔ اس لئے کہ یہ بچہ افعال ادا کرنے کے تو قابل نہیں مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔

اسلام کا قانون اس کی ذات پر آگیا تو وہ قانون زندگی سے شروع ہو جاتا ہے۔ آپ نے اذان کہہ دی' تکبیر کہہ دی' اب نماز باقی رہ گئی ___ علماء لکھتے ہیں کہ نماز جنازہ وہ نماز ہے اس اذان اور تکبیر کی' آج تو آپ نے تکبیر اور اذان کہی اور جاتے ہوئے اسے آپ نے نماز پڑھ کر رخصت کیا۔ تو ایک مسلمان کی زندگی اذان اور نماز کے درمیان میں ہے۔ گویا ابتداء میں بھی اسے اللہ کے نام نے گھیر رکھا ہے اور انتہاء بھی خدا کی عبادت پر جاکر ہوئی تو ابتداء کرو اس کی اذان اور تکبیر سے اور انتہاء کرو اس کی نماز کے اوپر تو ساری زندگی اس کی دو چیزوں کے درمیان آجائے گی عظمت خداوندی' توحید خداوندی توحید الٰہی' اقرار رسالت اور نماز کا جذبہ اور ختم ہو گا وہ نماز کے اوپر تو ظاہر بات ہے کہ جنازہ کی نماز تو آپ ہی پڑھیں گے میت کو خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے وہ تو بیچارہ کفن پہنے لیٹا ہوا ہے مگر ذات تو اس کی موجود ہے۔ نفس تو موجود ہے ___ تو اسلام کا قانون اس کی ذات پر لاگو ہوا۔ افعال تو بعد کی چیزیں ہیں۔ تو جو قانون ذات پر لاگو ہو وہ افعال پر کیوں لاگو نہ ہو گا۔ وہ اقوال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا۔ وہ اعمال کی اصلاح کیوں نہ کرے گا تو انسان کی ذات اور افعال سب گھرے ہوئے ہیں اسلامی قانون کے تحت۔

تعلیم فطرت

ظاہر بات ہے کہ یہ قانون اگر غیر مسلم بلکہ سارے انسان تسلیم کریں تو کیا یہ کوئی برائی کی چیز ہے کہ ابتداء ہی میں خالق کی عظمت دل میں بیٹھ جائے یہ تو ہر قوم کے غور کرنے کی چیز ہے کہ کتنی پاکیزہ تعلیم ہے کہ پیدا ہوتے ہی توحید الٰہی اور رسالت کی شہادت اسکے دل میں ڈال دو۔ **حی علی الصلوٰۃ** کہہ کر اسے عبادت خداوندی پر آمادہ کرو۔ معاذ اللہ یہ کوئی بری چیز ہے؟

غور کیا جائے تو یہ فطرت کے مطابق تعلیم ہے اور یہ تعلیم قوم مسلم کے ساتھ مخصوص نہیں یہ ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ہے۔ کوئی غور نہ کرے یہ اس کی محرومی کی بات ہے لیکن اسلام نے تو غور کا دروازہ کھول دیا ہے۔ مگر جب آپ یوں کہیں گے کہ یہ ہمارا قانون ہے اور وہ ہمارا قانون ہے' میری قوم کا قانون الگ ہے۔ اور جب آپ یہ کہیں گے کہ نہ ہمارا قانون نہ تمہارا قانون۔ یہ تو خدا کا قانون ہے۔ جس کے مکلف ہم سب قرار دیئے گئے ہیں۔ اب موقعہ آئے گا ان کے غور و فکر کا کہ جب ہمیں بھی یہ پیغام دیا گیا ہے تو ہم بھی اس پر غور کریں۔

اسلامی پرسنل لاء

اس لئے میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ماننے کے لحاظ سے یہ مسلم پرسنل لاء ہے اور حقیقت کے لحاظ سے یہ اسلامی پرسنل لاء ہے۔ یہ اسلامی لاء ہے۔ یہ خدا کا قانون ہے جو سب کے لئے عام ہے۔ بچپن سے لے کر موت تک اور موت سے لے کر قبر تک اور قبر سے لے کر میدان حشر تک اور میدان حشر سے لے کر جنت تک اور جنتوں میں داخل ہونے کے بعد ابد الآباد تک یہی قانون چلتا رہے گا اور اسی میں ترقی ہوتی رہے گی' حشر میں اور ہو گی' جنتوں میں جاکے کچھ اور ہو گی۔ مگر بنیادی طور پر یہی قانون رہے گا اور انسان کی ترقی اسی سے

ہوتی رہے گی۔

پرسنل لاء کا تحفظ

بہرحال مسلم پرسنل لاء کا اصل مقصد یہ ہے کہ عائلی قوانین جوان کی ذات پر لاگو ہیں ان کا تحفظ ہو' حقیقت یہ ہے کہ ہماری کسی سے بھی لڑائی نہیں ہے اور نہ ہم کسی قوم سے لڑتے ہیں۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ اس قانون کو تم بھی اختیار کرو اور اگر نہیں اختیار کرتے تو کم سے کم ہم کو تو عمل کرنے دو' تم اس میں کیوں رکاوٹیں ڈالتے ہو؟

ان رکاوٹوں کا دور کرنا یہ ہمارا سب سے بڑا مقصد ہے کہ ہمیں عمل کرنے دو۔ اگر تم محروم رہنا چاہتے ہو اور نہیں عمل کرتے تو عمل کرنے والوں پر پابندیاں کیوں عائد کرتے ہو۔؟ کیوں اس میں رکاوٹ ڈالتے ہو تو مقصد اصلی ان قوانین کا تحفظ ہے۔

اب اگر اس تحفظ کے سلسلے میں آپ لفظوں سے دباؤ ڈال سکیں تو لفظوں سے دباؤ ڈالیں' کوئی اور تجویز ہو اثرات ڈالنے کی آپ اسے اختیار کریں' مگر مقصود اصلی حفاظت ہے اس قانون خداوندی کی تو اس کو ہم محسوس کریں اور اس کا احساس ہمیں ہونا چاہئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفاظت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قانون کوئی بت یا تصویر ہے' وہ رکھا ہوا اور آپ شور مچائیں کہ صاحب! وہ ہے قانون پرسنل لاء کا' اس کی حفاظت آپ کریں۔

طریق تحفظ

قانون کی حفاظت یہ ہے کہ آپ اس کو استعمال کرنا شروع کردو پس وہ محفوظ ہو جائے گا اور تم بھی محفوظ ہو جاؤ گے۔ لیکن شور مچاؤ کہ وہ رکھا ہوا ہے قانون تو قانون کوئی بت ہے جس کی حفاظت کررہے ہیں یا کوئی وہ تصویر ہے؟ سب سے بڑی حفاظت یہ ہے کہ آپ اسے اپنے اندر رچالیں' اس پر عمل درآمد شروع کردیں تو قانون مجسم بن جائیں گے۔

ذرائع حفاظت کی سعادت

پرسنل لاء کوئی مٹنے والی چیز نہیں ہے' کوئی کتنا ہی مٹائے وہ خود مٹ سکتا ہے اس لئے کہ پرسنل لاء کے قانون کی جڑیں قرآن اور حدیث ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود اسلام ہے اور اسلام دوامی زندگی لے کر آیا ہے مٹنے کے لئے نہیں آیا ہے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود حق تعالیٰ نے لی ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

"ہم نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"۔

تو حفاظت ہوگی اللہ کی' اسمیں کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ ہمارے لئے سعادت یہ ہے کہ ہم ذریعہ اور سبب بن جائیں اس کی حفاظت کا۔ حافظ حقیقی تو حق تعالیٰ ہیں لیکن اگر ہم وسیلہ بن گئے تو ہمیں سعادت حاصل ہو جائے گی ورنہ اگر ہم عمل نہ کریں اور نہ حفاظت کریں پھر بھی مٹنے والا نہیں ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا اَمْثَالَكُمْ۔

"تم اگر سب مل کر اس دین کی حفاظت سے پھر گئے تو تمہیں نکال دیا جائے گا اس دین سے اور دوسری قومیں لا کھڑی کر دی جائیں گی"۔

وہ اس دین کی حفاظت کریں گی اس لئے سعادت تو ہماری ہے اگر ہم سب اور ذریعہ بنیں اس کی حفاظت کا۔ ہم خود حافظ نہیں کہ اس کی حفاظت کریں۔ حفاظت کرنے والا حفاظت کر رہا ہے۔

اس قانون کے خلاف کتنے کتنے مصائب، کتنے بڑے بڑے دشمن کھڑے ہوئے لیکن آج ان دشمنوں کا نام ونشان نہیں اور قانون خداوندی پھر اسی شان سے موجود، قرآن بھی محفوظ، حدیث بھی محفوظ، فقہ بھی محفوظ، ساری چیزیں اپنی جگہ ہیں انکار کرنے والے گزر گئے، آج کوئی نقش پا بھی ان کا پتہ بتلانے والا نہیں، یہ قانون تو اپنی جگہ رہے گا حفاظت خداوندی سے، ہم اگر ذریعہ بن جاویں اسکی حفاظت کا ہمیں سعادت حاصل ہو جاوے گی۔ انگلی کٹا کر شہیدوں میں داخل ہو جاویں گے ورنہ یہ تو محفوظ رہنے والی چیز ہے۔

ہم جو شور مچا رہے ہیں وہ درحقیقت اپنی حفاظت کے لئے، پرسنل لاء کی حفاظت کے لئے نہیں وہ محفوظ ہے۔ ہم جتنا اس کا دامن پکڑلیں گے اتنا ہی محفوظ ہو جائیں گے کیونکہ محفوظ کا دامن پکڑ کر آدمی خود محفوظ ہو جاتا ہے۔ آپ سے پرسنل لاء کی حفاظت نہ ہوگی، بلکہ پرسنل لاء سے آپ کی حفاظت ہوگی۔ تو ہم اپنی حفاظت کے لئے اسے دانتوں سے مضبوط پکڑیں اور ہم نہیں چاہتے کہ اسمیں کوئی خلل انداز ہو۔ ابھی تو ہم مدمقابل سے لڑنے کو تیار ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر کوئی خلل ڈالے۔ حکم خداوندی یہی ہے۔

تو واضح ہو گیا کہ پرسنل لاء کا قانون اسلامی قانون ہے کسی مخصوص قوم کا قانون نہیں، ماننے والے کا نام مسلم ہے تو وہ مسلم قانون کہلائے گا نہ ماننے والے کا نام غیر مسلم ہے۔ تو غیر مسلم کا قانون نہیں رہا ورنہ وہ حقیقت میں انسانی قانون ہے، انسان کی برتری اور اس کی حفاظت اور ان کی خوبی اور دنیا و آخرت کے بھلائی کے لئے یہ قانون بھیجا گیا ہے۔

دین اور رسمی قوانین کا فرق

اس قانون کا حاصل فقط یہی نہیں کہ آپ چند رسمیں ادا کرلیں بلکہ قانون کی حفاظت اور تحفظ کا حاصل یہ ہے کہ اس پر عملدرآمد کرکے آپ ظاہری افعال بھی ادا کریں مگر ہر فعل میں قربت اور تعلق پیش نظر رہے۔ یہی فرق ہے دین میں اور رسمی قانون میں۔

رسمی قوانین جو سلطنتیں طے کرتی ہیں وہ صرف افعال پر لاگو ہوتے ہیں لیکن خدائی قانون دلوں کے اوپر لاگو ہوتا ہے۔ اگر کسی کو چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا تو قانوناً اس کو سزا دیں گے۔ لیکن اس کے دل میں سے کوئی چوری کا جذبہ نکال دے۔ یہ کوئی دنیاوی قانون نہیں کرسکتا۔ جیل خانے میں جاکر بھی چور کا جذبہ یہی رہے گا کہ اب اگر چھ مہینے کے بعد چھوٹ جاؤں گا تو پھر اس سے بڑی چوری کروں گا۔ پھر چھ ماہ جیل میں رہوں گا۔ مگر اس کے بعد میں ایک اور زبردست ڈاکہ ڈالوں گا۔

تو بھائیو! دنیا کا قانون تو جذبات پر بھی لاگو نہیں ہوتا۔ ذات پر تو کیا ہو وہ تو اور بھی اوپر کی چیز ہے۔ صرف افعال پر لاگو ہوتا ہے۔ منظر عام پر وہ قانون چلتا ہے لیکن دینی قانون اور انبیاء کا قانون وہ ہے کہ وہ فقط چوری ہی سے نہیں روکتا بلکہ چوری کی نفرت بھی دل کے اندر بٹھا دیتا ہے۔ وہ ڈاکہ زنی ہی سے نہیں روکتا بلکہ ڈاکہ کی غلاظت اس کے سامنے ایسی آتی ہے جیسے پاخانہ کی غلاظت۔

تو جرائم کی نفرت بٹھا دینا، جرائم سے بیزار بنا دینا یہ قانون خداوندی کا کام ہے۔

مسلم پرسنل لاء کا منشاء

مسلمانوں کا شخصی قانون ہو یا عائلی قانون ہو اس کا منشاء فی الحقیقت یہی ہے کہ ظاہر میں یہ عمل کرو اور باطن میں خدا کی طرف رجوع کرو۔ اس لئے کہ قانون دونوں چیزوں پر لاگو ہوتا ہے۔ تمہارے دلوں پر بھی، تمہاری زبانوں پر بھی، تمہارے ہاتھوں اور پیروں پر بھی۔ نہ فقط دل کی اصلاح نہ فقط ہاتھ پیر کی اصلاح، نہ فقط زبان کی اصلاح بلکہ انسان کے مجموعے کی اصلاح پیش نظر ہے کہ اس کا ہاتھ پیر بھی درست ہو، اس کا قلب بھی درست ہو۔ ظاہر و باطن سے وہ اس پر عمل درآمد کرے، تو یہ شور مچانا محض اس لئے نہیں کہ چند رسمیں ہیں جنہیں ہم پورا کرنا چاہتے ہیں یا چند رسمی باتیں ہیں جن کی حفاظت کرنا ہمارا مقصود ہے۔ نہیں بلکہ یہ اللہ کا دین ہے جس کے پیش نظر انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ ہم اس کی حفاظت کرکے اپنی حفاظت کرنا چاہتے ہیں اور دنیا کی قوموں کو بتلانا چاہتے ہیں کہ تم بھی اس قانون کو اپناؤ۔ موازنہ اور مقابلہ کرکے دیکھ لو، ذاتی زندگی ہو یا افعال کی زندگی ہو کہ یہ زندگی بہتر ہے یا وہ بہتر ہے جو تم تجویز کر رہے ہو۔ یہ بھی ہمارے مقاصد میں داخل ہے۔

مسلم پرسنل لاء کے لئے سربراہان مذاہب کا اتحاد

تو پرسنل لاء کے خلاف ایک شور اٹھا، اس سے لوگ پریشان ہوئے اور آل انڈیا مسلم بورڈ قائم کر دیا۔ میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ شور مضر نہیں ثابت ہوا گو وہ فی نفسہ کوئی اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا۔ جنہوں نے پرسنل لاء کی مخالفت کی واقعی انہوں نے سخت غلطی کی۔ گویا ایک شر اٹھا۔ مگر اس شر میں سے ہمارے لئے خیر نکل آئی۔

پہلی خیر تو یہ نکلی کہ سارے مسلمان متحد ہو گئے کہ ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے آج آپ کے سامنے یہ سربراہان مذاہب بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہر فرقے اور ہر طبقے کے علماء موجود ہیں ہر تنظیم کے سربراہ موجود ہیں۔ سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں اس شر میں سے ہی تو یہ خیر نکلی ہے اگر پرسنل لاء کے مخالف نہ کھڑے ہوتے تو ان کے دل میں یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہوتا کہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں تو اتحاد جیسی نعمت اس شر نے ہمیں بخشی، تو یہ شر ہمارے لئے مضر ثابت نہیں ہوا۔ ہم تو انہیں محسن سمجھتے ہیں جو ایک درجے میں پرسنل لاء کی مخالفت کر رہے ہیں کہ ان کی مخالفت نے ہم میں جذبۂ اتحاد پیدا ہو گیا۔

خدا شرے بر انگیزد
کہ خیرے دراں باشد

بعض دفعہ شر اٹھتا ہے مگر اس شر میں سے خیر نکل آتی ہے۔ ہمارے لئے بھی اس میں سے خیر نکل آئی کہ ہم کو نعمت اتحاد ملی۔

یہ بات نہیں کہ رسمی طور پر ہم اتحاد کو اچھی بات سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ ایک نعمت خداوندی ہے۔ حق تعالیٰ نے بھی اسے نعمت فرمایا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ لڑتے تھے آپس میں عداوتیں بڑھی ہوئی تھیں آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے، لڑائیاں ٹھنی ہوئی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر جنگیں اٹھتی تھیں۔ پانی پلانے پر جھگڑا، پہلے پانی کون پلائے، اس پر قبیلے لڑ پڑتے تھے اور یہ لڑائی پچاس پچاس، سو سو برس جاری رہتی تھی، اور مرنے والے وصیت کر جاتے تھے کہ لڑائی بند نہ ہونے پائے، اسے جاری رکھنا ہمارے خاندان کی ناک

نہ کٹ جائے۔ باتیں چھوٹی چھوٹی ہوتی تھیں مگر لڑائیاں بہت بڑی بڑی، عناد و دشمنی عام، آپس میں رقابتیں مزاج بن گیا تھا، اسلام نے آکر انہیں متحد کردیا۔ تو اس اتحاد کو حق تعالیٰ نے ایک آیت میں نعمت فرمایا ہے کہ :

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً ۔

"اس وقت کو یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے، ایک دوسرے کے نام سے بیزار تھے"۔

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالدی۔ **فاصبحتم بنعمته اخوانا** یہ اس کی دی ہوئی نعمت تھی کہ تم آپس میں جمع نہیں ہوسکتے تھے۔

نعمت تالیف قلوب

تو اس اتحاد اور تالیف قلوب کو حق تعالیٰ نے انعام خداوندی فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ دلوں کا ملادینا یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے ساری تنظیمیں آپ کریں مگر دلوں کا ملادینا یہ اللہ ہی کا کام ہے۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کہ آپ کی تائید سے بڑھ کر اور کس کی تائید قوی ہوسکتی ہے ___ لیکن حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ :

لَوْاَنْفَقْتَ مَافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآاَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۔

"اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اگر زمین بھر کر بھی سونا خرچ کردیتے تو دلوں کو نہیں جوڑ سکتے تھے۔ دلوں کا جوڑنا اللہ کا کام ہے"۔

یہ جو ہمارے بزرگ جو بیٹھے ہوئے مختلف مسالک، مختلف فرقوں کے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض کندھے سے کندھا ملائے ہوئے نہیں بیٹھے بلکہ دل بھی ان کے جڑے ہوئے ہیں۔ دلی جذبہ بھی یہی ہے کہ واقعی ہم حفاظت کریں اپنے دین کی تو تالیف قلوب یہ تو اللہ ہی کا کام تھا اور واقع جب ہوا جب شر اٹھا اور پرسنل لاء کے مخالف کھڑے ہوئے تو ہم کو اللہ نے اس شر سے ایک بڑی نعمت عطا کردی اور اسلام کا شیوہ ہمیشہ رہا ہے کہ جب بھی وہ ابھرا ہے مخالفتوں میں ابھارا ہے۔ اگر مخالفین نہ ہوں اور اس سے ٹکراؤ نہ ہو تو اس کی برکتیں نہیں کھل سکتیں، اس کے اندر جو خیر کے پہلو ہیں وہ نمایاں نہیں ہوسکتے تھے۔

مسلم پرسنل لاء کی مخالفت کے فوائد

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی نام ہی ٹکراؤ کا ہے۔ اگر دنیا میں ٹکراؤ نہ ہو تو ترقی نہیں ہوسکتی۔ مثلاً پانی ہے، ہزاروں برس سے سمندر ٹھاٹھیں ماررہا ہے اس میں کوئی ترقی نہیں کہ پہلے سمندر کی موجیں اٹھتی تھیں پہاڑوں کی شکل میں اور اب گلدستوں کی صورت میں آنے لگی ہوں، پھول بوٹے بن گئے ہوں۔ ویسی ہی موجیں ہیں جیسی دس ہزار برس پہلے اٹھتی تھیں ویسے ہی ٹھاٹھیں ماررہا ہے۔ کوئی ترقی نہیں۔ آگ ہے اس میں کوئی ترقی نہیں جیسے پہلے لپٹ اٹھتی تھی ویسے ہی آج بھی لپٹ اٹھ رہی ہے۔ وہ پھول بوٹے نہیں بناتی، زمین ہے اگر تنہا چھوڑ دو تو اس میں کوئی ترقی نہیں۔ جیسے پہلے پامال تھی ویسے ہی آج بھی پامال ہے۔ آپ

جیسے اسے روندتے ہیں روندی جاتی ہے۔ لیکن پانی کو اگر آپ ملادیں مٹی سے اور ٹکرادیں تو گارا بنے گا اور گارا بننے کے بعد کہیں برتن بنیں گے، کہیں اینٹیں بنیں گی، کہیں سامان بنے گا۔ بس ترقی شروع ہو گئی۔

تو آگ پانی کے ٹکراؤ سے ترقی ہوتی ہے، الگ الگ رہنے میں کوئی ترقی نہیں ہے۔ آگ کو آپ ہوا سے ٹکرادیں تو جو (فضا) کے عجائبات پیدا ہونگے کہیں گرج ہوگی، کہیں بادل ہوں گے، کہیں بجلیاں چمکیں گی۔ اگر ہوا اور آگ دونوں الگ الگ رہیں تو نہ بجلی نظر آئے گی نہ کڑک نظر آئے گی نہ بارش برسے گی۔ تو بہرحال ٹکراؤ ہی میں ترقی ہے۔

ایک بہت بڑا عالم ہے وہ ہزارہا مسائل جانتا ہے لیکن پھر اس کے اندر ترقی نہیں۔ لیکن اگر اس کو کسی جاہل سے ٹکرادیا جائے تو اور وہ اعتراضات کرے تو اعتراضات کے جواب میں نئی نئی چیزیں کھلیں گی اور نیا علم سامنے آئے گا۔ اس طرح سے ایک عالم کے علم کی ترقی شروع ہو جائے گی۔

تو جہالت بھی ایک نعمت ہے بغیر اس کے ٹکراؤ کے علم کے اندر ترقی پیدا نہیں ہوتی۔ ایک حکیم کا مقالہ ہے کہ:

القلب میت وحیاتہ بالعلم والعلم میت وحیاتہ بالمناظرۃ۔

"دل مردہ ہے اس کی زندگی ہے علم اور علم مردہ ہے اس کی زندگی بحث اور نظر اور ٹکراؤ سے ہے"۔

اور علم کی ٹکر جہالت سے ہی ہوگی۔ علم تو علم سے ٹکراتا نہیں۔ تو جتنا جاہل ٹکرائے گا عالم سے اتنا ہی اس کے علم میں وسعت شروع ہو جائے گی۔

ایک بہت زبردست پہلوان ہے، ہزاروں داؤ پیچ جانتا ہے جو اس کی جھولی میں محفوظ پڑے ہوئے ہیں، اگر کشتی لڑنے پر آجائے تو ان داؤ پیچ میں ترقی ہوگی وہ اپنے بچانے کے لئے نئے نئے داؤ پیچ ایجاد کرے گا۔ نئی نئی صورتیں پیدا کریگا تو جب تک دو پہلوانوں کی ترقی نہ ہو تو فن کی ترقی نہیں ہوتی۔ ترقی درحقیقت نام ہی تصادم کا ہے۔ اگر تصادم نہ ہو تو ترقی ناممکن ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے اسی تصادم کو بھی فضل خداوندی ظاہر فرمایا ہے اور فرمایا کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔

"اگر اللہ ایک قوم کو دوسری قوم سے نہ ٹکرائے تو زمین فاسد ہو کر رہ جائے اور قومیں بیٹھ جائیں"۔

ان کی ترقی رک جائے، لیکن اللہ ٹکراتا ہے ٹکرانے کے بعد پھر نئے نئے عجائبات تمدن کے پیدا ہوتے ہیں۔ جب کوئی جنگ ہوتی ہے تو جنگ کے بعد نئے نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں۔ تمدنی ترقی ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم قوی ہے تو اس ٹکرانے سے اس کی نخوت ٹوٹتی ہے۔

اور جو ضعیف ہے اس کی غفلت ٹوٹتی ہے۔ تو دونوں فرقوں کی بھلائی ٹکرانے کے اندر ہوتی ہے۔ ٹکریں نہ ہوں تو کوئی ترقی ممکن نہیں۔ تو پرسنل لاء کو ٹکرایا، لوگوں نے مخالفت کی، اعتراضات کئے۔ اس سے ہر فرقے کے علماء کھڑے ہو گئے، ہر تنظیم کے سربراہ کھڑے ہو گئے، انہوں نے ان کے اعتراضات کے جواب دیئے۔ اس سے مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ پھیل گیا اور اتنی شقوق کھل گئیں کہ اس سے پہلے ہم بھی نہیں جانتے تھے کہ اس کے اندر اتنی شقوق ہیں۔ آج سینکڑوں رسالے شائع ہو گئے، سینکڑوں مضامین چھپ گئے۔ سارے

پہلو کھول کر رکھ دیئے۔ پتہ نہیں تھا کہ اس مسلم پرسنل لاء میں اتنا علم بھرا ہوا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ذوق اور ظرف کے مطابق علم نکالا۔ اتنے پہلو واشگاف کئے کہ اگر مخالف اعتراض نہ کرتے تو کبھی یہ پہلو ہمارے سامنے نہ آتے بس اتنا جانتے تھے کہ قانون اللہ کا ہے۔ بھائی عمل کراو اس پر' مگر ٹکرے آپس میں ترقی ہوئی' عجیب لطائف اور نکات پیدا کئے علماء نے' اگر یہ ٹکر نہ ہوتی تو پرسنل لاء کا مسئلہ واضح نہ ہوتا۔ حق تعالیٰ جب چاہتے ہیں کہ اسلام کے کسی مسئلہ کو کھول کر واضح کریں تو جہلاء کو ٹکرا دیتے ہیں کہ تم اعتراضات کرو اور مخالفت کرو' جتنی مخالفت ہوگی علماء اس کے جواب میں کھڑے ہو جائیں گے اور جو گوشے چھپے ہوئے تھے وہ کھل کر سامنے آجائیں گے۔

اسی لئے کفار کو ٹکر دی گئی مسلمانوں سے' فساق کو ٹکر دی گئی متقیوں سے' منافقوں کو ٹکر دی گئی مخلصوں سے تاکہ مخلص کا اخلاص کھل جائے' منافق کا نفاق کھل جائے اور جو چیز اصل ہے وہ کھل کر برسرعام آجائے۔

تو واقعہ یہ ہے کہ پرسنل لاء کی مخالفت ہمارے لئے بڑی نعمت ثابت ہوئی اگر یہ نہ ہوتی تو اتنا بڑا اتحاد جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ نہ ہوتا۔ اس اتحاد سے جو حفاظت ہو رہی ہے پرسنل لاء کی وہ نہ ہوتی۔ اس حفاظت سے رعب کی جو کیفیت مخالفین کے دلوں میں پیدا ہو گئی وہ نہ ہوتی۔ ہزاروں مسلمان جو پرسنل لاء کو سمجھتے ہوئے نہ مانتے تھے وہ اچھی طرح مان گئے۔

تو ایک نعمت کیا ہزاروں نعمتیں مل گئیں۔ اس اعتبار سے تو ہم شکر گزار ہیں مخالفت کرنیوالوں کے کہ اگر وہ مخالفت نہ کرتے تو ہمیں یہ نعمتیں نہ ملتیں۔ اور وہ زیادہ مخالفت کر کے دیکھیں' مسئلہ اور زیادہ واضح ہوگا۔

اور ممکن ہے کل کو اس کھلے ہوئے مسئلے کی لپیٹ میں وہ بھی آجائیں اور وہ بھی کہیں بھائی! وہی بات تو تھی جس سے لڑ رہے تھے اسے دیکھو اور جب دیکھیں گے تو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاویں گے۔ تو یہ مخالفت ذریعہ بن جائے گی ان کی موافقت کا یہی مخالفت ذریعہ بنے گی پیروی کرنے کا۔ تو ان کے لئے بھی راستہ ہموار ہو رہا ہے۔

مبنی بر حقیقت قانون

اور ہمارے لئے تو اللہ نے علمی اور نظری راستہ پیدا کر ہی دیا بہت سوں میں اب استعداد پیدا ہو رہی ہے غور و فکر کی اور استعداد کے بعد جب وہ غور و فکر کریں گے تو فطری قانون پر آکر رہیں گے۔ یہ مصنوعی قوانین سب ختم ہو جائیں گے۔

باپ کا بیٹا ہونا یہ کوئی فرضی بات تھوڑا ہی ہے کہ جسے چاہیں آپ کہدیں کہ یہ بیٹا ہے۔ بس وہ بیٹا بن گیا۔ جسے چاہیں آپ کہدیں کہ یہ باپ ہے بس وہ باپ بن گیا ___ باپ بیٹا ہوتا ہے جزئیت کے تعلق سے کہ وہ باپ کا جزو ہے اس کے نطفے سے ہے اس لئے وہ اس کا بیٹا ہے۔ محض منہ کے بولنے سے تو جز نہیں بن جائے گا۔ کسی شخص کا محض نام لینے سے بیٹا بنا دینا درحقیقت یہ فرضی اور مصنوعی بات ہوگی۔ حالانکہ اس کا تعلق خلقت سے ہے۔ خدا ہی باپ بناتا ہے خدا ہی بیٹا بناتا ہے وہی ایک کے اندر سے دوسرے کو نکالتا ہے۔ اس کے اجزاء منتقل ہوتے ہیں دوسرے کے اندر جس سے وہ بیٹا بن جاتا ہے۔ بیٹی بن جاتی ہے۔

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ۔

"وہ مردہ سے زندہ کو نکال دیتا ہے' ایک قطرہ پانی سے جو مردہ محض ہے"۔

زندہ انسان پیدا کر دیا ہے اور اس زندہ انسان میں سے پھر وہ قطرہ آگے کو چلتا ہے تو زندہ میں سے مردہ کو

نکال دینا اور مردہ میں سے زندہ کو پیدا کرنا یہ تو اللہ کا کام ہے کسی انسان کا کام نہیں ہے۔ تو ایک انسان کا جزء بن جائے گا دوسرا انسان۔ وہ جزء زبان کی حرکت سے تھوڑا ہی بنے گا۔ وہ تو خلقۃً بنا ہوا ہے۔

جو بیٹا ہے وہ بیٹا ہے جو باپ ہے وہ باپ ہے تو ظاہر بات ہے کہ جب اس حقیقت پر وہ غور کریں گے وہ خود نادم ہوں گے اگر عقل رکھتے ہوں گے کہ بھائی! یہ محض منہ سے بیٹا کہہ دینے سے بیٹا کیسے بن گیا اور بیٹا بھی حقیقی کہ وراثت میں بھی شریک اور حقوق میں بھی۔ یہ سب فرضی کارخانہ ہے کہ ہم نے بیٹھ کر خیال کر لیا' بس ہو گیا' تو باپ بیٹا ہونا خیالات سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو خلقت ہے تخلیق خداوندی ہے جتنی چیزیں قانون کی بنائی جاتی ہیں۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ مصنوعی ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون جو آتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگرچہ دوسری قومیں اپنے اقتدار کی وجہ سے اپنے تحفظات کی وجہ سے قانون ایسے بناتی ہیں کہ وہ محفوظ ہو جائیں۔ دوسرا چاہے پامال ہو جائے لیکن اللہ کے تو سب بندے ہیں وہ تو سب کا خیر خواہ ہے۔ اس لئے وہ قانون بھیجتا ہے سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے اس لئے سب ہی بنی آدم کو اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

پرسنل لاء کی خدمت

بہرحال اب اس لحاظ سے میں عرض کروں گا کہ اہل بنگلور نے جو مدارات کی ہے آنے والوں کی اور جو مہمانداری کی اور اخلاقی بلندیوں کا ثبوت دیا وہ فی الحقیقت ہمارے گوشت پوست کی خدمت نہیں بلکہ وہ خدمت کی ہے پرسنل لاء کی۔ وہ خدمت کی ہے اتحادِ طبقات کی' وہ خدمت کی ہے تمام فرقوں کے متحد ہونے کی' تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ ہم الفاظ میں شکریہ ادا نہیں کر سکتے' لیکن پھر بھی انسان کے اوپر فرض ہے کہ شکریہ ہی ادا کرے اللہ کا بھی اور بندوں کا بھی۔

من لم يشكر الناس لم يشكر الله۔

"جو بندوں کا شکر گزار نہیں وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں"۔

اس لئے کہ اس نے جو کام کیا ہے وہ کیا ہے اللہ ہی کی توفیق دینے سے تو اولاً اللہ کا شکر ہوتا ہے پھر وسائل کا شکر ہوتا ہے۔ تو بجائے اس کے کہ ہم آپ کا شکر ادا کرتے یہ آپ کی عالی حوصلگی ہے کہ آپ ہمارا شکر ادا کر رہے ہیں۔

دے بھی رہے ہیں شرما بھی رہے ہیں

فی الحقیقت یہ شکریہ آپ کے لئے ہے اس وقت تک جب تک آپ کی نسلیں باقی ہیں۔ آپ کے لئے دعاء ہے اس وقت تک جب تک دنیا میں آپ کا نام ونشان باقی ہے۔ تو اللہ آپ کو بھی دوامی کرے اور خدا کرے کہ ہمارا شکر بھی دوامی ہو۔

دوام شکر

انسان تو ہے ہی دوامی' انسان ازلی نہیں بلکہ ابدی ہے۔ ازلی تو اس لئے نہیں کہ اللہ نے پیدا کیا تو ہو گیا اس سے پہلے انسان کا نام ونشان نہیں تھا۔ قرآن کریم نے فرمایا:

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا۔

"انسان پر ایک بڑا زمانہ گزر چکا ہے کہ لاشی محض تھا اور اس کا چرچا بھی نہ تھا زبانوں پر"۔

کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ زید کون ہے اور بکر کون ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ۔

"ہم نے پیدا کیا انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پلٹتے رہے اس کو"۔

تو ہمیں پیدا ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہم معدوم تھے۔ اس سے پہلے ہمیں اپنے عدم کا بھی علم نہ تھا۔ زمانہ دراز گزر چکا ہے کہ انسان نہیں تھا۔ اللہ نے پیدا کیا لیکن جب پیدا کر دیا تو اب وہ مٹنے والا نہیں اب وہ ابدی ہے۔

موت کے معنی فنا کے نہیں ہیں کہ آدمی موت آنے کے بعد فنا ہو گیا یا ختم ہو گیا ایسا نہیں ہے بلکہ موت کے معنی منتقل ہو جانے کے ہیں۔ اس دار سے دوسرے دار میں' اس جہان سے دوسرے جہان منتقل ہونا۔ تو انتقال ایک دار سے دوسرے دار کی طرف' ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف یہ تو ہوتا رہے گا' مگر مٹ جائے انسان' یہ نہیں ہو سکتا۔ نو مہینے آپ ماں کے پیٹ میں رہے۔ ایک عالم میں تھے۔ اس سارے عالم کی عمر نو مہینے کی تھی' وہاں سے انتقال ہوا تھا۔ دنیا میں آگئے۔ اب دنیا میں آپ کی عمر ساٹھ' ستر' اسی' سو برس کی ہے' یہاں رہے۔ یہاں سے انتقال ہوا تو عالم برزخ میں پہنچ گئے' جسے آپ قبر کہتے ہیں۔ وہ اللہ ہی جانتا ہے کہ آپ اس میں کتنی مدت رہیں گے۔ قیامت تک تو رہنا ہی ہے۔ پھر قیامت آگئی تو آپ عالم برزخ سے عالم حشر کے اندر منتقل ہوں گے اور عالم حشر میں ایک دن قیام کرنا ہے اور وہ ایک دن ہو گا پچاس ہزار برس کا' لہٰذا پچاس ہزار برس اس عالم کی عمر ہے۔ اس عالم میں آپ پچاس ہزار برس گزارنے کے بعد منتقل ہوں جنتوں کی طرف۔

تو انسان مٹنے والا نہیں ہے۔ باپ کی پیٹھ سے ماں کے پیٹ سے چلا تو چلتا ہی رہے گا ابد الآباد تک۔ اس لئے آپ بھی باقی' ہم بھی باقی' آپ کے اخلاق بھی باقی' ہمارا شکریہ بھی باقی۔ دونوں چیزیں دوامی ہیں جو چلتی رہیں گی اور جنتوں تک ساتھ جائیں گی۔

وحدت خیال و وحدت قلوب

بہرحال آپ نے فی الحقیقت یہ خدمت مہمانوں کی نہیں بلکہ ایک مسئلۂ عظیم کی خدمت کی ہے۔ آپ نے مسلم پرسنل لاء کی خدمت کی ہے۔ اس کو عام کیا' اس کو پھیلایا اور آپ نے چاہا کہ ساری پبلک اس سے واقف ہو جائے۔ اس کے لئے یہ عظیم الشان جلسہ منعقد کیا۔ یہ جلسہ درحقیقت وعظ و تقریر کا نہیں ہے۔ وعظ و تقریر میں ہوتی ہے تربیت' یہ جلسہ ہے اعلان کا کہ آپ کو ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جو قانون کے اوپر آنیوالے ہیں۔ ان کی بچاؤ کی صورتیں آپ کے سامنے رکھی جائیں۔ ان صورتوں پر آپ متفق اور متحد ہو کر چلیں۔ یہ جلسہ اس اعلان کے لئے ہے وعظ و تقریر کے لئے تو ہزاروں جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں عبادات' معاملات وغیرہ سب چیزوں کی نصیحت بھی ہوتی ہے لیکن یہ محض وعظ و نصیحت کا اجلاس نہیں یہ تو جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ خطرات سے آگاہ کر دیا جائے۔ تو بہت سے خطرات سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ فلاں مسئلے کو اگر بدلا گیا تو یہ خطرات ہوں گے' پرسنل لاء کے مسئلے میں مداخلت کی گئی تو یہ خطرات رونما ہوں گے۔

ان خطرات پر تجویزیں آرہی ہیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں تو یہ جلسہ اذن عام اور اعلان عام کا ہے تاکہ آپ کا اتحاد باقی رہے ____ یہ ظاہر بات ہے کہ اتحاد زبان سے نہیں ہوتا۔ آپ نے کہا کہ میں آپ کا دوست ہوں، آپ نے کہہ دیا کہ میں بھی آپ کا دوست ہوں۔ یہ دوستی قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ یہ تو لفظوں کی دوستی ہے۔ دوستی واقعی جب ہے کہ واقعی دل میں دوستی آجائے، جگر کے اندر پیوست ہوجائے وہ دوستی باقی رہ سکتی ہے اور وہ دوستی کب ہوگی؟ جب وحدت خیال پیدا ہو۔ اگر خیالات بدلے ہوئے ہیں، آپ کا رخ ایک طرف میرا رخ ایک طرف، کبھی اتحاد پیدا نہیں ہوسکتا اور جب خیالات میں آگئی وحدت تو خود بخود اتحاد پیدا ہوگا۔ تو پرسنل لاء اور قانون الٰہی اور قرآن کے ایک ایک جز کی حفاظت ایسی چیز ہے کہ اس کے اوپر سارے متفق ہیں۔ اس کے معنی میں چاہے اختلاف کریں، رائے الگ ہیں۔ لیکن نفس قانون قرآن و حدیث اس پر سارے متحد ہیں۔

تو اس وقت آنچ آپ کے میرے خیالات پر نہیں آرہی ہے اس وقت تو آنچ آرہی ہے کتاب وسنت پر، ان کے مسائل پر لوگ تغیر و تبدل چاہتے ہیں۔ تو کون سا فرقہ رہ جائے گا جو اسے گوارہ کرلے کہ قرآن وحدیث میں کوئی شخص تغیر کرے، اس واسطے سارے کے سارے متحد ہوگئے۔ لہٰذا وحدت خیال بھی ہے اور وحدت قلوب بھی۔

اشتراک مقصد اور اخلاص باہمی

اور باہمی اخلاص بھی ہے ایک دوسرے سے بغیر اخلاص کے اس طرح جمع نہیں ہوسکتے اور اخلاص اس لئے ہے کہ مقصد ہے مشترک۔ الگ الگ مقصد نہیں ہے بلکہ ایک ہی مقصد ہے یہ کہ قرآن وسنت، ناقابل تغیر ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا ہے۔ تغیر و تبدل آپ تو کیا کرتے اس کا حق تو خود صاحب شریعت کو بھی نہیں دیا گیا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ارشاد فرمایا گیا آپ بھی اعلان کردیں:

قُلْ مَا يَكُونُ لِيْ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔

"میرے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ میں اس کے کسی شوشے کو بدل دوں"۔

میں تو ناقل اور امین اور داعی بن کر آیا ہوں اللہ کی طرف سے جو حق تعالیٰ فرمائیں گے بلا کم و کاست تمہارے آگے رکھ دوں گا۔ اس کے اندر میری طرف سے کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ تو حضور بھی جس تغیر و تبدل کے مجاز نہیں میں اور آپ اس کے مجاز کیسے ہوجاویں گے؟ اور جب میں اور آپ نہیں تو دوسری قومیں کیسے ہوجاویں گی؟ یہ تغیر و تبدل کرنے کھڑی ہوں گی تو لامحالہ مقابلہ بھی ہوگا اور مقابلہ ہوگا تو ہماری مدد بھی ہوگی۔

بندہ کی ذمہ داری اور نصرت خداوندی

مدد حاصل کرنے اور لڑنے کا ایک خاص اصول ہے۔ اگر آپ ضعیف اور کمزور ہیں، مدمقابل ہے بہت قوی اور آپ مقابلہ نہیں کرسکتے ہیں اس سے، تو اصول یہ ہے کہ کسی قوی کو اس کے مقابلہ پر ڈال دیجئے وہ لڑتے رہیں گے آپ بیٹھ کر تماشہ دیکھتے رہیں گے تو آج قانون پر آنچ آرہی ہے آپ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اقوام کو اللہ سے بھڑادو اور کہدو کہ یہ قرآن وحدیث میں تغیر کرنا چاہتے ہیں، قرآن والا خود ان کو سمجھ

لے گا۔ لڑائی ان کی شروع ہوگی۔ ہم آرام سے بیٹھ کر دیکھیں گے خدا کو کون مغلوب کر سکتا ہے؟ اس کے قانون کو کون نیچا دکھا سکتا ہے؟ اس کی صورت یہی ہے کہ ہم آ ڑلیں قرآن و حدیث کی۔ اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہیں نہ ہماری عقل کوئی چیز ہے نہ ہمارا خیال کوئی چیز ہے۔ ہم تو قانون کے حق میں امانت دار ہیں اس قانون کو پہنچائیں گے۔ قانون قانون والے کا ہے۔ اگر کوئی لڑے گا تو وہ قانون سے اور قانون ساز سے لڑے گا۔ ہم تو قانون ساز نہیں ہیں۔ ہم تو بیٹھ کر تماشہ دیکھیں گے۔

جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا گیا' مقابلہ ہوا مشرکین مکہ سے ظاہر بات ہے کہ مسلمان تعداد میں بھی تھوڑے' سامان بھی ان کے پاس نہیں اور مقابلہ اس قوم سے کہ سارے وسائل زندگی اس کے ہاتھ میں ہیں' اقتدار حجاز کا اس کے ہاتھ میں' حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

ذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ۔

''اے پیغمبر! مجھے چھوڑ دو اور میرے مقابلہ پر انہیں چھوڑ دو''۔

ہم نمٹ لیں گے تم بیٹھ کر دیکھو۔ تو ہمارا بھی کام یہ ہے۔ بھائی تم ہماری جائیداد یا ہماری ذات پر حملہ نہیں کررہے ہو۔ یہ تو براہ راست قانون پر حملہ ہے اور قانون الٰہی ہمارا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے تو تم لڑلو' اگر تمہارے اندر طاقت ہے اللہ میاں سے' ہمارا کام تو یہ ہے کہ ہم پیش کردیں کہ یہ خدا کا قانون ہے اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے پھر بھی کہو گے تو مجرم ٹھہرو گے خدا کے' ہمارا کوئی جرم نہیں کہ ہم خواہ مخواہ تم سے لڑیں۔ تم نمٹ لو۔

بہرحال اصول بھی یہی ہے کہ جب آپ کے اندر طاقت نہیں تو کم از کم اتنی طاقت ہے کہ اپنے دین کو مضبوطی سے سنبھال لیں اور دوسروں میں اعلان کردیں اور یہ بھی کہہ دیں کہ یہ ناممکن التغیر ہے۔ بس اتنا آپ کرتے رہیں۔

اب آگے جھگڑنے کے بعد کون مغلوب ہو کون نہیں۔ اس کو قانون والا اپنے آپ جان لے گا۔

شاہ حبش کی شکست

آپ کے سامنے تو واقعہ ہے کہ مکہ مکرمہ پر جب دھاوا بولا ہے ابرہہ نے یہ حبش کا بادشاہ تھا اور اس نیت سے آیا تھا کہ بیت اللہ شریف کو منہدم کرے' (معاذ اللہ) تاکہ لوگوں کا رجوع اس کی طرف سے ختم ہو کر اس مکان کی طرف ہو جائے جو اس نے یمن میں بنایا تھا تو وہ بڑے بڑے ہاتھیوں کا لشکر لے کر آیا اور مکہ کے اردگرد اس نے گھیرا ڈال لیا اور ارادہ یہ تھا کہ معاذ اللہ بیت اللہ کو مسمار کردے اور ڈھادے۔ تو اس نے **عبدالمطلب** کو اطلاع دی کہ اگر تمہیں کچھ کہنا ہو تو آ کر کہو۔ مکہ کے باشندوں کے تم سردار ہو۔ **عبدالمطلب** آئے ان کی بڑی تعظیم کی بڑی توقیر سے پیش آیا اور کہا کہ اگر کوئی بات ہو تو آپ کہیں۔ انہوں نے کہا میرے چند اونٹ ہیں' میری چند املاک ہیں ان کی آپ حفاظت کریں' ان پر آپ ہاتھ نہ ڈالیں اور میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

اسے حیرانی ہوئی کہ یہ اپنے چند اونٹوں کو لے کر بیٹھ گئے اور بیت اللہ جیسی چیز کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں کہا کہ صاحب اسے مسمار مت کرو' اس پر حملہ مت کرو' تو اس نے **عبدالمطلب** سے کہا کہ آپ اپنے چند اونٹوں کے بارے میں آئے ہیں اور اپنی ایک شخصی ملک کو سامنے رکھا ہے۔ حالانکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اس مرکز کو ڈھادوں جس سے آپ کی بنیاد قائم ہے۔ اس کے بارے میں آپ نے کچھ بھی نہیں کہا۔

تو **عبدالمطلب** نے کہا کہ بیت اللہ میری ملک تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو خدا کا گھر ہے خدا آپ سے خود نمٹ

لے گا میں تو اپنی ملک کے بارے میں کہنے کے لئے آیا ہوں خدا کی ملک کے بارے میں کہنے نہیں آیا۔ وہ جانے آپ جانیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے اس کے ہاتھیوں کے پرخچے چند چڑیوں کے ذریعے سے اڑا دیئے بیت اللہ اسی طرح قائم رہا اس کے ہاتھیوں کے اور اس کے لشکر کے پرخچے اڑ گئے ان میں سے ایک شخص بھی باقی نہ رہا۔

پرسنل لاء میں مداخلت کی وجوہ

ہم اور آپ اس چیز کے ذمہ دار ہیں کہ پہلے تو اس قانون پر ہم اور آپ عمل کریں اپنے اندر اس کو رچالیں اس کے بعد اس کا اعلان کریں کہ یہ خدائی قانون ہے۔ اس میں تغیرو تبدل نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کو خدا کے مقابلے پر ڈال دیں کہ ہم تو اسی پر عمل کریں اور اسی کا اعلان کریں گے جو تمہارا جی چاہے کرلو تو حقیقت یہ ہے کہ کوتاہی ہماری ہے۔ عامل تو ہم نہیں۔ پرسنل لاء کے نام سے ہم واقف نہیں شخصی اور عائلی قوانین کیا ہیں ان پر عمل درآمد نہیں' اگر عمل درآمد ہو تو دوسرے خود مغلوب ہو جاویں گے لیکن خود آپ عمل نہ کریں تو دوسروں کو جرأت ہوتی ہے کہ دخل اندازی کریں وہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو پتہ نہیں کہ پرسنل لاء کیا ہے۔ لہٰذا جس طرح سے چاہو اس کے روپ کو بدل دو۔

ہماری بدعملی نے یہ راستہ دکھایا ہے اگر آج سب مل کر اس پر جمع ہو جائیں کہ پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جو اسلامی معاشرہ ہے ہم اسے قائم کرکے رہیں گے۔ پھر کروڑ ہا کروڑ انسان جن کو سات کروڑ کہا جاتا ہے۔ لیکن اندازہ یہ ہے کہ دس بارہ کروڑ سے کم نہیں ہیں یہ سارے مل کر اگر عمل کریں درآمد کریں تو عمل کے اندر خود وہ طاقت ہے کہ دوسروں کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ زبان سے بھی کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارا اور آپ کا کام یہ ہے کہ ایک تو عمل درآمد ہو اس کے اوپر اور ایک اس کا اعلان ہو اور اس کی پوری اطلاع دیدی جائے کہ اس قانون میں تغیرو تبدل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہم اس کو ایک منٹ کے لئے گوارہ کرسکتے ہیں۔ ہماری جانیں جاسکتی ہیں مگر اس قانون پر آنچ نہیں آسکتی۔

فریضۂ مسلم اور ادائیگی شکر

یہ اعلان کردینا آپ کا فرض ہے اس پر جم جانا آپ کا فرض ہے اس لئے یہ جلسے منعقد کئے جارہے ہیں۔ پرسنل لاء کے مسائل کے بارے میں مجھے کوئی تحقیق عرض کرنی نہیں تھی بلکہ مقصد آپ کا شکریہ یہ ادا کرنا تھا اور ایک یہ کہ پرسنل لاء کے اوپر آپ کو جم جانا چاہئے۔ علماً بھی عملاً بھی اور اعلاناً بھی اور اذن عام بھی آپ کریں' مطلع کردیں کہ یہ قانون خداوندی ہے۔ ہم اس کے امین ہیں۔ ہم ایک منٹ کے لئے بھی اس میں تغیرو تبدل گوارہ نہیں کرسکتے۔ یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں' کوئی تقریر یا وعظ نہیں کرنا تھا۔

ایک خادم بورڈ کی حیثیت سے یہ بھی میرا فرض تھا کہ آپ حضرات کی قدر افزائی کا شکریہ اداء کروں۔ اپنی طرف سے بھی اور ان سب بزرگوں کی طرف سے بھی۔ اصل میں تو یہی سارے بزرگ ہیں۔ انہوں نے مجھے لاکے آگے بٹھلادیا ہے کہ تو یہ کام کر۔ صدر تو اصل میں وہی ہیں جو صدر بنا سکتے ہیں کیونکہ وہ کرسی پر جسے چاہیں بٹھادیں' میں تو ایک علامتی نشان ہوں کام کرنے والے تو یہی سارے بزرگ ہیں جو کام کررہے ہیں اور انہوں نے ہی کیا ہے اس لئے ادا شکر کے اندر میں ان کی طرف سے نیابت کررہا ہوں۔ حق تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر دے۔ آپ کے احوال میں برکت عطا فرمائے! آمین۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون ۔

وسلام علی المرسلین والحمد للّٰہ رب العالمین۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید

اسلام میں سیاست واجتماعیت کے اصول وقوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں، جنہوں نے دین ودنیا کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود ونمود اسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب وسنت اور فقہ فی الدین کے انوار شامل تھے۔ البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کے حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے لیکن ان کے عملی کارناموں سے کوئی سبق نہیں لیا۔ اگر قوم اپنے نظریات کو قائم رکھ کر آج کے عملی میدانوں میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت وشوکت دکھلا سکتی تھی جو اب سے پہلے دکھلا چکی ہے اور دنیا اس کی تقلید پر مجبور ہوتی نہ کہ قصہ برعکس ہوتا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

حرف آغاز

۲۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ایک غیر معمولی اور عظیم اجلاس میں شرکت ہوئی جس کا موضوع تھا، "فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ" ___ اس اجلاس میں ملک کے تمام مرکزی اداروں کے نمائندوں اور تقریباً ہر مکتب خیال کے فضلاء اور دانشوروں نے شرکت کی ___ اجلاس کی اہمیت صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخرالدین علی احمد کی شرکت سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ احقر ناکارہ کو صدر اجلاس منتخب کیا گیا ___ چونکہ صدر مملکت نے صرف ایک گھنٹہ دیا تھا، اس لئے اجلاس کی پہلی نشست کی ساری کاروائی ایک ہی گھنٹہ میں پوری کی جانی ضروری تھی۔ ابتدا میں شیخ الجامعہ پروفیسر مسعود حسین صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اس کے بعد محترم ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج وڈائریکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ نے اجلاس کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ پندرہ پندرہ منٹ صدر جلسہ اور صدر مملکت کی تقریروں کے لئے تھے۔ احقر نے اولاً اپنی تقریر سے جلسہ کا افتتاح کیا۔ لیکن وقت کی قلت کی وجہ سے چونکہ اس اہم موضوع پر کوئی تفصیلی روشنی ڈالنا ممکن نہ تھا اس لئے تقریر میں چند بنیادی اور اساسی نقاط ہی بیان کئے جاسکے ___ البتہ نشست کے اختتام پر جب اس کا ذکر آیا تو ذمہ داران جامعہ نے اسے مناسب خیال فرمایا کہ یہ تفصیلات نقاط، مقالہ کے طور پر لکھ کر ارسال کردی جائیں جس میں باقیماندہ نقاط بحث بھی شامل ہوں۔ اس لئے یہ مقالہ پیش کیا جارہا ہے۔ جس میں وہ سب بنیادیں بھی ہیں جو اجلاس میں زبانی بیان

کی گئی تھیں اور باقیماندہ نقاط بھی آگئے ہیں جو وہاں بیان میں نہ آسکتے تھے۔ ممکن ہے کہ ترتیب میں فرق ہو لیکن مقاصد سب آگئے ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مسئلہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس موضوع کے سلسلہ میں چند بنیادی نقاط پیش کردوں جنہیں فکر جدید کی تعمیر اٹھانے والے حضرات کو پیش نظر رکھنا میرے نزدیک ازبس ضروری ہے۔

عالم بشریّت میں فکر و تفکّر کی اہمیت

پہلے بطور تمہید کے یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ عالم بشریت میں فکر و تفکر ایسی ایک عظیم اصولی بلکہ اصل الاصول قوت ہے کہ انسان کی ساری معنوی قوتیں اسی کے نیچے آئی ہوئی ہیں اور سب اسی کی دست نگر ہیں، جو بلا فکر ایک قدم بھی کسی میدان میں آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ حواس خمسہ ہوں یا عقل و دانش، ذوق و وجدان ہو یا بصیرت و تفقہ، حدس و تجربہ ہو یا جوہر قیافہ ان سب کا قائد اور محرک فکر ہی ہے۔ پھر یہ فکر نہ صرف یہ کہ انسان کی تمام معنوی قوتوں کا سرچشمہ ہی ہے، بلکہ خود انسان کی ایک ایسی امتیازی خصوصیت بھی ہے جس سے اس کی انسانیت پہچانی جاتی ہے کیونکہ یہ قوت انسان کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں، اس لئے اگر اس فکری قوت کو انسان کی ماہیت کا حقیقی معرف کہہ دیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔

انسان کی مشہور و معروف تعریف حیوان ناطق یا حیوان عاقل سے کی جاتی ہے۔ لیکن غور کیا جائے تو اس سے انسان کا کوئی امتیاز بخش تعارف نہیں ہوتا کہ اسے انسان کی حد تام یا جامع و مانع تعریف سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ عقل کا تھوڑا بہت جوہر غیر انسان حتیٰ کہ حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایک کتے کو بھی اگر ایک جگہ ٹکڑا ڈال دیا جائے تو اگلے دن وہ پھر اسی جگہ آموجود ہوگا۔ گویا وہ قیاس کرتا ہے کہ جب آج اس جگہ ٹکڑا ملا ہے تو کل کو بھی مل سکتا ہے اور جب مل سکتا ہے تو پھر اسی جگہ پہنچ جانا چاہیے، یہ صغریٰ کبریٰ ملانا آخر عقلی قیاس نہیں ہے تو اور کیا ہے ___ خواہ وہ تعبیری اور لفظی نہ ہو مگر ایک حقیقت تو ہے، نیز عرف عام میں بعض جانوروں کو چالاک اور ہوشیار کہا جاتا ہے۔ جیسے لومڑی اور گدھے، بھینس کو عام طور سے احمق اور بلید کہتے ہیں، سعدی شیرازی نے کہا تھا کہ ۔

مسکن خر اگرچہ بے تمیز است
چوں بارہمی برد عزیز است

اور کسی نے بھینس کے بارے میں بھی کہا کہ ۔

جاموش بے وقوف وبے ہوش
چوں شیر دہد تو چشم از وپوش

اگر ان حیوانات میں عقل و شعور کی جنس ہی نہ ہوتی تو یہ نوعی تفاوت کی تقسیم صحیح نہ ہوتی جو عرف عام میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، اندریں صورت عاقلیت یا دریافت معقولات علی الاطلاق انسان کی خصوصیت قرار دے کر اس کی حد تام حیوان ناطق کو بتلایا جانا اور اس سے نوع انسانی کا تعارف کرایا جانا کوئی جامع مانع قسم کا تعارف نہیں ہو سکتا، البتہ فکر و تدبر کے راستے سے حقائق کا تجزیہ کر کے ان میں امتیاز قائم کرنا، نئے نئے اکتشافات سے جزئیات پیدا کرلینا اور جزئیات کو جمع کر کے ان سے کلیات بنانا، کلیات سے جزئیات کا

نکال لینا اور جزئیات کے عواقب ونتائج کو سمجھنا' نتائج کے معیار سے عواقب اور انجام دنیا و آخرت کو پیش نظر رکھنا' نوعی خیر سگالی اور اس کی منظم تدبیریں اور اصلاح معاشرہ کے لئے سوچ بچار وغیرہ بلا شبہ انسانی نوع ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ سب اسی فکر کے کرشمے ہیں' اسی لئے انسانی حقیقت کی اگر کوئی جامع مانع تعریف ہو سکتی ہے تو وہ حیوان ناطق نہیں بلکہ حیوان متفکر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ فکر مندی' فکر نمائی اور فکری پیمائش اور وہ بھی عمومی اور پوری نوع بشری کے لئے اور نہ صرف اس حیات کے لئے بلکہ حیات مابعد الممات تک کے لئے صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے' جو اس کے دوسرے ابنائے جنس کو میسر نہیں۔ اس لئے حیوان متفکر ہی کو انسان کی حد تام تک کہنا کچھ زیادہ قرین عقل نظر آتا ہے۔

پس یہ فکری قوت ہی انسان کی سب سے بڑی فعال قوت اور اس کی ساری معنوی قوتوں میں اولوالامر کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جس سے وہ کائنات میں متصرف اور ہر عنصری مخلوق سے اونچا سمجھا جاتا ہے ___ پھر یہی نہیں کہ انسان اس قوت کا ایک ظرف ہی ہے جس میں عقل و دانش' ذوق و وجدان اور حدس و تجربہ جیسی قوتوں کی مانند فکر بھی ان ہی جیسی ایک قوت ہے اور دوسری قوتوں کی طرح وہ بھی کسی نہ کسی وقت اپنے محدود مخصوص دائرے میں کام دے جاتی ہے' بلکہ فکر کی طاقت اس کی تمام معنوی طاقتوں پر حکمران متصرف اور انکی روح ہے' جس کے اشاروں پر یہ ساری قوتیں آمادۂ عمل رہتی ہیں۔ اگر کہیں نمائشی کروفر کا بازار گرم ہو اور باجوں' گاجوں اور نعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی ہوں' لیکن اگر راہ گیر کسی دوسرے خیال میں مستغرق ہو تو ان میں سے ایک چیز بھی نہ آنکھ کو نظر آئے گی نہ کان کوئی آواز سن پائے گا۔ اور لاعلمی کے اظہار پر جب لوگ حیرت کریں گے تو وہ یہ کہے گا کہ میں فلاں بات کے فکر میں ڈوبا ہوا تھا' مجھے ان مناظر اور آوازوں کی کچھ خبر نہیں۔ اس سے واضح ہے کہ آنکھ کان نہ خود دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں بلکہ قوت خیال و فکر ہی دیکھتی سنتی ہے۔ یہ آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی فکر کے آلات و وسائل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

یہی صورت عقل و دور اندیشی کی بھی ہے کہ آدمی زیرک بھی ہو اور دانائے روزگار بھی سمجھا جاتا ہو لیکن وہ کسی نظریئے کے سوچ میں محو ہو تو دوسرے کتنے ہی عقلی نظریات اس کے سامنے رکھ لئے جائیں' نہ وہ انہیں سمجھ سکے گا نہ ان کا شعور ہی پا سکے گا۔ کیونکہ اس کی قوت فکریہ کسی دوسرے میں مصروف جولانی ہے اور فکر کو فرصت نہیں ہے کہ وہ اس نظریئے پر غور کر سکے۔ اسی طرح روحانی احوال و کیفیات کا ادراک بھی قوت فکریہ کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا۔ اگر غیبی میدانوں میں فکر کی قوت متوجہ ہی نہ ہو یا کسی دوسرے روحانی مقام میں محو ہو تو دوسرے غیبی اور وجدانی لطیفے قلب پر بھی منکشف نہیں ہو سکیں گے۔ آخر مراقبات میں قوت فکر اور دھیان ہی کا تو استعمال ہوتا ہے۔ احسان یا تصوف کے معنی ہی یہ ہیں کہ اللہ کو اس طرح حاضر و ناظر تصور کر کے آدمی عبادت میں مصروف ہو گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ سو یہ قوت فکر کا استعمال نہیں تو اور کیا ہے؟

انسان کی فکری قوت کی کارپردازی

بہرحال یہ ایک واقعی حقیقت ہے کہ انسان کی معنویت میں حقیقی کارپرداز صرف یہ فکر ہی قوت ہے۔ وہ متوجہ ہو تو قوت باصرہ' سامعہ' شامہ' ذائقہ' لامسہ اور قوت عاملہ سب معطل رہ جاتی ہیں۔ اس لئے جب وہ محسوسات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو حواس خمسہ ہرکاروں کی طرح اس کے حکم پر دوڑتے ہیں۔ جب عقلیات کی طرف منعطف ہوتی ہے تو عقل ایک خادم کی طرح اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔

یہی قوت فکر جب **غیبیات** کی طرف چل نکلتی ہے تو وجدان و ذوق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔

اس لئے قوت فکریہ نہ صرف یہ کہ انسان کی خصوصیت ہی ہے جو اس کی ماہیت کا سرنامہ ہے بلکہ اس کی ساری ہی اندرونی قوتوں کی روح اور ان کے حق میں محرک اور قائد بھی ہے۔ قرآن حکیم نے اپنے کلام معجز نظام میں اسی حقیقت کو واشگاف فرمایا ہے۔ چنانچہ جو قومیں ان حسی طاقتوں، آنکھ کی بینائی اور کان کی شنوائی وغیرہ کے ذریعہ معجزات انبیاء کو دیکھتی تھیں اور ان کے پاک کلمات سنتی تھیں، مگر رضاء و تسلیم کا نام نہیں لیتی تھیں تو قرآن حکیم نے اس کی وجہ آنکھوں کی نابینائی یا کانوں کی ناشنوائی قرار نہیں دی بلکہ دل کی نابینائی بتلائی ہے جو درحقیقت اس قوت فکریہ کی نابینائی ہے۔ ارشاد فرمایا:

فَاِنَّهَا لَاتَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ۔ (حج پ ۱۷ آیت ۴۶)

”بات یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں بلکہ سینوں میں دل اندھے ہیں (جو فکر اور غور سے عاری ہیں)“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواس کی روح اور مدار کار فکر قلب ہی ہے نہ کہ نظر چشم، فکر کی آنکھ نہ ہو تو حواس سب کے سب اندھے ہی رہ جاتے ہیں گو وہ طبعی آمادگی سے دید و شنید کا کام بھی انجام دیئے جائیں۔ اس لئے قرآن حکیم نے منکرین کی ظاہری دید و شنید کو مانتے ہوئے بھی اس کی حقیقی کارکردگی کا انکار کیا ہے جبکہ اس کی غرض و غایت ہی اس پر مرتب نہیں ہوتی جو قوت فکر سے متعلق ہے کہ یہی فکری روح ان محسوسات کے پیکروں میں سے ان کی روح نکال کر لاتی ہے۔ ارشاد حق ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَايَعْقِلُوْنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَايُبْصِرُوْنَ ۔ (یونس پ ۱۱ آیت ۴۲، ۴۳)

”اور (آپ ان کے ایمان کی توقع چھوڑ دیجئے کیونکہ) ان میں (گو) بعض ایسے بھی ہیں جو (ظاہر میں) آپ کی طرف کان لگا لگا کر بیٹھے ہیں۔ کیا آپ بہروں کو سنا (کر ان کے ماننے کا انتظار کرتے) ہیں گو ان کو سمجھ بھی نہ ہو اور (اسی طرح) ان میں بعض ایسے ہیں کہ (ظاہرا) آپ کو (مع معجزات و کمالات) دیکھ رہے ہیں تو پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھلانا چاہتے ہیں گو انکو بصیرت بھی نہ ہو“۔

اس سے واضح ہے کہ سن کر کسی چیز کو ان سنی کر دینا اور دیکھ کر ان دیکھی بنا دینا قوت فکر ہی کے تعطل سے ہوتا ہے جس کو قرآن نے عقل و ابصار سے تعبیر کیا ہے گویا جس مبصر و مسمع میں یہ بنیادی شعور شامل نہ ہو جس کا قوۂ مفکرہ کے غور و فکر سے تعلق ہو تو وہ مبصر و مسمع بلحاظ حقیقت غیر مسموع اور غیر مبصر کے حکم میں ہے

پھر اس طرح قرآن حکیم نے ایک دوسری جگہ ان منکروں کے حق فرمایا جو پیغمبر علیہ السلام اور ان کے پیغمبرانہ اقوال و افعال کو دیکھتے اور سنتے تھے اور طبعی انداز سے وہ بینا اور شنوا بھی تھے لیکن فکر قلبی نہ ہونے یا نہ برتنے سے ان کے یہ حواس، حیوانی حواس سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے اور ان میں وہ فکری شعور نہ تھا جو حقیقی معنی میں دیکھتا اور سنتا ہے جسے قرآن نے فقہ قلبی سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد حق ہے:

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّايَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّايُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّايَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۔ (اعراف پ ۹ آیت ۱۷۹)

”ان کے دل ایسے ہیں کہ جن سے وہ سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ایسی ہیں کہ جن سے وہ

دیکھتے نہیں ان کے کان ایسے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں ایسے لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ رو ہیں یہی لوگ غافل ہیں"۔

اس سے واضح ہے کہ قلب کا محض طبعی شعور اصل نہیں جو حیوانات میں بھی موجود ہے بلکہ فقہ قلب اصل ہے' جس کا دوسرا نام قوت فکر ہے' وہ نہ ہو تو حواس کام ہی نہ کریں گے یا کریں گے تو وہ ناقابل اعتبار ہوگا اور غیر قابل التفات۔ جس سے نمایاں ہے کہ قلبی نور اصل ہے۔ جس کا نام فکر ہے نہ کہ مطلقاً قلبی شعور جو چوپایوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

عقل کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا حقیقی معیار

اسی طرح عقل کے بارے میں قرآن کریم نے یہی فیصلہ دیا ہے کہ اس کی کارگزاری کے قابل التفات ہونے کا معیار بھی یہی قوت فکر ہے۔ عقل محض نہیں' یعنی عقل طبعی کے سوچ بچار کے باوجود جبکہ قلب کا فقہی سوچ بچار اس کا منشانہ ہو۔ جس کا نام فکر ہے تو عقلی شعور بھی بے شعور اور ناقابل اعتنا ہو جاتا ہے' چنانچہ ایسے قلوب کے جو بے فکرے ہوں، قرآن نے انھیں عاقل نہیں کہا غافل کہا ہے' جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحْیٖ بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔

"اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور امید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے' پھر اسی سے زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے' ان میں سے ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں"۔

اس آیت کریمہ سے نمایاں ہے کہ برق و بخار اور بارش سے احیاء غبار (زمین) وغیرہ باوجود یہ کہ آنکھوں سے نظر آنے کی چیزیں ہیں جنہیں سب دیکھتے ہیں حتیٰ کہ چرند و پرند بھی اور ان سے اس دنیوی زندگی کے بارے میں کچھ نہ کچھ خوف و طمع کا اثر بھی لیتے ہیں' لیکن فرمایا یہ گیا ہے کہ ان حوادث میں قدرت کی نشانیاں پنہاں ہیں اور ان ہی کی پہچان کرانا مقصود بھی ہے۔ وہ صرف عقل لڑانے والوں ہی کے لئے ہیں' آنکھ لڑانے والوں کے لئے نہیں اور عقل لڑانے کا نام ہی فکر کا استعمال ہے جو عقل کو کام پر لگاتا ہے' بے فکری اور بے توجہی سے عقلی تگ و تاز بھی عبث اور بے نتیجہ رہ جاتی ہے' بہرحال حس ہو یا عقل' ذوق ہو یا وجدان بلا فکر کے نابینا اور بے نگاہ سمجھے گئے ہیں جس سے فکر کا بلند مقام کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

قرآن حکیم کی انسان کو فکر و تدبر کی دعوت اور اس کا انداز

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جگہ جگہ مختلف دائروں میں انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دی ہے کہیں غور و فکر کے لئے انفسی آیات' کہیں شرعی اور علمی آیات سامنے رکھی ہیں اور کہیں وجدانی اور لدنی آیات اور ان میں تدبر اور غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے ___ انفسی آیات کی طرف رہنمائی کے لئے فرمایا:

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (ذریات پ۲۶ آیت ۲۱)

"تمہارے اندر (خود دلائل معرفت) موجود ہیں کیا تم غور نہیں کرو گے؟"۔

کہیں آفاقی آیات پیش کیں جیسے

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِیْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (اعراف پ۹ آیت ۱۸۵)

"کیاوہ آسمانوں اور زمین کے حقائق میں نظر (و فکر) نہیں کرتے؟"

کہیں ان دونوں نوعوں کو جمع کر کے فرمایا:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (حٰم سجدہ پ۲۵ آیت ۵۳)

"ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گردونواح میں بھی دکھادیں گے اور خود انکی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے"۔

کہیں شرعی آیات پیش کیں اور قرآن حکیم کو غور و تدبر کے لئے پیش کیا:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (نساء پ۵ آیت ۸۲)

"کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے"۔

کہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی حیات طیبہ کی شانوں اور پاکیزہ سیرت و کردار میں غور کرنے کی طرف توجہ دلائی ___ تاکہ اس سیرت پاک کو دیکھ کر آپ کی دعوت کی صداقت دلوں میں آجائے اور لوگ اسے ماننے کے لئے تیار ہو جائیں، فرمایا:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَیْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۔ (سبا پ۲۲ آیت ۴۶)

"آپ فرمادیں اے پیغمبر کہ میں تمہیں ایک ہی بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم دو دو اور فُرادیٰ فُرادیٰ اٹھو اور پھر فکر کرو کہ کیا واقعی تمہارے ان ساتھی (پیغمبر) میں کوئی دیوانگی یا جنون ہے؟ وہ تو اس کی سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ تمہیں آخرت کے شدید عذاب سے ڈرانے والے ہیں جو تمہارے سامنے آنے والا ہے"۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (اعراف پ۹ آیت ۱۸۴)

"کیا یہ فکر سے کام نہیں لیتے اپنے ساتھی (پیغمبر) کے بارے میں کہ کیا ان میں جنون ہے؟ وہ نہیں ہیں مگر ایک کھلے ہوئے ڈرانے والے آخرت کے عذاب سے کیا یہ کسی مجنون کا کام ہے؟"۔

یہی صورت وجدانیات کی بھی ہے کہ حقائق غیبیہ کے انکشاف میں بھی یہی قلبی فکر کام کرتا ہے جس کو "لب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس سے ___ منکشف شدہ علوم و معارف کو حکمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا کہ:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (بقرہ پ۳ آیت ۲۶۹)

"جسے حکمت دے دی گئی اسے خیر کثیر عطا کر دی گئی اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو گہری عقل والے ہیں"۔

حاصل کلام

حاصل یہ ہے کہ مطلقاً عقل ایک طبعی غریزہ اور طبعی مادہ ہے' جیسے بینائی اور شنوائی وغیرہ' مگر وہ صورت عقل ہے جو مادۂ شعور ہے اور زیادہ سے زیادہ قیاس کے راستے سے کلیات کا ادراک کر لیتا ہے لیکن لب اور لباب حقیقت عقل ہے جس سے حقائق کونیہ اور حقائق شرعیہ منکشف ہوتی ہیں۔ اسی کا نام فکر ہے' یہ حکمت جسے خیر کثیر کہا گیا ہے۔ محض عقل طبعی سے برآمد نہیں ہوتی' بلکہ عقل عرفانی سے منکشف ہوتی ہے جسے لب کہا گیا ہے۔

بہرحال قرآن حکیم نے اس خاص قوت فکر کو جس کا تعلق قوانین الٰہی' معرفت خداوندی' حقائق نبوت اور اس کے ایوان کے انکشاف سے ہے جسے **صبغت اللہ** کہا گیا ہے۔ اسی کو کہیں فقہ قلبی سے' کہیں لب (عرفانی) کہیں نظر (باطن) سے' کہیں بصیرت سے اور **انصباغ من اللہ** سے تعبیر کیا گیا ہے جو انسان کی ساری قوتوں' حواس عقل' وجدان عقل اور حدس و تجربے کو کام میں لگاتا ہے اور یہ صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

بہرحال قرآن حکیم نے فکر کو انسان کا بنیادی جوہر قرار دے کر اس کا مصرف انفس و آفاق تشریع و تکوین اور کمالات ذات وصفات نبوی اور معرفت الٰہی کو بتلایا ہے اور جگہ جگہ اسی کی دعوت دی ہے اور ظاہر ہے کہ فکر و تدبر چشم بینا اور گوش شنوا کا کام نہیں' بلکہ قلب متفکر ہی کا کام ہے اور فکر ہی جب ان اعضاء حواس وغیرہ کا امام بنتا ہے تو وہ اس کی اقتداء میں اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور پھر فکر ان میں سے اصولی' کلی اور علمی مقاصد تک پہنچ کر معرفت حق کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ کہ فکر ہی انسان کی امتیازی صفت ہے۔ فکر ہی انسانی حقیقت کی فصل ممیز ہے' فکر ہی سے علم و معرفت کے دروازے کھلتے ہیں' فکر ہی انسان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کا امام اور سربراہ ہے۔ اگر فکر اسلام میں مطلوب نہ ہوتا تو اجتہاد کا دروازہ کلیۃً مسدود ہو جاتا اور شرائع فرعیہ امت کے سامنے نہ آسکتیں ــــ یہ بحث الگ ہے کہ کس درجہ کا اجتہاد باقی ہے اور کس درجہ کا ختم ہو چکا ہے۔ مگر اجتہاد کی جنس بہرحال امت میں قائم رکھی گئی ہے جو برابر قائم رہے گی' اس لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اگر اس بنیادی اصول بلکہ اصل الاصول کی طرف ہندوستان کے علمی حلقوں کی توجہ دلائی اور دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید کی دعوت دی اور ارباب علم و فضل کو انسانی اور ربانی حقائق کے انکشافات کی طرف متوجہ کیا تو نہ صرف یہ کہ اس نے ایک بڑا بنیادی مسئلہ اٹھایا ہے' بلکہ خود جامعہ کی تاریخ کو بھی دہرایا ہے' کیونکہ جامعہ کی بنیاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے رکھی تھی جس کا نصب العین ہی قدیم وجدید تعلیم کو یکجا کر کے ملت کی مختلف صلاحیتوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا تھا تاکہ فکر واحد کے راستے سے قوم کے ان دو گروہوں میں قدیم وجدید کی دوئی ختم کر کے انہیں افکار و خیالات اور عقائد و مقاصد کی وحدت سے قوم واحد بنا دیا جائے اس لئے بلاشبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس اقدام میں تبریک و تحسین کی مستحق ہے لیکن اس نئی **نہضت** اور فکر اسلامی کی تشکیل نو کے جذبات سامنے آنے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فکر کا علمی آغاز کس مرکزی نقطہ سے کیا جائے جس میں یہ تمام مذکورہ انواع جن کے لئے قرآن حکیم نے دعوت دی ہے سمٹ کر اسی مرکزی نقطہ کے نیچے جمع ہو جائیں اور کام بجائے پھیلنے کے سمٹ کر اس بنیادی نقطہ سے شروع ہو۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا مرکزی نقطۂ منہاج نبوّت

اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے تفکر کے لئے سب سے پہلا فکر ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہیے جس پر اپنے فکر کی توانائیاں صرف کریں اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آجائے گا بلکہ تشتت افزا اوہام وخیالات بھی خود بخود اس سے دفع ہوتے چلے جائیں گے اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کی مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے جس کا نام منہاج نبوت ہے۔ جس پر فکر کو مرکوز کر دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھی ہے اور ظلمتوں میں اجالا پھیلتا چلا گیا ہے۔ پس اس منہاج سے آج بھی آگے بڑھ سکتی ہے اس منہاج نبوّت کو سامنے رکھ کر ہمارے سامنے وہ مزاج آجائے گا جو اس امت میں نبی امت نے پیدا فرمایا ہے اور یہ واضح ہو جائے گا کہ خود اسلام کی تشکیل کا آغاز کس نوعیت سے ہوا کہ ہم اس کی فکر جدید کا آغاز بھی اس نوعیت سے کریں' نیز یہ بھی سامنے آجائے گا کہ اس کے ابتدائی مراحل سے گزر کر اور آخر کار اپنی انتہائی منزل پر پہنچ کر بحیثیت مجموعی اس امت کا مزاج کیسا بنایا؟ اور اسے کس ذوق پر ڈھالا۔

منہاجِ نبوّت کا امّت کے مزاج اور ذوق کی تعمیر پر اثر

غور کیا جائے تو اس منہاج نبوت نے اصولی طور پر ہمیں دین کے بارے میں کمال اعتدال اور توسط کا راستہ دکھایا ہے۔ نہ تو اس نے ہمیں رہبانیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم عبادت اور دین داری کے نام پر دنیا کو کلیۃً ترک کر کے زاویہ نشیں ہو جائیں۔ شہری آبادیوں تمدنی معاملات اور مدنیت کے سارے تقاضوں بلکہ خود اپنے سارے طبعی جذبات و میلانات کو بھی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں جا بیٹھیں کہ نہ گھر ہو نہ در' نہ معاشرہ ہو نہ معیشت نہ انسانی روابط ہوں نہ قومی تعلقات' نہ موانست باہمی ہو نہ اجتماعیت کہ یہ نہ اسلام کا مزاج ہے نہ اس کا مطالبہ اور نہ ہی فطرت کا تقاضا۔ اس لئے اسلام نے اس کا نام رہبانیت رکھ کر اس کی برملا نفی کی ہے کہ **لارھبانیۃ فی الاسلام** ۔

"اسلام میں رہبانیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں"۔

اور نہ ہی ہمیں بہیمیت کے راستے پر ڈالا ہے کہ ہم مدنیت کے نام پر عبادت الٰہی اور طاعت نبویؐ سے بیگانہ ہو کر کلیۃً نظام دنیا سنوارنے' جاہ ومال کے خزانے بٹورنے میں لگ جائیں اور راحت طلبی اور عیش کوشی میں غرق ہو جائیں اور ہماری زندگی کا نصب العین ہی ہوس رانی' حظ اندوزی اور ہوائے نفس کی غلامی کے سوا دوسرا نہ ہو' نہ عقائد رہیں نہ عبادات' نہ فرائض رہیں نہ سُنن' نہ واجبات ہوں نہ ان کی لگن نہ قومی تربیت کا داعیہ رہے نہ صلہ رحمی اور خیر خواہی اور نہ اولاد واقارب کا جذبہ' بلکہ دن رات ہوائے نفس کی پیروی' شبانہ روز لہو ولعب' عیش وطرب' آسائش اور نمائش وزیبائش' مالی تکاثر اور جاہی تفاخر ہی زندگی کا مشغلہ بن کر رہ جائے' سواسے بھی اسلام نے نمائشی زندگی' متاع اور غفلت یا با لفاظ مختصر بہیمیت کہہ کر اسے امت کے قومی مزاج سے خارج کر دیا ہے ___ فرمایا: (حدید پ۲۷ آیت)

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۝ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ۝ ذَرْهُمْ (ذرہم پ۱۴ آیت) يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ

بعلمون -

"اور دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا ہے یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں ـــــ اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں اور آپ ان کو (ان کے حال پر) رہنے دیجئے کہ وہ کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے"۔

بلکہ اس افراط و تفریط سے الگ کر کے دنیا کو ترک کرانے کی بجائے اس کی لگن کو ترک کرایا ہے اور دین کو اصل رکھنے کے ساتھ اس میں غلو اور مبالغے سے روکا ہے۔ یعنی ایک ایسا جامع فکر دیا ہے۔ جس میں دنیا کے شعبوں کو زیر استعمال رکھ کر ان ہی میں سے آخرت پیدا کی ہے' چنانچہ دنیا کو کھیتی بتلایا اور آخرت کو اس کا پھل۔

الدنیا مزرعة الاٰخرة۔

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔

حاصل یہ نکلا کہ اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی بھی اتنی ہی ضروری ہے' اسلام کے ہر حکم میں جہاں اجر آخرت ہے وہیں حظ دنیا بھی شامل ہے۔ مثلاً اگر مسواک میں ثواب آخرت ہے تو وہیں منہ کی خوشبو بھی پیش نظر ہے۔ اگر طیبات رزق میں بہ نیت حسن عبادت کی قوت رکھی گئی ہے وہیں کام ودہن کے ذائقے سے بھی اجتناب نہیں بتلایا گیا ہے۔

اگر لباس میں بہ نیت آخرت اور غیرت حیا اور ستر عورت کا تحفظ اصل ہے تو وہیں حسن دنیوی اور وقار بھی ملحوظ ہے۔ اگر ازار کو ٹخنوں سے نیچا اور زمین سے گھسٹتا ہوا رکھنے کی ممانعت سے کبر و نخوت اور جاہ پسندی کی تخیل سے بچایا ہے تو وہیں لباس کو آلودگی اور گندگی سے پاک اور صاف رکھنے کی صورت اختیار کی گئی ہے جو دنیاوی مفاد ہے۔ اگر تخت شاہی کا اصل مقصد عدل کے ساتھ تحفظ ملک' خدمت خلق اور قومی تربیت بجوابدہی آخرت اصل ہے تو ہیں اسے دنیوی وقار و عزت اور سیادت و قیادت کے حظوظ سے بھی بھرپور کیا گیا ہے بہرحال آخرت کی سچی طلب کے ساتھ دنیا کا کسب و اکتساب بھی لازمی رکھا گیا ہے۔ صائب نے اس ذوق کو کس خوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا ۔

فکر دنیا کن اندیشہ عقبیٰ مگذار
تا بعقبی نہ رسی دامن دنیا مگذار

غرض منہاج نبوّت نے رہبانیت اور بہیمیت کے درمیان معتدل مزاج پر اس امت کو ڈھالا ہے' جس میں طبعی جذبات بھی پامال نہ ہوں بلکہ ٹھکانے لگ جائیں اور عقلی مقاصد کی تکمیل میں بھی فرق نہ پڑے اور وہ بروئے کار آجائیں' اس لئے اس منہاج کے عناصر ترکیبی تہذیب نفس' تدبیر منزل' سیاست مدن' تسخیر اقالیم' تعظیم امر اللہ' شفقت علی خلق اللہ' نظام اجتماعیت' جماعتی تنظیم و مرکزیت' اخلاق و ایثار کی منظم تربیت' نظام عبادت اور نظام امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اس کے ساتھ فکر آخرت اور محاسبہ اخروی کا استحضار قرار پائے اور پوری قوم کو اسی رنگ میں رنگا گیا ہے تاکہ یہ قوم جامع دین و دنیا بن کر بجائے اس کے کہ دنیا کی اقوام کی جامد' مقلد اور مقتدی بنے' اسے خود دار بنا کر اقوام اور داعی حق و صداقت کی حیثیت دی گئی ۔

جس طرح احمد مختار ہیں نبیوں میں امام
ان کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

تشکیل جدید میں آج کی ضرورت

پس آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس منہاج نبوت کو سمجھ کر فکر اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب بیان سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں اسلامی فکر کی یہی تشکیل جدید ہوگی' ورنہ اس منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہو گئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی جو قلب موضوع ہوگا' اس لئے تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید تاکہ یہ تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الٰہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم ہے یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔

فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط کی پابندی کی اہمیت

اس تشکیل جدید کے سلسلے میں دوسرا قدم وہ اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاج نبوت کے تمام عقائد واحکام واخلاق وعبادات اور معاملات واجتماعیات وغیرہ آئے ہیں' تاکہ ہماری تشکیل جدید کا سرچشمہ وہی اصول ہوں جن سے مسائل کی تشکیل قدیم عمل میں آئی تھی اور اس طرح قدیم وجدید تشکیل میں کوئی تفاوت یا بعد اور بیگانگی رونما نہ ہوگی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اصول کلیہ سے ہٹ کر یا انہیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی۔

اگر ایک شخص سائنس کے فکر کو مرتب یا حل کرنے کے لئے فن طب کے اصول سے کام لینے لگے جن کا سائنس کے اصول مسلمہ اور علوم متعارفہ سے کوئی تعلق نہ ہو یا منطق وفلسفہ کی فکر کی تشکیل کے لئے صرف ونحو کے اصول سے کام لینے لگے تو وہ کبھی اس تشکیل میں کامیاب نہ ہو سکے گا' اس لئے سب سے پہلے اسلامی فکر کی تدوین وترتیب میں اسلامی فکر کے اساسی اصول ہی کو سامنے رکھنا پڑے گا تاکہ ہماری تشکیل سے وہ ذوق فوت نہ ہونے پائے جو ان اساسی اصول میں پیوست کیا گیا ہے اور انہی سے شریعت کے قواعد ومقاصد تک پہنچا ہوا ہے یہ اصول وقواعد ہی درحقیقت منہاج نبوت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں' جس کا اثر قانون شریعت میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر تشکیل جدید میں یہ قواعد وضوابط نہ رہیں تو وہ اسلامی فکر کی تشکیل نہ ہوگی صرف دماغی فکر کی تشکیل بن جائے گی۔

اصول وضوابط کے ساتھ جزئیات کے تعین کا مسئلہ

البتہ ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود متعین کر دی ہیں' اس لئے ان میں تغیر وتبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ معاملاتی' معاشرتی اور سیاسی واجتماعی امور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے ادلتے بدلتے رہتے ہیں' اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کی ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے جن میں اصول وقواعد کے تحت توسعات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے' البتہ ایسے

تغیرات کو چونکہ قواعد کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے۔ اس لئے ان میں بہرحال فنی استخراج کی ضرورت پڑے گی' جسے مبصر علماء کی بصیرت ہی حل کر سکے گی۔ جیسا کہ قرونِ ماضیہ میں کرتی رہی ہے۔ بس ایک مجتہد کو اجتہاد کی تو اجازت ہے ایجاد کی نہیں ہے کہ وہ اتباع کے دائرے سے باہر نہ نکل سکے' خواہ یہ اتباع جزئیات کا ہو جبکہ وہ منصوص ہوں یا قواعد کلیہ کا ہو جب کہ وہ اجتہادی ہوں۔ جزئیات میں در حقیقت اتباع ان اصول اجتہادی کا ہوتا ہے جس کے ذریعے یہ جزئیات باہر آتی ہیں۔ اس لئے اس تشکیل جدید کے موقع پر یہ کلیات و جزئیات سامنے رکھنی ناگزیر ہوں گی اور انہی کے دائرے میں رہ کر یہ جدید تشکیل و ترتیب عمل میں آسکے گی' نیز اگر اس تشکیل کا مقصد قومی تربیت ہے کہ افراد اس منہاج پر ڈھالے جائیں تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تربیت اصول اور کلیات سے نہیں ہو سکتی جیسے علاج اصول طب اور معرفت خواص ادویہ سے نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ مزاج کے جزوی احوال کو پہچان کر جزوی طور پر نسخہ نہ تجویز کیا جائے' یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ اگر قومی معالجہ اور قومی اصلاح پیش نظر ہو تو وہ محض اصول کلیہ سے نہیں ہو سکتی' بلکہ جزئیات عمل ہی سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اصولوں کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو وہ محض ذہن کی زینت ہوں عملی زندگی سے انہیں کوئی تعلق نہ ہو اور کوئی عملی پروگرام بھی ان کے پیچھے نہ ہو تو شریعت نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان میں زیادہ غور و خوض کیا جائے۔ مثلاً چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو قرآن نے اسلوب حکیم پر جواب دیا کہ اس کے منافع سے فائدہ اٹھاؤ ان کے حقائق کے پیچھے مت پڑو :

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ (بقرہ پ۲ آیت ۱۸۹)

"آپ سے چاندوں کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ آلۂ شناختِ اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے"۔

روح کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا دیا گیا کہ تمہارا علم اتنا نہیں ہے کہ ان حقائق کو پہچان سکو تو کیوں اس ناقابل تحمل بات کے پیچھے پڑتے ہو۔ یہ حقائق یا خود ہی عملی ریاضت سے منکشف ہو جائیں گی یا اگر نہ ہوں تو قیامت میں تم سے ان کا کوئی سوال نہ ہو گا کہ نجات ان پر موقوف نہیں تھی۔

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل پ۱۵ آیت ۸۵)

"آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے"۔

یا اس طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرما دیا گیا کہ تمہیں اس سے کیا تعلق تمہاری ترقی اور سعادت اس کے مقررہ وقت کے علم پر موقوف نہیں' صرف اس کے آنے کے یقین اور عقیدے پر موقوف ہے اور اس میں یہ جزوی تفصیلات شامل نہیں۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا ۝ (نازعات پ۳۰ آیت ۴۲ تا ۴۴)

"یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہو گا' سو اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق اس (کے علم تعیین) کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے"۔

بہرحال قرآنی رہنمائی سے علم وہی مطلوب ___ اور قابل تحصیل ہے جس سے عملی زندگی میں کوئی سدھار پیدا ہوتا ہو اور سعادت دارین حاصل ہوتی ہو۔ حاصل یہ ہے کہ عملی زندگی محض اصول سے نہیں بنتی

بلکہ جزئیات عملی ہی سے بنتی ہے۔ جس کی بروقت تمرین اور ٹریننگ دی جائے' اسی لئے کسی مربی نفس ربانی کی ضرورت ہے' ربانی کی تفسیر ابن عباسؓ نے **الذی یربی الناس بصغار العلم ثم بکبارھا** سے کی ہے۔ یعنی ربانی وہ ہے جو ابتداءً چھوٹی چھوٹی جزئیات سے لوگوں کی تربیت کرے اس لئے قرآن کریم نے تذکیر مواعظ اور امر بالمعروف کے نظام کو اجتماعی طور پر مستحکم کیا اور اسے تمکین فی الارض (حکومت و سلطنت) کی بنیادی غرض وغایت ٹھہرایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس منہاج پر ہم اپنی فکر کی توانائی صرف کریں وہ جہاں اصولی ہو وہیں وہ جزئیات عمل سے بھی بھرپور ہو تاکہ علم اور عمل دونوں جمع ہو سکیں کہ اس کے بغیر ہماری فکر اور اس کی تشکیل پایہء تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

حاصل مطلب

حاصل یہی ہوا کہ فکر اسلامی کی ترتیب کے وقت جیسے اسلامی بنیادوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے ایسے ہی فقہ اور فقہی جزئیات کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ البتہ مناسب اور آج کے دور کے نفسیات کو سامنے رکھ کر ان جزئیات میں ترجیح وانتخاب جداگانہ ہے۔ وہ اہل علم کا کام ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اصول کا تعارف اور انکی جامعیت' وسعت نیز ان کے اندرونی مضمرات کی وضاحت ان کی جزئیات کے بغیر ممکن نہیں' نظری اصول کتنے بھی معقول اور دلپذیر ہوں لیکن جب تک ان کی عملی مثالیں سامنے نہ ہوں' ان کا حقیقی مفہوم وانکشاف نہیں ہو سکتا ان جزئیات عمل ہی سے اسلام کی مجموعی اور صحیح صورت وشکل سامنے آسکتی ہے اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید میں جہاں ایک طرف مجموعہ دین کے اساسی اصول اور ان کے نیچے ہر ہر باب کے قواعد کلیہ یا ضوابط تفقہ ناگزیز ہیں وہیں دوسری طرف ان کے نیچے کی عملی جزئیات کا سامنے ہونا بھی لازمی ہے۔ ورنہ اصول کی وسعت وجامعیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔

فقہاء متقدمین کے استخراج جزئیات کی افادیت

اس سے ہی ان حوادث' واقعات پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے جو ان جزئیات کے استخراج کا باعث بنے جب کہ فقہاء امت نے قواعد شرعیہ سامنے رکھ کر ان کے بعید سے بعید **محتملات** کے احکام بھی ان قواعد سے نکالے' ظاہر ہے کہ ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانی ہوتی ہے گو حادثوں کی شکلیں حسب زمان ومکان کچھ جدا جدا بھی ہوں' اس لئے وہی جزئیات آج کے حوادث میں بھی بیکار ثابت نہیں ہو سکتیں اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس تو ضروری ہی کیا جاسکتا ہے' بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں سابق دور کی طرح کارآمد ثابت ہوں اور حالات کا پورا مقابلہ کر سکیں' ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش وجستجو کی ہوگی۔ بلکہ یہ جزئیات چونکہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہے اس لئے یہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاج نبوت سے زیادہ قریب ہوں گی' اس لئے بجائے اسکے کہ ہم از سر نو قواعد کلیہ سے جزئیات کا استنباط کرنے کی مشقت میں پڑیں یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش اور ترتیب میں وہ محنت ومشقت استعمال کریں پھر بھی اگر مفتی کو نئے استخراج ہی کی ضرورت داعی ہو تو جزئیات سابقہ ہی اس کا راستہ بہتر طریق پر ہموار کر سکیں گی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ جب یہ فقہی جزئیات کا ذخیرہ اصول سے جڑا ہوا سامنے آئے تو شاید ہمیں کسی نئے جزئیہ کے استخراج کی ضرورت

ہی نہ پیش آئے کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ فقہاء امت نے اصول تفقہ اور قواعد شرعیہ کی روشنی میں بعید سے بعید **محتملات** تک کے احکام **مستنبط** کر کے جمع کر دیئے ہیں جس کے مجموعہ سے ایک مستقل فن بنام فقہ تیار ہو گیا۔ جس میں ہر شعبہ زندگی کی بے شمار جزئیات موجود ہیں۔

اس لئے فکر جدید کی تشکیل میں قواعد کلیہ کے ساتھ ان جزئیات کو سامنے رکھنا ازبس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ کو بھی کسی مرعوبیت یا اقوام کے طعن واستہزاء کی وجہ سے کبھی ترک کرنا گوارہ نہیں کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایک بار بغداد (عراق) میں کھانا تناول فرمارہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھانا کھلا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اسے فوراً اٹھا کر اس کی گرد جھاڑی صاف کیا اور تناول فرمالیا۔ غلام نے عرض کیا کہ یہ ملک متمدنوں دولتمندوں اور سیر چشموں کا ہے وہ اس حرکت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے فرمایا :

اأترک سنة حبیبی لهولاء الحمقاء۔

کیا میں اپنے حبیب پاکؐ کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں؟ غور کیا جائے کہ ایک طرف تو دین کے ایک ایک جزیہ کی پابندی اور دوسری طرف ملکوں کی فتوحات' خلافت کی توسیع اور تسخیر اقالیم اور اس کے ساتھ متکبروں کا تمسخر وطعن' لیکن جو نشہ ان پاک ارواح میں فیضان نبوّت سے پیوست تھا وہ اس قسم کے عوارض سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ آخر صحابہؓ سے زیادہ کون سنن دین کی جزوی جزوی پابندی میں پیش قدم تھا۔ مگران سے زیادہ پھر کون اسلامی فتوحات میں تیز قدم تھا' جس سے ایک تو یہ واضح ہے کہ وقتی احوال وحوادث کے پیش نظر توسع اور ہمہ گیری کے معنی ذہنی ڈھیلے پن کے نہیں کہ قوموں کی رضاجوئی یا مجبوری یا آجکل کی اصطلاحی رواداری کے تحت اسلامی جزئیات میں مداہنت کی جاسکے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسلام نے اصول اس درجہ وسیع اور لچک دار رکھے ہیں کہ حوادث ان سے باہر نہیں جاسکتے' جس کے معنی یہ ہیں کہ دین اپنے خاص مزاج اور اساسی پالیسی کے تحت نہ حوادث میں کبھی تہی دامن ثابت ہوا اور نہ اس نے کہیں اپنے اندر خلا محسوس کر کے سپر ڈالی۔ دوسری یہ بات بھی اس واقعے سے اور اس جیسے ہزاروں واقعات سے نمایاں ہے کہ اسلام روکھی اور سطحی قسم کا کوئی رسمی قانون نہیں بلکہ دین ہے۔ جس کی اساس کا بنیادی عنصر عشق ومحبت ہے' جو ذات حق' ذات نبوی اور ذات صحابہؓ سے وابستہ ہے' اس لئے ایک سچا عاشق اپنے محبوب کی کسی ادا کو ایک آن کے لئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا' جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے یہاں "حبیبی" کا لفظ استعمال فرما کر اس محبت کی طرف اشارہ فرمادیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی جزئیہ کے ترک کرنے میں کوئی قانونی گنجائش بھی نکلتی ہو تو قانون عشق میں ایسی گنجائش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلامی مزاج میں یہ عشقی کیفیات بھی اسی طرح گھلی ہوئی ہیں جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے' جو ایک راسخ العقیدہ مسلم کو ہر ہر جزیہ کا پابند کئے رہتی ہیں اور اس سے ایک انچ بھی نہیں ٹل سکتا' اس لئے تشکیل نو کے وقت اسلام کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام میں آزادئ ضمیر اور حریّت رائے کی حدود

لیکن اس انتہائی پابندی اور قید وبند کے ساتھ ہی آزادی ضمیر اور حریت رائے بھی پوری فراخی کے ساتھ اسلام نے قوم کو بخشی ہے کہ ایک عام سے عام آدمی بھی اس قانون حق کے معیار سے مسلمانوں کے بڑے بڑے سربراہ پر روک ٹوک عائد کر سکتا ہے اور اسے عوام کی تنقید کو ماننے سے چارہ کار نہیں ہوتا' اس کے لئے

سب سے بڑی نظیر نماز کی جماعت ہے جس کا نام امامت صغریٰ ہے' جو کلیۃً امامت کبریٰ یعنی امامتِ خلافت پر منطبق ہے' وہاں اگر امام اور امیر ہے تو یہاں بھی امام ہے۔ وہاں اگر جہاد میں ہر نقل و حرکت پر نعرہ تکبیر ہے تو یہاں بھی ہے' وہاں اگر امام کے حق میں سمع وطاعت فرض ہے تو یہاں بھی ہے۔ وہاں اگر مجاہدین کی صفیں مرتب اور سیدھی ہونی ضروری ہیں تو یہاں بھی یہی ہے' وہاں اگر میمنہ اور میسرہ ہے تو یہاں بھی ہے' وہاں اگر صفوف میں شگاف آجانا ناکامی کی علامت ہے تو یہاں بھی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس لئے امامت صغریٰ (جماعت صلوٰۃ) کے جو طور طریق رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامت کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں' اس صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کے مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو اس کی نماز ہی صحیح نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کر کے ہاتھ باندھیں' وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں' وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں' وہ سجدہ میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہو جائیں۔ وہ ولا الضالین کہے تو یہ آمین کہیں' حتیٰ کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزوی غلطی بھی ہو جائے اور وہ سجدہ سہو کرے تو مقتدی بھی اس کی اس فکری خطا میں ساتھ دیں اور سجدہ سہو کریں۔

لیکن حریت و آزادی یہ ہے کہ اگر امام قرأت یا افعال صلوٰۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کر جائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کر لے یا قرأت صحیح نہ کرے یا کسی رکن میں غلطی ہو جائے اور اسے درست نہ کر لے' چنانچہ امام کی غلطی پر ہر ایک مقتدی پیچھے سے تکبیر و تسبیح کی آوازوں سے اس طرح متنبہ کرتا ہے اور کرنے کا حق رکھتا ہے کہ امام غلطی کی اصلاح پر مجبور ہو جائے۔

بعینہ یہی صورت امامت کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیر المومنین کی سمع وطاعت تو ہر معاملے میں واجب ہے ورنہ تعزیر و سزا کا مستحق ہو گا۔ لیکن ساتھ ہی خود امیر کی کسی خطاء و لغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی برملا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے' جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کر لے یا اس کا کوئی عذر سامنے نہ رکھے۔

فاروق اعظمؓ پر ایک اعرابی نے اس وقت اعتراض کیا جب کہ وہ بحیثیت امیر المومنین ممبر پر کھڑے ہو کر خطبے میں اعلان فرما رہے تھے' ''لوگو! امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو۔'' اعرابی نے کہا کہ ہم نہ بات سنیں گے نہ اطاعت کریں گے۔ فرمایا کیوں؟ کہا مال غنیمت میں آپ کا حصہ عام لوگوں کی طرح صرف ایک چادر تھی' حالانکہ آپ کے بدن پر اس وقت دو چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ فرمایا اس کا جواب میرا بیٹا (عبد اللہ بن عمر) دے گا' صاحبزادے نے فرمایا کہ امیر المومنین کا قد لانبا تھا' ایک چادر کافی نہ تھی اس لئے میں نے اپنی چادر پیش کر دی' وہی ان کے بدن پر ہے جو انہوں نے آج استعمال کی ہے' تب اعرابی نے کہا کہ اب ہم بات سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے ___ بہرحال منہاج نبوت کی مزاج کی رو سے عمل میں تو یہ تقیید اور پابندی ہے کہ اس کے کسی کلیہ جزئیہ میں ڈھیلا پن گوارا نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ ایک عامی آدمی کو بھی امیر المومنین تک پر کسی محسوس قسم کی فروگزاشت کے بارے میں اعتراض کا حق دیا گیا۔ لیکن حریت رائے اور اصول کے تحت آزادی بھی انتہائی ہے جو حقیقی قسم کی جمہوریت کی پردہ دار ہے' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصول و قوانین کی یہ پابندی اور ان میں زندگی کو مقید کر دینا کوئی قید و بند نہیں جو ذہنوں پر شاق ہو' جب کہ ان ہی اصولوں کی پابندی سے اسلام اور اسلامی قوم عالمگیر بنی۔

اسلام اور اسلامی اصول کی عالمگیری پر واقعاتی حقیقت کے شواہد

آخر جب ہم اسلام کے حق میں ایک عالمگیر دین کے مدعی ہیں تو اس ہمہ گیری کے معنی ان کے انہی اصولوں کی ہمہ گیری کے تو ہیں' اگر وہ تنگ اور جامد ہوتے تو اسلام عالمگیر تو کیا عرب گیر بھی نہ ہو سکتا' لیکن جب انہی اصول پر صدیوں ہمہ گیر حکومتیں بھی چلیں اور انہی اصول سے تربیت پاکر قوم میں عظیم عظیم شخصیتیں بھی ابھریں جنہوں نے مشرق و مغرب کو روشنی دکھائی اور ظلمتوں کی تنگنائیوں میں پھنسی ہوئی قوموں' نسلوں اور وطنوں کو ان کی مصنوعی حد بندیوں سے نکال کر انسانیت کے وسیع میدانوں میں پہنچایا تو کیا یہ اصول کی تنگیوں سے ممکن تھا ___ اس لئے فطری اصول اور فطرت کی پابندی کو قید و بند اور تنگی سمجھا جانا ذہنوں کی تنگی کی علامت ہو سکتا ہے۔ فطرت کی تنگی نہیں کہلایا جا سکتا ___ بالخصوص جب کہ ان اصولوں کی وسعتوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان سے ہر دور کے مفکر اور اہل علم و فضل نے استخراج مسائل کی حد تک بھی کام لیا ہے اور آج بھی لے سکتے ہیں ___ جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے ہدایت کا سامان موجود ہے۔

اس لئے تمدن و معاشرت کی **مشخص** عملی جزئیات اور سنن زائدہ پر اس قانون فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا' بلکہ اس کو وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے' ہر زمانے میں جو نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں انہیں اہل علم ان کے اصول سے وابستہ کر کے ان کے احکام نکال سکتے ہیں' جیسا کہ مفکران باب فتویٰ کا اسوہ اس بارے میں سامنے ہے ___ بالخصوص مسائل کے طرز استدلال کے بارے میں تو خاص طور پر ہر قرن جدید کے رنگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ایک دور میں نظری فلسفہ نے رنگ جمایا اور دین کے بارے میں محض نقل و روایت لوگوں کے لئے تسلی بخش نہ رہی جب تک وہ عقلی چولے میں نہ آئے تو رازیؒ و غزالیؒ جیسے حکمائے ملت نے دین کو فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے لوگوں پر حجت تمام کی' ایک دور میں تصوف اور حقائق پسندی کا غلبہ ہوا تو ابن عربیؒ وغیرہ نے صوفیانہ اور عارفانہ انداز سے اسلام کو نمایاں کیا۔ ایک دور میں معاشی فلسفہ کا زور ہوا تو شاہ ولی اللہؒ جیسے حکیم امت نے نظری و معاشی رنگ کے فلسفیانہ دلائل سے اسلام کو سمجھایا اور وقت کے مسائل حل کئے۔ ایک دور سائنسی اور مشاہداتی فلسفے کا آیا تو بانی دارالعلوم (دیوبند) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے محقق اور عارف باللہ نے اسلامی عقائد و اصول کو شواہداتی رنگ میں حسی شواہد و نظائر پیش کر کے اتمام حجت فرمادیا۔ جس سے ایک طرف اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت واضح ہوئی تو دوسری طرف اس کا توسع کھلا اور اس کے رنگ استدلال کی یہ لچک بھی واضح ہوئی کہ اس کے حقائق پر ہمہ نوع دلائل کا لباس سج جاتا ہے اور حقیقت بدستور حقیقت رہتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خود اس میں یہ سارے آلوان اور سارے نہج موجود ہیں جس سے ہر رنگ کا لباس زیب زدہ ثابت ہو جاتا ہے جو درحقیقت خود اس کا رنگ ہوتا ہے ___ البتہ حالات اور وقت کے تقاضے صرف اجاگر کر دیتے ہیں۔

دور جدید کی عملی و نظریاتی خصوصیات اور اسلامی قوت و شوکت

آج کا دور سیاسی اور معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستوں اور معاشی فلسفوں کے غلبہ کا ہے' مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو ___ ان حالات میں جب تک کسی دینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کے ساتھ پیش نہ کیا جائے عوام کے لئے قابل التفات نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ نہ ہو گا۔ بلکہ اسی کے اندر کا ہو گا' حالات متحرک ہوں گے

اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی پیکر اس تحریک سے نمایاں ہو کر اسلام ہی کی سیاست واجتماعیت کے اصول وقوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اس کی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں، جنہوں نے دین ودنیا کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود ونمود اسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب وسنت اور رفقہ فی الدین کے انوار شامل تھے، البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کے حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے لیکن ان کے عملی کارناموں سے کوئی سبق نہیں لیا اگر قوم اپنے نظریات قائم رکھ کر آج کے عملی میدان میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت وشوکت دکھلا سکتی تھی جو اب سے پہلے دکھلا چکی ہے اور دنیا اس کی تقلید پر مجبور ہوتی نہ کہ قصہ برعکس ہو جاتا۔

دور جدید میں دینی مزاج کے مطابق فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا واحد طریق عمل

بہر حال اس دور میں اس کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی اصول، اسلامی مزاج اور نبوت کا منہاج بجنسہٖ قائم رکھ کر جس میں دیانت وسیاست اور عبادت ومدنیت بیک وقت جمع ہے۔ وقت کے مسائل کو نئی تشکیل وترتیب سے نمایاں کر کے نئے حوادث میں قوم کی مشکلات کا حل پیش کیا جائے تو یہ وقت کے تقاضوں کی تکمیل ہوگی جبکہ اس میں فقیہ المزاج شخصیات، اسلامی اصول کی روشنی اور جزئیات عملیہ کی رعایت، اسلامی مزاج کی برقراری، سلف صالحین کا اسوہ، مرادات خداوندی کے ساتھ **تقید**، رضاء حق کی پاسداری، اجتماعی اصلاح وفلاح، اخروی نجات کا فکر وغیرہ کی حدود قائم رکھی جائیں گی تو بلاشبہ "فکر اسلامی تشکیل جدید" دینی ہی رنگ کے ساتھ منظر عام پر آجائے گی ___ مگر اسی کے ساتھ ان منتخب شخصیات میں جہاں اس دینی فکر اور **تفقہ** مزاجی کی ضرورت ہے۔ جس کی تفصیل عرض کی گئی، وہیں اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ وہ موجودہ دنیا کے مزاج اور روقت کو بھی پہچانتے ہوں۔ عصری حالات اور وقت کی ضروریات بھی ان کے سامنے ہوں، علوم عصریہ میں انہیں مہارت وحذاقت میسر ہو، دنیا کی عام رفتار اور آج کے ذہن کو بھی وہ سمجھے ہوئے ہوں اور اس میں ذی فہم اور ذی رائے بھی ہوں کیونکہ حالات ہی اصل محرک فتاویٰ ہیں۔ اگر یہ منتخب شخصیات شرعیات کی خوگر ہوں لیکن عصریات سے بے خبر ہوں یا برعکس معاملہ ہو تو فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں کٹھن مرحلہ ایسی جامع شخصیتوں کی فراہمی کا ہے جو شرعیات اور عصریات میں یکساں حذاقت ومہارت کی حامل ہوں، عموماً اور اکثر وبیشتر ماہرین شرعیات، عصریات سے کچھ نابلد اور موجودہ دنیا کی ذہنی رفتار اور اس کے گوناں گوں نظریات سے بے خبر ہیں اور ماہرین عصریات اکثر وبیشتر شرعیات سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار اگر تنہا ایک طبقے پر ڈال دیا جائے تو علماء کی حد تک بلاشبہ مسائل کی تشکیل قابل وثوق ہوگی لیکن ممکن ہے جدید طبقے کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی اور دوسری طرف ماہرین عصریات جبکہ عامۃً دینی مقاصد اور اسلام کے شرعی موقفوں کا زیادہ علم نہیں رکھتے اور قوم کے دینی مزاج سے کچھ بیگانہ بھی ہیں، اگر فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا بار محض انہی کے کندھوں پر ڈال دیا جائے تو حوادث کے حد تک وہ ماہرین شریعت کے اعتراضات کا ہدف بن جائے گی بہر دو صورت تشکیل جدید کا خاکہ ناتمام بلکہ ایک حد تک نقصان دہ ثابت ہوگا۔

ان حالات میں درمیانی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس تشکیل کے لئے دونوں طبقوں کے مفکرین کی

مشترک مگر مختصر اور جامع کمیٹی بنائی جائے جس میں یہ دونوں طبقے اسلام کے تمام تمدنی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں اپنے اپنے علوم کے دائرے میں غور وفکر اور باہمی بحث و تمحیص سے کسی فکرِ واحد پر پہنچنے کی سعی فرمائیں اور جامع فکروں کو کتاب و سنت اور فقہ کی روشنی میں مسائل کی تنقیح میں استعمال کریں تو وہ فکر یقیناً جامعیت لئے ہوئے ہوگا۔ جس میں دینی ذوق اور شرعی دستور بھی قائم رہے گا اور عصری حالات سے باہر بھی نہ ہوگا، نیز ایک طبقہ کا ہدف طعن وملامت نہ بن سکے گا اور مسائل کے بارے میں کوئی خلجان سدِ راہ نہ ہوگا۔

تشکیل جدید کرنے والے مفکرین کے لئے ایک امرِ لازم

البتہ مفکرین کو یہ ضرور پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ اسلام کوئی رسمی اور دنیوی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس میں دنیا کے ساتھ آخرت بھی لگی ہوئی ہے اور ہر عمل میں خواہ وہ فکری ہو یا عملی، جہاں انسان کی دنیوی زندگی میں شائستگی کی رعایت رکھی گئی ہے اور انہیں تنگی اور ضیق وحرج سے بچا کر ہمہ گیر سہولتیں دی گئی ہیں۔ وہیں رضاءِ خداوندی اور آخرت کی جوابدہی بھی ان پر عائد کی گئی ہے۔ اس لئے اسے محض دنیوی قوانین اور صرف معاشی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر حوادث کا آلۂ کار بھی نہیں بننے دیا گیا ہے، کیونکہ احوال ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور بدلتے رہیں گے، حال کے معنی ہی **ماحال فقد زال** کے ہیں (یعنی جو حال آیا وہ زائل بھی ہوگا) حال تو بدلنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے لیکن اصول فطرت بدلنے کے لئے نہیں لائے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ اٹل ہی رہیں گے البتہ ان شرعی اصولوں میں ایسی وسعتیں ضرور رکھی گئی ہیں کہ وہ ہر بدلتی ہوئی حالت میں وقت کے مناسب رہنمائی کر سکیں، اس لئے مفکر کا کام صرف اتنا ہی ہوگا کہ بدلے ہوئے حالات اور نئے حوادث کو سامنے رکھ کر ان جزئیات مسائل کو سامنے رکھ کر ان جزئیات مسائل کو سامنے لے آئے جو اس حادثہ کے بارے میں منہاجِ نبوت نے اصولاً یا جزءً وضع کئے ہیں اور ان پر منطبق کئے ہیں، پس مفکر، دانشور یا مبصر، مفتی کا کام حادثہ اور مسئلہ تبدیل کرنا نہیں بلکہ دونوں میں تطبیق دے دینا ہے۔ نہ حالات سے صرف نظر کرنا ہے نہ مسائل سے قطع نظر کر لینا ہے اس لئے شریعت نے تمدنی اور معاشرتی احوال کی حد تک زیادہ تر قواعد کلیہ ہی سامنے رکھے ہیں۔ نئی جزئی صورتوں کی تشخیص نہیں کی ہے کہ وہ ہر دور میں نئے نئے رنگ میں نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

سیاسی "ملل ونحل" کی تدوین کی ضرورت واہمیت

فی زمانہ اسلامی مسائل میں انتشار یا ان کے بارے میں شکوک و شبہات کی بوچھاڑ کا سرچشمہ سب جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب وتمدن اور اس سے زیادہ آج کے سیاسی نظریات دماغوں پر مذہب کے رنگ سے چھائے ہوئے ہیں۔ آج مسلک اور ازم بن رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی اور معاشی قوانین تیار ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی، حتیٰ کہ عقائد بھی بن رہے ہیں تو وہ بھی سیاسی اور معاشی، چنانچہ سیاسی نظریات کے بارے میں اصطلاح بھی ٹھہر گئی ہے جو مذہب اور دین کے بارے میں رائج تھی کہ ہم فلاں نظریہ پر یقین رکھتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایمان لاتے ہیں جو کسی دور میں دینی عقائد کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اس لئے آج ایک سیاسی "ملل ونحل" کی تدوین کی بھی اشد ضرورت ہے جس میں سیاسی مذاہب کے عقائد وافکار کو تقابلی رنگ سے سامنے رکھ کر اسلام کے اجتماعی مسائل کو دلائل کی روشنی میں پیش کیا جائے جس کے لئے چند مفکر عالم اور چند مفکر گریجویٹوں کی خدمات حاصل کی جائیں، کیونکہ قدیم زمانہ کے "ملل ونحل" اس دور کے

پیدا شدہ مذہبی عقائد اور افکار کے پیش نظر مرتب ہوئے تھے۔ جب کہ دلوں پر سیاست کے ٹھپے لگے ہوئے نہیں تھے اب عصر حاضر کے سیاسی عقائد و افکار کو سامنے رکھ کر اسلام کے سیاسی اجتماعی اور معاشرتی مسائل کو دلائل و شواہد سے سامنے لانے کی ضرورت ہے۔

خوشی ہے کہ جامعہ اسلامیہ نے آج جب فکر اسلامی کی تشکیل نو کا مسئلہ اٹھایا ہے تو ممکن ہے کہ سیمینار کے ثمرے کے طور پر اس سیاسی معاشرتی اور اجتماعی رنگ کی ''ملل و نحل'' کی مضبوط بنیاد بھی پڑ جائے۔ حدیث اور فقہی کتب میں معاشرتی تمدنی اور اجتمائی مسائل کی جو نوعیں ابواب و فصول کے ساتھ جن جن عنوانوں سے پائی جاتی ہیں وہ اپنی جامعیت اور اصولیت کی وجہ سے اپنے متعلقہ مسائل کی جزئیات پر کلیۃً حاوی ہیں اور ان میں فقہاء امت کے دل و دماغ کا نچوڑ سمایا ہوا ہے اس لئے اگر ان عنوانات کے تحت کام کیا جائے اور آج کے معاشرتی، سیاسی اور تمدنی مسائل کو تقابلی انداز سے سامنے رکھ کر علمی اور فکری سعی کا محور بنایا لیا جائے تو اس میں تمام وقتی مسائل بھی آجائیں گے اور دوسرے مہم مسائل بھی شامل ہو جانے کی وجہ سے ایک بہترین سیاسی ''ملل و نحل'' تیار ہو جائے گی جو جامعہ کا ایک یادگار کارنامہ ہو گا۔

اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی توقع رکھنی چاہئے کہ یہ سعی چند زبان زد مسائل مثلاً بینک کاری، اسٹاک ایکسچینج و سودی معاملات یا انشورنس وغیرہ وغیرہ جیسے مالی اور تجارتی مسائل تک ہی محدود نہ رکھی جائے گی۔ کیونکہ جب فکر اسلامی کے بارے میں قدم اٹھایا جا رہا ہے تو وہ بھرپور اٹھنا چاہئے جس میں اس قسم کے تمام مسائل کا ایک ہی بار فیصلہ کر دیا جائے۔

امید ہے کہ اس تشکیل کے سامنے آجانے پر یہ شبہ بھی حل ہو جائے کہ آیا اسلام میں جمود ہے یا ذہنوں میں جمود ہیں، جسے اسلام کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ اسے توڑنے والا خود اسلام ہے، جیسا کہ اس نے تیرہ صدیوں میں کتنے ہی جامد ذہن اقوام کا جمود توڑا ہے۔ اسلام نے اپنے اصول فطرت میں ماننے والوں کو محدود کر دیا ہے جس کے معنی جمود کے سمجھے جا رہے ہیں۔ لیکن اصول فطرت میں محدود رہنا جمود نہیں بلکہ جمود شکن ہے۔

اسلامی مزاج اور منہاج نبوت کے اساسی اصول

منفی پہلو :

۱ لااسلام الا بجماعة۔

''اسلام بغیر جماعت نہیں، یعنی اسلام کا مزاج اجتماعیت پسندانہ ہے، انفرادیت پسندانہ نہیں''۔

۲ لارهبانية فى الاسلام۔

''یعنی دین کے بارے میں اسلام کا مزاج اختراع پسندی اور جدت طرازی کا نہیں بلکہ اتباع پسندی ہے۔ نیز گوشہ گیری اور انقطاعیت پسندی کا نہیں بلکہ عام مخلوق میں ملے جلے رہ کر کام انجام دینے کا ہے''۔

۳ لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۔ (بقرہ پ۳ آیت ۲۵۶)

''یعنی اسلام کا مزاج دین میں جبر و اکراہ اور تشدد کا نہیں بلکہ نرمی و محبت کے ساتھ حجت

وبرہان سے حق واضح کردینے کا ہے۔ ماننا نہ ماننا کلیۃً مخاطب کا اختیاری فعل ہے"۔

۴ لاضرر ولا ضرار فی الاسلام۔

"یعنی اسلام کا مزاج تخریبی یا ضرر رسانی کا نہیں بلکہ تعمیری اور نفع رسانی کا ہے"۔

۵ لاعدوی ولا طیرۃ فی الاسلام۔

"یعنی اسلام کا مزاج توہم پسندانہ نہیں کہ شگون یا ٹونے ٹوٹکے یا کسی کی بیماری کسی کو لگ جانے کا تخیل باندھ لینا اس کے یہاں معتبر ہوں بلکہ حقیقت پسندانہ ہے کہ امور واقعیہ ہی اس کے نزدیک معتبر ہوتے ہیں۔ خواہ وہ حسی اسباب سے ظہور پذیر ہوں یا معنوی اسباب سے تخیلاتی اور توہماتی خطرات، وساوس اس کے نزدیک اسباب نہیں ہیں کہ حوادث کا ان سے تعلق ہو"۔

۶ لانولی امرنا ھذا من طلبہ۔

"یعنی اسلام کا مزاج طالب عہدے کو عہدہ نہ دینے کا ہے۔ گویا عامۃً عہدوں کی طلب خود غرضی کی دلیل ہوتی ہے اور خود غرض انسان اپنی اغراض کی تکمیل میں مشغول رہ کر فرائض منصبی میں عادۃً قاصر رہتا ہے"۔

۷ لَا تُكَلَّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (اعراف پ۸ آیت ۴۲)

"یعنی اسلام کا مزاج کسی پر اس کی طاقت کے قدر بار ڈالنے کا ہے خواہ انسان ہو یا حیوان زائد از طاقت بوجھ رکھنا اس کے نزدیک ظلم ہے"۔

۸ لیس منامن غشنا۔

"یعنی اسلام کا مزاج گندم نمائی جو فروشی اور نمائشی خوبصورتیاں دکھلا کر دغل فصل کا نہیں بلکہ حقیقت پسندی اور حقیقت نمائی کا ہے"۔

۹ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۔ (ص پ۲۳ آیت ۸۶)

"یعنی اسلام کا مزاج تصنع، بناوٹ یا نمائش پسندی کا نہیں، بلکہ سادگی سچائی اور ظاہر وباطن کی یکسانی کا ہے"۔

۱۰ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۔ (بقرہ پ۳ آیت ۲۸۵)

"یعنی اسلام کا مزاج شخصیات مقدسہ کے نام پر تعصب، تنگی، حد بندی اور گروہ سازی کا نہیں بلکہ ان کی ہمہ گیر توقیر و تعظیم کے ساتھ بین الاقوامی طور پر اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور عالم انسانیت کو متحد کرنے کا ہے"۔

۱۱ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (بقرہ پ۴ آیت ۱۳۹)

"یعنی اسلام کا مزاج دل چھوڑ کر بیٹھ رہنے اور بزدلی اور کم ہمتی دکھلانے کا نہیں بلکہ عزیمت اور قوت یقین کے ساتھ عالی حوصلگی اور ہمت مردانہ دکھلانے کا ہے"۔

۱۲ لَا تَيْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ۔ (یوسف پ۱۳)

"یعنی اسلام کا مزاج کتنی بھی مشکلات کا ہجوم سر پر آجائے مایوسی کا نہیں بلکہ امید، بھروسہ

اور اللہ پر اعتماد کے ساتھ ثبات واستقلال اور آگے بڑھتے رہنے کا ہے مایوسی اس کے نزدیک کفر کا شعبہ ہے"۔

۱۳ مَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ (حج پ۱۷ آیت ۷۸)

"اسلام کا مزاج دین کے بارے میں ضیق اور تنگی کا نہیں بلکہ فراخی کا ہے۔ معذور کو مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے مناسب حال راہ نکال دی جاتی ہے"۔

۱۴ لن يشاد الدين الاغلبه۔

"یعنی اسلام کا مزاج دین میں غلو، مبالغہ اور تحمل بیجا کا نہیں ورنہ دین اسے ہٹادے گا بلکہ اعتدال کے ساتھ بقدر طاقت بوجھ اٹھانے کا ہے۔ توسط واقتصاد ہی اس کا بنیادی اصول ہے"۔

۱۵ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (مائدہ پ۶ آیت ۸)

"یعنی اسلام کا مزاج دوست اور دشمن میں یکساں انصاف ہے جانبداری یا بے جا رعایت یا خویش نوازی اس کے یہاں خلاف عدل اور خلاف تقویٰ ہے"۔

۱۶ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى۔ (نجم پ۲۷ آیت ۳۹)

"یعنی اسلام کا مزاج عمل پر ابھارنا ہے کہ ہر ایک کو اسی کی سعی کام دے گی، دوسرے کی محنت کام نہ آئے گی تاکہ آدمی دوسروں پر تکیہ کرکے معطل نہ ہو بیٹھے، ہمت سے خود آگے بڑھے"۔

مثبت پہلو

یہی صورت اسلام کے اساسی اصول میں مثبت ضابطوں کی بھی ہے، جس سے اسلام کا مزاج کھلتا ہے مثلاً:

۱ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (انفال پ۱۰ آیت ۴۲)

"یعنی اسلام کا مزاج حجت پسندی، حجت طلبی اور تحقیق حال کا ہے جذبات پسندی یا محض شبہات یا قرائن بے تحقیق کسی کو انعام یا انتقام دینے کا نہیں"۔

۲ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَّاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ۔ (نساء پ۵ آیت ۱۲۸)

"یعنی اسلام کا مزاج صلح جوئی اور امن پسندی کا ہے۔ لڑائی جھگڑا شر انگیزی اور فتنہ جوئی کا نہیں نیز اس کا مزاج احسان اور جودوکرم کا ہے، بخل، تنگی اور جزرسی کا نہیں"۔

۳ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآاَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (لقمان پ۲۱ آیت ۱۷)

"یعنی اسلام کا مزاج انتقام پسندانہ نہیں بلکہ کریمانہ اور مصائب یا ایذا رسانیوں پر صبروتحمل اور عفوودرگزر کا ہے۔ اس کو اس نے اولوالعزمی کہا ہے"۔

۴ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ (حجرات پ۲۶ آیت ۱۰)

''یعنی اسلام کا مزاج باہمی بھائی بندی اور ملنساری کا ہے اجنبیت پسندی اور بیگانہ روش کا نہیں''۔

۵ ان الناس کلهم اخوة۔

''یعنی اسلام کا مزاج عالمی بھائی چارے کا ہے کہ تمام انسان بھائیوں کی طرح رہیں خواہ کوئی بھی قوم ہو اور کسی بھی مذہب کی ماننے والی ہو۔ غلام سازی یا استحصال عوام یا گروہ سازیوں کے ذریعے بھائی بھائی سے جدا کر دینے کا نہیں ہے''۔

۶ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا۔

''یعنی اسلام کا مزاج پورے عالم انسانیت کے احترام و تحفظ کا ہے انسانیت کی تحقیر و تذلیل اور لاپرواہی سے اس کے ضائع ہو جانے پر قناعت کر لینے کا نہیں''۔

۷ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۔ (نساء پ۶ آیت ۱۵۰، ۱۵۱)

''یعنی اسلام کا مزاج خلط و التباس یا حق و باطل کو مخلوط کر دینے یا اقوام کی رضاجوئی کی خاطر حق و باطل کو جمع کر کے بین بین راہیں نکالنے کا نہیں بلکہ حق و باطل کو نکھار کر متمیز کر دینے کا ہے''۔

۸ اُدْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۔ (بقرہ پ۲ آیت ۲۰۸)

''اسلام کا مزاج دائرہ حق (اسلام) میں پورے داخل کرانے اور یک رخی کے ساتھ دلوں کو سکون و اطمینان بخشنے کا ہے۔ ناتمام اور ادھ کچرے کام سے دلوں کو ڈانواڈول کر دینے کا نہیں''۔

۹ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۔ (نساء پ۵ آیت ۵۸)

''یعنی اسلام مزاج امانت داری اور امانت سپاری کا ہے بددیانتی، خیانت پسندی یا دغل فعل کا نہیں''۔

۱۰ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۔ (بقرہ پ۳ آیت ۲۸۵)

''اسلام کا مزاج اجتماعی امور میں استواری نظام اور قیام امارت پر امیر کے حق میں سمع و طاعت کا ہے اگرچہ ایک حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے لامرکزیت یا فوضویت اور بے مرکز جمہوریت اسلام کا مزاج نہیں یہ انتشار پسندی ہے''۔

۱۱ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۔ (ذاریات پ۲۷ آیت ۲۱)

''اسلام کا مزاج ہر ایک کو اپنے ہی عمل پر ابھارنا ہے تاکہ دوسروں پر تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائے''۔

۱۲ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۔ (نساء پ۵ آیت ۱۲۳)

''اسلام کا مزاج یہ ہے کہ کوئی اپنی نسبت یا نسب یا انتساب پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائے جس نے جو کچھ کیا ہے وہ ضرور اس کے آگے آئے گا''۔

۱۳ ثلثة لعنهم الله (ومنهم) متبع فی الاسلام سنة جاهلية ۔

"یعنی اسلام کا مزاج یہ ہے کہ جاہلیت کی جن رسوم کو اس نے مٹادیا ہے ان کا اعادہ یا نئی نئی پگڈنڈیاں نکالنا اس کے لئے قابلِ برداشت نہیں کہ یہ خود اسلام کی تخریب ہے"۔

۱۴ مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ (حشر پ۲۸ ایت ۷)

"اسلام کا مزاج رسالت کی پیروی کرانا ہے۔ قانونِ حق میں ایجاد و اختراع کرانا نہیں"۔

۱۵ الدنیا مزرعة الاخرة ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للاخرة۔

"اسلام کا مزاج ہر عمل کو خواہ عبادۃ ہو خواہ عادۃً اخروی بنانا ہے، دنیا پر ختم کردینا نہیں ہے نہ دنیاوی مفادات کو اصل رکھنا ہے، مگر دنیا ترک کرانا بھی نہیں بلکہ اسے اختیار کرکے اس میں سے آخرت نکلوانا ہے۔ اس لئے دنیا کو کھیتی کہا ہے، پس اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی کرنا بھی ضروری ہے ورنہ پھل نہیں مل سکتا، پس اسلام کے مزاج میں ترک دنیا نہیں بلکہ ترک محبت دنیا ہے اس لئے کہ یہ ساری دنیا انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے تو وہ معطل نہیں چھوڑی جاسکتی اور انسان آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو اسے محض دنیا پر نہیں چھوڑا جاسکتا"۔

خلاصۂ اصول

بہرحال کتاب وسنت کے یہ چند اساسی اصول جیسے اجتماعی، انفرادی، شخصی، جماعتی مرکزیت، امارت، سمع وطاعت، تفویض، عہدہ جات کی نوعیت، عوام کا طرز تربیت، اخلاقی بلندی، عملی جوش، معاشرت کا ڈھنگ، دین کی وسعت، خلط والتباس سے اس کا بالاتر ہونا، بدعات ومحدثات سے گریز، اتباع رسالت، اخوت، ہمدردی، بے لوث عدل وانصاف، خدمت خلق، دنیا کا آخرت سے ربط اور آخرت کی مقصودیت وہ امور ہیں جن سے منہاج نبوت کا ذوق اور اسلامی مزاج کھل کر سامنے آتا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو سرسری طور پر ذہن میں آئیں ورنہ کتاب وسنت ان جیسے سینکڑوں اصول سے بھری ہوئی ہیں۔ ہمیں اپنی تشکیل نو میں ان سب کو بہرحال سامنے رکھنا ہے۔

تشکیل جدید میں سب سے زیادہ اہم قدم رجال کار کا انتخاب

لیکن ان اقدامات میں سب سے زیادہ اہم قدم یا چوتھا قدم رجال کار کا انتخاب ہے جو دین کے مبصر اور فقیہانہ شان رکھتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی دین کے اصول وفروع ان کے سامنے ہوں۔ اسلام کی حقیقی روح ان کی روحوں میں پیوست ہو اور اسلام کی وہ حکمت عملی اگر رجال کار ناواقف یا غیر فقیہ یا غیر مبصر اور اسلام کی حکمت عملی سے نابلد، روح اسلام سے بیگانہ ہوں تو فکر اسلامی کی تشکیل ممکن نہ ہوگی ____ اس لئے سب سے بڑا مسئلہ شخصیات کے انتخاب کا ہے، حق تعالیٰ نے جب اس مکمل دین کو دنیا میں بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو اولاً شخصیت ہی کا انتخاب فرمایا اور وہ ذات تھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جس کی وجہ یہ ہے کہ دین محض تعلیم وتفکیر کے لئے نہیں بلکہ تربیت کے لئے آتا ہے اور تربیت محض تعلیم یا کتاب کے نوشتوں سے نہیں ہوسکتی۔ جب تک کہ اس سے ہم آہنگ شخصیتیں اسے قلوب تک پہنچانے والی اور اپنے عمل سے نمایاں

کرنے والی سامنے نہ ہوں ___ اس لئے دنیا کا کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا کہ امتوں کی صلاح وفلاح کے لئے محض قانون اتارا گیا ہو اور پیغمبر کی شخصیت نہ بھیجی گئی ہو' کیونکہ شخصیت ہی دین اور مسائل دین کو اس انداز اور اس حکمت عملی سے پیش کر سکتی ہے' جو شارح حقیقی حق تعالیٰ شانہ نے اس کے لئے وضع کیا ہے۔ اس لئے وہی شخصیت مخاطب قوم کی نفسیات کی رعایت رکھتی ہے اور اس کے اجتماعی مزاج سے آگاہ ہوتی ہے جو ہدایت کے لئے منتخب کی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر دور میں اس رنگ کی شریعت آئی جو رنگ مخاطب قوم کا تھا اور اس نوع کے معجزات سے نبوت کو ثابت کیا گیا ___ جو نوعیت اس دور کے ذہن و مزاج کی ہوئی۔

آج جبکہ نبوت ختم ہو چکی ہے تو انبیاء کا کام اس امت کے مجددوں اور مفکر علماء عرفاء کے سپرد کیا گیا کہ وہ شریعت کو اسی رنگ سے ثابت کر کے دلوں میں جمائیں جو آج کے دور کی نفسیات کا رنگ ہو۔

اس حقیقت کو امام ابن سیرینؒ نے جو ایک جلیل القدر تابعی اور تعبیر خواب کے امام ہیں ان لفظوں میں ادا فرمایا کہ:

ان هذا العلم دين فانظروا عمّن تأخذون دينكم۔ (مشکوٰۃ)

"یہ علم (اور آج کی اصطلاح میں یہ فکر) ہی تمہارا دین ہے تو دیکھ لو کہ کس شخصیت سے تم دین (یا فکر) اخذ کر رہے ہو"۔

جس سے دین اور دین کے فکر کے بارے میں ہمیں پوری رہنمائی ملتی ہے کہ تربیت کا سب سے بڑا ماخذ شخصیت ہے کاغذ اور نوشتے نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مربی اور معلم یا مصلح فکر اگر خود صحیح المنہاج ہوگا تو وہی قلوب کی صحیح رہنمائی کر سکے گا ورنہ وہ خود اگر اس منہاج کا فکر لئے ہوئے نہ ہو یا قلب میں کوئی زیغ اور کجی لئے ہوئے ہو تو کتاب وسنت سے بھی وہ اسی زیغ ہی کو سامنے لا کر دوسرے قلوب میں بھر دے گا۔

آخر مسلمانوں میں آج کتنے متضاد فرقے ہیں جو قرآن ہی کو اپنا امام تسلیم کرتے ہیں اور اسی کا نام لے کر اپنا اپنا فکر دنیا کے سامنے رکھتے ہیں اس حال میں کہ ان متضاد فرقوں میں کوئی ایک ہی حق وصواب پر ہو سکتا ہے۔ سب کے سب اس تضاد فکری کے ساتھ محق نہیں کہلائے جا سکتے۔ ظاہر ہے کہ کتاب وسنت کے سامنے ہونے اور اسے امام کہنے کے باوجود اگر کوئی فرقہ **مبطل** ہو سکتا ہے تو یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ اس راستے میں فکر صحیح اور مفکر کی ذات ہی اصل ہے اور کسی فرقے کے **مبطل** ہونے کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ اس کے ہاتھ میں کتاب وسنت اور دینی لٹریچر نہیں، بلکہ یہ ہوں گے کہ اس میں کوئی صحیح الفکر اور ذوق سلف پر تربیت یافتہ شخصیت نہیں' بلکہ کوئی **مبطل** اور زیغ زدہ شخصیت آئی ہوئی ہے پس اگر شخصیت صحیح ہو تو باطل نوشتوں سے بھی وہ حق ہی سامنے لے آئے گی اور اگر فاسد الفکر ہو تو قرآن وحدیث سے بھی وہ باطل ہی نمایاں کر کے قلوب کو فاسد کر دے گی۔ ورنہ قرآن کو امام کہنے والا کوئی **مبطل** فرقہ **مبطل** نہ ہوتا۔ اس لئے جب کہ ہم فکر اسلامی کی تشکیل کے لئے قدم اٹھا رہے ہیں تو سب سے مقدم صحیح الفکر شخصیات ہی کا انتخاب ہے۔ جس سے منہاج نبوت کا صحیح اور متوارث ذوق ہمارے سامنے آجائے اور اس سیدھے سے منہاج پر ہمارا فکر استقامت کے ساتھ رواں دواں ہو۔

حرف آخر

بہرحال فکر اسلامی کی تشکیل تو قابل تبریک ہے۔ جس کا سہرا جامعہ اسلامیہ کے سر ہوگا لیکن اس میں سب سے پہلا قدم نشانۂ فکر متعین کرنا ہے اور وہ منہاج نبوت ہے۔ دوسرا قدم اس منہاج میں فکر دوڑانے کے

لئے اس کے اصول و قواعد درکار ہوں گے۔ جس میں قواعد کلیہ اور فروعات فقہیہ سب داخل ہیں۔ تیسرا قدم اس مزاج کا پہچاننا ہے اور اسے سامنے رکھنا ہے جو ملت اسلامیہ کو بخشا گیا ہے اور اس پر اس کی صدیوں سے تربیت ہوتی آ رہی ہے۔ چوتھا رجال فکر کا انتخاب ہے کہ فکر کا ظہور، صاحب فکر ہی سے ہو سکتا ہے نہ کہ محض کاغذ کے نوشتوں سے اور پانچواں قدم ان ظاہری اور باطنی خصوصیات کی رعایت ہے جو اس منہاج کا جوہر اور اس کی خصوصیات ہیں۔

مجھے اعتراف ہے کہ اجلاس جامعہ میں تو قلت وقت کی وجہ سے قرآنی اصول کی صرف اجمالی فہرست ہی پیش کر سکا تھا۔ جو یقیناً تشنۂ تفصیل تھی اور اب مقالہ کی صورت میں اس کی کچھ توضیحات بھی اگر پیش کر رہا ہوں تو قلت فرصت کی وجہ سے وہ بھی کچھ تفصیلی اور مرتب شدہ نہیں ہیں ___ بلکہ کثرت مشاغل کے سبب بھاگ دوڑ کے ساتھ جو بھی منتشر چیزیں سامنے آ رہی ہیں ___ انہی کو عجلت کے ساتھ جمع کر دیا گیا۔ جس میں نہ کسی خاص ترتیب ہی کی رعایت ہو سکتی ہے ___ نہ نظام کلام کی۔ اس لئے اسے جهد العقل دموعه کے مصداق سمجھنا چاہئے، جو ادائے فرض تو ہے ___ مگر لوازم فرض سے آراستہ نہیں ہے ___ دعا ہے کہ حق تعالیٰ اس مہم کو انجام حسن تک پہنچائے اور ملت کے لئے ایک نافع قدم ثابت فرمائے۔ آمین۔

ماخوذ از ماہنامہ دار العلوم دیوبند بھارت
شمارہ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۷۹ء

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

امارتِ شرعیّہ

امارتِ شرعیّہ کا قیام ضروری ہے ___ اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کر لیں اپنے معاملات میں ان کی طرف رُجوع کریں اور سمع و طاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔

حضرت حکیم الاسلام قدس اللہ سرّہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ۔ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۔ (صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ)

روزِ مسرّت

بزرگانِ محترم!

میرے لئے خصوصیّت سے آج بہت ہی مسرّت و خوشی کا دن ہے کہ اس مقدّس مجمع میں کہ جس میں اس نواح کے امیرِ شریعت اور دوسرے بزرگان تشریف فرما ہیں۔ مجھے ان کی معیّت کا بھی شرف حاصل ہوا ہے۔ اور ان کی برکات سے مستفیض ہونے کا بھی موقع ملا اور دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ ان کی رعیّت ہونے کا فخر حاصل ہوا۔ اس لئے کہ امیرِ شریعت کے سامنے تو سب رعایا ہی ہوتی ہے وہ باہر کے ہوں یا اندر کے ہوں۔

بہرحال ایک رعایا کی حیثیت سے اپنے امیر کی خدمت میں حاضر ہونا ایک مستقل سعادت اور برکت ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس امارت کے سلسلہ میں چند طالب علمانہ باتیں آپ کی خدمت میں گزارش

کروں زیادہ دیر تک تو عرض نہیں کر سکوں گا اس لئے کہ کچھ تو علیل ہوں اور باعتبارِ علم کے قلیل ہوں اور اسی کے ساتھ ساتھ صبح سے دماغی کاوش کا بار بھی اُوپر پڑا ہوا ہے جس وجہ سے تعب اور تکان بھی پیدا ہو گیا۔

معالجوں کی طرف سے بھی مجھے ہدایت ہے کہ عشاء کے بعد نہ کسی جلسے میں تقریر کروں اور نہ شرکت کروں لیکن بہرحال بزرگوں کا حکم ڈاکٹروں کے حکم سے زیادہ اونچا ہے کیونکہ ڈاکٹر معالج جسمانی ہیں اور یہ بزرگانِ دین معالج روحانی ہیں اور روح کو جسم پر قدرتی طور پر فضیلت حاصل ہے اس لئے معالجین روح کا حکم زیادہ واجبُ الاطاعت ہے بہ نسبت معالجین جسم کے اس لئے تعمیلِ حکم کے طور پر بھی کچھ عرض کرنا ضروری تھا۔ مگر میں زیادہ وقت نہیں لے سکوں گا صرف تھوڑی دیر چند طالب علمانہ باتیں مختصر طور پر گزارش کروں گا۔

اِسلام کی بُنیاد

اسلام وسیع ترین اور عالمگیر دین ہے اور ساری دنیا کی اقوام کے لئے پیغام ہے۔ اور اس کی عمارت پانچ شعبوں پر قائم ہے۔ گویا اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں کہ جس پر اسلام کی تعمیر کھڑی ہے۔

(۱) اعتقادات
(۲) عبادات
(۳) اخلاقیات
(۴) معاملات
(۵) اجتماعیات

عقائد

پہلا شعبہ اعتقادات کا ہے کہ آدمی کے عقائد درست ہونے چاہئیں اور عقیدے کی تین بنیادیں ہیں۔

۱۔ مبداء ۲۔ معاد ۳۔ نبوت

مبداء کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہم کہاں سے کہاں آئے ہیں۔ ہماری اصل کیا ہے۔ ہم کس طرح دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔ معاد کا حاصل یہ ہے کہ ہم یہ عمر گزار کر جائیں گے کہاں؟ اور نبوت کا حاصل یہ ہے کہ اس آمد و شد کے درمیان ہم زندگی کیسے گزاریں۔ یہ تین بنیادیں ہوئیں عقائد کی۔ مبداء ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے کہ جس سے ہمیں ہستی ملی ہے اور وجود ملا ہے۔ اور وہی ہمارے وجود کی اصل ہے اور معاد بھی وہی ہے کہ اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

تو مبداء بھی وہی ہے اور معاد بھی وہی ہے اور ہدایت کرنے والا بھی وہی ہے کہ ہم زندگی کیسے گزاریں۔ تو سب سے پہلی چیز عقائد ہے کہ جس سے قلب انسانی صحیح ہو جائے۔ کیونکہ تمام اعمال عقائد ہی کے تابع ہیں۔ عقیدہ اگر غلط ہے تو عمل خود بخود غلط ہو جائے گا خواہ آدمی اچھی نیت ہی سے کرے۔ اگر عقیدہ درست ہے تو سارے اعمال خود بخود صحیح ہو جائیں گے۔ جب اعمال صحیح ہوں گے تو احوال بھی صحیح ہوں گے۔ اور جب احوال صحیح ہوں گے تو انجام بھی صحیح ہو جائے گا۔ تو ابتداء سے انتہا تک انسان عقائد کی صحت کی بنا پر صحیح ہو گا۔ اس لئے سب سے بڑی بنیادی چیز اسلام میں عقائد کا درجہ ہے جو قلب کے اندر پیوست کیا جاتا ہے۔

عبادات

دوسرا شعبہ عبادات کا ہے کہ ان عقائد کے تحت اللہ تعالیٰ کو کس طرح سے یاد کیا جائے‘ عبادت کس طرح سے کی جائے۔ عبادت کے معنیٰ ہیں غایت تذلّل۔ یعنی معبود کے سامنے ایسی ذلت اختیار کرلینا جس کے بعد ذلّت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عزّت لامحدود ہے۔ کوئی عزّت کا درجہ نہیں جو اس کی ذات میں موجود نہ ہو۔ اس کے یہاں عزّت کامل ہے اسی لئے اس کے یہاں ذلّت کامل یعنی ایسی ذلّت پیش کرنی چاہئے کہ اس کے بعد ذلّت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے کہ آدمی اس کے سامنے ذلیل نہ ہو جائے۔

تو عبادت کا مطلب یہ ہے کہ اس عزیز مطلق کے سامنے ذلیل مطلق بن جائے۔ اس کی عزت کسی حد تک رُکی ہوئی نہیں۔ ہماری ذلّت کسی حد پر رُکی ہوئی نہ ہو اور یہ غایتِ تذلّل اور انتہائی ذلّت‘ اللہ کے سامنے اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ آدمی میں انتہائی محتاجگی ہو کیونکہ غنی کسی کے سامنے نہیں جھک سکتا ۔

آنکہ شیراں راکند روباہ مزاج

احتیاج است واحتیاج است واحتیاج

جو شیروں کو بھی لومڑی بنادے وہ حاجت مندی ہے۔ غنا کے ساتھ کوئی کسی کے آگے نہیں جُھک سکتا۔ حق تعالیٰ شانہٗ غنی مطلق ہیں‘ رفیع المرتبت ہیں‘ انسان ان کے سامنے ذلیل مطلق ہے اس کا کام ان کے سامنے ہر وقت جھکنا ہے کہ دل سے بھی جھکے‘ روح سے بھی جھکے‘ بدن سے بھی جھکے‘ قول سے بھی جھکے‘ فعل سے بھی جھکے ہر اعتبار سے اپنی ذلّت و پستی کا اظہار کردے۔ یہ ہے عبادت۔

عبادت کے معنیٰ فقط نماز روزہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ قانونِ اسلام کے تحت ذلّت کے ساتھ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے وہ اگر کہیں کہ گھر میں فلاں کام کرو تو یہ ہمارا فرض ہے کہ اسی طرح کریں۔ اگر وہ فرمائیں کہ مسجد میں جاؤ تو ہمارا فرض ہے کہ مسجد میں جائیں اگر وہ کہیں کہ تختِ سلطان پر امیرِ شریعت بن کر بیٹھ جاؤ۔ ہمارا فرض ہے کہ امیر بن کر بیٹھ جائیں اگر وہ کہیں کہ غلام بن جاؤ‘ فلاں کے تو ہم غلام بننے کو تیار ہیں تو اظہارِ ذلّت کے یہ معنیٰ ہیں کہ عمل سے قول سے‘ فعل سے‘ حال سے‘ چال سے ہر اعتبار سے آدمی اپنی پستی‘ اپنی احتیاج اور اپنی حاجت مندی کا اظہار کردے۔ اسی کا نام عبادت ہے۔

اخلاقیات

تیسرا شعبہ اخلاقیات کا ہے۔ عبادات اور عقیدہ درست نہیں ہو سکتا ہے۔ جب تک کہ قلب کی حالت درست نہ ہو اور قلب محلِّ اخلاقیات ہے۔ لہٰذا جب تک اخلاق انسانی صحیح نہ ہوں گے یعنی جب تک صبر نہ پیدا ہو‘ حیا نہ پیدا ہو‘ شکر نہ پیدا ہو۔ سخاوت نہ پیدا ہو‘ شجاعت نہ پیدا ہو‘ توکّل علی اللہ نہ پیدا ہو۔ انابت الی اللہ نہ پیدا ہو۔ یہ ملکات جب تک ذہن میں نہ جمیں گے عقیدہ درست نہ ہوگا۔ عقیدہ درست نہ ہوگا تو عمل درست نہ ہوگا اور عبادت درست نہ ہوگی تو مدار آکر ٹھہرجاتا ہے اخلاق پر۔ اسی لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاق کا ہے۔ لہٰذا اخلاق کی تربیت کی جائے۔ اخلاق کو بلندی پر پہنچایا جائے۔ اور انسان کو جبلی طور پر جو بداخلاقیوں کے روگ لگے ہوئے ہیں یہ دور کرکے پاکیزہ اخلاق سے بدلا جائے۔ جبلی طور پر انسان میں حرص بھی ہے بخل بھی ہے۔ حسد بھی ہے۔ کبر و رعُونت بھی ہے۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کو مخلوق کے آگے ذلیل کرتی ہیں۔ ان کو نکال کر کبر کے بجائے تواضع پیدا کی جائے۔ بخل کے بجائے سخاوت پیدا کی جائے۔ خود

غرضی کے بجائے ایثار پیدا کیا جائے۔ ہوس رانی کے بجائے قناعت کا جذبہ پیدا کیا جائے جب یہ اخلاق درست ہوں گے تو عقائد درست ہوں گے پھر اعمال درست ہوں گے اور جب اعمال درست ہوں گے تو انجام درست ہو گا۔ پھر زندگی بھی صحیح ہو جائے گی اور موت بھی صحیح ہو جائے گی۔ اس لئے اسلام میں اہم ترین شعبہ اخلاقیات کا ہے۔

معاملات

چوتھا شعبہ معاملات کا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کس طرح کا برتاؤ کریں معاملات میں نزاع ہو۔ جھگڑا ہو۔ اس کا سُلجھاؤ کس طرح سے کریں۔ ہم ایک دوسرے سے جھگڑنے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کا فیصلہ کس طرح سے کریں۔ لین دین کس طرح سے ہو۔ قرض ادھار کے طریقے کیا ہوں گے۔ امانت رکھنے کے طریقے کیا ہیں اور ادائیگی کے طریقے کیا ہیں۔ اجارہ کے احکام کیا ہیں۔ اور زمین کے احکام کیا ہیں تو معاملات کا شعبہ بھی اہم شعبہ ہے جس میں ایک انسان کو دوسرے انسان سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر دیانت نہ ہو' امانت نہ ہو۔ لازمی طور پر دنیا میں فساد پیدا ہو گا اور جب فساد پیدا ہو گا تو بدامنی پیدا ہو گی۔ جب بدامنی پیدا ہو گی تو نہ جان کی خیر رہے گی نہ مال کی خیر رہے گی۔ ہر شخص غیر مطمئن رہے گا۔ پریشان رہے گا۔ اضطراب اور بے چینی قلب کا جوہر بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے معاملات کی صحت اور خوبی یہ بھی اہم ترین اسلام کا شعبہ ہے۔

اجتماعیات

پانچویں چیز اپنی قومیت کو سنبھالنا ہے۔ یعنی اجتماعی حالت کو درست کرنا ہے کہ قوم میں اجتماعی طور پر ایک تنظیم ہو۔ قوم ایک نظم کے تحت زندگی گزارے' بدامنی نہ ہو کہ ایک کا رخ ادھر کو ہو اور ایک کا رُخ اِدھر کو ہو۔ ایک مشرق کو جا رہا ہے۔ اور ایک مغرب کو جا رہا ہے ___ یا ایک اُدھر سے آرہا ہے اور ایک اِدھر سے اور دونوں ٹکرائیں آپس میں اور جھگڑیں اور خونم خون ہوں' بلکہ ایک نظم کے اندر پوری قوم جُڑی ہوئی ہو۔ ایک نظام کے تحت چل رہی ہو۔ ہر ہر چیز اپنے محل کے اوپر قائم ہو۔

یہ پانچ شعبے ہو گئے ہیں۔ اعتقادات' عبادات' اخلاقیات' معاملات اور اجتماعیات۔ ان پانچ شعبوں کو علماء کے ایک ایک طبقہ نے سنبھالا ہے اور لاکھوں علماء ایک ایک شعبے کو سنبھالنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ انہوں نے سنبھالا اور اپنا فرضِ منصبی پورا کیا۔

متکلّمینِ اسلام کی خدمات

اعتقادات کو سنبھالنے اور ان کو ثابت کرنے کے لئے حکماء اسلام کا ایک طبقہ کھڑا ہوا جنہیں متکلّمین کہتے ہیں۔ انہوں نے عقلی اور نقلی انداز سے عقائد کو حق ثابت کیا' اِستدلالات سے عقائد کا فطری ہونا ثابت کیا کہ سب عقیدے فطرت کے مطابق ہیں۔ کوئی عقیدہ فطرت کے خلاف نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اسلام میں اس کو زبردستی ٹھونس دیا گیا ہو بلکہ فطرت تقاضہ کرتی ہے کہ یہ ہی عقیدہ ہونا چاہئے۔

فطرتیں مطمئن ہیں کہ یہی عقیدہ درست ہے۔ ان حکماء اسلام نے حسّی' عقلی' نقلی' فطری۔ ہر طریقے

سے ثابت کر دکھایا' ایک ایک عقیدے کے لئے ہزار ہا دلائل قائم کئے اور اس سلسلے میں بڑی بڑی' ضخیم ضخیم' عظیم عظیم کتابیں لکھی گئیں اور حجت وبرہان سے عقائد مضبوط ہو گئے۔ اس لئے کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے نہ مسلمانوں کے سامنے اور نہ ان کے عقائد کے سامنے' اللہ جزائے خیر دے متکلمین حکماء اسلام کو کہ انہوں نے اس سلسلہ میں خدمت کی اور اس دائرۂ اعتقادات کو سنبھالا اور ثابت کر دکھایا کہ حق یہ ہی ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

ائمۂ اجتہاد کی خدمات

دوسرا شعبہ عبادات کا ہے اس کو سنبھالا ہے فقہائے اسلام نے اور ائمۂ مجتہدین نے اور پھر ان کے نیچے دوسرے ائمۂ کھڑے ہو گئے اور فقہ کے بڑے بڑے اکابر نے اس کو مدوّن کیا اور مرتّب کیا۔ باب وار' فصل وار مسائل مقرر کئے۔ اپنی ترتیب کے ساتھ مسائل کو ترتیب دیا۔ ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی گئیں مستقل ایک فن بن گیا جس کے اندر ہزار ہا فروع داخل ہوئیں۔ ائمۂ اجتہاد نے اپنے تفقہ کے اصول سے قرآن وحدیث سے مسائل کا استخراج کیا۔ خود مسائل کو نکال کر پیش کیا اگر کہیں اصولِ فقہ میں اختلاف ہوا تو فروعی مسائل میں بھی اختلاف ہوا مگر سب ائمۂ ہیں دین حق پر ہیں اور حق ان میں دائر وسائر ہے۔

اگر امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام مالک' وامام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ میں اختلافات ہیں تو وہ حق وباطل کے نہیں کہ ایک سمت حق ہو اور ایک سمت باطل ہو۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ خطاء اور صواب کے اختلافات ہیں کہ ایک طرف صواب ہے اور ایک طرف خطاء' لیکن ساتھ میں یہ قید بھی لگی ہوئی ہے کہ یہ صواب ہے مگر احتمال ہے کہ خطا بھی ہو اور یہ خطا ہے مگر احتمال ہے کہ صواب بھی ہو۔ اسی لئے حق دائر وسائر ہے تمام ائمۂ کے اندر اور تمام کے تمام نجوم ہدایت ہیں جس کا دامن آپ تھام لیں گے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی۔ اگر کوئی شافعی المسلک ہے تو وہ بھی نجات یافتہ ہے۔ اگر کوئی حنفی ہے تو وہ بھی نجات کے مراتب طے کر رہا ہے اور اگر کوئی مالکی یا حنبلی ہے تو وہ بھی نجات کے راستے پر جا رہا ہے اور سب اللہ ورسول کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ اس لئے کہ بنیاد سب کی ایک ہے وہ ہے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ۔ البتہ استخراج مسائل میں اصول الگ الگ ہو گئے ہیں۔

اختلافِ مشرب

اور یہ خود شریعت کی عین حکمت ہے اس لئے کہ ائمۂ کے اختلاف سے امت کے اندر آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں اتنے راستے نکل آئے ہیں کہ جو جس ذوق کا ہے اسی راستے پر چل کر حق کو پا سکتا ہے۔ اگر ایک عظیم دریا ہو اور بہت بڑا لمبا چوڑا اتھاہ سمندر ہو لیکن پانی پینے کا گھاٹ ایک ہی ہو تو لوگ ہزاروں میل سے سفر کر کے آئیں گے جب ہی پانی مل سکتا ہے ورنہ وہ پانی سے محروم رہیں گے۔ لیکن دریا اگر ایسا ہے کہ ہزاروں مشرب اور گھاٹ موجود ہیں جس سمت سے آئے وہی پانی۔ وہی مزہ' وہی ذائقہ ہے۔ صرف سمت بدلی ہوئی ہے۔ ایک مشرق کی طرف ہے ایک مغرب کی طرف ہے تو کچھ آسانی ہو گی کہ دریا بڑا ہے اور مشرب اور گھاٹ بہت ہیں۔ ہر طرف سے پانی مل سکتا ہے تو اسلام ایک اتھاہ سمندر ہے اس کے مشارب بہت ہیں۔ ایک مشربِ حنفی ہے اور ایک مشربِ مالکی ہے۔ ایک مشربِ حنبلی ہے اور ایک مشربِ شافعی ہے۔ اور یہ چار ائمۂ وہ ہیں کہ حسن تدبیر کہئے یا تقدیرِ خداوندی کہئے کہ یہ چار مذہب دنیا کے اندر رائج ہو گئے۔ ورنہ ائمۂ اجتہاد

سینکڑوں پیدا ہوئے۔ امام بخاریؒ خود مجتہد ہیں۔ عبداللہ بن مبارکؒ خود مجتہد ہیں۔ حمادبن سلمہؒ خود مجتہد ہیں۔ سفیان ثوریؒ مجتہد ہیں۔ سفیان بن عیینہؒ مجتہد ہیں۔ ہر ایک کا فقہ الگ الگ ہے۔ لیکن یہ خدا کی طرف سے بات ہے کہ بقیہ فقہیں مندرس ہو گئے اور باقی نہ رہے اور یہ چار فقہیں دنیا کے اندر رائج ہو گئے۔

فقہائے اسلام اور ان کا تادُّب

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں پیدا ہوئے خراسان کی طرف ان کا فقہ چلا تو پورا خراسان حنفی' پورا افغانستان حنفی' ہندوستان کا اکثر حصہ حنفی' پورا ترکستان حنفی۔ جہاں جہاں ان کا فقہ پھیلا وہاں وہاں حنفی ہو گئے۔ چونکہ اللہ و رسول کی محبت انتہاء پر تھی اسی لئے ادب بھی بے حد تھا۔ چنانچہ واقعہ مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حج کو تشریف لے گئے' مدینہ منورہ روضۂ اقدس پر بھی حاضری دی تو سات دن کے بعد واپسی کا ارادہ کیا مگر تمام اہلِ مدینہ سر ہو گئے کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ جب سارے مصر ہو گئے تو ٹھہر گئے' دس دن ہو گئے تو پھر اجازت چاہی۔ مگر اہلِ مدینہ نے پھر گھیرا ڈال لیا کہ ہم ابھی اجازت نے دیں گے۔ گیارہویں دن آپ نے فرمایا کہ اب مجھ میں طاقت نہیں ہے ___ اس پر اہلِ مدینہ نے معلوم کیا کہ ناطاقتی کی کیا بات ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ جب سے مدینہ میں آئے ہیں۔ استنجاء نہیں فرمایا ہے۔ نہ پیشاب نہ پاخانہ کہ مناسب نہیں' مدینہ کی ارضِ مقدس کو نجاست سے آلودہ کرنا اس لئے اب میرے اندر طاقت نہیں تو پھر اہلِ مدینہ نے خود باعزت واحترام رخصت کیا۔

یہ تھا ائمہ کا ادب واحترام کہ جتنی محبت غالب تھی ان حضرات میں اتنی ہی ادب واحترام تھا۔

اِمام شافعیؒ

آپ کی پیدائش ہوئی مصر میں مقامِ غزا میں۔ ابتدائی زمانہ مصر میں گزرا اور عمر کا اکثر حصہ حجاز میں گزرا اور عمر کا آخری حصہ بھی مصر میں گزرا۔ مصر میں ہی وفات بھی ہوئی۔ مصر تقریباً سب کا سب شافعیؒ المسلک ہے۔ حجاز میں بھی تقریباً سب فقہ شافعی پر چل رہے ہیں۔ محبت وادب میں ان کا بھی وہی حال تھا۔ جو دیگر ائمہ کا ہے۔ خوف و خشیت غالب' محبت غالب اور تقویٰ اونچے درجے کا۔

اِمام مالکؒ

امام مالک' امام دارالہجرہ کے لقب سے ملقب ہیں۔ مدینہ سے ان کو شغف تھا اور مدینہ کے ذرہ ذرہ سے اُن کو محبت تھی اور ادب کا یہ حال تھا کہ مدینہ شہر میں کبھی جوتے پہن کر نہ چلے' اس لئے کہ معلوم نہیں کہاں حضورؐ کا قدم مبارک پڑا ہو اور وہاں میرا جوتا گزرے اور مدینہ منورہ میں کبھی پاخانہ پیشاب بھی نہیں کیا بلکہ اس کے لئے مدینہ منورہ سے کئی میل دُور نکل جاتے تھے۔

یہ ادب تھا اور تمام ائمہ میں اسی طرح سے ادب کی انتہا تھی۔ مدینہ منورہ کو ہی اپنا وطن قرار دیا اور وہیں ہجرت فرمائی۔ ان کی تمنا یہ تھی کہ مجھے مدینہ کی زمین قبول کرلے اور میں وہیں دفن ہو جاؤں۔ نفلی حج بھی نہیں کرتے تھے اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں باہر میری وفات نہ ہو جائے اور میں مدینہ کی زمین سے الگ ہو جاؤں۔

امام مالک نے ایک روز خواب دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دربار مبارک قائم ہے اور امام مالک

حاضر ہیں۔ عرض کیا یا رسول اللہ! میرا جی چاہتا ہے کہ مدینہ کی زمین مجھے قبول کرلے اور مجھے معلوم ہو جائے کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں۔ سال ہے یا دو سال ہیں تاکہ مجھے اطمینان ہو جائے اور میں عمرہ کر آؤں اور حج کر آؤں۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضورؐ نے اس طرح سے ہاتھ اُٹھایا کہ پانچوں انگلیاں کھلی ہوئی ہیں۔ اب امام مالک حیران ہیں کہ پانچ انگلیاں آپؐ نے اٹھائی ہیں تو آیا یہ مطلب ہے کہ پانچ دن باقی ہیں میری عمر کے۔ یا پانچ مہینے یا پانچ برس ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

امام مالک کے ہم عصر امام محمد بن سیرین ہیں جو تعبیر خواب کے امام ہیں اور خواب کی تعبیر پر انہوں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ جلیل القدر امام ہیں اور ایسی تعبیر دیتے تھے کہ ہاتھ کے ہاتھ تعبیر واقعات کی صورت میں ظاہر ہوتی تھی ان کو یہ مناسب تعبیر سے تھی۔ اس قسم کے ان کے بہت سے واقعات ہیں۔ تو امام مالک نے ایک شخص سے کہا کہ تم جا کر ابن سیرین سے میرا خواب بیان کرو مگر میرا نام مت لینا۔ یہ کہنا کہ مدینہ میں رہنے والے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا ہے۔ اس کی تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ شخص حاضر ہوا اور اس نے ابن سیرین سے کہا کہ مدینے کے ایک شخص نے یہ خواب دیکھا کہ اس نے حضورؐ سے یہ دریافت کیا کہ میری عمر کے کتنے دن باقی ہیں تو حضورؐ نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ دن مراد ہیں یا پانچ مہینے یا پانچ برس مراد ہیں؟

ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب تو بہت بڑا عالم دیکھ سکتا ہے۔ جاہل کا کام نہیں کہ اس قسم کا خواب دیکھے اور نہ جاہل کو حضورؐ یہ جواب دے سکتے ہیں۔

یہ جواب تو بڑے عالم کو ہی دے سکتے ہیں۔ اور مدینہ میں اس وقت امام مالک سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ تو کہیں یہ خواب امام مالک نے تو نہیں دیکھا؟

اب وہ شخص خاموش کیونکہ اسے تو روک دیا گیا تھا کہ میرا نام مت لینا۔ اس نے کہا کہ اچھا مجھے اجازت دیجئے کہ میں ان سے اجازت لے کر آؤں۔ فرمایا ہاں اجازت لے کر آجاؤ۔ پھر ہم خواب کی تعبیر بتلائیں گے۔

وہ گیا اور جا کر عرض کیا کہ حضرت! وہ تو پہچان گئے کہ یہ خواب دیکھنے والے آپ ہیں اور نام بھی لے دیا۔ مگر یہ کہا کہ پوچھ کر آجاؤ پھر تعبیر بتاؤں گا۔ فرمایا کہ اچھا جاؤ میرا نام لے دینا کہ مالک بن انس نے یہ خواب دیکھا ہے۔

اس شخص نے جا کر عرض کیا کہ حضرت! امام مالک نے ہی یہ خواب دیکھا ہے ابن سیرین نے فرمایا کہ ہاں امام مالک ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں، دوسرے کی مجال نہیں کہ وہ یہ خواب دیکھے فرمایا کہ :

> "حضورؐ نے پانچ انگلیاں اٹھائیں اس سے نہ پانچ دن مراد ہیں نہ پانچ مہینے نہ پانچ برس مراد ہیں۔ بلکہ اشارہ ہے اس طرف کہ **هِيَ خَمْسٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ** یعنی یہ پانچ چیزیں وہ ہیں جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ **وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ** کسی کو پتہ نہیں کہ میرا انتقال کس زمین پر ہوگا اور میں کہاں دفن ہوں گا اور کیا وقت ہے میرے انتقال کا۔ قرآن کریم کے اندر فرمایا گیا کہ اصول غیب کے پانچ ہیں جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ فرمایا گیا **اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ** اس کے نظام

کو صرف اللہ جانتا ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ کسی کو پتہ نہیں حالانکہ قیامت کا عقیدہ قطعی ہے' قرآن سے ثابت ہے ہر مسلمان کا ایمان ہے مگر وقت کا پتہ کسی کو نہیں حتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پتہ نہیں۔ چنانچہ جبرئیل امین نے آپؐ سے پوچھا **متی السّاعۃ یا رسول اللہ** قیامت کب آئے گی۔ فرمایا **ما المسئول عنھا باعلم من السّائل** آپؐ نے فرمایا کہ اس بارے میں سوال کرنے والے سے زیادہ مجھے علم نہیں ہے۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے کہ قیامت آئے گی مگر یہ مجھے معلوم نہیں کہ کب آئے گی۔ یہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ تو امام ابن سیرین نے فرمایا کہ یہ خواب امام مالک ہی دیکھ سکتے تھے۔ خواب بھی علمی ہے۔ جواب بھی علمی ہے اور حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ امام مالک ہی اس کے مخاطب بن سکتے ہیں۔ ابن سیرین نے اس آدمی سے فرمایا کہ امام مالک سے کہہ دینا کہ حضورؐ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ موت کہاں آئے گی کس زمین میں آئے گی۔ اس کا علم ان پانچ چیزوں سے ہے۔ جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے"۔

امام مالک یہ جواب سن کر مطمئن ہو گئے اور پھر گھر سے نہیں نکلے یہاں تک کہ فات ہو گئی اور مدینہ کی زمین نے قبول کیا اور جنتؐ البقیع میں مزار ہے جو ہر مسلمان کے لئے زیارت گاہ بنا ہوا ہے ___ تو بہرحال امام مالک امام دارالہجرہ ہیں اور ان کا زیادہ تر فقہ مغربی ممالک میں پھیلا ہوا ہے جو عرب کے مغربی حصے ہیں ان میں زیادہ تر مالکی ہی آباد ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبلؒ کا قیام نجد میں رہا ہے۔ اسی لئے نجد اور یمن کے لوگ بکثرت حنبلی ہیں اور فقہ حنبلی پر عمل پیرا ہیں۔

احسانِ عظیم

تمام ائمہ برحق ہیں جس کا دامن تھام لوگے انشاء اللہ نجات ہو جائے گی یہ سب حضرات حقانی ہیں۔ ان بزرگوں نے اپنے اصولِ فقہ اور اپنے اجتہاد سے کتاب وسنت سے مسائل اخذ کئے اور مسائل نکال کر دین کو باغ وبہار بنا دیا اور ایک لاء اور ایک قانون کی صورت میں فقہ کو مرتب کیا۔ جن کے ابواب الگ الگ ہیں۔ بابُ الافاضات' بابُ المعاملات' بابُ المساقات' بابُ المزارعۃ' بابُ الاراضی وغیرہ۔ سارے مسائل ان ابواب کے نیچے جمع ہیں۔ ساری چیزیں استخراج کر کے جمع کر دی ہیں۔ ان کا بھی امت پر احسانِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے اور ان کے مقابر کو نور سے منور فرما دے اگر یہ استخراج نہ کرتے تو اتنی جزئیات ہمارے پاس فقہ میں موجود نہ ہوتیں۔ بڑی دقت اور دشواری پیش آتی۔

عُرفاءِ اسلام کی خدمات

عرفاء اسلام جن کا دوسرا نام صوفیاء کرام ہے۔ ان حضرات نے اخلاقیات کو سنبھالا ہے اس طرح پر کہ بال

کی کھال نکال کر انسانوں کے سامنے پیش کردی روح کی حکمت بیان کی اور بتایا کہ نفس میں اتنی مکاریاں ہیں ان کا توڑ یہ ہے اگر نفس میں یہ کید پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے اور نفس میں یہ خواہش پیدا ہو تو اس کا دفعیہ یہ ہے اور کوئی رغبت اور تمنا پیدا ہو تو اس کی کاٹ یہ ہے۔ یہ ان حضرات صوفیاء ہی کا طفیل ہے کہ حکمتِ قلب کی انہوں نے تعلیم دی اور انہوں نے دلوں کو منور کیا اخلاق سے' اور ان ہی اخلاق کے ذریعہ تزکیۂ نفس کیا اور انسان کو انسان بنایا۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْرَ الْجَزَاءِ

اُمراءِ اسلام کی خدمات

اُمراءِ اسلام' انہوں نے شعبہ معاملات کو سنبھالا۔ لین دین اور جھگڑوں کے فیصلوں پر امراء اسلام مقرر ہوئے۔ دنیا بھر کے جھگڑے نمٹائے۔ لوگوں کے مقدمات فیصل کئے' فوجداری کے الگ' دیوانی کے الگ' ہر ہر دائرے کے مقدمات سنبھالے اور مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ کی کتاب ہے "السیاسۃ الشرعیۃ" اور اسی طرح بہت سے ائمۂ علوم نے کتابیں لکھیں کسی نے سیاست کے اصول واضح کئے ہیں۔ فصل خصومات اور مقدمات کا فیصل کرنے کے لئے' اس لئے ان اُمراء نے بہت اونچا کام کیا ہے کہ اس شعبہ کے حقائق کو واضح کیا ہے۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ

خُلفاءِ اسلام کی خدمات

اس پانچویں شعبہ کو سنبھالا ہے خلفاء اسلام نے جیسے صدیق اکبرؓ فاروقِ اعظمؓ وغیرہ یہ حضرات درحقیقت ذمہ دار تھے ملک کے نظام کے اور تنظیم ملت اور تنظیم اُمت کے ان حضرات نے پوری امت کو اور مغرب و مشرق کے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا کہ نہ آپس میں لڑیں نہ جھگڑیں۔ نہ تعصبات برتیں' نہ آپس میں گالم گلوچ کریں نہ سَبّ و شتم کریں۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو محبت سے پیش کردیں' دوسرا محبت سے جواب دے۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو اسے معذور سمجھے اور یہ خیال کرے کہ ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں۔ دوسرا حق پہ ہو۔ یہ کہنا کہ میں ہی حق پر ہوں۔ دوسرا غلطی پر ہے۔ رائے دہی کے معاملہ میں بالکل غلط چیز ہے۔

خلفاء کے لئے طریقِ عمل

سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنے ایک خلیفہ کو خلافت عنائیت فرمائی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق پگڑی باندھی اور کچھ وصیتیں کیں اور کہہ دیا کہ تم میری طرف سے نائب اور خلیفہ ہو جاکر لوگوں کی تربیت کرو۔ اصلاح کرو۔ ان خلیفہ نے رخصت کے وقت عرض کیا کہ حضرت! کچھ نصیحت فرمایئے تاکہ میں اس نصیحت پر کاربند رہوں۔ حضرت نے دو باتوں کی نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ :

"نہ تو نبوت کا دعویٰ کرنا اور نہ خدائی کا دعویٰ کرنا"۔

خلیفہ یہ سن کر حیران و پریشان ہوئے کہ حضرت! آپ کا خادم' غلام' برسوں آپ کی صحبت میں رہا۔ کیا مجھ سے یہ ممکن ہے کہ میں خدائی کا دعویٰ کروں۔ جو نبیؐ کے غلاموں کا غلام ہو وہ کب نبوت کا دعویٰ کرے گا؟ تو حضرت نے یہ کیسی نصیحت فرمائی۔ نصیحت فرماتے کہ بھائی عبادت میں ثابت قدم رہنا' اخلاق کی حفاظت کرنا' مخلوق کی اصلاح کرنا اور یہ کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا' نبوت کا دعویٰ مت کرنا۔ یہ تو ہم لوگوں سے

ممکن ہی نہیں۔ اس نصیحت سے کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ فرمایا کہ اس کے معنی سمجھ لو پھربات سمجھ میں آجائے گی۔

فرمایا کہ خدا کی ذات وہ ہے کہ جو کہہ دے وہ اٹل ہو اگر وہ چاہے کہ زمین بنے تو زمین بن کر رہے۔ ناممکن ہے کہ نہ بنے۔ ارادہ خداوندی پر مراد کا مرتّب ہونا قطعی اور لازمی ہے یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ ارادہ فرمائیں اور وہ پورا نہ ہو وہ تو قادر مطلق ہیں۔ **اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ** اگر وہ ارادہ کرے کہ جہان بنے تو اسے محنت کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اسباب فراہم کریں' وہ اسباب کے محتاج نہیں۔ اسباب کے تو وہ خالق ہیں وہاں تو منشاء ہے کہ ہو جا بس وہ ہو جاتی ہے۔ تو اللہ کی ذات وہ ہے کہ جو وہ ارادہ کرے اور کہہ دے وہ اٹل ہو' ٹلنے والی چیز نہ ہو۔

اور دعویٰ نبوّت کے معنیٰ یہ ہیں کہ نبیؑ کی شان یہ ہے کہ جو فرمادے وہ حق ہو۔ یوں ممکن ہی نہیں کہ نبی کی زبان سے کوئی ناحق چیز نکلے۔ جو نبیؑ فرمائیں گے وہ حق ہوگا اور جو کر کے دکھائیں گے وہ بھی حق ہوگا۔ ناحق کا وجود نبیؑ کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ نبی جو کہے گا وہ حق ہوگا اور اس کے خلاف باطل ہوگا۔ نبیؑ کی جانب خلاف کبھی حق نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر تم نے جا کر یہ کہا کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اور میری رائے اتنی حق ہے کہ دوسرا سامنے نہیں آسکتا۔ تو یہ دَرپردہ نبوّت کا دعویٰ ہوگا۔ میں تم کو اسی کی نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دعویٰ نہ کرنا۔ نبوّت کا دعویٰ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم یوں کہو کہ میں نبی ہوں۔ بلکہ اپنے اندر خاص وہ شان پیدا کر کے جو نبی کے اندر ہوتی ہے یوں کہے کہ جو میں کہہ رہا ہوں وہی حق ہے اس کے خلاف سب باطل ہے۔ اس چیز کا مدعی بننا دَرپردہ نبوّت کا دعویٰ ہے۔ اور جو یوں کہے کہ میں نے ارادہ کرلیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے مخلوق کٹ جائے' خون بہہ جائے مگر یہ ہو۔ یہ درپردہ خدائی کا دعویٰ ہے یہ خدا کا کام ہے کہ جو ارادہ فرمائے وہ اٹل ہو۔ تو میں نے جو یہ کہا ہے کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنے ارادے کو یوں مت سمجھنا کہ یہ اٹل ہے اور ہونا ہی چاہئے اور اس کے خلاف ممکن نہیں حالانکہ ہر چیز میں تمہارا خلاف ممکن ہے۔ یہ تو ہوا دعویٰ خدائی کا حاصل۔

اور دعویٰ نبوّت کا حاصل یہ کہ جو تمہاری زبان سے نکل جائے اس پر جمے رہو گویا کہ اس کے خلاف باطل ہے حالانکہ یہ ناممکن ہے وہ خدا کا مقام ہے اور یہ نبی کا مقام ہے۔

تو حضرت شیخ نے بڑے بلیغ پیرائے میں نصیحت فرمائی۔ ظاہر میں تو بڑی وحشت ناک نصیحت تھی کہ خدائی کا دعویٰ نہ کرنا' نبوّت کا دعویٰ مت کرنا۔ مگر جب معنیٰ بیان کئے خدائی اور نبوّت کے تو سمجھ میں آگیا۔ معلوم ہوا کہ بہت سے آدمی دَرپردہ خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ جو جمود کرتے ہیں کہ وہی صحیح ہے جو ہم کہہ رہے ہیں وہ درپردہ نبوّت کا دعویٰ کرتے ہیں ورنہ ان پر کوئی وحی یا اِلہام آرہا ہے کہ وہی حق کہہ رہے ہیں دوسرا حق کہہ ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ مسئلہ جو قرآن وحدیث سے ثابت شدہ ہے اس کے بارے میں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہی حق ہے اس کے خلاف ہرگز نہیں۔ ہاں اپنی رائے اور فکر کے بارے میں یہ کہیں کہ یہ ہی حق ہے یہ نہیں ہونا چاہئے۔

ان جھگڑوں کا فیصلہ جب ہی ہو سکتا ہے جب امّت کا نظام بنا ہوا ہو پھر اس قسم کے مدّعی مغلوب ہو جائیں گے اور واقعی جو حقّانی لوگ ہیں وہ غالب آجائیں گے۔ یہ کام ہے نظام و تنظیم کا جب تک تنظیم نہ ہو' نظام نہ ہو اس وقت تک معاملہ نہیں سلجھ سکتا ہے۔ اس خدمت کو انجام دیا ہے خلفاء اسلام نے۔ یہ ہی درحقیقت ملک کے نظام اور تنظیم ملّت کے ذمّہ دار تھے۔ ان ہی حضرات نے امّت کو جوڑا ہے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع

ہے۔

محافظینِ شئونِ نبوّت کی تعظیم ضروری ہے

خلفاء اسلام نے تنظیمِ ملّت کی ذمّہ داری قبول کی۔ امراء اسلام نے جھگڑوں اور فیصلوں کو نمٹایا اور عرفاء م نے اخلاق درست کئے اور فقہاء اسلام نے عبادات کو صحیح کیا اور حکماء اسلام نے عقائد کو درست کیا۔ نچ طبقے اکابر اہل اللہ کے ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے جنہوں نے ان پانچ شعبوں کو مضبوط کیا اور مضبوط ں پر قائم کیا اور اُمت کے سامنے پیش کیا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے وہ یہ کہ ایک مقدمہ ہوا' تفصیل اس میں بہت ہے مگر میں تفصیل نہیں کر سکتا۔ اسی لئے میں نے ایک لفظ کہا تھا کہ طالب علمانہ انداز میں کہوں گا' یہ تو محض طالب انداز ہے جو درس و تدریس میں طالب علموں کے سامنے کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ آپ عرفی طور پر طالب علم ہیں مگر حقیقتاً تو طالب علم ہیں ورنہ جلسوں میں کیوں آتے علم کی طلب ہی تو آپ کو لے کر آئی ہے۔ بھی طالب علم ہیں اور میں بھی ایک طالب علم ہوں۔ اور آپ سے کم رتبہ ہوں۔ درس و تدریس نہ سہی ہ تو سمجھ جائیں گے۔

میرا اندازہ تو یہ ہے کہ اتنی بات تو آپ سمجھ گئے ہوں گے جو میں نے کہی ہے کہ پانچ شعبے ہیں اور ان پانچ کو پانچ طبقات نے اٹھایا ہے اور وہ طبقے سب کے نزدیک معظّم و مکرّم ہیں اس لئے امراء اسلام بھی ہماری آنکھ ہیں۔ اسی طرح عرفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں اور خلفاء اسلام بھی ہماری ایک آنکھ ہیں تو اپنی کس آنکھ کو پھوڑ لے سب کو یکساں طور پر ہم کو اپنے سر پر رکھنا پڑے گا اسی بنا پر سب ہمارے نزدیک مکرّم ہیں سب کے آگے گردن جھکانا ہمارا کام ہے۔

گر کوئی شخص محدّث کے آگے گردن جُھکادے اور فقیہ کے خلاف کرے وہ درحقیقت اُمتی ہونے کا نہیں دے رہا ہے۔ امت کا صحیح فرد وہ ہے کہ حکماء' فقہاء' صوفیاء' عرفاء' امراء' خلفاء سب کو واجب سمجھ کر سب کے آگے گردن جُھکادے' اس لئے کہ یہ پانچوں طبقے وہ ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ لم کی ایک ایک شان کو سنبھالا ہے۔ آپ کی ایک شان عقیدے کی ہے ایک شان عبادت کی ہے' ایک خلاق کی ہے' ایک شانِ معاملات کی ہے۔ ایک شانِ خلافت و تنظیم ملّت کی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ شانیں ہیں انہیں ٹکرانے کا یہ مطلب ہے کہ حضورؐ کی شانوں میں پیدا کر رہے ہیں جو لوگ ان میں باہم ٹکردے رہے ہیں۔ یہ سوائے جہل کے اور کیا ہو سکتا ہے شئونِ ں ٹکراؤ پیدا کرنا علم والے کا کام نہیں ہے اور نہ علم والے کا کام یہ ہے کہ طبقاتِ امت میں ٹکراؤ پیدا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک کے سامنے گردن جھکادے اور ہر ایک کی تعظیم و تکریم ضروری سمجھے۔

نظمِ مسائل

ب دوسری بات اور سمجھ لیجئے وہ بھی طالب علمانہ ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر طبقے نے کتاب و سنت سے کیا ہے یعنی اسلامی مسائل بے تُکے نہیں ہیں۔ ہر مسئلہ ایک لڑی کے اندر پرویا ہوا ہے اور مسائل کا م ہے اور پورے مسائل منظم ہو کر ایسے ہیں جیسے موتیوں کا ایک ہار ہوتا ہے۔ اگر ایک موتی بیچ سے تو ہار ناقص ہو جائے گا اور چونکہ ہر کڑی دوسری کڑی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے لہٰذا ہر شعبہ نہایت

منتظم ہے۔

تنظیم بِلا امام ممکن نہیں

آپ جانتے ہیں کہ نظم و تنظیم بغیر امام کے نہیں ہوتی ہے مثلاً اگر تسبیح میں ایک ہزار دانے ہیں مگر امام نہ ہو جسے اَلْعُقْدُ کہتے ہیں۔ وہ ایک لمبا دانہ ہوتا ہے تسبیح کے درمیان وہ اگر بیچ میں نہ ہو تو وہ تسبیح نہ ہوگی بلکہ مالا کہلائے گی۔ اگر تسبیح ہی بنانی ہے تو ایک گرہ بیچ میں ضرور ہونی چاہئے جسے آپ امام کہیں گے۔ اسی سے سارے دانے جُڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ گرہ آپ اگر کھول دیں تو سارے دانے بکھر جائیں گے۔

جھاڑو میں ہزاروں سینکیں ہوتی ہیں۔ ایک سینک کو آپ چٹکی سے مَسل دیں تو وہ ٹوٹ جائے گی لیکن اگر بندھن باندھ کر جھاڑو بنائیں تو گھر کا کوڑا کباڑ آدھ گھنٹے میں صاف کردیں گی۔ ایک سینک یہ کام نہیں کرسکتی ہے۔ ساری سینکیں مل کر پھینکیں گی۔

اور ملنے کی شرط یہ ہے کہ ان میں بندھن بندھے وہی بندھن ان کا امام ہے اگر ان میں بندھن نہ ہو تو منتشر ہوجائیں گی۔ بکھر جائیں گی۔ کوڑا کباڑ تو کیا صاف کرتیں وہ خود کباڑ بن جائیں گی۔ لیکن اگر بندھن باندھ دیا اور ایک ڈورے کے تابع کردیا ان کو تو سارے گھر کا کوڑا صاف ہوجائے گا اور وہ جھاڑو ایک جگہ رکھی ہوئی موزوں نظر آئے گی۔ گویا کہ صاف کرنے کا آلہ موجود ہے۔ جو بڑے سلیقہ سے رکھا ہوا ہے۔ بغیر امام و بندھن کے نظام قائم نہیں ہوسکتا ہے۔

اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے ہر چیز میں اس نے نظم قائم کیا ہے کہ جماعت سے نماز پڑھو اور جماعت کے اندر بھی پھر ترتیب قائم کی ہے کہ امام کیا کرے گا اور تم کیا کرو گے۔ امام کیا پڑھے گا اور تم کیا پڑھو گے۔ اس میں تمہیں آزادی نہیں بلکہ ایک نظم کے تحت نماز پوری کرنی ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے :

اذا قال الامام ولا الضالین فقولوا اٰمین

یہ حدیث کا آخری ٹکڑا ہے مطلب یہ کہ جب امام اللہ اکبر کہے سب اللہ اکبر کہو، جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو۔ وہ سجدے کرے تم بھی سجدہ کرو۔ وہ قیام کرے تم سب قیام کرو اور جب امام ولا الضالین کہے تم آمین کہو اور جب وہ سلام پھیرے تو تم بھی سلام پھیرو۔

تو تم کلیۃً امام کے تابع ہو ہر نقل و حرکت میں اگر تابع نہ ہوئے اور اطاعت نہ کی تو آپ جماعت سے نکل جائیں گے۔ اگر آپ نے امام سے پہلے سلام پھیر دیا تو بس گئی آپ کی نماز۔ اس لئے کہ آپ امام سے منحرف ہوگئے۔ جماعت کی نماز بن نہیں سکتی جب تک آپ اطاعت کامل نہ کریں۔ لیکن انفرادی طور پر اللہ نے اجازت دی ہے کہ پڑھ لیا کرو جتنی چاہے پڑھو، لیکن جماعت سنتِ مؤکدہ ہے۔ اور بعض ائمہ کے یہاں واجب قرار دی گئی ہے اور بعض کے یہاں فرض ہے کہ اگر نماز یا جماعت ترک کردی تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کو قتل کردو یا جیل میں ڈال دو۔ امام ابو حنیفہؒ کے یہاں یہ سہولت ہے کہ وہ جماعت کو سنتِ مؤکدہ کہتے ہیں جو قریب قریب واجب کے ہوتی ہے تو جماعت بن نہیں سکتی۔ جب تک امام نہ ہو اور امام، امام نہیں ہوسکتا جب تک کہ سب مطیع نہ ہوں۔ امام بنادیا اور مقتدی کھڑے ہوگئے۔ لیکن کوئی تکبیر کہتا ہے تو کوئی اس کے بجائے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتا ہے۔ کسی نے سجدہ کیا تو کسی نے رکوع کیا، کسی نے مغرب کی طرف منہ کیا تو کسی نے مشرق کی طرف منہ کیا تو امام ہوا نہ ہوا برابر ہے۔ امام جب ہی بنتا ہے کہ جب سب مطیع ہو

سمع وطاعت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

اسمعوا واطيعوا ولو امر عليكم عبد حبشي مجدّع الاطراف۔

"سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر امیر مقرّر کردیا جائے کسی ایسے حبشی غلام کو جس کے ہاتھ پیر بھی کٹے ہوئے ہوں"۔

کوئی صورت وجاہت کی نہ ہو اور قوم مل کر اسے امیر بنادے تو مأمورین پر سمع وطاعت فرض ہے اس کے خلاف مت کرو، اُمت کا نظم جب ہی باقی رہ سکتا ہے۔ نماز فرض کی تو اس میں جماعت کا حکم دیا اور جماعت کے لئے امام بنانے کی لازمی طور پر ضرورت پڑے گی۔

فرائضِ امیر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے چند صحابہ ؓ کو ساتھ لے کر سفر کیا حضرت صدّیق اکبر ؓ نے فرمایا کہ بھائی کسی کو امیر مقرّر کرلو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ سے زیادہ افضل ہم میں کون ہے کہ جسے امیر بنادیں، آپ افضلُ الصحابہ رضی اللہ تعالٰی عنہ ہیں۔ فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں، کوئی اور بن جائے۔ عرض کیا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آخر کار سب نے مل کر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو ہی امیر بنادیا۔

حضرت ؓ نے فرمایا کہ جب میں امیر بن گیا تو اطاعت کروگے۔ عرض کیا کہ لازمی طور پر کریں گے۔ عہد پیمان لیا کہ منحرف تو نہیں ہوگے۔ عرض کیا کہ قطعاً نہیں ــــ جب منزل پر پہنچے تو سب کے بستر کھول کر بچھانے شروع کئے۔ لوگوں نے کہا حضرت ہم بچھائیں گے۔ فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو۔ امیر کی طاعت واجب ہے کسی کو بسترہ نہیں بچھانے دیا، کبھی جگہ صاف کررہے ہیں، کبھی کپڑے بچھارہے ہیں۔ جہاں کوئی آیا کہ حضرت میں کروں گا یہ کام، فرماتے کہ میں امیر ہوں۔ امیر واجبُ الاطاعت ہوتا ہے۔

لوگ عاجز آگئے۔ کھانا پکانے کا وقت آتا، تو جنگل سے لکڑیاں لارہے ہیں۔ کبھی بازار میں گوشت خریدنے جارہے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا۔ حضرت! ہم یہ کام کریں گے۔ فرمایا کہ امیر کے کام میں دخل مت دو۔ لوگ عاجز آگئے کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہوگئے کہ ہمارے امام مقتداء، بڑے اور ساری خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے جوتے بھی سیدھے کررہے ہیں۔ بستر بھی بچھارہے ہیں۔ کھانا بھی پکارہے ہیں اور کوئی بول بھی نہیں سکتا ہے اور جہاں کوئی بولا تو انہوں نے کہا کہ میں امیر ہوں واجبُ الاطاعت ہوں، اس لئے لوگ عاجز آگئے۔

عجیب لطیفہ

اس سفر میں ایک لطیفہ بھی پیش آیا وہ بھی سنادوں گو مضمون سے متعلق نہیں مگر اس واقعہ کا جز ہے کہ ایک روز حضرت صِدّیق اکبر ؓ نے کھانا وغیرہ پکادیا مگر کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیا کسی کام سے باہر تشریف لے گئے۔ ایک صحابی ؓ کو بھوک بے تحاشہ لگی۔ انہوں نے کھانے کے نگران سے کہا کہ بھائی، کم از کم مجھے ایک

روٹی دے دو، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔ نگران نے کہا جب تک امیر نہیں آئیں گے اور ان کی اجازت نہیں ہوگی تو میں کھانا نہیں دوں گا۔

انہوں نے بہت منت سماجت کی کہ بھائی مجھے ضعف طاری ہو رہا ہے۔ بھوک ستا رہی ہے۔ ایک آدھ روٹی دے دو، کچھ سہارا ہو گا۔ انہوں نے پھر انکار کیا اور ان کو روٹی نہیں دی۔

تو صحابہؓ جیسے مقدس ہیں ویسے ہی اندر خوش طبعی بھی ہے۔ فرمایا کہ اچھا میں تجھے سمجھوں گا نہ دے روٹی ___ اسی حال میں بھوکے بیٹھے رہے، کچھ دیر کے بعد وہ جنگل کی طرف اٹھ کر چلے، اچانک دیکھا کہ ایک دیہاتی اونٹ پر بیٹھا ہوا آرہا ہے وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ لباس سے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی گاؤں کا بڑا آدمی ہے اور اچھی خاصی عمدہ اونٹنی پر سوار ہو کر آرہا ہے۔ ان صحابیؓ نے کہا کہ چودھری صاحب کہاں جا رہے ہو۔ انہوں نے کہا مجھے ایک غلام خریدنا ہے کھیتی باڑی کے کام کے لئے۔

انہوں نے کہا کہ میرے پاس غلام موجود ہے اور پانچ سو درہم میں بیچ سکتا ہوں۔ چودھری صاحب نے کہا کہ پانچ سو درہم کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر غلام اچھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بہت سمجھ دار ہے معاملہ طے ہو گیا اور پانچ سو درہم لے کر اشارہ ان کی طرف کیا جنہوں نے روٹی نہیں دی تھی کہ وہ بیٹھا ہوا ہے اس کو جا کر پکڑ لو۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے دماغ میں تھوڑی سی سنک ہے جب کوئی پکڑنے جاتا ہے تو کہتا ہے کہ میں غلام کب ہوں؟ میں تو آزاد ہوں اس کا خیال نہ کیجیو۔ انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا بعضوں کے دماغ میں ہوا ہی کرتی ہے۔ ایسے ہی انہوں نے کہا کہ چلائے گا بھی کہ میں غلام کب ہوں؟ ___ میں تو حُر ہوں۔ آزاد ہوں اس کا بھی خیال نہ کیجیو۔ یہ اس کی عادت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں سمجھ گیا ہوں۔

چودھری صاحب نے جا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ چل میرے ساتھ، اس نے کہا کہ کہاں چلوں، چودھری صاحب نے کہا کہ میرے گھر۔ اس نے کہا کہ کیوں، کہنے لگے کہ میں نے تجھے خریدا ہے۔ اس نے کہا کہ واللہ میں غلام نہیں ہوں میں تو آزاد ہوں اس نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ تیری عادت یہی ہے۔ اب یہ چلا رہا ہے کہ میں آزاد ہوں۔ حُر ہوں۔ مگر چودھری صاحب نے ایک نہ سُنی۔ چودھری صاحب چونکہ طاقت ور تھے زبردستی اُٹھا کر اونٹ پر سوار کیا اور لے جانا شروع کیا اور اس نے ہائے وائے شروع کی کہ مجھے غلام بنا دیا، میں تو آزاد ہوں۔ اس نے کہا کہ میں تیری ساری داستان سن چکا ہوں۔ تیری عادت ہی یہ ہے۔

اِدھر سے صدیق اکبرؓ چلے آرہے تھے دیکھ کر یہ چلائے کہ امیر المؤمنین میرا تو ناطقہ بند کر دیا ہے اور مجھے غلام بنا دیا ہے اور یہ چودھری مجھے لئے جا رہا ہے۔ صدّیق اکبرؓ کا سبھی لوگ احترام کرتے تھے۔ چودھری اُتر سواری سے اور سلام عرض کیا، حضرت نے فرمایا کہ بھائی یہ تو میرا ساتھی ہے اسے تو کہاں لئے جا رہا ہے۔ کہنے لگا حضرت جی، میں نے تو اسے پانچ سو درہم میں خریدا ہے۔ فرمایا کہ یہ غلام نہیں، یہ آزاد ہے یہ کس نے بیچا ہے۔ اشارہ کیا کہ فلاں صاحب نے بیچا ہے۔ میں نے رقم بھی ان کو ہی دی ہے۔ انہوں نے کہا کہ غلام موجود ہے لے جاؤ، حضرت صدیق اکبرؓ سمجھ گئے کہ کسی نے مذاق کیا ہے ان کے ساتھ۔ جب واپس آئے تو جنہیں روٹی نہیں ملی تھی انہوں نے آنکھ سے اشارہ کر کے کہا کہ اب کہو کیا حال ہے۔ تو نے مجھے روٹی سے عاجز کر رکھا۔ اب بتا۔ صدیق اکبرؓ جب پہنچے تو فرمایا، کیا واقعہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! ___ مجھے بہت بھوک لگ رہی تھی میں نے اس کی بہت منّت کی کہ بھائی آدھی ہی روٹی دے دو، کچھ سہارا ہو جائے گا۔ اس نے کہا کہ جب تک امیر نہیں آئیں گے میں نہیں دوں گا تو میں نے بھی ایک مذاق کیا کہ اس کو پانچ سو درہم میں بیچ دیا۔ تو حضرت صدّیق اکبرؓ بہت ہنسے وہ پانچ سو درہم واپس کئے گئے، جب اس کی گلو خلاصی ہوئی ___ یہ

واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سنایا گیا تو آپ مسکرائے اور منہ پر رومال رکھ لیا جب بھی اس واقعہ کا
ذکر آتا تو حضورؐ مسکراتے اور منہ پر رومال رکھ لیتے۔ گویا یہ عجیب لطیفہ بن گیا۔

نظمِ اجتماعیت

یہ واقعہ اس پر یاد آیا تھا کہ نماز کے اندر بھی جماعت رکھی ہے اور اس جماعت کا ایک امام مقرر کیا ہے اور
وہ بھی مُطاع جس کی اطاعت کی جائے' سفر پیش آئے تو اس میں ایک امام بنالیا جائے تاکہ سفر منظم ہو گھر میں
اگر ہو تو ایک کو بڑا سمجھ لو اور اس کے احکام کی تعمیل کرو گھر میں نظام پیدا ہوگا۔ حج رکھا تو اس میں امامُ الحج مقرر
کیا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ زکوٰۃ رکھی تو بیتُ المال ___ میں ایک کو امام مقرر کیا کہ وہ ہر چیز کی زکوٰۃ
وصول کیا کرے تو ہر چیز میں ایک جماعتی اور اجتماعی نظم قائم کیا اور اس کا ایک ایک امیر مقرر کیا اور اس کی سمع
وطاعت واجب قرار دی کہ اس کی اطاعت کرو۔

اسی طرح ہر فن کا ایک امام مقرر ہے عقیدہ میں مرکز حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات ہے اس میں امام مقرر کئے
گئے۔ چنانچہ عقائد میں دو بڑے بڑے امام ہیں۔ ایک امام ابو منصور ماتریدی ہیں اور ایک امام ابوالحسن اشعری
ہیں یہ دو امام ایسے سمجھے جاتے ہیں کہ جن کی رائے فنِ عقائد میں فن کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی لئے بعض لوگ
اشعری ہیں اور بعض لوگ اپنی نسبت دوسرے امام کی طرف کرکے اپنے آپ کو ماتریدی کہتے ہیں ان میں
آپس میں کچھ تھوڑے بہت اختلافات بھی ہیں مگر وہ اختلافات لفظی کے قریب قریب ہیں۔ عقائد سب کے
ایک ہیں' جب اس فن کا کوئی بڑا مسئلہ پیش آوے تو رُجوع کرو اس کی طرف کہ امام ابوالحسن نے یہ کہا ہے۔

فقہ کا مسئلہ ہو تو اس میں ایک امام مقرر کرو امام شافعیؒ ہوں' امام ابو حنیفہؒ' امام مالکؒ ہوں جب کوئی مسئلہ
اختلافیہ آئے تو کسی ایک کی اطاعت کرلو تاکہ تمہارے اندر نزاع نہ پیدا ہو۔

مبنی برحجّتہ اختلاف مذموم نہیں

اس لئے کہ مسئلہ میں نزاع نہیں۔ مسئلہ میں اگر اختلاف ہو تو اختلاف حجّت کا ہوتا ہے۔
اور نزاع وجدال جو ہوتا ہے وہ نفسانی جذبے کے تحت ہوتا ہے اور وہ بُرا ہوتا ہے ___ اور حجّت سے
اختلاف ہوتا ہے وہ بُرا نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ ہر اختلاف بُرا نہیں ہے۔
مثلاً چور اور ڈاکو اتفاق کرلیں تو یہ اتفاق اچھا نہیں ہے۔ برائی میں اگر لوگ متحد ہو جائیں تو وہ اتحاد بھی
ہوگا اور اگر بھلائی کے اوپر لوگ جمع ہو جائیں تو وہ اتحاد اچھا ہوگا۔

اب اختلاف کو لے لو اگر اختلاف حجّت سے ہو اور اللہ ورسول کا حوالہ دیانت سے ہو تو وہ ایک پہلو ہے
دین کا۔ وہ اختلاف تو ہوگا مگر جھگڑا نہ ہوگا۔ کیونکہ حجّت اس میں موجود ہے یہ جھگڑے اصل میں ہم ا
جذبات سے کرتے ہیں اور مسئلوں کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑنا نہیں ہے اگر مسئلوں کی خاصیت
ہوتا تو پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی کہ کوئی رفع یدین کر رہا ہے کوئی نہیں کر رہا ہے۔ کوئی آمین بالجہر کر رہا
کوئی آمین بالسِّر کر رہا ہے۔ کوئی فاتحہ کو امام کے پیچھے واجب قرار دیتا ہے اور کوئی ناجائز قرار دے رہا ہے تو س
سے پہلے تو صحابہؓ میں لاٹھی چلتی اگر مسئلہ کی خاصیت لڑنا ہوتا۔ مگر سب اپنے اپنے مسلک پر عمل کر رہے
اور ایک دوسرے کی عظمت بھی قلب میں لئے ہوئے ہیں۔ پھر اس کے بعد ائمہ مجتہدین میں ڈنڈا چلتا جن
اختلاف چلتا خوب لڑائی ہوتی مگر سارے آئمہ باہم متحد ہیں اس لئے کہ وہ اختلافات فروعی ہیں اور بنیاد
سب کی ایک ہیں۔ اس لئے قلوب میں سب ایک دوسرے کی عظمت لئے ہوئے ہیں ___ حتی کہ امام شا

بغداد میں امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر حاضر ہوئے تو فاتحہ پڑھی اور ایصال ثواب کیا۔ وہیں مسجد تھی۔ جب نماز کا وقت آیا تو نماز پڑھی اور اپنا مسلک ترک کر کے امام اعظمؒ کے مسلک کے مطابق نماز پڑھی اور امام شافعیؒ کا مسلک جو کہ مستحب کے درجہ میں تھا یعنی رفع یدین نہیں کیا اور آمین زور سے نہیں کہی۔ پوچھنے پر امام شافعیؒ نے فرمایا کہ :

> "مجھے صاحب مزار سے حیا آتی ہے کہ میں ان کے قریب ہو کر ان کے مسلک کے خلاف عمل کروں۔ جس جس مسئلہ میں گنجائش تھی اس میں فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھی اور جہاں جہاں جائز و ناجائز کا اختلاف تھا اس میں وہ معذور تھے"۔

چونکہ ان کی عظمت قلب میں موجود تھی اس لئے ایسا کیا تو معلوم ہوا کہ مسئلہ کی خاصیت لڑائی نہیں بلکہ اپنے نفسانی جذبات سے لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا رکھا ہے۔

آمین بالشر

ہمارا بچپن کا زمانہ تھا ہمارے ہاں سہارنپور میں مارچ نام کا ایک کلکٹر تھا۔ تھائی لینڈ کا رہنے والا۔ نسلاً یورپین تھا۔ مگر مذاق و ذوق اس کا ایشائیت کا تھا کیونکہ اس کی پیدائش ہندوستان کی تھی۔ اس کے زمانے میں ایک جھگڑا پیش آیا کہ ایک حنفی کہیں اہل حدیث کی مسجد میں چلا گیا۔ انہوں نے زور سے آمین کہی۔ اس نے آہستہ سے کہی۔ وہاں سب جہلا جمع تھے انہوں نے اس کی مار پٹائی کی کہ اس نے زور سے آمین نہیں کہی۔

پٹتے پٹتے وہ چلایا کہ حنفیو! دوڑو، دوڑو، تمام حنفی جمع ہو گئے انہوں نے اہل حدیث پر حملہ کر دیا۔ اب اہل حدیث چلائے کہ اے اہلحدیث دوڑو! ادھر سے اہل حدیث آ گئے۔ غرض لاٹھی چلی کتنوں کے ہی سر پھٹے۔ بلوۂ عام ہو گیا۔ فریقین سے رپورٹ درج کرائی۔

مارچ کا زمانہ تھا اس کے یہاں مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین کے وکلاء نے بحث کی آمین کے مسئلہ میں اب اس کی سمجھ میں نہ آئی اس نے کہا کہ بھائی کیا آمین کسی جائیداد کا نام ہے یا کوئی جاگیر ہے یا کوئی بلڈنگ ہے۔ آخر تم کس چیز پر لڑ رہے ہو۔ انہوں نے کہا صاحب! مسئلہ ہے۔ اس نے کہا کہ مسئلے پر کیوں لڑتے ہو۔ لڑائی عورت پر ہوتی ہے دولت پر ہوتی ہے۔ جائیداد پر ہوتی ہے۔ مسئلہ پر کیوں لڑتے ہو۔ آخر یہ لڑائی کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب ایک حدیث میں آیا ہے کہ آمین زور سے کہو اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ آہستہ سے پڑھو۔ اس نے کہا بھائی، جسے زور سے پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ زور سے پڑھے اور جسے آہستہ پڑھنے کی حدیث پہنچی ہے وہ آہستہ سے پڑھے۔ آپس میں لڑتے کیوں ہو۔ اپنی اپنی حجت پر عمل کرو۔ اس کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ آمین پر لڑائی کیسے ہو سکتی ہے۔ بات بھی ایسی ہی سمجھ میں نہ آنے کی تھی۔ اس نے تحقیق کر کے فیصلہ لکھا اور فیصلہ بڑا دانش مندانہ لکھا۔ اس نے لکھا کہ میں روداد مسل کو دیکھ کے اس نتیجے پہنچا ہوں کہ :

> دو مسلمانوں کے یہاں آمین کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) آمین بالجہر یعنی زور سے آمین پڑھنا۔ (۲) آمین بالسِّر یعنی آمین آہستہ سے پڑھنا (۳) آمین بالشر یعنی جھگڑا اٹھانے کے لئے آمین پڑھنا۔ یہ جتنا جھگڑا ہے نہ آمین بالجہر کا ہے اور نہ آمین بالسر کا کیونکہ دونوں کے بارے میں پیغمبرؐ سے حدیث وارد ہے اور یہ جھگڑے کی چیز نہیں۔ یہ سارا جھگڑا آمین

بالشر کا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں فریق مفسد ہیں۔ میں دونوں کو سزا کرتا ہوں"۔

مسائل کی آڑ میں اندرونی بخار نکالنا

مطلب یہ کہ ہم لوگ آپس میں نفسانی جذبے کے تحت لڑتے ہیں اور مسائل کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ مسئلے کی خاصیت لڑائی نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کتاب وسنت کی حجت ہے اس پر عمل کریں۔ لڑائی کے کیا معنی اور نفرت کے کیا معنی؟ آپس میں مل کر رہو اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو جبر تھوڑا ہی ہے۔ ان کے پاس بھی حجت ہے وہ اس پر عمل کر رہا ہے۔ یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ وہ فاسق ہے۔ کافر ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے۔ لہٰذا میری بات مانو۔ دوسرا باطل محض ہے۔ اس لئے وہ حق پر نہیں ہے۔ یہ کہنا غلط بات۔ یہ مسائل صرف آڑ ہیں ورنہ حقیقی لڑائی تو نفسانی جذبات کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ لڑ لڑ کر مسلمانوں نے حکومتیں برباد کیں اپنی جائیدادیں تباہ کردیں اپنی بلڈنگیں برباد کردیں، جب یہ دنیا چلی گئی تو رہ گیا دین اور لڑنا ضروری تھا۔ اس سے ہٹ نہیں سکتے تھے۔ کہا کہ اب دین کو آڑ بناؤ۔ اب جائیدادیں نہیں تو مسئلوں پر لڑو۔ فروعات پر لڑو۔ یہ صرف نفسانی جھگڑے ہیں۔ اگر حجت ہاتھ میں ہے تو اس میں جھگڑا ہی نہیں۔

امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ چونکہ حدیث میں آیا ہے اس لئے زور سے آمین کہتا ہوں۔ امام ابوحنیفہؒ کہیں گے کہ آپ معذور ہیں کیونکہ آپ کے پاس حجت ہے۔ میرے پاس حدیث ہے۔ میں آہستہ سے آمین کہتا ہوں چونکہ میرے پاس حجت ہے امام شافعیؒ کہیں گے آپ بھی معذور ہیں چونکہ آپ کے پاس بھی حجت ہے آپ بھی حق پر عمل کر رہے ہیں۔ میں بھی حق پر عمل کر رہا ہوں۔ معاملہ ختم ہوا نہ دوستی گئی، نہ نفرت پیدا ہوئی۔ نہ جھگڑا پیدا ہوا اس لئے کہ حجت ہے۔ جہاں اختلاف بلا حجت ہوتا ہے۔ تعصب سے، عناد سے، پارٹی بندی سے وہاں اصل میں لڑائیاں نفسانی جذبے کے تحت ہوتی ہیں۔ وہ مسئلے کی لڑائی نہیں ہوتی۔ وہ تو مسئلہ کو آڑ بنا کر اپنا اندرونی بخار نکالنا مقصود ہوتا ہے۔

توحید مقصد

میں عرض کر رہا تھا کہ فقہ کے مسئلے میں بہر حال کسی کو امام بنانا پڑے گا، جہاں اختلافی مسئلہ آوے کسی امام کی طرف رجوع کرے اور یہ فطری چیز ہے مثلاً آپ علاج کرائیں اور چار طبیبوں کی چار رائیں ہو جائیں۔ ایک کہے کہ میں گرم دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں ٹھنڈی دوائیں دوں گا۔ ایک کہے میں خشک دوائیں دوں گا۔ ایک کہے کہ میں تر دوا دوں گا۔ کیا کبھی آپ نے یہ کیا ہے کہ چونکہ طبیب آپس میں لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا مجھے انتقال کر کے قبر میں چلا جانا چاہئے۔ میں علاج نہیں کراؤں گا۔ چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ان اطباء میں سے آپ انتخاب کرتے ہیں کہ کسی ایک کی طرف رجوع کریں خواہ انتخاب کی کوئی بھی وجہ ہو۔ خواہ یہ وجہ ہو کہ یہ جامعہ طبیہ کا پڑھا ہوا ہے جو بہت بڑا طبی ادارہ ہے۔ لہٰذا یہ طبیب حاذق ہو گا۔ اس لئے اس کا علاج کراؤں گا۔

یا اس وجہ سے کہ اس کے مطب سے شفا پانے والے بہت ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نسخے تیر بہدف ہیں لہٰذا اس کا علاج کراؤں گا یا یہ وجہ ہو کہ یہ طبیب خاندانی طور پر طبیب ہے اس کے یہاں جدی طب چلی آرہی ہے۔ لہٰذا طب سے جو مناسبت اسے ہے وہ دوسروں کو نہیں ہے۔ اس بنا پر میں اس کا علاج

کراؤں گا کہ کوئی بھی وجہ ہو مگر آپ انتخاب کریں گے اس لئے کہ جان عزیز ہے محض اس بناء پر کہ اطباء میں اختلاف رائے ہے۔ آپ موت کو ترجیح نہیں دیتے زندگی پر۔ کہتے ہیں کہ زندگی رہنی چاہئے اور علاج ہونا چاہئے۔ ان اطباء میں سے کسی کو بھی منتخب کرلو۔

اگر علماء میں اختلافِ رائے ہو اور آپ یہ کہیں کہ علماء تو لڑ رہے ہیں لہٰذا ہم دین اسلام کو چھوڑ دیتے ہیں اور اَبدی موت کو ترجیح دیتے ہیں اور موت کو قبول کرتے ہیں۔ یہ آج تک کسی نے کیا ہے؟ انتخاب کرنا پڑے گا۔ جس کی طرف آپ جائیں یہ دیکھیں کہ اس کا علم مستند ہے۔ اس کے مشائخ سَند صحیح کے ساتھ نبی کریمؐ تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اور جو احکام یہ بیان کرتے ہیں ان کی سَند کا سلسلہ پیغمبرؐ تک پہنچا ہوا ہے۔ لہٰذا ہم ان کے مسائل پر عمل کریں گے۔ دوسروں کے مسئلے پر عمل نہیں کریں گے۔ کوئی بھی وجہ ہو مگر انتخاب کرنا پڑے گا۔

اطباء میں اختلافِ رائے ہو تو ان میں سے انتخاب کرتے ہیں اگر علماء میں اختلاف ہو تو دین سے بدظن ہوجاتے ہیں کہ صاحب! کس کی مانیں مولوی تو آپس میں لڑ رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جان زیادہ عزیز ہے ایمان زیادہ عزیز نہیں ہے۔ وہاں چونکہ جان عزیز ہے اس لئے ڈاکٹروں میں کتنے ہی شدید اختلافات ہوں کسی کا انتخاب ضرور کریں گے۔ یہاں اگر ایمان عزیز ہوتا تو کتنا ہی اختلاف ہوتا علماء میں کسی نہ کسی کا انتخاب ضرور کرتے اور اس کی پیروی کرتے چونکہ ایسا نہیں ہے معلوم ہوا کہ جان تو عزیز ہے مگر ایمان عزیز نہیں ہے۔

بہرحال اپنا امام ضرور بنانا پڑے گا اور اَشخاص میں سے انتخاب ضرور کرنا پڑے گا اور ایک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ طب کے اندر ہو تو رجوع کرنا پڑے گا کسی طبیب کی طرف۔ ایک دم چار کا علاج جاری کریں تو آپ کا مزاج فاسد ہو کر رہ جائے گا اور جلد ہی آپ قبر میں تشریف لے جائیں گے۔ اس لئے کہ ایک طبیب صبح کو ٹھنڈی دوا دے گا تو دوسرا شام کو گرم دوا دے گا' تیسرا تَر دوا دے گا' چوتھا طبیب خشک دوا سے علاج کرے گا تو مریض تختۂ مشق بن جائے گا اور وہ قبر میں جانے کی تیاری شروع کردے گا۔ اس لئے ایک ہی کا علاج کریں۔

توحیدِ مطلب

طریقت میں آپ نے بیعت کی تو وہاں بھی توحیدِ مطلب ہے کہ جس شیخ کے ہاتھ پر بیعت کریں یہ سمجھیں کہ میری دنیا و آخرت کی خوبی اسی شیخ میں ہے دوسرے کی طرف رُجوع مت کرو۔ ہاں عظمت سب کی کرو۔ احترام سب کا کرو مگر قلب کا علاج ایک ہی سے کراؤ۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اس کا نام توحیدِ مطلب ہے۔ یہ ہے کہ وَحدت ہونی چاہئے اس شخص کے لئے جس کو آپ نے شیخ بنالیا ہے۔ شیخ دو یا تین نہیں ہوں گے بلکہ ایک ہی ہوگا اور ایک ہی کے طریق پر چلنا پڑے گا۔

ہاں اگر یہ ثابت ہوجائے کہ یہ شیخ واقعی اہلِ سنت میں سے نہیں ہے بلکہ مبتدع ہے تو ترک کرسکتے ہیں۔ اس کے بعد پھر حضرات صوفیاء لکھتے ہیں کہ ترک کرکے دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرو مگر اس پہلے کی شان میں بے ادبی مت کرو' چاہے وہ اپنی ذات میں کیسا ہی ہو گستاخی مت کرو۔ ادب سے پیش آو۔ تو طریقت کے اندر توحید مطلب ہے اور طب کے اندر توحیدِ مطب ہے۔ تو آخر علم کے اندر توحید مقصد کیوں نہیں ہونا چاہئے اور کسی ایک امام کو کیوں مقرر نہیں کرتے کہ آپ اس کے فقہ پر عمل کریں۔ اگر ایسا نہیں کریں گے تو آپ ڈانواں ڈول رہیں گے' کبھی ادھر' کبھی ادھر اور یہ نفس کی اِتباع ہوگی کسی امام کا اِتباع بالکل نہ ہوگا اور شریعت

میں نفس کا اِتباع مطلوب نہیں۔

تو شریعت نے ہر معاملے میں نظم قائم کیا' عقائد میں الگ نظم ہے اور فقہ کے مسائل میں الگ نظم ہے مقصد یہ کہ اُمت جڑ جائے۔ چاہے اختلاف رائے بھی ہو مگر باہم متفق و متحد ہو جائیں۔

اسی طرح سے جب آپ حضراتِ صوفیاء کے پاس جائیں گے اور اپنے اخلاق کی تربیت کرائیں گے تو کے بھی مختلف طُرق پائیں گے۔ چشتیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ سہروردیہ کا اور طریق تربیت ہے۔ قادریہ وظائف اور ہیں مگر ہیں سب حضرات اہل اللہ اور سب حضرات اہل حق ہیں۔ لیکن چاروں میں آپ ایک بیعت کر کے چاروں سے علاج کرائیں تو دین فاسد ہو کر رہ جائے گا اس لئے کہ متضاد چیزوں پر عمل کیسے کریں للہذا ایک ہی طرف رُجوع کرنا پڑے گا۔ ہاں عظمت و احترام سب کا کرنا پڑے گا اور خادم سب کا بننا پڑے گا علاج ایک سے کرائیں۔

تو تصوّف کے اندر بھی توحیدِ مطلب ہے جیسے طب کے اندر توحیدِ مطب ہے۔ اور فقہ کے اندر توحید مق ہے۔

امیرِ معاملات

اسی طرح سے جب معاملات پیش آئیں تو کسی نہ کسی کو امیر تو بنانا پڑے گا مثلاً کوئی جھگڑا ہو' اب را چلتے ہوئے پوچھ رہے ہیں کہ بھائی کیسے فیصلہ کروں' ایک نے کہا کہ یوں کروں' دوسرے نے کہا کہ یوں تیسرے نے کہا کہ یوں کرو۔ اگر تینوں کی رائے پر عمل کیا تو وہ جھگڑا تو یوں ہی رہ جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ بھی فاسد ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی ایک متدین شخص کو اپنا امیر بنا لیا کہ بھائی! ہم تم سے فیصلہ چاہتے ہیں فیصلہ کرو گے ہمیں منظور ہے۔ اگر صحیح کرو گے۔ تب عمل کریں گے۔

اور اگر کوئی فکری غلطی بھی واقع ہو گئی تب بھی عمل کریں گے۔ مگر کرائیں گے فیصلہ آپ سے ہی ایک قسم کا اطمینان و سکون ہو جائے گا۔

اسی واسطے فقہاء لکھتے ہیں کہ قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہو جائے گی۔ قاضی جب حکم کر دے کہ یہ مسئلہ تو وہ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی نافذ ہو جاتا ہے یعنی اس کے خلاف پھر کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر بعد یہ بھی ثابت ہو کہ رائے کی غلطی تھی تو یہ بات نہیں کہ فیصلہ ٹوٹے گا' ایسا نہیں بلکہ جو فیصلہ ہو چکا وہ نافذ رہے گا۔ چونکہ وہ فیصلہ مِن جانب اللہ ہے' اور اس کے بغیر سکون و اطمینان قلبی اور یکسوئی نہیں ہو سکتی بنا پر قاضی کی قضا ظاہراً و باطناً نافذ ہو جاتی ہے اور اس کا ماننا لازم ہو جاتا ہے تو اُمراء اسلام اس لئے مقرر گئے تاکہ وہ جھگڑوں کے فیصلے کر سکیں۔

حقِ امارت

اگر خلیفۃ المسلمین اور بادشاہِ اسلام موجود ہے تو اصل امیر وہ ہے پھر جن کو وہ امیر مقرر کریں وہ امی جائیں گے۔ اگر اسلام کی حکومت نہیں ہے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ سب مل کر اپنا امیر مقرر کر لیں۔ اگر سارے ملک کے مسلمان ایک امیر پر جمع نہ ہوں تو خطوں کے امیر بنا لئے جائیں۔ ہر کا الگ امیر ہو اور تمام مأمورین پر اپنے اپنے امام کی اطاعت کرنا واجب ہے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ

یہاں پر تین اطاعتیں واجب اور فرض قرار دیں۔
اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت اور اُولی الامر یعنی امیر کی اطاعت۔

اطاعتِ ذاتی اور وصفی

قرآن تو قرآن ہی ہے وہ تو سرچشمہ ہے بلاغت وفصاحت کا اور معجزہ ہے۔ اس نے جہاں اللہ کی اطاعت فرض کی وہاں تو اللہ کا نام ذکر کیا کہ اَطِیْعُوا اللہ یعنی اللہ کی اطاعت کرو۔ اس کے معنی یہ ہیں اللہ بذاتہٖ واجبُ الطاعت ہیں کسی وصف کی وجہ سے ان کی اطاعت واجب نہیں ہے کہ جب اللہ کا نام آئے تو گردن جھک جانی چاہئے اَطِیْعُوا اللہ علم ذات کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ وہ بالذّات واجبُ الاِطاعت ہیں۔ ہم اور آپ کسی وصف سے واجبُ الاطاعت بنتے ہیں۔ آپ میں اگر علم آگیا تو علم کی وجہ سے آپ کی اطاعت ہوگی ورنہ آپ کی اطاعت نہ ہوگی۔ مثلاً کوئی جاہل ہے اس کی کوئی بھی اطاعت نہیں کرتا۔ ہاں علم کا وصف اگر آجائے تو اطاعت کرنے لگیں گے۔

اگر کوئی باپ ہے تو باپ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت شروع ہوجاتی ہے۔ کوئی استاد ہے تو استاد ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت ہونے لگی کوئی شیخ ہے۔ تو شیخ ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی تو انسان بذاتہٖ واجبُ الاطاعت نہیں بلکہ بالاوصاف واجبُ الاطاعت ہے۔ جب کوئی وصف کمال پیدا ہوگا۔ اس کی وجہ سے اس کی اطاعت ہوگی۔

لیکن حق تعالیٰ شانہٗ بذاتہٖ واجبُ الاَطاعت ہیں۔ صفات تو ذات کے تابع ہوا کرتی ہیں کیونکہ وہ ذات کا پرتو ہیں۔ دراصل سرچشمہ کمالات کا ذات ہے اور صفات اس لئے مقبول ہوئیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں مگر اصل ان سب کی ذات ہی ہے اور جب آگے کی اطاعت بتلائی گئی تو یوں نہیں فرمایا گیا کہ :

اطیعوا عیسٰی یا اطیعوا موسٰی یا اطیعوا محمداً۔

بلکہ فرمایا اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

یعنی رسول وصفِ رسالت کی وجہ سے واجبُ الاطاعت ہیں ___ اسی وجہ سے اگر وہ کوئی ذاتی مشورہ دیں تو واجبُ الاطاعت نہیں ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اپنی محبت کی وجہ سے ان کی منشاء کی بھی اطاعت کریں۔ لیکن قانونِ شریعت یہ ہے کہ اگر رسول کوئی ذاتی رائے دیں تو واجبُ الاطاعت نہیں البتہ جب یہ فرمائیں کہ میں حکمِ خداوندی پہنچارہا ہوں تو وہ واجبُ الاطاعت ہے۔ جب رسالت پہنچائیں گے تو اطاعت کرنا فرض ہے اور جب یوں فرمائیں کہ میرا ذاتی مشورہ ہے تو آپ مختار ہیں۔ اور معذرت بھی کرسکتے ہیں، ادباً چاہے آپ عمل کرلیں مگر آپ کے ذمے واجب نہیں ہے۔

جیسے کہ حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہوا۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی باندی تھیں اور ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مغیثؓ سے کردیا تھا۔ حضرت بریرہؓ حسین وجمیل اور بہت خوبصورت تھیں اور حضرت مغیثؓ کالے کلوٹے اور بدصورت تھے۔ اس لئے آپس میں بنتی نہ تھی۔ رات دن آپس میں کھٹ پٹ رہتی تھی اور رات دن لڑائی ہوتی رہتی تھی اور حضورؐ فیصلہ فرماتے تھے مگر بہرحال قصہ چل رہا تھا۔

حضرت عائشہؓ نے ان کو آزاد کردیا۔ اب وہ باندی نہیں رہیں اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ منکوحہ باندی جب آزاد ہوتی ہے تو نکاح اس کے قبضے میں آجاتا ہے۔ چاہے تو باقی رکھے چاہے تو فسخ کردے۔ اب جب کہ آزاد ہوئیں تو انہوں نے ارادہ کرلیا کہ میں نکاح کو باقی نہیں رکھوں گی بلکہ فسخ کردوں گی کیونکہ حضرت مغیثؓ سے

ان کی موافقت نہیں ہوتی تھی۔ پکا ارادہ کرلیا کہ اب میں ان کے نکاح میں نہیں رہوں گی۔
اور حضرت مغیثؓ ان پر سو جان سے عاشق تھے جب انہیں معلوم ہوا تو پریشان ہوگئے۔ کبھی صدیق اکبرؓ سے سفارش کراتے ہیں کبھی حضرت عمر فاروقؓ کے پاس جاتے ہیں کہ آپ ان کو سمجھادیں کہ وہ نکاح باقی رکھیں۔ انہوں نے سب کو جواب دے دیا کہ نہیں میں نکاح باقی نہیں رکھتی ___ آخر میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ یا رسول اللہ! آپ نے ہی یہ نکاح باندھا تھا۔ اب بریرہؓ اس نکاح کو توڑ رہی ہیں۔ آپ ان سے فرمادیں کہ اس نکاح کو باقی رکھو۔ اور حضرت مغیثؓ بے حد پریشان حال ہیں۔
مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ وقت دیکھنے کے قابل تھا کہ حضرت مغیثؓ مدینے کی گلیوں میں روتے ہوئے پھر رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو ہیں۔ داڑھی پر آنسو ٹپ ٹپ گر رہے ہیں کہ ہائے بریرۃ جُدا ہو گئیں۔ اس درجہ عشق تھا۔ تو حضورؐ سے جاکر عرض کیا کہ آپ فرمادیں نکاح باقی رکھنے کو۔ حضورؐ تشریف لے گئے اور فرمایا بریرہ نکاح مت توڑو مغیث سے۔ میں نے ہی وہ نکاح قائم کیا تھا تم اب بھی قائم رکھو۔ وہ بھی بڑی ذہین تھیں انہوں نے کہا :

"یا رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے یا آپؐ کا ذاتی مشورہ؟
آپؐ نے فرمایا، کہ نہیں حکم شرعی نہیں شرعاً تو تم آزاد ہو۔ نکاح باقی رکھو چاہے توڑ دو۔
یہ میرا ذاتی مشورہ ہے"۔

بریرہؓ نے کہا پھر تو میں نہیں مانتی ___ آخر کار نہیں مانا اور نکاح توڑ دیا تو معلوم ہوا کہ اگر نبی اپنی ذات سے کوئی مشورہ دیں تو وہ قانون واجبُ الاطاعت نہیں ہوتا، اگر رسالت پیش کریں کہ یہ حکم خداوندی ہے اس کی اِطاعت فرض ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب انبیاء بھی ذاتی طور پر واجبُ الاطاعت نہیں تو میری آپ کی کیا حقیقت ہے اور میں ذاتی بات کہوں اور اس پر ضِد کروں کہ نہیں اس کو ماننا ضروری ہے۔ قطعاً ضروری نہیں ہے۔ صرف ایک رائے ہے آپ کی، میری بھی ایک رائے ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جو حق ہو اس پر عمل کریں۔ تو اللہ نے جہاں اپنی اطاعت کا حکم دیا وہاں اپنا نام لیا ہے اور فرمایا اَطِيعُوا اللّٰهَ کہ اللہ کی ذات واجبُ الاطاعت ہے۔ آگے رسول کا نام نہیں لیا بلکہ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ فرمایا یعنی وصفِ رسالت کا تذکرہ کیا کہ اسی وصفِ رسالت کی وجہ سے وہ واجبُ الاطاعت ہیں کہ جب رسالت خداوندی پیش کریں تو گردن تسلیم خم کردو۔

اطاعتِ امیر کا معیار

وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ یہاں اَطِيعُوا کا لفظ بھی خصوصیت سے ذکر نہیں کیا جیسا کہ اَطِيعُوا وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ میں ذکر کیا تھا یہ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ پچھلے اَطِيعُوا کے نیچے ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ جو اُولی الْامر ہوگا وہ تابع ہوگا۔ نبی کریمؐ کے چونکہ آپؐ کا نائب بن کر آیا ہے۔ اس لئے واجبُ الاطاعت ہے۔ مستقلاً اس کی اطاعت نہیں۔ اللہ کے رسول کا فرمان نافذ کرے گا تو اطاعت واجب ہوگی ورنہ محض مشورہ ہوگا کوئی واجبُ الاطاعت نہیں اور اُولی الامر کا لفظ آخر میں ہے۔ اس کے بعد کوئی اطاعت نہیں۔
اس بنا پر تین اطاعتیں ہوگئیں۔ اللہ کی اطاعت۔ رسولؐ کی اطاعت۔ اُولی الْامر کی اطاعت۔
ہاں اگر اُولی الْامر کوئی غلط حکم دے ___ تو اس کی اصلاح کی جائے۔ اس لئے ذاتی حکم واجبُ الاطاعت نہیں۔ جب وہ یوں کہے کہ قرآن شریف میں یوں آیا ہے تو پھر وہ واجبُ الاطاعت ہے چاہے وہ استنباط ہی

ا ہو۔ نصِ صریح بھی نہ ہو کیونکہ وہ قرآن ہی سے کہہ رہا ہے۔ وہ قرآن ہی کا مصداق ہے۔ اس لئے اس
گردن پھیرنا جائز نہیں ہے۔

صلاحیت کی بنیاد پر چیف جسٹس کی تقرری

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب امیر المؤمنین تھے تو دربارِ خلافت میں ایک عورت حاضر ہوئی۔ اس نے
ں کیا کہ امیر المؤمنین! میرے خاوند کی آپ کیا بات پوچھتے ہیں۔ صائم الدّہر ہے۔ قائم اللّیل ہے۔ تمام
ں عبادتیں کرتا ہے اور تمام دن روزے رکھتا ہے۔

فرمایا کہ ماشاء اللہ۔ اللہ مبارک کرے بڑا اچھا خاوند ہے کہ عبادت گزار ہے' راتوں کو تہجد پڑھتا ہے۔
کو روزے رکھتا ہے مبارک ہو۔

وہ بچاری چپکی ہو کر چلی گئی۔ دربار میں ایک صحابیؓ موجود تھے جن کا نام اکثمؓ تھا وہ اُٹھے اور انہوں نے کہا
میر المؤمنین! آپ سمجھے بھی! یہ کیا کہہ کر گئی ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ خاوند کی تعریف کر کے گئی ہے
ا کہتی ہے؟

انہوں نے کہا کہ حضرت! اسے کیا مصیبت آئی تھی کہ وہ دربارِ خلافت میں آکر خاوند کی تعریف کرے کہ
ں اتنی پڑھتا ہے۔ روزے اتنے رکھتا ہے۔

کہنے لگے پھر کیا کہہ کر گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا' خاوند کی تعریف کرنے نہیں آئی تھی بلکہ اِستغاثہ اور دعویٰ
کے گئی ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ دعویٰ کیا کر کے گئی ہے۔ اکثمؓ نے کہا کہ دعویٰ یہ کیا ہے کہ ساری رات تو رہتا
ادت میں اور سارے دن رہتا ہے روزے میں یہ اللہ میاں کے کام کا تو ہے میرے کام کا نہیں ہے۔ یہ
ں کا منشاء وہ اِستغاثہ دائر کر کے گئی ہے۔

ضرت عمرؓ چپ ہو گئے اور فرمایا کہ مجھ جیسے کو امیر بنادیا ہے جسے معاملہ سمجھنے کی بھی طاقت نہیں۔ میں
ل نہیں تھا کہ امیر بنایا جاتا۔

ر فرمایا کہ اچھا اللہ تعالیٰ نے تجھے اتنی سمجھ دی ہے تو تو ہی فیصلہ کر اس مقدّمے کا جب اس نے استغاثہ
ہے اور خاوند کی شکایت کی ہے تو کیا حکمِ شرعی ہونا چاہئے؟

ہوں نے فوراً ہاتھ کے ہاتھ فیصلہ کیا کہ ''امیر المؤمنین! اس کے خاوند کو حکم دیا جائے کہ چار دن میں
ے دن ضرور افطار کیا کرے اور خوب کھانا کھایا کرے اور چار راتوں میں سے ایک رات بالکل نہ جاگے۔
ے پاس سویا کرے۔ تین راتوں میں اسے اختیار ہے کہ خوب تہجد پڑھے اور تین دنوں میں اسے اختیار
خوب روزے رکھے۔ تو ہر چار دن میں سے ایک دن اور ہر چار راتوں میں سے ایک رات خالی
ے''۔

ضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے اکثمؓ! یہ حکم تم نے کہاں سے نکالا ہے۔ انہوں نے کہا قرآن سے
عمرؓ نے فرمایا کہ قرآن میں کہاں موجود ہے؟ کہ اگر کسی بیوی کا خاوند رات دن عبادت کرے تو وہ چار
ں میں سے ایک رات دن بیوی کے پاس گزارے۔ عرض کیا کہ قرآن میں حکم ہے :

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ

ں آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے۔ اگر چار بیویاں ہوں تو چار راتیں

ان کے گھر جائیں گے۔ اگر چار میں سے ایک بیوی ہو تو تین راتیں خدا کی اور ایک رات بیوی کی۔

فرمایا' سبحان اللہ کتنا اچھا فیصلہ ہے۔ مجھ جیسے کو امیر بنادیا جس نے قرآن سے اتنا فیصلہ نہیں کیا۔ اسی دن حضرت عمرؓ نے اُن کو چیف جسٹس یعنی قاضیُ القضاۃ بنادیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری سمجھ کو تیز کیا ہے۔ اس لئے تم ہی فیصلے کرو آج سے مسلمانوں کے مقدّموں کے۔ ایک چاول سے پوری دیگ پرکھی جاتی ہے جب ایک فیصلہ کیا کہ جو کہ معمولی مسئلہ تھا' قرآن سے پیش کیا۔ فرمایا کہ تیری سمجھ اس قابل ہے کہ آج سے تو مسلمانوں کے فیصلے کرے۔ اسی بنا پر ان کو قاضیُ القضاۃ بنادیا۔

اِنحرافِ اطاعت موجبِ تفریق ہے

بہرحال اِطاعتیں تین ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت' رسولؐ کی اطاعت' اور رسولؐ کے جو نمائندے اور نائب ہیں ان کی اطاعت جب کہ وہ رسول کی رسالت کو جاری کریں اور ان کے علم پر اعتماد ہو تو وہ واجبُ الاطاعت بن جاتے ہیں۔ پھر ان سے اور ان کی اطاعت سے انحراف کرنا قوم کے اندر تفریق ڈالتا ہے اس لئے مأمورین کے ذمہ ہے کہ ہر صورت میں جب کہ وہ حکمِ شرعی بیان کریں تو ان کی اطاعت کریں۔ لہٰذا جب ہم نے اپنا امیرِ شریعت بنالیا ہے اور بحمد اللہ ان میں امیرِ شریعت کے اوصاف بھی موجود ہیں جو اوصاف کہ واقعی طور پر ایک امیر کے اندر ہونے چاہئیں۔ خدا نے ان کو اہل بنایا ہے۔ جب آپ کو ایک اہل مِلا تو آپ کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں۔ اب ایسے اشخاص تو آنے سے رہے جو کبھی بھی غلطی نہ کریں۔ ہمیں اپنے ہی میں سے ہر ایک کو بنانا پڑے گا اور اس کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ ہاں اتنا دیکھ لو کہ وہ بشر عمدہ ہو جس کی تمام زندگی تقویٰ وطہارت سے گزری ہو۔ جس کی زندگی میں صَلاح اور رُشد پایا جاتا ہو وہ بے شک اس قابل ہے کہ وہ ہمارا مُطَاع بن جائے اور غلطی سے تو کوئی بشر خالی نہیں ہر ایک انسان غلطی بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود واجبُ الاطاعت ہے تو بہرحال اللہ تعالیٰ نے ایک امیر بنادیا آپ کے لئے' جو اہل ہے امامت کا۔ ہم سب کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اب اگر ان سے کوئی اور افضل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ امیر سب سے افضل ہو۔ اگر دوسرا کوئی افضل بھی ہو تو اطاعت اسے بھی کرنی پڑے گی۔ اس لئے کہ قوم نے مِل کر ان کو امیر مقرّر کردیا ہے۔

اِمارت کی بُنیادی شرط

اگر کوئی یوں کہے کہ صاحب! میں ان سے زیادہ کامل ہوں۔ اس لئے امیر میں بنوں گا۔ تو مدّعی کو امیر بنانے کے لئے کوئی تیار نہیں ___ خود شریعت میں مسئلہ موجود ہے لَانُوَلِّیْ اَمْرَنَا ھٰذَا مَنْ طَلَبَہٗ' جو خود عہدے کی طلب کرے اسے کبھی عہدہ نہیں دیں گے۔

جو شخص عہدے سے بچے اور الگ رہے وہ اس قابل ہے کہ عہدہ اس کے ذمے ڈالا جائے۔ اس واسطے کہ جب مسلمانوں نے عہدہ ڈال دیا اس کے ذمے اور امیر بنادیا اور امیر نے پھر ایک قاضی مقرّر کردیا تو قوم کا فرض ہے کہ اس کی اطاعت کرے۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی بات سامنے آئے کہ صریح قرآن وحدیث کے خلاف فیصلہ دیا اور تخریب کردی تو بھائی اس وقت غور کرنا! کہ ایسے کو امیر کیوں بنایا' لیکن قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کررہا ہے۔ تو اس بیچارے سے کیوں انحراف کریں؟

اسلامی حکومت نہ ہو تو مسلمانوں کی ذمہ داری

امارتِ شرعیہ کا قیام ضروری ہے اور فقہاء لکھتے ہیں کہ جب حکومت اسلامی نہ ہو تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنا ایک امیر مقرر کر لیں۔ اپنے معاملات میں ان کی طرف رُجوع کریں اور سمع وطاعت کے ساتھ اس پر چلیں۔ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہنچے گا۔ وہ یہ کہ جب پوری قوم منظم ہو گی اور ایک کے تابع ہو گی تو اَغیار پر اثر پڑے گا کہ یہ ہے متحد و منظم قوم۔

جب عید کی نماز ہوتی ہے اور ایک امام کے پیچھے پچاس پچاس ہزار آدمی ہوتے ہیں تو بہت سے غیر مسلموں کو یہ کہتے سُنا گیا ہے کہ یہ نظام کسی قوم کو نصیب نہیں ہے جو اس قوم کو دیا گیا ہے کہ ایک کے اشارے پر لاکھوں آدمی جھک رہے ہیں۔ حرم محترم میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک امام کے پیچھے تیس لاکھ آدمی نماز پڑھ رہے ہیں۔ ایک جھکتا ہے تو وہ بھی جھکتے ہیں۔ عجیب و غریب نظام قائم ہے۔ ایک امامِ حج کے پیچھے سارے حجّاج جا رہے ہیں۔ ایک امامِ زکوٰۃ کے پیچھے سارے اپنی زکاتیں پیش کر رہے ہیں۔ تو اسلام نے ہر ہر جزئی میں ایک نظم قائم کیا ہے اور نظام ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ جماعت نہ ہو اور جماعت ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ امام نہ ہو اور امیر نہ ہو اور امیر ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک کہ سمع وطاعت نہ ہو۔ تو سمع وطاعت ہم سب کا فرض ہے ہمیں اور آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی توفیق دی کہ ہم نے اپنا ایک امیر مقرر کیا اور امیر بحمد اللہ ایسا کہ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

انتخابِ امیر کے لئے مجموعی زندگی کو پیشِ نظر رکھا جائے

دنیا میں کوئی ایسی ذات نہیں ہے جو اعتراض سے بچی ہوئی ہو۔ [اعتر]اض سے کوئی خالی نہیں۔ اعتراض جس پر چاہو کر دو۔ حتی کہ اعتراض کرنے والوں نے اللہ و رسول پر بھی اعتراض کر دیئے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے :

قَدْ قِیْلَ اِنَّ اللّٰہَ ذُوْ وَلَدٍ
وَقِیْلَ اِنَّ الرَّسُوْلَ قَدْ کَہَنَ
مَا نَجَا اللّٰہُ وَالرَّسُوْلُ مِنْ
لِسَانِ الْوَرٰی فَکَیْفَ اَنَا

کہنے والے نے کہا کہ اللہ صاحب اولاد ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بیٹے ہیں اور باپ ہیں۔ اور حضرت مریم بیوی ہیں۔

رسول کے بارے میں کسی نے کہا کہ کاہن ہیں۔ کسی نے کہا کہ ساحر ہیں، کسی نے کہا کہ مجنون ہیں۔ تو شاعر کہتا ہے کہ جب اعتراض کرنے والوں نے اللہ و رسول کو بھی نہیں چھوڑا تو میں کون ہوں۔ میں بیچارہ کیا چیز ہوں۔ دنیا میں کون ہے ایسا جس پر اعتراض نہ ہوا ہو۔ بھائی تھوڑا بہت تو اعتراض سب پر ہوتا ہے۔ مجموعی زندگی کو دیکھا جاتا ہے کہ مجموعی زندگی سچائی سے گزر رہی ہے یا مکر و فریب سے۔ صلاح و تقویٰ پر گزر رہی ہے یا جہالت پر۔ اس لئے اگر تھوڑی بہت غلطی بھی ہو جائے تو وہ قابلِ عفو ہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

جن کی نیکیاں غالب ہیں وہ اللہ کے یہاں بھی نجات پا جائیں گے۔ معصوم تو انبیاء علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کی ذواتِ گرامی ہیں۔ لیکن انبیاء کے بعد اولیاء محفوظ ہیں۔ پھر اولیاء کے بعد جتنے ہم اور آپ ہیں نہ محفوظ ہیں نہ

معصوم ہیں۔ کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی غلطی ہو ہی جائے گی مگر مجموعی زندگی کو دیکھ کر حکم لگے گا۔ ایک ایک غلطی نہیں پکڑی جائے گی۔ یہ بدنیتی ہوگی کہ ساری زندگی کی اچھائیوں میں سے ایک بُرائی پر نظر پڑی تو اس کو آپ نے اُچھال دیا۔ یہ تو عناد کی بات ہے۔ یہ کوئی آدمیت نہیں ہے۔ یہ ہے خلت ماکرہ نبی کریمؐ نے اس سے پناہ مانگی ہے۔ فرمایا کہ :

اللّٰھم انّی اعوذبک من خلیل ماکر عیناہ ترہانی وقلبہ یرعانی ان رایٰ حسنۃ دفنھا وان رایٰ سیئۃ افشاھا۔

"اے اللہ! میں ایسے مکّار دوست سے تیری پناہ لیتا ہوں جس کی آنکھیں مجھے دیکھیں اور اس کا دل میری ٹوہ میں لگا رہے اگر نیکی دیکھے تو اسے چھپالے اور اگر بُرائی دیکھے تو اس کو پھیلاتا پھرے"۔

ایسا دوست پسندیدہ نہیں ہے بلکہ اگر کسی کی بُرائی آپ کے سامنے ہو تو اس کی اچھائیوں کو بھی دیکھنا چاہئے اور ان اچھائیوں کی وجہ سے اس کی برائی نظر انداز کردینی چاہئے۔ یہی قرآن کا فیصلہ بھی ہے۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ کہ نیکیاں تمام بُرائیوں کو ختم کردیتی ہیں۔
جب ختم ہوگئی پھر بُرائی رہ ہی کہاں گئی جس کو اُچھالا جائے۔ لیکن کہنے والے اور اعتراض کرنے والے تو ہر وقت اور ہر زمانہ میں رہتے ہیں۔ کام کرنے والے اگر اس کی پرواہ کریں تو کچھ بھی نہیں کرسکتے ___ قیامت میں جب باری تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگی تو اعتراض کرنے والے بھی سامنے کھڑے ہوں گے اور کام کرنے والے بھی کھڑے ہوں گے۔ مگر کامیاب و سرخرو کام کرنے ولے ہوں گے' تو شکریہ ادا کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے ہمیں اپنا امیر بنانے کی توفیق دی اور آگے ہم اس کی توفیق بھی بارگاہِ صمدی سے چاہتے ہیں کہ ہم اپنے امیر کی سمع وطاعت کریں اور ہم کو راہِ راست پر چلائے۔ ہمارے گناہوں کو معاف کردے۔ ہمیں اسلام پر قائم ودائم رکھے' ایمان پر خاتمہ فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تکمیلِ انسانیت

بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے عمل کا بار کم ڈالا جاتا ہے ___ یہی وجہ ہے کہ اس اُمّت پر عمل کا بار کم کر دیا گیا، پچھلی اُمتوں میں سَلاسِل اور اَغلال تھے، نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال۔ وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی، ایک عمل کرو گے تو دس نیکیوں کا ثواب اور اس کے بعد سات سو تک ___ اور وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ

غرض اَجر بڑھا دیا، تحسین بڑھا دی مگر عمل کا بار گھٹا دیا۔ اس لئے کہ اُمت بوڑھی ہو چکی تھی ___ تو عمل کا بار بہت کم، اجر بہت ہی زیادہ۔

(از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ ___ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ۔

تقریبِ تکمیل

بزرگانِ محترم!

یہ تقریب ہمارے عزیز محمد اَزہر صاحب کے ختم قرآن شریف کے لئے ہو رہی ہے۔ اسی مجلس میں انہوں نے قرآن کریم ختم کیا اور اس میں دعا کی گئی۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہمارے یہ عزیز قرآن شریف شروع کرنے کی ابتدا کر رہے تھے اور اس کے حفظ کا قصد تھا۔ یقیناً وہ بھی خوشی کا دن تھا جس میں انہوں نے قرآن کریم حفظ کرنے کا آغاز کیا ___ اور ایک آج کا دن ہے کہ حق تعالیٰ نے انہیں حافظ بنایا اور اِن شاءاللہ "حافظ جیّد"

بھی ہوں گے اور ان کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قاری مجوّد بھی ہوں گے۔ تو ایک ابتدا تھی اور ایک انتہا اور یہ دونوں چیزیں خوشی کی ہوتی ہیں۔

ابتدا اور تکمیل پر خوشی

ابتدا کی خوشی توقع کی بنا پر ہوتی ہے کہ ماں باپ بچے کو مکتب میں بٹھاتے ہیں اور خوشی کرتے ہیں مگر خوشی توقعات پر مبنی ہوتی ہے کہ ہمارا بچہ پڑھے گا' چند دن بعد حفظ کرے گا اور اس میں کمال پیدا کرے گا ___ غرض ابتدا میں امید کی بنا پر خوشی ہوتی ہے اور انتہا میں تکمیل کی بنا پر خوشی ہوتی ہے کہ جو توقعات باندھ گئی تھیں وہ اللہ نے پوری فرمادیں۔ اس لئے انتہائی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ تو ہر ابتدا بھی خوشی کی چیز ہے اور پھر انتہا بھی خوشی کی چیز ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ابتدا میں خوشی توقع پر ہوتی ہے اور انتہا میں تکمیل پر ہو ہے :

اور ظاہر بات ہے کہ تکمیل بہ نسبت توقع کے زیادہ خوشی کی چیز ہے اور توقع اور امید تو مبہم ہوتی ہے پوری ہو یا نہ ہو ___ لیکن تکمیل کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ساری توقعات پوری ہو گئیں۔ تو وہ امیدِ محض ہو ہے۔ یہ واقعہ ہوتا ہے۔ تو واقعہ پر خوشی ہو گی وہ یقیناً اس سے بڑھ کر ہو گی جو محض توقع پر ہوتی ہے۔

تکمیل پسند اُمّت

ویسے بھی مسلمان کچھ تکمیل پسند واقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ دین ہی اس کا کامل ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

دین کی ابتدا تو حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور تکمیل و انتہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات پر ہوئی۔

عالمِ بشریّت کی طفولیّت اور اس کا ابتدائی علم

ابتدا کے وقت بالکل ابتدائی چیزیں تھیں' جو بچوں کے لئے ہوتی ہیں' بچے کا سب سے بڑا علم یہ ہوتا ہے کہ اسے کچھ چیزوں کے نام سکھلا دیئے جائیں۔ یہ روٹی ہے' یہ لوٹا ہے' یہ زمین ہے' یہ آسمان ہے ___ تو اگر بچے کو نام یاد ہو جائیں یہ اس کا سب سے بڑا علم ہوتا ہے اور علم کا پہلا درجہ بھی "علم الاسماء" ہی کا ہے اشیاء کے نام معلوم ہوں ___ اگر کسی چیز کا نام ہی معلوم نہ ہو تو وہ مجہول مطلق ہوتی ہے اس کی طلب نہیں ہو سکتی ___ غرض علم کا ابتدائی درجہ ناموں کا معلوم ہونا ہے۔ اس کے بعد پھر طبعاً آدمی کا جی چاہتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس اسم کا مسمّٰی کون ہے۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ جب مسمّٰی کی صورت دیکھ لی تو جی چاہتا ہے کہ اب ___ یہ معلوم ہو کہ اس مسمّٰی کی خصوصیات کیا ہیں۔ تو آدمی ان خصوصیات کا علم حاصل کرتا ہے۔ جب وہ بھی حاصل ہو گیا تو پھر آگے یہ درجہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت کیا ہے ___ تو پہلے اسم۔ اس کے بعد معانی مدلولہ ہیں۔ اس کے بعد اس کے خواص اور آثار ہیں ___ اس کے بعد اس کے حقائق ہیں۔ اس طرح درجہ بدرجہ علم ترقی کرتا ہے ___ تو آدم علیہ السلام کے زمانے میں عالمِ بشریت کی طفولیت بھی۔ انسانیت کے لڑکپن کا زمانہ تھا اور بچوں کا سب سے بڑا علم ناموں کا یاد کرنا ہے۔ اس لئے آدم علیہ السلا

جو وحی اُتاری گئی اس میں زیادہ تر اسماء ہی تھے :

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا۔

آدم علیہ السلام کو نام یاد کرادیئے گئے ___ ناموں کے کچھ مسمّیات بتادیئے گئے مسمّٰی پہچانوا دیا گیا۔ تو م کی ابتدا اسماء سے ہوئی۔ حضرت آدم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے تیس صحیفے اتارے۔ جیسے اس امّتِ رحومہ پر قرآن کریم کے تیس سپارے اُتارے گئے۔ تو تیس صحیفے اُترے۔ ان میں زیادہ تر رہائشی امور کی لیم تھی۔ کھیتی یوں کرنی چاہئے۔ باغ یوں لگانا چاہئے کپڑا یوں بننا چاہئے۔ لکڑی کا کام یوں ہونا چاہئے۔ جیسا ہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ :

"آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے ایک ہزار صنعتیں سکھلائیں۔ وہ ان کی اولاد میں پھیلیں۔ ہر طبقے نے اپنی مناسبت سے ایک صنعت اختیار کرلی"۔

کسی نے لکڑی کا کام، کسی نے لوہے کا کام، کسی نے تعمیر کا کام، کسی نے کھیتی باڑی کا، بنی آدم میں مختلف عتیں پھیل گئیں ___ مگر سب کی سب وحی کے ذریعہ سے آئی ہیں۔

اِبتدائی عبادت

بہرحال آدم علیہ السلام پر تیس صحیفوں میں جو وحی کی گئی، اس میں زیادہ تر رہائشی امور تھے، حلال وحرام ، احکامِ فقہیّہ بہت اَقلّ قلیل تھے، اس لئے کہ بچوں کا ابتدائی علم ناموں ہی کا سکھلانا ہے، حلال وحرام زیادہ ں بتلاتے۔ وہ تو معصومیت اور فطرت پر ہوتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد فطرت پر تھی، نیک اور لح تھی۔ جو نام یاد کرادیئے گئے ان کو پڑھ لینا یہی سب سے بڑی عبادت تھی :

جب کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے حضرت شیث علیہ السلام کو کچھ اسماء کی تلقین کی کہ بڑھا کرو۔ تو اس دَور کی سب سے بڑی عبادت یہ تھی کہ اسماءِ خداوندی کو رَٹا جائے اور بار بار پڑھا جائے :

غرض ابتدا علم یہی تھا کہ ناموں کا علم ہو جائے اور اسماء معلوم ہو جائیں۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا۔

اس پر شاہد ہے ___

عالمِ بشریّت کا دُوسرا دَور اور اس کا علم

اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا دَور آیا ___ تو طبعی طور پر جذبہ ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اسم کا مسمّٰی کیا ہے۔ یہ نام کس چیز پر صادق آتا ہے۔ اس کا مسمّٰی کون ہے اس کی طلب ہوتی ہے۔ تو آدم السلام نے تو ناموں کے ذریعہ سے معرفتِ خداوندی کرائی اور نوح علیہ السلام نے مسمّیات کے ذریعہ سے نتِ خداوندی کی طرف پہنچایا ___ چنانچہ فرمایا گیا :

اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۔ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا۔ ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَیُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۔

زمین کو اللہ تعالیٰ نے پھیلایا۔ تمہیں اس طرح سے پیدا کیا جس طرح نباتات پیدا ہوتی ہیں۔ زمین

و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی طرف توجہ دلائی گئی۔

تو حضرت آدم علیہ السلام کے دور میں اسماء سکھلائے گئے تھے' یہاں مسمّیات سامنے رکھے گئے کہ ان کے ذریعے معرفتِ خداوندی حاصل کرو۔ مصنوع کو دیکھ کر صانع کا تصوّر بندھتا ہے۔ اگر مصنوع بہت عمدہ ہو تو تعریف کی جاتی ہے کہ صناع بڑا کامل ہے۔ جس نے ایسی بڑی صنعت دکھلائی۔ تو آسمان اور زمین وہ چیزیں ہیں کہ بجز اللہ کے کوئی نہیں بنا سکتا ___ اس واسطے ان کی طرف متوجّہ کیا گیا کہ ان کے ذریعے سے صانع کو پہچانو کہ وہ کیسا حکیم' کیسا حکیم و خبیر ہے اور کیسا قادرِ مطلق اور قدیر علی الاطلاق ہے کہ جس نے آسمان کا خیمہ تان دیا اور زمین کا فرش بچھا دیا۔

آپ چھوٹا سا بھی ایک شامیانہ کھڑا کرتے ہیں تو بانس کے بیسیوں سُتون لگاتے ہیں تاکہ وہ تھمے ___ مگر آسمان کا یہ اتنا بڑا خیمہ جس کی مسافت پانچ سو برس کی ہے۔ نہ اس کے نیچے کوئی بانس ہے نہ ٹیکن ہے اور ہوا کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ تو وہ کتنا بڑا قادر ہے جس نے یہ خیمہ تان دیا :

بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ___

نہ کوئی ستون ہے نہ کوئی لکڑی ___ بہرحال نوح علیہ السلام نے اسماء کے بعد مسمّیات کی طرف متوجّہ کیا اور مسمّیات کے ذریعے سے حق تعالیٰ کو پہچانوا دیا۔ معرفتِ خداوندی کرائی ___ اب گویا عالمِ بشریّت کو نام بھی معلوم ہیں اور مسمّیات بھی معلوم ہو گئے :

عالمِ بشریّت کا تیسرا دَور اور اس کا علم

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دَور آیا ___ تو اس درجے کے بعد اب طبعی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان مسمّیات کے خواص کیا ہیں؟ ان کے آثار کیا ہیں؟ یہ کیوں بنائے گئے؟ ان کی غرض وغایت کیا ہے؟

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نفسیات کی طرف متوجّہ کیا۔ نفوسِ فلکیہ' نفوسِ ارضیہ ___ اور ان کے ذریعے سے معرفتِ خداوندی کرائی۔ اس لئے کہ اسم اور مسمّٰی تو معلوم ہو چکے تھے۔ اب تو خواص و آثار سامنے تھے۔ تو خواص و آثار کی طرف متوجّہ کر کے انہیں معرفتِ خداوندی کی طرف بڑھایا۔

دَورِ موسوی اور اس کا علم

طبعی طور پر جذبہ یہ ہوتا ہے کہ نام یہ ہے' مسمّٰی یہ ہے' خواص یہ ہیں ان کے استعمال کا طریقہ کیا ہو؟ کس طریقے سے استعمال کریں۔ ان کے احکام کیا ہیں؟ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دَور آ گیا اور تورات نازل ہوئی اور اس شان سے کہ :

تَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ

ہر چیز کے احکام کی تفصیل بتلائی گئی کہ اسے یوں استعمال کرو' یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے' یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ غرض احکام کی تفصیل آ گئیں :

احکام کی حقیقت کا دَور

اب یہ کہ نام بھی معلوم ہو گیا' خاصیتیں بھی معلوم ہو گئیں اور احکام کا بھی پتہ چل گیا تو طبعی طور پر ذہن

اس کی طرف جاتا ہے کہ احکام کی علت کیا ہے جس پر یہ مبنی ہیں؟ کیونکہ حکم کا تعلق بہرحال کسی حقیقت اور علت سے ہوتا ہے۔

اس لئے کہ جب علت سامنے آتی ہے تو فقط ایک ہی چیز کا حکم معلوم نہیں ہوتا' جہاں جہاں وہ علت پائی جائے گی احکام معلوم ہوتے رہیں گے۔ تو ایک علت سے سینکڑوں ابواب کے احکام سامنے آجاتے ہیں۔

دورِ نبوی (علیہ السلام) اجتہادِ انسانیت کا دور

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور آگیا ___ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفاصیل ارشاد فرمائیں کہ ہر حکم کے پیچھے حکمت' ہر حکمت کے پیچھے علت اور ہر علت کے پیچھے ایک حقیقت اور ہر حقیقت کے پیچھے ایک صفت خداوندی جس سے اس علت اور حقیقت کا رابطہ ہے۔ تو علمی طور پر گویا بنی آدم اس قابل بن گئے کہ حق تعالیٰ تک پہنچ سکیں۔ صورت دکھلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ مسمیات پہچانے جائیں۔ وہ تو پہچان چکے تھے۔ اس طرح نام بتلانے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ وہ معلوم ہو چکے تھے۔ زیادہ احکام بتلانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ معلوم ہو چکے تھے۔ علل احکام بتلانے کی ضرورت تھی تاکہ یہ امت مجتہد بنے۔ اس امت کے اندر یہ قوت پیدا ہو کہ اس ایک علت سے ہزاروں چیزوں کے احکام نکالے:

اور یہ اس لئے کہ ختم نبوت کا دور ہے' کوئی نبی آنے والا نہیں۔ کوئی نئی شریعت آنے والی نہیں۔ تو اس امت کے علماء کو یہ قوت دی گئی کہ قیامت تک کے حوادث کا فیصلہ اسی قرآن کریم سے کریں۔ انہی اصول و کلیات اور انہی علل سے اور انہی حقائق سے فیصلہ کریں ___ چودہ سو برس گذر گئے ہیں اور امت فیصلے کرتی آرہی ہے۔ ہر صدی میں نئے نظریات پیدا ہوتے ہیں نت نئے حوادث سامنے آتے ہیں۔ لیکن کبھی امت میں عجز پیدا نہیں ہوتا۔ اسی قرآن مجید' اسی حدیث' اسی فقہ سے احکام نکلتے چلے آتے ہیں۔ انہی علل سے احکام کا استخراج کیا جاتا ہے۔ تو یہ مجتہدین کی امت ہے۔

امتِ محمدیہ میں آثارِ نبوت

اور جیسا کہ بعض روایات میں فرمایا گیا:

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

گو اس روایت کی سند میں کچھ کلام کیا گیا ہے۔ مگر باوجود اس کے علماء اس سے استدلال و استشہاد کرتے ہیں کہ سنداً گو یہ روایت کچھ ضعیف ہو مگر اس مضمون کی دوسری روایات بھی ہیں اگرچہ عنوان بدلا ہوا ہو۔ اس لئے مضمون کی حیثیت متواتر ہے۔ گو سند کے لحاظ سے ضعیف ہو۔ ایک حدیث اگر سند کے لحاظ سے ضعیف بھی ہو مگر اس کے معادل دوسری چیزیں مل جائیں تو درجہ حسن پر پہنچ ہی جاتی ہے۔ بہرحال سند کچھ ضعیف بھی سہی مگر معنیً ضعیف نہیں ہے:

تو امت کے علماء نبی تو نہیں ہیں۔ مگر کام وہ کیا جو نبیوں کا ہوتا ہے۔ جہاں ایک بھی عالم بیٹھ گیا' ہزاروں کو ایمان اور معرفت سے رنگ دیا۔

ایک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے علمی آثار کوفہ سے خراسان اور ایران کی طرف پہنچے اور ایران سے افغانستان کی طرف اور افغانستان سے ہندوستان کی طرف۔

تو ہندوستان' افغانستان کی اکثریت حنفی ہے۔ حتیٰ کہ شام کی اکثریت بھی حنفی ہے۔ آپ کی فقہ وہاں پہنچی،

اور اس فقہ نے ان ممالک کی اکثریت کو اپنے ذوق میں رنگ دیا اور لاکھوں کروڑوں حنفی بنے۔

امام شافعیؒ ایک امام حق اور امام مجتہد ہیں۔ آپ کی پیدائش مصر میں ہوئی اور حجاز میں زیادہ تر قیام ہوا ہے۔ تو حجاز کی اکثریت شوافع ہے۔ مصر کی اکثریت شافعی ہے ___ پھر وفات بھی مصر میں ہی ہوئی۔

امام مالکؒ امام دار الهجرة ہیں۔ تو عرب کے جو مغربی قطعات ہیں تو وہ اکثر و بیشتر مالکی ہیں۔

امام احمد ابن حنبلؒ کا نجد اور یمن میں قیام ہوا ہے۔ تو وہاں اکثریت حنبلیوں کی ہے ___ غرض ایک عالم ربانی بھی جہاں پہنچ گیا' لاکھوں کے اندر ایمان کا نور پیدا کر دیا۔ لاکھوں کو ایمان میں رنگ دیا تو :

علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

ایک نبی کی ذات بابرکات آتی ہے تو امتیں بن جاتی ہیں۔ لاکھوں' کروڑوں کو ایمان نصیب ہوتا ہے ___ اس دور میں چونکہ نبوت نہیں رہی تھی تو علماء کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام بنا دیا گیا۔ یہ وہ کام کریں جو انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ وہ انہی کی طرز پر تبلیغ کریں' وہی تربیت ہو' وہی تعلیم ہو' وہی تزکیہ نفوس ہو۔ اس طرح سے ان علماء اور مشائخ ربانی نے کام کیا اور صحیح معنیٰ میں اپنے پیغمبر علیہ السلام کا قائم مقام بن کر دکھلایا۔

شرائع اصلیہ اور وضعیہ

علم کے ساتھ قرنِ اوّل میں ظاہر بات ہے کہ ساری جزئیات تو نہیں آئی تھیں۔ ہزاروں حوادث بعد میں پیدا ہوئے مگر عِلل و کلیات کی صورت میں احکام موجود ہیں اور وہ منصوص ہی کے حکم میں ہیں ___ تو یہ امت گویا مجتہدین کی امت ہے۔ جس کو علماء نے دوسرے لفظوں میں یوں تعبیر کیا کہ :

"ایک شرائع اصلیہ ہیں وہ وہ ہیں جو قرآن و حدیث میں حضور علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل ہوئیں ___ اور ایک شرائع وضعیہ ہیں کہ ان شرائع اصلیہ سے احکام نکال نکال کر فقہ مرتب کر دیا گیا ___ کتابیں مدوّن ہو گئیں' ہزاروں کتابیں لکھی گئیں وہ کتاب و سنت ہی سے نکلے ہوئے احکام ہیں۔ معاذ اللہ کوئی مجتہدین کا ذاتی اختراع تھوڑا ہی ہے"۔

انہوں نے اصول سے احکام کا استنباط کیا۔ تو وہ بھی در حقیقت کتاب و سنت ہی کے احکام ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ مجتہد کا ذہن پہنچتا ہے۔ ہمارا اور آپ کا نہیں پہنچتا۔ ہم سوائے اس کے کہ ان کا اتباع کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ ان کی تقلید کریں اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

تو اصل میں ان حضرات نے کتاب و سنت سے علوم اخذ کئے اور دین کو باغ و بہار بنایا' ابواب مرتب ہوئے۔ فصول مرتب ہوئیں اور ان فنون پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ فقہ مرتب ہوا تو ہزار ہا کتابیں فقہ میں آ گئیں۔ اصول فقہ مرتب ہوئے تو وہ ایک مستقل فن ہو گیا ___ اس طرح سے علم در علم اور شاخ در شاخ ہوتے ہوئے عالم کے اندر علم پھیلا تو جو شان انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہے کہ وہ اللہ سے علم حاصل کر کے مخلوق کو دیتے ہیں' وہی شان ان مجتہدین کی ہے کہ وہ پیغمبر علیہ السلام سے علم حاصل کر کے اُمتوں کو بانٹ رہے ہیں :

عالَم بشریّت کا شباب

میں نے اس پر عرض کیا کہ علم کا ابتدائی درجہ "علمُ الاَسماء" تھا۔ یہ عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ تھا۔ اس

کے بعد جب مراہقت کا زمانہ آیا جو حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ تھا تو "مستمیات" کا دور آگیا ___ اور پھر بیچ میں شباب آگیا تو حضرت ہُود اور حضرت صالح علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ اس وقت عمر بھی زیادہ' قدو قامت بھی زیادہ :

قوم عاد پر جب عذاب آیا اور وہ ہوا سے پھڑ پھڑ کر گرے ہیں تو فرمایا گیا :

كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ۔

اتنے لمبے لمبے قد جیسے کھجوروں کے تنے ہوتے ہیں۔ ہزار ہزار' ڈیڑھ ہزار برس کی عمر ہے ___ ہم اور آپ ایک ایک مکان بناتے ہیں۔ تو سو دو سو برس میں ہماری کئی نسلیں اس میں گذرتی ہیں اور وہاں تین سو برس' چار سو برس گذرے مکان گر گیا' پھر مکان بنایا' پھر چار سو برس کی عمر ہوئی پھر مکان بنایا' تو ایک ہی آدمی چار چار دفعہ مکان بناتا تھا۔ کیونکہ عمر ہی ڈیڑھ ہزار برس کی ہوتی تھی۔ تو مکانات بھی نئے نئے بنتے تھے۔ بہرحال عمریں بھی زیادہ تھیں ___ تو یوں کہنا چاہئے کہ آدم علیہ السلام کا زمانہ تو عالم بشریت کی طفولیت کا زمانہ ہے اور عاد و ثمود کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہے :

جوانوں میں تو یہی ہوتا ہے کہ پنجے لڑا رہے ہیں۔ اکھاڑے کر رہے ہیں' کشتیاں کر رہے ہیں۔ ہر ایک کہتا ہے کہ مجھ سے طاقت میں کون زیادہ ہے تو دوسرا کہتا ہے کہ میں تجھ سے طاقت میں زیادہ ہوں۔ یہی ان قوموں کی حالت تھی :

مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً۔

"ہم سے زیادہ کون قوی ہے؟"۔

اور ان کے کام دیکھو تو جنات جیسے۔ فرمایا گیا :

وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا۔

"پہاڑوں کو تراش تراش کر بلڈنگیں بناتے تھے"۔

دنیا کی بلڈنگیں نیچے سے اوپر کو چلتی ہیں۔ وہ اوپر سے بناتے ہوئے نیچے لاتے' پہاڑوں کو کھود کھود کے اور تراش کے بلڈنگیں تیار کیں ___ بہرحال یہ جوانی کا زمانہ ہے اور کام وہ کئے کہ ہم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

عالَمِ بشریت کی طفولیّت کے لئے اندازِ تعلیم

اور ظاہریات ہے بچوں کے سامنے' اگر وہ بدشوقی اختیار کریں' تو کچھ پیار کرتے ہیں' کچھ ترغیب دیتے ہیں کہ مٹھائی کھلائیں گے' پیسے دیں گے تو بچہ تعلیم میں لگ جاتا ہے۔ تو کھیل کود کے اسباب سامنے زیادہ رکھتے ہیں تاکہ بچہ متوجّہ ہو جائے۔

تو آدم علیہ السلام کے جو صحیفے تھے تو اس میں صنائع و حرف کی تعلیم تھی کہ دنیا کی چیزیں یوں بناؤ۔ تو دنیا کے بارے میں فرمایا گیا :

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ۔

یہ دنیا تو کھیل کود ہی ہے ___ تو کھلونے زیادہ سے زیادہ دیئے گئے تاکہ ان کا دل راغب ہو اور اس راستہ سے علم کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ یہ گویا حکمت تربیت ہے کہ اسی مزاج سے اللہ تک پہنچا دیا جائے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ تم پہلے جوان بنو۔ تب اللہ تک پہنچو گے بلکہ طفولیت ہی میں اللہ تک پہنچنے کا راستہ دکھلا دیا گیا۔ تو مربّیِ کامل

وہی ہے کہ انسان جس حالت میں ہو۔ اسی حالت کو وصول الی اللہ کا ذریعہ بنادے۔

مولانا محسن کاکوریؒ بڑے عالم اور شاعر بھی بہت بڑے گذرے ہیں اور نعت میں ان کے اشعار واقعی بڑے عالمانہ اور اونچے ہوتے ہیں۔ تو انہوں نے اپنا واقعہ لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ہر سال پتنگ بازی کا ایک موسم آتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور بڑے بڑے اُمراء کنکلے اُڑا رہے ہیں اور تکلوں کے میچ ہو رہے ہیں کہ دوسرے کے مانجے کو کاٹا تو انہوں نے کہا کہ وہ جیت گیا۔ تو ہار جیت ہوتی تھی۔ میچ ہوتے تھے۔ ہوا میں پتنگ اُڑاتے تھے ___ تو مولانا محسن کہتے ہیں کہ ہمارا بچپن تھا تو ہمیں پتنگ اُڑانے کا شوق تھا مگر یہ پتنگ بازی علماء کے گھرانوں کی شان کے مناسب نہیں تھی۔ اس لئے والد ماجد نے روکا بھی مگر اس میں سے اللہ تعالیٰ تک پہنچانے کا راستہ نکال دیا۔ چنانچہ فرمایا :

> ”تم چاہتے ہو کہ تم جیت جاؤ اور تم دوسرے کے مانجے کو کاٹ دو؟ انہوں نے کہا جی! یہ چاہتے ہیں ___ فرمایا اس کی تدبیر میں تم کو بتلائے دیتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ رات کو آخیر شب میں اُٹھ کر پہلے تو چار رکعات پڑھو اور اس کے بعد قُل ہُوَاللہُ پڑھ کر مانجا سوتتے رہو اور اللہ کا نام لیتے رہو۔ پھر جو لڑو گے تو تم ہی جیت جاؤ گے“۔

مولانا مرحوم فرماتے ہیں کہ اب ہم آخیر شب میں اُٹھتے، وضو کرتے، نماز پڑھتے، قُل ہُوَاللہُ پڑھ کر مانجا سوتتے۔ اب جو صبح میچ ہوتا ___ اکثر کامیاب ہوجاتے ___ فرمانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ جوان ہونے کے بعد پتنگ بازی تو چھوٹ گئی ___ مگر تہجد باقی رہ گیا ___ اور معرفت باقی رہ گئی۔ غرض یہ ایک تدبیر تھی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ جب تم بڑھو گے تو تم خدا کو پہچانو گے۔ نہیں بلکہ لڑکپن ہی کی نفسیات اور کیفیات سے تم اللہ کو پہچانو۔ تو اس راستے پر ڈال دیا۔

اسی طرح سے آدم علیہ السلام کے زمانے میں اسماء کے ذریعے اللہ تک پہنچایا گیا اور نوح علیہ السلام کے زمانے میں مسمّیات کے ذریعے پہنچایا۔

قومِ عاد اور قومِ ثمود جوان قومیں تھیں۔ ان کو ان کے قوت کے راستے سے پہنچایا۔

عالمِ بشریت کے شباب کے لئے اندازِ تعلیم

یہ قاعدے کی بات ہے کہ بچہ اگر بدشوقی دکھلائے تو ایک آدھ تھپڑ مار دیا۔ کچھ ترغیب دیدی ___ لیکن اگر جوان آدمی سستی دکھلائے تو استاذ صبر نہیں کرسکتا، سخت سزا دیتا ہے کہ جب جوانی میں کام نہیں کیا تو کیا بڑھاپے میں کام کرو گے؟ جوانی اور مانجا ڈھیلا ___؟

تو اس عمر میں پیار وغیرہ زیادہ نہیں کرتے۔ ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے کہ پھر تمہارے کام کرنے کی کونسی عمر آئے گی۔؟ تو قومِ عاد اور ثمود نے جب سرکشی دکھلائی تو یہ نہیں کہ انہیں کھیل کھلونے دیئے گئے ہوں ___ بلکہ آندھی مسلّط کی گئی اور ہوا سے تباہ کیا گیا ___ قومِ ثمود کو چنگھاڑ سے تباہ کیا گیا کہ جوان ہو کر جب عمل نہیں کرو گے تو کیا عمل کرنے کے لئے بڑھاپے کا زمانہ آئے گا؟ اس واسطے جوانوں پر ڈانٹ ڈپٹ زیادہ ہوتی ہے۔ بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ زیادہ نہیں ہوتی۔ انہیں ترغیبات زیادہ دیتے ہیں اس لئے عذاب میں گرفتار ہوگئے۔

عالمِ بشریت کا بڑھاپا' قوّتِ فکریہ کا اِزدیاد

درجہ بدرجہ یہاں تک پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دَور آیا ___ تو یہ عالمِ بشریت کے بڑھاپے کا زمانہ ہے۔ گویا بنی آدم ضعیف ہو چکے ہیں۔ نہ قدو قامت رہے نہ وہ عمریں رہی نہ وہ طاقتیں رہیں جو پچھلوں میں تھیں ___ مگر بوڑھے آدمی کا دماغ تجربہ کار ہو جاتا ہے۔ عقل بڑی ہوتی ہے اگرچہ کام کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن جوانوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ اس لئے کہ وہ زمانے کے گرم اور سرد سے گزر چکے ہیں اور تجربات ان کے سامنے ہیں۔

تو جوانوں کا کام یہ ہے کہ وہ عمل میں لگیں لیکن جب رکاوٹ پیش آئے تو بوڑھوں سے مشورہ لیں۔ وہ کام کی بات بتائیں گے۔

بڑھاپے میں علم کی وُسعت

وہ کہتے ہیں کہ کہیں بارات گئی اور بارات میں سودو سو آدمی تھے۔ جس گھر میں گئی وہ بہت کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ تو انہوں نے یہ شرط لگائی کہ بارات جو آئے تو اس میں کوئی بوڑھا ساتھ نہ ہو' سارے جوان ہوں ___ دولہے والوں کے ہاں مشورہ ہوا کہ بڑا بوڑھا ساتھ نہ ہو اور کوئی مشکل آن پڑی تو مشورہ کون دے گے؟ تو بوڑھے کو ڈھول میں بند کر کے لے گئے تاکہ ان کی بات کا بھی خلاف نہ ہو اور بوڑھا بھی پہنچ جائے۔

بارات جب پہنچی تو صاحبِ خانہ نے کہا کہ لڑکی تو دی جائے گی مگر ___ شرط یہ ہے کہ ہر آدمی کے سامنے ایک بکرا تل کر رکھا جائے گا اور وہ اس کو پورا کھانا پڑے گا۔ اگر نہ کھا سکیں تو ہم بیٹی نہیں بیاہیں گے۔

اب یہ بے چارے پریشان ہوئے کہ اتنا معدہ کس کا ہے کہ پورا بکرا اپنے اندر اُتار لے ___ تو انہوں نے کہا کہ بھئی! سوچ کر جواب دیں گے۔ تو ڈھول والے کے پاس پہنچے تو بڑے میاں کو ڈھول میں سے نکالا اور کہا کہ شرط لگائی ہے کہ ایک آدمی ایک بکرا کھائے۔ ہم میں تو اس کی طاقت ہے نہیں۔ اگر شرط رد کرتے ہیں تو پھر نکاح نہیں ہو گا۔ مانتے ہیں تو ہم میں طاقت نہیں۔

بڑے میاں نے کہاں کہ نہیں تم مان لو اور ان سے کہو کہ ایک ایک کر کے تَل کے دیتے جائیں ___ اب جونہی ایک بکرا آتا تو ساری بارات میں بوٹی بوٹی آتی اور بکر ختم ہو جاتا۔ اس طرح کر کے بڑے میاں کے مشورہ سے ان کی شرط بھی پوری ہو گئی اور بارات دلہن لے کر واپس ہوئی۔

بوڑھی اُمّت پر بارِ عمل کی کمی

یہ امّت بوڑھی ہو گئی ہے۔ اس واسطے عملی طاقت تو اگرچہ گھَٹ گئی مگر دماغی اور قلبی طاقت بڑھ گئی۔ تجربات وسیع ہو گئے' دنیا کی امتوں کے احوال قرآن و حدیث کے ذریعے سے اس کے سامنے ہیں۔ تو یہ امت عالِم بھی ہے اور مجتہد بھی اور تجربہ کار بھی ہے۔

بڑے بوڑھوں کا یہی کام ہوتا ہے کہ عملی بات تو ان پر ڈالی نہیں جاتی۔ ان کے ذمّہ معمولی کام لگایا جاتا ہے مگر ان کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے کہ بڑے میاں نے بڑا کام کیا۔

چنانچہ اگر شادی بیاہ ہو تو دیگ کے اوپر بڑے میاں کو بٹھا دیتے ہیں۔ آپ نگرانی فرماتے ہیں۔ جوان آدمی

کھانا لے جارہے ہیں۔ رکھ رہے ہیں۔ مگر بڑے میاں بیٹھے ہوئے ہیں اور شام کو کہتے ہیں کہ :

"صاحب! بڑے میاں کی حکمت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ صبح سے شام تک نگرانی فرمائی۔ حالانکہ بڑے میاں نے کیا کیا بیٹھے ہی تو رہے۔ کوئی حرکت تو نہیں کی"۔

مگر بڑی تحسین کرتے ہیں کہ بڑے میاں کی ہمت ایسی۔ تو بڑے بوڑھوں کی تحسین زیادہ کی جاتی ہے۔ عمل کا بار کم کردیا گیا۔ وہ پچھلی امتوں میں سلاسل اور اغلال تھے۔ نہایت شاق شاق ریاضتیں اور نہایت محنت کے اعمال۔ وہ ختم کر کے بہت سہل اعمال دیئے گئے اور تحسین زیادہ کی گئی کہ ایک عمل کروگے تو دس نیکیوں کا ثواب اور دس کے بعد سات سو تک ___ اور :

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔

"اور اللہ جتنا چاہے اجر بڑھادے"۔

غرض اجر اور بڑھادیا، تحسین بڑھادی۔ مگر عمل کا بار گھٹادیا۔ اس لئے کہ امت بوڑھی ہوچکی تھی۔ تو عمل کا بار بہت کم اور اجر بہت ہی زیادہ۔

تکمیلِ دین

بہرحال مطلب یہ کہ درجہ بدرجہ عالمِ بشریت نے ترقی کی تو حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے میں ابتدا ہوئی اور یہ انتہا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوئی ___ اس وقت توقعات تھیں کہ آگے بڑھیں گی اور اس دَور میں آکر وہ توقعات عملی شکلوں میں آگئیں کہ امت کامل ہوگئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

دین کامل کردیا گیا ___ بلحاظ عقائد کے بھی، بلحاظِ اخلاق کے بھی، بلحاظِ اعمال کے بھی اور بلحاظِ احوال باطن کے بھی۔ تو ہر حیثیت سے اس امت کی تکمیل کی گئی ___ یوں دین کامل ہوا۔

انتہاءِ زیادہ خوشی کی چیز

تو میں شروع میں یہ عرض کررہا تھا کہ یہ امت تکمیل پسند ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر تکمیل پسندی کا جذبہ ہے۔ اس لئے اس کو ابتدا سے زیادہ انتہا پر خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ وقت تکمیل کا ہوتا ہے۔ ویسے ابتدا اور انتہا دونوں ہی خوشی کی چیزیں ہیں۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس وقت مٹھائی بانٹتے ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب انتقال ہو تو انتہائی خوشی ہو۔ کہیں کہ بھائی! آج تکمیل ہوگئی! گویا کتنا خوشی کا وقت ہے ___ مگر آپ کہیں گے اس وقت تو کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔ سارے بیٹھ کر روتے ہیں۔ لیکن چونکہ تکمیل کو پہنچ گیا تو خوش ہونا چاہئے۔

میں کہتا ہوں کہ موت پر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ انتقال پر کوئی خوش نہیں ہوتا بلکہ موت اگر اچھی ہوتی تو سب کہا کرتے ہیں کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت کوئی رونے کی ایسی چیز ہوتی تو یہ دعا نہیں کیوں کرتے کہ ایسی موت ہمیں بھی نصیب ہوجائے ___ اللہ کے راستے میں کوئی شہید ہوا۔ کہتے ہیں بڑے رُتبے کی چیز ہے۔ اللہ ہمیں بھی ایسی موت نصیب کرے۔ معلوم ہوا موت غم کی چیز نہیں۔ موت تو خوشی کی چیز ہے۔ غم اپنے عزیز کی جدائی کا ہوتا ہے کہ ہم سے ہمارا عزیز جُدا ہوگیا۔ اس کے فیض سے محروم ہوگئے۔

اس کے انتقال کا صدمہ نہیں ہوتا۔ انتقال سے تو وہ اللہ تک پہنچ گیا۔ یہ کوئی صدمہ کی چیز ہے۔ ایک آدمی خد
سے جاملا۔ یہ کونسی رونے کی بات ہے۔ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ عمر جس کام کے لئے رکھی گئی تھی آج
کام پورا ہو گیا کہ وہ اللہ تک پہنچ گیا۔

اس بات کو حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ :

اَلْمَوْتُ تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ۔

سب سے بڑا تحفہ مؤمن کے لئے موت ہے ــــ اور کیوں ہے؟ اس لئے ہے کہ :

انّ الموت جسرٌ یصل الحبیب الی الحبیب ۔

موت ایک پُل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے محبوب حقیقی سے جاملتا ہے۔ تو محبوب سے کسی عاشق کا مل
جانا، یہ غم کی چیز تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے۔ آپ روتے ہیں اس لئے کہ ایک عزیز جد
ہو گیا۔ تو جدائی کا صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے مرنے کا صدمہ نہیں ہوتا ــــ مگر وہ چونکہ ایک وقت میں د
چیزیں ہیں تو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ موت پہ رو رہے ہیں۔ موت پہ کوئی نہیں روتا وہ تحفہ ہے :

تمنّائے اِنتہاء

یہی وجہ ہے کہ موت حقیقت میں ولایت کی علامت ہے۔ جتنے جتنے اولیاء ہیں وہ موت کی تمنّا رکھتے ہیں
ــــ فُسّاق و فُجّار موت سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی امیدیں سامنے نہیں آرہیں۔ اولیاء کرام او
ربّانی لوگ وہ تمنّا میں رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

کون سی مبارک گھڑی ہو گی جو اس اُجڑے دیار کو ہم چھوڑیں گے اور اس شہر مطلوب میں ہم پہنچیں گ
جس کا اللہ نے وعدہ دیا ہے۔

تو موت کی تمنّا علامت ولایت ہے اس لئے حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی :

اللّٰھم حبّب الموت الی من یعلم انی رسولک ۔

"اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے رسول و نبی ہونے کا قائل ہو"۔

جس حدیث میں موت کی تمنّا سے ممانعت کی گئی ہے۔ وہ اس لئے کہ دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا ک
موت کی تمنّا نہ کرے۔ اللہ کی ملاقات کے شوق میں جو تمنّا مطلوب ہے، اس کا حکم دیا گیا ہے :

یومِ تکمیل کا اِنتخاب

اس امّت کے مزاج میں چونکہ تکمیل پسندی ہے۔ تو سیّد الایّام کے انتخاب میں اُمَم کے امتحان کے وقت
اس امّت نے اپنی عبادت کے لئے یوم تکمیلِ خلائق یعنی جمعہ کو پسند کیا۔ یہود نے ہفتہ کو اختیار کیا اور نصار
نے اتوار کو۔ مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں جو منتخب دن تھا وہ یوم جمعہ تھا جو یوم تکمیل ہے اور وہ اس امّتِ مسلم
نے پسند کیا :

حدیث میں ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق عصر اور مغرب کے درمیان ہوئی۔ اس سے پہلے نظام بناد

گیا تھا' گھر بار سجا دیا گیا تھا۔ ضروریات مہیا کر دی گئیں تھیں۔ کھانا' دانا پانی غذا وغیرہ سب چیزیں زمین میں پھیلا دی گئی تھیں۔ اخیر میں مہمان کو لایا گیا ___ اور اسی پر تخلیق کی تکمیل ہو گئی ___ غرض اس امت نے یوم تکمیل کو پسند کیا۔ اس لئے کہ تکمیل پسند تھی تو دن بھی وہ اختیار کیا جس میں کمال تھا۔

ایک درجہ میں تکمیل اور ایک درجہ میں آغاز

بہر حال بات دور جاتی ہے۔ تو ابتدا بھی خوشی کی چیز اور انتہا بھی خوشی کی چیز ___ تو بحمد اللہ ہمارے عزیز محمد ازہر نے قرآن کریم ختم کیا تو یہ یوم تکمیل ہے۔ جس وقت یہ شروع کر رہے تھے تو اساتذۂ کرام نے' ماں باپ نے امیدیں باندھی تھیں کہ ان شاء اللہ حافظ ہو گا۔ توقع ہے کہ وہ حفظ ہو جائے۔ آج وہ توقع پوری ہو گئی۔ یہ انتہائی خوشی کا دن ہے۔

بہر حال آج یہ تقریب ہے اور تقریب خوشی کی ہے اور خوشی بھی تکمیل کی ہے آغاز اور ابتدا کی نہیں بلکہ حدِ کمال پر پہنچ جانے کی ہے۔ تو ان کے لئے دعا ہے کہ حق تعالیٰ انہیں حافظِ جید بنائے اور قاری مجوّد بنائے۔ عالم با عمل بنائے' صاحب اخلاق وصی و نقی و تقی بنائے اور وہ ساری امیدیں پوری ہوں جو ماں باپ اور اساتذۂ کرام نے باندھی ہیں ___ حق تعالیٰ شانہٗ ان چیزوں کو بھی اسی طرح سے مکمل فرمادے جس طرح سے قرآن شریف کے حفظ کو آج انہوں نے مکمل کر لیا۔

آج اس کے الفاظ ان کے سینے میں جمع ہو گئے۔ کل کو انشاء اللہ اس کے معانی جمع ہوں گے' معانی کے بعد اس کے حقائق جمع ہوں گے' حقائق کے بعد ان کی علل آئیں گی' علل کے بعد پھر اسرار و مصالح اور حکم بھی منکشف ہوں گی۔ تو اس طرح علم بڑھے گا ___ غرض ایک درجہ میں یہ آغاز ہے یعنی معانی سمجھنے کے لئے اور ایک درجے میں یہ تکمیل ہے یعنی الفاظ کے حفظ کی۔

علوم و شخصیات کے مراتب

تو الفاظ سینے میں آ گئے اور قرآن کریم دو ہی چیزوں کے مجموعے کا نام ہے نہ محض الفاظ کا نام قرآن ہے نہ محض معانی کا نام ___ بلکہ الفاظ مع المعانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ اس میں الفاظ یاد کئے جاتے ہیں اور معانی سمجھے جاتے ہیں۔ تو ایک میں قوّتِ حافظہ کام کرتی ہے' ایک میں قوّتِ عاقلہ کام کرتی ہے۔ تو قوّتِ حافظہ کا کام یہ ہے کہ الفاظ بعینہٖ اپنے اندر محفوظ کر لے اور قوّتِ عاقلہ کا کام یہ ہے کہ ان الفاظ کے اندر سے معانی نکالے اور معانی کے بھی اندر سے معانی نکالے ___ اس لئے کہ قرآن تو ایک سمندر ہے۔ معانی در معانی اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں ۔

حرف حرفش راچند در معنیٰ
معنیٰ در معنیٰ در معنیٰ

ابتداء میں ایک لفظ ہے جو قشر کی مانند ہے اور مغز اس کے معنیٰ ہیں۔ پھر معنیٰ بھی قشر کی طرح سے ہے۔ اس کے اندر اور معنیٰ ہیں۔ پھر وہ بھی قشر کی طرح سے ہے۔ اس کے اندر اور معانی ہیں ___ غرض جیسے علوم کے مراتب ہیں ایسے ہی حق تعالیٰ نے شخصیات کے بھی مراتب قائم کئے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ الفاظ کے فقط مدلول سمجھ لیتا ہے وہ بھی اونچے درجے کا آدمی ہے۔ ایک یہ کہ مدلول سے آگے بڑھ کر وہ حقائق تک پہنچتا

ہے۔ وہ اس سے اونچا عالم ہے اور ایک وہ ہے کہ حقائق کے بعد علل و اسرار کو بھی سمجھتا ہے وہ اور بھی اونچے درجے کا عالم ہے تو جیسے آیات قرآنیہ میں مراتب ہیں ایسے ہی شخصیات میں بھی مراتب ہیں۔ ایک لفظوں کا عالم ' ایک معانی کا عالم ' ایک علل و اسرار کا عالم ' پھر سینکڑوں قرآن کریم کے علوم ہیں جن کا آدمی عالم بنتا ہے۔

غرض یہ ایک خوشی کا دن ہے۔ کہ ہمارے ایک عزیز کے قرآن کریم کے حفظ کی تکمیل ہوگئی۔ اس کے بعد حفظ معنیٰ کا درجہ شروع ہوگا ___ اب ہم دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں معانی کا عالم بھی بنائے۔ پھر یہ دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر نفسِ مزکّٰی بھی پیدا کرے تاکہ حقائق اور علوم و معارف ان پر کھلیں۔

تبریک

بہرحال اس خوشی کے موقع پر میں ان الفاظ کے ساتھ ان کی خدمت میں ان کے والدین اور ان کے اساتذہ کرام کی خدمت میں "مبارک باد" پیش کرتا ہوں۔

حُسنِ طلب نہیں بیانِ واقعہ

مگر بھئی! ہمارے ہاں تو یہ دستور ہے کہ جب مبارک باد ہوتی ہے تو منہ میٹھا ضرور کراتے ہیں ___ فقط چائے پہ ٹرخا دینا یہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے منہ میٹھا ہونا چاہئے۔ بلکہ پہلے ہونا چاہئے تھا۔ میٹھے منہ سے جو دعا نکلتی ہے۔ اس میں چیک زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے اس کی ضرورت ہے کہ منہ میٹھا کرایا جائے تاکہ دعا جاکے اچھی طرح چپکے ___ اور یہ حسن طلب نہیں بلکہ بیانِ واقعہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے کہنے سے ایسا کریں۔ بلکہ یہ دستور ہے۔ اب اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے وہ اس کا درجہ ہے۔ بہرحال ہمارا کام تو یہ ہے کہ جب حاضری ہوئی تو مبارک پیش کریں اور خوشی کا اظہار کریں۔ حق تعالیٰ شانہٗ ان جیسے اور بھی حفّاظ اس مدرسے سے پیدا کرے۔

حُسنِ نیت کے ثمرات

ہمارے بھائی مولانا (محمد یوسف) بنوّری مرحوم ' جس خلوص سے انہوں نے یہ ادارہ قائم کیا اور جس ضبط و نظم اور منظم طریق پر اسے چلایا اور بہترین قواعد و اصول بنائے یہ حقیقت میں ان کی نیت کے ثمرات ہیں جو سامنے آرہے ہیں۔ بلڈنگیں کھڑی ہوئی ہیں۔ نظم بنا ہوا ہے۔ علماء و طلباء جمع ہیں۔ درس و تدریس بھی ہے۔

ایک مخلص پیدا ہوا تو ہزاروں اس سے بن جاتے ہیں۔ جیسے دنیا میں نبی ایک ہی ذات آتی ہے۔ مگر لاکھوں لوگ ایمان سے رنگے جاتے ہیں۔ اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ اس امت میں شخصیات پیدا فرماتے ہیں۔ ان شخصیتوں کے ذریعے سے آگے شخصیتیں بنتی ہیں ___ بہرحال یہ مولانا مرحوم کی نیت کے ثمرات ہیں۔

اَخلافِ صِدق کا وعدہ

جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ اسی طرح سے شخصیات کے بھی پیدا کرنے کی ذمّہ داری لی ہے۔ حدیث میں اس کا وعدہ موجود ہے۔

یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ۔

سلَف کے بعد خلَف پیدا ہوتے رہیں گے اور وہ سلَف کا علم حاصل کرتے رہیں گے ___ غرض شخصیات کے پیدا ہونے کا وعدہ دیا گیا۔ یہ ناممکن ہے کہ نہ ہوں ___ بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ صاحب! زمانہ خراب آگیا۔ اب خلَف صحیح پیدا ہی نہیں ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ علی الاطلاق یہ غلط ہے۔ بے شک خلَف ویسے نہیں جیسے سلف تھے۔ مگر آگے جو خلَف آنے والے ہیں ان کے حق میں یہ سلَف ہی ہیں اور ان کے حق میں یہ بہترین ہی ہیں۔ تو نوعیت قائم رہے گی۔ کبھی مٹنے والی نہیں۔ علماء کے بعد علماء' حفّاظ کے بعد حفّاظ پیدا ہوتے رہیں گے۔

چنانچہ حدیث میں فرمایا گیا :

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم

بہترین دَور میرا دَور ہے۔ جو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا دَور ہے۔ پھر تابعین ہیں۔ پھر تبع تابعین ہیں۔ تو جو مقام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کا ہے وہ تابعین کا نہیں۔ جو تابعین کا ہے وہ تبع تابعین کا نہیں۔ یہ شخصیات میں درجات اور فرقِ مراتب کا قصہ ہے ___ لیکن نوعیت قیامت تک یکساں رہے گی۔ جس کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا :

"میری امت کی مثال بارش کی سی ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پہلا قطرہ زیادہ نافع ثابت ہوا کہ بعد کا قطرہ ___"۔

بارش ہے۔ اول و آخر قطرات پڑ رہے ہیں۔ زمین سیراب ہو رہی ہے۔

غرض امت میں خیر باقی رہے گی۔ فرقِ مراتب ہوتا رہے گا۔ اس سے خیر کا انقطاع نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت اور شخصیات کے ذریعے سے معیار قائم کرایا۔ ان کے ذریعے حق کی راہیں نظر آئیں گی۔

ضرورتِ انتخاب

اور میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر اہلِ حق میں اختلاف ہو جائے۔ تو اختلاف اس کا عذر نہیں کہ حق کو چھوڑ دیا جائے۔ جدوجہد ختم کر دی جائے۔

اگر آپ خدانخواستہ بیمار ہو جائیں اور اطبّاء کی رائے میں اختلاف ہو جائے تو کبھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تو انتقال کرتے ہیں اور قبر میں جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اطبّاء میں اختلاف ہے۔ آپ منتخب کرتے ہیں۔ خواہ اس لحاظ سے کہ یہ طبیب فلاں طبیہ یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے یا اس معیار سے کہ لوگ اس کے یہاں زیادہ شفایاب ہوتے ہیں یا اس لحاظ سے کہ ان کے خاندان میں جدّی طور پر طِب چلی آ رہی ہے اس کو طِب سے زیادہ مناسبت ہے۔ کوئی نہ کوئی معیار لے کر آپ انتخاب کریں گے یہ فیصلہ کبھی نہیں کریں گے کہ اطبّاء میں اختلاف ہے لہٰذا انتقال فرما جانا چاہئے۔ لہٰذا قبر کو آباد کرنا چاہئے۔

غرض جسمانی صحت اور اطبّاء کے بارے میں ان کے اختلاف سے آپ گھبراتے نہیں اور انتخاب کرتے ہیں۔ تو علماء میں اگر اختلاف ہو تو آپ کیوں انتخاب نہیں کریں گے؟ وہاں یہ کیوں فیصلہ کریں گے کہ چونکہ علماء اختلاف کر رہے ہیں لہٰذا دین کو چھوڑ دینا چاہئے۔ وہاں بھی انتخاب کرنا چاہئے۔

معیارِ انتخاب

اب انتخاب کا معیار الگ ہے۔ اصل چیز آپ کی طلبِ صادق ہے جس عالم کی دیانت پر آپ کو اعتماد و اطمینان ہو۔ دین اس کے سُپرد کریں اور اس سے پوچھ پوچھ کر اس پر عمل کریں۔

آپ کو حَکم کس نے بنایا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو آپ ثالث بنیں کہ جب ان کا اختلاف ختم ہو تو میرا دین سنبھلے گا۔ تو نہ اختلاف رفع ہو گا نہ آپ کا دین سنبھلے گا۔ ان لڑنے والوں میں اور اختلاف کرنے والوں میں جس فرد یا جس جماعت اور طبقہ پر آپ کا دل مطمئن ہو۔ اس کی طرف آپ رجوع کریں اور اس سے آپ آنکھ بند کر لیں کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔

عوام کے لئے حجت

میں تو ایک مختصر بات کرتا ہوں کہ عالم کے لئے تو کتاب و سنت حجّت ہے ان میں وہ مسائل تلاش کریں۔ عوام کے لئے حجّت خود وہ عالِم ہے۔ عوام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ براہ راست قرآن و حدیث کو سمجھیں۔ انہیں تعلیم نہیں وہ اسے کیا سمجھیں گے؟ عوام کا کام یہ ہے کہ عالِم ربّانی جو فتویٰ دیں اس پر عمل کریں۔

اور مان لیجئے کہ کسی نے غلط فتویٰ دیا۔ آپ کی ذمہ داری نہیں۔ آپ کے لئے نجات ہے۔ اس عالم کی گردن نپے گی کہ اس نے کیوں غلط فتویٰ دیا؟

من افتیٰ بغیر علم فاثمہٗ علی من افتیٰ۔

حدیث میں ہے کہ جس نے غلط فتویٰ دیا تو مُفتی کو پکڑا جائے گا عمل کرنے والے کو نہیں پکڑا جائے گا۔ اس نے دیانت داری سے عمل کیا۔ تو آپ اپنی جدّوجہد صرف کریں، ان اختلاف کرنے والوں میں کون سا طبقہ ہے، کون سا فرد ہے جو واقعی متدیّن ہے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ آپ دین کے بارے میں اس سے مدد لیں۔ علماء میں اختلاف ہے وہ ان پر چھوڑ دیں آپ کوئی حکم نہیں ہیں کہ بیٹھ کر فیصلہ دیں وہ اپنا فیصلہ خود کریں گے آپ میں اس کی سکت اور استطاعت نہیں ہے۔ ان میں فیصلہ کا حکم وہ بنے گا جو ان دونوں عالموں سے بڑھ کر عالِم ہو۔ وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ صحیح کہتا ہے یہ غلط۔ آپ الف سے ب نہیں جانتے اور علماء کے اندر فیصلہ کرنے کے لئے چلے۔

تو آپ کیا فیصلہ دیں گے؟ آپ کا کام اطمینان کے بعد انتخاب ہے اس سے سن کر اپنا دین چلائیں۔ فتویٰ اور مسئلہ پوچھنے کے ذریعے اپنا دین سنبھالیں۔ جب دین اور علم آگیا اب آپ ذمہ دار ہیں جس راستے پر آپ چلیں گے۔ دیانت سے چلیں گے۔ اس لئے بڑی خرابی یہ ہے کہ اختلاف کو دیکھ کر لوگ اس فکر میں ہیں کہ دین کو چھوڑ دیا جائے کہ صاحب! ہم کہاں جائیں؟

سوال یہ ہے کہ جب بیمار ہوتے ہو تو اطبّاء میں اختلاف ہو جائے تو کہاں جایا کرتے ہو؟ کیا قبر میں جایا کرتے ہو؟ ان میں سے کسی کو حکم اور منتخب کرتے ہیں۔ یہاں کیوں نہیں انتخاب کر لیتے؟ دین کے بارے میں خود مفتی بننے کی کوشش کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے۔

اِتّحادِ علماء کی ضرورت

اس واسطے علماء کے حق میں تو یہی عرض کیا جائے گا کہ وہ آپس میں اتحاد کریں۔ کوئی بھی قدر مشترک لے

لیں۔ مگر اتفاق کریں۔ اپنی ذاتی خصوصیات اپنے گھر میں رکھیں۔ خود عمل کریں اور جو آپ کے زیر اثر ہے۔ اس سے عمل کرائیں۔ لیکن جو قدرِ مشترک ہے' اس میں متفق ہو کر سامنے آؤ۔ دشمنانِ اسلام بہت ہیں۔ اعداءُ اللہ بہت ہیں جو رات دن دین پر حملہ آور ہیں اور استیصال کی فکر میں ہیں۔ آپ ان کے مقابلے میں کیوں نہیں آتے۔ تمام تر جدوجہد آپس کی لڑائی میں صرف ہو رہی ہے۔ غرض آپس میں کسی بھی قدرِ مشترک پر اتفاق کر کے سامنے آؤ۔ مثلاً اللہ واحد' رسول صلی اللہ علیہ وسلم واحد اور کتاب اللہ واحد ــــ اب اگر کسی میں مفہوم کا اختلاف ہے تو ہوتا رہے۔ آپ اپنی دینی زندگی کی فکر کریں۔

طلبِ صادق

بہرحال علماء میں اتفاق کرانے یا علماء میں اتفاق ہو جانے کے انتظار میں آپ اپنی دینی زندگی کے بارے میں بے فکر نہ ہوں۔ طلبِ صادق سے آپ کو بااعتماد علماء مل جائیں گے۔ آج بھی ایسا نہیں کہ دنیا میں علماءِ ربّانی آپ کو نہ ملیں۔ اگرچہ وہ تھوڑے ہیں مگر ضرور موجود ہیں۔ ان کا دامن پکڑ پکڑ کر پُوچھ پُوچھ کر اتباع کرتے چلے جائیں۔ آپ کی اپنی زندگی سنورتی چلی جائے گی۔

غرض علماء کے اختلاف کو دین سے بیزاری کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ انتخاب کا طریق اپنایا جائے۔

یہ چند باتیں میں نے آپ حضرات کی خدمت میں عرض کیں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عمل مرحمت فرمائے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنا نصیب فرمائے۔ آمین!

وأخر دعوانا ان الحمد لله ربّ العٰلمين۔

(کتبہ' ۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ)

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

حقوقِ مالیہ

کمیونزم اور اسلام میں یہی فرق ہے کہ کمیونزم دلواتا ہے 'مگر جبری طور پر' اس سے غصہ اور غیض وغضب پیدا ہوتا ہے۔ امیر کہتا ہے کہ اس فقیر کو کسی طرح تباہ کردو' یہ کمائی میری ہے 'لوٹ کر یہ لے جاتا ہے۔ غریب کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کو تباہ کردو' جنہوں نے ہمارے حقوق مار رکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تاک میں ہیں۔ یہ غالب آئے گا' اُسے ختم کردے گا' وہ غالب آئے گا' اِسے ختم کردے گا۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ'

بعداز خطبہ مسنونہ

اما بعد ۔ فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔
ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستة ایام ثم استوٰی علی العرش یغشی الیل النھار یطلبہ حثیثا والشمس والقمر والنجوم مسخرٰت بامرہ الا لہ الخلق والامر تبٰرک اللہ رب العٰلمین (اعراف پ ۸ ع ۶)
صدق اللہ العلی العظیم [1]

بدن اور اس کی ضروریات کا خالق

بزرگانِ محترم!

مجھے اس وقت کوئی لمبی چوڑی تقریر کرنا نہیں ہے۔ مختصر طریق پر چند کام کی باتیں آپ حضرات کے سامنے گذارش کروں گا اور اس میں بھی کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے۔ بلا تمہید جو اصل مقصود کی باتیں ہیں' وہی کہنی ہیں۔

اتنی بات ہر مسلمان جانتا ہے کہ ہمارا خالق اور مالک اللہ ربّ العزّت ہے اسی نے ہمیں پیدا کیا' ہمارے

---

[1] ۳۱ جولائی ۱۹۶۳ء افریقہ)

بدن کو بھی اور ہماری روح کو بھی اور روح وبدن کے لئے جن سامانوں کی ضرورت ہے' ان سامانوں کو بھی اس نے پیدا کیا۔ بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت تھی۔ تو زمین سے لے کر آسمان تک ان ضروریات کو پھیلادیا۔ زمین میں طاقت رکھ دی کہ ہماری غذائیں اگائے۔

اس میں طاقت رکھ دی کہ ہمارا لباس بھی اگائے۔ گویا زمین کو اللہ نے غذاؤں کا گودام بنادیا۔ یہ گیہوں' چنے' چاول' پھل پھول اور فروٹ سب اسی سے نکلتے ہیں۔ پھر اپنی حکمت سے زمین ہی کو سڑک بنادیا۔ ہم اس پر چلتے پھرتے ہیں ___ پھر زمین ہی میں ہمارے لئے پانی کا سامان رکھا اور دریا جاری کر دیئے' زمین ہی کے اوپر ہوائیں پھیلادیں کہ ہم سانس لے سکیں۔ تو زمین گودام' واٹرورکس' اور ہمارے کپڑوں کا صندوق بھی ہے۔ جس سے روئی اور جانوروں کی اون نکلتی ہے۔ ساری بدنی ضروریات اس میں مہیا کی ہوئی ہیں۔

بدن کو روشنی کی ضرورت تھی تو پہلے آسمان کی چھت قائم کی۔ اس میں چاند سورج اور ستاروں کے انڈے لٹکادئے پھر ایک ہی چیز سے بہت سے کام لئے۔ سورج ہمیں روشنی بھی بخشتا ہے۔ گرمی کی ضرورت ہے تو حرارت بھی بخشتا ہے۔ ٹائم اور وقت کی ضرورت ہو تو اچھی خاصی گھڑی بھی ہے۔ جس سے ہم اوقات بھی معلوم کرتے ہیں ___ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ۔ ستاروں سے لوگ راستے بھی پاتے ہیں۔ سمندروں میں جہاز رانی ہوتی ہے وہاں سڑکیں بنائی ہوئی نہیں ہوتی' سمتوں سے چلتے ہیں اور سمتیں ستاروں سے متعین کرتے ہیں۔ تو ستاورں سے راہ' سورج سے روشنی اور گرمی ملتی ہے۔ نیز ستاروں سے جڑی بوٹیوں میں خاصیتیں اور تاثیر پیدا ہوتی ہیں ہڈیوں کی نلیوں میں گودا اور روغن پیدا ہوتا ہے۔

غرض انسان کے لئے جتنی بدن کی ضروریات درکار ہیں۔ وہ سب زمین اور آسمان کے وسط میں رکھ دی ہیں تو وہ ہمارے بدن کا بھی خالق ہے اور بدن کی ضروریات کا بھی۔

رُوح اور اس کی ضروریات کا خالق

اسی طرح وہ ہماری روح اور اس کی ضروریات کا بھی خالق ہے۔ جیسے بدن کی ضروریات ہیں' بدن کے لئے غذا کی بھی ضرورت ہے تو روح کے لئے بھی ضرورت ہے۔ بدن کو اگر راحت کی ضرورت ہے' تو روح کو بھی سکون و تسکین کی ضرورت ہے۔ ___ فرق اتنا ہے کہ بدن مادی چیز ہے اس کے سامان بھی مادی ہیں روح ایک پاکیزہ اور لطیف چیز ہے اس کے سامان بھی لطیف ہیں روح کی غذا علم و معرفت' اخلاقِ ربانی اور ملکیت ہے یعنی ملائکہ کی صفات اپنے اندر پیدا کی جائیں۔ اس سے روح کو سکون ملتا ہے۔ روح کو آپ کے اس روٹی اور کپڑے کی ضرورت نہیں ہے اس کا روٹی کپڑا اس کے مناسب حال ہے جو علم' کمالِ دین و دیانت اور اخلاق ہے۔

جس طرح پانی کے لئے بادل مقرر کئے۔ جو اپنے وقت پر آکر برس جاتے ہیں' جس سے آپ کی زمین سیراب ہوتی ہے اسی طرح علم کے بادل پیدا کئے۔ وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہیں جن کے ذریعے وحی کی بارش ہوتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ :

> مثل ما بعثنی اللہ بہ من الھدی والعلم کمثل الغیث الکثیر اصاب ارضاً الخ

میری اور میرے دائرۂ علم و کمال کی ایسی مثال ہے جیسے بہت زور کا بادل اُٹھا اور گھٹا اُٹھی اس میں سے

بارش برسنی شروع ہوئی موسلا دھار پانی پڑا تو زمین کی تین قسمیں ہو گئیں ایک زمین وہ ہے جو پانی کو اپنے اندر جذب کرتی ہے اور پھل پھول اُگا کر باغ و بہار بنا دیتی ہے' ایک وہ کہ باغ و بہار اور پھل پھول نہیں نکالتی لیکن پانی کو جمع کر لیتی ہے گہرے تالاب ہیں ان میں پانی بھر جاتا ہے پھر لوگ وہاں سے پانی لے کر پیتے ہیں۔ کھیتوں کو سیراب بھی کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ وہ جو بالکل چٹیل میدان ہے جس میں نہ اگانے کی صلاحیت ہے نہ پانی کے جمع کرنے کی پانی آیا اور بہہ کر نکل گیا۔ نہ جمع کیا کہ دوسرے فائدہ اٹھائیں نہ کوئی پھل پھول ہی اُگایا کہ خود اس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دلوں کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک قلوب وہ ہیں کہ جب وحی کا پانی آتا ہے تو وہ اپنے اندر سمو لیتے ہیں اور اس سے طرح طرح کے علم و حکمت کے پھل پھول نکال کے پیش کرتے ہیں۔ جس سے روحانیت میں باغ و بہار آجاتی ہے۔ یہ ایسے ہیں جیسے فقہاء کہ دین اور علم پہنچا' انہوں نے اجتہاد کیا مسائل نکال نکال کر دنیا کے آگے رکھ دیئے تاکہ لوگ عمل کریں۔

ایک قلوب کا وہ طبقہ ہے' جو پھل پھول تو نہیں اُگا سکتا۔ مگر امانت داری کے ساتھ وحی کے پانی کو جمع کر لیتا ہے۔ لوگ آتے ہیں' کوئی اس سے پیتا ہے' کوئی کھیتی کو دیتا ہے۔ یہ ایسے ہیں جیسے محدثین اور حفاظ قرآن حکیم کہ وحی آئی اور انہوں نے اسے اپنے سینے میں جمع کر لیا۔ ان میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس میں سے مسئلہ نکال لیں۔ مگر جو آئے گا' اسے پانی پہنچا دیں گے وہ اس میں سے مسائل نکال لے گا۔

تیسرا طبقہ گمراہ کہا گیا وہ وہ ہے کہ وحی کا پانی برسا لیکن اس کے دل ایسے ہیں جیسے اونچی زمین ہوتی ہے کہ آیا اور بہہ گیا۔ نہ اس میں جمع ہوا نہ پھل پھول نکلے ___ جیسے مادی پانی کے لحاظ سے زمین کی تین قسمیں ہیں اسی طرح وحی کے پانی کے اعتبار سے بھی قلوب کی تین قسمیں ہیں ___ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے جیسے بدن کے لئے غذائیں پیدا کی گئیں' روح کے لئے بھی پیدا کی گئیں' بدن کی غذا بھی ہر ایک نہیں نکال سکتا۔ کسی کے اندر ایجاد کا مادہ ہے کہ زمین میں سے معدنیات نکالے' سونا چاندی اور سیسہ نکال کر طرح طرح کے سامان بنائے' ایک وہ مزدور ہیں' جن میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ایجاد کریں' وہ سونا چاندی نکال نکال کے پیش کر دیتے ہیں' تاکہ دوسرے اس سے کام لیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن میں نہ عقل ہے نہ ہمت نہ ایجاد کر سکتے ہیں نہ وہ کوئی چیز جمع کر سکتے ہیں بلکہ دونوں باتوں سے خالی ہیں۔ غرض جیسے وہاں تین قسمیں ہیں۔ یہاں بھی تین ہی قسمیں ہیں۔

رُوح و بدن کو صحیح کر کے اس کے مالک کو سونپنا ہے

تو بدن کے لئے مادی غذاؤں کی ضرورت ہے۔ روح کے لئے روحانی غذاؤں علم و کمال وغیرہ کی ضرورت ہے اور یہ سارے سامان اللہ میاں نے پیدا کئے۔ تو ہم بھی' ہماری جان بھی' ہمارا مال بھی سب خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اور ہم اللہ کی مِلک و مملوک ہیں۔ نہ ہمارا بدن ہماری مِلک ہے نہ روح۔ ہم امانت دار ہیں مالک نے پیدا کیا ہمارا فرض ہے کہ ہم امانت داری کے ساتھ اسے سونپ دیں اور صحیح کر کے اسے سونپیں۔ تو ہم اس بدن کے خود مالک نہیں ہیں۔ یہ سرکاری مشین ہے۔ اس لئے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔

اس لئے اگر بدن پر بیماری آجائے تو سنت ہے کہ علاج کیا جائے۔ اس کی حفاظت کی جائے۔ اس لئے کہ ہماری ملک ہو تو چاہے اپنے کو ختم کر دیں' چاہے قتل کر دیں' خود کشی کر لیں۔ مگر یہ ہماری ملک نہیں' مالک کی

چیز ہے۔ ہمیں امانت داری کے ساتھ اسے سونپنا ہے۔ اس واسطے اس کے کہے کے مطابق ہم بدن میں تصرف کرتے ہیں' بدن بیمار ہو تو علاج کرتے ہیں، پھوڑا پھنسی ہو تو مرہم لگاتے ہیں اندر کا زخم ہو تو آپریشن کراتے ہیں' دوائیں پیتے ہیں تاکہ صحت ہو جائے اسی طرح روح کے اندر بھی پھوڑے اور پھنسیاں نکلتی ہیں۔ بیماریاں بھی آتی ہیں۔ اخلاق کی بیماریاں ہیں اگر بداخلاقی پیدا ہو گئی۔ حرص' حسد' بغض' تکبر اور غرور پیدا ہو گیا دوسرے کو ایذا پہنچانے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ روح کی ہی بیماریاں ہیں۔

جیسے بدن کی بیماریوں میں علاج کے لئے آپ ڈاکٹروں اور اطباء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ روح کی بیماریوں کے لئے روحانی ڈاکٹروں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ وہ اس کی تدبیر جانتے ہیں' مادی ڈاکٹر نہیں جانتے۔ وہی بتا سکیں گے کہ تکبر کو کیسے دور کریں' لالچ کو کیسے چھوڑیں' حسد کو کیسے دور کریں۔ اس کے علاج اور تدبیر میں اس کے لئے کتابیں ہیں علوم و فنون ہیں۔ جو قرآن و حدیث میں سب بیان کر دیئے گئے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ہم نہ اپنے بدن کے مالک نہ روح کے مالک اور جب ہم اپنے بدن اور روح کے مالک نہیں ہیں۔ تو ظاہر بات ہے کہ ہم آسمان اور زمین کے مالک کیسے ہوئے؟

رُوح اور بدن کو اپنے خالق کی بندگی کے سوا چارہ نہیں ہے

اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ اگر آپ بدن و روح کے مالک ہوتے تو جان آپ کے قبضے میں ہوتی۔ کوئی بھی نہ مرا کرتا' کسی کا انتقال نہ ہوا کرتا' کوئی مارتا تو فوراً کہتے کہ میں مالک ہوں۔ کسی کو کیا حق ہے کہ وہ میری جان نکال سکے تو ملک الموت سے بڑی لڑائیاں ہوا کرتیں کہ صاحب! آپ کو کیا حق حاصل ہے، کہ آپ جان نکالنے گئے۔ جان تو میری ہے۔ مگر جب جان نکلنے کا وقت آتا ہے تو ایک منٹ کے لئے نہیں روک سکتے۔ پیدا بھی ہونا ہی پڑتا ہے' مرنا بھی پڑتا ہے' نہ جینا اپنے قبضے میں نہ مرنا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ نہ ہم جان کے مالک ہیں نہ بدن کے مالک۔ اگر بدن پر ہمارا تسلط ہوتا' ہم کبھی بیمار نہ ہوتے۔ کون کہتا ہے کہ میرا بدن خراب ہو' یا میرا بدن کمزور پڑ جائے۔ لیکن جب بیماری آتی ہے' بیمار ہونا ہی پڑتا ہے۔ جب کوئی آفت آتی ہے تو سہنی ہی پڑتی ہے۔

اس لئے جیسے بدن دوسرے کا ہے' اسی طرح اس پر عوارض آتے ہیں' وہ دوسرے کی طرف سے آتے ہیں۔ تو جب اسی طرح سے ہم بے بس ہیں کہ نہ آنا ہمارے قبضے میں' نہ جانا ہمارے قبضے میں۔ قضا لاتی ہے' آنا پڑتا ہے۔ قضا لے جاتی ہے' جانا پڑتا ہے۔ جب ہم اپنے مالک نہیں تو اس زمین و آسمان کے مالک کیسے ہوئے؟ اسی طرح رات دن' اس کے بھی مالک نہیں۔ یہ ہمارے قبضے میں نہیں کہ رات کو لمبا اور دن کو چھوٹا کر دیں۔ یہ اس کے قبضے میں ہے جو رات دن کو پیدا کر رہا ہے ____ جب ہر صورت میں خالق و مالک وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہو گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بدن کو پیدا تو وہ کرے۔ عبادت ہم دوسرے کی کریں' حکم دوسروں کا مانیں' گردن دوسرے کے سامنے جھکائیں۔ اسی کے آگے گردن جھکے گی' جس نے گردن کو بنایا ہے' اسی کے آگے ہماری روح اور بدن جھکے گا' جس نے ان کو پیدا کیا ہے ____ حاصل یہ نکلا کہ جب مالک و خالق وہ ہے۔ ہم اس کے غلام ہیں' تو غلام کا کام یہ ہے کہ بے چون و چرا مالک کے حکم پر گردن طاعت سے جھکا دے۔ سرکشی کرے گا تو غلامی سے نکل جائے گا۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ه (ذریات پ ۲۷ آیت ۵۶)

''ہم نے جنوں اور انسانوں کو محض اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری بندگی کریں''۔

اس لئے کہ جب ہم پیدا کرنے والے ہیں، ہم مالک ہیں، تو کون ہے جو ہماری بندگی نہ کرے ہمارے سامنے نہ جھکے۔

بندے کا کام ارادہ سے ہمہ قسم عبادت ہے

آپ ارادہ کریں نہ کریں، جھکنا تو پڑتا ہے موت آئے گی تو آپ جھکیں گے؟ یا یہ کہیں گے کہ ہم نہیں موت کو قبول کرتے، مجبور ہونا پڑے گا۔ صحت و بیماری آئے گی۔ مجبور ہو کے اسے قبول کرنا پڑے گا۔ مالک کے آگے جھکنا ہی پڑے گا۔ محتاج کا کام یہ کہ غنی کے آگے جھکے۔ اگر آپ غنی ہیں، جھکنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر غنی نہیں، محتاج ہیں، تو پھر محتاج ہو کے تو جھکنا ہی پڑے گا۔ تو بجائے اس کے کہ آدمی مجبوراً جھکے، رضا مندی سے کیوں نہ جھکے۔ مجبوراً تو آسمان، زمین اور پہاڑ بھی جھک رہے ہیں۔ یہ ان پر قہر ہے۔ لیکن انسان کو عقل و ارادہ اور اختیار دیا گیا۔ تو اور چیزیں بلا ارادہ جھکتی ہیں۔ انسان کا کام یہ ہے کہ ارادہ سے جھکے، عقل سے سوچ کر جھکے، اپنے اختیار سے جھکے۔ اسی کا نام عبادت ہے تو بندے کا کام بندگی کرنا ہے اور بندگی کا معنیٰ غایت تذلّل کے ہیں۔ پوری طرح اپنے مالک کے آگے انتہائی ذلت اختیار کرنا، یہ عبادت ہے۔ یہ کیوں اختیار کرے؟ اس لئے کہ اللہ کی اتنی عزت ہے کہ عزّت کا کوئی درجہ ایسا نہیں ہے، جو اس کے ہاں نہ ہو۔ تو بند اس کے سامنے انتہائی ذلت ایسی پیش کرے کہ ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ انسان کے اندر سب سے بڑی چیز عزّت کی اس کی ناک اور پیشانی ہے۔ نماز میں زمین پر اس کو ٹیکا جاتا ہے کہ اے اللہ! میں اپنی سب سے زیادہ عزّت کی چیز کو تیرے آگے پامال کرتا ہوں کیونکہ تیری عزّت سب سے بلند ہے۔ غرض بندے کا کام بند کرنا ہے۔ جان سے بھی، مال سے بھی اور آبرو سے بھی۔ اس لئے کہ عزّت کی ضرورت پڑے تو وہ وہاں سے آئے گی، مال و جان کی ضرورت پڑے، وہ وہاں سے آئے گا۔ اس لئے کہ بندہ نہ اپنی جان کا مالک نہ اپنی آب اور مال کا مالک۔ تو بندگی کا حاصل یہ نکلا کہ مال، جان، آبرو، سامان سب سے عبادت کرے۔

اس لئے اللہ نے عبادتوں کی قسمیں رکھ دی ہیں۔ ایک جانی عبادت ہے، وہ جان سے ادا کی جاتی ہے جیسے آپ نماز پڑھتے ہیں بدن کو، روح کو جھکاتے ہیں اور حج کرتے ہیں اس کے لئے سفر کرتے ہیں۔ ایک م عبادت ہے۔ جیسے صدقہ اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور غرباء کی خدمت کرتے ہیں۔ تو تینوں قسموں کی عبادتیں فر کردی گئیں۔ بندے کا کام یہ کہ جان، مال اور آبرو سے بھی جھکے۔ جان سے نماز میں اور آبرو سے حج میں جھ ہے۔

آبرو سے عبادت

اس لئے کہ جتنے وقار اور ظاہری عزّت کے سامان ہیں، سب کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ اپنے وطن میں آ آبرو اور وقار جتلاتا ہے۔ تو ملک چھڑوادیا، تو جو وقار گھر کا تھا وہ ختم ہوگیا۔ اب مسافر بن کے چلا جارہا ہے۔ لباس آبرو اور وقار پیدا کرتا ہے۔ نیا لباس پہنا ہے، اکڑ کے چلتا ہے۔ تو حکم دیا گیا کہ لباس اُتارو، کفنی پہنو، ننگے سر رہو۔ پھر آدمی بدن کی زینت سے اور چہرے کے بنانے سنوارنے سے وقار حاصل کرتا ہے۔ یہاں یہ ہے کہ جب احرام باندھ لیا، بال، ناخن کتروانے کی اجازت نہیں، بدن میں جوئیں پڑ جائیں تو مارنے کی اجازت نہیں، شکار کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ بندہ عاشق بن کر جاتا ہے، عاشق کا زینت سے کام؟ عاشق اگر اپنی زینت اور آرائش کرے گا تو محبوب کی طرف کیسے متوجہ ہوگا؟ وہ پکا عاشق نہیں اس

یہ سب کچھ چھڑوایا گیا۔

پھر محبوب کے گھر آیا تو پروانوں کی طرح سے چکر کھا رہا ہے، طواف کر رہا ہے۔ محبوب نے کہا کہ منٰی جا، وہاں چلا گیا کہ سر منڈا، سر منڈا دیا۔ پھر کبھی آدمی چال سے وقار حاصل کرتا ہے کہ بن بن کر چلتا ہے۔ تو سارا وقار نکال دیا گیا۔ جب بیت اللہ کا طواف ہوتا ہے۔ تو جس طواف کے بعد سعی کرنی ہوتی ہے، اس میں رَمل بھی ضروری ہوتی ہے۔ کہ چار پھیروں میں اکڑ کے چلے۔ اب کوئی عالم ہو، لمبی داڑھی ہو، وہ جھک کر چلتا، مگر اب اکڑ کے چل رہا ہے جیسے پہلوان جا رہے ہوں۔ پھر رمل کا حکم دیا گیا۔ جب تم رَمل کرو اور پہلوانوں کی طرح چلو تو اِحرام کی چادر کو دائیں مونڈھے کے نیچے رکھ کے بائیں مونڈھے پر ڈال لو، تو سارا بدن کھل گیا۔ جو لوگ اپنا بدن کھولنا وقار کے خلاف سمجھتے ہیں، وہ وقار بھی ختم ہو گیا۔ اسی طرح صفا و مروہ میں دوڑنے سے وقار ختم ہوتا ہے۔

غرض وقار کی جتنی چیزیں تھیں۔ وہ سب ممنوع قرار دے دیں۔ تو حج میں آبرو ختم کر کے اسے مٹا کر عبادت کرائی جاتی ہے۔

نماز کا قصہ برعکس ہے کہ گھر سے نکلو تو دوڑ کے مت چلو فرمایا گیا :

لاتأتوها وانتم تسعون واتوها وانتم تمشون ۔

"مسجد میں آؤ تو وقار کے ساتھ چلو۔ ایسے دوڑ کے مت چلو جیسے بچے دوڑا کرتے ہیں"۔

وہاں یہ حکم تھا کہ لباس اُتار کر کفنی پہنو۔ یہاں یہ فرمایا کہ پورا لباس پہن کر ننگے سر بھی نہیں، پورے وقار کے ساتھ نکلو۔

حج میں فرمایا کہ خبردار! اگر تم نے خوشبو لگائی۔ نماز کے بارے میں فرمایا، خود بھی خوشبو لگاؤ اور مسجد کو بھی معطّر کرو۔ تو بالکل برعکس ہے۔ کیونکہ نماز میں جان سے اور حج میں آبرو سے عبادت کرائی جاتی ہے۔

عبادتِ مالی

اب مال رہ گیا تھا تو زکوٰۃ وصدقات کی عبادت رکھ دی کہ اس میں سے غرباء کا حق نکالو ۔۔۔ پہلی امتوں کو حکم یہ تھا کہ اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد جو بچے وہ صدقہ کر دو ایک پائی رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر تم نے رکھا تو تمہاری روحانیت نہیں بنے گی۔ اخلاق درست نہیں ہوں گے۔ بس کھا لیا، پی لیا اور پہن لیا۔ باقی جو زائد ہے، صدقہ کر دیا۔

اور اگر کوئی صدقہ لینے والا نہ ملے، تو حکم یہ تھا کہ اس مال کو آگ لگا دو تَاْكُلُهُ النَّارُ۔ آگ اس کو کھا لیتی تھی۔ یہ علامت تھی کہ صدقہ قبول ہو گیا ۔۔۔ لیکن یہ امت ضعیف ہے۔ اس واسطے رعایت کی گئی کہ کھاؤ بھی، پیو بھی۔ اگر بچ رہے تو یہ نہیں ہے کہ سب دے ڈالو۔ اس میں کچھ حقوق مقرر کر دئے کہ اس طرح سے اپنے مال کو خرچ کرو اور اس میں فرائض مقرر کئے۔

جس مال کے حاصل کرنے میں آدمی کو زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں اللہ نے اپنا حق کم کر دیا، تاکہ دینے میں آسانی ہو۔ جو مال کم محنت سے حاصل ہوتا ہے، اس میں اپنا حق بڑھا دیا کیونکہ دینے میں سہولت ہے۔ جس مال میں بالکل محنت نہ پڑے تو حصہ بھی بڑھا دیا۔ جسے حاصل کرنے میں آسانی تھی، تو دینے میں بھی آسانی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا، اگر کسی کو دفینہ یا خزانہ مل جائے۔ مثلاً لاکھ دو لاکھ کا زمین سے مل جائے۔ تو یہ بلا

محنت کے بلا کوئی مشقت نہیں اُٹھائی پڑی اتفاق سے جنگل میں گئے' زمین کو کھودنے لگے تو ایک بڑی بھاری دیگ نکل آئی۔ یہ بلا محنت ملا۔ اس میں حق تعالیٰ نے پانچواں حصہ رکھا ہے۔ اگر سو روپے ہیں تو پانچواں حصہ بیتُ المال میں جمع کرے گا۔ یعنی بیس روپے غرباء کا حق ہے اور اسی روپے تمہارا حق ہے۔ اس لئے کے سو میں سے بیس دینا مشکل نہیں ہوگا۔ جبکہ اسی بھی بغیر محنت و مشقت کے مل رہے ہیں۔ چونکہ اسمیں محنت کم تھی تو اللہ نے اپنا حق بڑھا دیا۔

اگر کھیتی باڑی کی' تو کھیتی میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں اپنا حق گھٹا دیا۔ دفینے میں پانچواں حصہ تھا۔ یہاں فرمایا گیا کہ دسواں حصہ دینا پڑے گا۔ یعنی سو روپے میں سے دس روپے دینے پڑیں گے۔ یہ بیتُ المال کا حق ہوگا۔ جو غریبوں پر خرچ ہوگا۔ نوے روپے تمہارے اپنے ہیں تو کھیتی میں اللہ تعالیٰ نے اپنا حق گھٹا دیا۔

اور اگر آدمی تجارت کرنے لگے تو تجارت میں زیادہ محنت ہوتی ہے تاجر کا دماغ صبح سے شام تک لگا رہتا کہ میل بھی باقی رکھوں' سامان میں بھی کمی نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ گاہک آئے اور میری دوکان میں چیز نہ ہو تو صبح سے شام تک دماغ لڑاتا ہے گویا محنت زیادہ کرتا ہے۔ وہاں سے مال منگواؤ' وہاں سے مال منگواؤ' کہیں بکنگ کا قصہ ہے' کہیں لاری کا سسٹم ہے۔ غرض دنیا بھر کے جھگڑے ہیں اور اس میں پھر ہر ایک کو خوش رکھنا' گاہک سے بھی معاملہ نرمی سے کرنا' اگر گاہک نے کوئی بدتمیزی کی' پھر بھی تاجر کا فرض ہے کہ اخلاق سے پیش آئے۔ بداخلاقی برتے گا تو گاہک دوکان چھوڑ کے چلا جائے گا۔

غرض یہاں بھرپور محنت کرنی پڑتی ہے۔ اللہ نے اپنا حق اور کم کردیا کہ تم بجائے خُمس و عُشر کے چالیسواں حصہ دے دو۔ سو میں سے اڑھائی روپے دے دو۔ تو سو روپے میں سے اڑھائی روپے دینے کوئی مشکل نہیں ہوتے۔

اور اس میں یہ آسانی کردی کہ جس دن سو ہوئے' زکوٰۃ تو واجب ہوگئی' لیکن ادا کرنا واجب نہیں جب تک کے ایک برس نہ گذرے ایک برس میں اگر اور کمائے گا' تو سو سے زیادہ ہوجائیں گے۔ پھر اڑھائی روپے دینا کچھ مشکل نہیں ہوں گے۔ تو اللہ نے یہ عجیب اُصول رکھا کہ جس میں بندے کی محنت بڑھتی ہے۔ اتنا اپنا حق گھٹا دیتے ہیں' جتنا بندہ بے محنت کمائے' اپنا حق بڑھا دیتے ہیں تاکہ دینے کے اندر اسے عار نہ پیدا ہو' مشکل نہ پیش آئے۔

تو زکوٰۃ میں غریبوں کا حق رکھ دیا۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کمانے میں آپ اپنے کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کو بھی۔ غریب بھی اسی طرح آپ کی اولاد ہے۔ اگر یہ آپ کی نسبی اولاد ہے تو حیثیت کے لحاظ سے وہ آپ کی معنوی اولاد ہے۔ ان کو اگر نہ دیا' آپ کے لئے پھر دوسری مشکلات پیدا ہوں گی۔ جب غریبوں کو حقوق نہیں پہنچیں گے۔ پھر سرمایہ دار اور مزدور کا سوال پیدا ہوگا۔ وہ سارے کھڑے ہوجائیں گے کہ ان سرمایہ داروں کو نکالو یہاں سے۔ اس میں زیادہ مصیبت پڑے گی۔

میں تو کہاں کرتا ہوں کہ اللہ میاں نے سو روپے سے اڑھائی روپے رکھے تھے۔ جب اس کے دینے میں پس و پیش کیا اور نہ دیا۔ تو اتنے بڑے بڑے ٹیکس لگوائے کہ اسّی فیصد گورنمنٹ کا اور بیس فیصد تمہارا۔ اگر اڑھائی روپے دیتے رہتے' تو ساڑھے ستانوے روپے تمہارے ہوتے۔ لیکن اب سو کماؤ گے تو اسی حکومت لے گی' بیس تمہارے ہاتھ میں رہ جائیں گے۔ یہ کفرانِ نعمت کا نتیجہ ہے۔ اگر خدا کا حق پورا دیتے رہتے اور اس کے اُصول پر قائم رہتے۔ دوسرا غلبہ نہیں پا سکتا تھا۔

بہرحال شریعت نے یہ ایک اصول رکھا کہ جتنی محنت اور مشقت زیادہ ہے اللہ میاں اپنا حق گھٹا دیتے ہیں

اور جب بندے کی محنت کم ہو' اپنا حق بڑھادیتے ہیں ___ مثلاً بکریاں ہیں' اگر تجارت کی ہوں تو چالیس بکریوں پر ایک بکری دینی پڑتی ہے اور گائے بیل ہوں' تو بیس گائے پر ایک گائے کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ بدن بڑھ گیا۔ تو اس کی تعداد گھٹادی اور اگر اونٹ ہیں' پانچ اونٹ ہوں گے تو ایک اونٹ کا بچہ دینا پڑے گا۔ اس لئے کہ اونٹ گائے سے دوگنا تین گنا ہے۔ بدن بڑھ گیا' تو عدد کم کردیا۔ تو عجیب حکمت سے ایک نظام قائم کیا ہے۔

عبادتِ مالی سے مقصود امیر و غریب میں توازُن قائم کرنا ہے

اور مقصد یہ ہے کہ امیر اور غریب کے اندر قُرب پیدا ہو۔ یہ نہ ہو کہ امیر آسمان کے اوپر ہو اور غریب زمین کے اوپر ہو۔ کچھ وہ نیچے اُترے' کچھ غریب کو اوپر چڑھادیا تاکہ توازُن پیدا ہوجائے۔

یہ تو شریعت نے پسند نہیں کیا کہ مساوات کرو کہ بالکل ایک ہی جیسی روٹی لباس اور ایک ہی سب کی آمدنی ہو اور جبر کر کے امیر سے ساری آمدنی لے لی جائے تاکہ غریبوں میں بانٹ دی جائے ___ اس لئے کہ اس میں امیر اور غریب کو مضرت پہنچے گی۔

اوّل تو یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ ایک آدمی میں اتنی عقل اور ہوشیاری ہے کہ وہ سو روپیہ لے جاتا ہے۔ تو ہزار روپے کما کے لاتا ہے۔ اور ایک اتنا احمق ہے کہ ہزار روپے لے جاتا ہے وہ بھی کھو کے آتا ہے۔ یہ دونوں کیسے برابر ہوجائیں گے؟ تو جو محنت کرے گا' اس کا حق زیادہ ہوگا۔ جو نہیں کرے گا' اس کا حق کم ہوگا۔ شریعت یہ نہیں کہتی کہ دونوں برابر ہوگئے۔ بلکہ صراحۃً فرمایا:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ۔ (زخرف پ ۲۵ آیت ۳۲)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں' ہم نے اپنے بندوں پر معاش تقسیم کردی ہے اور ایک کو دوسرے سے بڑھایا ہے۔ کوئی اونچا' کوئی نیچا' کوئی امیر' کوئی غریب تاکہ ایک دوسرے کے کام آنے والا ہو اور تمدّن پیدا ہو۔ اگر سارے ایک جیسے ہوتے تو آپ صدقہ کیسے دیتے۔ جسے دیتے وہ کہتا' میرے گھر میں بہت سا پڑا ہوا ہے۔ مجھے ضرورت نہیں۔ تو تعاون اور ایک دوسرے کی خدمت گذاری ختم ہوجاتی ___ اور اگر سارے کے سارے ہی بھک منگے ہوتے۔ تو نہ آپ اسے دیتے' نہ وہ آپ کو دیتا۔ وہ آپ سے بے تعلق' آپ اس سے بے تعلق۔ بالکل سارے مفلس ہوں جب بھی تعاون اور تمدّن نہیں پیدا ہوتا اور سارے امیر بن جائیں' جب بھی پیدا نہیں ہوتا۔ تمدّن جبھی پیدا ہوگا جب کچھ امیر ہوں' کچھ غریب' امیر کی حاجت غریب اور غریب کی حاجت امیر سے اَٹکی ہوئی ہو۔ اس واسطے حکمت باہمی اور تعاون باہمی کے لئے اللہ نے فرق پیدا کیا۔ تو فرق کو مٹادینا یہ فطرت کے خلاف ہے۔

اس لئے اگر مال کا فرق مٹانا ہے تو پھر عقلوں کا فرق بھی مٹانا چاہئے۔ ایک بڑا ہوشیار ہے' اسے تو بے وقوف بنانے کی کوشش کریں اور جو بیوقوف ہے اسے عقلمند بنانے کی کوشش کریں۔ یہ آپ کے قبضے میں نہیں۔ فہموں میں اختلاف ہے' رنگوں میں اختلاف ہے۔ کوئی کالا' کوئی گورا۔ زبانوں میں اختلاف ہے۔ کسی کی عربی' کسی کی انگریزی تو زبانوں' صورتوں' سیرتوں کا' اخلاق کا اور عقل کا اختلاف ہے' تو جب مختلف عقل سے کمائیں گے' اس میں بھی اختلاف ہوگا۔ کوئی زیادہ کمائے گا' کوئی کم کمائے گا' اب اگر آپ جبر کر کے ایک امیر سے کہیں کہ ساری کمائی دے۔ اگر تیرے پاس پانچ ہیں تو یہ سب کو بانٹ دے تاکہ سب برابر ہوجائیں۔

اس کا نقصان یہ پہنچے گا کہ امیر کے دل میں مزدور سے بُعد پیدا ہو گا کہ محنت تو میری اور جبراً سب کچھ اس نے لے لیا۔ میں اور یہ برابر ہو گئے' فرق کیا رہا۔ میں رات دن محنت کروں اور اسے بے محنت دے دوں۔ محنت کو اس کا جی نہ چاہے گا فطرت کے خلاف ہے اور غریب یہ سمجھے گا' جب بے محنت مجھے بھی حصہ مل رہا ہے۔ تو مجھے محنت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ معطل ہو جائے گا۔ غرض اگر آپ نے جبری طور پر معاش کے اندر مساوات اور برابری قائم کی تو نہ امیر باقی رہے گا نہ غریب نہ دونوں ایک دوسرے کام آسکیں گے۔ اس واسطے مساوات فطرت کے خلاف ہے۔ ہاں توازن ہے' یعنی ایک دوسرے سے بالکل بعید نہ ہوں کہ ایک آسمان پر اور دوسرا زمین پر۔ حقوق رکھ دئے کہ کچھ وہ نیچے اُترے' کچھ یہ اوپر ہو جائے تاکہ محبتیں پیدا ہوں۔

مثلاً رمضان شریف آیا اور فرض کیجئے آپ ایک لاکھ کے مالک ہیں۔ اور چالیسواں حصہ زکوٰۃ کا واجب ہوا۔ ایک لاکھ کا چالیسواں حصہ اڑھائی ہزار ہو گا۔ تو اڑہائی ہزار غریبوں کے لئے ہو گا ___ غریب نے کیا سمجھ کہ میں غریب ہوں ہی میرے سر پر ایسے امیر موجود ہیں۔ جو میری خدمت کرتے ہیں۔ میں غریب نہیں ہوں میں بھی دولت مند ہوں۔ تو وہ شکر گزار ہو گا کہ یہ اولاد کی طرح مجھے پال رہے ہیں۔ اس کے دل میں محبت بڑھے گی ___ رمضان شریف میں آپ نے دس ہزار روپیہ بانٹا اور فرض کیجئے کہ دس بیس آدمی ہیں' انہوں نے بھی اتنی ہی مقدار میں تقسیم کیا۔ اب یہ لاکھ دو لاکھ غریب کے پاس جو پہنچے گا۔ تو اس کے دل میں ممنونیت پیدا ہو گی کہ انہوں نے میری خبر گیری کی۔ یہ درحقیقت جتنے امراء ہیں' میرے ماں باپ کی جگہ ہیں' میں ان کی اولاد کی جگہ ہوں' مجھے ان کا حق پہچاننا ہے۔

امیر نے یہ سوچا کہ میرے سے خدا نے کام لیا' میرے سے ان کی خدمت کرائی۔ میری دنیا بھی بنی آخرت بھی بنی۔ وہ غریب کا ممنون ہو گا کہ اگر یہ غریب نہ ہوتا تو میں صدقہ و زکوٰۃ کسے دیتا۔ خدا نے میرے سے ادا کرا دیا' میری دنیا و آخرت بن گئی۔ غریب اپنی جگہ خوش' امیر اپنی جگہ خوش اور دونوں میں محبت پید ہو گئی۔

لیکن اگر غریب آدمی کہے' جو کچھ امیر کے پاس ہے سب پر قبضہ کر لوں۔ تو امیر کے دل میں یہ ہو گا کہ اگر میں نے نہ بھی دیا یہ کم بخت اسے اٹھا لے جائے گا اور غریب کے دل میں کیا آئے گا۔ وہ کہے گا' امیر کے ذمہ ہے ہمیں دینا۔ ہمیں کوئی شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ امیر کہے گا اگر میرا بس چل جائے تو میں سارے غریبوں کی گردن مار دوں۔ کمائی میری ہے' مزے یہ اُٹھا رہے ہیں اور غریب اس فکر میں رہے گا کہ جتنے امیر ہیں سب تباہ ہوں۔ میرے پاس حکومت آئے' میں آج ہی سب کو ختم کر دوں گا۔ جو بر سر اقتدار آئے گا' وہ دوسرے کو ختم کرنے کی فکر میں رہے گا۔ یہ تو اسلام نے ایک توازن قائم کیا کہ غریب امیر کا محب اور عاشق بن جائے گا۔ امیر غریب پر شفیق اور مہربان بن جائے گا۔ تو تعاون' تناسل' تمدن بھی بنے محبتیں بھی بڑھیں۔ لیکن جبری تقسیم اور مساوات و برابری سے غیض و غضب پیدا ہوتا ہے۔

اس واسطے اسلام نے پہلی چیز تو یہ رکھی کہ محبت باہمی اور خلوص سے امیر غریب کو دے۔ ایک حصہ پر جبر کیا گیا کہ چالیسواں حصہ بھائی کو ضرور دو۔ ورنہ وہ بھائی ہی نہیں۔ اگر آخرت پیش نظر ہو تو خوش ہو گا کہ میری آخرت بن گئی ___ تو رمضان میں تو آپ نے یہ دیا۔

اب رمضان گزرا تو عیدُ الفطر آئی' تو اسلام نے صدقۂ فطر واجب کر دیا۔ ہر بچے کی طرف سے خواہ وہ عید سے پہلے ہی پیدا ہو' اس کی طرف سے بھی دینا پڑے گا۔ اب اگر ایک گھر میں بارہ آدمی ہیں تو بارہ روپے گو مٹھی نکلے اور سو آدمی ہیں تو سو روپے گھر سے نکلے۔ تو غریب کہے گا کہ رمضان میں انہوں نے مجھے نوازا تھا۔ عید آ

اب بھی انہوں نے مجھے نواز دیا۔ ان سے بہتر میرا اور کوئی خیر خواہ نہیں' اب محبت اور بڑھ گئی۔

امام ابو حنیفہؒ کی غریب پروری

جیسے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ یہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے اور یہ نہیں کہ ایک آدھ دکان تھی کہ کپڑا بکوا دیا۔ جگہ جگہ کپڑے بننے اور سلائی کرنے کے کارخانے تھے اور اتنی بڑی دولت تھی کہ جب امام ابو حنیفہؒ کی وفات ہوئی ہے تو کچھ امانتیں بھی تھیں۔ مگر چھپن کروڑ روپیہ خزانے کے اندر موجود تھا۔ جو انہوں نے چھوڑا۔ مگر ان چھپن کروڑ سے کیا ہوتا تھا؟ یہ سب غریبوں پر خرچ ہوتا تھا۔

ان کی تاریخ میں لکھا ہے کہ کوفے میں جتنے غریب' بیوائیں اور یتیم تھے' امام ابو حنیفہؒ کے ہاں سب کی فہرستیں بنی ہوئی تھیں اور ان کے قدو قامت بنے ہوئے تھے۔ کہ فلاں اتنی عمر کا ہے' فلاں اتنی عمر کا ہے' فلاں جوان ہے' فلاں بچہ ہے۔ غریبوں کے ہر گھر کے لئے رمضان شریف میں کپڑے تیار ہوتے تھے۔ بڑے آدمی کے بڑے کپڑے' چھوٹے کے چھوٹے کپڑے' عورتوں کے لئے ان کے مناسب اور جہاں عید کا دن آیا صبح صبح سب غریبوں کے گھر کپڑے پہنچ جاتے تھے۔ تو غریب کہتے تھے کہ ابو حنیفہ سلامت چاہئے۔ جیسی عید امیروں کی' ویسی عید ہمارے بچوں کی بھی ہے۔ بہتر سے بہتر کپڑا ہیلا۔

امام ابو حنیفہؒ نے ایک مجلس قائم کی۔ بڑے بڑے علماء و ائمہ اس میں جمع تھے۔ وہ فقہ کے ہر ہر مسئلہ پر بحث کرتے تھے۔ جس کو آپ آج فقہ حنفی کہتے ہیں۔ یہ بہت سے اماموں کے دماغ کا نچوڑ ہے۔ امام محمدؒ' امام زفرؒ' امام ابو یوسفؒ بڑے بڑے ائمہ علم و فضل ان کی ایک کمیٹی بیٹھتی۔ ایک ایک مسئلے پر ایک ایک ہفتہ بحث ہوتی تھی۔ جب چھن چھنا کر بحث کرنے کے بعد ایک چیز صحیح طور پر واضح ہوتی تھی تب وہ لکھی جاتی۔ تو بیس جلدوں میں فقہ حنفی مرتب ہوا۔

یہ جو پچاس کی کمیٹی تھی' ان سب کی تنخواہیں امام ابو حنیفہؒ اپنے خزانے سے دیتے تھے۔ کسی کو پانچ سو ماہوار' کسی کو ہزار۔ یہ لاکھ روپے کا خرچ تھا جس سے ان حضرات کی خدمت ہوتی تھی۔ غریبوں کے لئے الگ ہر عید میں سلے سلائے کپڑے موجود ہوتے تھے۔

پھر اس کے ساتھ یہ صورت بھی ہوتی تھی کہ ہزاروں آدمی امام ابو حنیفہؒ سے لاکھوں روپے قرض لے جاتے تھے۔ ہزاروں کا کام قرض سے چلتا تھا اور اس میں بھی یہ سخاوت کا جذبہ تھا کہ مؤرخین لکھتے ہیں کہ امام صاحبؒ سے ایک شخص نے بیس ہزار روپے قرض لیا اور مدت متعین کر دی کہ برس دن میں ادا کردوں گا مدت گزر گئی' اس کے پاس دینے کو نہ ہوا یا بخل کیا نہیں دیا۔ جب وقت گذر گیا اور نہیں ادا کیا۔ وہ اب امام صاحبؒ سے کترانے لگا کہ سامنے آؤں گا' تو شرمندگی پیدا ہوگی۔ جب امام ابو حنیفہؒ کو دیکھا کہ آرہے ہیں' اس گلی میں گھس گیا' اس کوچے میں چلا گیا تاکہ سامنا نہ ہو ۔ ورنہ مجھے جھوٹا کریں گے۔

امام صاحبؒ کو خیال پیدا ہوا تو ایک دن آپ جا رہے تھے' ادھر سے وہ آرہا تھا۔ وہ دیکھ کر ایک گلی میں گھسا' دوڑ کر امام صاحبؒ بھی اسی گلی میں گھسے اور جا کر پیچھے سے اس کا دامن پکڑا اور کہا کہ :

> "بھائی تو نے تعلقات کیوں خراب کئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو تم نے بیس ہزار لئے تھے وہ دینے کو نہیں تھے' اس لئے شرمندہ نہ ہو۔ میں نے تمہیں معاف کیا' تعلق بڑی چیز ہے روپیہ بڑی چیز نہیں ہے۔ تم ایک پائی دینے کی تکلیف مت گوارا کرو۔ تعلق کو کیوں ختم کیا"۔

ہزاروں کے اس طرح قرضے معاف کردیئے۔ دیکھا کہ یہ نہیں دے سکتا۔ بس سے معاف کردیا۔

امام ابو حنیفہؒ کا تجارت میں تقویٰ

پھر اس میں تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ___ آخر مسلمانوں کے امام ہیں انہوں نے کپڑا بنوا کر سلائی کیا' کئی لاکھ روپے کا کپڑا اور ایک تاجر کو فروخت کرنے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس وقت کپڑے کے دام ذرا سستے ہیں اور دو مہینے کے بعد دام چڑھ جائیں گے' کپڑا روک لیا تاکہ ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول ہوں چنانچہ یہی ہوا۔ جب یہ میعاد گزر گئی۔ اب لوگوں کی ضرورت بڑھی تو انہوں نے دام بڑھا دیئے۔ تو ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول کئے اور جاکر بڑی خوشی سے امام ابو حنیفہؒ کے پاس رکھے۔

امام صاحبؒ نے فرمایا کہ حساب سے تو ایک لاکھ ہونا چاہئے۔ یہ دو لاکھ کیسے ہو گئے؟

اس نے کہا کہ میں نے دو مہینے کے لئے کپڑا روک لیا تھا کہ جب ضرورت بڑھ جائے گی' تب فروخت کروں گا۔

فرمایا' معاذ اللہ اسی کا نام اِحتکار ہے کہ لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ کہہ کر خفا ہوئے اور فرمایا یہ دو لاکھ غریبوں کے اوپر صدقہ کرو۔ یہ مال میرے کام کا نہیں ہے۔ اس میں تم نے غریبوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ جب ضرورت کا وقت تھا' تمہیں مقررہ قیمت پر بیچنا چاہئے تھا۔ تو کمانے میں یہ تقویٰ تھا اور خرچ کرنے میں یہ سخاوت تھی۔

تو ایسے سخی کے سامنے غرباء کا دل کیسے ٹوٹ سکتا تھا۔ ہر غریب کہتا تھا کہ ابو حنیفہؒ سلامت چاہئے۔ میں نہیں غریب نہیں ہوں۔ نہ میری بیوی' بچے اور گھر غریب ہے' کھانے پینے کو آرہا ہے۔ تو امام ابو حنیفہؒ یوں شکر گزار کہ اللہ نے مجھے توفیق دی' میں نے غریبوں کی خدمت کی مجھے اجر ملا' آخرت بنی اور غریب یوں خوش کہ ہماری سرپرستی ہوئی۔ اس لئے وہ غریب اتنے عاشق تھے کہ ابو حنیفہؒ کے پسینے پر خون بہانے کے لئے تیار تھے۔

بہرحال اسلام نے خرچ رکھا اور تقسیم رکھی' مگر خوشدلی کے ساتھ' جبری طور پر نہیں رکھی گئی۔ جہاں جبر کیا' وہاں ایسی صورتیں رکھی ہیں کہ خرچ کرنا ناگوار نہ ہو۔ سو پر اڑھائی روپے اور اڑھائی روپے بھی فوری نہیں' سال بھر کی مدّت رکھی تاکہ دینے میں کوئی دُشواری نہ ہو۔ اس طرح سے اسلام نے خرچ کرایا۔

اسلام نے مالیات کی بنیاد تقسیم کے اُصول پر رکھی ہے جمع اُصول پر نہیں

اسلام نے مالیات کی بنیاد رکھی ہے وہ تقسیم کے اُصول پر رکھی ہے' جمع کے اُصول پر نہیں رکھی۔ یعنی روپے کو رکھا ہے کہ چلتا رہے' گھومتا رہے۔ جمع ہو کر ایک جگہ نہ پڑا رہے۔

زکوٰۃ آئی تو ادا کی۔ پھر صدقۂ فطر کا وقت آیا' پھر خرچ کروایا' تو رمضان میں دیا۔ عید الفطر پہ دیا۔ اب بقر عید آئی۔ اس میں قربانی واجب ہوئی۔ قربانی میں مستحب یہ ہے کہ چوتھا حصہ غریبوں پر صدقہ کرو' اپنے رشتہ داروں کو دو' خود بھی کھاؤ اس موقع پر غریبوں کے گھر گوشت پہنچ گیا' سامان پہنچ گیا۔

اس سب کچھ کے بعد پھر فرمایا :

إنّ في مال المرء حق سوى الزكوٰة

"آدمی کے مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی کچھ حقوق ہیں۔ جو ضرورت کے وقت ادا کرے"۔

اس کو اسلام نے یوں سہل بنایا کہ اخلاقی حالت درست کی اور کہا کہ سخاوت افضل ہے اور بُخل اللہ کے

ہاں مبغوض ہے۔ اس سے بغض وعداوت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا :

السخیّ حبیب اللّٰہ قریب من اللّٰہ والبخیل عدوّاللّٰہ بعید من اللّٰہ

”سخی اللہ کا دوست ہے اور اس کے قریب ہے بخیل اللہ کا دشمن اور اس سے بعید ہے“۔

اس لئے کہ سخاوت اللہ کی صفت ہے، بخل اللہ کی صفت نہیں ہے دوست ہو دشمن، سب کو مل رہا ہے۔ سورج چمکاتے ہیں، دشمن بھی فائدہ اٹھاتے ہیں دوست بھی، مسلم بھی، کافر بھی، زمین پر غذا اگتی ہے، مؤمن بھی لیتا ہے کافر بھی، دوست بھی حصہ پا رہا ہے دشمن بھی۔ دوست دشمن سب کے لئے یکساں ہے بخل نہیں ہے۔

البتہ مؤمن کے لئے خصوصی رحمت ہے کہ اسے دولت کے ساتھ اسلام، ایمان، علم اور آخرت کا عقیدہ بھی دیا۔ یہ خصوصی توجہ ہے۔ مگر دنیا کے اعتبار سے دوست، دشمن، مسلم وکافر سب برابر ہیں۔ تو جود وسخا اللہ کا خاص وصف ہے۔ اس کے خزانوں میں سے رات دن خرچ ہو رہا ہے۔ جو سخی ہوگا، اس نے گویا اللہ کی یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لی۔ بخل اللہ کی صفت نہیں ہے اگر کوئی بخیل ہوگا تو اللہ سے دُور ہو گیا۔ اسے اللہ سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ اس لئے جہاں خرچ کا حکم دیا۔ وہاں سخاوت کی فضیلت بیان کی تاکہ دینے پر آمادہ ہو۔ طبیعت میں گھٹن پیدا نہ ہو۔

قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں جذبۂ سخاوت

اور یہ اتنا بڑھایا کہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں میں دینا اتنا محبوب تھا کہ روکنا اتنا محبوب نہیں تھا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ گھر بار لٹا دیں۔

صحابہؓ میں حضرت ابن عوفؓ یہ بہت زبردست تاجر تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تجارت میں برکت کی دعا کی تھی۔ تو یہ کیفیت تھی کہ روم، شام اور مصر جگہ جگہ ان کا مال جاتا تھا اور نفع جو آتا تھا تو وہ یہ نہیں تھا کہ دو چار آدمی لے کر چلے جائیں۔ نوٹوں کو گڈی ڈالی اور لے کے چلے آئے۔ بلکہ ایسا تھا کہ اونٹوں پر لد کر روپیہ، سونا، چاندی آتا تھا اور کثرت یہ تھی کہ جب گھر میں رکھنے کو جگہ نہیں رہتی تھی، تو عاجز آ کے کہتے تھے کہ گھر کے کونے میں ڈھیر لگا دو۔ تو روپیہ اور اشرفیوں کا چھت تک ڈھیر لگ جاتا تھا۔ یہ دولت کی کیفیت تھی۔ گویا کروڑپتی لوگوں میں سے تھے مگر اس کے ساتھ معاملہ کیا تھا؟

فرماتے کہ اصحابِ حدیبیہؓ جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور معاہدہ کیا تھا۔ ان کی تعداد کتنی ہوگی؟

لوگوں نے عرض کیا کہ چودہ سو۔

تو ایک خاص برتن منگوایا جاتا۔ اس میں روپیہ اور اشرفیاں بھر بھر کر چودہ سو صحابہؓ کے گھر گھر بھجوائی جاتیں کہ یہ میری طرف سے ہدیہ ہے۔ آپ اسے قبول کر لیں۔ پھر پوچھتے کہ اصحابِ بدرؓ کتنے ہیں۔ جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے معلوم ہوا تین سو تیرہ۔

پھر ان تین سو تیرہ صحابہ کرامؓ کے پاس اشرفیاں بھجوائی جاتیں کہ یہ ہماری طرف سے ہدیہ ہے۔

جن کے ہاں پہنچتیں، وہ کہتے کہ اتنا مال ہم کیا کریں گے؟ وہ بھی آگے غریبوں میں بانٹتے۔ تو روپیہ پیسہ ادھر سے چل رہا ہے، ادھر سے نکل رہا ہے۔

سب سے زیادہ دولت کی محبت عورتوں کو ہوتی ہے۔ ان میں بھی سخاوت کا جذبہ اتنا بھر گیا تھا کہ دینا انہیں عزیز بن گیا تھا' رکھنا عزیز نہیں تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ پاک ہیں۔ ان کے بھانجے عبداللہ بن زبیرؓ انہوں نے ایک بوری اشرفیوں کی بھر کر اپنی حکومت کے زمانے میں اپنی خالہ کے گھر پہنچائی ___ جب یہ بوری پہنچی' صدیقہ عائشہؓ نے فرمایا کہ میں اتنا کیا کروں گی؟

خادمہ کو حکم دیا کہ اسے غریبوں میں تقسیم کردو۔ اس نے تقسیم کرنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک تقسیم کی ساری بوری ختم ہو گئی۔ باندی نے کہا' ام المؤمنین! تین دن سے آپ کے اوپر فاقہ ہے۔ غذا میں کچھ میسر نہیں تھا۔ آپ نے بھی کچھ رکھ لیا ہوتا' فرمایا :

"جا بے وقوف! پہلے سے کیوں نہ یاد دلایا۔ دو چار روپے میں بھی رکھ لیتی"۔

گویا یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میرے اوپر فاقہ ہے اور گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اس درجہ غنا اور سیر چشمی پیدا ہو گئی تھی کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ کچھ ہے بھی یا نہیں ___ عورتوں کے دلوں میں سخاوت کا اتنا جذبہ اور اتنی بے تعلقی' یہ اسی تعلیم اور فیض اور صحبت کا اثر تھا کہ جس میں آپؐ نے اخلاق سکھلائے سخاوت کی فضیلت اور بخل کی مذمت بیان کی۔

حضرت امیر معاویہؓ جب شام کے اوپر قابض ہوئے اور پوری خلافت ان کے ہاتھ میں آگئی اور حضرت حسنؓ نے فرمایا کہ میں مسلمانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا۔

گو خلافت کا استحقاق میرا ہے۔ مگر میں معاویہؓ کے حوالے کرتا ہوں۔ امیر معاویہؓ جانتے تھے کہ حضرت حسنؓ میں سخاوت غیر معمولی ہے۔ تو ایک سادہ کاغذ لے کر اس پر دستخط کر کے حضرت حسنؓ کے پاس بھیج دیا کہ جتنا چاہو لکھ دو۔ اتنا ہی آپ کو سالانہ اور ماہانہ دیا جائے گا۔ اس پر انہوں نے لکھ دیا کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ دیا جائے۔ وہ آتا اور تین دن میں ختم ہو جاتا۔ غربا' یتیموں اور فقیروں کو دینے میں ہی خوشی تھی جس پر امیر معاویہؓ نے لکھا کہ :

لا خير في الاسراف

"اسراف اور فضول خرچی میں خیر نہیں ہے۔ ڈھنگ سے دینا چاہئے۔ یہ نہیں کہ ایک لاکھ آیا تو دو دن میں لٹا کے برابر کیا"۔

حضرت حسنؓ نے جواب میں لکھ بھیجا کہ :

لا اسراف في الخير

"اسراف خیر کے اندر ہوتا ہی نہیں"۔

جب اللہ کے لئے دیتے ہیں تو اس میں ایک لاکھ دو لاکھ سب برابر ہیں۔ اس میں کوئی اسراف نہیں۔ غرض یہ کیفیت تھی اور یہ فیض صحبت کا اور اس تعلیم کا اثر تھا۔

تو دینے کے کا قانون بھی بنا دیا گیا۔ ساتھ ہی قلوب میں دینے کے جذبات بھی پیدا کئے گئے۔

سخاوت مسلمانوں کا قومی مزاج ہے

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں قومی حیثیت سے سخاوت موجود ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی فرد یا شخص بخیل

پیدا ہو جائے۔ لیکن قوم کا مزاج جمع کا نہیں ہے۔ خرچ کرنے کا ہے۔ غریب امیر سب کے اندر جذبہ موجود ہے کہ دینے کی عظمت دل کے اندر موجود ہے' جمع کرنے کی عظمت نہیں ہے۔ کوئی واقعہ پیش آجائے' رکاوٹ پیدا ہو جائے' تو الگ بات ہے۔ لیکن قوم کا مزاج قومی حیثیت سے سخاوت کا ہے' بُخل کا نہیں ہے۔ مہمان نوازی ہو گی' تو اپنے آپ کو بچھادیں گے۔ دینا ہو گا تو دینے میں کمی نہیں کریں گے۔ یتیموں کی خبر گیری کریں گے۔

اور اقوام میں دیکھنے میں آتا ہے کہ قومی طور پر یہ مزاج نہیں ہے۔ افراد بڑے بڑے سخی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں غریب ہو وہ بھی سخی ہے۔ اس لئے کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج بنا دیا ہے۔ امیر سخی ہے' غریب سخی ہے حتیٰ کہ جو پیشہ ور لوگ تھے' ان میں سخاوت کا جذبہ ہے۔

معبد جُہَنی ایک بہت بڑا گویا تھا اور فن موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ منصور کے زمانے میں یہ گزرا ہے۔ اس کی یہ کیفیت تھی کہ ایک دفعہ جا کے غزل سنائی۔ تو چالیس ہزار روپیہ اس کی ایک دفعہ کی فیس تھی اور امراء اس کو دیتے تھے۔ شاہی خزانے سے دس ہزار روپیہ روزانہ مقرر تھا' خواہ وہ سنانے کے لئے آئے یا نہ آئے۔ گویا اس کی روزانہ دس ہزار روپے تنخواہ تھی۔ اندازہ کیجئے مہینے میں کتنا پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے باورچی خانے کے لئے تین بکرے مقرر تھے۔ دو ذبح کئے ہوئے' ایک صحیح سالم زندہ۔ یہ تین بکرے روز پہنچتے تھے۔

اور کیوں پہنچتے تھے؟ تھا تو گویا مگر مہمان داری کا یہ عالم تھا کہ تین تین سو مہمان اس کے دستر خوان پر ہوتے تھے۔ امراء آتے تھے' کوئی گانا سیکھنے کے لئے' کوئی اس کی مجلس سے فائدہ اٹھانے کے لئے۔ اور وہ مہمانداری کرتا تھا۔

اس کا بیٹا کہتا ہے کہ میرے باپ نے اتنا کمایا کہ اگر ہم چاہتے تو سونے چاندی کی اینٹوں کے محل بنا لیتے۔ لیکن جب انتقال ہوا تو نوے لاکھ روپے قرضہ چھوڑا۔ جو بیٹے کو ادا کرنا پڑا۔ اس لئے کہ مہمانداری پر اور غریبوں' یتیموں' ناداروں پر خرچ کرتا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں رکھتا تھا۔

تو اسلام میں گویوں اور پیشہ وروں کی یہ حالت تھی۔ یہ اس تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام نے سخاوت کا مزاج بنا دیا تھا۔

عالمگیرؒ اپنے زمانے میں ایک دفعہ کشمیر کی سیر کرنے کے لئے چلے۔ تو سفرمینا کی پلٹن بارہ میل آگے رہتی تھی جو جا کے بادشاہ کے خیمے نصب کرتی تھی اور وہاں دو تین دن قیام ہوتا تھا جب وہاں سے روانہ ہوا وہ سفرمینا کے لوگ آگے بڑھ جاتے تھے۔ پھر انہوں نے آگے جا کر خیمے وغیرہ لگائے تو یہ جو پلٹن تھی جو خیمے وغیرہ لگاتی تھی اس انچارج آفیسر کا نام منعم تھا۔ ایک موقع پر جا کر اس نے خیمے نصب کئے' عالمگیرؒ کو چوتھے پانچویں دن وہاں پہنچنا تھا۔ سامان سب مرتب ہو گیا۔

ایک فقیر کو پتہ چلا کہ یہ بادشاہ کا کیمپ پڑا ہوا ہے' تو اس نے کسی سے معلوم کیا کہ انچارج آفیسر کا نام کیا ہے اسے پتہ چلا کہ اس کا نام منعم ہے تو اس نے آکر بڑی خوش آوازی سے طرز سے ایک شعر پڑھا ؎

منعم بدست کوہ وبیاں باں غریب نیست
ہر گاہ کہ رفت خیمہ زدو بارگاہ ساخت

منعم کسی جنگل میں بھی غریب نہیں' جہاں جاتا ہے' شہر بنا ہوا تیار ہے' خیمے' شامیانے تیار۔ منعم کو خدا نے ایسی دولت اور انعام دیا ہے کہ وہ پہاڑوں میں جائے جب بھی غریب نہیں' جنگل میں جائے جب بھی

غریب نہیں۔ جہاں بھی جائے گا‘ خیمے لگ جائیں گے‘ بار گاہیں بن جائیں گی۔ اس نے اس خوش آوازی سے جو پڑھا۔ اس کی آواز سارے کیمپ میں پھیل گئی۔ تو منعم کو بڑا پسند آیا۔ حکم دیا‘ اس فقیر کو حاضر کرو۔ تو تین لاکھ درہم اس کو دئیے۔ ایک غریب اور بھک منگے کو ایک دم تین لاکھ روپے مل گئے۔

اگلے دن صبح کے بعد اس نے آکر پھر اسی خوش آوازی سے شعر پڑھا۔ اس نے پھر بلایا اور تین لاکھ روپے اور دے دئیے۔ تیسرے دن اس نے پھر شعر پڑھا۔ تو تین لاکھ اور دے دئیے۔ تین دن میں نو لاکھ روپیہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ چوتھے دن نہ آیا ___ اب منعم انتظار میں بیٹھا ہوا ہے کہ وہ آئے تو میں دوں۔ مگر وہ نہ آیا۔ حکم دیا کہ اسے پکڑ کر لاؤ‘ آج کیوں نہیں آیا۔ سپاہی اور پیادے دوڑے اور اسے پکڑ کے لائے۔

منعم نے کہا کہ تو کیوں نہیں آیا؟ ___ اور تو بڑا بے وقوف ہے مجھے تو یہاں دس دن ٹھہرنا ہے اور میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دس کے دس دن تجھے روزانہ تین لاکھ روپے دوں گا‘ بڑا احمق ہے۔

اس نے کہا‘ حضور بات یہ ہے کہ تین دن میں مجھے نو لاکھ روپے ملے ہیں یہ اتنی بڑی دولت ہے کہ میری سات پشتوں کے لئے کافی ہے۔ میں نے یہ سمجھا کہ یہ میرے لئے کافی ہے اور یہ بھی خیال تھا کہ حضور بادشاہ ہیں۔ جذبے میں آکر دے دیا اور اگر کہیں یہ جذبہ آگیا کہ چھین لو اس سے تو پھر ایک پائی بھی میرے پاس نہیں بچے گی۔ اس لئے قناعت بھی نہ آنے کی باعث ہوئی کہ میرے لئے کافی تھے اور خوف بھی باعث ہوا کہ کہیں چھین نہ لیں۔ اس واسطے نہیں آیا۔

اس نے کہا کہ یہ تیرا عمل تھا۔ مگر میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ دس دن میں روزانہ تجھے تین لاکھ دوں گا۔

تو ایک ایک افسر گویا اور پیشہ ور‘ ایک ایک عورت کا اسلام نے یہ مزاج بنا دیا تھا۔ سخاوت کے فضائل سنا کر‘ قانون کی فضیلت بتلا کر کہ کس طرح خرچ کریں۔ مگر اس میں جبر نہیں تھا۔ دل کے داعیے اور جذبے سے آدمی دیتا تھا۔ اس لئے کہ اگر یہ چیزیں جبراً دلوائی جاتیں‘ آدمی دینے سے بیزار ہو جاتا کہ کون اس قانون کے تحت اپنی دولت کو کھوئے کہ میں محنت کروں اور جبراً دوسرے کو دلوا دیا۔ اس لئے جبر کرنے کی بجائے دلوں میں ایسا جذبہ پیدا کیا۔ خود اپنی خوشی سے دیں اور جو حصہ جبری تھا‘ جیسے زکوٰۃ‘ صدقۂ فطر اور قربانی ہے۔ اس میں آخرت کے اتنے فضائل بیان کئے کہ وہ بھی دل کے جذبے سے آدمی دیتا ہے۔ اسلام نے کہا کہ تو ایک حصہ قربانی کر۔ اس نے کہا‘ نہیں میں تو پورا اونٹ دوں گا۔ ساتوں حصے میری طرف سے ہوں گے۔ بلکہ لوگ کئی کئی قربانیاں کرتے ہیں تاکہ غریبوں کو فائدہ پہنچے۔ یہ جذبہ پیدا کر دیا۔ تو ایک مسلم دولت مند بن کر خوش دلی سے دیتا ہے۔

تقسیمِ دولت میں اسلام اور کمیونزم میں فرق

کمیونزم اور اسلام میں یہی فرق ہے کہ کمیونزم دلواتا ہے مگر جبری طور پر اس سے غصہ اور غیض و غضب ہوتا ہے امیر کہتا ہے کہ اس فقیر کو کسی طرح تباہ کر دو۔ یہ کمائی میری ہے‘ لوٹ کر یہ لے جاتا ہے۔ غریب کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کو تباہ کر دو‘ جنہوں نے ہمارے حقوق مار رکھے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تاک میں ہیں۔ یہ غالب آئے گا‘ اسے ختم کر دے گا۔ وہ غالب آئے گا اسے ختم کر دے گا۔

آپ کے سامنے روس اور امریکہ کا مسئلہ ہے۔ ایک جگہ سرمایہ ہے ایک جگہ مزدوری کا دعویٰ ہے۔ یہ اس کی فکر میں ہے اور وہ اس کی فکر میں ہے دونوں کے ایٹم بم تیار ہیں وہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں‘ یہ کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو میں اسے ختم کر دوں۔

یہ در حقیقت ایک دوسرے کا رد عمل ہے۔ یہ وہی جبر و تعدّی کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے بیچ میں اسلام ہے۔ اسلامی قانون آجائے۔ تو دونوں کی صلح ہو سکتی ہے اور یہ نہیں ہو گا تو دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل ٹھہریں گے۔

اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنایا

تو اسلام اعتدال کامل پر ہے کہ دلواتا بھی ہے اور اتنا دلواتا ہے کہ غریب کا گھر بھروا دیا۔ مگر مساوات اور برابری قائم نہیں کی۔ بلکہ توازن پیدا کیا کہ امیر کو نیچے اُتار دیا کہ اگر تیرے پاس ایک لاکھ ہے تو اپنے دل کے جذبے کے ساتھ غریبوں کو تیس چالیس ہزار دے۔ تو اسے نیچے اُتارا اور غریب کو اونچا کر دیا کہ وہ اس درجے پر نہ رہے کہ وہ یہ سمجھے کہ میری پیدائش ہی اسی لئے ہے کہ میں جوتیاں اٹھایا کروں، تکلیف اٹھایا کروں۔

حدیث میں ہے کہ جو غلام جنگ میں پکڑے ہوئے آتے تھے۔ لوگوں کو ان کو بیچ دینے کا حق تھا، یہ قانون تھا۔ لیکن تعلیم یہ دی کہ **خولکم اخوانکم** یہ غلام تمہارے بھائی ہیں۔ جو تم کھاتے ہو، انہیں کھلاؤ۔ جو تم پہنتے ہو، انہیں پہناؤ۔

حدیث میں فرمایا گیا، اگر کسی شخص کے ہاں باندی آگئی تو باندی کا نام بُرا ہوتا ہے، ایک حقیر لفظ ہے۔ باندی کی اگر اولاد ہو جائے۔ اسے بھی لوگ حقیر سمجھتے ہیں کہ یہ باندی کا بچہ ہے، سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں ہے ___ اسلام نے تعلیم دی کہ جس شخص نے اپنی باندی کو تعلیم دی، تربیت کی، اسے شائستہ اور مہذّب بنایا۔ پھر اس سے نکاح کر لیا تو اس کو دوگنا اجر قیامت کے دن دیا جائے گا۔

مثلاً فرمایا کہ اگر کسی نے غلام کو آزاد کیا، تو اسے اجر ملے گا جیسے کہ بنی اسماعیل میں سے اس نے سو غلام آزاد کر کے خاندانِ نبوّت کو آزاد کر دیا۔ یہ اجر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جہاد میں جتنے غلام آتے تھے۔ اس سے زیادہ وہ آزاد ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اجر کمانے کے لئے لوگ آزاد کرتے تھے، تعلیم دیتے تھے، جو خود کھاتے تھے انہیں کھلاتے، جو خود پہنتے، انہیں پہناتے۔ تو وہ اُن کے عاشق، یہ ان کے عاشق۔ تمدّن بنا ہوا تھا ___ اس درجہ اسلام نے گویا غلاموں کے حق میں تعلیم دی۔

تو باندی کے بارے میں فرمایا کہ جس نے اپنی باندی کو تعلیم دی **فا حسن تعلیمها**۔ اچھی تعلیم دی۔ **وادبها فاحسن تادیبها** اس کو ادب سکھلایا، تہذیب سکھلائی، تربیت دی اور بہت عمدہ تربیت کی اور پھر اسے خود نکاح کر لیا، گویا اس کو برابر بٹھلالیا۔ وہ بے چاری باندی تھی۔ اس کو حُرّہ بنا کر اپنے برابر بٹھلالیا۔ فرماتے ہیں اس کو دوگنا اجر ملے گا اور قیامت کے دن اس کو اجر و ثواب ہے۔ تو ہزاروں لوگوں نے باندیوں کو تعلیمیں دیں، تہذیبیں سکھلائیں۔

اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیسری چوتھی صدی میں جتنے بڑے بڑے علما اور اکابر تھے، وہ سب غلام ہی تھے۔ سب جہاد ہی سے آئے ہوئے تھے۔ ان کو آزاد کیا گیا۔ حضرت حسن بصریؒ غلام ہی تھے۔ آزاد کر کے تعلیم دی گئی، تو مسلمانوں کے امام بن گئے اور صوفیا کے اندر عظیم الشّان شیوخ میں سے ہیں۔ سعید ابن المسیبؒ جہاد سے پکڑے ہوئے غلام بن کے آئے تھے۔ لیکن آزاد کر کے تعلیم دی۔ تو اب بہت بڑے امام ہیں۔ عطاء ابن ابی رباحؒ غلاموں میں سے تھے۔ لیکن بہت بڑے امام بنے۔ غرض اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غلاموں میں اتنے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے کہ ہر ہر فن میں انہوں نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا۔ تو یہ اس تعلیم ہی کا نتیجہ ہے بہر حال اسلام نے امیروں کو غریبوں کے اوپر شفیق بنا دیا ہے اور اس درجہ پر شفیق بنا دیا ہے کہ وہ اپنے سے

زیادہ غریبوں کو مقدم سمجھتے ہیں۔ جو خود فائدہ اٹھاتے ہیں' انہیں بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ جان بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ ہماری روح بھی خدا کی ملک ہے۔ تو اس پر بھی عبادت فرض کی گئی۔ مال خدا کی ملک ہے تو مالی عبادت بھی رکھی گئی۔ آبرو خدا کی بخشی ہوئی ہے تو آبرو کی عبادت رکھی گئی۔ تو اللہ کے سامنے مال' جان اور آبرو کی کوئی پرواہ مت کرو۔ اس لئے کہ ہر چیز اس کی ملک ہے۔ اس لئے اس کے نام پر لٹاؤ۔

اسلام نے خرچ کرنے میں حُدود بتلائی ہیں

ہاں اس کی حدود بتلادیں کہ حد کے اندر خرچ کرو' نہ اسراف کرو اور نہ فضول خرچی کرو کہ آج جذبے میں آکے سب کچھ لٹادیا۔ کل کو بھیک مانگنے کے قابل ہوگئے۔ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں اور نہ اتنا بخل کرو کہ ہاتھ ہی سکیڑ لو۔

وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ (بنی اسرائیل پ۱۵ آیت ۲۹)

"نہ اتنا پھیلاؤ کہ سارا دے ڈالو اور کل کو بھیک مانگو۔ نہ ہاتھ اتنا سکیڑو کہ ہاتھ سے کچھ بھی نہ نکلے"۔

درمیان میں جو اعتدال کا راستہ ہے وہ اسلامی تعلیم ہے کہ دو بھی اور رو کو بھی۔ مگر مصرف کو دیکھ کر کہ یہاں دینا صحیح ہے' یہاں اجر ہے۔ لہٰذا دینے میں دریغ نہ کرو۔ برا مصرف ہے تو دینے میں بخیل بن جاؤ۔ یہاں نہ دینا زیادہ بہتر ہے' یہاں نہ دینا ثواب ہے۔

مثلاً آپ نے تھیٹر اور سینما پر خرچ کردیا ناجائز چیزوں پر۔ تو مال بھی گیا اور اوپر سے گناہ بھی سر پر۔ دنیا بھی ختم ہوئی' آخرت بھی برباد ہوئی۔ اور اگر آپ نے غریبوں' یتیموں' کو دیا۔ تو وہ کہیں نہیں گیا۔ اس لئے کہ غریب کو دیا ، تو وہ آپ کا خادم ہوگیا۔ وہ آپ کے کام آئے گا۔ اس لئے گویا وہ اپنے ہی گھر میں رہا اور اپنے بھائی کو دیا' تو اپنے گھر میں رہا اور آخرت الگ بن گئی۔ اللہ کے کہنے کے مطابق دینے سے دنیا بھی بنتی ہے' آخرت بھی بنتی ہے' اور اللہ سے کٹ کر دینے میں دنیا بھی جاتی ہے اور آخرت بھی جاتی ہے۔ غلط راستے پر خرچ کرنا ظاہریات ہے' یہ غلط ہی ہوگا۔ اس کے نتائج بھی غلط نکلیں گے۔

مالِ حرام غلط مصرف میں ہی جاتا ہے

بلکہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو مال غلط طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ غلط ہی مصَرف میں خرچ بھی ہوتا ہے۔ جو جائز طریق پر کمایا جاتا ہے۔ وہ مقدار میں تھوڑا ہوتا ہے' مگر جائز راستہ پر خرچ ہوتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ محض مال کے مصَرف کو دیکھ کر کہ کہاں خرچ کیا جارہا ہے۔ اس لئے مدخل سے پتہ چلالو کہ یہ آیا کہاں سے ہے۔ جب برے راستہ پر جارہا ہے۔ تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ بُرے ہی راستے سے آیا ہے۔ حرام مصَرف میں جارہا ہے۔ تو سمجھ لیتا ہوں کہ کمانے میں ضرور کوئی ناجائز صورت پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے یہ برے مصَرف میں گیا۔ اگر خالص حلال کی کمائی ہوتی تو بُرے مصرف میں نہ جاتا۔ تو حلال کی کمائی مقدار میں تھوڑی ہوتی ہے۔ مگر بدن کو بھی لگتی ہے۔ روح میں بھی بشاشت پیدا کرتی ہے اور اس سے آخرت بھی بن جاتی ہے۔ اور ناجائز کمائی اگر بہت بھی ہوجائے' تو نہ روح میں تسکین آتی ہے۔

بدن کو لگتی ہے نہ دوسرے کے کام آتی ہے۔ ناجائز طریق پر ہی جاتی ہے۔ اس لئے جائز ہی طریق پر کمایا جائے گا۔ وہی کار آمد ثابت ہوگا۔

لقمۂ حلال قربِ خداوندی کی شرطِ اوّل ہے

اسلام میں لقمۂ حلال اللہ کے قُرب ہونے کی سب سے پہلی شرط ہے۔ حرام لقمے سے کبھی قُرب پیدا نہیں ہوتا۔ توفیق چھن جاتی ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ جائز کمائی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے قلب میں نور ہوتا ہے۔ نیک کام کرنے کو ان کا جی چاہتا ہے۔ ناجائز کمائی کھاکر توفیق چھن جاتی ہے اور سرکشی کرنے اور بُرے کام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بڑا فرق پڑتا ہے۔

ہمارے ہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے۔ شاہ جی عبداللہ صاحبؒ ان کو کہتے تھے۔ بالکل بے پڑھے لکھے تھے، مگر صاحبِ نسبت تھے۔ ذکر و شغل ان کا مشغلہ تھا۔ اللہ والے تھے۔

انہوں نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے معاش کا یہ سلسلہ کر رکھا تھا کہ گھاس کھود کر بیچتے تھے اور گھاس کی گٹھڑی کے چھ پیسے متعیّن تھے۔ نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے اور نہ زیادہ اور لوگوں کا دیوبند میں یہ حال تھا کہ جنہیں جانوروں کے لئے گھاس خریدنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کی ایک قطار کھڑی رہتی تھی۔ اور بھی بہت سے مرد و عورت گھاس بیچنے والے تھے۔ ان کی گٹھڑیاں رکھی ہیں، مگر کوئی نہیں ان سے لیتا تھا۔ ہر ایک کا جذبہ یہ تھا کہ شاہ جی کی گٹھڑی خریدیں گے۔ گھر میں برکت ہو جائے گی۔ اس لئے سب انتظار میں کھڑے رہتے تھے اور جہاں دیکھا کہ شاہ جی گٹھڑی لے کر آئے۔ لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے۔ بس جس نے پہلے ہاتھ لگادیا شاہ جی وہیں گٹھڑی ڈال دیتے تھے کہ بس لے جاؤ۔ اسی کی گٹھڑی ہو جاتی تھی اور چھ پیسے متعیّن تھے۔ سردی ہو، گرمی ہو یا برسات ہو۔ نہ ایک پائی کم نہ زیادہ۔

اس کا مصرف ان کے ہاں یہ تھا کہ دو پیسے اسی وقت صدقہ کردیتے۔ اس زمانے میں پیسوں کے کچھ تانبے کے ٹکڑے آتے تھے۔ جنہیں منصوری پیسہ کہا جاتا تھا۔ ایک پیسے کے بہت سے ٹکڑے آجاتے تھے۔ تو دو پیسوں کے بہت سے ٹکڑے لئے اور وہ ٹکڑے غریبوں میں تقسیم کردئے۔

اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ ایک پیسے میں ادھیلہ کا آٹا اور کچھ تیل وغیرہ لے لیا۔ بہرحال گھر کی ضرورت دو پیسے میں پوری کرتے۔

اور دو پیسے روز جمع کیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب اس کے کچھ چھ سات روپے بن جاتے۔ تو اس رقم سے ہمارے ان بزرگوں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ حضرت حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ ، مولانا رفیع الدینؒ ، مولانا رشید احمد صاحبؒ گنگوہی، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرّس تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ جب کبھی دارالعلوم آتے، ان کی بھی دعوت کرتے۔ سال میں ایک دعوت ہوتی تھی۔

میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ یہ فرماتے تھے کہ سال بھر ہمیں انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دعوت کا وقت آئے اور شاہ جی کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا، جس دن ان کے گھر کا کھانا کھاتے ہیں۔ چالیس دن قلب میں نورانیت رہتی ہے اور جذبہ اٹھتا ہے کہ نماز پڑھو، تلاوت بھی کرو، ذکر اللہ میں مشغول رہو، یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ سال بھر دعوت کا ہمیں انتظار رہتا۔

ایک دفعہ شاہ جیؒ بے چارے بیمار ہوگئے۔ تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے کہلا کے بھیجا کہ میں تو

مریض ہوں' آنہیں سکتا۔ یہ سات آٹھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ میری طرف سے ان بزرگوں کو کھلادیں۔ یہ پیسے جب مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس پہنچے تو غسل کیا' کپڑے بدلے' زمین کو پاک کیا' اس پر بیٹھ کر خود کھانا پکایا اور ان سب بزرگوں کی دعوت کی' تو حلال کے لقمہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دلوں میں نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ عبادت وطاعت کا جذبہ اٹھتا ہے۔

حلال کمائی ہی میں برکت ونورانیت ہے

آج جو ہماری کیفیت چھن گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری کمائیاں مشتبہ ہو گئیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ اللہ کے نیک بندے ہزاروں' لاکھوں ہیں۔ وہ اپنے نزدیک اپنی ہمت صرف کرتے ہیں کہ جائز طریق سے کمائیں' لیکن ہمارے بھائی بہت سے ایسے ہیں کہ انہیں پرواہ نہیں ہے۔ جائز ہو' ناجائز ہو۔ بس پیسہ آنا چاہئے۔ اس میں جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ بہت سے مال کی وجہ سے ایمان کی بھی پرواہ نہیں کرتے' پیسہ آنا چاہئے۔

لیکن انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس پیسے میں برکت نہیں ہوتی۔ اس قسم کی ناجائز کمائی اپنے کو بھی ضرر پہنچاتی ہے اور بعض اوقات پورے خاندان کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ یہ ناجائز کمائی جچتی نہیں ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ :

ما خالطت الزکٰوۃ مالا قط الا اھلکتہ ۔

''جس مال میں زکوٰۃ ملی رہ جاتی ہے' وہ راس المال کو بھی لے ڈوبتی ہے''۔

زکوٰۃ ملے ہوئے رہ جانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زکوٰۃ فرض ہوئی اور نہ دی' وہ راُس المال کسی نہ کسی دن تباہ ہو گا۔ ایک یہ ہے کہ دوسرے نے زکوٰۃ دی کہ غریبوں کو دے دینا' اس نے خود رکھ لی' حالانکہ خود امیر تھا اسے اپنے مال میں ملالیا۔ تو یہ اس راُس المال کو تباہ کر کے رہی گی۔

غرض جس مال میں زکوٰۃ ملی ہوئی رہ جاتی ہے۔ وہ غنی کے مال کو لے ڈوبتی ہے۔ تو وہی پچتا ہے' جو بالکل جائز اور حلال طریقے سے کمایا جائے۔ اس میں برکت بھی ہوتی ہے' دل میں نورانیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اور ویسے مال بڑھ جائے فائدہ نہیں پہنچاتا۔ زکوٰۃ دینے اور نہ دینے کی مثال بالکل ایسی ہے کہ زکوٰۃ اگر نہیں دے گا۔ تو ظاہر میں تو مال بڑھ رہا ہے۔ ایک لاکھ میں سے اڑھائی ہزار روپے دیئے جاتے' جب نہیں دے گا تو ایک لاکھ پورے ہیں۔ اور جو زکوٰۃ دے رہا ہے' بظاہر اس کا مال گھٹ رہا ہے۔ مگر حقیقتاً بڑھ رہا ہے۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص وہ ہے۔ جس نے صحت حاصل کرنے کے لئے مسہل لیا' تو بالکل لاغر اور کمزور ہو گیا۔ مگر وہ کمزوری صحت کی علامت ہے کہ مادہ فاسد نکل گیا۔ چار دن کے بعد قوت آئے گی اور صحت مند و توانا ہو جائے گا۔ یہاں بظاہر بدن گھٹ گیا۔ مگر حقیقتاً بڑھ گیا۔ کیونکہ چار دن کے بعد صحت عیاں ہونے والی ہے اور اگر خرچ نہ کیا اور مال رہ گیا۔ یہ ایسا ہے جیسے بدن میں رول پڑ گئی۔ تو دیکھنے میں تو پہلوان معلوم ہو رہا ہے۔ مگر صحت ساری برباد ہو رہی ہے۔ چند دن کے بعد یہ صحت ساری ختم ہو جائے گی۔ جو دے کر مال گھٹتا ہے' یہ ایسا ہے جیسے مسہل سے بدن گھٹتا ہے' وہ صحت کے لئے مفید ہوتا ہے اور نہ دینے سے جو مال بڑھا ہوا نظر آتا ہے وہ ایسا ہے جیسے رول چڑھ گیا کہ دیکھنے میں آدمی بہت موٹا نظر آتا ہے اور حقیقت میں اندر سے جان نکل رہی ہے۔ تو یہ ظاہری توانائی اور ظاہری زیادتی قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔ اصلیت جس سے بدن میں توانائی اور نور پیدا ہوتا ہے وہ حلال اور جائز کمائی سے ہوتی ہے۔

بہر حال اسلام نے جہاں مال کے خرچ کرنے کا طریقہ بتلایا۔ اس کی درآمد کا طریقہ بھی بتلایا کہ اس طرح سے کماؤ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور ملازمت وغیرہ اور ایسے پیشوں سے روک دیا ہے۔ جو مخلوق کے لئے ضرر پہنچانے والے ہوں۔ چوری، ڈکیتی سے روک دیا، سود سٹے سے روکا، جوئے سے روکا، قمار بازی سے روکا، کہ ان میں ظاہر میں بڑھتا ہے، حقیقت میں گھٹتا ہے۔ عموماً دیکھا ہے کہ سودی لین دین کرنے والوں کا ابتداً میں مال بڑھ جاتا ہے لیکن جب دیوالیہ ہوتے ہیں، تو ایسے ہوتے ہیں کہ بھک منگے بن جاتے ہیں۔ ہزاروں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ کسی کا ہارٹ فیل ہو گیا، کوئی گر پڑا ___ تو اس قسم کا مال بچنے کے بجائے اور زیادہ وبال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اوّل تو یہ ہے کہ اس قسم کی ناجائز کمائی ظاہر میں تو آدمی خود کھاتا ہے اور جب دیوالیہ ہوتے ہیں تو فقیر کو تھوڑا دینا پڑتا ہے، بادشاہ اور افسران کو زیادہ دینا پڑتا ہے۔ بس رات دن ہزاروں روپے اسی میں لگا رہے ہیں۔ کچھ کسی نے چوری کر لیا تھا، کسی نے ڈکیتی کر لی اور گورنمنٹ نے ٹیکس بھی لگا دیئے اور اب پریشان ہو رہا ہے کہ اتنی مشکل سے کمایا۔

لیکن اگر اعتدال کے ساتھ کمائے اور اعتدال کے ساتھ خرچ بھی کرے۔ اس کا یہ بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ اسلام نے کمانے اور خرچ کرنے کا بھی ڈھنگ بتلایا۔ دونوں میں اعتدال پیدا کیا ___ اور قانونی طور پر جبر نہیں کیا۔ جبر کیا بھی تو بہت معمولی کہ دینا آسان ہو۔ اخلاقی طور پر زیادہ زور دیا ہے۔ لاکھوں نظیریں موجود ہیں کہ قانونی طور پر زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ دیتے ہیں اور اس کے بعد بھی دینا اور دے کر خوش ہونا، مہمانداری وغیرہ، یہ مسلم کا گویا ایک پیشہ اور شعار ہے۔

اِنفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب کے لئے قرآن کا طرزِ اُسلوب

اس طرح سے اسلام نے مالی عبادت بھی سکھلائی اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا تو کیسے پیارے انداز میں حکم دیا کہ واقعی دینے کو جی چاہے۔ فرمایا :

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ

”خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے“۔

یعنی تم کہاں سے لے کر آئے ہو، مال تو ہمارا دیا ہوا ہے۔ پھر اس میں سے خرچ کرتے ہوئے تمہیں کیوں دکھ ہوتا ہے، کیوں تمہارا جی گھبراتا ہے۔ اگر یوں فرماتے کہ اپنی کمائی دے ڈالو۔ تو آدمی کو ذرا دکھ ہوتا کہ بھئی! کماؤں میں اور دوسرے کو دے ڈالوں۔ اس لئے عنوان یہ اختیار کیا کہ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ جو ہم نے دیا تھا، اس میں سے دو۔ آدمی سمجھے گا کہ میرا تو ہے ہی نہیں، ان کا ہے۔ وہ مانگ رہے ہیں، میں دے دوں۔

یہ ایسا ہے جیسے آپ کا ایک بچہ ہو اور اسے آپ دو روپے دیں۔ اس کے بعد کہیں کہ بیٹا دو پیسے ہمیں بھی دے دے۔ ظاہر بات ہے کہ بچہ جو دے گا۔ وہ خود کما کے تھوڑا ہی لایا ہے، وہ تو باپ نے اس کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ اسے دینا کچھ مشکل نہیں ہو گا۔ وہ یہ سمجھے گا۔ کہ باپ ہے اور پھر مجھ سے مانگ رہا ہے۔ اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔ تو دینے والے حق تعالیٰ خود ہیں۔ پھر کہتے ہیں بھئی! جو ہم نے تجھے دیا تھا۔ اس میں سے ہمیں بھی کچھ دے دے۔ تو دینے والے کو بھاری نہیں گزرے گا کہ دینے والے اور مالک بھی خود ہیں، وہ مانگ رہے ہیں۔

پھر یہ مانگنے کے بعد جو تم نے دے دیا۔ پھر یہ نہیں کہ تمہارا تعلق اس سے ختم ہوا۔ نہیں، فرماتے ہیں :

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (بقرہ پ۲ آیت ۲۴۵)

''کوئی ہے جو اللہ میاں کو قرض دے''۔

دنیا میں تو قرض کے اوپر سود حرام قرار دے دیا کہ جتنا قرض لو' اتنا ہی دو۔ قرض دینے والا اوپر سے زیادتی لے' وہ سود ہے' ناجائز ہے اور خود سود دیتے ہیں۔ بلکہ سُود دَر سُود کہ اگر کسی نے دس روپے ہماری راہ میں دیئے تو تمہیں دس کے ستّر دیں گے۔ یہاں قرض کے اوپر سُود دے رہے ہیں۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانوں میں سود اس لئے حرام قرار دیا کہ کمائی محدود ہے' تھوڑی سی کمائی ہے۔ اس کے اوپر ہم نے دس روپے قرض پر پانچ اور بڑھا دئے تو دینے والے پر بڑا گراں گزرتا ہے کہ اس کی دولت محدود تھی۔ جب ظلم کے طور پر اس سے پانچ اور لیں گے تو کیسے دے گا؟

اور اللہ میاں کی دولت لامحدود ہے۔ اس کے خزانے میں کبھی کمی نہیں آسکتی۔ تو اپنے حق میں سود کا سلسلہ جائز رکھا' انسانوں کے حق میں ناجائز رکھا اور فرمایا :

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ (بقرہ آیت ۲۶۱ پ۳)

حق تعالیٰ فرماتے ہیں' جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے' جیسے گیہوں کا ایک دانہ زمین میں ڈال دیا جائے' گیہوں کا درخت اگا۔ تو سات بالیاں اس میں سے نکلیں اور ہر بالی کے سو دانے تو ایک دانہ ڈالا تھا اور سات سو دانے نکل آئے۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ آپ نے اللہ کو ایک دانہ قرض دیا اور سات سو دانے وصول کئے۔ تو سات سو گناہ کون سود دیتا ہے۔ یہ تو اللہ میاں ہی دیں گے۔

اور آگے یہ بھی فرمایا کہ سات سو پر بس نہیں۔ اللہ اگر بڑھانا چاہیں۔ تو کون روکنے والا ہے۔ وہ لاکھوں گنا سود دے دے' جب بھی اس کے ہاں کمی نہیں ہے۔

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص چھوہارے کی ایک گٹھلی صدقہ کرتا ہے۔ تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اسے پالتے ہیں اور ایسے پالتے ہیں' جیسے تمہارے ہاں گھوڑے کا کوئی بچہ ہو تو تم اسے دودھ پلا کر پال لو۔ چند دن کے بعد ہی وہی گھوڑی بن جائے اور سواری کے قابل بن جائے۔ فرمایا' جو ایک گٹھلی بھی صدقہ دیتا ہے ہم اسے پال کر جبل اُحد کے برابر کر دیتے ہیں۔ آخرت میں جب یہ اَجر کے ڈھیر سامنے آئیں گے۔ تو بندہ حیران ہو گا کہ میں نے کون سا ایسا صدقہ کیا تھا۔ جس کے بدلے میں یہ پہاڑ جیسا اجر سامنے ہے۔ فرمائیں گے' تو نے گٹھلی صدقہ کی تھی۔ لیکن ہم نے تیرے خُلوص کے وجہ سے اس کو پال کر پہاڑ کے برابر کر دیا ____ اندازہ کیجئے ایک پہاڑ میں سے چھوہارے کی کتنی گٹھلیاں نکل سکتی ہیں۔ ایک گٹھلی اس نے صدقہ کی اور اربوں کھربوں گٹھلیوں کے برابر اس نے اَجر لے لیا۔ تو اللہ کے ہاں نہ سود سے کمی' نہ سود در سود سے کمی۔ ''دہ در دنیا ستر در آخرت'' کا مقولہ مشہور ہے کہ دنیا میں دس دے دو' آخرت میں ستّر مل جائیں گے۔

ایمان اور سکونِ قلب دنیا کی کروڑوں سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں

اور آخرت تو آخرت دنیا میں بھی مل جاتا ہے' اللہ کی راہ میں دینے والا کبھی محروم نہیں ہوتا ____ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیں کہ اس نے دیا۔ مگر اس کے بدل میں کچھ نہ ملا۔ مگر جو قلب میں ایمان اور سکون کی دولت ہوتی ہے۔ وہ کروڑوں سلطنتوں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ جو اس پر عطا کی جاتی ہے۔

ایک بزرگ جا رہے تھے بزرگوں کا یہی حال ہوتا ہے کہ لباس کی کچھ زیادہ خبر نہیں ہوتی۔ بس جیسا مل گیا'

پہن لیا۔ کبھی شاہانہ لباس، کبھی پھٹے پرانے کپڑے وہ بزرگ پھٹے پرانے کپڑوں سے چلے جارہے تھے ایک شہر سامنے آیا تو سارے شہر کے دروازے بند۔ اب ہزاروں گاڑیاں اندر جانے والی، وہ باہر رُکی ہوئیں، اور اندر کی اندر۔ تجارت و کاروبار بھی سب بند۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ بھئی! یہ دروازے کیوں بند ہوگئے۔

لوگوں نے کہا کہ اس شہر کا جو بادشاہ ہے اس کا باز کھوگیا ___ باز ایک پرندہ ہوتا ہے۔ جس سے چڑیوں کا شکار کرتے ہیں۔ وہ کھوگیا ہے۔ تو بادشاہ نے کہا، چونکہ باز کھوگیا۔ شہر کے دروازے بند کردو اور اسے کہیں سے پکڑ کے لاؤ۔

انہوں نے کہا، کیسا احمق بادشاہ ہے بھئی! پرندے کو اس سے کیا کہ دروازے بند کئے ہیں۔ وہ اُڑ کے باہر نہیں چلا جائے گا۔ اسے دروازے کی کیا ضرورت ہے ایسا احمق آدمی ہے۔ پرندے کو اگر پکڑنا تھا۔ تو شہر پر جال لگوادیتا کہ اوپر سے اُڑ کے نہ نکلے۔ دروازے بند کرانے کی کون سی تک ہے اور اس بزرگ نے کہا۔

یا اللہ! یہ آپ کی عجیب قدرت ہے کہ اس کندۂ ناتراش کو تو بادشاہ بنادیا جس کو یہ بھی تمیز نہیں کہ باز کو روکنے کے لئے جال ڈالنا چاہئے یا شہر کے دروازے بند کرانے چاہئیں اور مجھ جیسے فاضل، عالم کو بھک منگا بنار رکھا ہے کہ جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں، کوئی پوچھتا نہیں۔ عجیب آپ کی قدرت ہے اور آپ کا نظام کہ اس احمق کو سلطنت دے دی اور مجھے جوتیاں چٹخانے کے لئے چھوڑ دیا۔

اس بزرگ کے دل میں یہ وسوسہ گذرا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا کہ کیا تم اس کے لئے تیار ہو کہ تمہارے دل کی، ایمان کی دولت اس بادشاہ کو دے دیں اور اس کی سلطنت تمہیں دے دیں۔

تھرا گئے، عرض کیا۔ نہیں، یا اللہ! میں ایمان نہیں دینا چاہتا۔

فرمایا اتنی بڑی دولت دے دی۔ پھر بھی بے وقوف اپنے کو بھک منگا سمجھ رہا ہے، یہ دولت ظاہری جس کے پاس ہے وہ کل کو ختم ہوگی، جس کے پاس ایمان ہے وہ وہ دولت ہے جو ابد الاباد تک چلنے والی ہے۔ تو تجھے ابدی دولت دی اور اسے عارضی دولت دی، تو نے اس کی قدر نہ کی۔

پھر توبہ کی اور کہا کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر۔ واقعی تو نے مجھے دولت مند بنادیا۔ جس کے پاس ایمان کی دولت ہے۔ اس سے بڑھ کر کون دولتمند ہے۔ یہ دولت آگے تک جانے والی ہے۔ مسلمانوں کو اگر مادی دولت ملے تو شکر ادا کرنا چاہئے کہ ایمان کی دولت الگ دی اور دنیا کی دولت بھی دی۔

مسلم کو دنیا بطورِ حق نہیں بلکہ خدمات کے صلہ میں ملتی ہے

میں تو کہا کرتا ہوں، دنیا میں جتنی دولت ہے۔ مسلمان اس کا قطعاً حقدار نہیں ہے۔ یہ کفار کا حق ہے۔ اس لئے کہ ان کی آخرت نہیں ہے۔ انہیں دنیا میں ہی سب کچھ دیا جاتا ہے اور یہ کتنی زیادتی کی بات ہے کہ ایک مسلم یوں کہے کہ آخرت بھی مجھے ملے، دنیا بھی مجھے ملے اور کافر غریب کو کچھ بھی نہ ملے۔ دوسرے کے حق کو ساقط کردینا، اسے محروم کردینا، یہ کونسی دانش مندی کی بات ہے؟ مسلمانوں کو جو دولت ملتی ہے۔ وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے۔ جہاد کرے گا، حکومت مل جائے گی۔ جدّوجہد کرے گا، دولت مل جائے گی۔ غرض مسلمانوں کو دولت اور دنیا جو ملتی ہے وہ خدمات کے صلے میں ملتی ہے۔ اس کا حق نہیں ہے۔ کافر کو خدمت کے صلے میں نہیں ملتی ہے۔ اس کا حق ہے۔ اس لئے کہ آگے اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ تو یہ بڑی بے انصافی کی بات ہے کہ آپ یوں چاہیں کہ اس دنیا کی دولت بھی میرے ہی پاس آجائے۔

پھر بھی یہ اللہ کا فضل ہے کہ اگر خدمت کرتا ہے تو مسلم کو دولت دنیا بھی دیتے ہیں۔ مگر وہ مقصودِ اصلی

نہیں ہوتی، مقصودِ اصلی آخرت ہی ہوتی ہے۔ یہ دولت بھی اس کے لئے وسیلہ بنتی ہے۔

حدیث میں ایک واقعہ فرمایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایلا کے موقع پر جب آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ نے نان ونفقہ طلب کیا اور گھیرا ڈال کی بیٹھیں کہ ہمیں بھی تو کچھ دینا چاہئے۔ آپؐ کو رنج ہوا۔ آپؐ کنارہ کشی کر کے اوپر ایک حجرہ تھا اس میں بیٹھ گئے اور بول چال بند کر دی۔ چہرۂ مبارک پر بشاشت نہیں رہی کہ میرے گھر والے مجھ سے دولت طلب کریں۔ آپؐ اوپر بیٹھ گئے۔

تمام صحابہؓ پریشان تھے۔ فاروق اعظمؓ نے اوپر آنے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے اجازت دی۔ اوپر ایک چھوٹا سا خلیہ تھا۔ اس میں آپؐ اس حالت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ کل سامان اس گھر میں یہ تھا کہ ایک چٹائی جس پر آپؐ لیٹے ہوئے تھے اور ایک چمڑے کا چھوٹا سا برتن۔ جس میں تھوڑا سا شہد تھا۔ یہ کل سامان تھا۔ آپؐ لیٹے ہوئے تھے۔ فاروق اعظمؓ کے آنے پر اٹھ بیٹھے تو کمر مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ___ فاروق اعظمؓ رو پڑے اور کہا کہ :

یا رسول اللہ! قیصرو کسریٰ جو بادشاہ ہیں۔ یہ بڑے بڑے تخت، نرم بستروں اور محلات میں آرام کریں۔ آپؐ اللہ کے رسول اور اس حالت میں کہ بدن مبارک کے اوپر چٹائی کے نشان اتر آئے ہیں۔ کوئی چیز بچھانے کی میسّر نہیں تھی۔

فاروق اعظمؓ کے آنکھوں میں آنسو آگئے۔

آپ نے فرمایا :

اوفی ھذا انت یاابن الخطاب؟

”اے ابن خطاب! کیا تو ابھی تک حیرت میں پڑا ہوا ہے؟“

اولئک قوم عجلت لھم طیباتھم فی الحیٰوۃ الدنیا -

تو نے قیصرو کسریٰ کا نام لیا۔ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور تیرے اندر علم وایمان اور دین کی دولت ہے۔ پھر بھی تجھے حرص پیش آئی اور اس قوم کی جس کے لئے انجام میں کچھ نہیں ہے۔

گویا آپؐ نے سمجھایا۔ یہ مت کرو۔ یہ حرص ہے ٹھیک نہیں۔ شکر کی چیز یہ ہے کہ دولت ایمان عطا کر دی۔ جس کے پاس ایمان ہے، وہ کبھی مفلس نہیں ہو سکتا۔ اللہ دولت دنیا دے تو شکر کا مقام ہے اور نہ دے تو تب بھی دولت مند ہے۔ اس لئے کہ بڑی دولت میسّر ہے۔

بندے اور خدا میں صرف غلامی کی نسبت ہے

اس لئے چونکہ جان بھی اللہ کی دی ہوئی ہے، روح بھی اللہ کی دی ہوئی ہے مال بھی اللہ کا دیا ہوا ہے اور یہ چیزیں نہ صرف دی ہوئیں بلکہ اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ تو وہی مالک بھی ہے جو پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے یہ چیزیں اسی کے کہے کے مطابق لٹائی جائیں گی اور خرچ کی جائیں گی۔ کیونکہ مالک وہ ہے۔ اگر وہ یوں کہے کہ سب مال لٹا دو، لٹا دینا چاہئے۔ اگر وہ یوں کہے کہ بخیل بن جاؤ، بخیل بن جانا چاہئے۔ اگر یوں کہے کہ جان دے دو، دے دینی چاہئے۔ وہ کہے ہرگز مت دو، روک لینی چاہئے۔

اصل میں عبادت اسی کا نام ہے کہ اطاعتِ محض کی جائے۔ جو حکم ہو اس کی تعمیل کر دی جائے۔ یہی عبادت ہے۔

ظاہر میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، اور حج کا نام عبادت ہے۔ یہ عبادت نہیں ہے۔ یہ

جزئیات ہیں، عبادت کی مثالیں ہیں۔ عبادت کہنا ماننے اور زندگی کے ہر گوشے میں اطاعت کرنے کا نام عبادت ہے۔ اگر وہ کہیں کہ نماز پڑھو، تو نماز پڑھنا عبادت ہے اور اگر یوں کہیں کہ بالکل مت پڑھو۔ تو چھوڑنا عبادت ہوگا۔ اگر پڑھے گا تو گنہگار ہوگا۔ پانچ وقت مؤذن اعلان کرتا ہے کہ نماز پڑھو۔ نماز پڑھنا عبادت ہے۔ پانچ وقتوں میں نماز فرض ہے۔ نماز ادا کی جائے گی اور تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ جب آفتاب طلوع وغروب ہو رہا ہو یا سر کے اوپر آگیا ہو، ان تین وقتوں میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ اگر پڑھے گا تو قبول نہیں ہوگی۔ معلوم ہوا نماز کا پڑھنا عبادت ہے، نہ چھوڑنا عبادت ہے۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب ہم کہیں پڑھو، جب ہم کہیں رُک جاؤ، یہی بندہ کا کام ہے۔

رمضان شریف میں روزہ رکھنا فرض ہے۔ اگر نہیں رکھو گے تو گنہگار ہوگے اور عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے۔ اگر رکھو گے تو گنہگار ہوگے۔ معلوم ہوا روزہ رکھنا نہ رکھنا عبادت نہیں۔ کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب ہم کہیں کہ مت رکھو، پھر چھوڑ دینا عبادت ہے۔

خود کشی حرام ہے۔ کسی کو حق نہیں ہے کہ اپنی جان کو خود ختم کرلے۔ لیکن اگر وہ حکم دیں کہ میدانِ جہاد میں جاکے خود بھی شہید ہو جاؤ۔ اب یہی عبادت ہے معلوم ہوا نہ جان رکھنا عبادت، نہ گنوانا عبادت، کہنا ماننا عبادت ہے۔ جب کہیں کہ دے دو، تو عبادت اور جب کہیں کہ ہرگز مت دو تو روک لینا عبادت ہے۔

یہی صورت مال کی بھی ہے۔ اگر یوں کہیں کہ ہرگز مت خرچ کرو۔ یہ مصرف بہت بُرا ہے۔ تو روک لینا اور بخیل بننا ہی عبادت ہے اور اگر یوں کہیں کہ خرچ کرو، تو خرچ کرنا عبادت ہے۔

مطلب یہ کہ بندہ جان، مال، آبرو، طاقت وقوت سب کے لحاظ سے بندہ ہے اور بندے کو یہ معلوم ہے کہ جو مالک کو حق ہوگا، غلام وہی انجام دے گا غلام اپنی تجویز سے کچھ نہیں کرے گا۔

کسی غلام سے کسی نے پوچھا تھا تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا جو آقا کھلادے۔ کیا پہنے گا؟ جو آقا پہنادے۔ کام کیا کرے گا؟ جو آقا کام لے لے۔ اس نے کہا تیری بھی کوئی مرضی ہے؟ اس نے کہا، اگر میری اپنی مرضی ہوتی۔ تو غلام ہی کیوں بنتا؟ آقا کیوں نہ بن جاتا۔ میرے غلام ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ میری مرضی، میرا ارادہ، میری خواہش بھی غلام۔ یہی غلام ہونے کے معنیٰ ہیں۔ اگر یہ چیزیں میری اپنی ہوتیں، تو میں آقا ہوتا، غلام کیوں ہوتا؟ تو ایک انسان انسان کا غلام بن جائے، جس نے نہ اسے پیدا کیا، نہ روزی دی۔ محض ایک نسبت پیدا ہوگئی کہ خرید لیا اور غلام بن گیا۔ اس کی یہ کیفیت کہ آقا کے مقابلے میں نہ مرضی نہ ارادہ نہ خواہش۔ کچھ بھی تو نہیں۔

اور اللہ رب العزت جس نے پیدا کیا، جان دی، روح دی، ہر چیز کا مالک اس کے سامنے بندگی کا دعویٰ کرے اور بندگی کے خلاف بھی کرے؟ وہاں تو یہ ہونا چاہئے کہ ہماری مرضی بھی اللہ کی غلام ہے۔ ہماری خواہش بھی اللہ کی غلام ہے۔ وہاں آکر آدمی بنتا ہے، یہاں آقائی میں آتا ہے۔ شریعت کا حکم آئے تو اس میں رائے زنی کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا چاہئے۔ گویا اللہ میاں معاذ اللہ تابع ہیں اور یہ ان کے متبوع ہیں۔ خدا اور رسول کو اپنی مرضی پر چلانا، اس سے زیادہ گستاخی کی کیا بات ہوگی۔ بندہ اس لئے آیا تھا کہ اللہ و رسول کی مرضی پر چلے نہ یہ کہ اپنی مرضی پر انہیں چلانے کی کوشش کرے۔ تو دین میں لوگ ترمیمیں پیش کیا کرتے ہیں کہ صاحب! یوں نہیں، یوں ہونا چاہئے۔ گویا آپ پارلیمنٹ ہیں اور شریعت آپ کے مشورہ سے بن رہی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں کو جب دین اتارنا تھا، تو ہمیں بلا لیتے۔ ہم سے مشورہ لے لیتے کہ یہ حکم کیسے اتاروں؟ ___ یہ کتنی بڑی گستاخی کی بات ہے بندے اور خدا میں نسبت صرف غلامی کی ہے کہ بندہ غلام ہے

اور وہ آقا ہیں۔ اس کی مرضی بھی غلام اور خواہش بھی غلام۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو فرمایا :

اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۔ (بقرہ پ۱ آیت ۱۳۱)

”اے ابراہیم مسلم بنو“۔

یہ مطلب نہیں تھا کہ معاذاللہ اب تک آپ مسلمان نہیں تھے۔ اب مسلمان ہو جاؤ۔ اسلام کے معنیٰ گردن نہاد ہونے کے ہیں۔ اپنے آپ کو سونپ دینے کے ہیں۔ یعنی اے ابراہیمؑ! اپنے کو ہمارے حوالے کردو۔ جو چاہیں ہم تمہارے اندر تصرّف کریں اور تمہیں بولنے کی مجال نہ ہو۔ جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں بے اختیار ہوتا ہے، جدھر کو چاہے کروٹ دے دے۔ مردہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے ادھر کیوں کروٹ دی۔ اسی طرح شریعت کے ہاتھ میں آدمی مثلِ مردہ کے ہو جائے کہ شریعت جدھر بھی تصرّف کرے، بلا چوں وچرا آدمی عمل کرے۔

ایک آدمی گورنمنٹ کا ملازم ہو جاتا ہے۔ تو جب سرکاری آرڈر ہوتا ہے پھر چوں وچرا کی گنجائش نہیں دیتا۔ کوئی چوں وچرا کرے تو لڑنے کو تیار کہ سرکاری آرڈر ایسے ہی ہوتا ہے ___ اللہ میاں کا آرڈر آئے تو وہاں رائے زنی کرنے کو تیار کہ یہ آرڈر اور حکم کیوں آیا؟ ایسا کیوں نہ ہو گیا اور ویسا کیوں نہ ہو گیا۔ یہ غلط کاروائی ہے۔

بہرحال جان ہو، مال ہو، آبرو ہو۔ یہ سب مخلوق ہیں اور مخلوق کا کام یہ ہے کہ خالق کے آگے جھکے۔ اس جھکنے ہی کا نام طاعت وعبادت ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝ (ذاریات پ۲۷ آیت ۵۶)

”ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے“۔

یعنی بندہ دنیا میں خدائی کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ بندگی کرنے کے لئے آیا ہے۔ خدائی کے لئے خدا کی ذات کافی ہے۔ تمہیں تو بندہ بننے کے لئے بھیجا گیا ہے اور بندگی کے یہی معنیٰ ہیں کہ بے چوں وچرا اطاعت کرو۔

ہمارے ضلع سہارن پور کے قریب پنجاب کا ایک ضلع انبالہ ہے۔ اس میں عبداللہ پور ایک گاؤں ہے ___ سائیں توکّل شاہ صاحبؒ ایک بہت بڑے عارف باللہ اور شیخِ کامل تھے، صاحب نسبت بزرگ تھے۔ وہاں وہ رہتے تھے۔ جمنا کے کنارے یہ گاؤں آباد تھا۔

ایک دفعہ برسات میں جمنا میں پانی چڑھا اور اتنا چڑھا کہ گاؤں کی جو چہار دیواری تھی اس تک آدھا پانی آ گیا۔ اگر گز بھر اور بڑھ جائے۔ تو پورا گاؤں غرق ہو جائے ___ وہاں ایک بزرگ شاہ دولہ صاحبؒ تھے۔ یہ سائیں توکّل شاہ صاحبؒ کے مریدوں میں سے تھے۔

لوگوں نے جب دیکھا کہ پانی بہت چڑھ گیا اور دیوار اگر ٹوٹ گئی، تو پھر گاؤں کی خیر نہیں ہے۔ تو سارے گاؤں والے جمع ہو کے شاہ دولہؒ کے پاس آئے اور کہا کہ حضور دعا کیجئے، جمنا کا پانی چڑھ رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ گاؤں ڈوب جائے۔ یہ ذرا دیوار کھڑی ہے۔ اس سے پانی رک رہا ہے۔

فرمایا، اچھا پانی بڑھ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا ”جی ہاں“

فرمایا، پھر پھاوڑا اٹھا کے چلو۔

پھاوڑا لایا گیا۔ تو شاہ دولہؒ نے پھاوڑا لیا۔ اب شاہ دولہؒ آگے آگے، پیچھے پیچھے سارا گاؤں۔

وہ جو دیوار کھڑی تھی۔ جس سے پانی رُک رہا تھا۔ شاہ دولہ" نے اس دیوار کو توڑنا شروع کر دیا۔ اب وہ ٹوٹ رہی ہے اور پانی اندر آنا شروع ہوا۔ لوگوں نے کہا، حضرت یہ کیا کر رہے ہو؟ اس دیوار کی بدولت تو گاؤں بچ رہا ہے۔ دیوار توڑ دیں گے تو پانی نہیں آجائے گا؟

فرمایا۔ "جدھر مولا ادھر شاہ دولہ"

نامعقولو! تم مجھے اس لئے لائے تھے کہ میں اللہ سے مقابلہ کروں۔ وہ چاہیں کہ بستی غرق ہو، تو میں بھی چاہتا ہوں کہ بستی غرق ہو۔ میں اللہ سے مقابلے کے لئے نہیں آیا۔ میں اطاعت کے لئے آیا ہوں۔ ان کا منشاء یہ ہے کہ یہ بستی غرق ہو، تو میرا منشاء بھی یہی ہے کہ اس بستی کو غرق ہونا چاہئے۔

کسی بزرگ سے کسی نے کہا تھا۔ کہ آپ کا کیا حال ہے؟

انہوں نے کہا، اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو۔ جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا آپ اس درجہ کے ہیں۔ فرمایا، الحمد للہ میں اسی درجہ کا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے! فرمایا یہ اس طرح سے ہے کہ دونوں جہانوں کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں۔

اور میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا۔ جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو جو بھی عالم میں ہوتا ہے، وہ میری مرضی کے خلاف ہی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی پیدا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں الحمد للہ پیدا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اگر کوئی مرتا ہے، میں کہتا ہوں الحمد للہ اسے مرنا ہی چاہئے تھا۔ میں کون ہوں۔ جو اللہ کا مقابلہ کروں کہ وہ موت دے، میں کہوں نہیں۔ موت نہیں آنی چاہئے ___ انسان بندگی کے لئے آیا ہے اور بندگی کے معنیٰ اطاعت کے ہیں کہ جو ان کی مرضی وہ میری مرضی ع

مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ

تو بندہ وہ ہے کہ اپنی مرضی کو، مال، جان اور روح کو فنا کر دے۔ اس کو فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

اس میں میں نے جان کی تفصیلات کو چھوڑ کر مالیات کو بیان کیا۔

اس لئے کہ جب اللہ نے دولتیں دی ہیں۔ تو دولت کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ جہاں دولت کے حقوق پہچانے جائیں۔ وہاں غرباء کے حقوق بھی پہچاننے کی ضرورت ہے۔ غریب بھی آپ کے اور ہمارے ہی بھائی ہیں۔ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔ بہت سے مسلمان غریب ہیں۔ سب کی یکساں حالت نہیں ہے۔ ان کی طرف توجہ دیں۔

اجتماعی طور پر غرباء کی خدمت کی ضرورت ہے

ایک تو یہ ہے کہ شخصی طور پر آپ نے دے دیا۔ بے شک عبادت انجام دی۔ جس غریب کو بھی دیں گے۔ آپ نے عبادت ادا کی۔ زکوٰۃ دیں، صدقات دیں، وہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر دیں۔ مثلاً آپ فنڈز بنائیں۔ جس میں لاکھ دو لاکھ روپیہ جمع ہو۔ بہت سے پس ماندہ غریب ہوتے ہیں کہ ان کے قرض لینے کا سامان ہو جاتا ہے، بہت سے بھک منگے ہوتے ہیں، کھانے پینے کو نہیں۔ انہیں قرض دے کر تجارت کرائی جائے۔ کوئی کاروبار لگا دیا جائے کہ بھئی! تم پانچ برس میں ہمارا قرض ادا کر دینا۔ مگر اب اپنا کام چلاؤ۔

ہندوستان میں بہت سی ایسی بستیاں ہیں کہ انہوں نے فنڈز جمع کئے اور ان سے غریبوں کو قرضہ دیتے ہیں ___ پہلے یہ صورت تھی کہ لوگ ساہوکاروں سے قرضہ لیتے تھے۔ تو مسلمانوں کی لاکھوں کی جائدادیں تباہ ہو

گئیں۔ وہ ساری سود ہی میں نکل جاتی تھیں۔ اس لئے مسلمانوں میں جو دولت مند تھے انہوں نے فنڈز قائم کئے اور اس میں بلاسود کا قرضہ دیا۔ اس میں کچھ ضمانتیں یا لکھت پڑہت بھی ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سینکڑوں آدمی کام سے لگ گئے۔ جو پریشان حال تھے۔ ان کی پریشانی رفع ہوگئی۔ تو شخصی طور پر زکوۃ دی جائے بے شک ضروری ہے۔ فرض وعبادت ہے ثواب واجر بھی ملے گا۔ لیکن اگر اجتماعی طور پر فنڈز مقرر کئے جائیں کہ ہم اپنے غریب بھائی کو غریب نہیں رہنے دیں گے۔ جتنا ہم سے بن پڑے گا ___ اس میں تعلیم کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے' پیسہ کا بھی بندوبست ہو سکتا ہے' غریبوں کی خبر گیری بھی ہو سکتی ہے۔ ایک کا کام ایک ہی کا ہوتا ہے۔ جماعت کا کام جماعت ہی کا ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر خدمت کی جائے تو قوم کی زیادہ خدمت ہو سکتی ہے۔ تعلیم وتربیت اور معاشرت ومعاش کے سلسلہ میں خدمت کے بہت بہتر نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں ___ غریبوں کے حقوق بھی امیروں کے اوپر عائد ہوتے ہیں۔ یہ غریب بھی اپنے بھائی ہیں۔ کوئی الگ نہیں ہیں۔ جیسا کہ دولت مند بھائی ہیں۔ یہ بھی ہیں۔ تو دولت مندوں کا یہ بھی فرض ہے کہ زکوۃ' صدقات اور ﷲ فی اللہ سے اپنے بھائیوں کی خبر گیری کریں۔ شخصی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی ___ یہ بھی ایک مستقل عبادت اور طاعت ہوگی اور اس کا اجر جماعتی طور پر ہوگا۔ اس سے قوم کی ترقی ہوگی' بہبود وفلاح بھی ہوگی ___ اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

"ہم نے جنّوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے"۔

کہ وہ بندگی کریں۔

مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ

"ہم نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ ہم تم سے روزی چاہیں"۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ۔

"روزی کا ذمّہ ہم لیتے ہیں۔ تم مت گھبراؤ"۔

تو ایک کام ہمارے سپرد کیا اور ایک اپنے ذمّہ لیا۔ اپنے ذمّہ روزی دینا لیا۔ آپ کے ذمّہ طاعت وعبادت کرنا ہے۔ جتنا آپ طاعت وعبادت کریں گے' ادھر سے روزی آئے گی اور روزی کے معنی فقط روٹی کے نہیں ہیں۔ رزق' روٹی' عزّت' آبرو' اِقتدار سب چیزیں اس میں داخل ہیں۔ تو ہم روزی دیں گے' تم طاعت وعبادت کرو۔

اب مسلمانوں نے جو اپنے ذمّے لیا تھا۔ اسے ترک کردیا اور جو اللہ نے اپنے ذمّہ لیا تھا۔ اس کا مطالبہ قائم ہے۔ اگر روزی میں کمی ہوئی۔ تو بس اللہ میاں کی شکایت شروع ہوگئی کہ صاحب! بس روزی بند کرنے کو میں ہی رہ گیا تھا۔ کفّار کہاں چلے گئے تھے۔ میرے ہی اوپر بلا آتی ہے۔ گویا انہوں نے جو روزی کا ذمّہ لیا تھا۔ معاذ اللہ اسے پورا نہیں کیا اور آپ جو ذمّہ لے کے آئے تھے کہ میں طاعت کروں گا۔ وہ آپ نے کب پورا کیا؟ اپنے کو دیکھتے نہیں' شکایت اللہ میاں کی شروع کردی۔ اس واسطے اپنا بھی حق ادا کرو اور اللہ نے جو اپنے فضل وکرم سے اپنے ذمّہ لیا ہے۔ وہ ادا کریں گے۔ تم کمی کروگے' ادھر سے بھی کمی ہو جائے گی۔ تم پورا حق ادا کروگے' ادھر سے بھی روزی دی جائے گی۔ اس لئے فرماتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ

"روزی کی فکر نہ کرو ہم دیں گے"۔

اپنے کام کی فکر کرو۔ جو تمہارے ذمے ڈالا گیا ہے اور وہ طاعت و عبادت ہے۔

یہ چند باتیں میں نے بلا تمہید عرض کیں کسی علمی تمہید کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو طاعت و عبادت کی، جھکنے کی توفیق عطا فرمادے ___ آمین۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ
وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ
صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ
بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

عروج وزوال

مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے۔ لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے' جو دوسروں کے پاس نہ ہو' اس کے پاس ہو ___ کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت و ثروت یا جاہ و مال کے ذخیرے نہیں ہوسکتے کہ یہ سب اوروں کے پاس بھی ہیں بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں ___ اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرۃ الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ___ اَمَّا بَعْدُ ___

عروج وزوال کا معیار

ہر قوم کی زندگی کا ایک معیار اور نصب العین ہوتا ہے جس سے اس کی ترقی و تنزل اور فناء و بقاء پہچانی جاتی ہے' مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر غور کرنے کے لئے بھی یہی راستہ زیادہ سہل اور مختصر ہے کہ اس کے بنیادی نصب العین کو سامنے رکھ لیا جائے گردوپیش کے حالات ہنگامی حوادث یا شخصی آراء معیار کا درجہ نہیں رکھتیں کہ ان سے کسی قوم کے عروج وزوال کو پہچانا جائے' پس مسلم قوم کا نصب العین اس کی سیاسی تعلیمات اور ابتدائی قرون کے تعامل ہی سے سامنے آسکتا ہے جو اس کے عروج کا دور ہے' جس حد تک امت اس کے مطابق ہو اسے قوم کی بقاء اور ترقی باور کیا جائے گا اور اس میں اس کی ترقی مضمر ہوگی اور جس حد تک وہ اس سے ہٹی ہوئی ہو اسی کو اس کے لئے سبب تنزل قرار دے کر اس سے ہٹانے اور راستہ بدلنے کی سعی کی جائے گی اس میں اس کا تنزل مضمر ہوگا۔

جناب کا یہ احساس بالکل صحیح ہے کہ مسلم قوم دنیا کی محتاج رہ کر ان کے سامنے سائل اور بھکاری بن کر زندہ نہیں رہ سکتی چہ جائیکہ بڑھے اور پھلے پھولے' لیکن استغناء کے معنی یک سوئی انقطاعیت گوشہ گیری اور علیحدگی پسندی کے نہیں بالخصوص اس بین الاقوامی دور میں کہ یہ بھی موت کے مترادف ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ مسلمان دوسری اقوام سے مستغنی بھی ہوں، سائل اور بھکاری بھی نہ ہوں اور ساتھ ہی اقوام کے جمگھٹوں میں کندھے سے کندھا ملا کر ان میں گھسے ہوئے بھی ہوں تو اس گھسنے کے کیا معنی ہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ سائل بن کر نہیں محسن بن کر اور ایثار پیشہ بن کر گھسیں جسے دوسرے لفظوں میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان دنیا کو کچھ دینے کے لئے آیا ہے لینے یا مانگنے کے لئے نہیں آیا۔

اور ظاہر ہے کہ وہ وہی کچھ دے سکتا ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو، اس کے پاس ہو، کھلی بات ہے کہ وہ دنیا کی دولت وثروت یا جاہ ومال کے ذخیرے نہیں ہو سکتے کہ یہ سب کچھ اوروں کے پاس بھی ہیں بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی ان کے ہاتھ میں ہیں۔

معلم وامام اقوام

اس لئے دینے کی چیز ایک ہی رہ جاتی ہے اور وہ مستند دین ہے کہ اس فطرت الٰہی پر خود چل کر اقوام کو چلائیں اور ان کے معلم اور امام بنیں اس سے امت مسلمہ کے نصب العین اور وجہ تشکیل کا خلاصہ مختصر لفظوں میں صلاح نفس کے ساتھ اصلاح عالم کو دعوت عام، اعلاء کلمۃ اللہ اور احیاء سنن انبیاء کے سوا دوسرا نہیں نکلتا۔ امت اسی راستہ سے آگے بڑھی اور اسی لائن سے دنیا کے خطے اس کے تابع فرمان ہوئے، اس لئے اس کی ترقی وتنزل اور عروج وپستی کے پہچاننے کا بھی یہی معیار ہو سکتا ہے کہ ہر شعبۂ زندگی میں خواہ دیانت وسیاست ہو یا تمدن ومعاشرت، بین الاقوامی تعلقات ہوں یا جنگ وصلح، امن ہو یا بدامنی، سرمایاداری ہو یا ناداری وہ اسے اختیار کئے ہوئے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں کئے ہوئے ہیں تو اس صورت میں نہ اس کا استغناء باقی رہ سکتا ہے نہ احسان وایثار، جو ان کے وجود کی اصل بنیاد تھا اور اس طرح ان کی قومیت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔

اب اگر مسلم قوم کا نظریہ محض کسی خطۂ زمین پر آرام وآسائش یا زیادہ سے زیادہ کچھ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لینے کے ساتھ گذر بسر کر لینا ہے تو اس ملک کی مختلف اقوام کے ہجوم میں اس کا نتیجہ اس کے حق میں رشک، احساس کمتری، حرص وآواز اور پھر اس سے قلبی بے چینی، اندرونی تشویشات، ماتم سرائی، اضطراب وگھبراہٹ اور پراگندہ خاطری کی صورت میں نمایاں ہوگا جیسا کہ ہو رہا ہے اور وہ کبھی چین اور امن کی زندگی بسر نہیں کر سکیں گے۔ اسی لئے اسلامی زندگی میں اس گذر بسر کے تصور کی کوئی خاص قدر وقیمت نہیں جبکہ اس کے ساتھ وہ معیاری جذبہ نہ ہو جس پر اس قوم کی بنیاد ہے اور جس کی خاطر دنیا میں اسے مبعوث کیا گیا تھا۔

قلبی تمکین

ہاں اگر وہ ہے تو پھر ان مذکورہ خطرات کے بجائے قوم میں قلبی تمکین، اطمینان خاطر، دل جمعی اور استغناء اور تفوق لازمی ہے اور اسی کے ہوتے ہوئے قوم کی امتیازی شان یا وجاہت، حیثیت عرفی اور اقوام کے قلوب میں اس کی ہیبت قائم رہ سکتی ہے۔ جیسا کہ تاریخ اسے بار بار دہرا چکی ہے۔

اندریں صورت اگر اس ملک میں دائیں بائیں بازو کے ساتھ ایک تیسری قوت مسلمان بھی ہیں تو انہیں اور ان کے تمام افکار ونظریات زندگی کو پہلے اسی معیار پر جانچنے کی ضرورت ہوگی، جس معیار کی رو سے وہ مسلمان کہلائے، اس لئے سوالات کی یہ نوعیت باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان کے کس خطے میں مسلمانوں کی اخلاقی یا سماجی حالت کیسی ہے یا دوسری اقوام سے ان کی تعلقات کیسے ہیں اور ان کی سیاسی پالیسی کیا ہے؟ یا وہ

نادار اور بے روزگار ہیں یا سرمایہ دار اور برسرکار؟

بلکہ سوال کی صحیح نوعیت یہ بنتی ہے کہ ان کے حالات کچھ بھی ہوں وہ اس قوم کے بنیادی معیار کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اور اگر وہ ایسا نہیں کر رہے تو ان کی دلوں میں ان کا بنیادی نصب العین کس طرح بیدار کیا جائے اور انہیں مختلف مصنوعی نصب العینوں سے ہٹا کر کس طرح اصلی اور حقیقی نصب العین کی طرف لایا جائے۔ غیر مسلموں کی نظر ہمارے حالات پر نہیں بلکہ کردار اور اخلاق اور قومی خصوصیات پر ہے۔ جنہیں وہ تاریخ سے جانتے ہیں۔

عظیم تعمیری خدمت

میں سمجھتا ہوں کہ بہت حد تک موجودہ حالات اور کردار اور اخلاق کی گراوٹ' نیز منصب سے روگردانی ہی نے انہیں اسلام کی اور مسلمانوں کی طرف سے شکوک وشبہات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اگر کردار واخلاق معیار کے مطابق ہوتا اور اپنے منصبی فریضہ سے وہ غافل نہ ہوتے تو شکوک کی گنجائش نہ تھی۔ ہر شبہ کا جواب مسلمانوں کا کردار بن جاتا' جیسا کہ پہلے بنتا رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اتحاد و تنظیم کے بغیر ان کا مستقبل تاریک ہے۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ یہ اتحاد بھی تجربہ اور قرآنی شہادت کی رو سے محض رسمی تنظیموں سے نہ کبھی حاصل ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس کی صورت بھی ایمان و عمل صالح اور بالخصوص دعوت الی اللہ ہی سے ہویدا ہوتی ہے۔ جس حد تک ہماری مخلصانہ توجہ اغیار کی طرف ہوگی اور ہم اسلامی حلقوں کی توسیع کی طرف متوجہ رہیں گے' اس حد تک طبعی طور پر باہمی خلفشار سے بچے رہیں گے۔ اگر جناب ان سوالات پر بھی خود غور فرما کر یا ملک کے اہل فضل وکمال سے ان کے جوابات طلب فرما کر ان کے حل کی طرف متوجہ ہو جائیں گے تو یہ یقیناً قوم کے امتیاز و تفوق اور اس کے کردار کی بلندی کی ایک عظیم تعمیر اور بنیادی خدمت ہوگی۔

سوالات گرامی دیکھ کر جہاں ان سے استفادہ کی توفیق ہوئی وہیں یہ چند سوالات بھی ذہن میں ابھر آئے۔ گو طالب علمانہ ہیں مگر پھر بھی پیش کر دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔ مسلمانوں کی ہمہ جہتی تربیت میں خواہ وہ سیاسی اور اقتصادی ہو یا مذہبی۔ اگر یہ معیار پیش نظر رہے تو امید ہے کہ ان کی حالت بدل جائے گی اور ان میں حوصلہ مندی پیدا ہو جائے گی۔

والسلام.

محمد طیب غفرلہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

۳ر ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

ملت اسلامیہ کا المیہ اور اس کا علاج

ملک اگر آزاد بھی ہو' ہندوستان ہو' پاکستان ہو' کچھ بھی ہو' اور انتظام و اثرات غیروں کے غالب ہوں کہ جب تک وہ مدد نہ کریں چل نہیں سکتے اسے اقتدار تھوڑا ہی کہتے ہیں؟
اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر چیز میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ روٹی' رزق اور ٹکڑے میں عزت اور اقتدار میں تو سوال یہ ہے کہ اس بے رزقی اور بے عزتی کے بارے میں آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ہم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟ یہ شکایت رہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں کیوں نہیں دیا؟ ہمارے ملک کیوں چھین لئے؟ ہماری عزت کیوں چھین لی؟ کیوں ہم بھیک مانگتے پھر رہے ہیں؟ اللہ کی نسبت تو خیال آتا ہے اپنی نسبت خیال نہیں آتا کہ ہم نے بھی کچھ کیا؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

گزارش واقعی

بزرگان محترم!
میں اس وقت زیادہ دیر تک نہیں بول سکوں گا ــــ کچھ تو اپنے ضعف کی وجہ سے اور کچھ یہ کہ تقریباً ایک ہفتے سے روزانہ مسلسل تقریریں کرنی پڑیں' اتنی قوت نہیں ہے کہ روز کی تقریریں نبھائی جاسکیں' بمبئی آنے کا میرا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہاں آکر تھکاوٹ دور کروں اور آرام کروں ــــ مگر یہاں پہنچ کر بہرحال جلسے کی تیاری ہو گئی اس لئے اس تعب اور تھکان کی بناء پر میں زیادہ دیر نہیں بول سکوں گا' صرف جلسہ اور اس کے اعلان کا احترام قائم رکھنے کے لئے چند باتیں گزارش کرنی ہیں۔

اضطراب عام

اس جلسہ کے لئے جو دعوت نامہ پہنچا تھا اس میں یہ تھا کہ اس وقت مسلمان پریشانیوں میں مبتلا ہیں' اور مختلف قسم کے فتنے اور مختلف قسم کی پریشانیاں ان پر آرہی ہیں' کچھ اخلاقی لائنوں سے' کچھ سیاسی لائنوں سے' کچھ اعتقادی لائنوں سے کچھ تمدنی اور معاشرتی لائنوں سے۔ غرض مختلف قسم کے فتنے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو مضطرب' بے چین اور پریشان کر رکھا ہے ــــ اس میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ ان پریشانیوں کو دور کرنے کا کوئی راستہ تجویز کیا جائے اور کوئی بات کہی جائے جس سے یہ پریشانیاں دور ہوں۔
یہ ہمارے قبضے میں تو نہیں ہے کہ ہم کسی پریشانی کو دور کردیں۔ ہم اپنی ہی پریشانی دور نہیں کر سکتے' ہم دوسروں کا کیا بنا سکتے ہیں ــــ البتہ تدبیر بیان کی جاسکتی ہے کہ یہ تدبیر اختیار کی جائے تو فتنے ختم ہوں گے' پریشانی دور ہو گی' اور دلجمعی پیدا ہو جائے گی۔

تدبیر بھی ہم خود کیا تجویز کر سکتے ہیں جو خود فتنوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو وہ تدبیر کیا کرے گا۔ تدبیر وہ بتلا سکتا ہے' جو فتنوں سے بری اور بالا ہو ___ تو اس کی تدبیر حق تعالیٰ ہی سے پوچھنی چاہئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنی چاہئے وہی ہمارے فتنوں کا رد ہو گا اور وہی فتنوں کا دفعیہ کا ذریعہ ہو گا۔

اس کے بارے میں ایک حدیث سنائے دیتا ہوں اس کا ترجمہ اور اس کی مختصر سی تشریح عرض کئے دیتا ہوں۔

حدیث حضرت معاذ رضی اللہ عنہ

حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث منقول ہے۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرما رہے ہیں ___ اور انہوں نے روایت سے پہلے واقعہ بیان کیا کہ میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سواری پر سوار تھے۔

عرب میں عامتہً یہ دستور ہے کہ ایک اونٹ پر دو سیٹیں ہوتی ہیں' اسی طرح ایک گھوڑے پر دو سیٹیں' ایک گدھے پر دو سیٹیں ___ تو زین ہی دو سیٹ کا بنایا جاتا ہے اس کے آگے پیچھے کو آدمی سوار ہو جاتے ہیں۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہی سواری پر سوار تھے اور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا قریب تھا کہ :

لیس بینی وبینہ الا مؤخرۃ الرحل

میرے اور آپؐ کے درمیان میں کوئی حائل نہیں تھا' صرف زین اور کجاوے کی ایک ڈنڈی بیچ میں تھی ___ گویا اگلا بیٹھنے والا تو لگام سہار کر بیٹھتا ہے اور پچھلا بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو سہار لیتا تھا تاکہ گر نہ پڑے ___ تو وہ زین ایسے ہی بنائے جاتے تھے کہ دو سیٹیں تھیں۔ بیچ میں ایک ڈنڈی اس طرح سے لگاتے تھے تاکہ پیچھے بیٹھنے والا اس ڈنڈی کو تھامے رہے۔ اسے مؤخرۃ الرحل کہتے تھے۔ گویا کجاوے کا ایک درمیانی حصہ ___ بہر حال حضرت معاذؓ فرماتے ہیں کہ زین کی اگلی سیٹ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور پچھلی پر میں تھا' میرے اور آپؐ کے درمیان اسی ڈنڈی کا فاصلہ تھا۔ اس کے سوا کوئی فصل نہیں تھا۔

تعدّدِ ندا

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی کہ :

یا معاذ ___ اے معاذ!

میں نے عرض کیا :

لبیک یا رسول اللہ وسعدیک

میں حاضر ہوں یا رسول اللہ!

اس کے بعد کچھ سکوت فرمایا۔ اور پھر آواز دی کہ :

یا معاذ ___ !اے معاذ!

میں نے عرض کیا :

لبیک یا رسول اللہ وسعدیک

یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں اور میری سعادت ہی حاضری میں ہے۔
پھر آپؐ نے تیسری آواز دی کہ :
یا معاذ!
میں نے پھر عرض کیا :
لبیک یا رسول اللہ وسعدیک
یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں۔
اس کے بعد آپؐ نے وہ حدیث ارشاد فرمائی جو مجھے اس وقت سنانی ہے۔

مقام اشتباہ

اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کسی بعید کو جو دور ہو اسے پکارا جاتا ہے اور جو اتنا قریب ہو کہ ملا ہوا بیٹھا ہو صرف ایک کجاوے کی ڈنڈی بیچ میں ہو اسے پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپؐ نے جو ارشاد فرمانا تھا وہ ارشاد فرمادیتے' پکارنے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ پھر پکارنا بھی ایک دفعہ نہیں تین دفعہ ہے ــــ اور پھر اس کے باوجود کہ ہر پکار پر وہ عرض کرتے ہیں کہ **لبیک یا رسول اللہ**

یا رسول اللہ میں حاضر ہوں ــــ اگر جواب نہ آتا ممکن تھا کہ پہلی آواز کو نہ سنا ہو' اس لئے دوسری آواز دی' دوسری انہوں نے نہ سنی ہو تو تیسری مرتبہ پکارا گیا ہو ــــ لیکن ہر پکار کا جواب بھی دے رہے ہیں۔ تو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ پہلی پکار نہیں سنی ہوگی' تو سوال یہ ہے کہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ تین دفعہ آپؐ پکاریں۔

اشتیاق مقصد

یہ حقیقت میں ایسے مواقع پر ہوتا ہے جب کوئی اہم مضمون بیان کرنا ہو اور کوئی عظیم مقصد پیش کرنا ہو۔ تو تین تین دفعہ متوجہ کرتے ہیں کہ غور سے سنو تاکہ وہ چیز دل کے اندر اتر جائے۔ بلا پکارے ہوئے اور بلا لبیک کہلوائے ہوئے کسی چیز کا کہنا بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کان سے بات کہی اور دوسرے کان سے نکل گئی۔ تین دفعہ متوجہ فرمایا کہ شوق پیدا ہوجائے اور اس مضمون کی رغبت پیدا ہوجائے جو آگے ارشاد فرمانا ہے۔

اور یہ انبیاء علیہم السلام اور نائبان علیہم السلام کا خاصہ رہا ہے کہ پہلے دل میں شوق اور تڑپ پیدا کرتے ہیں اس کے بعد میں مقصد پیش کرتے ہیں تاکہ دل میں اتر جائے ــــ بلا طلب کے اگر از خود کوئی چیز کہہ دی جائے تو عادت یہ ہے کہ دل میں اترا نہیں کرتی' آدمی توجہ نہیں کرتا' جب تک اندر سے طلب صادق نہ ہو' تو شوق پیدا کرنے کے لئے ایسے اسباب اختیار کرتے ہیں کہ طلب پیدا ہوجائے اور طلب کے بعد جو چیز دل میں آتی ہے وہ دل میں اترتی جاتی ہے۔ غیر طالب کو کچھ نہیں ملتا' اس لئے طلب گار ہونا چاہئے۔
جیسے عارف رومی نے کہا ہے کہ ؎

آب کم جو، تشنگی آور بدست

پانی کو زیادہ مت پکارو' پیاس اپنے اندر پیدا کرو' پیاس پیدا ہوگی تو پانی ملے گا اور پھر وہ اترے گا اور رگ

رگ میں تری پیدا کرے گا' پیاس نہ ہو تو پانی پی لو تو بعض دفعہ بیماری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ پیٹ میں اپھارہ پیدا ہو جاتا ہے ___ تو معدے کی خواہش کے بعد اگر کھانا کھایا جائے گا تو معدے میں اترے گا' پچے گا اور بدن کو لگے گا اور بلا بھوک کوئی کھاتا رہے تو بیماریوں کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنے گا۔ اس لئے پانی اور دانے کی تلاش کی زیادہ ضرورت نہیں۔ بھوک اور پیاس پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معدہ خراب ہوتا ہے اور بھوک کی کمی ہوتی ہے تو طبیب کے پاس جاتے ہیں۔ تندور پر نہیں جاتے کہ بہت سی روٹیاں لے آئیں' بلکہ طبیب کے پاس جاتے ہیں کہ ان روٹیوں کی گنجائش تو پیدا ہو جائے' علاج کراتے ہیں تاکہ معدے میں طلب تو پیدا ہو جائے۔

انتظار رغبت

میں نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہ العزیز بانی دارالعلوم دیوبند ان کے مریدین میں سے حافظ محمد احسن صاحب جو ہمارے عزیزوں میں سے تھے' حضرت سے بیعت تھے ___ نوجوان تھے اور اس زمانے کے نوجوانوں کا جو لباس تھا وہ یہ تھا کہ چوڑی دار پائجامہ جو ٹانگوں پر لپٹا ہوا ہو اور سر کے اوپر دوپٹہ جس کی کناری پر کرن اور گوٹہ بھی لگا ہوا ہوتا تھا اور ہاتھوں پر مہندی' اور پور پور چاندی کے چھلے' یہ اس زمانے میں نوجوانوں کا تمدن ہے ___ یہی لباس ان کا بھی تھا ___ کے بارے میں سنا کہ۔

یہ حضرت کی مجلس میں آتے تھے اور حضرت کچھ نہیں فرماتے تھے۔

لوگوں کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ حضرت کے مرید اور خادم' اور لباس غیر شرعی' مردوں کے لئے کب جائز ہے کہ مہندی لگائیں یا ہاتھوں میں چاندی کے چھلے پہنیں۔ یہ سارے ناجائز کام کر رہے ہیں۔ چوڑی دار پائجامہ جو ٹخنوں سے نیچا' جس کی شرعی ممانعت ہے۔ جس کو شرعاً اسبال کہتے ہیں ___ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا گیا' ٹخنوں سے نیچے پائجامہ یا لنگی ڈالنے والا۔ جس کا نام "مُسْبِل منان" ہے حق تعالیٰ اسے قیامت کے دن نظر رحمت سے نہیں دیکھیں گے کہ دنیا میں اسبال کرتا تھا' ٹخنوں سے نیچے ازار یا پائجامہ رکھتا تھا' تو اس پر نگاہ رحمت نہیں فرمائیں گے' اس سے اعراض کیا جائے گا۔

تو حضرت کی مجلس میں وہ آتے ہیں اس حالت میں کہ اسبال موجود' ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی ناجائز چھلے پہنے ہوئے اور حضرت کچھ نہیں بولتے نہی عن المنکر نہیں فرماتے' لوگوں کے دلوں میں یہ خطرہ گزرتا تھا' اور ایک' دو نے ایک دوسرے سے کہا بھی۔ مگر حضرت پر کوئی اثر نہیں ___ حافظ صاحب آرہے ہیں اور مجلس میں بیٹھ رہے ہیں۔

حضرت کیوں کچھ نہیں فرماتے؟

دل میں شریعت کے اتباع کا شوق اور طلب پیدا کرنے کے لئے ___ کہ طلب پیدا ہو جائے۔ پھر جب یہ حکم دیا جائے گا تو دل میں اتر جائے گا ___ اور بلا طلب کے لاکھ تقریریں کرو' وعظ کہو' کوئی اثر نہیں ہو گا۔ جیسے آج کی دنیا میں سینکڑوں وعظ اور سینکڑوں تقریریں ہوتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں نہ ایسی تقریریں تھیں' نہ مواعظ تھے' نہ جلسے ہوتے تھے ___ اور آج جلسوں کی بھرمار ہے۔

اور جلسوں کا سیزن ہے اور ہزاروں پر انتہا نہیں ہوتی۔ لاکھوں تک اجتماعات میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ لیکن دل ٹس سے مس نہیں' کسی کے اندر کوئی تغیر نہیں ___ وہی کی وہی حالت جو پہلے تھی ___ ایک واعظ وعظ کہہ کے وعظ کا ایسا پانی ڈالتا ہے جیسے گنبد پہ ڈال دیا' کہ ادھر ادھر بکھر جاتا ہے۔ اندر کچھ بھی نہیں پہنچتا' بنا

اس کی یہ ہے کہ طلب صادق نہیں' تفریحاً آ کے وعظوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ گویا بھانڈ کی دیکھتے ہیں کہ مقرر کیا بولتا ہے' کیسی باتیں کرتا ہے۔ یہ طلب ہو کہ اس کی کوئی بات لے کر ہم اپنی دنیا و آخرت کی نجات کی فکر کریں۔ یہ نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ ہوگی' ہزاروں لاکھوں میں کسی ایک کو ___ عام طور سے نہیں ہے۔ اس لئے مواعظ اثر بھی نہیں کرتے۔

وعظ' غلط نہیں ہوتا' مگر دل کھلا ہوا ہو جب اس کے اندر کوئی چیز اترے اور اگر دل الٹا ہو تو اس کی تلی پر جتنا پڑے گا ادھر ادھر بہہ جائے گا۔ اندر نہیں جائے گا ___ بہرحال حضرت بھی کچھ نہیں کہتے تھے۔

جب چھ مہینے گزر گئے اور دیکھا کہ اب ان کے اندر عقیدت پوری بیدار ہوگئی ہے اور قلب میں گرویدگی آگئی ہے۔ اور طلب صادق آگئی۔ تو تنہائی میں لے جا کر کیسے عجیب انداز سے کہا ___ فرمایا۔

"بھائی! حافظ جی! تم تو ہمارے دوست ہو اور ہم تمہارے دوست ہیں اور دوستوں کے اندر محبت ہوتی ہے۔ اور محبت میں ہر ایک دوسرے کی حرص کیا کرتا ہے۔ اب ہمارا لباس تو یہ ہے کہ ایک معمولی سا کرتہ اور ایک پٹے پائنچوں کا پاجامہ' اور ایک دو پلی ٹوپی ___ تمہارا ماشاء اللہ فاخرہ لباس ہے۔ گوٹے لگا ہوا عمامہ بھی ہے۔ پور پور چھلے بھی اور نہایت عمدہ اچکن اور چپل بھی ___ بھئی! دوستی ہے تو یا تو ہم بھی آج سے یہ لباس اختیار کرلیں کہ ہم بھی چوڑی دار پائنچوں کا پاجامہ پہن لیں' ہم بھی ہاتھوں کو مہندی سے رنگیں' یا پھر تم اس راستے پر آجاؤ جس پر میں ہوں۔ یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دو دوست ہوں ایک کا رخ مشرق کو ہو اور ایک کا مغرب کو ہو ___"۔

طرز نصیحت

چونکہ دل میں عقیدت آچکی تھی اور طلب صادق پیدا ہو چکی تھی' تو حافظ محمد احسن صاحب رونے لگے اور بلا کچھ کہے وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر گئے ___ جا کر وہ چوڑی دار پاجامے تو بیوی کو دیئے کہ رنگ لگا کر اس کو تو پہن لے' اور گوٹے کی کناری کے دوپٹے اس کو دیئے کہ ان کی تو اوڑھنیاں بنالے ___ اور پندرہ دن گھر سے نہیں نکلے' جب تک مہندی کا وہ رنگ ہتھیلیوں سے زائل نہیں ہوگیا' چھلے بھی بیوی کو دیئے کہ تو ان کا زیور بنوالے۔

پندرہ بیس دن کے بعد جب وہ مہندی کا اثر جاتا رہا۔ تو خالص مولویانہ لباس' وہی مغلیہ قسم کا پاجامہ اور کرتہ' اور دو پلیہ ٹوپی اوڑھ کر حضرت کی مجلس میں پہنچے ___ بالکل ایسے جیسے ایک طالب علم ہوتا ہے ___ حضرت نے سینے سے لگایا اور فرمایا۔

بھئی! آج دونوں دوست یکساں ہوگئے۔

اور بڑی خوشی کا اظہار فرمایا ___ یہ جو چھ مہینے تک امر بالمعروف نہیں کیا' وہ اس لئے نہیں کیا کہ اس کا انتظار تھا کہ دل میں طلب آجائے' دل میں گرویدگی اور عقیدت پیدا ہو جائے تب کہے کا اثر پڑے گا۔

انبیاء علیہم السلام کا بھی یہ طریقہ ہے۔ اہل اللہ اور وارثین انبیاء علیہم السلام کا طریقہ بھی یہی ہے ___ اور وہ لوگ تو اب کہاں ہیں کہ ایک منٹ میں توجہ ڈالی اور کایا پلٹ دی' وہ لوگ گزر گئے' اب تو یہ ہے کہ اخلاق اور بھائی بندی سے کوئی اثر ڈال کر طلب پیدا کر کے کوئی نصیحت کریں تو کارگر ہوتی ہے۔ یوں نصیحت کرنے کو ہر ایک کا فرض ہے کہ نصیحت کرے' وعظ بھی کہے ___ لیکن مؤثر نہیں ہوتا۔

حکمت تربیت

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ ان کے ایک پٹھان مرید جلال آباد کے تھے بڑے خوبرو جوان تھے ___ اس زمانے کے نوجوانوں کا تمدن داڑھی منڈانے کا نہیں داڑھی رکھنے اور داڑھی چڑھانے کا تھا ___ نماز نہیں پڑھتے تھے' حضرت حاجی صاحبؒ سے شکایت کی گئی کہ حضرت! آپ کے مرید ہیں اور نماز نہیں پڑھتے ___ حضرت نے بلایا ___ بڑی شفقت سے کمر کے اوپر ہاتھ رکھا اور فرمایا۔

"بیٹا! نماز پڑھنی چاہئے' نماز ہی تو ایک مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز اور فرق ہے جب نماز ہی نہ ہو تو وہ مسلمان ہی کیا ہوا؟"

انہوں نے کہا حضرت! مجھے داڑھی چڑھانے کی عادت ہے اور سوا گھنٹے میں داڑھی چڑھتی ہے۔ پہلے اسے گوند لگاتا ہوں' پھر اسے سکھاتا ہوں' پھر اس میں کنگھا کرتا ہوں' سوا گھنٹہ لگتا ہے۔ آپ کہیں گے وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی' جب وضو کروں گا تو وہ سارا گوند موند دھل جائے گا۔ تو ہر نماز کے بعد مجھے داڑھی چڑھانی ہوگی ___ تو پانچ نمازیں تو گھنٹے بھر سے کم میں ہو جائیں گی اور پانچ دفعہ داڑھی چڑھانے میں سات گھنٹے صرف ہوں گے۔ یہ مشکل ہے اور آپ کہیں گے کہ بے وضو نماز جائز نہیں۔

اب آگے "حکمت تربیت" ہے۔ تعلیم تو یہ ہے کہ حضرت فرماتے کہ ہاں بلا وضو نماز جائز نہیں ___ حدیث میں ہے :

لاتقبل صلوٰۃ بغیر طھور

"کوئی نماز بغیر پاکی کے قبول نہیں ہوتی"۔

یہ تو تعلیم کا درجہ تھا۔ مگر تربیت کا درجہ دوسرا ہے۔ تعلیم میں تو ایک حکم ہوتا ہے سب کو سنا دیا جاتا ہے تربیت میں ہر ایک کا مزاج دیکھنا پڑتا ہے' اس کی نفسیات کے مطابق اس سے کلام کرنا پڑتا ہے ___ تو حضرت نے یہ دیکھا کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے اس کا کیا سنانا' وہ خود ہی کہہ رہے ہیں۔ کہ آپ کہیں گے کہ بلا وضو کے نماز نہیں ہوتی تو مسئلہ تو معلوم تھا ___ اب حضرت کیا فرماتے جو معلوم ہے اس کا علم کرادیتے' مگر حکمت تربیت پیش نظر تھی۔ حضرت نے فرمایا :

"بھئی! میں نے تو وضو کا ذکر نہیں کیا' میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ نماز پڑھا کرو"۔

انہوں نے عرض کیا' حضرت! بے وضو پڑھ لوں؟

فرمایا :

"پھر وضو کا ذکر' میں وضو کا نام کب لے رہا ہوں میں وضو کا تذکرہ کب کر رہا ہوں' میں تو نماز پڑھنے کو کہہ رہا ہوں"۔

تو خان صاحب اٹھے' انہوں نے بے وضو نماز ٹرخانی شروع کردی' غرض بے وضو نماز پڑھنی شروع کردی۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ بے وضو پڑھ رہے ہیں اور انہیں ٹوکتے نہیں۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ کی نماز نہیں ہوتی اس لئے کہ مسئلہ تو انہیں بھی معلوم ہے کہ نماز نہیں ہوتی۔

پندرہ دن گزر گئے ___ پندرہ دن کے بعد ان کے ذہن میں خود یہ جذبہ پیدا ہوا کہ تو محنت بھی کر رہا ہے

اور اکارت جارہی ہے۔ رائیگاں جارہی ہے۔ بلاوضو کے نماز نہیں ہوتی ___ مگر انہوں نے کہا کہ نماز تو اب میں چھوڑ نہیں سکتا' اس لئے کہ پیر کا حکم ہے۔ اور پٹھان کی زبان ہے جو کٹ چکی ہے وہ ٹل نہیں سکتی' للذا نماز نہیں چھوڑوں گا ___ نماز مجھے ہر صورت میں پڑھنی ہے۔ تو یہ کیا کہ صبح کی نماز کے لئے وضو کرتے اور داڑھی چڑھاتے اور عشاء تک اس وضو کو باقی رکھتے اور پانچوں نمازیں وضو سے پڑھتے۔

لیکن یہ ایک نوجوان آدمی کے لئے بڑا مشکل ہے کہ صبح سے لے کر عشاء تک باوضو رہے' تکلیف شروع ہوئی۔ پیٹ میں نفخ اور اپھارہ شروع ہوا۔

اب انہوں نے یہ کیا کہ ایک وضو تو صبح کی نماز کے لئے کرتے اور ایک ظہر کے وقت کرتے' اسے عشاء تک باقی رکھتے ___ غرض نماز باوضو شروع کردی ___ لیکن ایک نوجوان کے لئے بڑی مشکل سی بات ہے کہ ظہر سے لے کر عشاء تک باوضو رہے ___ اس سے بھی پیٹ میں تکلیف شروع ہوئی۔ اب انہوں نے کہا کہ نماز تو میں چھوڑ نہیں سکتا' پیر سے وعدہ کر چکا ہوں اور زبان پٹھان کی ہے جو کٹ گئی ہے' اب بدل نہیں سکتی ___ اس واسطے انہوں نے سوچا کہ یا تو داڑھی چڑھانے کو قائم رکھوں' یا نماز قائم رکھوں ___ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے داڑھی چڑھانی چھوڑ دی اور نماز باوضو پڑھنی شروع کردی۔

بیس پچیس دن کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ نے بلوایا اور بہت شاباش دی اور فرمایا :

"نوجوان صالح ایسے ہی ہوتے ہیں"۔

اور بڑی دعائیں دیں ___ اس کے بعد فرمایا :

بھئی! بے وضو کی نماز کتنے دن تم نے پڑھی؟"

انہوں نے عرض کیا :

حضرت! پندرہ بیس دن ___ فرمایا :

اسے لوٹا لینا' یہ ہوئی نہیں ___ انہوں نے عرض کیا۔ لوٹا لوں گا۔

اس کے بعد فرمایا کہ :

بھئی! تمہاری عمر کیا ہے؟

خان صاحب نے کہا کہ سولہواں سال شروع ہے۔ پندرہ پورے ہو چکے ہیں۔ فرمایا :

چودہ برس کے بعد آدمی شرعاً بالغ ہو جاتا ہے اور نماز اس پر فرض ہو جاتی ہے ___ برس دن کی نماز تو پڑھنی نہیں ہوگی۔

انہوں نے عرض کیا :

حضرت! نہیں' میں نے تو نہیں پڑھی ___ فرمایا :

یہ قضا عمری ہے۔ اسے بھی قضا کرلو۔

اب دل میں لگن تو لگ چکی تھی ___ سرکاری ملازم تھے انہوں نے ایک ہفتے کی رخصت لی' اور ساری نمازیں برس دن کی انہوں نے قضا کیں' اور ادا نمازوں سے سلسلہ مل گیا ___ گویا بلوغ کے وقت سے جو نمازی بنے تو پھر مرتے دم تک نماز نہیں چھوٹی اور پکے پابند صوم و صلوٰۃ ہو گئے ___ یہ کیسے ہوئے؟

حضرت نے پندرہ دن کی بے وضو نماز پڑھوا کے عمر بھر کی نمازیں باوضو پڑھوا دیں۔ اور اگر پہلے ہی کہہ دیتے کہ بلاوضو کے نماز نہیں ہوتی' وہ کبھی نہ پڑھتے' اور عمر بھر بے نماز رہتے۔ یہ حکمت تربیت تھی کہ پندرہ دن بے وضو کے نمازیں پڑھوا کے عمر بھر کے لئے پابند نماز بنا دیا ___ اگر تربیت کی یہ صورت اختیار نہ کرتے'

وہ کبھی نماز کے عادی نہ ہوتے۔

تربیت کرنے میں بعض اوقات کسی بری اور منکر چیز کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، سکوت کرنا پڑتا ہے کہ طبیعت میں صلاحیت آجائے، پھر بات کہی جائے، پھر نصیحت کی جائے گی وہ قابل قبول ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔

تربیت کا امتیاز

اور سنت سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے ___ ایک قبیلہ جو کئی ہزار آدمیوں پر مشتمل تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا :

یا رسول اللہ! ہم اسلام قبول کرنے کے لئے آئے ہیں۔

فرمایا بارک اللہ

انہوں نے کہا، حضرت! اسلام قبول کرنے کی ایک شرط ہے وہ یہ کہ ایک صبح کی نماز نہیں پڑھیں گے۔

اور ایک عشاء کی نماز نہیں پڑھیں گے، تین نمازیں پڑھواتے رہیں۔

فرمایا ___ شرط منظور ہے۔

حالانکہ جس طرح سے تین وقت کی فرض تھیں، ویسے ہی بقیہ دو وقت کی بھی فرض تھیں ___ مگر آپؐ نے شرط منظور فرمائی اور وہ تین وقت کی پڑھ رہے ہیں اور صبح و عشاء کی غائب۔

آپؐ نے بھی نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں پڑھتے؟ یہ ناجائز ہے، ممنوع ہے۔ حرام ہے ___ مہینہ بھر کے بعد میں از خود ان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ جیسے تین وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ ویسے ہی صبح و عشاء کی بھی فرض ہیں۔ تو ہم آدھے دین کو قبول کریں اور آدھے دین کو ضائع کریں، یہ ہرگز مناسب نہیں، چنانچہ مہینہ بھر کے بعد انہوں نے وہ دو بھی پڑھنا شروع کر دیں ___ اس کے بعد وہ حاضر ہوئے اور نماز کے پابند ہو گئے، تو دو وقت کی نماز نہ پڑھنے کی شرط مان کر عمر بھر کی پانچ وقت کی نمازوں کا پابند بنا دیا، یہ تعلیم نہیں تھی بلکہ تربیت تھی۔

تعلیم میں تو مسئلہ عام ہوتا ہے، تربیت میں ہر مزاج کے مطابق اس کو دوا دی جاتی ہے۔

آپ کسی طبیب اور ڈاکٹر کے ہاں تعلیم پانے جائیں۔ ایک ہی مسئلہ بیان ہوگا جو کتاب میں ہے وہی سب کے لئے ہے ___ لیکن جب طبیب مطب کرے گا وہاں یہ نہیں کہ ایک نسخے میں سب کو پار کر دے، ہر مریض کی نبض الگ ہے اس کا مزاج الگ ہے، اس کے مطابق نسخہ تجویز کرنا ہوگا۔ غرض تعلیم میں عموم ہوتا ہے اور تربیت میں خصوص ہوتا ہے ___ اس لئے "مربیان قلوب" بعض اوقات انتظار کرتے ہیں۔ اس کی نفسیات کو دیکھ کر اس کی برائی پر کوئی روک ٹوک نہیں لگاتے کہ پہلے اس سے تعلق پیدا ہو جائے، دل میں گرویدگی آجائے پھر اس وقت کہا جائے گا۔

خیر وہ بات طویل ہو گئی، میں مختصر بیان کرنا چاہتا تھا، بہرحال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کو تین دفعہ آواز دی، حالانکہ وہ کمر مبارک سے ملے ہوئے بیٹھے تھے تاکہ تین دفعہ آواز دے کر ان کے دل میں شوق پیدا کر دیں کہ کوئی بڑی اہم بات کہی جانے والی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دل میں ایک طلب، تلاش اور پیاس پیدا ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرمائیں گے جو مجھے تین دفعہ متوجہ فرمایا۔

اللہ و بندے کا باہمی معاہدہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

یا معاذ ھل تدری ماحق اللّٰہ علی العباد ؟

اے معاذ ___ ! اللہ کا بندوں کے اوپر کیا حق ہے؟

انہوں نے عرض کیا :

اللّٰہ ورسولہ اعلم

اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے کہ اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں۔

فرمایا :

اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے۔

یعبدوا اللّٰہ ولا یشرکوا بہ شیأً

عبادت صرف ایک اللہ کی کریں جس میں شرک نہ آنے پائے۔ جبھی اللہ کا حق ادا ہوگا۔

اس کے بعد فرمایا :

ھل تدری ماحق العباد علی اللّٰہ ؟

یہ بھی جانتے ہو کہ بندوں کا اللہ کے اوپر کیا حق ہے؟

عرض کیا :

اللہ اور رسول ہی بہتر جانتا ہے۔

فرمایا :

"بندوں کا حق یہ ہے کہ جب وہ ایک ہی طرف جھک جائیں اور شرک سے بالکل الگ ہو جائیں۔ پوری زندگی ان کی توحید پر آجائے اور ایک ہی کو کرتا دھرتا سمجھیں' ایک ہی کو نافع اور ضار سمجھیں' ایک ہی کو محی و ممیت سمجھیں' ایک ہی کو رزّاق اور فتّاح سمجھیں' ایک ہی کو مشکلات آسان کرنے والا سمجھیں' ایک ہی کو دافع بلیّات سمجھیں' ایک ہی کو حلال مشکلات سمجھیں' جب بندے کے دل میں یہ آ گیا' اس نے اللہ کا حق ادا کر دیا ___ تو اللہ نے فرمایا کہ پھر تمہارا حق میرے اوپر یہ ہے کہ میں تمہیں رزق دوں گا' رزق ظاہری بھی' اور رزق باطنی اقتدار' عزت' عظمت' عرفی حیثیت' دنیا کی اقوام پر رعب داب' یہ میں تمہیں عطا کروں گا"۔

غرض بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو عبادت کر جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو۔ میں تمہیں رزق دوں گا جس کے اندر کمی کا شائبہ نہیں ہوگا۔

یہ گویا بندے اور خدا کا ایک معاہدہ ہوا کہ تم میری یاد میں لگو' میں تمہیں رزق دوں گا۔

قانون مکافات

اللہ تعالیٰ کے ہاں مکافات کا قانون ہے کہ جیسا تم کرو گے' ویسا نتیجہ سامنے آئے گا ___ چنانچہ فرمایا گیا :

فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ

فرماتے ہیں تم میری یاد کرو گے میں تمہاری یاد کروں گا۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ

تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے، میں تمہاری مدد کروں گا۔

من احب لقاء الله احب لقاءه

فرماتے ہیں، اگر تمہیں یہ شوق ہے کہ مجھ سے آکر ملو اور موت قبول کرو تو مجھے بھی یہ شوق ہے کہ کب میرا بندہ آئے اور مجھ سے ملے۔ تم میں بھی محبت ہے مجھ میں تمہاری محبت ہے۔ غرض "ادل بدل" اور مکافات کا قانون ہے اس لئے بندے اور خدا کا گویا معاہدہ یہ ہوا کہ تم تو میری عبادت میں رہو اور مجھے تنہا خالق ومالک اور مؤثر سمجھو، مجھے اپنا تنہا بادشاہ اور مالک حقیقی سمجھو اور پھر میں تمہیں رزق ظاہری اور باطنی بھی دوں گا، روٹی ومکان بھی، اقتدار وعزت بھی اور حکومت وسلطنت بھی۔ اور تمہیں دنیا کے اوپر غالب کروں گا۔ جس کا ایک جگہ وعدہ فرمایا:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ

"اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے، عقیدہ بھی پکا اور سچا اور عمل بھی سچا، ہم ضرور انہیں زمین میں خلافت عطا کریں گے، انہیں اقتدار عطا کریں گے، انہیں عزت عطا کریں گے، وجاہت دیں گے"۔

یہ گویا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ___ بندے سے یہ وعدہ لیا کہ تو تنہا میری طرف جھک، کسی کو کرتا دھرتا مت سمجھنا، ڈرے تو مجھ سے ڈر، عبادت کر تو میری کر، مانگ تو مجھ سے مانگ، میرا غیر تیری مشکلات کو حل نہیں کر سکتا، غیر اللہ کے ہاں تیرے لئے گنجائش نہیں۔ میرے ہی پاس ساری گنجائش ہے۔ میں ہی دوں گا ___ یہ معاہدہ ہو گیا۔

بندے کا انحراف عہد

معاہدے کا قاعدہ ہے کہ اگر ایک معاہد اپنا عہد توڑ دے تو دوسرے پر ضروری نہیں رہتا کہ اپنا معاہدہ پورا کرے اور اپنا وعدہ پورا کرے ___ دو حکومتوں میں معاہدے ہوئے، ایک نے غدر کیا، دوسری کہے گی اب ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں، اب خواہ ہم جنگ کریں یا اس ملک پر ہم قبضہ کریں، جب تک معاہدہ رہتا ہے دونوں فریق ایک دوسرے کی رعایت کرتے ہیں۔

اسی طرح بندے اور خدا میں معاہدہ ہو گیا، بندے نے عہد کیا کہ میں آپ کا بنوں گا، فرمایا، ہم تیرے بنیں گے، تو ہماری عبادت کر، ہم تجھے سب کچھ دیں گے اب اگر بندہ اس عہد سے پھر جائے کہ بجائے اس ایک کی عبادت کرنے کے اس نے ہزاروں کے سامنے سر جھکانا شروع کر دیا، بجائے اس ایک کی بندگی کے کبھی وہ کسی قبر کے آگے جھک رہا ہے، کبھی کسی پتھر کے آگے جھک رہا ہے۔ کبھی سونے اور چاندی کے آگے جھک رہا ہے ___ ظاہر ہے کہ اس نے عہد توڑ دیا، جب عہد توڑ دیا تو وہ جو وعدہ تھا اس کی پابندی باقی نہیں رہی۔ فرمائیں گے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ تجھے رزق دیں، کیا ضرورت ہے کہ تجھے اقتدار دیں، تو تو ہم سے منحرف ہو جائے اور ہم تجھے اقتدار دیں، تو تو مالک وخالق، روٹی، گیہوں اور چنے کو اور انسانوں کو سمجھے اور ہم تجھے عزت واقتدار دیں۔

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ

کیا ہم اپنی رحمت تیری کمر سے چپکا دیں گے کہ تو بھاگتا جا رہا ہے۔ ہم کہیں رحمت لیتا جا' تجھے لاکھ دفعہ ضرورت ہو تو ناک رگڑ' تو ہم تجھے رحمت دیں گے' جب تو وعدہ کا پکا نہیں تو ہم بھی اپنے وعدے کے پابند نہیں' جب تک وعدے کی پوری پابندی رہی' صحابہؓ کا دور' تابعین کا دور' تبع تابعین کا دور' اقتدار بھی آیا' عزت بھی آئی اور وہ اقتدار آیا کہ آج دنیا اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی' آج آپ فخر کرتے ہیں کہ عرب ہمارا' عراق ہمارا' مصر ہمارا' ترکستان ہمارا' افغانستان ہمارا' شام اور اردن ہمارا' یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ تو ہے جو آپ کو یہ کہنے کو ملا' آپ نے ان کو خود فتح کیا تھا ___ ؟ کیا آپ نے خود قوت بازو سے ان ممالک کو قبضے میں کیا تھا ___ ؟ یا ان بزرگوں نے جو اللہ کی چوکھٹ پر جھکے ہوئے تھے؟ آپ کو فخر کا موقع مل رہا ہے کہ ؎

چین و عرب ہمارا' ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم' وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ فخر کا موقع ان کی جوتیوں کے صدقے سے مل رہا ہے' آپ کی بات اگر ہوتی تو نہیں ہو سکتا تھا ___ تو جب تک قوم وعدے پر پختہ رہی وہ اقتدار بھی تھا' وہ عزت بھی تھی' وہ روزی بھی تھی۔ وہ فتنے بھی نہیں تھے' آپ داعی تھے' دوسرے مدعو' جب آپ نے دعوت چھوڑ دی تو دوسرے داعی بنے آپ کو مدعو ہونا پڑا' آپ بااقتدار تھے' دوسرے ماتحت تھے ___ جب آپ نے اقتدار کے اسباب چھوڑ دیئے' آپ ماتحت بنے' دوسرے آپ کے اوپر غالب کر دیئے گئے ___ یہ وعدہ خلافی آپ نے کی ___ تو جب فتنے آتے ہیں' پریشانیاں آتی ہیں آپ کہتے ہیں کہ تدبیر تو بتلاؤ' تدبیر تو اللہ نے بتلا دی کہ تم میرے بن جاؤ میں تمہارا بن جاؤں گا اور کیا تدبیر ہو ___ حکومت ان کے ہاتھ میں ہے ___ رزق ان کے ہاتھ میں ہے' عزت ان کے ہاتھ میں ہے' اس کی چوکھٹ پر جھکو گے تو یہ چیزیں آئیں گی' اس کی چوکھٹ چھوڑ کر غیروں کے آگے جھکنا شروع کیا تو غیروں نے آپ کی رہی سہی عزت کو بھی قبضہ میں لے لیا رہی سہی روٹی پر قبضہ کر لیا' آپ کو فتنوں کے میدان میں چھوڑ دیا۔ اب کوئی روٹی کو رو رہا ہے' کوئی پانی کو رو رہا ہے' کوئی صحت کو رو رہا ہے۔

کیوں رو رہے ہیں۔

اس لئے کہ جب ایک کا دروازہ چھوڑا تو پچاس کے آگے جھکنا پڑا' اور ان دروازوں پر کچھ ہے نہیں جو آپ کو دیں' نہ ادھر کے رہے' نہ ادھر کے رہے۔

عظمت در اور سر

مجھے ایک شعر یاد آیا واقعی بڑا کام کا شعر ہے اور شاعر نے بڑی بلیغ بات کہی ہے۔ جس نے بھی کہی ہے بڑی دینی بات ہے اور دو لفظوں میں بڑی زبردست حقیقت کہہ دی ہے' شاعر کہتا ہے ؎

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے در نہیں کہتے

دروازہ وہی ہے جسے دیکھتے ہی آدمی کا جی چاہے کہ جھک جائے ___ اہل اللہ کا دروازہ' انبیاء علیہم السلام کا دروازہ۔ خواہ مخواہ ہی دل چاہتا ہے کہ سر جھکاؤ۔ انکار کی شکل ہی نہیں۔ تو شاعر کہتا ہے ؎

سر جس پہ نہ جھک جائے اسے در نہیں کہتے
ہر در پہ جو جھک جائے اسے سر نہیں کہتے

ذلت انحراف

جو پچاس کو اپنا آقا بنالے' وہ کسی آقا کی خدمت نہیں کرسکتا' ایک ہی آقا کی خدمت ہو سکتی ہے۔ جب آپ کے پچاس آقا ہیں' کبھی اس کی چوکھٹ پہ جھکنا کبھی اس کی چوکھٹ پہ۔ کبھی اس سے بھیک مانگی کبھی اس سے بھیک مانگی ــــ تو مسلم قوم دنیا میں بھک منگی بن کے تھوڑا ہی آئی تھی ــــ وہ دنیا سے کچھ مانگنے کے لئے نہیں آئی تھی ــــ جب احسان کا دروازہ بند کردیا اور ختم کردیا تو سائل اور بھکاری بننا پڑا۔ اب آپ کی یہ حالت ہے کہ کسی قوم کے آگے جھک رہے ہیں کہ ہمیں تمدن کی بھیک دے دو' کسی کے آگے جھکتے ہیں کہ ہمیں سیاست کی بھیک دے دو' کسی کے آگے آپ جھک رہے ہیں کہ ہمیں اخلاق کی بھیک دے دو' اور سر کے اوپر ٹوکرا رکھا ہوا ہے جس میں رزق موجود ہے ــــ مگر در در مانگتے پھر رہے ہو۔ یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ہاتھ اٹھا کے سر کے اوپر سے لے لو' وہ ساری چیزیں اس ٹوکرے میں موجود ہیں ــــ قرآن وحدیث سر کے اوپر رکھا ہوا ہے اور دنیا کے در پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ حالانکہ اس میں سب کچھ موجود ہے ــــ اسی نے دنیا میں بین الاقوامیت اور بین الاوطانیت پھیلائی ؎

یک سبد پر زناں ترا بر فرق سر
تو ہمی جوئی لب ناں در بدر

سر پہ روٹیوں کا ٹوکرا بھرا ہوا ہے۔ اور ٹکڑوں کی مانگ کرتے پھر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جب غیر کی چوکھٹ پر سر جھکائیں گے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ آپ بھکاری بنیں گے تو مسلمان دنیا میں اقوام کو کچھ دینے کے لئے آئے تھے' مگر سائل اور بھکاری ہوگئے ــــ اور بھیک ملتی نہیں۔ تو ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔

یہ کیوں ہوا؟

اس لئے کہ وعدہ خلافی کی۔ اس معاہدہ کو توڑ دیا جو اللہ سے کیا تھا۔ کہا تھا کہ مجھ ہی پر بھروسہ کرو' مجھے ہی اپنا بادشاہ سمجھو' مجھے ہی خالق اور مالک سمجھو۔ میرے ہی قانون کی دنیا کے اندر ڈونڈی پیٹو' میرا ہی قانون سب تک پہنچاؤ۔ آپ نے جو اس قانون کو چھوڑا تو دنیا کی اقوام نے آپ پر قوانین لادنے شروع کئے ــــ وہ قوانین جو فطرت کے بھی خلاف' عقل کے بھی خلاف اور ہوش مندی کے بھی خلاف۔ مگر آپ کو جھک مار کر کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ کشاں کشاں جارہے ہیں ــــ اور آپ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ چیز بری ہے۔ مگر آپ کو جانا پڑا۔

کوئی نس بندی کا قانون پاس کرے گا' آپ کو مجبور ہو کے گردن جھکانی پڑے گی اس لئے کہ جب اپنے قانون کو پس پشت ڈالا تو دوسرے کے قانون پر چلیں' کوئی فیملی پلاننگ لائے گا' آپ کو ماننا پڑے گا۔ اس لئے کہ جو اسلام کا حکم تھا وہ پس پشت ڈال دیا ــــ پھر دنیا کی اقوام کے آگے جھکنا پڑے گا۔

اسلامی قانون کی عملی پابندی کی ضرورت

اگر آپ اس قانون پر عامل ہوتے فقط اعتقادی طور پر نہیں' عمل بھی ہو تو کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے اندر رخنہ اندازی کرے ــــ جب عملاً چھوڑ دیا تو ؏

خانہ خالی را دیومی گیرد

جب گھر خالی ہوتا ہے تو شیطان ہی اس میں آکر بسیرا کرتا ہے ــــ اس لئے ایک ہی قرار واقعی علاج

ہے۔ اللہ نے جو قانون دیا ہے' آنکھ بند کر کے اس کی عملی پابندی کرنی شروع کیجئے۔ پھر دیکھئے کیسے تبدیلی آتی ہے ___ آپ چاہتے ہیں کہ نظری طور پر چیزیں آجائیں۔ دماغ کو فرحت ہو جائے۔ عمل کا کوئی نام نشان نہیں اور کچھ نہ کرنا پڑے۔ تو دنیا میں بلا کئے کسی کو کچھ نہیں ملتا' دنیا تو دار العمل اور دارا لکسب ہے جتنا کسب و محنت کریں گے اتنا ہاتھ آئے گا' اور جتنا آپ اسباب کو چھوڑ کر غنی بن کے بیٹھ جائیں گے محتاج ترین بن جائیں گے' آپ کو کوئی چیز نہیں ملے گی' یہ جنت نہیں ہے کہ تخیل باندھنے سے نعمت سامنے آجائے۔ یہ دنیا ہے یہاں محنت کرنے سے چیز سامنے آجائے گی۔

اگر کاشتکار چھ مہینے خون پسینہ ایک رنگ نہ کرے' وہ چار دانے لے کر گھر میں نہیں آسکتا اس لئے کہ دنیا دار العمل ہے ___ اگر کاشت کار برسات کے مہینے میں یہ دیکھ کر کہ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں' بڑا اچھا خنک موسم ہے۔ لہٰذا یہ چار' چھ مہینے تو سو کے گزار لو ___ تو تخم ریزی کا زمانہ نکل جائے گا' بارش کا دور ختم ہو جائے گا' جب لوگ اناج کے ڈھیر لے کر آئیں گے تو یہ بیٹھ کے قسمت کو روئے گا کہ میں نے تخم ریزی کا سارا وقت سونے میں گزار دیا' اب جب دانہ لینے کا وقت آیا جنھوں نے محنت کی تھی وہ لے کر آرہے ہیں۔ میں خالی اور محروم ہوں۔ اب بیٹھ کر روئے گا' مگر اب رونے سے کیا ہوتا ہے ___ ملامت کرنے والا یہی تو ملامت کرے گا کہ کمبخت تو نے ان چھ مہینوں میں جا کر کیوں نہیں محنت کی ___؟

جب نہیں کی تو اب بیٹھ کر اپنی قسمت کو روؤ ___ غرض دنیا کا بازار اور دنیا کا میدان کاشت کاری کے لئے ہے ___ اللہ نے تخم سعادت کا بیج دلوں میں بکھیر دیا ہے۔ اس کو بار آور کرنا کہ ایمان و اعتقاد مضبوط کر کے عملاً چلنا' تب جا کے آخرت اور دنیا میں اس کے ثمرات ظاہر ہوں گے۔

جب آپ نے نہ بیج کو پانی دیا' نہ بیج کی آبیاری کی تو چند دن کے بعد نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیج بھی سوخت ہو جاتا ہے۔ جب زمین پر پانی ہی نہ پڑے تو بیج جل جائے گا۔ جو تخم سعادت قلوب کے اندر بکھیرا گیا تھا۔ اسے آپ ضائع کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کو پانی دے کر اگانے کی فکر میں نہیں ہیں ___ اور سوال یہ ہے کہ ہمیں دانہ کیوں نہیں مل رہا؟ ہمیں رزق کیوں نہیں مل رہا؟

بھئی! جب تم اگاؤ گے نہیں تو کہاں سے ملے گا ___؟ جب تم تخم ریزی نہیں کرو گے تو دانہ کہاں سے ملے گا؟

حصول عزت واقتدار کی تدبیر

یہ ہر شخص کے دل میں سوال ہے کہ مجھے راحت کیسے ملے؟ مجھے سکون کیسے ملے ___؟ مجھے عزت اور عرفی حیثیت کیسے ملے ___؟ اقتدار کیسے ملے ___؟ اور عمل کے نام سے آگے کوئی بڑھنا نہیں چاہتا۔

یہ اسی کاشتکار کی سی مثال ہو گئی کہ تخیل باندھ رکھا ہے جو تخم ریزی کے زمانے میں تو پڑ کے سو گیا' اس کے گھر میں دانہ کون لائے گا ___؟ سوائے اس کے کہ وہ دکان دکان بھیک مانگے گا کہ بھئی! میں نے تو اپنی زمین میں نہیں اگایا' تم خدا کے واسطے ایک ڈھیری مجھے دے دو' خدا کے واسطے ایک ٹکڑا دے دو' وہی مثال ہماری ہو گئی کہ جو کام کرنے کا وقت ہے وہ تو ہم آرام میں ضائع کر رہے ہیں' نہ دین کی خبر' نہ احکام کی خبر' نہ خدا کے اور رسولؐ کے اتباع کی خبر۔ نہ وہ معاہدہ یاد ہے جو اللہ سے کر کے آئے ہیں۔ اور جب کچھ نہیں کیا اور فتنے آگے پڑے' اقتدار بھی چھنا' دولت بھی چھنی اور ملک بھی چھنا' اب بھیک مانگتے پھر رہے ہیں کہ ہمیں فلاں ریاست دے دو ___ فلاں ملک دے دو۔

ملک وریاست' دولت وعزت کے ملنے کے جو اسباب تھے ان اسباب سے کنارہ کشی اختیار کرلی' اب کہتے ہیں کہ کیا تدبیر کی جائے؟

تدبیر موجود ہے' کرنے کا بھی وقت ہے۔ تدبیر بنانے کی ضرورت نہیں' وہ تو بنی بنائی اللہ نے اتار دی تھی۔

کفر کے دست نگر اسلامی ممالک

غرض جب آپ نے عہد کی خلاف ورزی کی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم پر بھی ضروری نہیں کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں' وہ وعدہ تو اس شرط سے مشروط تھا کہ تم ہماری بندگی کرو' تم قانون خداوندی پر عمل کرو' تم اپنی زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا دستور اپناؤ ___ ان کی حیات اور دستور زندگی کو مشعل راہ بناؤ ___ اور تم یہ وعدہ کرکے آئے تھے' جب تم نے یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ تو ہم پر کب وعدہ پورا کرنے کی پابندی رہی کہ تمہیں اقتدار بھی دیں' عزت بھی دیں اور رزق بھی دیں۔

اسی لئے یہ چیزیں ہاتھ سے چھننی شروع ہوئیں۔ ملک ہاتھ سے چھننا شروع ہوئے' آج یہ ملک نکل گیا ___ کل یہ نکل گیا۔

اور نہیں بھی نکلا تو اقتدار خود آپ کا نہیں' اقتدار اب غیروں کا ہے۔ آپ اپنے ملک میں رہ کر کچھ نہیں کرسکتے' جب تک ان غیروں کا منشاء نہ ہو تو آپ ان کے منشاء کے غلام اور تابع بنے۔

کہنے کو آپ کہتے رہیں کہ صاحب! ہمارا ملک آزاد ہے اور ہمارا اقتدار ہے ___ مگر تمہارا اقتدار کیا ہے؟ پیسوں کے تم محتاج ہو' وہ اگر یوں کہیں کہ جب تک تم فلاں بندی نہیں کرو گے' ہم قرضہ نہیں دیں گے۔ تمہیں جھک مار کے کرنی پڑ رہی ہے۔

یہ کون سا اقتدار ہے ___؟ یہ کون سی آزادی ہے؟

آزادیٔ اقتدار

اقتدار اسی کا نام ہے کہ "اپنی قدرت سے قادر ہو۔" "قادر بقدرت الغیر" کو قادر نہیں کہتے ___ کیا آپ قادر ہیں جب تک دوسرے کی قدرت استعمال نہ کریں ___؟ یہ کون سی قدرت ہے؟ قدرت وہ ہے کہ اپنے اندر ہو اور آپ اپنی من مانی کارروائی کرسکیں۔ جی چاہے بات کرسکیں۔ یہ قدرت نہیں تو آپ قادر ہی کب رہے؟

ملک اگر آزاد بھی ہو' ہندوستان ہو' پاکستان ہو' کچھ بھی ہو۔ اور انتظام واثرات غیروں کے غالب ہوں جب تک وہ مدد نہ کریں۔ چل نہیں سکتے۔ اسے اقتدار تھوڑا ہی کہتے ہیں۔

اس کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر چیز میں دوسروں کے محتاج ہیں۔ روٹی' رزق اور ٹکڑے میں' عزت اور اقتدار میں۔

پارٹی بندی کا انجام

تو سوال یہ ہے کہ اس بے رزقی اور بے عزتی کے بارے میں آپ کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ہم نے معاہدے کی کوئی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟

یہ شکایت رہتی ہے کہ اللہ نے ہمیں اقتدار کیوں نہیں دیا ___؟ ہمارے ملک کیوں چھین لئے؟ ہماری عزت کیوں چھین لی؟ ہماری روٹی کیوں چھین لی؟ کیوں ہم بھیک مانگتے پھر رہے ہیں ___؟ ___ اللہ کی نسبت تو خیال آتا ہے۔ اپنی نسبت خیال نہیں آتا کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے ___ بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم کے کہ ۔

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

جو آفت آتی ہے' وہ انہیں پر آتی ہے۔ اب روتے ہیں ___ یہ نہیں سوچتے کہ یہ برق آئی کیوں ___؟ یوں کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے بھیج دی' اللہ میاں نے بھیجی۔ مگر کب بھیجی؟ جب تم اللہ میاں کے نہ رہے۔ وہ بجلی ہی گرائیں گے' وہ تو قحط سالی ہی رکھیں گے' وہ تو رزق چھین لیں گے۔ تم نے معاہدہ توڑ دیا' انہوں نے بھی وعدہ پورا نہیں کیا' وعدہ جب ہی تک ہے جب کہ شرط ایمان و عمل صالح کی پوری ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ

"تو ایمان و عمل صالح اور باہمی اعتماد و محبت کی شرط پوری ہو تو ایفائے وعدہ ہو گا"۔

ہمیں آپ کو تو لڑنے سے ہی فرصت نہیں۔ اتحاد تو کہاں رہے گا؟ اختلاف اور نزاع ہر چیز میں ہے۔ اب گویا مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر چیز میں لڑتا جھگڑتا رہے' کوئی مسئلہ آئے گا تب کھڑے ہو کر لڑیں گے' کوئی حکم شرعی ہو گا' اس میں کھڑے ہو کے لڑیں گے۔ ہر چیز میں لڑائی' ہر چیز میں پارٹی بندی' ہر چیز میں نکتہ چینی اس قوم کا تو پھر یہی انجام ہونا ہے کہ وہ روتی پھرے۔

قومی غفلت

یہ سوال ہر ایک کے دل میں ہوتا ہے کہ صاحب! ان فتنوں میں گرفتار ہیں' کیا کریں مگر دل میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے فتنے برسا دیئے۔ بس اللہ کی شکایت ذہن میں آتی ہے۔ اپنے نفس کی کوئی شکایت ذہن میں نہیں آتی کہ میں نے کیا کیا۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ اس سے بری ہے کہ کوئی اس کا شکوہ کرے' اس کے ہاں تو دروازے کھلے ہوئے ہیں' لینے والا کوئی ہونا چاہئے ___؟ اقبال نے ایک جگہ "جواب شکوہ" میں کہا ہے۔ جو گویا اللہ کی طرف سے شکوہ کا جواب آیا ہے کہ ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں' کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے' رہرو منزل ہی نہیں

جب کوئی سوال کرنے والا ہی نہ ہو تو وہ کیسے دے۔

حدیث شریف میں ہے کہ روزانہ اخیر تہائی رات میں حق تعالیٰ کی تجلیات آسمان دنیا پر اترتی ہیں اور ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ ۔

انا الرازق من ذاالذی یسترزقنی
انا الغافر من ذاالذی یستغفرنی

میں رزق دینے والا ہوں' کوئی ہے رزق مانگنے والا ___؟
میں مغفرتیں کرنے والا ہوں' کوئی ہے مغفرت مانگنے والا ___؟

جن کو اللہ نے توفیق دی وہ مانگتے ہیں اور انہیں شخصی طور پر ملتا بھی ہے۔

لیکن قوم غافل ہے' نہ وہ مانگتی ہے' نہ اسے ملتا ہے ___ غرض ہاتھ پھیلا کر کہہ رہے ہیں کوئی ہے مانگنے والا ___؟ تو صحیح ہے کہ ــــ

ہم تو مائل بہ کرم ہیں' کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے' رہرو منزل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی' یہ وہ گل ہی نہیں

جس مٹی سے انسان کو بنایا گیا تھا' اس مٹی میں ہی پیداوار نہ رہے ___ تو شیطانی روح حلول کر گئی تو نصب العین شیطان سے مل گیا۔ آدم سے کہاں باقی رہا؟

زندگی کا جائزہ لینے کی ضرورت

اب ذہن میں یہ تو آتا ہے کہ اللہ میاں نے دوسری اقوام کو سب کچھ دے دیا' اور ہم سے سب کچھ چھین لیا ___ یہ نہیں آتا کہ کیوں چھینا ___؟ اور ہم نے کیا کیا ___؟ تو سب سے بڑی ضرورت اس کی ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لیا جائے' ہمارا فرض ہے کہ زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر گزاریں اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک تھوڑی بہت تعلیم نہ ہو اور تھوڑی بہت تربیت نہ ہو ___ سنتیں آسمان سے برستی تھوڑا ہی ہیں کہ وہ گھر گھر میں اتریں۔ وہ تو تعلیم کے راستے سے آتی ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیم کا فقدان ہو گیا ___ کتنے ہیں ہم میں جو واقعی قرآن کریم کو اس نیت سے پڑھتے یا سنتے ہیں کہ ہمیں عمل نصیب ہو جائے؟

بہت سے وہ ہیں جو پڑھنا ہی نہیں جانتے' انہوں نے تعلیم ہی نہیں پائی' لفظوں کی بھی تعلیم نہیں ___ معنی کی بات تو الگ ہے اور مفہوم کی الگ ہے۔ سو میں ننانوے وہ نکلیں گے جنہیں مس بھی نہیں کہ دین کیا چیز ہے مگر مدعی دین بن کر کھڑے ہو جائیں گے کہ صاحب! ہم دین دار ہیں ___ شاید سو میں کوئی دو چار گنے چنے نکل آئیں گے ___ تو قوم' نیک قوم تب کہلاتی ہے جب اس کی اکثریت نیکی پر ہو۔ ہزار دو ہزار میں سے اگر دس بیس اشخاص نکل آئیں تو وہ قوم کی سربلندی نہیں ہے۔ وہ ان اشخاص کی سربلندی ہے' قوم کی سربلندی جب ہو گی جب کم سے کم اکثریت تو آئے۔ برابر سرابر تو ہو۔ اب ہماری کیفیت یہ ہے کہ :

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ

مؤمنین کم ہیں۔ فسّاق و فجّار زیادہ ہیں۔ اور جتنے مؤمن ہیں ان کے بارے میں قرآن کریم نے شکایت کی ہے کہ :

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ

بہت سے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ حقیقت میں مشرک ہیں۔ دلوں کے اندر وہی غیر اللہ کی عظمت جمی ہوئی ہے۔ مالک کی عظمت نہیں ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ پیر مجھے اولاد دے گا' کوئی کہہ رہا ہے فقیر مجھے منہ مانگی مراد دے دے گا۔ جو اللہ کی عظمت تھی وہ فقراء اور اشخاص کے سپرد کر دی۔ اس میں قوم کا کیسے بیڑا پار ہو گا؟ تو یہ طلب ہوتی ہے کہ فتنوں سے بچنے کی صورت بتائی جائے یہ نہیں ہوتی کہ ہمیں بھی کچھ کرنا چاہئے۔

کم ہمتی کی انتہا

اور بڑے سے بڑا کام کریں گے تو یہ کہ صاحب! کہ ایک تعویذ لکھ دیں' دکان میں برکت ہو جائے ___ میں نے کہا تجھے کچھ نہ کرنا پڑے' جو کرے بس تعویذ کھڑا ہو کر کرے' تم اپنا آرام سے بیٹھے رہو ___ تو عمل کی خو جاتی رہی' بس تعویذ سب کچھ بنادے گا ___ یا کوئی دعا لٹکادی' دعا بھی جبھی کار آمد ہوتی ہے جب اپنے اندر کچھ جان ہو۔ ورنہ ایسا ہے جیسے کوئی کسی کے پاس جائے کہ حضرت! دعا کرو کہ میرے اولاد ہو جائے۔ اور نکاح کا نام نہیں۔ بیوی پاس نہیں ___ بھئی! دعا بھی جبھی کار آمد ہوتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرے۔ دعا نتیجے کے لئے کرائی جاتی ہے کہ اسباب پر ثمرہ مرتب ہو جائے' یہ نہیں ہوتا کہ اسباب بھی دعا ہی سے مہیا ہو جائیں گے مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا کہ :

''حضرت! مجھے نماز پڑھنے کے لئے تعویذ لکھ دو!''

حضرت نے فرمایا۔ ''بھئی مجھے ایسا کوئی تعویذ لکھنا نہیں آتا کہ میں تعویذ لکھ کے اس میں دو سپاہی بھی بٹھادوں کہ جہاں نماز کا وقت آیا اور وہ ڈنڈا لے کر تیرے سر پر ہو جائیں کہ چل مسجد میں ___ میرے پاس ایسا تعویذ نہیں ہے کہ اس میں دو سپاہی بھی بیٹھے ہوئے ہوں ___ اور پھر اس کو ڈانٹا کہ :

''نالائق! جو تیرے کرنے کا کام ہے۔ وہ بھی تعویذ ہی کرے۔ تجھے اپنی چارپائی سے ہلنا نہ پڑے۔ تو آرام سے پڑا رہے' بس تعویذ سب کچھ کردے گا''۔

تو تعویذ کار آمد ہے مگر جبھی جب آپ اسباب مہیا کرلیں۔ نتیجے کے لئے تعویذ ہوتا ہے' دعا ہوتی ہے کہ اللہ ثمرہ مرتب کردے' یہ محنت رائیگاں نہ جائے' محنت کے لئے تعویذ تھوڑا ہی بنایا جاتا ہے کہ صاحب! مجھ سے عمل کرالو۔ کان پکڑ کے مجھ سے عمل کرادو' عمل تو آپ کی ہمت کرے گی۔ دوسرے کے کان پکڑنے سے عمل تھوڑا ہی ہوتا ہے۔

عزم و ہمت کی ضرورت

اصل چیز دین میں صرف ہمت ہے۔ آدمی عزم باندھ لے کہ یہ مجھے کرنا ہے کہ پھر مدد خداوندی ہوتی ہے۔ اور وہ کر گزرتا ہے۔ ڈاواں ڈول رہے۔ عزم ہی نہیں اس کی مدد بھی نہیں ہوتی' تو آپ کے دلوں میں تمنا تو ہے کہ فتنے رفع ہوں مگر دل میں عزم نہیں ہے کہ آپ انہیں رفع کردیں گے۔

اس لئے عزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے ___ دنیوی معاملات میں بھی اگر محض تمنا ہو کہ مجھے ماہوار ہزار روپیہ آمدنی ہو' کبھی نہیں ہوگی' لیکن جب عزم کریں گے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار کمانا ہے۔ چاہے تجارت کرنی پڑے' چاہے زراعت کرنی پڑے' چاہے ملازمت کرنی پڑے۔ مجھے ایک ہزار کی آمدنی کرنی ہے۔ اور اس کام میں آپ لگ گئے تو مدد خداوندی ہوگی۔ ضرور ایک ہزار کی آمدنی ہو جائے گی۔

لیکن اگر نہ دکان پر جائیں' نہ دفتر میں جائیں' نہ کھیت میں جائیں اور تمنا یہ ہے کہ مجھے ہزار روپیہ ماہوار ملے تو ایک ہزار روپیہ ماہوار کی کوئی بارش تھوڑا ہی برسے گی؟ کئے کرنے سے آئے گا۔

بلا اسباب دعا مؤثر نہیں

دعا بھی جبھی کام دیتی ہے جب آدمی اسباب مہیا کرا کے دعا کرائے کہ صاحب! اتنا کام تو میں نے کردیا کہ

میں وضو کر کے پانچ وقت مسجد میں جاتا ہوں۔ آپ دعا کیجئے کہ میں اس پر جما رہوں، مستقیم رہوں۔ اس کی دعا ہو سکتی ہے ــــ لیکن یہ کہ میرا ارادہ تو نماز پڑھنے کا ہے نہیں۔ آپ دعا کر دیں کہ نمازی ہو جاؤں۔ ایسا بھی دنیا کا کوئی دستور اور فطرت ہے؟

اسی واسطے ایسی دعا کرنے کی ممانعت کی گئی ہے جس کو مشیت کے اوپر محول کیا جائے۔ یوں کہا جائے:

اللھم اغفرلی ان شئت اللھم ارحمنی ان شئت

"اے اللہ! میری مغفرت فرمادے، اگر تو چاہے، اے اللہ میرے اوپر رحم فرما اگر تو چاہے"۔

رحم و مغفرت تو وہ جبھی کریں گے، جب چاہیں گے۔ آپ کا یہ کہنا کہ "اگر آپ چاہیں میری مغفرت کردیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تو ضرورت ہے نہیں آپ کی مغفرت کی، آپ چاہیں تو مغفرت کردیں، یا یہ کہ مجھے تو آپ کی رحمت کی ضرورت نہیں ہے، آپ چاہیں تو میرے اوپر رحم کردیں، اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ دعا کو مشیت کے ساتھ مقید کر کے دعا مت مانگو کہ آپ چاہیں تو دے دو۔ مجھے تو ضرورت نہیں ہے ــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ــــ فرمایا کہ دعا مانگو اس الحاح اور قوت کے ساتھ کہ ہم لے کر اٹھیں گے۔ کریم کے دروازے پر آئے ہیں۔ محروم ہو کر نہیں جائیں گے، تو لیچڑ بن کے دعا مانگو تو دعا ضرور قبول ہوگی اور ملے گا ــــ تو سائل بنیں اور لیچڑ بن کر سوال کریں اور چوکھٹ پر سر ٹیک دیں کہ میں بغیر لئے کے اٹھوں گا نہیں ــــ تو ایسے بندے کی دعا بے شک قبول ہوتی ہے۔

وہاں حج پر ہم نے دیکھا کہ بیت اللہ میں ایک بدوی حاضر ہوا۔ بالکل بے پڑھا لکھا ــــ اور صاحب! اس نے جو دعا مانگی عجیب تھی ــــ اس نے کہا:

یا رب البیت یا رب البیت جئتک والاھل لی البیت ان تغفرلی ان تغفرلی

"اے اللہ! میں تیرے گھر میں آگیا ہوں اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر آیا ہوں"۔

گویا بڑا احسان کیا ــــ تو بیوی بچوں کو چھوڑ کے آیا ہوں، وہ گھر میں ہیں اور میں تیرے گھر میں آگیا۔ لہٰذا بخشنا پڑے گا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں بلا مغفرت کے جاؤں، میں تو مغفرت لے کر جاؤں گا ــــ واقعی ایسے کو مغفرت ملتی ہے ــــ غرض الحاح بھی ہو، زاری بھی ہو، قلب کا جھکاؤ بھی ہو، قلب کے اضطراب سے دعا ہو:

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ

"جو مضطر ہو کر الحاح تام کے ساتھ دعا مانگے گا، ہم ضرور برائی رفع کریں گے، اس کے اوپر سے فتنہ ضرور ہٹائیں گے ــــ اور زمین کی قوت و خلافت بھی دیں گے اور اقتدار بھی دیں گے"۔

تو مانگنے والا ہو، قول سے بھی مانگے، عمل سے بھی مانگے ــــ عمل کرے تو وہ کرے جس میں شرک کا شائبہ نہ ہو، اور دعا وہ مانگے جس میں استغناء کا شائبہ نہ ہو، لیچڑ بن کر مانگے، تو ضرور ملتا ہے ــــ تو اب آپ دعا سے بھی مستغنی، تعلیم سے بھی مستغنی، تربیت سے بھی مستغنی، پڑھنے لکھنے سے مستغنی، محنت سے مستغنی، اور تمنا یہ ہے کہ سب کچھ ملے۔ یہ فطرت اللہ کے خلاف ہے۔

عزت واقتدار کا قانون عام

دنیا میں حق تعالیٰ کی کسی سے رشتہ داری تھوڑا ہی ہے کہ اس قوم کو ضرور اقتدار دیں گے' انہوں نے تو اصول وقوانین بیان کردیئے' جو ان پر چلے گا اسے ملے گا' جو نہیں چلے گا' نہیں ملے گا۔ قانون عام کا اعلان کردیا :

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ

''مسلمان ہوں یا صابی ہوں' یہودی ہوں یا نصرانی ہوں، مجوسی ہوں یا کسی اور قوم کا ہو' جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرلے گا' اس کے لئے اجر بھی ہے نہ پھر خوف رہے گا' نہ غم رہے گا' نہ اسے محرومی رہے گی''۔

تو تدبیر تو یہ آگئی' اب آپ کو کیا تدبیر بتائی جائے؟ اور کیا کہا جائے؟ اور کون آکر کہے؟ کیا حضرت جبرئیل کہنے کے لئے آئیں گے؟ ___ نہیں۔ اللہ نے اپنی کتاب اتاردی' پڑھو' علم حاصل کرو اور احکام معلوم کرو تعلیم نہیں پائی' علماء سے پوچھ پوچھ کر احکام حاصل کرو' مگر اتباع کا جذبہ رکھو کہ پابندی کریں گے ___ خواہ پڑھنے سے ہم معلومات حاصل کریں' خواہ مطالعہ سے ہم معلومات حاصل کریں' خواہ علماء سے فتوے لے لے کر ہم معلومات حاصل کریں۔ سوال کر کر کے اپنی تشفی کریں' ہمیں عمل کرنا ہے۔ اور اتنا علم ہم نے حاصل کرنا ہے جس پر ہم عمل کرسکیں۔ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ خواہ کچھ بھی ہو۔ جب آدمی کے دل میں لگن ہوتی ہے تو دس طریقے اختیار کرتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ کسی عورت کا شوہر ملازمت پر گیا' اور وہ سینکڑوں ہزاروں میلوں کے فاصلے پر تھا۔ عورت کو خاوند سے محبت تھی۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھی۔ اگر خاوند کا خط آتا' چونکہ خود پڑھی لکھی نہیں تھی مگر چونکہ خاوند کی لگن اور محبت تھی تو محلے میں پھرتی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ مجھے پڑھ کے سنادے کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اگر دل میں لگن نہ ہوتی تو وہ کبھی بھی گھروں کو جا کے نہ جھانکتی' تو بے پڑھی لکھی تھی' مگر چونکہ خاوند سے محبت تھی' اس کا کارڈ کا ایک پرزا آیا تو گھر گھر پھر رہی ہے کہ اللہ کے واسطے اس کا مضمون سنادو کہ میرے خاوند نے کیا لکھا ہے۔ اس لئے کہ لگن ہے۔

اللہ کا آپ کے گھر خط آیا ___ اور وہ قرآن کریم ہے جو اللہ کا فرمان ہے۔ اگر آپ کے دل میں لگن ہوتی اور علم نہ ہوتا' آپ علم کے گھر گھر' مدرسے مدرسے جھانکتے پھرتے کہ اس کا مجھ مطلب سمجھادو' یہ میرے مالک کا فرمان ہے۔ میرے مالک کا خط آیا ہوا ہے۔ غرض لگن ہو تو سب کچھ ہوتا ہے اور لگن نہ ہو تو پھر آدمی مگن نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے اندر کڑھن ہوتی ہے اور پریشانی ہوتی ہے۔

خاصیت ذکر اللہ

صاف فرمادیا گیا :

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

اگر تم دلوں کا اطمینان اور سکون چاہتے ہو تو ذکر اللہ میں لگو' ہماری یاد میں لگو' ہم سکون دیں گے۔ ذکر اللہ میں سکون مخفی ہے۔ دنیا کے لاکھ اسباب آپ جمع کر لیں۔ سکون قلب کبھی میسر نہیں ہو گا۔ جو آج تمام اسباب ووسائل کو جمع کئے ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے زیادہ پریشان خاطر ہیں' ہر وقت ڈانواں ڈول ہیں کہ یہ اسباب چھوٹ نہ جائیں' اقتدار کہیں چلا نہ جائے۔ رات دن مصیبت میں مبتلا ہیں ___ اور جو اللہ کا ذکر کر کے ان پر اعتماد کئے ہوئے ہیں ان کو کوئی فکر نہیں ہے نہایت مطمئن اور ساکن القلب ہیں۔

آپ سکون قلب غیر اللہ میں اور دنیا کے وسائل میں تلاش کریں۔ وہ کبھی میسر نہیں ہو گا' ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کی یاد ہو۔ اس سے دل کو سکون آتا ہے' آپ گھروں کے اندر کتنا ہی پریشان ہوں' مصیبت زدہ اور مبتلا ہوں مگر جب مسجد میں آتے ہیں ایک سجدہ کرتے ہیں دل ٹھہر جاتا ہے کہ میں نے اپنے مالک کے آگے عرض معروض کر دی' تو گھر میں سکون نہیں ہوتا' مسجد میں آ کے ہو جاتا ہے تو ذکر اللہ کا خاصہ قلب کا سکون ہے۔

ذکر اللہ اور اسٹالن

یہ جو اسٹالن تھا جو کمیونسٹوں کا امام ہے جس نے کمیونزم ایجاد کیا' جب یہ مرنے لگا تو خدا کا تو بالکل منکر تھا۔ دین ومذہب کا انکار کرتا تھا جب مرنے لگا تو اس کی زبان سے اللہ اللہ جاری ہوا اور یہ کہنا اس نے شروع کیا۔

لوگوں نے کہا بھئی! تو تو خدا کے وجود کا انکار کرتا تھا' اب تو کیسے کہہ رہا ہے؟ ___ اس نے کہا' میں اب بھی انکار کرتا ہوں ___ کمبخت محروم تھا ___ اس لئے کہا کہ اب بھی انکار کرتا ہوں مگر اسے کیا کروں کہ دل میں سکون اسی نام سے ہوتا ہے۔

اور سکون کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اگر میں گنیوں کا نام لوں' روپے کا نام لوں' قلعوں کا نام لوں سکون نہیں ہوتا' ساری چیزیں مجھ سے جدا ہونے والی ہیں' چھنے والی ہیں' جب یہ نام لیتا ہوں دل ٹھہر جاتا ہے۔ تو میں منکر ہوں۔ مگر اس کے باوجود سکون قلب اسی سے میسر آتا ہے۔

تو ایک دھریہ اور ملحد تو اس کا احساس کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔ اور ایک ماننے والا مسلم اقرار نہ کرے کہ سکون اللہ کے نام میں ہے۔ نہ وہ فکر کرے' نہ وہ ذکر اللہ کرے' نہ دل میں یادداشت رکھے تو جب مسلمان اتنے غافل بن جائیں گے تو انہیں سکون کے ثمرات اور رزق کے اسباب اور اقتدار کے اسباب کہاں سے ملیں گے۔

تو میرے بھائی نے یہ درخواست کی تھی کہ مسلمان مصائب میں گرفتار ہیں ___ کیا علاج کریں؟

بھئی علاج یہ ہے جو میں نے عرض کیا ہے ___ سب کے لئے ضروری نہیں کہ سارے علماء بن جائیں اور سب کے سب امام غزالی بن جائیں۔

ادائیگی فرض

مگر اتنا ضروری ہے کہ اللہ نے جو سب کے لئے فرائض رکھے ہیں ان کی تو پابندی شروع کرو' پانچ وقت کی نماز پڑھو' اگر صاحب نصاب اور صاحب استطاعت ہو' زکوۃ اور صدقات سے اپنے بھائیوں کی خدمت کرو۔ روزہ رکھ کر اپنے نفس کو پاک کرو' اگر استطاعت ہو تو حج کر کے اپنے عشق کے جذبات ابھارو' حسن سلوک

سے پیش آؤ' ہر ایک سے محبت سے پیش آؤ ___ حسن ظن رکھو۔ دیکھو پھر قوم جڑتی ہے یا نہیں جڑتی؟

ہر ایک کے دل میں جو بد ظنی ہے کہ وہ نکما ہے اور ناکارہ ہے۔ بس میں کار آمد ہوں۔ وہ بھی نالائق اور مجھ میں لیاقت ہے۔ جب یہ جذبات ہوں گے۔ محبت باہمی کیسے پیدا ہوگی ___ ؟ اپنی برائی سامنے نہیں اور دنیا کی برائیاں سامنے ہیں اور ہم ایسے مقدس ہیں کہ ہم میں کوئی برائی نہیں۔ ساری برائیاں دنیا کے انسانوں میں ہیں۔ تو یہ سب سے بد ظنی ہے تو بد ظنی سے نہ کوئی اتحاد قائم ہوتا ہے نہ کوئی محبت قائم ہوتی ہے' تو حسن ظن سب سے بڑی چیز ہے کہ اپنے کو کمتر سمجھے اور دوسرے کو اعلیٰ سمجھے' اس سے حسن ظن پیدا ہوگا۔

معیار اقتداء

آپ کا آخری بادشاہ ظفر جو مغلیہ خاندان کا آخری تاجدار تھا۔ کچھ تو اپنی ذات سے بھی صوفی منش اور کچھ حالات نے بھی غریب کو صوفی بنادیا تھا ___ اس نے ایک قطعہ کہا ہے۔ وہ واقعی بڑی عبرت کا ہے ___ وہ کہتا ہے ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

دنیا کو آپ برا جب ہی سمجھیں گے جب اپنی برائی سامنے نہ ہو' جب اپنے عیب سامنے ہوں' ہر ایک آپ کو پاک صاف اور پاکیزہ نظر آئے گا' اب یہ کہ ع

ہر کسے ناصح برائے دیگراں

جب دیکھو دوسرے کو نصیحت کر رہا ہے خود اپنے کو بھلائے ہوئے ہے۔ اس سے کام نہیں چلتا' دنیا کے بارے میں ہمیشہ اپنے سے کمتر کے بارے میں نظر رہنی چاہئے کہ اس بے چارے کو تو سو روپے ماہوار کی آمدنی ہے اور مجھے ہزار پانچ سو روپے کی آمدنی ہے۔ آدمی شکر کرے ___ اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر پر نظر ہونی چاہئے کہ یہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا ہے۔ افسوس مجھے توفیق نہیں ___ تو دنیا کے بارے میں اپنے سے کم تر کو دیکھے' اور دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھے تاکہ ازدیاد رغبت پیدا ہو۔

اب لوگوں نے بالکل قصہ برعکس کر دیا کہ دین کے بارے میں تو اپنے سے کمتر کی اقتداء کرتے ہیں۔ میری نمازیں بہت ہیں۔ یہ تو نالائق آدمی ہے' اس کی نہ نماز پوری نہ کچھ' اور دنیا کے بارے میں اپنے سے برتر کے اوپر نگاہ رکھتے ہیں کہ مجھے سو روپے کی آمدنی ہے۔ مجھے دو سو کی چاہئے۔ جس سے حرص بڑھتی ہے اور حرص کا انجام برا نکلتا ہے۔ غرض لوگوں نے قصہ الٹ کر دیا۔

بہرحال دین کے بارے میں اپنے سے برتر کو دیکھا جائے' تاکہ دین کی حرص پیدا ہو اور دنیا کے بارے میں اپنے سے کمتر کو دیکھو تاکہ شکر کا جذبہ پیدا ہو کہ مجھے خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ اس لئے ظفر نے کہا کہ ؎

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنی خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی خرابیوں پر جو نظر

تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اور آگے کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحب فہم وذکا

کہ بڑا مدبر، لیڈر، دانشمند، ذہین ہو اس کو آدمی نہ جانئے گا۔ تو کہتا ہے کہ ؎

ظفر آدمی اس کو نہ جانیئے گا
گو ہو کیسا ہی صاحب فہم وذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

وہ آدمی نہیں ہے عیش میں آدمی اس پر نگاہ کرے کہ جو دینے والا ہے اس کا حق ادا کروں، اس سے ڈرتا رہوں، جسے دینا آتا ہے اسے چھیننا بھی آتا ہے۔ جتنا آدمی شکر ادا کرے گا۔ اسے زیادہ لے گا، کفران نعمت کرے گا وہ نعمت چھین لی جائے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ ہے :

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ

جتنا نعمت پر شکر کرو گے، میں نعمت کو بڑھاؤں گا۔

وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ

اور اگر تم نے کفران نعمت کیا تو میرا عذاب بھی دردناک ہے۔ پھر وہ ساری نعمتیں چھنی جائیں گی۔

مسلم کے لئے اسبابِ اقتدار

سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ حسنِ ظن رکھے، اس کی اطاعت میں رہ کر تھوڑی عبادت پر بھی شکر بہت کرے، تاکہ وہ عبادت بڑھتی جائے، اپنی اطاعت پر غرہ نہ کرے کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدمی نماز پڑھ کے یا کچھ ذکر کر کے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ میں نے نماز پڑھی، میں نے تلاوت کی میں نے ذکر کیا، گویا غرور اور اتراہٹ ہے کہ میں نے بڑا کام کیا ___ فرماتے ہیں ___ نالائق! تو نے کیا کام کیا؟ ارے طاقت میں نے بخشی تھی، ارادہ میں نے پیدا کیا تھا۔ اسباب میں نے مہیا کئے، تو نے کیا کیا۔ غرض جتنا کیا اسے بھی رد کر دیتے ہیں۔

اور اگر سب کچھ کر کے یوں کہے کہ اے اللہ! مجھ سے تو کچھ بھی نہیں بن پایا ___ فرماتے ہیں۔ نہیں چل کر مسجد تک تو ہی گیا تھا، طاقت کا استعمال تو نے ہی کیا تھا۔ حج کے لئے سفر کرنے کا ارادہ تو نے ہی کیا تھا۔ تو نے سب کچھ کر لیا، تو سب کچھ کر کے جو یوں کہتا ہے کہ کچھ نہیں کیا، اس کا جواب دیتے ہیں کہ تو نے ہی سب کچھ کیا ہے۔ تجھے سب کچھ ملے گا۔ اور اگر تھوڑا بہت کچھ کر کے یوں کہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا، اسے فرماتے ہیں۔ نالائق! تو نے کیا کام کیا۔ قوت میری تھی، ارادہ میرا تھا، مشیت میری تھی، اسباب میرے تھے، تو نے کیا کیا؟

اس لئے ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے مالک کے آگے جھکیں اور جھکنے کے بعد غرہ نہ کریں، ہر قدم پر سمجھیں کچھ نہیں ہو سکا، توبہ کریں، استغفار کریں، اور آگے بڑھیں، جب قوم میں یہ جذبہ ہو گا، قوم بڑھے گی ___

اگر یہ جذبہ نہیں ___ وہ لاکھ کرتی سوچتی رہے کبھی مرکز اقتدار پر نہیں پہنچے گی' اقتدار تمناؤں سے نہیں ملا کرتا' نہ تمناؤں سے عزت ملا کرتی ہے۔ اور نہ غیر اسباب سے عزت ملتی ہے۔ انہی اسباب سے عزت ملتی ہے۔ جنہیں اللہ نے مسلم قوم کے لئے متعین کردیا ہے۔ غیر اقوام سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ مسلم سے اور قسم کا معاملہ ہے۔ جو یہ دعویٰ کرے کہ میں آپ کا ہوں' اس کے ساتھ معاملہ اور قسم کا ہے۔

دشمن سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ

اور جو یہ کہے کہ میں آپ کا نہیں ہوں' اس کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے' دشمن ہے تو آدمی اس کی گالیوں کو بھی سہہ جاتا ہے کہتا ہے کہ دشمن ہے۔ اور اس کا کیا کام ہے۔ گالیاں ہی دے گا اور اپنا بیٹا ترچھی نگاہ سے دیکھ لے تو باپ دھول رسید کرے گا کہ تجھ سے توقع نہیں تھی ___ اس لئے مسلم کی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پر گرفت ہوتی ہے۔ تو ہمارا تھا' تیرا دعویٰ تھا کہ انا مسلم میں مطیع خداوندی ہوں اور پھر تو نے یہ حرکت کی؟

اور ایک قوم کہتی ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہی نہیں۔ اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔ انہیں سب کچھ دے دو' ایک وقت آئے گا کہ اچانک عذاب کا پنجہ ان پر گرے گا جب انہیں پتہ چل جائے گا۔ تو دشمن کو ڈھیل دیتے ہیں اور دوست کو ڈھیل نہیں دی جاتی' جو غلطی کرتا ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ سزا دی جاتی ہے۔ اور کافر کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ گالیاں بھی دے دے' دین کی تکذیب بھی کردے' دین کا مذاق بھی اڑائے' اسے ڈھیل دیتے ہیں کہ اس کے انجام کی خرابی کا وقت آرہا ہے ___ غرض میرا مطلب یہ تھا کہ بھئی! تدبیر تو سب پوچھتے ہیں لیکن یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ اس تدبیر کو عمل میں کون لائے گا؟ ___ یہ کہتے ہیں کہ عمل کے لئے یہودی اور نصرانی ہیں۔ باقی ہمیں تم تدبیر بتلادو' تاکہ ہمارے دماغ میں فرحت آجائے کہ ہمیں تدبیر معلوم ہوگئی' عمل کرنا دھرنا نہیں ہے۔ یہ دوسری قوموں کا کام ہے۔ جب دوسری قومیں کریں گی تو وہی پائیں گی بھی ___ پھر آپ رشک کیوں کرتے ہیں کہ صاحب! انہیں سب کچھ مل گیا اور ہمیں کچھ نہیں ملا۔ انہوں نے کچھ کیا تھا تو انہیں کچھ ملا' آپ نے نہیں کیا' نہیں ملا۔

تدبیر عمل

اسلام کے معنی مسلم بننے کے ہیں۔ اور مسلم کے معنی ''مطیع حق'' کے ہیں۔ جب آپ کہتے ہیں کہ میں مسلم ہوں' اس کے معنی ہیں کہ میں اپنے پروردگار کا مطیع ہوں' پھر اس اطاعت کو کرکے دکھلایئے ___ تو یہ حدیث معاذؓ میں فرمایا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا :

هل تدری ماحق الله على العباد؟

اے معاذؓ! جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے؟

وہ یہ ہے کہ :

ان يعبدوا الله ولا يشركوا به شيئاً

تو اللہ کی عبادت میں لگ جائیں' اس کے قانون پر چلیں' اس کے نبیؐ کی سنتوں کی پیروی کرو اور جذبہ و لگن ان کے دل میں یہی ہو کہ ہمیں اپنے رب کی اطاعت کرنی ہے اور غیر رب کو ہم شریک نہیں کرنا چاہتے تو یہ حق ادا کردیا۔

اس کے بعد فرمایا :

هل تدری ماحق العباد علی اللہ؟

کیا یہ جانتے ہو کہ بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟

فرمایا۔ بندوں کا حق یہ ہے کہ اس کا وعدہ ہے کہ جب تم عابد بنو گے تو میں تمہیں سب کچھ دوں گا۔ رزق معنوی بھی، رزق باطنی بھی، رزق حسی بھی، رزق ظاہری بھی ___ سبھی کچھ ملے گا، دونوں چیزیں ہاتھ آئیں گی۔ اس لئے ساری تدبیر اس ایک حدیث میں فرمادی گئی۔ اگر عمل کرنا چاہیں تو یہ ایک حدیث بھی زندگی درست کرنے کے لئے کافی ہے اور عمل نہ کرنا چاہیں تو ایک ہزار وعظ بیٹھ کر آپ سن لیں، کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا بلکہ وہ وعظ اور وبال جان بنیں گے۔

دنیادار علماء

اس واسطے کہ وعظ میں کچھ مسئلہ تو معلوم ہو گیا۔ اگر آدمی جاہل ہے اور غلطی کر جائے تو ایک غدر ہے کہ صاحب! مجھے مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ معلوم کر کے پھر نہ کرے تو یہ مصیبت اور وبال ہے۔ وہ متنبی ایک موقع پر کہتا ہے ؎

وان کنت لاتدری فتلک مصیبۃ
وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

اگر تم جانتے نہیں ہو جاہل ہو یہ ایک مصیبت ہے، اور اگر جانتے ہو اور پھر عمل نہیں کرتے تو یہ ڈبل مصیبت ہے۔

اس واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو بددعا دی ایک دفعہ اور عالم کو سات دفعہ ___ فرمایا :

ویل للجاهل مرۃ وویل للعالم سبع مرات

جاہل ایک دفعہ برباد اور، عالم سات دفعہ برباد، جو علم رکھتا ہے پھر عمل نہیں کرتا۔ اب اگر ایک عالم ہے اسے حلال وحرام اور جائز و ناجائز کا علم ہے۔ وہ اللہ ہی کی رضا کی پابندی کرے گا، غیروں کی رضا نہیں کرے گا ___ اب اگر کوئی مولوی یہ کہے کہ صاحب! مسئلہ تو بے شک یہ ہے مگر آمدنی کا تعلق فلاں سے ہے۔ لہٰذا کیا حرج ہے۔ اس کی دلداری کے لئے اس کے مطابق مسئلہ بیان کردو ___ وہ اللہ کا بندہ تھوڑا ہی رہا۔ وہ تو ابلیس کا بندہ بن گیا کہ جس سے چار پیسے مل گئے تو فتویٰ بھی اس کے مطابق دے دیا۔

وہ مسئلہ کیا ہوا۔ وہ تو موم کی ناک ہو گئی کہ جیسے دنیا کی غرضیں سامنے آتی جائیں ویسے ہی بدلتے جائیں۔ یہ عالم کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہل کا کام ہے۔ جس نے خواہ مخواہ علم کا لبادہ اوڑھ لیا ہے ___ جو واقعی عالم ہے وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔

آدمی عالم ہو اور اپنی حاجات غیروں کے آگے پیش کرے۔ اور غیروں کی رضا اتنی ہو کہ چاہے مجھے دین کا مسئلہ بھی بدلنا پڑ جائے مگر مجھے یہ چار پیسے مل جائیں۔ یہ علم اور علماء کی شان نہیں ہے۔ اور ایسے لوگ درحقیقت علماء میں بھی نہیں۔ وہ نام کے علماء ہیں۔ عالموں کا لبادہ اوڑھ لیا ہے :

وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

جان بوجھ کر عمل نہیں کرو گے تو ڈبل مصیبت ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہل کو ایک

دفعہ بددعا دی اور عالم کو سات دفعہ۔

جدوجہد کا ثمرہ

یہ چند باتیں اس سلسلہ میں عرض کرنی تھیں کہ بے شک فتنوں کی افراط ہے، پریشانیں ہر طرف سے ہیں۔ مگر وہ ہماری لائی ہوئی تو ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو نہیں برسائیں وہ تو پیدا کرنے والے ہیں۔ وہ اس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کا بندہ کسب کرے، تو کاسب بندہ ہے۔ خالق اللہ ہے۔ تم کسی کام میں جدوجہد کرو گے وہ پیدا کردیں گے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جدوجہد میں لگو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ وہ تخلیق فرمائے گا ___ تو فتنے ہیں بلاشبہ ہیں ___ مگر

اے باد صبا، ایں ہمہ آوردہ تست

یہ تمہارے ہمارے ہی لائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمادیا :

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ

کوئی مصیبت تم تک نہیں پہنچتی جب تک تم ہی اپنی کرتوت سے اس مصیبت کو اپنے اوپر لاد نہ دو، تمہارے کئے ہوئے کا یہ سب ثمرہ ہے۔ تو ہم نے جو کیا وہ کیا دھرا سامنے آگیا ___ اور اگر نیکی کا کام کریں گے اور نیکی کی راہ پر چلیں گے تو پھر دوسرا ثمرہ آجائے گا ___ ثمرہ حق تعالیٰ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں عدل ہے۔ ان کا نام ہی **العدل اللطیف الخبیر** ہے۔ ان سے زیادہ عادل کون ہے۔ تو کسی کی محنت کو وہ رائیگاں نہیں فرماتے :

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ

کسی محسن کے احسان کو اور عمل کو رد نہیں فرماتے ___ آدمی کر کے دیکھے تو اللہ پر بھروسہ کیجئے اور کچھ جدوجہد بھی کیجئے، کچھ دین کی معلومات اور تعلیم بھی حاصل کیجئے۔ کچھ اپنی تربیت کی طرف بھی متوجہ ہو جیسے کسی مربی سے تعلق پیدا کر کے اپنے اخلاق کی اصلاح کرائیے۔ تو خیر انشاء اللہ ظاہر ہوگی۔

اور اگر کچھ بھی نہ ہو تو پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں۔ اور وہ شاعر کا قطعہ ہے، وہ پڑھ لیتا ہوں ؎

ما نصیحت بجائے خود کردیم
روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس
بر رسولاں بلاغ باشد وبس

شاعر کہتا ہے کہ ہم نے اپنی جگہ بہت نصیحتیں کرلیں۔

ایک بڑا زمانہ ہم نے صرف کیا، ہم نے بڑی نصیحتیں کیں، اب اس کے بعد بھی کسی کے کان میں نصیحت نہ جائے اور دل میں نہ اترے، تو نصیحت کرنے والے کا کام تبلیغ اور پہنچادینا ہے۔ منوادینا اس کا کام نہیں ہے۔ آدمی مانے گا تو اپنے اندرونی جذبے اور دیانت سے مانے گا ___ اس واسطے تدبیر میں نے عرض کردی، عمل آپ کو کرنا ہوگا۔ اب یہ کہ تدبیر بھی بتلاؤں اور عمل بھی میں کراوں ___ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ بھئی میرے عمل کرنے سے پوری قوم تر جائے گی تو چلو یہ بھی ہو جاتا، مگر قوم ہی کے عمل کرنے سے قوم ترے گی، کسی ایک کے عمل کرنے سے کسی دوسرے کو نجات تھوڑا ہی مل جائے گی۔

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى

جو سعی کرے گا وہی انسان پائے گا' سعی تو ایک کرے اور دوسرے کو مل جائے' یہ سنت اللہ کے خلاف ہے جو کرے گا۔ اسی کو ملے گا ۔۔۔ اس واسطے اب میں ختم کرتا ہوں' فتنے اور مصائب واقعی ہیں۔ ان کا علاج جو واقعی ہے وہ عرض کر دیا گیا' اس کی تفصیلات پھر آپ علماء سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس عمل کو کس طرح کریں ۔۔۔ اس عمل کو کس طرح کریں ۔۔۔ مثلاً ایک عمل عبادت کا ہے تو پوچھنا پڑے گا کہ کس طرح سے نماز پڑھیں۔ ایک عمل اجتماعیات کا ہے کہ دنیا کی قوموں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ یہ بھی قرآن کریم سے پوچھے اس نے بتلا دیا ہے۔ ایک عمل سیاست کا ہے کہ سیاسی تدبیریں کیا ہوتی ہیں۔ وہ بھی قرآن کریم نے بتلا دی ہیں کہ وہ یہ ہیں جن سے قوم اقتدار پاتی ہے۔ تو سب کچھ ہے ۔۔۔ مگر یہ اسی کے لئے ہے جو کچھ کرے۔

ایمان کے سونے کی ضرورت

اگر ہم یوں کہیں کہ آپ خالی جیب جا رہے ہیں۔ تو بازار میں چاہے کروڑوں روپے کا مال بھرا پڑا ہے۔ تو یہ ٹھیک ہوگا اس لئے کہ جیب خالی ہے' وہاں سے تو وہ سامان لے کر آئے گا جو جیب میں پیسے لے کر جائے گا ۔۔۔ تو اگر آپ بازار گئے اور ہم یوں کہیں کہ اس بازار میں کچھ نہیں' کوے اڑ رہے ہیں کوئی سامان نہیں ۔۔۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چاہے لاکھوں کا سامان ہو مگر تیرے لئے کچھ نہیں' اس لئے کہ تیری جیب میں پیسہ نہیں' پیسہ ہوگا تو بھی کچھ لے کے آئے گا۔

غرض دل کے جیب میں ایمان کا سونا ہونا چاہئے ۔۔۔ ایمان کا جذبہ ہونا چاہئے' پھر دنیا کے بازار میں سب کچھ ملے گا' اور اگر دل خالی کر کے جا رہے ہیں جس میں ایمان باللہ نہیں' عمل صالح' پیروی سنت نہیں' پھر دنیا چاہے کروڑوں کی ہو مگر آپ کے لئے کچھ نہیں' خالی ہاتھ واپس آنا پڑے گا۔

دعا

اللہ تعالیٰ ہمیں نیک عمل کی' عبرت پکڑنے کی' عمل کا جذبہ اختیار کرنے کی' عمل کی ہمت باندھنے کی' ہمت کے اسباب پیدا کرنے کی' صحبت صالحین اختیار کرنے کی' مطالعہ اختیار کرنے کی' سوال کرنے کی' ان سب چیزوں کی توفیق دے' جن سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور عمل میں ترقی ہوتی ہے۔

اللھم ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم'

اللھم ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریتنا قرۃ واعین واجعلنا للمتقین اماما

اللھم ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین۔

اللھم وتوفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین

صلی اللہ تعالیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین

برحمتک یا ارحم الراحمین

تنبیہہ

یہ دعا بھی کردی ہے۔ اور یہ عزم لے کر جایئے کہ اس پر عمل کرنا ہے' اس کی ٹوہ میں لگنا ہے۔ ہمیں دینی اور اخلاقی معلومات حاصل کرنی ہیں۔ پھر ان شاء اللہ مدد خداوندی ہوگی ___ اور ایک بات یہ بھی عرض کرنی ہے کہ عام طور سے عادت یہ ہے کہ لوگ مصافحہ کیا کرتے ہیں ___ تو میں کمزور ہو رہا ہوں۔ اور ضعیف ہو رہا ہوں۔ آپ میں سے تو ہر ایک کو ایک دفعہ ہاتھ ملانا پڑے گا' مجھے پانچ سو دفعہ' میرے اندر طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا مصافحہ سے معاف رکھیں اور گزر جانے دیں۔ بس دل مل گئے' یہ کافی ہے۔ ہاتھ ملانے کی ضرورت نہیں۔

وصلی اللہ علیٰ نبینا ورسولنا محمد والہ وصحبہ وبارک وسلم

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

فلسفۂ موت

موت جیسے فزعِ اکبر ہے۔ جیسے عظیم ترین مصیبت ہے ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے، عظیم ترین انعامِ خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس ہائے افسوس کا۔ بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مؤمن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آبادکاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے عُلوم پیدا ہونے کا، اور نئے مرتبوں کے پیدا ہونے کا۔ اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے اس کی تمنا بھی کرے......

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــ

فاعوذ باللّٰہِ من الشیطٰن الرجیم۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۔ صدق اللّٰہ العلی العظیم

(بقرہ پ۲ ع۱۹)

تمہید

بزرگان!

میری اس وقت حاضری کا مقصد ملتان میں نہ کوئی جلسہ تھا، نہ کوئی مجلس تھی، نہ کوئی تقریب اور وعظ کا تخیّل ذہن میں تھا۔ میری حاضری کا مقصد حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (بانیٔ مدرسہ خیرالمدارس ملتان) کی وفات کے بعد یہ پہلی حاضری تھی تاکہ تعزیت ادا کروں۔ تعزیت کے لئے ہجوم اور مجمع نہیں ہوتا، اگر مجھے پہلے سے علم ہوتا کہ جلسہ کا اعلان کیا گیا، تو میں روک دیتا اور امید تھی کہ مولانا محمد شریف صاحب (مہتمم مدرسہ خیرالمدارس، فرزند ارجمند حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ) مان بھی لیتے، لیکن اچانک آکر معلوم ہوا کہ کوئی جلسہ بھی ہے اور اجتماع بھی۔ جلسہ اور تقریر میں ان سب کے لئے ضرورت پڑتی ہے نشاط کی، طبیعت میں

انشراح ہو، نشاط ہو۔ یہ ساری چیزیں مل جاتی ہیں مگر میں اس وقت حاضر ہوا ہوں کہ ایک بجھے ہوئے دل کے ساتھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا غم سامنے ہے، یہاں آکر تازہ ہو گیا۔ حالانکہ ان کی وفات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے مگر میرا تعلق اتنا قوی تھا ان سے، اور قلبی رابطہ برسہا برس سے تھا ___ مولانا مرحوم جب جالندھر میں مقیم تھے۔ پنجاب کا جو بھی میرا سفر ہوا دو جگہ اُترنا لازمی ہوتا تھا۔ جالندھر مرحوم کی وجہ سے، اور امرتسر میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب مرحوم کی وجہ سے۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا مرحوم کا قیام ملتان میں ہوا۔ یہاں بھی ایک آدھ مرتبہ ان کی حیات میں حاضری ہوئی۔ اس وقت ان کی وفات کے بعد یہ پہلا موقع ہے حاضری کا۔ تو وہ سارے تعلقات سامنے آگئے، وہ ساری تاریخ سامنے آگئی۔ اس وجہ سے دل پر غم کا ایک بوجھ ہے تو اس بجھے ہوئے دل سے میں کیا تقریر کروں اور کیا جلسے کا حق ادا کروں؟ اور اوپر خود میرا بھی اب ضعیفی کا عالم ہے قوت بھی وہ نہیں ہے، جو پہلے تھی۔ جذبات بھی سرد پڑ چکے ہیں۔ ایسی حالت میں تقریر ہو تو کیا ہو؟

بہر حال جب ہو گیا ایک اجتماع اور حضرات جمع ہو گئے ان کا احترام بھی ضروری ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ نہ کچھ عرض کیا جائے۔ اس لئے غم کے سلسلے میں تعزیتی تقریر ہوگی۔ کوئی خاص وعظ و نصیحت اس میں نہ ہوگا۔

عالَم کی بقا روحانیت کی بقا سے ممکن ہے

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی ذات ایک مقناطیسی ذات تھی جو قلوب کا رجحان تھا، اور دل کھنچتے تھے اور ان کی وفات جیسا کہ مقولہ مشہور ہے موت العالِم موت العالَم (عالِم کی موت فی الحقیقت عالَم کی موت ہے) اس لئے کہ عالِم کے ذریعے سے حیات پھیلتی ہے۔ وہ حیات یہ نہیں ہے، جو کھانے پینے کی ہے، وہ حیاتِ روحانی ہوتی ہے اور وہی حقیقی حیات بھی ہے اور وہی حقیقی روح بھی ہے، اسی لیے حق تعالیٰ شانہ، نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا ہے۔ اسی روح سے اقوام زندہ ہوں گی اور اسی روح کے نکل جانے سے پژمردگی طاری ہوگی ___ فرمایا ایک موقع پر کہ :

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (شوریٰ پارہ ۲۵)

اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے یعنی اپنی روح آپ کے اندر ڈالی ہے وہ عالم کی روح ہے، اور وہ کتاب اللہ اور قرآن کریم ہے جس کو روح بتلایا گیا ہے۔ فی الحقیقت یہ زندگی ہے سارے عالم کی۔ یہ روح ایک فرد سے نکل جائے تو وہ مردہ ہو جائے گا۔ پوری کائنات سے نکل جائے تو کائنات بھی مردہ ہو جائے گی۔

حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:

لاتقوم الساعۃ حتی یقال فی الارض اللہ اللہ

قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جس وقت اس عالم میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہو گا۔ جب ایک بھی باقی نہیں رہے گا تو قیامت آجائے گی۔ تو قیامت اس پورے عالم کی موت ہے۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ اس عالم کی زندگی اور اس کی روح "اللہ اللہ" ہے۔ جب یہ روح نکل جائے گی، عالم مردہ ہو جائے گا۔ اس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ آسمان وزمین ٹوٹ پھوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور ساری کائنات کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ غرض عالم کی روح وہ فی الحقیقت ذکرُ اللہ اور یادِ خداوندی ہے، نہ صرف پورے عالم کی بلکہ ایک ایک جُز کی روح بھی یہی ہے۔

"ہر چیز تسبیح خواں ہے"

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ درخت کی ہر ہر ٹہنی بھی اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ تسبیح بند ہو جاتی ہے اس پر زردی چھا جاتی ہے' وہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ روح نکل گئی' موت طاری ہو گئی۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے۔ تسبیح بند ہو جاتی ہے جب کہ وہ ٹھہر جاتا ہے۔ تسبیح بند ہو جانے کے بعد ٹھہرا ہوا پانی سڑتا بھی ہے بدبودار بھی ہوتا ہے۔ یہ اس کی موت کا وقت ہوتا ہے۔ تو پانی کی زندگی بھی تسبیح و تہلیل سے ہے۔

حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ امام کے لئے مکروہ تحریمی ہے کہ ایسے کپڑے پہن کر امامت کرائے کہ پسینے میں زرد ہوئے ہوں۔ پسینے کی بو آرہی ہو۔ اس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔ ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ جب بدبودار کپڑے ہوں گے اور تعفن ہو گا تو مقتدیوں کو اقتدا کرتے ہوئے کراہت پیدا ہوگی۔ نشاط باقی نہیں رہے گا۔ جو ایک رابطہ ہے بندہ اور خدا کے درمیان میں وہ پورا قائم نہیں رہ سکے گا' اسی لئے فقہاء لکھتے ہیں کہ امام کے لئے صاف ستھرے کپڑے پہننا ضروری ہیں' اتنے میلے نہ ہوں کہ ان سے بدبو آنے لگے۔ رنگ بدل جائے' ظاہری وجہ تو یہی ہے کہ بدبو سے مقتدیوں کو عار پیدا ہوگی۔ حقیقی وجہ یہ ہے کہ کپڑا گندا ہو کر اس کی تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ ذکر اللہ منقطع ہو جاتا ہے' وہ بھی ختم ہو جاتا ہے' انقباض پیدا ہوتا ہے' روح میں۔ تو در حقیقت سارے عالم کی روح ذکر اللہ ہے یہ قائم ہے تو عالم قائم ہے یہ نہیں رہے گی تو عالم قائم نہیں رہے گا۔ عالم کی جزئیات ختم ہو جائیں گی تو ہر ہر چیز اللہ کی تسبیح میں مشغول ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ

کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں ہے جو حق تعالیٰ کی تسبیح میں مصروف نہ ہو۔ تم ان کی زبان نہیں سمجھتے یا آواز کو نہیں سنتے۔ تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے اور در حقیقت وہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے اپنی زبان میں۔ ہم دیکھتے کہ شیر دھاڑ رہا ہے' فی الحقیقت وہ اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔ پرندے سیٹیاں بجاتے ہیں' ہم دیکھتے ہیں کہ کہ وہ چہچہا رہے ہیں۔ حقیقت میں وہ ذکر الٰہی میں مصروف ہیں اپنی زبان میں۔ تو ع

ہر یکے را اصطلاحے دادہ ایم

ہر ایک کو اللہ نے ایک زبان دی ہے۔ وہ اپنی زبان میں اللہ کی حمد و ثناء اور تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے۔ ہم اس کی زبان کو نہیں سمجھتے' اور ہم ان کی زبان کو اگر نہیں سمجھتے تو تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہم اپنے ہی بھائی بندوں کی سب زبانیں کب سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی پشتونی آدمی پشتو میں اللہ کو پکارنے لگے' دعائیں مانگنے لگے' ہم کیا کریں گے' بیٹھے ہوئے دیکھتے رہیں گے' ہمیں کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ٹھیٹھ پنجابی میں آپ بولیں تو میں کیا سمجھ لوں گا۔ کوئی انگریزی میں اللہ کو پکارے تو ہم کیا سمجھیں گے' تو ہزاروں زبانیں دنیا میں رائج ہیں انسانوں میں۔ ہم اپنے بھائی بندوں کی زبانیں نہیں جانتے۔ اگر پرندوں کی زبان بھی نہ جانیں تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ ہر ایک کی ان کی ایک تسبیح ہے ___ اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کر رہا ہے۔ آپ نہیں سمجھتے نہ سمجھیں۔ فرمایا گیا :

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ تم ان کی تسبیح کو نہیں پہچانتے باقی معجزے کے طور پر اگر اللہ کسی کو بتلا دے پرندوں کی بولیاں تو اس کی قدرت ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ :

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ

اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولیاں بتلا دی گئی ہیں۔

جب پرندے بولتے تو سلیمان علیہ السلام فرماتے کہ یہ فلاں بات کہہ رہا ہے۔ وہ سمجھتے تھے ان کی بولیوں کو۔ یہ آواز کبھی آ سکتی ہے ہم لوگوں کے کان میں بھی معجزانہ طریق پر' جیسے کہ حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر کے کنکریاں اٹھائیں تو کنکریوں میں سے زور زور سے آواز آ رہی تھی سبحان اللہ سبحان اللہ۔ تمام صحابہؓ سن رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کنکریاں دے دیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ تسبیح برابر جاری رہی۔ انہوں نے وہ کنکریاں دیں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں۔ تسبیح برابر جاری رہی۔ جب اور صحابہؓ کو منتقل کی گئیں تو تسبیح کی آواز سننا بند ہو گئی۔ تسبیح جاری رہی ہو گی مگر سنائی نہیں دی۔ اعجازی طور پر ہم سن بھی سکتے ہیں۔ پرندوں کی بولیاں تو ان کانوں سے سنتے ہیں۔ کنکریوں کی آواز بھی معجزانہ طریق سے سن سکتے ہیں۔ جب اللہ کا کوئی معجزہ کسی پیغمبر کے ہاتھ ظاہر ہونا چاہے۔

اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ ٹیلیگراف آفس میں جائیں اور جا کر کہیں کہ بھائی یہ تار دے دو کہ میں فلاں گاڑی سے پہنچ رہا ہوں۔ اس نے پیتل کی ٹلی پر ہاتھ رکھ کر کھٹ کھٹ شروع کی۔ تو آپ کہیں گے کہ احمق آدمی میں نے یہ کہا ہے' کہ میرے آنے کی اطلاع دے دو۔ تم نے کھٹ کھٹ شروع کر دی' وہ کہے گا احمق تو تو ہے۔ اسی کھٹ کھٹ میں یہ سارا علم پہنچ رہا ہے' دوسرے ملک میں۔ باقی تو اس کھٹ کھٹ کی آواز سے واقف نہیں ہے۔ میں نے اس کی مشق کی ہے' اس کا فن حاصل کیا ہے۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ ایک دفعہ کھٹ ہو گی تو "الف" مراد ہو گا۔ دو دفعہ ہو گی تو "ب" مراد ہو گی۔ تین دفعہ ہو گی تو "ج" مراد ہو گا۔ تو کھٹا کھٹ سن رہا ہے۔ اور حقیقت میں یہ علم ہے جو ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہو رہا ہے' تو اس فن کو حاصل کر لے گا۔ تو تجھے بھی معلوم ہو جائے گا۔ نہیں حاصل کرے گا' تو نہیں پتہ چلے گا۔

تو جس طرح ہم اس کھٹا کھٹ سے علم نہیں سن سکتے' نہیں سمجھ سکتے اسی طرح جانوروں کی آوازوں کو ہم سنتے ہیں مگر تسبیح ہماری سمجھ نہیں آتی۔ وہ ان کی زبان میں تسبیح ہے' ذکر ہے اپنی زبان میں' وہ کر رہے ہیں۔

ملائکہ علیہم السلام کو بھی مختلف **تسبیحات** دی گئی ہیں۔ وہ اپنی زبان میں تسبیح کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی زبانیں بھی متعدد ہوں۔ اپنی اپنی زبان میں وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ بعض روایات میں ان کی **تسبیحات** بھی آئی ہیں۔ جیسے فرمایا گیا ہے کہ بعض ملائکہ کی تسبیح ہے کہ:

سبحان من زيّن الرّجال باللحٰی وزيّن النساء بالذّوائب۔

"پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو زینت دی ہے ڈاڑھیوں سے' اور عورتوں کو زینت دی ہے مینڈیوں اور چوٹیوں سے"۔

یہ ان کی زبان میں تسبیح ہے ان کی۔ وہ اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ تو مختلف **تسبیحات** ملائکہ بھی کرتے ہیں۔ جنات بھی کرتے ہیں۔ آسمان بھی تسبیح میں مصروف ہیں' زمین بھی تسبیح میں مصروف ہے۔ ستارے بھی تسبیح میں مصروف ہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط

قرآن کریم نے خطاب فرمایا ہے کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ آسمانوں میں جو ہیں وہ بھی مصروف' پہاڑ بھی۔ اور یہ تو ہے تسبیح۔

ہر چیز نمازی بھی ہے

قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز نمازی بھی ہے اپنے اپنے انداز سے نماز بھی ادا کرتی ہے۔

فقط ذکر ہی میں مصروف نہیں ہے۔ دعویٰ کیا ہے قرآن کریم نے :

كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ

ہر چیز نے اپنی نماز کو بھی پہچان لیا ہے اور اپنی تسبیح کو بھی جان لیا ہے۔ تو ہر ایک مخلوق نماز پڑھ رہی ہے۔ باقی اس کی نماز اسی انداز کی ہے جیسے اللہ نے اس کی ساخت بنائی ہے جیسے اس کی ہیئت بنائی ہے اسی ڈھنگ کی اس کی نماز بھی ہے۔ شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ درختوں کی نماز میں قیام ہے۔ رکوع اور سجدہ نہیں ہے وہ ایک پیر پر کھڑے ہوئے اللہ کے ذکر میں مصروف ہیں کہ جس قانون پر لگادیا اس سے ایک انچ نہیں ہٹ سکتے۔ اطاعتِ خداوندی میں لگے ہوئے ہیں۔ چوپائیوں کی نماز میں بھی رکوع ہے۔ ان کی ہیئت ہی ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ ہر وقت سر کو جھکائے ہوئے رکوع میں ہیں۔ حشرات الارض ہیں سانپ بچھو کیڑے مکوڑے ان کی نماز سجدہ سے ہے۔ قیام اور رکوع نہیں ہے۔ ان کی ہیئت اللہ نے ایسی بنائی ہے کہ وہ ہر وقت اوندھے پڑے ہوئے سجدہ میں ہیں۔ اسی طرح پہاڑوں کی نماز میں تشہد ہے۔ جیسے انسان زمین پر گھٹنے ٹیکے ہوئے بیٹھے ہیں ان کی نماز تشہد کے ساتھ ادا ہو رہی ہے تسبیح میں مصروف ہیں۔ جنت اور دوزخ کی نماز دعا مانگنا ہے۔ جنت بھی دعا کر رہا ہے کہ اے اللہ مجھے بھردے اور وعدۂ خداوندی ہے کہ ہم بھردیں گے۔ جہنم کی بھی یہی صدا ہے کہ مجھے بھر دیجئے میری غذا مجھے پہنچایئے۔ قیامت کے دن دوزخ کو بھر دیا جائے گا۔ اہلِ جہنم جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ مگر دونوں کی آواز نہیں ہوگی۔ جہنم کہے گا هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ اور لایئے ابھی تو میں خالی ہوں۔ جنت کہے گا میرے ہزاروں شہر خالی پڑے ہیں۔ آباد کاری فرمایئے آپ کا وعدہ ہے کہ بھردیں گے تو جنت کے لئے حق تعالیٰ ایک مستقل مخلوق پیدا فرمائیں گے جس سے آباد کاری ہوگی جنتوں کی۔ جہنم کے لئے مستقل مخلوق نہیں بنائیں گے۔ حدیث میں ہے کہ اپنا قدم رکھ دیں گے اس پر جیسا قدم اس کی جناب کے لائق ہے تو وہ کہے گا قط قط بس بس۔ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے میں بھر گیا۔ اس کی دعا قبول ہو جائے گی۔ تو جنت اور جہنم کی نماز دعا مانگنے سے ہے۔

ملائکہ علیہم السلام کی نماز ہے صف بندی لاکھوں کروڑوں ملائکہ صفیں باندھے ہوئے ہیں ہزار ہزار برس سے کوئی جماعت رکوع میں ہے۔ کوئی جماعت سجدہ میں ہے۔ کوئی قیام میں ہے۔ صفیں بنی ہوئی ہیں۔ صف بندی ان کی نماز ہے۔ سیارے ہیں جو گھومتے ہیں ان کی نماز حرکتِ دوراں ہے کہ جہاں سے چلے تھے پھر وہیں لوٹ آئیں۔ گھومنا ہی ان کی نماز ہے۔

"اِسلام کی نماز کی عظمت اور جامعیت"

یہ حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اسلام کی نماز میں ساری کائنات کی نمازیں اللہ نے جمع کردی ہیں۔ درختوں کا سا قیام بھی ہے چوپایوں جیسا رکوع بھی ہے حشرات الارض جیسا سجدہ بھی ہے۔ پہاڑوں کا سا تشہد بھی ہے۔ جنت و دوزخ کا سا سوال و دعا بھی ہے اور سیارات کا سا دوران بھی ہے۔ اس واسطے کہ ایک رکعت پڑھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے۔ کم سے کم دو رکعت ہوں۔ دو ہوں تین ہوں چار ہوں اگر نفل نماز ہے تو آٹھ ہوں پڑھے جائیں۔ غرض تنہا نماز ایک رکعت پڑھنا اس کی ممانعت ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور ملاؤ تاکہ شفعہ بن جائے تو دو یا چار رکعت کی نماز میں آپ کیا کرتے ہیں جو کام پہلی رکعت میں کیا الحمد پڑھی سورت پڑھی تسبیح پڑھی ___ دوسری رکعت میں پھر وہیں سے شروع کر دیتے ہیں وہی الحمد وہی سورت وہی تسبیح وہی تحمید۔ تو جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آگئے ایک دور ہے تمہاری نماز میں۔ تو سیارات جیسی گردش

بھی آپ کی نماز میں۔ تو جامع ترین نماز ہے کہ جتنی ہیئتیں ممکن ہیں عقلاً وہ سب دی گئی ہیں' تاکہ بندہ عبادت اور تذلّل کے ساتھ پیش ہو' کھڑا ہو تو تذلّل' بیٹھے تو اپنی ذلت کا اظہار' جھکے تب ذلت کا اظہار۔

عبادت کا صحیح مفہوم

غرض عبادت نام ہے اظہارِ تذلّل کا۔ انتہائی درجہ کی ذلت اپنی پیش کی جائے۔ اس لئے کہ جس ذات کے سامنے آدمی کھڑا ہوتا ہے وہ انتہائی عزت کے مقام پر ہے کہ اس کی بعد کوئی درجہ نہیں عزت کا۔ اس کے سامنے اتنی ذلت پیش کی جائے کہ اس کے بعد ذلت کا کوئی درجہ باقی نہ رہے۔ تو ذلیل محض بن کر آدمی اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہوگا۔ اس لئے کہ وہ عزت کے انتہائی مقام پر ہے اس کا فرض ہے کہ ذلت کے انتہائی مقام کو پیش کرے۔ کھڑے ہوتے ہیں آپ جامد و ساکت۔ یہ ایک درجہ ہے اظہارِ ذلت کا۔ رکوع کیا تو گردن جھکادی' یہ دوسرا درجہ ہے اظہارِ ذلت کا۔ اس کے بعد پیشانی زمین پر ٹیک دی۔ یہ آخری درجہ ہے اظہارِ ذلت کا۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائے' دعائیں مانگیں' تو بھیک مانگنا' یہ سب سے زیادہ انتہائی درجہ ہے ذلت کا۔ جتنی ہیئتیں ہیں وہ سب اظہار تذلّل کی ہیں۔ جتنے اذکار ہیں نماز میں یا عظمتِ خداوندی کا اظہار ہے یا اپنی نیاز مندی کا اظہار ہے۔ انہی دو چیزوں پر مشتمل ہیں تمام اذکار' تو ذکر بھی' افعال بھی' ہیئت بھی سب اظہارِ ذلت کے ہیں نماز میں۔

صرف نماز اپنی ذات میں عبادت ہے

اس لئے یوں کہنا چاہیے کہ حقیقی معنوں میں اگر عبادت ہے تو صرف نماز ہے۔ دوسری عبادات اور وجوہ سے عبادت بنی ہیں' اپنی ذات سے عبادت نہیں۔ نماز اپنی ذات سے عبادت ہے۔

"روزہ" : اس کا معنی یہ ہے کہ کھانے پینے سے آدمی مستغنی ہو جائے' تو کھانے سے پینے سے' بیوی سے غنی ہونا' یہ اللہ کی صفت ہے۔ اس میں ذلت تھوڑا ہے۔ یہ مشابہت ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ کہ کھانے سے بھی بَری' پینے سے بھی بَری' بیوی سے بھی بَری' تو یہ اظہارِ ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو اظہارِ عزت ہے۔ یہ عبادت تعمیلِ حکم کی وجہ سے ہے۔ حکم دیا تعمیل کرو تو بن گئی عبادت۔

"زکوٰۃ" : اپنی ذات سے عبادت نہیں ہے۔ اس کے معنیٰ عطا کرنے کے ہیں کہ فقیروں کو دو' عطا کرنا تو اللہ کی شان ہے۔ یہ تشبیہ ہے حق تعالیٰ کے ساتھ۔ اس میں ذلت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو عین عزت ہے' زکوٰۃ عبادت بنی اس لئے کہ حکم ہے کہ زکوٰۃ دو' تعمیلِ ارشاد نے اس میں پیدا کردیئے معنیٰ عبادت کے۔ اس طرح سچ بولنے کو عبادت کہتے ہیں اور وہ عبادت ہے لیکن سچ بولنا اپنی ذات سے عبادت نہیں یہ تو اللہ کی صفت ہے۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۞ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا

"اللہ سے زیادہ کس کا قول سچا۔ اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی"۔

تو سچ کہنا اور سچ بولنا حق تعالیٰ کی شان ہے۔ بندہ اگر سچ بولے گا تو مشابہت پیدا کرلے گا کمالاتِ خداوندی کے ساتھ۔ اس میں ذلت تھوڑا ہے یہ تو عینِ عزت ہے۔ پھر بھی وہ عبادت ہے کہ حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ اللہ کا کہنا ہے سچ بولو۔ تعمیل کے لئے گردن جھکادی کہ سچ بولوں گا۔ سچ کو عبادت بنادیا تعمیل حکم نے۔ اپنی ذات سے عبادت نہیں تھی۔ ورنہ اللہ کی صفت نہ ہوتی۔

صرف نماز پوری کائنات پر فرض ہے

لیکن نماز کی ہر ہیئت اظہارِ ذلّت کے لئے ہے۔ ہر ذکر بھی اپنی ذلّت کے اظہار پر مشتمل ہے اس واسطے نماز اپنی ذات سے عبادت ہے محض تعمیلِ حکم سے عبادت نہیں' اس کے اندر خاصیت ہی اظہارِ تذلّل کی ہے یہی وجہ ہے کہ ساری کائنات پر فرض کی گئی ہے۔ زکوٰۃ' حج' اور سچ بولنا فرض نہیں کیا گیا' فرمایا گیا کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ ہر چیز نے اپنی نماز کو پہچان لیا۔ یہ نہیں فرمایا : کل قد علم حجہٗ کل قد علم زکوٰتہٗ' تو نماز کائنات کی ہر چیز پر فرض کی گئی ہے۔ انسان' جنّ' فرشتہ' درخت' پہاڑ اور پتھر سب کے لئے عبادت اور نماز لازمی قرار دی گئی ہے تو اصل معنیٰ کے لحاظ سے نماز ہی عبادت ہے۔ بقیہ عبادتیں تعمیلِ حکم کی وجہ سے عبادتیں بنی ہیں۔

ربط مع الحق بدونِ نماز ممکن نہیں

یہی وجہ ہے کہ بندے کا حقیقی رابطہ اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہو سکتا۔ آپ زکوٰۃ دیں گے تعلق مع الخلق درست ہو جائے گا۔ غریب کی خبر گیری ہوگی' وہ آپ کا ممنون ہوگا۔ تعلّقات اُستوار ہو جائیں گے' اس تعمیل کی وجہ سے اللہ سے بھی تعلق پیدا ہوگا' مگر حقیقۃً وہ تعلق ہے مخلوق کے ساتھ۔ اس واسطے رابطہ بندے کا اللہ سے بغیر نماز کے قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر نماز میں قصور ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رابطہ حق تعالیٰ سے قائم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر (نماز میں) دوسرا خیال لاتا ہے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں میرے ہوتے ہوئے غیر کی طرف توجہ کرتا ہے تجھے حیا نہیں آتی۔ اگر متنبّہ ہو گیا بندہ' پھر تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ نہ ہوا تو پھر خود بے رُخ بن جاتے ہیں۔ توجہ ہٹا لیتے ہیں۔ اُٹھک بیٹھک رہ جاتی ہے۔ تو نماز سے ہی فی الحقیقت رابطہ قائم ہوتا ہے۔

نماز سے دیدارِ خداوندی کی اِستعداد

اس لئے حدیث میں فرمایا گیا تمام نمازوں کے بارے میں اور خصوصیّت سے صبح اور عصر کی نمازوں میں کہ ان دونوں سے استعداد پیدا ہوتی ہے دیدارِ خداوندی کی۔ نماز ہی سے اللہ کو دیکھنے کی صلاحیت بندہ میں آتی ہے۔ عمر بھر نماز پڑھتا رہے گا تو ابتداءً عقیدے کی آنکھ سے دیکھے گا' پھر کشف کی آنکھ سے دیکھے گا۔ اور پھر ایک وقت آئے گا کہ آخرت میں اس آنکھ سے بھی دیکھ سکے گا۔ تو مقصودِ اصلی عبادت سے معبود کو دیکھنا اور اس کا قرب حاصل کرنا ہے اور یہ صرف نماز سے ممکن ہے۔ تو حقیقی عبادت نماز ہی ہے۔

روحِ خداوندی ہر چیز میں موجود ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم کو اپنی روح فرمایا۔ اس روح کے اندر یہ عبادات بھی شامل ہیں۔ تعمیلِ ارشاد ہی اس کی روح ہے فی الحقیقت' بندے میں اللہ نے قرآن کی روح ڈال دی تاکہ اس میں بندگی پیدا ہو اور اللہ کی معبودیت ظاہر ہو۔ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۔ اے پیغمبر! عالمِ امر کی روح ہم نے آپؐ میں ڈال دی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے سے وہ روح ہم

تک پہنچ گئی' ہمارے اندر بھی وہ روح ہے ہم اس روح کو داخل رکھیں گے تو قوی رہیں گے۔ قوت کی علامت اس روح کی برقراری ہے اور ضُعف کی علامت اس روح کا نکل جانا ہے۔

مسلم اقوام کی پریشانی کا علاج

دنیا میں مسلمان شکایت کرتے ہیں کہ فلاں قوم نے ہمیں تباہ کردیا' فلاں قوم نے اپنی مکّاریوں سے ہمیں پریشان کردیا۔ ہماری جائدادیں ختم کردیں۔ ہمارے جان ومال کو ختم کردیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ شکایت بالکل غلط ہے ___ شکایت تو کفار کو ہونی چاہئے کہ تمہاری ناہنجاری سے ہم بدعنوان بن گئے' اگر تم صحیح معنوں میں اپنے دین پر قائم رہتے۔ ہم تمہاری ٹھوکروں کے نیچے رہتے' ہم تمہاری اِتباع کرتے لیکن جب تم اپنے نہج پر نہیں ہو تو ہم سے کیا توقع رکھتے ہو' کہ ہم تمہاری پیروی کریں یا پابندی کریں۔

تو حقیقت میں شکوہ ہے مسلمانوں کا۔ مسلمانوں کا حق نہیں ہے غیر اقوام سے شکوہ کرنے کا۔ مسلمان آیا تھا دنیا کی اقوام کو درست کرنے کے لئے۔ اس کو اقوامِ امام بنایا گیا' امام ہی کا وضو نہ ہو تو کیا مقتدیوں کی نماز ہو جائے گی؟ جب امام میں ہی حدث پیدا ہو گیا' ظاہر و باطن میں ناپاکی پیدا ہو گئی' اقوام کیوں اس کی اقتداء کریں گی۔ اور کیوں کر اس کی پیروی کریں گی؟

اس لئے کہ وہ قوت اس نے ختم کردی جو غالب اور ظاہر تھی اقوام پر۔ وہ روح ہوا کی طرح بھری ہوئی تھی۔ جب تک وہ ہے مسلمان قوی ہے' وہ نکل گئی مسلمان ضعیف ہے آپ نے دیکھا ہو گا کہ گیند ہے اس میں ہوا بھری ہوئی ہے اگر آپ اسے زمین پر پٹخ دیں تو گر دا کھا کے دس گز اوپر جاتی ہے اس لئے کہ ہوا بھری ہوئی ہے اس میں۔ اور اگر اس میں سوئی چبھو دی جائے تو ہوا نکل جائے گی' تو جہاں ڈالیں گے' وہیں پڑی رہ جائے گی۔ اس کو آپ پیروں سے پامال کردیں' وہ اٹھنے کا نام نہیں لے گی' اس لئے کہ روح نکل گئی۔

روحِ اسلامی نکلنے سے مسلمانوں کا انجام

مسلمانوں کی روح قرآن پاک ہے۔ اقوام کی یہ مجال نہیں کہ اس کو دبائیں' دبائیں گے پٹخ دیں گے نیچے' تو یہ دس گز اوپر جائے گا' اور اوپر ہی جائے گا' **الحق یعلو ولا یعلی** (حق غالب ہوتا ہے مغلوب نہیں ہوتا) لیکن یہ روح نہیں ہوگی' تو جہاں ڈالیں گے وہیں پڑا رہے گا۔ آج اگر مسلمان پامال ہو رہے ہیں' نہ اس لئے کہ کفار میں جان ہے۔ اس لئے کہ تم بے جان ہو گئے' جو روح تھی وہ نکال باہر کی' تو روح نکل جانے کے بعد آدمی لاشہ بن جاتا ہے۔ لاشہ کے لئے ہر انسان کا پہلا فرض ہوتا ہے۔ دبائے' جلائے یا اسے دفن کردے (الغرض آنکھوں سے اوجھل کرنا سب کے نزدیک ضروری ہے' اس دنیا میں اب اس کا کوئی مقام نہیں) اس کو گھر نہیں چھوڑتے' باہر نہیں چھوڑتے۔ اس کے تعفّن سے دنیا کی صحت خراب ہوگی۔ پہلا کام یہ کرتے ہیں اسے دفن کرتے ہیں' کوئی جلاتا ہے' کوئی پانی میں بہا دیتا ہے' اور کوئی بُرا نہیں مناتا۔ لیکن اگر زندہ آدمی کو کوئی جلائے' تو گورنمنٹ ہی مدّعی ہو جائے گی کہ اسی پھانسی دو۔ قوم بھی مدّعی بنے گی کہ یہ بدکار ہے' مجرم ہے' روح کے ہوتے ہوئے کسی کی مجال نہیں ہے کہ دبائے' دبائے گا تو مجرم ثابت ہو گا۔ لیکن جب روح نکل جائے گی' جس کا جی چاہے جلا دے' دفن کردے' تو مسلمانوں کا یہ شکوہ کرنا کہ فلاں قوم نے ہمیں جلا دیا' فلاں نے گرا دیا۔ میں کہتا ہوں غلط ہے۔ اس نے خود اپنے کو گرا دیا ہے' جب روح نکال دی' زندگی ختم ہوگی۔ زندہ آدمی کو کوئی نہیں جلا سکتا۔

عالَم کی روح فی الحقیقت ذکرُ اللہ ہے

میں عرض یہ کررہا تھا کہ حقیقی معنی میں حق تعالیٰ نے دینی روح (مسلمان میں) ڈال دی۔ اور وہ ہے قرآن مجید۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا تو اس عالم کی روح فی الحقیقت ذکرُ اللہ ہے۔ جب یہ نکل جائے گی، تو عالم لاشہ کی مانند ہو جائے گا، اور لاشہ کا انجام پھولنا، پھٹنا، سڑنا، گلنا اور ریزہ ریزہ ہو جانا ہے۔ ایک ایک چیز کا ذرہ ذرہ پھٹ جائے گا قیامت کے دن۔ یہ عالم کی موت ہوگی اور یہ اس لئے واقع ہوگی کی روح نکل جائے گی۔

روح کا حِسّی مرکز

اس روح کا سب سے بڑا حسّی مرکز بیتُ اللہ شریف ہے، جس کے ذریعے چلتی ہے اسی میں تجلّیٔ خداوندی ہے، جس کے سامنے ہم جھکتے ہیں۔ یہیں سے بطفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انوار و برکات چلتے ہیں۔ تو یہ مرکز روح ہے فی الحقیقت، قیامت کا جب قُرب ہوگا اور روح اٹھنے والی ہوگی تو حدیث شریف میں ہے کہ بیتُ اللہ کو ایک حبشی غلام ریزہ ریزہ کردے گا۔ ایک ایک پتھر اس کا جُدا کردے گا۔ تو سب سے پہلے بیتُ اللہ ختم ہوگا۔ پھر عالم پر قیامت طاری ہو جائے گی۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ کا لشکر چلتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ نصب کیا جاتا ہے تاکہ بادشاہ آکر ٹھہرے، ان کے ارد گرد ان کے دربار کے امراء کے خیمے لگتے ہیں، پھر فوجیوں کے خیمے لگتے ہیں، جب بادشاہ آتے ہیں تو بڑا شہر بن جاتا ہے لیکن جب کیمپ اُجڑتا ہے تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جاتا ہے بعد میں اور امراء کے خیمے اکھڑتے ہیں اور پھر میدان خالی ہو جاتا ہے، یہی صورت یہاں بھی ہے وہ خیمۂ خداوندی کہ تجلّیاتِ الٰہیہ اس میں مقیم ہیں، سب سے پہلے اس کو عالم میں قائم کیا گیا۔ فرمایا گیا: اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ سب سے پہلا گھر جو اللہ نے عبادت کے لیے قائم کیا وہ وہ ہے جو مکّہ شہر میں ہے اس کا نام کعبہ مقدّس ہے۔ یہ گویا خیمہ شاہی ہے جب عالم کو آباد کرنا ہوا تو سب سے پہلے خیمہ شاہی نصب کیا گیا اور جب عالم کا خیمہ اکھڑے گا اور یہ دنیا ختم ہوگی، تو سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھاڑا جائے گا۔ جب بیتُ اللہ کی ایک حبشی غلام اینٹ سے اینٹ بجادے گا اور تجلّیٔ خداوندی اسے چھوڑ دے گی اس کے بعد عام مساجد بھی ویران ہوں گی۔ تمام اللہ کے ذکر خانے (خیمے) بھی ویران ہوں گے، اور ساری دنیا ویران ہو جائے گی۔ تو اوّلین چیز وہ شاہی خیمہ ہے جو سب سے پہلے نصب ہوتا ہے کیمپ میں اور اکھڑنے کے وقت سب سے پہلے شاہی خیمہ اکھڑتا ہے۔

تو اوّلین چیز جو قائم کی گئی وہ بیتُ اللہ ہے اور ابتدا میں قیامت کے قُرب میں وہ سب سے پہلے اکھاڑا جائے گا۔ بہرحال وہ روح ذکرُ اللہ ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اسی کی بقا سے عالم باقی ہے۔

''فلسفۂ موت'' اور علماءِ ربّانی کی شان

تو موت فی الحقیقت نام ہوا ذکرُ اللہ کے منقطع ہو جانے کا یہ منقطع نہ ہو تو آدمی مرتا نہیں۔ اسی لیے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ مثل الذاکر فی الغافلین کمثل الحی فی الاموات غافلوں کے اندر ایک

بھی ذکرُ اللہ کرنے والا موجود ہے تو وہ مثل زندہ ہے' وہ غافلوں میں سے نہیں اس لئے مردوں کے اندر وہ زندہ ہوتا ہے۔

تو علماء ربّانی کی شان یہی بتائی گئی ہے کہ ان کا دِل' روح اور دماغ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہتا ہے۔ یہ اثر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا' اور ان کا صدقہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں یہ فرمایا گیا ہے : کان یذکر اللہ علیٰ کل احیانہٖ کوئی لمحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ سے خالی نہیں ہوتا تھا۔ زبان سے ذکر کریں۔ قلب سے ذکر کریں' جس کو فکر کہتے ہیں۔ روح سے ذکر کریں جس کو توجہ کہتے ہیں اور معرفت کہتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طریق پر ذکر میں مصروف رہتے ہیں۔ جب کوئی عالم ربّانی اُٹھتا ہے جس کے لئے کہا گیا ہے کہ موت العالِم موت العالَم تو ایسے عالِم کا اُٹھ جانا' پورے عالم کا اُٹھ جانا ہے' کیونکہ وہ روح نکل جاتی ہے تو پورے عالم پر ایک پژمردگی چھا جاتی ہے۔ تو میں نے (ابتدا میں) عرض کیا تھا کہ مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ' جیسے ان کے نام میں خیر ہے ان کے مسمّٰی میں اللہ نے خیریت ہی رکھی تھی۔ اور واقعۂ خیر ہی خیر تھے۔ حدیث کا پڑھنا پڑھانا' قرآن پاک کا پہنچانا' مواعظ سے تبلیغ و تلقین کرنا۔ اپنے پروردوں کی تربیت کرنا' غرض ذکر اللہ ہی ان کا مشغلہ تھا کسی بھی انداز سے ہو۔

ایسے عالم ربّانی کا اُٹھ جانا یقیناً پورے عالم کے لیے موت کا بھی اور علامات موت کا یقیناً اشارہ ہے جب کوئی عالم ربّانی اٹھتا ہے تو قلوب محسوس کرتے ہیں کہ ایک قسم کی ظلمت طاری ہو گئی ہے۔ پورے عالم میں روحانیت میں کمی آ گئی۔ ہر شخص محسوس نہیں کرتا' صاحبِ دل جانتا ہے کہ نورانیت میں کتنی کمی آتی ہے' اسی واسطے فرمایا گیا کہ ___ الموت الفزع الاکبر ___ موت سب سے زیادہ گھبرا دینے والی چیز ہے ___ مگر مجھے ساتھ یہ بھی عرض کرنا ہے کہ موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے' وہاں ایک تحفہ بھی ہے۔ ایک نعمت بھی ہے یہ نعمت بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ اگر موت نہ ہو عالم کی آباد کاری نہیں ہو سکتی۔

اللہ اور فرشتوں کے درمیان مکالمہ

ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کو ملا ئکہ علیہم السلام کے سامنے پیش کیا۔ اربوں' کھربوں انسان جو قیامت تک آنے والے ہیں۔ ملا ئکہ نے انہیں دیکھ کر عرض کیا۔ یا اللہ یہ زمین میں سمائیں گے کیسے؟ یہ تو تین ارب ہو جائیں گے تو اسی وقت کہیں گے کہ نس بندی کراؤ۔ فیملی پلاننگ کرو۔ ایک طوفان برپا ہے۔ اگر وہ پچاس ارب ہو جائیں تو زمین کا کیا حشر ہو گا؟ تو ملا ئکہ کو یہ خلجان گزرا کہ زمین میں یہ کیسے سمائیں گے؟

• حق تعالیٰ نے کہا کہ موت مسلط کردوں گا۔ آئیں گے بھی جائیں گے بھی' زمیں خالی ہوتی رہے گی۔ اگلے آتے رہیں گے' پچھلے جاتے رہیں گے۔ تو میں نے موت کا سلسلہ قائم کیا تاکہ جانے والے جائیں' اور آنے والے خالی جگہ آکر بستے جائیں۔

اس پر ملا ئکہ نے عرض کیا جب موت مسلط ہو گی تو ہر وقت موت کی فکر لاحق ہو گی' ان کی زندگی تلخ ہو جائے گی۔ نظامِ دنیا کیسے چلے گا؟ ہر وقت موت کی فکر میں غرق رہیں گے ___ فرمایا حق تعالیٰ نے کہ امیدیں مسلط کردوں گا ان کے قلوب پر۔ اُمیدوں میں لگے رہیں گے۔ موت کا دھیان بھی نہیں ہو گا' نظام دنیا چلتا رہے گا۔

بہر حال موت جہاں "فزعِ اکبر" ہے گھبرا دینے والی چیز ہے۔ وہاں آباد کاری کا بھی ذریعہ ہے اگر موت نہ

ہوتی تو اس زمین پر آباد کاری ممکن نہ ہوتی۔ تو مسافروں کی طرح آتے ہیں انسان اور چلے جاتے ہیں۔ جگہ خالی کردیتے ہیں۔

موت دنیوی تحفہ بھی ہے

اور اگر دنیوی لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی موت ایک عجیب نعمت ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ **الموت تحفة المؤمن** (موت سب سے بڑا تحفہ ہے مؤمن کے لئے) اس سے بڑھ کر اللہ کی طرف سے کوئی نعمت نہیں دی گئی اور کیوں ہے وہ تحفہ؟ اس کی وجہ بھی حدیث میں ہے: **الموت جسر یصل الحبیب الی الحبیب** (موت ایک پل ہے جس سے گزر کر آدمی اپنے حبیب سے جاملتا ہے)۔ تو محبوب حقیقی سے مل جانا' یہ کوئی گھبرانے کی چیز ہے؟ یہ کوئی مصیبت ہے؟ یہ تو عین خوشی کی چیز ہوئی۔ بندہ اپنے خدا سے جاملے۔ تو جس طرح کسی بندے کی پیدائش پر خوشیاں مناتے ہیں۔ میں کہتا ہوں موت بھی خوشی کی چیز ہے۔ (اس پر بھی خوشیاں منانے کا اہتمام ہوا کرے) مگر لوگ تو یوں کہیں گے کہ یہ تو بالکل الٹی بات ہے' عقل کے بالکل خلاف' لوگ رونے لگتے ہیں خوشی کیسے منائیں گے؟

میں کہتا ہوں وہ رنج' موت پر نہیں۔ وہ فراق پر رنج ہوتا ہے۔ موت کی خوشی ہوتی ہے کہ بندہ اپنے خدا سے جاملا۔ اسی لئے کہا کرتے ہیں کہ کسی کی اگر اچھی موت ہو کہ خدا ایسی موت تو سب کو نصیب کرے۔ اگر موت خوشی کی چیز نہ ہوتی تو کیوں کہتے لوگ؟

معلوم ہوا موت گھبرانے کی چیز نہیں ہے' جو روتے ہیں' وہ موت پر نہیں روتے۔ جُدائی پر روتے ہیں کہ ایک نعمت ہم سے چھن گئی۔ ایک چیز ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ تو صدمہ فراق پر ہے موت پر نہیں۔ موت خوشی کی چیز ہے۔ اس لئے کہ یہ مصیبت تو نہیں ہے کہ بندہ اپنے اللہ سے جاملے۔ یہ تو عین خوشی کی چیز ہے کہ بندہ محبوبِ حقیقی تک پہنچ گیا۔

موت کی تمنّا کرنا علامتِ ولایت ہے

اسی واسطے موت کی تمنّا یہ فی الحقیقت ولایت کی علامت بتلائی گئی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ یہود نے دعوےٰ کیا تھا کہ ہم اولیاء اللہ ہیں' تو قرآن نے دعوےٰ کیا کہ:

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ○

تو خود موت کی تمنّا بھی ایک نعمت ہے۔ اسی واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے:

اللّٰھم حبّب الموت الی من یعلم انی رسولک

"اے اللہ! ہر اس شخص کے دل میں موت کی محبت ڈال دے جو میرے نبی ہونے کا قائل ہے"۔ اس لئے کہ موت ہی واسطہ ہے اللہ تک پہنچنے کا موت نہ ہو تو بندہ اللہ تک کیسے پہنچے؟ تو موت ذریعہ ہے وصول الی اللہ کا۔ اس لئے موت تحفہ بھی ہے' نعمت بھی ہے اور واسطہ بھی ہے بندہ کا اللہ سے۔ اس لئے فرمایا کہ موت کی تمنّا کرنا ولایت کی علامت ہے۔

اولیاء اللہ رات دن موت کی تمنّا میں رہتے ہیں۔ ان کی زبان پر تو یہ رہتا ہے ؎

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردیم
راحتِ جاں طلبم وزپئے جاناں بردیم

نذر کردم کہ اگر آید بسرزیں غم روزے
تادر میکدہ' شاداں و غزل خواں بردیم

وہ کون سا مبارک دن ہو گا کہ اس اُجڑے ہوئے دیار کو ہم چھوڑیں گے' اور شہر مطلوب میں پہنچیں گے' جہاں اللہ سے ہمارا رابطہ قائم ہو گا۔ خدا کرے کہ وہ ساعت جلد آئے تو اولیاء اللہ کے دل میں تو (موت کی) تڑپ رہتی ہے۔

حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھوپالی نقشبندی خاندان میں سے ہیں اور ہمارے عزیزوں میں سے تھے' ان سے بہت فیضان اور (مخلوق کو) فائدہ ہوا۔ مرضِ وفات جب شروع ہوا' اور موت بالکل قریب آئی تو لوگوں نے جا کر تسلّی دی کہ حضرت فکر نہ کریں' اِن شاء اللہ صحت ہو جائے گی۔ غصہ آگیا مولانا کو' فرمایا :

"عمر بھر اس وقت کی تمنا میں تھے اور تم اس کو ہٹانے آئے ہو' خُدا خُدا کر کے وقت آیا کہ موت قریب آئی اور تم موت سے تسلّی دیتے ہو کہ اور زندہ رہوں۔ خبردار اس کے بعد یہ جملہ نہ کہیو' دعا کرو حُسنِ خاتمہ ہو جائے۔ تسلّیاں مت دو کہ میری عمر زیادہ ہو۔ عمر بھر میں اس وقت کی تمنا میں تھا۔ وقت آیا تو تم ہٹانے آگئے"۔

طالب علمانہ شبہ

یہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی طالب علم' طالب علمانہ طریق سے شبہ کرے کہ ایک حدیث میں تو موت کی تمنّا کرنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ :

لایتمنین احدکم الموت
"دیکھو تم میں کوئی موت کی تمنّا نہ کرے"

یہاں تو فرمایا جا رہا ہے کہ موت کی تمنّا نہ کرو' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعا دیتے ہیں کہ موت کی محبت ہر قلبِ مسلم میں ڈال دی جائے۔ تو بظاہر تعارض ہے :

جواب

میں کہتا ہوں تعارض نہیں ہے جس حدیث میں فرمایا گیا کہ "دیکھو موت کی تمنّا نہ کرو" اُسی روایت میں

یہ لفظ بھی ہیں۔ بضر نزل بہ موت کی تمنا مت کرو دنیا کی کسی مصیبت سے گھبرا کر۔ بیماری سخت ہو گئی کہ موت کیوں نہیں آجاتی؟ افلاس بڑھ گیا' تمنا کرو' اس کی ممانعت ہے کہ دنیا کے مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا مت کرو' یہ بے اعتمادی ہے حق تعالیٰ پر اور یہ بندگی کے خلاف ہے۔ باقی اللہ سے ملاقات کے شوق میں تمنا کرنا یہ ولایت کی علامت ہے۔ تو ہر ولیٔ کامل دل میں شوق رکھے گا اللہ سے ملاقات کا' اور چاہے گا کہ جلد اللہ تک پہنچ جاؤں۔ بہر حال موت جہاں گھبرا دینے والی چیز ہے وہاں ایک عظیم تحفہ اور نعمت بھی ہے۔

موت' چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے

میں کہتا ہوں کہ اس لحاظ سے بھی ایک بڑی نعمت ہے کہ اگر قیامت تک سارے بڑے بیٹھے رہا کرتے تو چھوٹوں کے جوہر کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوتی۔ چھوٹوں کا نہ علم سامنے آتا نہ کمال مگر بڑوں کا کمال سامنے رہتا' سب اسی میں لگے رہتے اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک دنیا میں تشریف رکھتے تو صحابہؓ کے جوہر نہیں کھل سکتے تھے۔ وہ ہر وقت اطاعت اور اطاعت گزاری میں رہتے۔ مستقل ہو کر آگے آکر اپنی طبیعت اور قلب کے جوہر نہ دکھلاتے۔ نہ صدیق اکبرؓ کے جوہر کھلتے نہ فاروق اعظمؓ کے جوہر کھلتے۔ یہ جبھی ہوا جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے' اور یہ قائم مقام بنے' قائم مقامی کا کام انجام دیا' اس میں تمام جوہر کھلے۔ تو میں کہتا ہوں کہ اس لحاظ سے بھی موت نعمت ہے کہ چھوٹوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے۔

اگر آج مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہیں ہیں۔ بیشک غم کی چیز ہے لیکن ان کے خلفِ صالح موجود ہیں۔ ان کی ذریتِ صالح موجود ہے' ان کے تلامذہ موجود ہیں جو اس کام کو جاری رکھیں گے اور ان کی طبیعت میں جو جوہر موجود ہیں وہ کھلیں گے۔ اگر مولانا ہی رہتے تو یہ چیزیں کبھی نہ کھلتیں۔ تو یہ بھی ایک فائدہ کی چیز ہے۔ اگلوں کے جوہر کھلنے کا ذریعہ ہے۔ اگلے دنیا کو آباد کریں گے' وہی کلمہ پہنچائیں گے۔

موت اصلاح و تربیت کے تعدد و تفنن کا ذریعہ ہے

موت نہ ہو تو نئی نسل کے دین سمجھنے میں دشواری پیش آتی' کیونکہ ہر زمانے کی نفسیات الگ الگ ہوتی ہیں۔ ہر سو برس بعد نفسیات بدل جاتی ہیں۔ اسی واسطے حدیث میں وعدہ کیا گیا: **ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجددلھا دینھا** "ہر قرن پر مجدد کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جاہلانہ طریق پر جو لوگ تاویلیں کر کے دین میں خلط پیدا کر دیں گے۔ اللہ سو برس کے بعد پھر مجدد پیدا کر دیں گے۔ وہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دے گا' پھر دین کو نکھار دے گا۔ اس لئے کہ سو برس میں ایک نسل ختم ہو کر دوسری نسل کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہر آئندہ آنے والی نسل کے نظریات الگ ہوتے ہیں' افکار الگ ہوتے ہیں' نفسیات الگ ہوتی ہیں۔ اس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ اسی دور کے اہل علم اپنی نفسیات میں ان کو دین سمجھانے والے ہوں۔ پرانے لوگ اگر ہوتے تو اپنی نفسیات میں سمجھاتے تو وہ لوگ دین کو نہ سمجھ سکتے۔ اس لئے اللہ نے موت کو رکھا تاکہ نئے لوگ جب آئیں تو نئے مجدد بھی پیدا ہوں۔ اسی زمانے کی اصطلاح میں' اسی زبان میں' اسی ڈھنگ سے دین کو پیش کریں اور سمجھائیں' تو موت اس لحاظ سے بھی بڑی نعمت ثابت ہوتی ہے کہ وہ ذریعہ ہے تربیت اور اصلاح کے تفنن اور تعدد کا' تاکہ مختلف الوان سے تربیتِ خداوندی میں داخل ہوں۔

ہر دور کے تقاضوں کے مطابق علماء وقت نے اسلام پیش کیا

ایک زمانہ تھا کہ روایت کا غلبہ تھا۔ عوام میں سے کوئی اس وقت تک دین کی بات نہیں مانتا تھا جب تک کہ سند پڑھ کر کوئی حدیث نہ سنا دی جائے۔ تو یہ روایت کا دَور تھا۔ روایتی طور پر دین کو قائم کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد عقل پسندی کا دور آیا۔ یہ معتزلہ کا دور تھا۔ کوئی شخص دینی مسئلہ نہیں جانتا تھا جب تک کہ عقل کے پیرائے میں نہ سمجھائیں۔ تو ایسے علماء اللہ نے کھڑے کئے۔ امام رازیؒ امام غزالیؒ کہ انہیں کی زبان میں دین سمجھایا' ان کو تائب کیا۔ پھر ایک زمانہ تصوّف پسندی کا آیا' جب تک صوفیانہ رنگ میں کوئی نہ سمجھائے' لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ تو اللہ نے ایسے صوفیائے کرام کھڑے کئے کہ ہر مسئلہ کو صوفیانہ رنگ میں ڈھالتے کہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔

آج حسیّات کا دَور ہے۔ فلسفۂ قدیم کا دور ختم ہو گیا جو محض نظریاتی طور پر فلسفہ تھا۔ اب حسیّات کا دَور ہے' مشاہدات کا دوَر ہے' جب تک ایسے علماء نہ ہوں کہ مشاہدات کے انداز میں سائنس کے انداز میں' حسّی مثالوں سے دین کو نہ سمجھائیں گے' لوگ نہیں سمجھیں گے۔ اگر بڑے ہی لوگ بیٹھے رہتے' آج کی اصطلاحات سے ناواقف ہوتے' تو دین نہ سمجھا سکتے۔ اللہ نے انہیں اٹھالیا' ان کے خلف صالح پیدا کر دیئے کہ وہ اس دوَر کے مطابق اسی رنگ میں سمجھائیں' تو بہر حال موت جیسے فزعِ اکبر ہے' جیسے عظیم ترین مصیبت ہے' ویسے ہی عظیم ترین نعمت بھی ہے' عظیم ترین انعامِ خداوندی بھی ہے۔ موت کے بارے میں صرف ایک پہلو ہی سامنے نہ رہنا چاہئے۔ ہائے افسوس' ہائے افسوس کا' بلکہ خوشی کا بھی ایک پہلو ہے کہ یہ تحفۂ مؤمن بھی ہے۔ یہ طریقہ ہے' راستہ ہے اللہ تعالیٰ کو ملنے کا۔ یہ طریقہ ہے دنیا کی آباد کاری کا۔ یہ طریقہ ہے نئے نئے علوم پیدا ہونے کا' اور نئے نئے مرتبوں کے پیدا ہونے کا۔ اس لئے موت کا ایک پہلو نہیں کہ اس سے ڈریں بلکہ موت میں پہلو خوشی کا بھی ہے کہ اس کا انتظار بھی کرے' اس کی تمنّا بھی دل میں رکھے' تو اس لئے میں نے عرض کیا کہ لوگ موت کو ہر وقت وحشت ناک سمجھتے ہیں' حالانکہ وہ وحشت کی چیز نہیں ہے اگر تعلق مع اللہ مضبوط ہے تو اس سے بڑھ کر نعمت کوئی چیز نہیں اگر غفلت ہے تو بیشک موت عظیم ترین مصیبت بھی ہے' اسی واسطے وہ کفّار کے حق میں مصیبت ہے' مؤمن کے حق میں مصیبت نہیں۔

کافر کی تمنّا

اور فرمایا گیا کہ کافر تمنّا کرتا ہے کہ زندگی بڑھتی ہی رہے۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ

تم ان کفّار کو دیکھو گے کہ سب سے زیادہ حریص ہیں دنیا کی زندگی پر۔ موت کے نام سے بھی موت آتی ہے انہیں' اور مشرکین کو اگر ہم ہزار برس کی عمر بھی دے دیں تو اسی کی تمنّا کریں گے کہ ایک ہزار برس اور ہو' یہ حال اور خاصّہ کفّار کا ہے۔ اور مؤمن کا یہ ہے کہ لمبی عمر ہو جائے تو اُکتا جاتا ہے کہ اللہ جلدی بُلا لیجئے کہ آپ سے مل لوں۔

تو بالکل برعکس ہے قصہ' تو موت سے فقط ڈرتے رہنا' گھبراتے رہنا غفلت کی علامت ہے' اور یہ غفلت (عنِ الحق) کفر کا سرا ہے اللہ بچائے ہر ایک کو۔ اور حق تعالیٰ سے موت کی تمنّا کرنا یہ بیداری اور تعلّق مع اللہ کی علامت ہے۔ اس لئے موت کا ایک ہی پہلو نہیں کہ آدمی رنج کرتا رہے بلکہ رنج کرنے سے روکا بھی ہے۔

طبعی رنج جتنا ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن اس رنج کو پالنا' تازہ کرتے رہنا' اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا اور فرمایا :

لیس منا من ضرب الخدود وشق الجیوب

''وہ ہم میں سے نہیں ہے جو موت کے غم میں بال نوچ ڈالے' رخسارے پیٹ ڈالے' چھاتی پیٹ ڈالے''۔

اس لئے کہ موت آتی ہے بیدار کرنے کے لئے نہ کہ غافل بنانے کے لئے' کہ آدمی اسی میں اُلجھ کر رہ جائے۔ موت آئی' اناللہ پڑھا۔ اس کے بعد مرنے والے کے عمل کو جاری کیا۔ اپنے عمل کو جاری کیا۔ اپنی تیاری شروع کردی' تو موت بیداری پیدا کرنے والی چیز ہے نہ کہ غافل بنانے والی۔ بیداری جس سے پیدا ہو وہ تو نعمت ہے' مصیبت تھوڑا ہی ہے۔ مصیبت بنتی ہے اس کے لئے جس پر غفلت طاری ہو۔

غفلت عَنِ الحق کے بُرے آثار

غافل عَنِ الحق کو موت کے نام سے بھی موت آتی ہے' جو اللہ سے غافل ہو موت کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرے گا' ہر وقت اسی موڑ میں رہے گا۔ پھر اس میں سرکشی تمرّد اور بغاوت پیدا ہوگی۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ فرعون کی عمر چار سو برس کی ہوئی' اس عمر میں کبھی بھی بیمار نہیں ہوا' کبھی بھی کوئی مصیبت نہیں دیکھی' تو کبر اور نخوت میں اپنے آپے سے باہر ہوگیا' اور کہا : اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى یعنی میں سب سے بڑا رب ہوں' اور موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر و تذلیل کے درپے ہوا' اور کہا :

اَلَيْسَ لِىْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِىْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (زخرف پارہ ۲۵)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے پاؤں کے نیچے نہریں جاری ہیں' مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں ہے۔ کرسیاں میری مضبوط ہیں اور میرے مخالفین کو تم عزّت دار سمجھتے ہو جس کے کپڑے بھی ٹھیک نہیں' یعنی موسیٰ علیہ السلام' تو توہین کے درپے ہوا''۔

یہ کیوں ہوا توہین کے درپے۔ اس لئے کہ غفلت تھی اللہ سے' تو غفلت والے کو موت کے نام سے موت آتی ہے۔ اور (فرعون کی) جب واقعی موت آنے لگی اور لگا ڈوبنے تو بآواز بلند کہا۔ میں ایمان لایا موسیٰ علیہ السلام پر اور ان کے پروردگار پر' جس کو فرمایا گیا :

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (یونس پارہ ۱۱)

''اب ایمان لایا جب کہ عالم غیب منکشف ہوگیا۔ اور اب تک دنیا میں فساد برپا کرتا رہا''۔

بعض روایات میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام اس کے منہ میں ریت ٹھوس رہے تھے کہ ایسا نہ ہو یہ ایسے کلمات کہے' کہیں نجات ہی نہ ہوجائے۔ بدبخت بخشا نہ جائے۔ ساری عمر تو مخلوقِ خُدا کو پریشان کیا اور اب نجات پا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ علیہم السلام پر غلبہ حال کا ہوتا ہے غلبہ محبت کا یا غلبہ عداوت کا۔ بہر حال جب غفلت طاری رہتی ہے' اللہ سے بَری رہتا ہے۔ جب بَری رہے گا' موت کو ناپسند کرے گا' اور اگر

غفلت کی بجائے بیداری او قلب میں ذکرُ اللہ ہے تو اللہ سے قریب ہو گا اور موت کی تمنّا بھی کرے گا۔ اور وہ ذریعہ بنے گا قُربِ خداوندی کا۔ تو موت کا جہاں پہلو غم کا ہے وہاں خوشی کا بھی ہے۔ جہاں دل بیٹھنے کا ذریعہ ہے وہاں دل کے اُبھرنے کا بھی ذریعہ ہے اس واسطے دونوں پہلوؤں کی موت کے اندر رعایت رکھنی چاہئے۔ کوئی میّت ہوگئی تو یہ نہیں کہ آدمی غم میں ڈوب کر آپے سے باہر نکل جائے۔ عقل سے بھی کام لے' جو اس کے لئے نفع بخش ثابت ہو۔

میّت پر جزع فزع

اگر غم میں بیٹھ کر آدمی نے بین کرنا شروع کیا تو میّت کو کیا فائدہ پہنچا' بلکہ میّت کو تکلیف پہنچتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ :

ان المیت لیعذب ببکاء اھلہ علیہ۔

جب بین کر کے لوگ روتے ہیں تو میّت کو تکلیف پہنچتی ہے اور ایذا پہنچتی ہے یوں کر کے رویا جائے کہ واجبلاہ ہائے تُو تو پہاڑ تھا' تو ملا ئکہ چوکہ لگاتے ہیں کہ کیا واقعی آپ پہاڑ تھے؟ وہ کہتے ہیں واشمساہ کہ تُو تو سورج تھا' ملا ئکہ چھوتے ہیں کہ کیا واقعی آپ سورج تھے؟ اس سے اذیّت پہنچتی ہے میّت کو۔ تو رونا' بکاء' تو د' جزع' فزع' یہ میّت کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔

اسی واسطے حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا کہ میّت ہونے پر پہلا کام تو یہ ہے کہ صبر کرو اور اِنَّا لِلّٰہ پڑھو۔ دوسرا کام یہ ہے کہ اس کو نفع پہنچانے کی کوشش کرو' تو وہ رونے سے نہیں پہنچتا' ثواب پہنچانے سے پہنچتا ہے۔ جس کے لئے ایصالِ ثواب ہوگا۔ اس کے لئے باعثِ خیر و برکت ہوگا۔ تو میّت کے لئے ہمیں نافع ہونا چاہئے اور میّت کا نام آئے تو اس کے لئے فائدہ کا سامان پہنچانا چاہئے۔ حدیث میں فرمایا گیا کہ :

اذکروا محاسن موتا کم اپنے مرنے والوں کی خوبیاں یاد کرو اور لوگوں کے سامنے بیان کرو' مرنے والوں کی بُرائیاں مت ذکر کرو۔ اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اگر اللہ نے بخش دیا ہے تم اگر بُرئیاں کرتے ہو اس سے کیا ہوتا ہے؟ تمہاری زبان گندی ہوگی' وہ تو مغفور ہوگیا۔ جتنا ممکن ہو خوبیوں اور اچھائیوں کا ذکر کرو۔ تاکہ لوگوں کو اچھا کام کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ بہرحال میّت ہونے کے بعد دوسرا کام یہی ہے کہ طبعی رنج ہوتا ہے۔ اس سے اللہ نے نہیں روکا۔ لیکن عقلاً روک دیا ہے کہ غم کو پالنے کے لئے مت بڑھاؤ۔

میّت پر ضرورت سے زیادہ غم کرنا رسمی ہوتا ہے' حقیقی نہیں۔ وہ رسمی غم ہوتا ہے جس کا زمانۂ جاہلیّت میں دستور تھا' کہ جب کوئی بڑا آدمی مرجاتا تو وصیّت کر کے جاتا تھا کہ مجھے چھ مہینے رویا جائے' مجھے برس تک رویا جائے تو باندھیاں کرائے پر رکھتے کہ انہیں رونے کی مشق ہوتی ہے' جہاں گردن جھکائی اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہوگئے۔ تو کرایہ پر جہاں رونے والی رکھی جاتی ہوں' جہاں انہوں نے دیکھا کہ کوئی تعزیّت کے لئے آیا' یا کوئی نیا آدمی آیا وہاں انہوں نے گھیرا بنایا اور رہا ہا شروع کی کہ واجبلاہ واشمسا واقمراہ ہائے تو تو پہاڑ جیسا تھا وغیرہ' بیٹھی رو رہی ہیں۔ تو راہ گیر کہتے تھے کہ کوئی بڑا آدمی مرگیا ہے جو چھ مہینے گزر گئے اور اب تک رویا جا رہا ہے' تو یہ علامت تھی بڑے ہونے کی۔

ظاہر بات ہے کہ یہ رونا کوئی حقیقی رونا تھوڑا ہی تھا۔ یہ تو رسمی اور بناوٹی رونا تھا۔ اسلام نے تصنّع اور بناوٹ نہیں سکھلائی۔ حقیقت بتلائی ہے' کہ محض تصنّع اور بناوٹ سے کوئی کام کرنا کوئی حقیقت نہیں' کہتا۔ طبعی غم ہو اس کا مضائقہ نہیں لیکن عقلی طور پر غم کو پالنا اور بڑھاتے رہنا زمانۂ جاہلیّت کی رسم تھی۔ اسلام

نے یہ رسم نہیں رکھی۔ اس نے تو یہ سیدھی بات بتلادی کہ جب کوئی انتقال کرے تو صبر جس سے آئے وہ پڑھو ــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

آیتِ اِسترجاع میں عقلاً و طبعاً صبر کی تعلیم ہے

اس آیت میں صبر اور تسلّی کا پورا سامان موجود ہے۔ جب آدمی نے یوں کہا اِنَّا لِلّٰہِ ہم سب اللہ کی مِلک ہیں۔ اس سے عقلی طور پر صبر آگیا کہ جب ہم اللہ کی ملک ہیں تو اپنی مملوک میں وہ جو چاہے تصرف کرے۔ چاہے اُٹھائے، چاہے دنیا میں زندہ رکھے۔ ہم کون ہیں اس میں دخل دینے والے؟ اس سے صبر آجائے گا عقلی طور پر کہ ہم مملوک ہیں اور مالک کو اختیار ہے، اپنی مملوک میں جو چاہے کرے۔ مگر طبعاً ابھی تک گھٹن موجود تھی، طبعی رنج بھی ہوا تھا، تو دوسرے جملے میں اس کا علاج بتلایا فرمایا : وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہ جب ہم بھی وہیں جائیں گے۔ ملاقات ہوجائے گی۔ ہمیشہ کے لئے تھوڑا ہی جدائی ہوتی ہے، تو اِنَّا لِلّٰہِ کے لفظ سے عقلاً اور اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ سے طبعاً بھی صبر آجاتا ہے۔ دعا اس لئے بتلائی گئی تاکہ صبر و تحمّل کے ساتھ اپنے عمل میں لگیں، غم میں نہ گھلیں بیٹھ کر.... (فارسی میں عرفی کا ایک شعر جس کا ترجمہ یہ ہے)۔

اگر رونے سے مرنے والا واپس آجایا کرتا تو ہم ہزار برس رولیا کرتے، مگر وہ واپس آنے والا نہیں ہے۔ جو گیا سو گیا۔ اب اس جہاں میں دوبارہ آنے والا نہیں ہے اب ملاقات ہوگی تو اس جہاں میں ہوگی۔ یہ جہان بھی ختم ہوجائے گا۔

مؤمن اور کافر کی موت کا موازنہ

مؤمن کو تو ہر وقت آس لگی ہوتی ہے کہ اپنے عزیزوں سے ملوں گا، دوستوں سے ملوں گا اور فلاں فلاں سے ملاقات ہوگی۔ کافر جس نے ساری زندگی اسی دنیا کو سمجھا ہے، مایوس وہ ہے مسلمان نہیں۔ اس لئے کہ اسے کوئی تمنا نہیں ہے تو بہرحال اسی حکم (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) سے صبر آجاتا ہے۔

تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس وقت نہ کوئی جلسہ تھا نہ کوئی وعظ کہنا مقصود تھا، نہ کوئی تقریب مقصود تھی، تعزیت مقصود تھی، اور تعزیت ہنگاموں کو نہیں چاہتی، یہ ہمارے مولانا (محمد شریف صاحب مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان) نے بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ آپ لوگوں کو تکلیف دی۔ میں تعزیت کے لئے حاضر ہوا تھا تو تعزیت کرکے واپس ہوجاتا۔ لیکن خیر بہرحال جب آپ حضرات تشریف لے آئے اور آپ کا کرم ہوا اور ہماری سعادت ہوئی کہ اتنے بھائیوں کی زیارت نصیب ہوگئی، اتنے بھائیوں سے ملنا ہوگیا۔ تو مجمع کی ہیئت ایسی بن گئی کہ آپ سامنے بیٹھ گئے، مجھے اس کرسی پر بٹھلادیا، اور سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھ دیا، تو خواہ مخواہ بولنا ہی پڑتا ہے۔ یہ ہیئت مقتضی ہوئی کہ کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ اس لئے میں نے وہی چند کلمے کہے جو آنے کے مقصد سے متعلق تھے اور وہ مقصد تھا تعزیت۔ تو تعزیت ہی کے سلسلے میں کچھ موت کا ذکر، کچھ موت کے پہلوؤں کا ذکر، کچھ مولانا (خیر محمد صاحب) مرحوم کی خیر و خوبی کا ذکر، کچھ انکے پس ماندگان کا ذکر، اور ان کے خلفاء کا ذکر، یہی چیزیں تعزیت میں آسکتی تھیں اس لئے چند جملے عرض کئے گئے، حق تعالیٰ شانہٗ صبر کی توفیق دے اور مولانا مرحوم کا نعم البدل ہمیں زیادہ سے زیادہ عطا فرماوے، اور ان کا جو کام تھا حق تعالیٰ اس کو جاری و ساری رکھے

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ

اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

ضروری نوٹ

ہمارے ہاں یہ بات ہمارے قومی مزاج میں داخل ہو چکی ہے کہ ہر نو وارد سے مصافحہ کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اس میں دوسرے کی راحت کا خیال پیش نظر نہیں رکھا جاتا' حالانکہ نظم و ضبط مسلمان کا امتیازی نشان تھا۔ حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ العالی تقریر فرما چکے تو ایک اژدہام اسٹیج کی طرف اُمڈ آیا' اور مصافحہ کی کوشش میں ادب و احترام اور ایذاءِ مسلم کا بھی بالکل پاس نہ رہا' بلکہ ایک دھینگا مشتی کا عالم تھا جو نہایت قابلِ افسوس تھا' اور خصوصاً ایسے مجمع میں جہاں علماء کرام اور مدارس عربیہ کے طلباء کرام کی کثیر تعداد تھی۔ لیکن بایں ہمہ وہ سب کچھ ہوا جس کی توقع کم از کم دینی تعلیم یافتہ اصحاب سے نہ تھی۔ حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی نے مجمع کی اس پراگندہ حالت کو دیکھ کر نظم و ضبط کی تعلیم فرمائی۔ اس کے باوجود حضرت قاری صاحب مدظلہٗ العالی کو اسٹیج سے اپنی رہائش تک رسائی میں انتہائی دِقت اور دشواری پیش آئی۔ جلسہ کے منتظمین مجمع عام ہونے کی وجہ سے اپنی اپنی جگہ معذور تھے۔ یہ چند کلمات بھی جو کہ ہمارے قومی مزاج کی اصلاح کے لئے آپ نے ارشاد فرمائے تھے' ذیل میں رقم کئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ سب کو عمل کی توفیق بخشے

(از مرتب غُفرلہٗ)

بحیثیت مسلمان ہونے کے آدابِ شرعیہ اختیار کریں۔ آپ کے اندر نظم و ضبط ہونا چاہئے۔ مصافحہ باعثِ برکت چیز ہے اور بہت خیر کی چیز ہے۔ اس پر اَجر کے وعدے کئے گئے ہیں ___ فرمایا گیا ہے کہ دو مسلمان جب مصافحہ کرتے ہیں' اور دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ آجائے تو ہاتھ جُدا نہیں کرپاتے کہ دونوں کے گناہوں کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ تو مصافحہ بڑی باعثِ برکت چیز ہے مگر ہر اطاعت کے اندر یہ شرط ہے کہ دوسرے کو اذیت نہ پہنچے' تکلیف کا سامان نہ ہو' ایذا رسانی حرام ہے اور مصافحہ کرنا فرض نہیں۔ ایک مستحب کے لئے ایک مکروہ چیز کا ارتکاب کرے یہ غلط بات ہے۔ لوگ جو مصافحہ کے لئے دوڑتے ہیں' یہ طریقہ آدابِ اسلامیہ کا نہیں ہے۔ اسے بالکل ترک کردیا جائے اور پھر اس طریق سے ہاتھا دھاپی' جس سے مصافحہ کرتے ہیں وہ بھی عاجز آجاتے ہیں ___ یہاں ہم پاکستان میں عاجز ہوتے' تو قاعدے سے تو ہم پولیس کی حراست میں تھے اور ان کی نگرانی میں تھے اور اب قوم کی حراست میں ہوگئے کہ جب تک حلقہ نہ بنے بھگدڑ دھیڑ نہیں کی جاسکتی۔ یہ کیا واہیات بات ہے؟ یہ مصافحہ ہے؟ یہ تو ایذا پہنچانا ہے۔ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کی تکلیف نہ کریں۔ جب میں اُٹھوں تو راستہ دے دیں۔ یہ مصافحہ خیر و برکت نہیں ہوگا جس میں اذیت پہنچے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده مسلمان وہ ہے جس کی زبان سے' جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو یہ ہاتھ سے تکلیف پہنچانا ہے۔

آپ حج کو جاتے ہیں۔ حجرِ اَسود کا بوسہ یا تو مستحب ہے یا واجبات میں سے ہے' مگر جب دوسرے کو تکلیف پہنچے تو شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس کی طرف ہاتھ اُٹھا کر اس کو چوم لے' یہ مصافحہ ہوگیا۔ ہاتھ بھی نہ اُٹھا سکو تو لکڑی سے اشارہ کرو یہ کافی ہوگیا۔ وہاں تو مصافحہ واجب تھا' اس کے لئے بدل رکھا اور یہاں تو واجب بھی نہیں ہے۔ اس واسطے خواہ مخواہ دوسروں کو اذیت پہنچانا' آپا دھاپی اختیار کرنا' اَجر تو اَجر' اس پر تو وبال ہوگا ___ اس لئے کوئی صاحب مصافحہ کا ارادہ نہ کریں۔ اور میں ویسے بھی کمزور ہوں' ضعیف اور بیمار ہوں' خود کو تحمّل نہیں کہ ایک ہزار آدمیوں سے مصافحہ کروں۔ ہر ایک تو ایک دفعہ کرے گا' مجھے ایک ہزار مرتبہ ہاتھ اُٹھانے پڑیں گے۔ مجھ میں یہ طاقت نہیں ہے ___ لہٰذا بیٹھیں رہیں اور جب اُٹھوں تو راستہ دے دیجئے۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

اِسلام میں تصوّرِ آخرت

آخرت کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے تصور باندھ رکھا ہے کہ آخرت تو آسمانوں کے اوپر ہے' اور دنیا یہ ہے۔ یہ غلط ہے بلکہ ہماری آخرت اسی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ اسے نکالنا ہمارا کام ہے۔ یہی کھانے' پینے کے اور سونے جاگنے کے افعال انہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ ان کے ذریعے سے اپنی آخرت نکالو۔ یہ نہیں کہ آخرت کوئی الگ عالم ہے اور دنیا ترک کرو' تب جا کے آخرت میں پہنچو گے......

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ'

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ـــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــ

بزرگانِ محترم!

دنیا اور آخرت دو چیزیں ہیں۔ آخرت کے بارے میں عام طور پر لوگوں نے یہ تصوّر باندھ رکھا ہے کہ آخرت تو آسمانوں کے اوپر ہے' اور دنیا یہ ہے' یہ غلط ہے ـــــ بلکہ ہماری آخرت اسی دنیا میں چھپی ہوئی ہے۔ اسے نکالنا ہمارا کام ہے یہی کھانے پینے کے اور سونے جاگنے کے افعال' انہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ ان کے ذریعے سے اپنی آخرت نکالو۔ یہ نہیں کہ آخرت کوئی الگ عالم ہے' اور دنیا ترک کرو تب جا کے آخرت میں پہنچو گے۔ دنیا میں رہ کر اس میں سے آخرت نکال لینا' یہ دانش مند کا کام ہے۔ یہ جو آپ نماز روزہ کرتے ہیں بدن ہی سے تو انجام دیتے ہیں' وہ بدن زمانے میں ہے یا مکان میں ہے' تو اس میں سارے دنیوی ہی افعال ہیں۔ اس سے جنت بن رہی ہے۔ جنت اس نماز سے ہی تو نکلی جو آپ نے بدن سے سرانجام دی۔ آخرت کوئی الگ تو نہیں تھی۔

یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا' اور ہزاروں نیکیاں لکھی گئیں' وہ ہزاروں نیکیاں جنت ہی تو ہیں۔ تو اس دنیا ہی میں آخرت چھپی ہوئی ہے۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے ـــــ افعال صحیح ہو کے آئیں' جنت یہیں سے بن جائے گی۔ افعال غلط ہو کے آئیں' تو جہنم یہیں بن جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا' اگر آدمی کھانا کھانے بیٹھے۔ کھانا ایک طبعی فعل ہے۔ بھوک لگے گی تو آدمی خواہ مخواہ

کھائے گا‘ لیکن اس نیت سے کھانے بیٹھے کہ قوت پیدا ہوگی تو عبادت کروں گا۔ اور بِسۡمِ اللّٰہِ سے شروع کرے اور "اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ کَثِیۡرًا" پر کھانا ختم کرے۔ فرماتے ہیں کہ اس کے پچھلے گناہ سب بخش دیئے جائیں گے۔ حالانکہ کھائی تو روٹی اور گناہ بخش دیئے گئے گناہوں کا بخشا جانا یہی تو آخرت ہے اس لئے آخرت دنیا ہی میں ہوئی۔

حدیث میں ہے کہ دو بھائیوں نے مصافحہ کیا اور قلبی محبت سے کیا۔ دونوں کے منہ پر مسکراہٹ آگئی اور کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ فرماتے ہیں کہ ہاتھ جُدا نہیں کرنے پائیں گے کہ پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ایک طبعی فعل انجام دیا مگر اس سے مغفرت ہوگئی بہر حال اس دنیا ہی سے ہماری آخرت نکلتی ہے۔

آخرت کے بارے میں اِسلام اور دیگر مذاہب کا فرق

یہیں سے دوسرے مذاہب اور اسلام میں فرق پڑ جاتا ہے۔ دوسرے مذاہب یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت دنیا سے بالکل الگ تھلگ کوئی چیز ہے۔ جب تک ترک دنیا نہیں کرو گے آخرت نہیں ملے گی۔ مثلاً ہندو مذہب ہے‘ اس میں سنیاس لیتے ہیں کہ گھر بھی ترک کیا بیوی بچے بھی ترک کئے‘ اور جا کر کسی کونے میں بیٹھ گئے‘ ساری لذتیں ترک کیں۔ اب سمجھتے ہیں کہ ہماری آخرت بن گئی۔

عیسائیوں کے ہاں ترکِ لذات ایک مستقل موضوع ہے‘ کہ گرجا میں آدمی داخل ہو جائے اور یہ عہد کرلے کہ میں نکاح نہیں کروں گا۔ کسی سے ملنے بھی نہیں جاؤں گا۔ بالکل ترکِ دنیا کر کے ایک کونے میں بیٹھ جائے۔ اب سمجھتے ہیں کہ آخرت ملی۔

اسلام نے ان سب چیزوں کو رد کر دیا کہ یہ رہبانیت ہے۔ اسلام نے گوشے میں بیٹھ جانا‘ پہاڑوں میں بیٹھ جانا‘ سمندر کے کناروں پر اپنے آپ کو گرا دینا‘ اس سے روکا کہ اس سے آخرت نہیں بنتی۔ دنیا میں رہ کر‘ لوگوں میں رہ کر‘ ان کی آڑی کڑی جھیل کر اصلاح کی کوشش کرے‘ اس سے آخرت بنے گی‘ اسی کھانے اور پینے سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ تم کھانا پینا چھوڑ دو۔

قرآن حکیم نے حکم دیا :

كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعۡمَلُوا صَالِحًا

اللہ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لئے بنائی ہیں‘ انہیں استعمال کرو‘ اور عمل صالح اختیار کرو۔ جتنی نیت اچھی ہوگی اسی میں سے آخرت بنے گی۔ یہ نہیں کہ کھانا پینا چھوڑ دو اور جنگل میں جا بیٹھو‘ تب آخرت بنے گی۔

اسی طرح لباس ہے۔ تو بعض مذاہب میں ترکِ لباس ہے۔ صرف لنگوٹا باندھو فرض لباس بھی ترک کیا ___ اسلام نے ناجائز قرار دیا کہ یہ رہبانیت ہے ___ گوشہ گیری ہے۔ یہ اسلام میں نہیں ہے۔ لباس پہنو‘ موٹا پہنو‘ اچھا پہنو‘ نیت اچھی رکھو۔ اسی میں سے آخرت نکلے گی۔ تو کھانا پینا‘ رہنا سہنا‘ مکان بنانا‘ اس سے اسلام نے نہیں روکا۔ مگر نیت صاف رکھنے کو کہا ہے۔ تھوڑی بہت زینت اور طبیعت کے موافق کرنے سے نہیں روکا۔ مگر نیّت صاف رکھنے کو کہا ہے۔ اس سے یہی چیزیں آخرت بنیں گی۔ تو اور مذاہب میں تو یہ کہ ترکِ دنیا سے آخرت بنتی ہے۔ اسلام یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر نیت صحیح کرنے سے آخرت بنتی ہے۔ انہی افعال میں سے آخرت بنے گی۔

اب مکان ہے۔ گیاہ میں ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کے ہاں خدا رسیدہ وہ ہے جس کا نہ گھر ہو نہ در ہو۔ صبح کے وقت ان کے ہاں ایک لشکر نکلتا ہے۔ وہ گھر گھر کھانا مانگتے ہیں۔ ان کے ہاں کھانا وانا نہیں پکتا‘ کسی نے

بھیک دے دی، کھالیا۔ اسلام نے اسے ممنوع قرار دیا کہ یہ ذلتِ نفس ہے۔ مؤمن کا یہ کام نہیں کہ اپنے نفس کو ذلیل کرے۔ بلکہ باوقار رہے۔ تو کھائے بھی، پیئے بھی، پہنے بھی، طبعیات کو استعمال کرے اور نیت یہ رکھے کہ اپنی آخرت کے لئے کر رہا ہوں۔ حکمِ خداوندی ہے تعمیل حکم کر رہا ہوں۔ وہی چیز اَجر کا ذریعہ بنے گی۔ اسلام نے یہ نہیں کہا کہ تم بھک منگے بن جاؤ۔ دنیا کماؤ، اس سے اپنی خدمت کرو، اور کسبِ حلال کو فرض قرار دیا۔ تجارت کرو۔ یہ راستہ دکھلایا نہ یہ کہ سب چیزیں چھوڑ کر پہاڑ کے گوشے میں جا کر بیٹھ جاؤ۔

بعض مذاہب میں یہ ہے کہ اعضاء کو مفلوج کردو تو آخرت بن جاتی ہے۔ مثلاً ہاتھ اونچا کر دیا، وہ خشک ہو گیا، اب وہ بیکار ہو گیا، اور وہ یہ سمجھے کہ اب آخرت بنی، اسلام نے کہا یہ لغویت ہے، اس سے آخرت کا کیا تعلق۔؟

یا بولنا چھوڑ دیا اس سے سمجھتے ہیں کہ آخرت بنی۔ اسلام نے کہا کہ یہ آخرت کیسی کہ ایک قوت کو ضائع ہی کر دیا۔ قوت سے کام لینے کا نام آخرت ہے نہ کہ قوت کو معطل چھوڑ دینے کا نام آخرت ہے۔

میرا ایک دفعہ گیاہ میں جانا ہوا، تو وہاں ایک بہت بڑا اور اونچا مندر ہے۔ اس میں بدھ کی تصویریں ہیں۔ اس کے بت رکھے ہوئے ہیں۔ وہاں ہم نے دیکھا کہ بدھ کا ایک بہت بڑا بُت ہے اور لوگ اس کے ارد گرد گھی کے چراغ جلا رہے ہیں۔ بہت سے پُجاری چراغ جلا کر جا رہے ہیں۔ میں نے ایک پُجاری سے پوچھا۔ اس گھی کو تم کیوں ضائع کر رہے ہو۔ کوئی آدمی کھاوے گا تو اس کے بدن میں قوت پیدا ہوگی اسے کیوں خواہ مخواہ ضائع کر رہے ہو..... اب وہ سنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ میں سمجھا کہ شاید یہ بہرہ ہوگا میں نے ذرا زور سے کہا۔ وہ پھر بھی دیکھ رہا ہے جواب کوئی نہیں دیتا۔ میں نے اور زور سے کہا، تو لوگوں نے مجھ سے کہا کیوں اپنا زور صرف کر رہے ہو۔ یہ جواب نہیں دے گا۔ ان کے ہاں چُپ رہنا ایک عبادت ہے۔ یہ شخص چالیس برس سے نہیں بولا، اور یہ پچاس برس سے نہیں بولا۔ تو زبان ایک قوت ہے اس کو ضائع کر دینے کا نام عبادت نہیں ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اس قوت سے ہی تو آخرت کماؤ گے۔ قوت ضائع کر دی، آدمی ناقص رہ گیا تو آخرت بھی ناقص ___ زبان کو استعمال کرو، تلاوتِ کلام پاک میں، درود شریف پڑھنے میں، اور عبادت میں، لوگوں کی اصلاح میں نیک مشورے دینے میں، اور سچی باتیں کہنے میں۔ اس میں قوت کو استعمال کرو۔ تو آخرت بنے گی۔ نہ یہ کہ قوت کو ختم کر دو، اور بیکار بیٹھ جاؤ۔ اس سے تو بدی بنے گی۔

ہاتھ ہے آپ اس کے ساتھ مصافحہ کریں گے، اَجر ملے گا۔ آخرت بنے گی۔ قرآن کریم کو ہاتھ لگائیں گے، اَجر ملے گا۔ بیتُ اللہ شریف کو چھوئیں گے، اَجر ملے گا، ہاتھ ہوگا جبھی تو اَجر ملے گا۔ اور اگر ہاتھ کو اٹھا کر خشک کر دیا، قوت بھی ختم اور اَجر بھی ختم ہو گیا۔ تو جتنے اَجر و ثواب کے راستے تھے وہ سارے بند ہو گئے۔

اسی طرح پیر کو مفلوج کر دیا۔ پیر ہوگا تو ہی مسجد کی طرف جائیں گے۔ دوستوں کے گھر بھی جائیں گے۔ عبادت گاہوں میں بھی جائیں گے۔ مجالسِ وعظ میں بھی جائیں گے۔ اس سے اَجر و ثواب کے ڈھیر ملیں گے۔ اور جو پیر کو کلہاڑا مار کے ختم کر دیا تو نہ مجلس رہی نہ مسجد کی طرف جانا رہا، نہ حج رہا۔ وہ کیا خاک اَجر ملا؟

تو تمام مذاہب نے تو یہ کہا ہے کہ دنیا ترک کرو۔ تب آخرت ملے گی۔ بدن کو کھو دو تو آخرت ملے گی۔ اسلام کہتا ہے کہ دنیا میں رہ کر آخرت پیدا کرو۔ ترکِ دنیا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کے نعمتوں کو چھوڑ دو ___ ہاں اس میں مبالغہ مت کرو۔ غُلو مت کرو۔ حد سے مت گزرو۔ اعتدال کے ساتھ استعمال کرو۔ اس سے اپنا بھی کام چلاؤ۔ اپنے بھائیوں اور عزیزوں کی بھی خدمت کرو۔ تمہاری آخرت بنے گی۔ تو یہ نیت پر اور افعالِ اختیاری پر ہے کہ مرضیٔ خداوندی کے مطابق وہ افعال ہوں گے تو دنیا ہی میں آخرت بنے گی۔

افعالِ دنیوی کے بارے میں اِسلام کا نظریہ

اب دنیا کے بڑے افعال سونا' جاگنا' کھانا' پینا' رہنا' سہنا اور مکان بنانا۔ ان سب کو حق تعالیٰ نے نعمت شمار کیا ہے فرمایا :

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِىْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ

اے پیغمبر! کون ہے جو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کرے اس نے جو پاکیزہ غذائیں اور لباس دیئے ہیں۔ کون ہے جو انہیں حرام کرے؟ ممانعت فرمادی کہ انہیں حرام مت قرار دو ___ البتہ حدود بتلادیں کہ ریشم کا کپڑا ہے۔ مرد کے لئے ناجائز' عورت کے لئے جائز۔ زیوارات میں سونا' چاندی عورت کے لئے جائز۔ مرد کے لئے ناجائز۔ تو حدود بتلادیں۔ ان حدود میں رہ کر استعمال کئے جاؤ۔

مکان ہے اس کے بارے میں اللہ نے احسان جتلایا اور فرمایا کہ :

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا

اللہ نے تمہارے گھروں میں تمہارے لئے سکون اور سکونت رکھی ہے۔ گھر بناؤ' استعمال کرو۔ اور پھر آگے کپڑوں کا بھی گھر ہوتا ہے یعنی کپڑے کا خیمہ۔ اور چمڑوں کا گھر بھی ہوتا ہے۔ یعنی چمڑے کا خیمہ۔ پتھر اور اینٹ کا گھر ہوتا ہے۔ ساری قسمیں گنوا کے احسان جتلایا۔ احسان اسی پر جتلاتے ہیں جو نعمت ہوتی ہے۔ مصیبتوں پر تو احسان نہیں جتلایا جاتا۔ مکانوں کو اللہ نے نعمت قرار دیا۔ تو کون ہے جو اللہ کی نعمتوں کو رد کرے؟ حدود میں رہ کر انہیں استعمال کرو۔ مبالغہ اور غُلو نہ کرو۔ ایک عام شریعت میں جو راحت کے سامان ہیں۔ انہیں آدمی اپنے لئے مہیا کرے۔ تو کھانا ہو' لباس ہو.... بلکہ ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ :

ان اللّٰہ یحب ان یری اثر نعمتہ علی عبدہ

اللہ اپنے جس بندے کو نعمت دے' تو اسے یہ بھی پسند ہے کہ اس نعمت کا اثر بھی اس بندے پر دیکھے۔ تو ڈھنگ کا کھانا ہو' ڈھنگ کا پہننا ہو' ڈھنگ کا رہنا سہنا ہو یہ نہیں کہ پھٹے حال میں آدمی رہ رہا ہے۔ کوڑے کباڑ میں کھڑا ہوا ہے۔ نہ صفائی نہ ستھرائی۔ مکان بنانے کا حکم دیا۔ صفائی ستھرائی کا حکم دیا۔

حدیث میں فرمایا گیا :

اپنے گھروں کے صحن چوک بھی صاف رکھو۔ دالان کو صاف رکھو۔ سڑک تک کو صاف رکھو ___ لباس کی صفائی کا حکم دیا۔ صفائی اور ستھرائی اسلام کا ایک مستقل موضوع ہے ___ یہ چیزیں چھڑائی نہیں گئیں۔ حُدود بتلادی گئیں کہ ان سے آگے نہ گزرو ___ تو ہماری آخرت اسی دنیا ہی سے نکلتی ہے۔ اسی بدن ہی میں سے تو آخرت پیدا ہوگی۔

اَعمالِ ایمانی کی خوشبو

حدیث میں ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے۔ تو ملائکہ علیہم السلام روح کھینچنے کے لئے آتے ہیں تو ہاتھ پیروں کو سونگھتے ہیں کہ اس میں ایمان کی خوش بو کتنی ہے۔ اعضاء کو سونگھتے ہیں۔ کیونکہ ایمانی افعال سرانجام دینے سے بدن میں خوشبو قائم ہوجاتی ہے۔ یہاں ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ آخرت میں محسوس ہوجائے گی۔

حدیث میں ہے کہ :

خلوف فم الصائم اطیب عنداللّٰہ من ریح المسک

روزے میں جب آدمی نہیں کھاتا تو منہ میں ایک قسم کی بو پیدا ہو جاتی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک یہ منہ کی بو مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔ یہاں تو یہ بدبو ہے' وہاں یہ خوشبو۔ وہ خوشبو در حقیقت روزے کی ہے اور روزے میں خوشبو ایمان سے ہے۔ ورنہ ایمان نہ ہو تو روزہ فاقہ ہے۔ وہ ایمان ہی کی خوشبو ہے ملائکہ علیہم السلام بدن میں سے اسی خوشبو کو سونگھتے ہیں کہ کتنی خوشبو آرہی ہے ___ بعض مرتبہ ایسا ہوگا کہ آدمی کے ساتھ اعمال نہیں ہیں اور ملائکہ علیہم السلام نے بھی سمجھ لیا کہ یہ جہنم کے لائق ہے' اور وہ ملائکہ آگئے جو کفار کی روح قبض کرتے ہیں۔ ان کی شکلیں ہیبت ناک ہوں گی۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اس کے بدن میں داخل کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پنڈلی سے ایک عمل چپکا ہوا تھا۔ اس نے کسی موقع پر سبحان اللہ کہا ہے۔ نیکی ہاتھ لگ جاتی ہے تو ملائکۂ رحمت کہتے ہیں کہ تم ہٹو۔ ہم اس کی روح قبض کرتے ہیں۔ تو وہ اعمال اسی بدن ہی میں سے سرزد ہوئے۔ پنڈلی میں سے عمل نکلے گا جگر میں سے نکلے گا ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ آدمی دل کی قوت سے عمل کرتا ہے' تو دل پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ کھڑے ہو کے کوئی عمل کرے تو گردوں کی طاقت سے آدمی کھڑا ہوتا ہے' اس عمل کا اثر گردوں پر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی بڑی بے جگری سے لڑتا ہے۔ خوب اس نے جہاد کیا۔ اس عمل کا تعلق جگر سے ہوگا۔ تو ہر عضو سے خاص اعمال متعلق ہیں۔ اور ملائکہ وہ پہچانتے ہیں۔ تو انہیں اعضاء میں اعمال کو تلاش کریں گے اور وہ کہیں گے کہ اس کا عمل پنڈلی میں چھپا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ صاحبِ نیکی ہے۔ ملائکۂ عذاب اس کی روح قبض نہیں کر سکتے۔ ہم اس کی روح قبض کریں گے ___ تو اسی عمل اور بدن ہی سے آخرت بنی۔

دربارِ خُداوندی کی پہلی پیشی

اور یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد مؤمن کی روح آسمانوں پر چڑھ جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام پہلے آسمان پر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ اور ستر ہزار ملائکہ علیہم السلام کے ہجوم کے ساتھ استقبال ہوتا ہے۔ ملائکہ صف باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ قطار کے بیچ میں سے اعزاز و اکرام کے ساتھ گزرتی ہے۔ پھر آسمان دوم کے مقربین اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ پھر آسمان سوم کے مقربین اس کا استقبال کرتے ہیں... یہاں تک کہ عرش پر پہنچ جاتی ہے۔ اور وہاں روح سجدہ کرتی ہے۔ حق تعالیٰ ابتدائی خطاب ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ فرماتے ہیں 'کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ کیا لے کے آیا؟

ایک عالم ہیں ان کی وفات ہوئی۔ تو بعض عارفین پر ان کا حال منکشف ہوا۔ حق تعالیٰ کے سامنے ان کی پیشی ہوئی تو ڈانٹ کر فرمایا۔ کیوں آیا؟ کیا لے کر آیا؟ انہوں نے کہا میں ڈیڑھ سو قرآن شریف ختم کر کے لایا ہوں۔ فرمایا ایک بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے روزے رکھے' فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ کہا اتنے تہجد پڑھے۔ فرمایا یہ بھی قبول نہیں۔ اب یہ حیران کہ کیا چیز پیش کروں۔ اور ادھر سے مطالبہ کہ کیوں آیا ___ ؟ آخیر میں انہوں نے کہا کہ میں آپ کی رحمت کا سہارا لے کر آیا ہوں اور کچھ نہیں۔۔!۔ فرمایا۔ اب بات ٹھکانے کی کہی۔ میری رحمت تیرے اوپر واجب ہوگئی۔ کسی وقت یہ نیت کی ہوگی وہ جا کر کام آگئی۔

وُسعتِ مغفرتِ خُداوندی

تو آدمی اپنے قلب کے رُخ کو صحیح رکھے۔ عملی کوتاہیاں ہر ایک سے ہوتی ہیں ہر ایک میں کچھ نہ کچھ گناہ' بڑا ہو یا چھوٹا' ضرور ہوتا ہے۔ سوائے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وہ تو معصوم ہیں۔ نبی کے بعد کوئی ایسا

نہیں جس سے کوئی ذلّت یا خطا نہ ہوتی ہو۔ اسی کو ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

ان تغفر اللھم تغفر جمّا ۔ وای عبدلک لاالمّا

یا اللہ جب آپ کو بخشنا ہی ہے تو سارے گناہ کیوں نہیں آپ بخش دیتے۔ کون بندہ ہے۔ جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ آپ کے سامنے سارے گنہگار ہی ہیں۔

اور حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔ فرمایا :

رب مغفرتک اوسع من ذنوبی ورحمتک ارجٰی عندی من عملی

اے میرے پروردگار تیری مغفرت میرے گناہوں سے بہت وسیع ہے۔ کہاں تک گناہ کروں۔ ہزار برس بھی کروں گا تو محدود ہوں گے۔ اور تیری رحمت کی کوئی حد ہی نہیں۔ میرے گناہوں کی تیری رحمت کے سامنے کیا قدروقیمت ہے۔ نیز میرے عمل محدود ہیں۔ بلکہ کوئی چیز نہیں مگر تیری رحمت ان سے بہت وسیع ہے۔

توبہ کا راستہ نہ ترک کیا جائے

بہرحال کوئی بندہ بشر ایسا نہیں جس سے کوئی غلطی اور خطا نہ ہوئی ہو۔ انبیاء علیہم السلام اس سے بری ہیں۔ اسی واسطے فضل ہی پر مدار ہے۔ جب توجہ فرماویں گے، جبھی مغفرت ہوگی۔ نیت اپنی یہ ہونی چاہئے کہ آدمی حق تعالیٰ پر بھروسہ کرے جب خطا ہو، توبہ کرے۔ گناہ سرزد ہوا فوراً توبہ کرلے تاکہ کھاتہ صاف ہوتا رہے۔ تو اصل چیز نیت ہے کہ آدمی کا رُخ صحیح ہونا چاہئے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے جو حدیث قدسی ہے کہ :

اے بندے اگر تو میرے پاس اتنے گناہ لے کر آئے کہ زمین اور آسمان تیرے گناہوں میں چھپ جائیں تو میں اتنی اتنی (گناہوں سے کہیں بڑھ کر) مغفرت لے کر تجھ سے ملاقات کروں گا۔ بشرطیکہ میری عظمت تیرے دل کے اندر ہو۔ تو اصل چیز عظمتِ خداوندی ہے۔ آدمی وہ قائم رکھے جو وفادار ہوتا ہے وہ غلطی بھی کرتا ہے تو آقا کہتا ہے کہ اس کو معاف کیا جاسکتا ہے ___ اس لئے اگر گناہ سرزد ہو، فوراً توبہ کرے۔ تاخیر ہرگز نہ کرے۔ کیونکہ اگر گناہ کیا اور دل پہ جم گیا۔ پھر گناہ کرتا رہا۔ پھر توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ گناہ کے بعد معافی مانگ لے۔ اس سے قلب زنگ آلود نہیں ہوتا، اور معصیت دُھل جاتی ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک آدمی نے بہت بڑا گناہ کیا اور ندامت ہوئی تو کہا۔ یا ربّ! .... ابھی یہ نہیں کہا کہ میری مغفرت کردیجئے، فقط یا ربّ کہا.... فوراً حق تعالیٰ فرماتے ہیں :

اعلم ان لہ ربا یؤاخذہ

اچھا یہ جان گیا کہ اس کا بھی کوئی رب ہے جو اس کی پکڑ کرے گا۔ فرمایا اگر یہ جان گیا تو قبل اس کے کہ مغفرت مانگے۔ اس سے پہلے ہی مغفرت کردیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس کی مغفرت ہوگئی ___ اگر پھر وہی گناہ کیا جو پہلے کیا تھا.... حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اے لوگو! تم گناہ کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔ اللہ بخشتے بخشتے نہیں تھکیں گے۔ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے۔ اس لئے آدمی سے جب غلطی ہو، فوراً توبہ کرلے، بس معاملہ صاف ہوگیا۔

اور یہ ایسا ہی ہے جیسے راستے پر لگا ہوا آدمی ٹھوکر لگی، گر پڑا اٹھا، کپڑے جھاڑ کر پھر چلنا شروع کردیا۔ پھر گر

پڑا۔ پھر چلنا شروع کردیا۔ بالآخر منزل تک پہنچ جائے گا۔ اور جس نے گرتے ہی راستہ ہی بدل لیا۔ وہ نہیں پہنچے گا۔ تو راستہ نہ چھوڑا جائے۔ جس وقت گناہ سرزد ہو' توبہ کرے۔ ایک نہ ایک دن منزل پالے گا۔

اسی لئے ایک حدیث میں فرمایا گیا :

سددوا وقاربوا وروحوا واغدوا وشیء من الدلجة

راستے پر لگے رہو۔ اعتدال کے ساتھ چلتے رہو' منزل کھوٹی مت کرو کہ منزل چھوڑ کے کسی سبزہ زار کے اوپر بیٹھ گئے۔ کسی باغ میں بیٹھ گئے بلکہ راستہ پر چلتے رہو۔ ایک نہ ایک دن پہنچ جاؤ گے۔

توبہ کی قوت

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام اور شیطان کی دشمنی ٹھن گئی تو شیطان آدم علیہ السلام کا حاسد اور قریبی دشمن تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تاجِ خلافت پہنا دیا گیا۔ جنتوں کے وعدہ دیئے گئے۔ تو شیطان کو فکر ہوئی' اس نے کہا۔ یا اللہ! آدم بہرحال میرا دشمن ہوگیا' میں اس کا دشمن۔ اس کے پاس عقل بھی ہے اور اسبابِ ہدایت بھی ہیں۔ یہ تو میرا ناطقہ بند کردے گا۔ کچھ قوت مجھے بھی دے دیجئے گا کہ میں اس پر غالب رہوں۔

حق تعالیٰ نے فرمایا :

"ہم نے تجھے اکثریت کی قوت دی"۔

آدمؑ کا اگر ایک بیٹا ہوگا' تو تیرے دس بیٹے ہوں گے۔ اس کے سو ہوں گے' تیرے ایک ہزار ہوں گے۔ تو ہمیشہ اکثریت میں رہے گا۔ یہ ایک ارب ہوں گے تو دس ارب ہوگا۔

مگر وہ بھی بڑا ہوشیار ہے۔ اس نے دیکھا کہ بعض دفعہ تو اقلیت بھی اکثریت پر غالب آجاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اکثریت ہی کا غلبہ ہو۔ اس نے عرض کیا۔

یا اللہ! بے شک میں اکثریت میں ہوگیا۔ لیکن اگر طاقتور اقلیت ہو' وہ تو اکثریت پر غالب آجاتی ہے۔ اس لئے مجھے اور طاقت دیجئے۔

فرمایا : تجھے یہ طاقت دیتے ہیں کہ تو آدم کے بدن میں اس طرح سرائیت کرسکے گا جیسے خون رگوں میں دوڑتا ہے۔

کہنے لگا ___ "اب میں اسے پچھاڑ سکوں گا" ___ اس لئے اس کے اندر گھس کے قلب میں وسوسے ڈالوں گا' دماغ کو خراب کروں گا۔ اور جو چاہے اندر جاکے کروں گا۔ اب مجھے طاقت مل گئی۔ اور وہ مطمئن ہوگیا۔

اب حضرت آدم علیہ السلام کو فکر پڑی کہ اس کمبخت کی یہ طاقت کہ میرے اندر گھس جائے' میرے اندر تو یہ طاقت نہیں کہ اس کے اندر گھس سکوں تو یہ غالب رہے گا اور سب کو جہنمی بنادے گا۔ مجھے بھی تو کوئی قوت دیجئے۔ (میں بھی اس کا مقابلہ کرسکوں؟)

حق تعالیٰ نے فرمایا کہ :

"آدم کو بھی ہم ایک طاقت دیتے ہیں کہ شیطان کی ہزار برس کی کارروائیاں ایک دم میں سب ملیامیٹ ہوجائیں گی۔ اور وہ ایسے چت ہوگا کہ چاروں شانے لگ جائیں گے"

کفر تک کرلو توبہ نصیب ہو' ایک منٹ میں سارا کفر ختم ہوجائے گا۔ اُس نے سو برس کفر کرایا۔ تم نے

ایک سچی توبہ کی۔ وہ سارا سو برس کا کفر ختم ہو جائے گا۔ اس کی ساری کارستانیاں ختم ہو جائیں گی ___ تو توبہ میں اتنی بڑی طاقت ہے کہ شیطان بھی اس سے عاجز ہے۔ اس لئے آدمی توبہ نہ چھوڑے۔ ذرا سی بات ہوئی فوراً توبہ کرے۔ بلکہ اِستغفار کو مستقل تسبیح کے طور پر پڑھے۔ کم از کم سو دفعہ روزانہ استغفار کرے۔

استغفر اللّٰہ تعالیٰ ربّی من کل ذنب واتوب الیہ

سو دفعہ پڑھ لے۔ سو گناہ نہیں کرے گا، مگر سو استغفار ہو جائیں گے۔ تو اس کے گناہ ختم ہوتے رہیں گے۔ اور یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، صرف دس منٹ کی بات ہے۔ صبح کی نماز کے بعد اگر سو دفعہ استغفار پڑھ لے۔ تو کوئی محنت نہیں مشقت نہیں ___ دن بھر میں آدمی سو گناہ نہیں کرتا، مگر توبائیں (توبہ کی جمع) سو ہو گئیں ___ اِن شاء اللہ سب گناہ ختم ہو جائیں گے۔

بہرحال قلب کا رخ صحیح رکھے۔ اِعتدال کے ساتھ چلتا رہے۔ جب گناہ ہو معافی مانگ لے۔ ایک نہ ایک روز منزل پر پہنچ جائے گا۔

اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے۔ حسنِ اخلاق نصیب فرمادے۔ اور خاتمہ بالخیر فرمادے۔ آمین۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

راہِ نجات

چار اُصول نجات کے ارشاد فرمائے گئے۔ علم، عمل، اخلاص اور اپنی آخرت کا فکر۔ یہ چار بنیادیں ہیں، جس سے آدمی کی آدمیت بنتی ہے۔ انسان کی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ اگر انسان میں علم نہ ہو، تو یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ جہالت سے نجات نہیں مل سکتی۔ اگر علم آگیا۔ روشنی آگئی مگر عمل نہیں ہے، تو کورا علم کسی کو نجات نہیں دلائے گا۔ بلکہ وبالِ جان بن جائے گا، اگر علم کے ساتھ عمل بھی ہو، مگر عمل کے ساتھ نفاق ہے، اخلاص نہیں ہے، وہ عمل بھی بیکار ہے۔ نجات نہیں دلائے گا۔ اگر علم بھی ہے، عمل بھی ہے، اور اخلاص بھی ہے۔ مگر انسان میں ناز اور شیخی ہے کہ میں سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہوں، آخرت کا خطرہ نہ ہو، وہ اخلاص بیکار ہے، وہ ختم ہو گیا۔ چار چیزیں جمع ہوں گی، تب انسان کی انسانیت بنے گی۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہٗ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَرْسَلَہُ اللّٰہُ اِلٰی کَآفَّۃٍ لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَیْہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ـــــــــ اَمَّا بَعْدُ ـــــــــ

فقد قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم الناس کلھم ھالکون الا العالمون ۔ والعالمون کلھم ھالکون الا العاملون ۔ والعاملون کلھم ھالکون الا المخلصون۔ والمخلصون علی خطر عظیم۔ (اوکما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام) صدق رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔

تمہید

میرے محترم بھائیو، اور بہنو!

یہ ایک حدیث ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ جو اِس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہے۔ اس میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ کہ انسان کی نجات دنیا میں بھی آخرت میں بھی، انہی باتوں میں منحصر ہے۔ انہی چند اُصولوں کی اس وقت

مجھے تشریح کرنی ہے اور میں کوشش کروں گا کہ مختصر وقت میں ان کی کچھ ضروری شرح آپ حضرات کے سامنے عرض کروں۔

آدمی کی نجات اس کے اندرونی جوہر سے ہے

پہلے اتنا اصول سمجھ لیجئے کہ انسان کو جو کچھ بھی نفع پہنچتا ہے' وہ جبھی پہنچتا ہے' جب کوئی خوبی اور بھلائی اس کے نفس میں آجائے۔ نفس کے اندر پیوست ہو جائے۔ باہر کتنی ہی خوبیاں پھیلی ہوئی ہوں' لیکن وہ انہیں اپنے اندر نہ لے' اس کے لئے نفع کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی ___ ایک باغ ہے اس میں قسم قسم کے پھول مہک رہے ہیں' اور خوشبوؤں سے فضا بھری ہوئی ہے' لیکن آدمی ناک بند کر کے بیٹھ جائے اور کوئی خوشبو اندر نہ جانے دے' اس کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا۔ دنیا میں خوشبوئیں بھری ہوئی ہیں' بھری رہیں' اسے نفع جب پہنچے گا جب خوشبو اندر پہنچے اور دماغ اس سے مستفیض ہو۔ اگر دنیا کے اندر ہزاروں خوب صورت اور خوش رُو نوجوان پھر رہے ہوں' بہتر سے بہتر حُسن و جمال کا نقشہ سامنے ہو' مگر ایک آدمی آنکھ بند کئے بیٹھا ہے' اسے کچھ پتہ نہیں کہ کون خوب صورت ہے کون بدصورت؟۔ تو اس کا دل نہ عشق سے آشنا ہو گا' نہ محبت سے آشنا ہو گا' نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکے گا ___ دنیا کی فضا میں ہزاروں نغمے گونج رہے ہوں' بہتر سے بہتر آوازیں پھیلی ہوئی ہوں' لیکن اس کے کان میں سننے کی قوت نہیں ہے' یا اس نے کانوں میں روئی ٹھونس لی ہے' کوئی نغمہ اس کے کان میں نہیں پہنچتا' اسے اس سے کوئی نفع نہیں ہو گا ___ کتابوں میں ہزاروں مسائل لکھے ہوئے ہوں' علم پھیلا ہوا ہو لیکن اس کے دل کا دروازہ بند ہو' علم اندر نہ پہنچے' اسے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ دنیا میں ایمان بھرا ہوا ہو' لاکھوں مؤمن موجود ہوں' لاکھوں اولیاء موجود ہوں' اور اگر نبوّت کا زمانہ ہو' تو نبی بھی موجود ہوں' مگر وہ اپنے دل کے دروازے بند کر دے' نہ ایمان کو اندر داخل ہونے دے' نہ علم و معرفت کو' اسے انبیاءؑ اولیاء کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اتنی بات آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آدمی کی نجات اور اس کا نفع' اس کے اندرونی جوہر سے ہے۔ باہر کی چیز کو جب تک اندر نہ داخل کرے' اسے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ نہ اس کے لئے کوئی عزت کا ساماں ہو سکتا ہے۔

اَصل کمال وہی ہے جو اِنسان کی ذات میں ہو

آپ نے نام سُنا ہو گا حکیم سقراط کا۔ یہ یونان کا ایک بڑا حکیم گزرا ہے۔ فنِ طِب کا یہ موجد ہے۔ اس فن کو اس نے مرتب کیا ہے۔ غرض بہت بڑا طبیب' حکیم' فلسفی اور عالم ہے۔ اس کی کیفیت یہ تھی کہ رات اور دن جنگلوں میں' پہاڑوں میں اور باغات میں جڑی بوٹیوں کا امتحان کرنے کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ گلِ بنفشہ کی کیا خاصیت ہے' ملٹھی کی کیا خاصیت ہے' فلاں بوٹی کیا نفع پہنچاتے گی' اور کسی چیز کو کھا کر دیکھ رہا ہے' اور کسی کو سُونگھ کر دیکھ رہا ہے ___ غرض محقق تھا۔ دن بھر اسی میں گزارتا تھا۔

یہ ایک دفعہ' دن بھر کا تھکا ماندا شہر میں آیا۔ شہر میں آکر کسی دُکان پر بیٹھا' تو اس کی آنکھ لگ گئی۔ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ بادشاہِ وقت کی سواری نِکل رہی تھی۔ جلوس آرہا تھا۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار تھا' سامنے سے فوجیں' سپاہی' نقیب اور چوب دار گزر رہے تھے۔ ہٹو اور بچو کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر یہ بے چارا اتنا سویا ہوا تھا' خدا جانے کتنے دنوں کا جاگا ہوا ہو گا' اس کی آنکھ نہ کھلی یہاں تک کہ بادشاہ کی سواری قریب آئی۔ تو بادشاہ کو بڑا غصہ آیا' کہ یہ بڑا بدتہذیب آدمی ہے۔ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں' میری سواری آرہی ہے' اور یہ پیر

پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا ہے۔ اور سو رہا ہے' کوئی ادب اس کے اندر نہیں ہے۔ بادشاہ ــــــ میں اپنے ہاتھی یا گھوڑے سے اُتر کر اس کے ایک ٹھوکر ماری' اور کہا او بے ادب! جانتا نہیں ہے کہ میں کون ہوں؟ یہ بے چارہ آنکھیں مَل کر اُٹھ بیٹھا' اور آنکھیں مَلنے لگا۔ جیسے سویا ہوا آدمی جاگنے کے وقت آنکھیں مَلا کرتا ہے۔ بادشاہ نے پھر ڈانٹ کر کہا ارے نامعقول! تو جانتا نہیں کہ میں کون ہوں؟ اس نے بڑے اطمینان سے آنکھیں مَلتے ہوئے کہا کہ جی ہاں! یہی تو میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کون ہیں؟ اسی لئے آنکھیں مَل رہا ہوں۔ اور اب تک میں اتنا جان چکا ہوں کہ آپ شاید جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں۔ اس واسطے کہ درندوں کی عادت ہے کہ زمیں پر پیر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ ٹھوکریں مارتے ہیں۔ چونکہ آپ نے ٹھوکر ماری ہے۔ میں سمجھا کہ کوئی بھیڑیا شیر آگیا ہو گا' کوئی جنگل کا درندہ ہے۔

بادشاہ کو اور زیادہ غصہ آیا کہ اب تک تو یہ ٹانگیں پھیلائے ہوئے لیٹا ہوا تھا اب اس کی زبان بھی میرے سامنے پھیل گئی ہے۔ ایسی بد تہذیبی کے کلمات ــــــ! بادشاہ نے ڈانٹ کر کہا' ارے احمق' جاہل! تو نہیں جانتا کہ میں بادشاہِ وقت ہوں۔ اتنے قلعے میرے قبضے میں ہیں۔ اتنے خزانے میرے قبضے میں ہیں۔ تاجِ شاہی میرے سر پر ہے۔ قباءِ شاہی میرے کندھے پر ہے۔ اتنی فوجیں کھڑی ہوئی ہیں۔ اتنے ملک میرے تحت میں ہیں۔ اور تو میرے ساتھ گستاخی کر رہا ہے؟

اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ آپ نے اپنی بڑائی بیان کرنے کے لئے تاجِ شاہی کو پیش کیا' قباء کو پیش کیا' قلعوں کو پیش کیا' پیسوں اور روپوں کو پیش کیا' ملکوں کو پیش کیا۔ ان سے ایک چیز بھی تو آپ کے اندر کی نہیں ہے۔ یہ تو باہر باہر کی چیزیں ہیں۔ اس میں تیرا کیا کمال ہوا۔ اگر چاروں طرف سونا پھیلا ہوا ہے' اور تیرے دل میں جہالت کی گندگی بھری ہوئی ہے' اس میں تیرا کیا کمال نکلا ــــــ؟ تو نے بہترین لباس پہن رکھا ہے اور دل جہالت و بد اخلاقی سے بھرا ہوا ہے۔ تو لباس سے تجھے کیا فائدہ پہنچا؟ یہ تو باہر کی چیز ہے ــــــ تو نے جتنی چیزیں پیش کیں' قلعہ یا فوج' ان سے تو نے اپنا فخر پیش کیا۔ یہ سب چیزیں تیرے باہر باہر کی ہیں۔ اپنے اندر کی بات بتلا' کہ تیرے اندر کیا کمال ہے؟ جس کی بنا پر تو دعویٰ کرتا ہے ــــــ اگر تیری عزت پیسے سے ہے' تو اس کا مطلب یہ ہے اگر کوئی پیسہ چھین کر لے جائے تو تو بے عزت ہو گیا۔ عزت ختم ہو گئی۔ تیری عزت اگر تاج سے ہے' تو کسی نے تاج اُتار لیا' یا تو رات کو میز پر رکھ کر سویا' تو تو بے عزت ہو گیا۔ اس لئے کہ تاج سر پر نہیں رہا۔ لباس اُتار دیا تو بے عزت ہو گیا۔ اس لئے کہ عزت تو کھونٹی پر ٹنگ گئی۔ تیری عزت اگر ان چیزوں پر ہے' تو یہ سب چیزیں تیرے سے باہر باہر کی ہیں۔ تیرے اندر کا جوہر کون سا ہے؟ اور کہا کہ اگر تجھے فخر کا یا شیخی کا دعویٰ ہے تو یہ تاج بھی اُتار' لباس بھی اُتار' یہ قلعہ اور فوج بھی چھوڑ' اور ایک لنگی باندھ کر دریا میں میرے ساتھ کُود پڑ' اور وہاں اپنے کمالات دکھلا' کہ تیری ذات میں کون سا جوہر ہے' تب تو میں سمجھوں گا کہ تو باکمال ہے تو نے کمال میں باہر کی چیزیں پیش کر دیں۔ ان میں ایک چیز بھی تیرے اندر کی نہیں اس میں تیرا کوئی کمال نہیں۔ اب بادشاہ بے چارہ شرمندہ' کیا جواب دے اس کا' بادشاہ چُپ ہو گیا ــــــ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گویا سقراط نے یہ بتلایا کہ انسان کا کمال اندر کے جوہر سے حاصل ہوتا ہے۔ باہر کے جوہرے اس کا کمال نہیں۔ سونا اگر اچھا ہے' اس سے آپ کی اچھائی تو ثابت نہیں ہوگی۔ کپڑا اگر بہت بے نظیر ہے' کپڑے کی خوبی ثابت ہوئی' آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوئی۔ محل اور بلڈنگ اگر بہت اعلیٰ ہے' تو وہ خوب اور اچھی نکلی' لیکن آپ کی خوبی تو اس سے ثابت نہیں ہوتی۔ خوبی وہ ہے جو انسان کے نفس کے اندر پیوست ہو۔ ایسا کمال ہو کہ اگر آپ زمین کے اوپر رہیں تو بھی باکمال۔ زمین کے نیچے دفن کر دیا جائے' تب بھی

باکمال ' لباس پہن لیں ' جب بھی باکمال ۔ لباس اُتار دیں ' جب بھی باکمال ۔ کمال اپنے اندر ہونا چاہئے ۔ باہر نہ ہونا چاہئے ۔ ورنہ یہ تو ایسا ہو جائے گا جیسے فنِ نحو کا امام سیبویہ تھا ۔ عربی گرامر کا بہت بڑا عالم گزرا ہے ' بڑے اونچے درجے کا امام سمجھا گیا ہے ۔ جب یہ تعلیم پاتا تھا ۔ تو استاذ جو تقریریں کرتے تھے ' یہ نوٹ کرتا رہتا تھا ۔ اور اتنی بڑی ایک کاپی اس نے بنائی کہ کئی سیر کے کاغذات تھے ' جس میں تمام یادداشتیں لکھی ہوئی تھیں ___ تو طالب علمی کے زمانے میں وہ کاپیاں اور نوٹ بکیں اس کے پاس سلیٹے ہوئے رکھے تھے ' اتفاق سے روٹی جو لینے گیا ' تو اس دستر خوان میں جس میں روٹیاں تھیں ' اسی میں اس نے وہ کاغذ بھی لپیٹ دیئے ۔ کتا جو آیا ' روٹی لے کر چلا ' تو وہ کاغذات بھی پوٹلی میں ساتھ لے گیا ۔ اب یہ چیختا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے ' اور کتا آگے آگے جارہا ہے ___ لوگوں نے کہا سیبویہ ! کہاں جارہا ہے ؟ اور کہاں بھاگ رہا ہے ؟ اس نے کہا کتا میرا علم لے کر چلا گیا ' اس کے پیچھے جارہا ہوں ۔ لوگوں نے کہا ۔ کمبخت ! وہ علم ہی کیا ہوا جسے کتا لے کر بھاگ جائے ___ اس نے کہا ' واللہ باللہ میری تو عمر بھر کی کمائی اس میں تھی ' جو کتا لے جارہا ہے ۔

تو جیسے سیبویہ نے سارا علم کتے کے سپرد کر دیا تھا ۔ اس کے اندر کوئی چیز نہیں رہی تھی ' اسی طرح اگر آدمی کے اندر کوئی کمال نہ ہو ' تو اسے کتا بھی لے کر بھاگ جائے گا ۔ شیر لے کر بھاگ جائے گا ' بھیڑیا بھی لے جائے گا ' دشمن بھی لے جائے گا وہ کمال ہی کیا ہوا کہ دوسرا لوٹ کر لے جائے ' اور آدمی کورا رہ جائے ۔ کمال وہ ہے کہ انسان کے نفس میں ہو ۔ ہزار آفتیں آئیں مگر وہ باکمال رہے ۔ ہزار مصیبتیں آئیں ۔ دشمن چڑھ آئیں ' مگر وہ باکمال بنا رہے کمال اس کے نفس میں پیوست اور رچا ہوا ہو ' وہی اصل کمال ہے ۔

دِل ایک عجیب کیمیا ہے

آپ نے مولانا رومیؒ کا نام تو سنا ہوگا ' بہت بڑے عارف کامل ہیں ' مثنوی لکھی ہے ' جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ :

ہست قرآں در زبان پہلوی

گویا فارسی زبان میں اللہ نے اُن سے قرآن لکھوا دیا ___ بہرحال بہت بڑے تصوف کے امام گزرے ہیں ۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے ۔ اس واقعہ سے عبرت دلانی مقصود ہے ۔ اس کو آدمی اگر غور سے سنے ' اور تدبّر کرے ۔ اس سے بڑی عبرت اور نصیحت حاصل ہوگی ۔ مولاناؒ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ رومیوں اور چینیوں میں باہم لڑائی ہوگئی ۔ رومیوں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم بڑے صنّاع ' دستکار ہیں اور بہترین صنعتیں بناتے ہیں ' ہمارے ہاتھ میں حکمت ہے ۔ بلڈنگیں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ بناتے ہیں کپڑا بھی بہتر سے بہتر بناتے ہیں ' برتن وغیرہ ' غرض ہر سامان بہتر بناتے ہیں ___ چینیوں نے کہا ہم سب سے زیادہ صنّاع ہیں ۔ ہم سے بڑا دستکار اور ماہر کوئی دوسرا نہیں ہے ۔ دونوں میں لڑائی ہوئی ' جھڑپ شروع ہوئی ۔ دونوں میں سے ہر ایک کہتا ہے کہ ہم زیادہ ماہر ہیں ۔ اتنی جھڑپ ہوئی کہ آخر مقدمہ بادشاہِ وقت کے پاس پہنچا ۔ بادشاہ نے کہا کہ جھگڑا کیا ہے ؟

رومیوں نے کہا کہ ہم بڑے صنّاع ' دستکار اور ماہر ہیں ' چینیوں نے کہا کہ ہم زیادہ ماہر ہیں ۔

بادشاہ نے کہا دعویٰ سے کام نہیں چلتا ' اپنی اپنی صنعت بنا کر دکھلاؤ ۔ ہم مقابلہ کر کے سمجھیں گے کہ کون زیادہ تم میں ماہر ہے ۔ بادشاہ نے ایک بہت بڑا ہال بنوایا اور بیچ میں پارٹیشن کر کے ایک دیوار کھڑی کر دی ' اور رومیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تو تم اپنی صنعت دکھلاؤ گویا نقاشی کرو اور چینیوں سے کہا کہ آدھے مکان میں تم اپنا کام دکھلاؤ ' اس کے بعد میں ہم ایک دوسرے کے کام کا مقابلہ کر کے دیکھیں گے ' جس کا کام اعلیٰ

ہو گا' اسے ڈگری دیں گے' اسے پاس کریں گے۔

چنانچہ مکان میں ایک طرف رومیوں نے اپنی دستکاری دکھلانی شروع کی' اور ایک طرف چینیوں نے۔

چینیوں نے تو یہ کیا کہ دیوار کے اوپر پلاستر کر کے رنگ برنگ پھول' بوٹے اور بیلیں ایسی بنائیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ باغ و بہار ہے' ساری دنیا کے چمن اور گلشن اسی دیوار کے اندر آ گئے ہیں۔

رومیوں نے کیا کیا؟ ایک پھول نہیں بنایا' ایک بوٹا نہیں بنایا' دیوار پر پلاستر کر کے اس کو صیقل کرنا شروع کیا۔ اور اسے مانجھنا شروع کیا۔ مانجھتے مانجھتے اتنا چمکا دیا کہ دیوار بالکل آئینہ بن گئی۔

جب دونوں اپنے کام سے فارغ ہوئے' تو بادشاہ کو اطلاع کی کہ ہم نے اپنی اپنی دستکاری بنالی ہے' اور محنت کر کے اپنے کاموں کا نمونہ تیار کیا ہے۔ آپ دونوں کو دیکھ کر فیصلہ دیجئے کہ کس کی صنعت زیادہ اعلیٰ ہے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ دیوار بیچ میں سے ہٹادی جائے' جو پارٹیشن کے طور پر درمیان میں قائم کی تھی۔ دیوار کا ہٹانا تھا کہ چینیوں نے جتنے بوٹے بنائے تھے وہ سب کے سب ادھر نظر آنے لگے' کیوں کہ دیواریں تو صیقل ہو چکی تھیں ___ اب بادشاہ حیران ہے کہ جو پھول پتے اُدھر بنے ہوئے ہیں' وہ اِدھر بھی نظر آ رہے ہیں' جو رنگ اُدھر لگے ہوئے تھے' وہ اِدھر بھی ہیں۔ بلکہ ادھر یہ زیادہ دیکھنے میں آیا کہ ادھر کے پھول پتوں میں چمک بھی تھی۔ بادشاہ نے کہا کہ رومیوں کی صنعت بڑھ گئی' چینی ہار گئے' اس لئے رومیوں نے اپنی صنعت بھی دکھلائی' اور ان کی بنی بنائی صنعت کو چھین کر اپنا کرلیا' تو دوگنی صنعت ہو گئی۔ لہٰذا رومی کامیاب ہیں۔ ہم انہیں پاس کرتے ہیں' اور چینی فیل ہو گئے۔ ان کی صنعت کوئی بڑی صنعت نہیں نکلی۔

مولانا رومیؒ یہ مثال دے کر کہتے ہیں کہ :

اے عزیز! تو بھی رومیوں کی صنعت اختیار کر' چینیوں کی مت کر' تو اپنے دل کو مانجھ کر صیقل کر کے ایسا آئینہ بنالے کہ دنیا کے سارے نقش و نگار تجھے گھر کے اندر بیٹھے ہوئے دل کے اندر نظر آئیں۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و چمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ ای درِ دل کشا بچمن درآ

بڑے ستم کی بات ہے کہ دنیا کی رنگینیوں پر فریفتہ ہو کر کبھی اس باغ میں' کبھی اس چمن میں کبھی اس بوٹے پہ' کبھی اس پتی پر پھر رہا ہے۔ تو اگر رومیوں کی صنعت اختیار کر کے دل کو مانجھ لے' یہ ساری پھول پتیاں گھر بیٹھے تجھے دل ہی میں نظر آئیں گی' اور ساری دنیا تیرے دل میں چمک اٹھے گی۔ دل کو مانجھ کر رومیوں کی صنعت پیدا کر' تو اللہ میاں کے ہاں تو بھی پاس ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دل اللہ نے بڑی عجیب کیمیا بنائی ہے۔ باہر کی چیزیں آدمی چھین کر اندر لے آئے تو اس کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ اور باہر باہر چمن کھلے رہیں' اور دل اندر سے خالی رہے۔ اس کے لئے نہ نجات کی صورت ہے نہ نفع کی صورت تو اصل چیز یہ ہے کہ انسان اپنے دل کو مانجھے' صیقل کرے' آئینہ بنائے۔

قلب کے دو دروازے

اللہ نے انسان کے دل میں دو دروازے رکھے ہیں' ایک دروازہ کھلتا ہے' تو اسے عرش کی چیزیں نظر آتی ہیں' اور ایک دروازہ کھلتا ہے تو اسے فرش کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ دل میں آنکھ' کان' ناک کے راستہ سے

جب آدمی دیکھے گا، تو ظاہری چمک دمک، پھول بوٹے سب نظر آئیں گے۔ اور ان آنکھ، کان، ناک کے دروازوں کو بند کر کے دل کے اندر کے دروازے کھولے گا، تو عرش کی چیزیں نظر آئیں گی، وہاں کے علوم اور کمالات اُترنے شروع ہوں گے، تو قلب کے اندر دونوں راستے ہیں۔ اگر اوپر کے دروازے بند کردو گے، صورتیں، شکلیں نظر پڑیں گی۔ نیچے کا دروازہ بند کردو گے، حقیقتیں کھلنی شروع ہو جائیں گی۔ دل میں دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود ہیں ___ اعلیٰ ترین صلاحیت یہ ہے کہ آدمی اوپر کی چیز کو جذب کرے، علم خداوندی کو، کمالات کو، معرفتِ خداوندی کو اخلاقِ ربانی کو، اور ملائکہ کی صفات کو جذب کرے، تو صحیح معنیٰ میں کامل انسان، اور کامل بشر بنے گا۔

مولانا رومیؒ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اندر کی صنعت پیدا کرو۔ باہر کی صنعت کے اوپر فریفتہ ہونا مت سیکھو، باہر کی چیزیں بھی اگر لوگے، وہ بھی جبھی کام دیں گی۔ جب اندر کچھ جوہر موجود ہوگا، اور اگر اندر خالی ہے، تو باہر کی چیزیں نفع نہیں دے سکتیں۔ اس واسطے اپنے دل کو صاف کر کے اسی طرف آنا پڑے گا۔

علم، روشنی اور غلبہ کا ذریعہ ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں ایسی ہی بنیادی چیز کا ذکر فرمایا ہے کہ جس سے انسان کا اندرون روشن ہو، قلب میں روشنی اور آراستگی پیدا ہو۔ آپ نے فرمایا : **الناس کلھم ھالکون الا العالمون۔**

سارے انسان تباہ و برباد ہونے والے، سب ہلاک ہو جانے والے ہیں، اگر بچیں گے تو اہلِ علم بچ سکتے ہیں، یعنی جہالت میں انسان کی نجات نہیں ہے۔ علم میں انسان کی نجات ہے، دنیا کا علم ہو، یا دین کا علم ہو، علم ہی سے راستہ نظر پڑ سکتا ہے۔ جہالت سے راستہ نظر نہیں پڑتا ___ جہالت فی الحقیقت ایک اندھیری ہے، اور علم فی الحقیقت ایک چاندنا ہے، تو چاندنے میں راستہ نظر پڑا کرتا ہے، اندھیرے میں راہیں نظر نہیں پڑتیں، جہالت میں نہ دنیا کی بھلائی سامنے آسکتی ہے نہ آخرت کی بھلائی۔

آج دنیا بھی اگر بجی ہوئی ہے اور آراستہ ہے، تو وہ بھی انسان کے علم کی وجہ سے بج رہی ہے، اگر آخرت درست ہے، وہ بھی انسان کے علم ہی کی وجہ سے درست ہے۔ آج یہ آپ کا شہر جگمگا رہا ہے، لاکھوں **قمقمے** بجلی کے روشن ہیں، شہر میں چاندنا ہے۔ کوٹھیاں اور بنگلے روشن ہیں۔ یہ چاندنا آپ کے علم کا ہے، بجلی کا نہیں ہے۔ اگر آپ علم و سائنس کی قوتیں استعمال نہ کرتے تو نہ قمقمہ بنتا، نہ بجلی بنتی۔ بجلی اور قمقمہ نہ ہوتا تو یہ گھر اور شہر روشن نہ ہوتا۔ علم نے قمقمہ بنایا، بجلی کو دریافت کیا، اور علم نے یہ صناعیاں کیں، اس کی وجہ سے روشنی ہوئی ___ تو درحقیقت یہ علم کا چاندنا پھیلا ہوا ہے، اگر انسانوں میں جہالت ہوتی، فنِ سائنس کو نہ جانتے، یہ چاندنا سامنے نہ آتا ___ یہ چھت میں آپ کو جو چمک نظر آرہی ہے۔ یہ آپ کے علم کی چمک ہے، بجلی کی نہیں ہے۔ بجلی تو خود آپ کے علم سے آئی ہے۔

جہالت ذریعۂ مغلوبیّت ہے

یہی علم کی قوت ہے جو انسان کو اونچا بناتی ہے، اور دنیا کے اوپر غالب کرتی ہے۔ اگر جہالت ہو تو آدمی مغلوب ہو جاتا ہے زمین بیچاری علم نہیں رکھتی، رات دن جوتیوں میں پامال ہے، جانور علم نہیں رکھتے، رات دن آپ کی غلامی میں مبتلا ہیں کسی جانور کے کندھے پر آپ نے ہل رکھا ہے، اس سے کھیتی باڑی کرا رہے ہیں کسی جانور کی پشت پر زین کس رکھا ہے اور انسان سوار ہوا پھر رہا ہے۔ گھوڑا طاقت میں انسان سے چوگنی طاقت رکھتا ہے، مگر انسان کے آگے دبا ہوا ہے اس لئے کہ غریب کے پاس علم کی قوت نہیں۔

اور یہ بھی اللہ کا فضل ہے کہ اللہ نے جانوروں کو علم نہیں دیا، عقل نہیں دی۔ اگر کہیں گھوڑے اور بیل میں عقل آجاتی، اور انسان، اس پر زین کسنے لگتا، گھوڑا کہتا کہ ٹھہر جائیے، پہلے دلیل سے ثابت کیجئے کہ آپ کو

مجھ پر سوار ہونے کا حق ہے۔ میں کیوں نا آپ پر سوار ہو جاؤں؟ اور میں کیوں نہ زین کس دوں؟۔ تو دو گھنٹے تو مناظرہ ہوتا۔ معلوم نہیں بحث میں کون جیتتا۔ کون ہارتا۔ نہ سواری ہوتی' نہ کھیتی باڑی ہوتی۔ تو شکر کرو کہ اللہ نے انہیں جاہل بنایا اور انہیں عقل نہیں دی۔

اس سے اتنی بات بھی معلوم ہوئی کہ کہیں جہالت بھی نفع دیتی ہے' محض علم ہی نفع نہیں دیتا۔ اگر دنیا میں جاہل نہ ہوں' تو غلامی کرنے والا کوئی نہ ہو' اور جب غلام کوئی نہ ہو' تو آقا کی آقائی کیسے کام دے گی؟ ___ لیڈروں کی لیڈری جبھی چلتی ہے۔ جب پبلک جاہل ہو ___ اگر سارے پڑھے لکھے عالم بن جائیں تو لیڈر کام نہیں کر سکتا۔ بے چارے لیڈروں کی عزت تبھی بنتی ہے' جب پبلک میں جہالت ہو ___ تو جانوروں سے فائدہ جبھی اٹھایا جا سکتا ہے جب جانوروں کے اندر عقل و شعور نہ ہو۔ ان میں شعور ہوتا' تو نہ کھیتی ہوتی' نہ سواری ہوتی' نہ حشم خدم ہوتا۔ بہرحال ان تمام چیزوں پر انسان نے غلبہ پایا ہے' وہ بدن کی طاقت سے نہیں پایا۔ بدن میں تو طاقت میں گھوڑا' بیل ہم سے زیادہ ہے' وہ غلبہ علم اور عقل کی طاقت سے پا رکھا ہے۔

بچپن میں ہم نے ایک حکایت عورتوں سے سُنی تھی' واللہ اعلم۔ قصہ واقعی ہے یا فرضی۔ واقعہ اگر فرضی بھی ہو تو مثال دینے اور عبرت پکڑنے کے لئے کافی ہے۔ وہ قصہ ہم نے یہ سنا تھا کہ ماں بہنوں سے جو انہوں نے نصیحت کے لئے سنایا تھا کہ ایک شیر کا انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی کہ دیکھو بیٹا! ہر ایک سے ملنا' ہر ایک کے پاس جانا۔ اس انسان کے پاس مت جانا' یہ بڑی ظالم چیز ہے' اگر کہیں اس کے پاس چلے گئے تو تم خطا اٹھاؤ گے' مصیبت میں مبتلا ہو گے' وہ شیر صاحب جو سارے جنگل کے بادشاہ تھے' انتقال فرما گئے۔ ان کی جگہ ان کے صاحبزادے "یعنی شیر کا بچہ" ولی عہد بنے۔

شیر کا بچہ تجربہ نہیں رکھتا تھا' جوان ہوا' مگر عقل تو آتے آتے ہی آتی ہے۔ کیسی بھی عقل ہو' جانور ہونے کی ہو یا انسان ہونے کی ہو' عمر گزرنے کی بعد آتی ہے۔ بچہ ہر ایک کا نا تجربہ کار ہوتا ہے' جانور کا ہو یا انسان کا ہو ___ تو شیر کے بچے کا بچپن تھا باپ تو اُٹھ گیا' شیر کا انتقال ہو گیا۔ اس شیر کے بچے نے کہا کہ میرے باپ نے کہا تھا کہ تو انسان کے پاس مت جانا' یہ بڑی ظالم چیز ہے' دیکھنا تو چاہئے انسان ہوتا کیا ہے؟ اور میرا باپ بہت ڈر رہا تھا' میرا باپ تو سارے جنگل کا بادشاہ تھا' اتنی طاقت والا تھا' وہ بھی ڈر رہا تھا' انسان معلوم نہیں کوئی دس گز لانبا ہو گا' بیس گز کا ہو گا' کیا چیز ہو گی انسان؟ دیکھنا تو چاہئے' تو جو پاس کے حالی موالی تھے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو بڑوں کی نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔ باپ نے کہا تھا کہ انسان کے پاس بھی مت جانا' یہ بڑی ظالم چیز ہے' تم ارادہ مت کرو' کہیں کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ' اس نے کہا نہیں بھائی کم سے کم ایک دفعہ دیکھنا تو چاہئے کہ یہ انسان کیا چیز ہے۔

باپ کی نصیحت نہیں مانی' اور انسان کو دیکھنے کی خاطر چلے۔ اتفاق سے سب سے پہلے گھوڑے پر نظر پڑی کہ چھلانگیں مارتے ہوئے جا رہا ہے۔ شیر کے بچے نے سمجھا کہ یہی انسان معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ باپ تو ڈیڑھ گز لانبا تھا' اور یہ تو بہت ڈیل ڈول کا ہے' میرا باپ جو ڈرتا تھا' یہ اس سے دو گنا چو گنا ہے واقعی ٹھیک ڈرتا تھا۔ تو گھوڑے کے قریب جا کے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا کہ جناب ہی کا نام انسان ہے؟۔ گھوڑے نے کہا کس ظالم چیز کا نام لیا۔ میرے سامنے انسان کا نام مت لینا' وہ تو بڑی ظالم چیز ہے جسے انسان کہتے ہیں۔ میں بہت ڈیل ڈول کا ہوں مگر انسان میری کمر پر زین کستا ہے' اس پر سوار ہوتا ہے' اس کے ہاتھ میں کوڑا ہوتا ہے۔ میری پیٹھ پر کوڑے پڑتے ہیں۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہوں' انسان ہے کہ مارتے مارتے باز نہیں آتا۔ تو سب چیزوں کا ذکر کرنا' مگر اس ظالم انسان کا نام مت لینا' یہ بڑی مصیبت کی چیز ہے ___ شیر کے بچے نے کہا'

یا اللہ! انسان کتنے ڈیل ڈول کا ہوگا۔ یہ ایسا لانبا چوڑا جانور' یہ بھی انسان سے ڈر رہا ہے' اور میرا باپ بھی ڈرتے ڈرتے مرگیا' کیا چیز ہوگی انسان؟ ___ اور آگے چلے تو اتفاق سے اونٹ نظر پڑا۔ اس نے کہا یہ ہوگا انسان۔ کوئی کل ہی سیدھی نہیں۔ گردن ادھر کو جارہی ہے' کمر ادھر کو جارہی ہے۔ ٹانگیں ادھر کو نکل رہی ہیں۔ بس یہی انسان ہوگا۔ یہ تو گھوڑے سے بھی چار ہاتھ اونچا ہے۔ اس نے قریب جاکر اونٹ سے کہا' کیا آپ ہی کا نام انسان ہے؟

اس نے کہا ارے لاحول ولا قوۃ ، کس ظالم چیز کا نام لے دیا۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے' اس کا نام میرے سامنے مت لینا' اس واسطے کہ میں تو اکیلا ہوں۔ میرے علاوہ میرے سو سو بھائی بند' اور ناک میں نکیل' جو آگے جارہا ہے۔ اس کی دم میں پچھلے کی نکیل بندھی ہوتی ہے اس طرح سو سو کی قطاریں ہوتی ہیں' اور انسان کا ایک بچہ ہمیں ہنکاتا ہے۔ ہم گڑگڑاتے ہیں' بل بلاتے ہیں۔ مگر ایک بچہ ہنکا کر لے جاتا ہے۔ سو اونٹ کی بھی ایک انسان کے آگے نہیں چلتی۔ یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ اس کا نام میرے سامنے مت لینا ___ شیر کے بچے نے کہا' یا اللہ! کتنی بڑی چیز ہوگا۔ یہ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا' یہ بھی ڈر رہا ہے' اور گھوڑے نے تو اپنی مصیبت بیان کی۔ اس نے تو اپنی برادری کی مصیبت بیان کی کہ سو اونٹ مل جائیں' تب بھی انسان کے ایک بچے سے عاجز ہیں ___ پھر یہ ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا تو اتفاق سے ہاتھی نظر پڑ گیا' اس نے کہا یہ انسان ہوگا' اس لئے کہ اچھے خاصے چار ستونوں پہ بلڈنگ بنی ہوئی ہے۔ چھت پڑی ہوئی ہے۔ اس پر ایک بڑا حوضہ رکھا ہوا ہے۔ یہ انسان ہوگا۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھی سے جاکر کہا کہ جناب ہی کا نام انسان ہے؟ آپ ہی کو آدمی کہتے ہیں۔

اس نے کہا' ارے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہِ کس مصیبت کا نام لے دیا' میرے سامنے اس کا نام مت لے' یہ بڑی ظالم چیز ہے' میرے ڈیل ڈول پر مت جانا' قد و قامت میرا اونچا نظر آرہا ہے کہ ایک عمارت سے کھڑی ہوئی ہے۔ مگر ایک انسان کا بچہ میری پشت پر سوار ہوتا ہے' لوہے کا ہنٹر اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ذرا میں چیخا' اس نے میرے سر پر لوہے کا ہنٹر مارا' میں چنگھاڑتا ہوں اور کچھ نہیں کرسکتا۔ گھوڑے کے منہ میں تو لگام بھی ہوتی ہے۔ میرے پر تو بے لگام ہی سوار ہوتا ہے' تو نہ لگام' نہ نکیل' مگر انسان کے سامنے میں مجبور ہوں ___ شیر نے کہا' یا اللہ! انسان کیا چیز ہوگی' ڈرتے ہوئے ملتا ہے جو ملتا ہے' جو بلا وہ کانپ رہا ہے کہ انسان بڑی ظالم چیز ہے۔

آگے چلا تو اتفاق سے ایک بڑھئی کا بچہ دس برس کا' وہ ایک بڑا بھاری شہتیر چیر رہا تھا' اور بہت بڑا آرہ اس میں ڈال رکھا تھا' اسے چیرے جارہا تھا' اور جتنا وہ چیر چکا تھا' اس میں ایک کھونٹی ڈال دی تھی' تاکہ اور نیچے نہ ہل سکے۔ تو شیر کو یہ وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان بھی ہوسکتا ہے' اس لئے کہ ذرا سا تو وہ آٹھ نو برس کا بچہ' اسے خیال نہیں گزر سکتا تھا کہ یہ آدمی ہوگا' وہ دیکھ کر آیا تھا' اونٹ کو' گھوڑے کو' اور ہاتھی کو' اور سب کو دیکھا کہ انسان سے ڈر رہے ہیں۔ تو وہ اس بچے سے تھوڑا ہی ڈر سکتے ہیں۔ اسے وہم بھی نہیں گزرا کہ یہ انسان ہوگا۔ مگر تحقیق کے لئے اس سے پوچھا کہ انسان کہاں ملے گا؟ بڑھئی نے کہا کہ انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں۔ اس نے کہا اچھا تو تو انسان ہے؟ آدھ گز کا اتنا سا بچہ؟ کہا جی ہاں' انسان تو مجھے ہی کہتے ہیں ___ اس نے کہا لاحول ولا قوۃ میرا باپ بڑا بے وقوف تھا' جو تجھ سے ڈر رہا تھا' میں ایک چپت میں تیرا کام تمام کردوں گا' اور شیر نے یہ کہہ کر اٹھایا پنجہ۔

بڑھئی کے بچے نے سمجھا کہ بھئی یہ تو شیر ہے۔ اب موت آگئی۔ اگر اس نے ایک طمانچہ بھی ماردیا' میں تو ختم ہوجاؤں گا' تو تدبیر سے کام کرنا چاہئے' بڑھئی کے بچے نے کہا کہ آپ تو جنگل کے بادشاہ ہیں' میں کیا چیز ہوں

آپ کے آگے۔ آپ بڑی طاقت والے۔ مگر ایک کام ہے جو میں نہیں کر سکتا' آپ ہی جیسا طاقت ور کر سکتا ہے اگر آپ اس کام کو انجام دے دیں؟

شیر نے کہا' ہاں بتلاؤ' کیا کام ہے؟ کہا یہ شہتیر جو میں نے چیرا ہے بڑی مصیبت سے اسے چیرتے چیرتے یہاں تک لایا ہوں۔ اوپر میں نے کھونٹی لگا رکھی ہے۔ اب وہ کھونٹی مجھ سے نکلتی نہیں' آپ اگر اس میں ہاتھ ڈال کے یہ کھونٹی نکال دیں' تو بڑا کام ہوگا۔ اس نے کہا یہ کونسا بڑا کام ہے' میں ابھی نکالتا ہوں۔ تو شیر نے دونوں ہاتھ اس میں دیئے' بڑھئی کے بچے نے چپکے سے وہ کھونٹی نکال دی' دونو پھٹ برابر ہوئے تو شیر صاحب پھنس گئے؟ اور چیں چیں کر رہے ہیں' نکلا جاتا نہیں' اور وہ بڑھئی کا بچہ کھڑا ہوا ہنس رہا ہے۔ دیکھ لیا انسان کو ___ ؟ اب وہ شیر ہے کہ پھنس رہا ہے' نہ نکل سکتا ہے۔ نہ جا سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیر ان دونوں پھٹوں کے اندر پھنس گئے' وہ کھونٹی نکل گئی' اور بڑھئی کے بچے نے ہنسنا شروع کیا ___ اس وقت شیر کے بچے نے کہا کہ واقعی جو اپنے ماں باپ سے نصیحت نہیں مانتا' وہ اسی ذلت و خواری کا شکار بنتا ہے ___ گویا عورتوں نے ہمیں یہ قصہ عبرت دلانے کے لئے سنایا تھا کہ اپنے بڑوں کی نصیحت ماننی چاہئے۔ جو اس نصیحت کے خلاف کرتا ہے' وہ یوں ذلت میں مبتلا ہوتا ہے' اور مصیبت کا شکار ہوتا ہے۔

مجھے اس سے یہ سنانا مقصود ہے کہ بڑھئی کے اتنے سے بچے نے جو شیر پر قابو پایا اور ہاتھیوں پر قابو پایا' اونٹوں اور گھوڑوں پر قابو پایا' وہ بدن کی طاقت سے قابو نہیں پایا۔ بدن کی طاقت اونٹ کی انسان سے زیادہ ہے۔ اگر اونٹ بلا ارادہ انسان پر گر پڑے تو انسان پس کے رہ جائے' چکنا چور ہو جائے۔ ہاتھی اگر کسی انسان پر آپڑے' تو انسان تو بے چارہ پس کے رہ جائے۔ کچھ بھی طاقت نہیں۔ تو بدن کی طاقت سے انسان غالب نہیں آیا۔ علم اور عقل کی طاقت سے غالب آیا ہے۔ وہ طاقت آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ وہ دل میں رہتی ہے۔ انسان کی انسانیت فی الحقیقت اس طاقت میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر بدن ہمارا بہت ڈیل ڈول کا ہو جائے' پہلوان بن جائیں اور اندر عقل نہ ہو' ہم غلبہ نہیں پا سکتے' انسان کا غلبہ تو علم و عقل اور فضل و کمال سے ہے۔

انسانی عقل و شعور کی قوت

یہ جو ساری دنیا عاجز ہے۔ شیر نے بھی کہا کہ انسان کا نام مت لو' بھیڑیئے نے بھی کہا' یہ اس کی عقل سے ڈر رہے تھے' بدن سے نہیں ڈر رہے تھے' آج یہ مشینیں چل رہی ہیں۔ مشین لگا دی اور پہاڑوں کے بڑے بڑے پتھر پس پس کر اس میں چونا بن رہے ہیں۔ تو نہ پہاڑ کی پیش چلتی ہے' نہ درختوں کی پیش چلتی ہے۔ ساری چیزیں کٹ رہی ہیں دنیا ہے کہ پسی جا رہی ہے' انسان کے آگے عاجز ہے' انسان کھڑا ہوا ہے' کہیں چکی بنا دی کہیں مشین بنا دی ___ زمین کے خزانے انسان نے نکال نکال کے استعمال کئے' اور زمین بے چاری چوں نہیں کر سکتی۔ اب آپ کے افریقہ میں جگہ جگہ سونے کی کانیں ہیں۔ ہزار ہا فٹ گہرے غار کھود کر گویا انسان نے زمین کا جگر نکال لیا' مگر زمین کچھ بھی نہیں بول سکتی۔ سونا اس کا نکال باہر کیا۔ چاندی اس کی نکالی' ہیرے اس کے نکال ڈالے۔ انسان کے آگے سب چیزیں عاجز ہیں' اور یہ تصرف کر رہا ہے' یہ بدن کا تصرف نہیں' یہ علم و عقل کا تصرف ہے۔ تو سائنس انسان کے بدن سے نہیں' انسان کے دماغ سے پیدا ہوئی' عقل سے نکلی' دنیا میں جتنی سجاوٹ ہے' جتنی زینت اور آرائش ہے' وہ انسان کے علم کی ہے۔ آخرت جتنی منور ہوگی' وہ انسان کے علم سے منور ہوگی' عمل سے منور ہوگی۔ بدن کے ڈیل ڈول سے منور نہیں ہوگی۔

امتِ محمدیہ کے نام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام

حدیث میں ہے کہ معراج کی شب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب ساتویں آسمان پر پہنچے ہیں تو

ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے، جس کو بیت المعمور کہتے ہیں ___ انسانوں کا قبلہ مکہ میں ہے۔ جس کو بیتُ اللہ اور کعبۂ محترمہ کہتے ہیں۔ اس میں آپ لوگ طواف و سجدے کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، ادھر کو رُخ کرتے ہیں۔ استقبالِ قبلہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ساتویں آسمان پر فرشتوں کا قبلہ ہے۔ فرشتے اس میں طواف کرتے ہیں ___ اور حدیث میں ہے کہ روزانہ ستر ہزار فرشتے طواف کرتا ہے، اور آج جنہوں نے طواف کیا ہے اب اَبَدُالآباد تک انہیں نوبت نہیں آئے گی، اگلے دن پھر ستر ہزار، اس سے اگلے دن پھر ستر ہزار، اَبد تک اسی طرح نئے نئے ستر ہزار آتے رہیں گے، اور طواف کرتے رہیں گے، پھر چھٹے آسمان میں اس کی سیدھ میں دوسرا قبلہ ہے۔ چھٹے آسمان کے فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں۔ پانچویں آسمان میں اس کی سیدھ میں اور قبلہ ہے، اس کا وہاں کے لوگ۔ غرض ساتوں آسمانوں میں اوپر نیچے ایک سیدھ میں قبلے ہیں ___ حدیث میں ہے اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر ڈالا جائے، تو ٹھیک بیتُ اللہِ الکریم کی چھت پر آکر گرے گا، اس سیدھ میں ہے۔ اصل میں قبلہ یہ محل اور مکان ہے، عمارت قبلہ نہیں ہے اگر عمارت نہ بھی رہے۔ معاذ اللہ اس کو ڈھا دیا جائے، نماز جب بھی ادھر ہی کو منہ کرکے پڑھنی پڑے گی۔ اس واسطے کہ قبلہ ان پتھروں کا، یا اس مکان کا نام نہیں ہے، بلکہ اس موضع اور محل کا ہے، جہاں وہ عمارت بنی ہوئی ہے، اور ساتویں زمین سے لے کر ساتویں آسمان تک ایک ہے، وہی قبلہ ہے۔ وہ ایک کلی ہے۔ جس کے اردگرد ساتوں آسمان اور زمینیں گھوم رہی ہیں۔

اسی لئے اگر آپ فضا میں جائیں، پچاس ہزار نہیں پچاس لاکھ فٹ بلندی پر جائیں، تب بھی رخ ادھر ہی کو کرنا پڑے گا، کیونکہ قبلہ کی فضا یہاں سے آسمانوں تک ایک ہی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ایک لاکھ میل اوپر پہنچ کر آپ نیچے کی طرف منہ کرکے نماز پڑھیں گے۔ سامنے رخ کریں گے، کیونکہ نیچے سے اوپر تک وہ ایک کیل ہے جو در حقیقت اوپر تک چلی گئی ہے۔ وہی کعبۂ محترم ہے۔ اس محل اور مقام کا نام کعبہ ہے، عمارت کا نام نہیں ہے ___ تو فرشتوں کا کعبہ ساتویں آسمان پر ہے۔ چھٹے آسمان والوں کا قبلہ چھٹے آسمان پر ہے، پانچویں والوں کا پانچویں پر، اسی طرح سے قبلے ہیں۔

اسی طرح جو یہ زمین پر قبلہ ہے، اس کی سیدھ میں نچلی زمین پر بھی قبلہ ہے۔ اس کی سیدھ میں اس کی نیچے کی زمین پر۔ سات زمینیں ہیں سات آسمان ہیں۔ تو نیچے سے اوپر تک قبلہ ہے۔

بہرحال ساتویں آسمان پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی، جو بیتُ المعمور کی دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

اور وہ جگہ غالباً اس لئے دی گئی کیونکہ دنیا میں انہوں نے بیتُ اللہِ الکریم کی تعمیر کی ہے۔ تو جیسا عمل تھا، ویسی جزا سامنے آئی۔ ساتویں آسمان پر بیٹھنے کے لئے بھی انہیں بیتُ اللہ دیا گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ :

"اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کو میرا سلام کہہ دینا، اور کہہ دینا کہ **الجنۃ قیعان** ۔ جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے۔ اس میں کوئی چیز بنی ہوئی نہیں، جو بھی محلات اور باغات ہوں، وہ تمہارے لئے کچھ نہیں۔ تم جب کوئی عمل کرو گے۔ تمہیں جب ہی ان محلات کا استحقاق پیدا ہوگا۔ تم اپنی جنت خود بناؤ گے، بنی بنائی جنت تمہاری نہیں ہے، خود تمہیں بنانی پڑے گی، جیسے عمل کرو گے، ویسا ہی وہاں ثمرہ مرتب ہو جائے گا، جیسی نیکی کرکے بھیجو گے، ویسی ہی وہاں جزا مہیا ہو جائے گی ___ تو تم یہاں بیٹھ کر جنت بناؤ، جب جا کے تمہارا مقام جنت میں ہوگا۔ تم نے کچھ عمل نہ کیا، اور تم یہ

امید لگائے بیٹھے رہے کہ جنت میں محلات ملیں گے، تم نے بنائے ہی نہیں، تو ملیں گے کہاں سے؟ تم خود تعمیر کرو گے، جب تمہیں ملیں گے"۔

دُنیا میں ہر انسان معمار ہے

ہمارے دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرّس مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ کشف بزرگوں میں سے تھے، اور اولیائے کاملین میں سے تھے۔ مولاناؒ میں کچھ تھوڑی سی مجذوبیت کی شان تھی جیسے مجذوب ہوتے ہیں کہ کوئی لٹک لگ گئی، کوئی بات لگ گئی، بس اسی طرف چل پڑے۔ یہ کچھ عادت تھی۔

ایک دن رات کو بیٹھے اور لٹک لگی، یہ دعا مانگنا شروع کی، کہ یا اللہ! مجھے تین لاکھ روپے دے دے۔ اب کیوں دے دے تین لاکھ، کاہے کے لئے دیدے، بس کچھ نہیں ___ آدھی رات گزر گئی دعا مانگتے مانگتے۔ یا اللہ مجھے تین لاکھ روپے دے دے ___ مجذوب جو ٹھہرے، تو مجذوبیت میں ایک بڑہاتھ لگ گئی۔ اور دعا شروع کردی۔ تین چار گھنٹے گزر گئے، رات کے دو بج گئے ___ اسی دعا مانگنے کی حالت میں بیٹھے ہی بیٹھے مولاناؒ کو نیند آگئی۔ تو خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا محل سفید رنگ کا ہے، کئی میلوں میں چلا گیا ہے، اور بالکل ایسا جیسے انڈا سفید ہوتا ہے۔ گویا اعلیٰ قسم کا وہائٹ ہال بنا ہوا ہے۔ اور اس کے اوپر دیواروں کے کناروں پر بڑے بڑے موتی لگے ہوئے ہیں، جو سورج سے بھی زیادہ روشن ہیں۔ تمام محل کے اردگرد چاندنا پھیلا ہوا ہے۔ ہزاروں سورج لگے ہوئے ہیں۔ مولاناؒ کو محل بہت پسند آیا۔ ہزاروں لوگ وہاں پھر رہے ہیں۔ مولاناؒ نے ان سے پوچھا کہ بھائی! یہ محل کس کا ہے؟ لوگوں نے کہا یہ مولانا محمد یعقوب صاحب کا محل ہے اور یہ جنت ہے۔ اور جنت میں یہ اللہ نے ان کا مکان بنایا ہے ___ مولانا بہت خوش ہوئے۔ اس میں داخل ہونا چاہا۔ تو دربانوں نے روک دیا کہ ابھی داخلہ کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آئے گا جب داخل ہوں گے۔ بڑا پسند آیا۔ سبحان اللہ! بڑا عجیب محل ہے، جس کے باہر اتنی چمک دمک ہے، تو اندر کیسے کیسے سامان ہوں گے ___ ایک طرف کو جو گئے تو دیکھا کہ ایک کونے میں ایک موتی ندارد۔ وہ موتی ٹوٹا ہوا ہے، اور وہاں اندھیرا پڑا ہوا ہے۔ سارے محل کے اردگرد تو چاندنا اور روشنی اور کونے میں ایک موتی نہیں ہے؟ وہاں اندھیرا۔ مولانا نے لوگوں سے پوچھا کہ بھائی یہاں موتی لگایا ہی نہیں گیا یا تھا اور نہیں رہا کہ نہیں تھا تو، ابھی ٹوٹا ہے۔ کیوں ٹوٹ گیا ___؟ کہا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب اللہ تعالیٰ سے تین لاکھ روپے مانگ رہے تھے، حکم دیا کہ محل کا ایک موتی توڑ کے بھیج دو، یہ تین لاکھ سے زیادہ قیمت کا ہے۔ تو وہ توڑ کے بھیج دیا گیا۔

اب مولانا کی آنکھ کھلی۔ اب دوسری دعا مانگنا شروع کی، یا اللہ! مجھے نہ تین لاکھ چاہئے، نہ تین ہزار چاہئے، نہ تین سو چاہئے۔ اگر میرے جنت کے محل کی اینٹیں توڑ توڑ کے میرے دنیا کے مکان کی تعمیر ہوئی، تو میری آخرت تو ویران ہو جائے گی۔ مجھے یہاں نہیں چاہئے، میں تو وہیں لوں گا۔ اب یہ دعا شروع کردی کئی گھنٹے اسی میں لگ گئے کہ مجھے نہیں تین لاکھ چاہئے، میں نہیں لینا چاہتا، پھر آنکھ لگی۔ دیکھا تو پھر وہی محل ہے۔ اب جو کنارے پہ گئے تو وہ موتی لگا ہوا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مولانا نے مانگتے مانگتے یہ عرض کردیا کہ اس وقت مجھے نہیں چاہئے۔ موتی پھر لگا دیا گیا۔

مجھے یہ بات اس پر یاد آگئی کہ جنت کی تعمیر تو ہم کرتے ہیں۔ اگر ہم تعمیر نہ کریں۔ وہاں اندھیرا پڑا رہے گا۔ بلاشبہ اللہ نے جنت میں بڑی بڑی نعمتیں بنائی ہیں۔ مگر ہمارے حق میں کچھ نہیں جب تک ہم کچھ کر کے نہ جائیں۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ زمین میں سونا بھی ہے، چاندی بھی ہے۔ مگر آپ کے لئے کچھ بھی نہیں

جب تک محنت کر کے مشین نہ لگائیں۔ مشین لگاؤ پھر نکالو سونا' ایک شخص گھر میں بیٹھا رہے' چاہے ساری زمین میں سونا بھرا ہوا ہو' اس کے لئے کچھ نہیں۔ تو یہ کہا جائے گا کہ افریقہ سونے سے بھرپور ہے مگر ملے گا اسے جو محنت کرے گا' یہ نہیں کہہ سکتے کہ افریقہ میں سونا نہیں۔ تو جنت میں سونے اور چاندی کے محلات ہیں' مگر ملیں گے تب جب آپ یہاں محنت کریں گے۔

حدیث میں ہے کہ جنت میں ایک محل تعمیر کیا جاتا ہے۔ ملائکہ اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ تعمیر کرتے کرتے ایک دم تعمیر رُک جاتی ہے۔ دوسرے فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم تعمیر بنا رہے تھے' رک کیوں گئے؟ وہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی فلاں عمل کر رہا تھا' ہم اس کے لئے مکان بنا رہے تھے' اس نے عمل کرنا چھوڑ دیا۔ مٹیریل بھیجنا چھوڑ دیا' ہم نے تعمیر روک دی۔ تو درحقیقت جنت کی تعمیر آپ یہاں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ ہر انسان معمار ہے۔ کوئی دنیا میں بیٹھ کر جہنم بنا رہا ہے کوئی جنت بنا رہا ہے۔ اپنی اپنی محنت کر رہے ہیں۔ مگر جو کچھ کرے گا' اسی کا نتیجہ سامنے آئے گا ___ تو مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے وہ دعا روک دی' اور کہا کہ مجھے وہ موتی نہیں چاہئے۔ اس واسطے کہ اگر میری آخرت دنیا میں مل گئی' آخرت میں کچھ نہیں رہے گا۔ تو اصل چیز محنت اور کمال ہے' وہ ہو گا تو وہاں ملے گا' ورنہ نہیں۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا' اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی امت کو میرا سلام کہہ دینا' اور کہہ دینا کہ **الجنۃ قیعان** جنت تمہارے حق میں چٹیل میدان ہے' اس میں تمہارے لئے کوئی چیز نہیں۔ جتنا کرلو گے' وہ تمہارے لے ہو جائے گا' ورنہ اس میں کچھ نہیں۔ تو جو کچھ آدمی کو ملتا ہے' اپنی محنت سے ملتا ہے تمنائیں کرنے سے نہیں ملتا۔ دنیا کو دارُالکسب بنایا گیا ہے' جو محنت اٹھائے گا' وہ پالے گا۔ اگر آپ صبح سے شام تک دکان پر بیٹھ کر محنت نہ کریں' آپ پیسے لے کر گھر نہیں آسکتے۔ اگر کاشت کار کھیت پر جا کر محنت نہ کرے' تو چار دانے لے کر اپنے گھر نہیں آسکتا۔ اگر ایک صناع محنت نہ کرے' برتن نہ بنائے' بازار میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو گی۔ کیونکہ دنیا تو محنت کی جگہ ہے' جو کرے گا' وہ پائے گا۔ جو نہیں کرے گا' اسے کچھ نہیں ملے گا۔

سب سے زیادہ محنت طلب' ایمان کا علم ہے

سب سے بڑی چیز جو انسان کے لئے محنت طلب ہے وہ علم ہے۔ علم ہی سے دنیا میں اور آخرت میں بھی چاندنا ہے۔ سائنس کا علم ہو گا' تو دنیا سجے گی۔ ایمان کا علم ہو گا' تو آخرت سجے گی۔ دنیا کا سجانا بھی ایک حد تک ٹھیک ہے۔ مگر بھائی! اس کو اگر سجاؤ گے بھی' تو ایک دن ختم ہو جائے گی' اس لئے اگر سارا سرمایہ اس کے اوپر لگا دیا' یہ تو ہاتھ سے چھننے والی ہے' تو پھر سرمایہ اس چیز میں کیوں نہ لگایا جائے' جو باقی رہنے والی ہے۔ بقدرِ ضرورت اس میں لگاؤ۔ بقایا سرمایہ اس میں لگاؤ' جس کی ابدالآباد تک ضرورت ہے۔

کیسی حکمت کی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی۔ فرمایا:

> **اعمل للدنیا بمقدار بقائک فیھا۔ واعمل للاٰخرۃ بمقدار بقائک فیھا**
>
> "دنیا کے لئے اتنی محنت کرو' جتنا دنیا میں رہنا ہے۔ آخرت کے لئے اتنی محنت کرو جتنا آخرت میں رہنا ہے"۔

دنیا میں رہنا ہے پچاس برس' چالیس برس' دس بیس برس' آخرت میں ابدالآباد تک کے لئے رہنا ہے' تو کم سے کم وہاں کی محنت زیادہ ہونی چاہئے۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ آپ یہاں کے لئے کچھ نہ کریں۔ نہیں یہاں

کے لئے آپ سب کچھ کریں۔ رہنے کے لئے گھر بھی بنائیں' کپڑا بھی بنائیں' کھائیں بھی' مگر سارا سرمایہ اسی میں نہ لگائیں۔ کچھ سرمایہ آگے کے لئے بھی چھوڑیں۔ کرنا دھرنا تو وہاں ہے سب کچھ' اس واسطے جب تک وہاں کی کوئی چیز حاصل نہیں ہوگی' وہاں کا کام نہیں بنے گا۔ اور وہاں کی سب سے بنیادی چیز علم ہے۔ جب تک وہ قلب کے اندر نہیں ہوگا' چاندنا نہیں پیدا ہو سکتا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

الناس کلهم هالکون الا العالمون۔

''سارے انسان ہلاک ہونے والے ہیں' تباہ ہو جانے والے ہیں' مگر علم والے بچیں گے''۔

جو اہلِ علم ہیں ان کے لئے نجات ہے۔ جہالت کے ساتھ نجات نہیں ہے۔ جاہل کو بھی اگر نجات ملتی ہے' تو کسی عالم کے ساتھ لگ کر ملتی ہے۔ اگر مزدور کو بھی کچھ ملے گا تو وہ کسی سرمایہ والے سے ملے گا۔ جب اس کی نجات بنے گی۔ سرمایہ دار وہ ہے جو اپنے علم اور قابلیت سے دکان پر بیٹھ کر لاکھوں روپے کی کمائی کر رہا ہے۔ وہ اپنے علم کے زور سے پل رہا ہے۔ جو بے چارے علم نہیں رکھتے' وہ اس کے ساتھ لگ گئے ہیں' تو ہزار پانچ سو کی روزی اس کے ذریعہ سے ہو رہی ہے۔ مگر انجام یہی نکلا کہ ان کی سمجھداری اور قابلیت سے دولت پیدا ہوئی ہے' جہالت سے پیدا نہیں ہوئی۔ دنیا کی بات ہو یا آخرت کی' دونوں چیزیں ہیں علم سے متعلق تو آپؐ نے ارشاد فرمایا :

الناس کلهم هالکون الا العالمون

''تمام انسان ہلاک ہونے والے ہیں' علم والے بچیں گے''۔

علمِ محض کار آمد نہیں

مگر علم والے بھی غرّہ نہ کریں' علم والے بھی ناز نہ کریں کہ بس ہمارے لئے تو نجات ہے' نہیں۔ دوسرا جملہ بھی فرمایا :

والعالمون کلهم هالکون الا العاملون۔

''علم والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔ بچیں گے وہ جو اپنے علم کے مطابق عمل کرتے ہیں''۔

اگر عمل نہ ہو' تو علم محض کوئی کار آمد چیز نہیں ہے' بلکہ اور زیادہ وبال بن جاتا ہے۔ علم جب کار آمد بنتا ہے' جب اس کا استعمال کیا جائے' اس کو عمل میں لایا جائے۔ علم محفوظ بھی جبھی رہتا ہے جب عمل میں آئے۔ ترقی بھی جبھی ہوتی ہے جب عمل میں آئے۔ اگر آپ ایک علم سیکھ لیں' لیکن استعمال میں نہ لائیں' چند دن کے بعد بھول جائیں گے۔ کام کے اندر لاتے رہیں' وہ ذہن کے اندر حاضر رہے گا' محفوظ رہے گا۔ ہم تو اپنا تجربہ آپ سے عرض کرتے ہیں اور غالباً ہر طالب علم کو یہی تجربہ ہوگا کہ جن مسائل پر ہمارا عمل ہے' ان کا علم محفوظ ہے' اور جن مسائل پر عمل کی نوبت نہیں آتی' وہ یاد ہی نہیں رہتے۔ مثلاً نماز کے مسائل تو وہ ہیں' اگر آپ پوچھیں تو شاید میں فوراً بتلا دوں۔ لیکن اگر حج کے مسائل پوچھیں گے' تو ذرا کتاب دیکھنی پڑے گی۔ اس لئے کہ ہر روز عمل کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ عمر میں ایک مرتبہ حج کر لیا۔ یاد ہی نہیں رہتے۔ اور اگر بیع و شراء کے مسائل پوچھیں اس میں تو شاید ایک مسئلہ بھی بے کتاب دیکھے بتانا مشکل ہوگا'

اس لئے کہ خرید و فروخت کی نوبت ہی کبھی آتی ہی نہیں۔ جو یہ یاد رہے کہ یہ بیع باطل ہے، یہ بیع فاسد ہے۔ یہ بیع اچھی ہے۔ یہ بیع مکروہ ہے اس لئے کہ ان مسائل پر ہمارا عمل نہیں۔ بلکہ آپ لوگوں کو اگر مسائل معلوم ہو جائیں آپ کو بہ نسبت عالم کے بیع و شراء کے مسائل زیادہ یاد رہیں گے، کیوں کہ رات دن آپ کو سابقہ پڑے گا۔ جن مسائل پر عمل ہوتا رہتا ہے، ان کا علم محفوظ رہتا ہے، اور جن مسائل پر عمل نہ ہو، علم محفوظ نہیں رہتا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علمِ محض کار آمد نہیں ہے، جب تک اس کا استعمال نہ ہو، اس پر عمل نہیں، وہ علم بیکار ہے، بلکہ وہ اور اللہ کی طرف سے زیادہ حجت بن جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن علماء کی ایک جماعت کو بلایا جائے گا، حق تعالیٰ فرمائیں گے، ہم نے تمہیں علم دیا، اور بڑا علم دیا، بلکہ کئی کئی قسم کے علوم دیئے۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا؟ ___ وہ عرض کریں گے، ہم نے مسائل بتائے، ہم نے نصیحت کی، ہم نے کتابیں تصنیف کیں۔ فرمایا۔ مگر کیوں کیں؟

لیقال انکم عالم تاکہ دنیا میں شہرت ہو جائے کہ تم بڑے عالم تھے۔ تو وہ ہو گئی۔ وہ چیز مل گئی جس کے لئے تم نے محنت کی تھی۔ مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟ اس قسم کے علماء کو گھسیٹ کر اوندھے منہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔ علم ان کے کام نہیں آئے گا۔ اس لئے کہ اس کے اوپر عمل نہیں تھا۔ تو علمِ محض بیکار ہے۔ جب تک کہ اس کے ساتھ عمل نہ ہو، بلکہ احادیث کے دیکھنے سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جو بے چارے بے پڑھے لکھے لوگ ہیں مگر کچھ نہ کچھ نیکی کرتے ہیں۔ ان کی نجات جلدی ہو جائے گی، علماء کی دیر سے ہو گی۔ اس واسطے کہ عالم سے تو یہ کہا جائے گا کہ آپ تو یہ بات بھی جانتے تھے۔ پھر اس پر عمل کیوں نہ کیا؟ یہ مسئلہ معلوم تھا، اس پر کیوں نہ عمل کیا؟ اور جو بے چارہ بے پڑھا لکھا اَن پڑھ تھا، اس سے اجمالاً کہا جائے گا کہ نماز پڑھی تھی ___؟ اس نے کہا حضور پڑھی تھی۔ زکوٰۃ دی تھی؟ جی ہاں دی تھی۔ کہ اچھا جاؤ جنت میں۔ اس لئے کہ نہ زیادہ علم نہ زیادہ عمل، اس لئے زیادہ علم بھی ایک مصیبت کی چیز ہے، مواخذہ بڑھ جاتا ہے۔

آپ کے سامنے کوئی بے وقوف سا سیدھا سادھا آدمی آجائے، تو ایک آدھ بات پوچھ کے آپ کہیں گے، جاؤ چھٹی، اور جو ذرا سمجھ دار ہے، جو کچھ زیادہ بولتا ہے، اس سے سوالات بھی زیادہ کریں گے۔ امتحان لینے والا جب بیٹھتا ہے، اگر کوئی طالب علم سیدھا سادھا بے وقوف سا ہے، ایک دو موٹی بات پوچھی، نمبر دے دیئے، جاؤ تمہیں پاس کر دیا۔ اور اگر کوئی ذکی ہے، بولتا زیادہ ہے۔ ممتحن اس سے زیادہ سوالات کریں گے کہ یہ بات تم نے کیوں کہی؟ اور یہ کیوں کہی؟ اس کے نمبر مشکل سے آتے ہیں ___ اسی واسطے حدیث میں ہے کہ:

علیکم بدین العجائز

"بوڑھیوں کا دین اختیار کرو"۔

پُرانے زمانے کی بڑی بوڑھیاں جو ہیں، وہ اپنے دین پر چل رہی ہیں، نہ ان کے دل میں شک ہے نہ شبہ، نہ زیادہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا پکا دین ہے۔ ایسا دین اختیار کرو، جس میں نہ شکوک ہوں، نہ سوالات ہوں۔ جلدی سے نجات مل جائے۔ زیادہ علم وبال بن جاتا ہے، اگر اس پر عمل نہ ہو۔ اور اگر عمل ہوا، پھر اس میں شک نہیں کہ ترقی بھی بڑی ہے، درجات بھی بڑے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محض علم پر غرہ مت کرو۔ علم کار آمد نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ اور اس کا استعمال نہ ہو، تو دو چیزیں فرمائی گئیں کہ آدمی کی نجات جہالت میں نہیں بلکہ علم میں ہے اور محض علم میں نہیں ہے بلکہ عمل میں ہے۔

بڑا عمل بلا اخلاص معتبر نہیں

پھر آگے ایک بات اور ارشاد فرمائی:

والعاملون کلھم ھالکون الا المخلصون

عمل کرنے والے سب تباہ و برباد ہیں، ان کے عمل کو بھی نہیں پوچھا جائے گا۔ عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد۔ بچیں گے کون؟ مخلصین، جو اپنے عمل میں خلوص رکھتے ہیں، للّٰہیت رکھتے ہیں۔ دکھلاوے کے لئے عمل کرے، وہ وبال کی چیز ہے۔ شہرت پسندی کے لئے عمل کرے، وہ تباہی کی چیز ہے۔ خالص خدا کی رضا کے لئے عمل کرے، وہی عمل کار آمد ہوتا ہے، اسی پر انسان کی نجات ہے۔

تو فرمایا لوگوں کی نجات شکل و صورت سے نہیں ہوگی، علم سے ہوگی۔ پھر فقط علم سے نہیں ہوگی، عمل سے ہوگی، پھر فقط عمل سے نہیں ہوگی، اخلاص سے ہوگی، للّٰہیت سے ہوگی۔ دو رُخے پن سے عمل کرے کہ خدا کو بھی خوش کرلوں، اور کچھ بندوں کو بھی خوش کرلوں۔ وہ عمل معتبر نہیں ہے۔ فقط اللہ کی رضا کے لئے ہو، وہی عمل معتبر ہوگا، ورنہ نہیں ہوسکتا۔ تو فرمایا کہ:

والعاملون کلھم ھالکون الا المخلصون

"عمل کرنے والے بھی سب تباہ و برباد ہیں۔ خلوص والے بچیں گے"۔

اگر کسی عمل کی شکل و صورت بڑی ہو، لیکن اس میں اخلاص نہ ہو، تباہی کا ذریعہ ہے۔ اور چھوٹا سا عمل ہو، بالکل معمولی سا ہو، مگر خلوص اور للّٰہیت ہو، تو وہ عمل نجات کا ذریعہ بن جائے گا۔ حدیث میں خلوص کی تین مثالیں فرمائی گئیں، اور تین ہی مثالیں حدیث میں بلا خلوص کے عمل کی فرمائی گئیں۔ اور نتائج الگ الگ۔

ابھی جیسے میں نے ایک حدیث کا جز سنایا، کہ علماء کی ایک جماعت بلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ اپنا احسان جتلائیں گے کہ ہم نے تمہیں قسم قسم کے علم دیئے، تم نے کیا کیا ___؟ کہیں گے، ہم نے نصیحت کی۔ ہم نے درس و تدریس کیا۔ ہم نے تبلیغ کی، ہم نے تصنیف کی۔ فرمائیں گے، کی مگر کیوں کی؟ لیقال انک عالم تاکہ دنیا میں شہرت ہو جائے کہ تم بڑے عالم تھے، تو فَقَدْ قِیْلَ۔ وہ شہرت ہوگئی تمہارا مقصد مل گیا۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔ یہاں تمہارے لئے اب کیا ہے؟ ___ انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ مالداروں کی ایک جماعت بلائی جائے گی، جن کو لاکھوں رقم اللہ نے دی تھی۔ حق تعالیٰ احسان جتلائیں گی۔ ہم نے تمہیں لکھ پتی، کروڑ پتی بنایا، لاکھوں کا مال دیا۔ اور ایک ہی قسم کا نہیں۔ نقد الگ دیا، باغات الگ دیئے، بلڈنگیں الگ دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا۔ وہ کہیں گے، ہم نے صدقہ کیا، خیرات کیا۔ ہم نے یتیموں کو، بیواؤں کو دیا ___ فرمایا، دیا مگر کیوں؟ لیقال انک جواد ___ تاکہ دنیا میں شہرت ہو کہ تم بڑے سخی داتا ہو۔ بڑے دینے والے ہو۔ تو وہ تو ہو چکی شہرت۔ ہم سے کیا چاہتے ہو؟ یہ جماعت بھی اوندھے منہ جہنم میں ڈالی جائے گی۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ ایک جماعت شہیدوں کی بلائی جائے گی۔ حق تعالیٰ فرمائیں گے ہم نے تمہارے بدنوں میں طاقت دی۔ تمہیں پہلوانی کے بدن دیئے۔ تم میں قوتیں دیں۔ تم نے ہمارے لئے کیا کیا ___؟ عرض کریں گے کہ ہم نے جہاد کیا، ہم نے جانیں لڑادیں۔ ہم نے گردنیں کٹا دیں، خون بہادیا۔ فرمائیں گے یہ کیا، مگر کیوں؟ لیقال انک جری۔ تاکہ دنیا میں تمہاری شہرت ہو کہ تم بڑے بہادر ہو، تم بڑے جواں مرد

تھے۔ فقد قیل وہ شہرت ہوگئی۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو___؟ اس جماعت کو بھی اوندھے منہ ہی جہنم میں ڈالا جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ علم سے تبلیغ کرنا' کتنا بڑا عمل ہے' پیغمبروں کا عمل ہے' مگر اکارت ہوگیا۔ اس لئے کہ اس میں مخلوص نہیں تھا۔ سخاوت کتنا بڑا عمل ہے صدقہ خیرات لاکھوں کروڑوں دیا۔ اتنا بڑا عمل ہے بے کار ہوگیا۔ اس لئے کہ اس میں خُلوص نہیں تھا۔ شہرت پسندی کا جذبہ تھا۔ جہاد کتنا بڑا عمل ہے کہ آدمی نے جان تک دیدی۔ مگر عمل مقبول نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اس میں خُلوص نہیں تھا۔ تو عمل کا ڈھانچہ کام نہیں دیتا جب تک عمل کے اندر جان نہ ہو۔ روح نہ ہو۔ روح اخلاص اور خلوص ہے۔ اس سے عمل کے اندر جان پیدا ہوتی ہے۔ اگر جان نہ ہو' تو مردہ لاش کتنی ہی موٹی ہو' پہلوانوں جیسی ہو' وہ تو ___ دفن کرنے کے قابل ہوتی ہے' کار آمد نہیں ہوتی۔ کار آمد جبھی ہے جب اس کے اندر جان اور روح ہو___ تو عمل کی شکل کتنی ہی بڑی ہو' اگر اس میں اخلاص کی روح نہیں ہے' خُلوص کی روح نہیں ہے' وہ عمل کار آمد ثابت نہیں ہوگا۔ تو بڑے بڑے اعمال کی تین مثالیں آپ نے سُنیں۔ جو خُلوص نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ہوئے۔

چھوٹا عمل خُلوص کی وجہ سے ذریعۂ نجات ہے

تین مثالیں حدیث میں چھوٹے چھوٹے اعمال کی بیان کی گئیں۔ کوئی بڑے عمل نہیں تھے۔ خُلوص کی وجہ سے نجات کا ذریعہ بنے ___ حدیث میں ہے کہ تین آدمی سفر کے لئے نکلے' چند میل دور نکلے تھے کہ زور کی بارش آئی۔ سامان کچھ پاس تھا نہیں۔ تو انہوں نے کہا بھائی بارش شدید آگئی' پہاڑ میں قریب یہ غار نظر آرہا ہے' اس میں چُھپ کر بارش سے بچو' جب بارش تھم جائے گی' پھر اس غار سے اپنا سفر شروع کریں گے' تو تینوں مل کر اس کے اندر اتر گئے' وہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں بیٹھ گئے۔ حدیث میں ہے کہ جب بارش شدید ہوئی تو اوپر سے ایک بڑی چٹان اور پتھر جو منوں وزن کا تھا۔ لُڑکا' تو وہ ٹھیک اس غار کے منہ کے اوپر آکر رُک گیا۔ اور غار کا منہ بند ہوگیا۔ اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ تینوں نے دیکھا تو سمجھ گئے کہ ہماری موت کا وقت آگیا ہے۔ اس لئے کہ چٹان کو ہلا نہیں سکتے ___ اس کا ہٹنا ممکن نہیں۔ کوئی صورت نہیں۔ دو وقت کا ہمارے پاس کھانا پینا ہے۔ کھاتے پیتے رہیں گے۔ اس کے بعد سسک سسک کر مرنا اور جان دینا ہے۔ چنانچہ مرنے کے ارادے سے بیٹھ گئے۔ غم ان کے دلوں پر چھا گیا' آنسو جاری۔ اب بے چارے کچھ نہیں کرسکتے۔ جب ایک دن گزر گیا' اور وہ ناشتہ بھی ختم ہونے لگا اور یقین ہوگیا کہ اب ہماری موت لازمی ہے۔ تو ایک نے دوسرے سے کہا کہ بھئی! مرنا تو ہے ہی' کوئی تدبیر ہی کرنی چاہئے۔ دوسروں نے کہا بھئی تدبیر کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہ تو منوں وزن کی چٹان ہے' نہ اسے ہلا سکتے ہیں' نہ اسے توڑ سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ مریں اور کیا کریں گے۔ اس نے کہا نہیں' میری سمجھ میں ایک تدبیر آئی ہے۔ کم سے کم وہی کرلو۔ دونوں نے کہا کہ بھئی! کیا تدبیر ہے؟ اس نے کہا مادی تدبیر تو ہے نہیں۔ کہ کسی پھاوڑے سے پتھر کو توڑ دیں۔ یہ تدبیر نہیں بلکہ روحانی تدبیر ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم تینوں بیٹھ کر اپنی پوری زندگی کا جائزہ لیں۔ اگر کسی کی زندگی میں کوئی نیک عمل ایسا ہوا ہے' جس میں کامل خلوص اور للّٰہیت تھا۔ اس عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔ یہ تو ہم کرسکتے ہیں۔ سب نے کہا بالکل ٹھیک ہے۔ اب باری باری سب نے اپنے اعمال پیش کرنے شروع کردیئے۔

ایک کھڑا ہوا' اور اس نے کہا اے اللہ! تو دانا اور بینا ہے' تو جانتا ہے کہ میں ایک غریب آدمی تھا۔ میرے ہاتھ پلّے کوئی پیسہ نہیں تھا مگر صورت حال یہ تھی کہ میرے پاس ایک بکری تھی' اسی کے دودھ پر میرا گزر تھا۔

تو میں یہ کیا کرتا تھا۔ کہ میری ایک ماں تھی' بیوی تھی' چند بچے تھے۔ میں بکری کا دودھ نکالتا اور رات کو سب سے پہلے وہ دودھ اپنی ماں کے سامنے پیش کرتا کہ اس کا حق مقدم ہے۔ یہ بڑی بوڑھی ہے' اس کی وجہ سے ہم ہیں۔ اس کا حق مقدم ادا ہونا چاہئے۔ تو وہ دودھ اس کے سامنے پیش کرتا۔ جب وہ پیٹ بھر لیتی اور دودھ بچ جاتا تو اس میں سے بچوں کو پلاتا اس میں سے بچ رہتا تو بیوی کو پلاتا اس میں سے بچ جاتا تو آخیر میں میں پیتا تھا' کبھی نہیں بچتا تھا تو میں فاقہ کر لیتا تھا' مگر ان کے حقوق کو مقدم سمجھتا تھا۔

ایک دن میں دودھ لے کر آیا۔ ذرا دیر ہو گئی' تو میری ماں کی آنکھ لگ گئی۔ میں اس کی پائنتیوں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا کہ جب بھی اس کی آنکھ کھُلے گی' میں دودھ کا پیالہ پیش کروں گا۔ بچے رو رہے تھے' بلک رہے تھے' ان کا حق مقدم نہیں' ماں کا حق مقدم ہے۔ میں دودھ کا پیالہ لئے کھڑا رہا۔ آدھی رات کہیں اس کی آنکھ کھُلی' جب کہ بچے سو چکے تھے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔

اس نے بھوک سے بیتاب ہو کر کہا کہ دودھ! میں جھٹ پیالہ لے کر پہنچا' اس نے دودھ پیا' اور مجھے بڑی دعائیں دیں' جو بچا میں نے بیوی اور بچوں کو پلایا' جو کچھ بچا تو میں نے بھی پی لیا۔ اے اللہ! یہ جو میں نے عمل کیا' اس میں کوئی دورخی نہیں تھی' کوئی دِکھلاوا اور سناوا نہیں تھا' صرف تیری رضا کی لئے میں نے یہ عمل کیا تھا' اگر واقعی تیرے ہاں میرا یہ عمل خلوص کی وجہ سے قبول ہوا۔ تو اے اللہ! اس مصیبت سے ہمیں نجات عطا فرما ___ حدیث میں ہے کہ ایک تہائی پتھر ہٹ گیا' اور غار کا منہ کھل گیا۔

اب دوسرا کھڑا ہوا' اس نے کہا' اے اللہ! تو جانتا ہے۔ دانا بینا ہے' میں ایک مزدور قسم کا آدمی تھا' کچھ روپیہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ میرے ایک چچا کی بیٹی تھی' جو بڑی حسین و جمیل تھی۔ مجھے اس کے ساتھ عشق پیدا ہوا۔ میں نکاح کا پیغام نہیں دے سکتا تھا' اس لئے کہ میرے ہاتھ پلّے کچھ بھی پیسہ نہ تھا' اور وہ ذرا بڑے گھرانے کی تھی۔ میں نے اس کے سامنے تنہائی میں جا کر اپنا مقصد پیش کیا۔ مطلب یہ تھا کہ میں بدکاری میں مبتلا ہوں۔ اس نے کہا میری ایک شرط ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک ہزار گنّی یا ایک ہزار پونڈ کی تھیلی جب تو لا کر دے گا۔ تب میں اس بدعملی پر آمادہ ہو سکتی ہوں۔ ورنہ نہیں۔ میں نے جا کر مزدوری کی محنت کی برس دن میں جا کر کوئی ایک ہزار گنّی جمع کی۔ اور وہ سونے کے سِکّوں کی تھیلی بھر کر میں لے آیا' اور تنہائی میں اس عورت کو بُلایا۔ اور میں نے کہا کہ تیری یہ شرط پوری کر دی' اور یہ ایک ہزار گنّیوں کی تھیلی سامنے موجود ہے' اب تجھے انکار کرنے کی ضرورت نہیں' اس نے کہا بے شک اب میں انکار نہیں کر سکتی' شرط پوری ہو گئی۔ میں نے پورا ارادہ کیا کہ میں بدعملی اور سیاہ کاری میں مبتلا ہوں۔ جب میں پوری طرح آمادہ ہوا' اس عورت نے کہا اے شخص! اتق اللہ اللہ سے ڈر' یہ جو تو بدعملی کرنا چاہ رہا ہے' قیامت کے دن کھُلنے والی ہے مجھے اور تجھے اللہ کے آگے جواب دینا ہے۔ خدا سے ڈر' اور تقویٰ اختیار کر۔ تو میرا دل لرز گیا' اور کانپ گیا۔ میں اسی وقت کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا میں نے یہ ہزار گنّی چھوڑی۔ اور ہمیشہ کے لئے توبہ کرتا ہوں' میں کبھی بدی کا ارادہ نہیں کروں گا۔ تو محض تیرے ڈر کی وجہ سے اے اللہ میں چھوڑ کر چلا آیا۔ بدعملی سے بچا' اور وہ ہزار گنّی بھی میں نے چھوڑی' اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد سامنے نہیں تھا۔ محض تیری رضا کے لئے میں نے یہ کام کیا۔ اگر تیرے ہاں مقبول ہوا تو ہمیں نجات دے ___ حدیث میں ہے کہ ایک تہائی پتھر اور سرک گیا۔ دو تہائی غار کا منہ کھل گیا۔

اب تیسرا کھڑا ہوا' اور اس نے کہا اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں بھی ایک غریب آدمی تھا۔ کھانے پینے کو میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میرے ایک دوست نے سفر کا ارادہ کیا۔ اور سو روپے میرے پاس امانت رکھوائے'

اور یہ کہا کہ جب میں سفر سے واپس ہوں گا' میری امانت واپس کردینا' اور تجھے اجازت ہے کہ تو میری عدم موجودگی میں خرچ کرلینا۔ جب میں آؤں گا تو دے دینا' کیونکہ امانت کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس روپے رکھوائے جائیں تو بعینہٖ انہیں نوٹوں کا واپس کرنا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ خرچ کرکے آدمی دوسرے دیدے۔ سو (۱۰۰) روپے کے نوٹ اگر رکھوائے تھے تو وہی نوٹ بعینہٖ واپس کرنے پڑیں گے۔ یہ نہیں ہے کہ انہیں خرچ کرکے بدل کر نوٹ دے دے اور سو (۱۰۰) روپے پورے کردے۔ سوائے اس کے کہ رکھوانے والا اجازت دے دے کہ تم خرچ کرسکتے ہو' جب تو آپ خرچ کرسکتے ہیں' اور بدلے میں نوٹ دے سکیں گے۔ اگر وہ اجازت نہ دے تو بعینہٖ اسی چیز کا واپس کرنا واجب ہے' جو آپ کے پاس رکھوائی گئی تھی ___ تو اس شخص نے سو روپے امانت رکھوائے اور ساتھ ہی اجازت دے دی کہ تم خرچ کرسکتے ہو۔ اے اللہ! میں نے انہیں خرچ کیا' ان سو روپے سے میں نے چند بکریاں خریدیں۔ بکریوں کا دودھ بیچنا شروع کیا' تو اس کی رقم آنی شروع ہوئی اس رقم سے کچھ اور بکریاں خریدیں' ان بکریوں کا دودھ بڑھا تو اور خریدیں ___ تو نقد بھی جمع ہونا شروع ہوا۔ بکریوں کا غلّہ بھی بڑھ گیا ___ اس نقد سے پھر میں نے گائے خریدی' تو گائے کا غلّہ بڑھنا شروع ہوا' اور بڑھا تو میں نے اونٹ خریدے غرض گائے' بیل' بکری' اونٹ اور بہت سا سامان جمع ہوگیا' پھر میں نے کچھ جائداد خریدی' کھیت خریدے' باغات خریدے' اس سے لاکھوں روپے کی آمدنی شروع ہوگئی۔ جب دس پندرہ برس گزر گئے' تو لاکھوں روپے میرے پاس جمع ہوگئے' تو اس نے کہا بھائی میرا سو روپیہ واپس کرو۔ تو میں بجائے اس کے سو روپیہ دے دیتا' میں نے ساری تجوریاں پیش کیں' سارے جانور پیش کئے' سارے باغات پیش کئے' کہ یہ ہے تیری امانت' اس نے کہا کہ میری امانت تو سو روپے تھی۔ یہ لاکھوں روپے تو نہیں تھے۔ میں نے کہا کہ لاکھوں روپے ان سو روپے سے ہی بنے ہیں ___ یہ لاکھوں روپے بھی تیرے ہی ہیں۔ اس لئے کہ سو روپیہ تیرا تھا ___ اس نے کہا نہیں مجھے سو چاہئے۔ لاکھوں نہیں چاہئے۔ میں نے کہا یہ لاکھوں بھی تیرے ہی ہیں۔ آخر میں نے اس نے اس کو قبضہ دلادیا۔ اور ساری بلڈنگیں' سارے باغات' اور سارے چوپائے سپرد کردیئے۔ اور میں پھر وہی بھک منگا بن گیا۔ پھر وہی فاقہ مستی ہوگئی۔ ایک پائی میرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اے اللہ! میں نے یہ عمل تیری رضا کے لئے کیا۔ میں نے اپنے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر نہیں کیا۔ اگر یہ عمل تیرے ہاں مقبول ہے تو ہمیں نجات دے۔ حدیث میں ہے کہ جو ایک تہائی چٹان رہ گئی تھی وہ بھی سرک گئی' غار کا پورا منہ کھل گیا' اور انہیں نجات ہوئی ___ یہ باہر آئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

دیکھئے سخاوت' تبلیغ' شہادت اور علم پڑھانے جیسا عمل بے کار ہوگیا۔ جہنم سے نہیں بچاسکا۔ اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا اور یہ چھوٹے چھوٹے اعمال کہ ماں کا حق ادا کیا۔ وہ تو فرض ' واجب ہے' ادا کرنا ہی ہے۔ اسی طرح زناکاری سے بچ گیا' وہ تو اس کا فرض ہے زنا سے بچنا' اس نے کوئی بڑا کام نہیں کیا' اسی طرح سے امانت سپرد کردی' اس کے فرائض میں تھا کہ امانت سپرد کرتا۔ کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے اعمال تھے مگر خلوص سے کئے' تو دنیا میں نجات کا سبب بن گئے' اور اللہ کے ہاں مقبولیت کا سبب بن گئے۔ اللہ اگر عمل قبول نہ کرتا۔ تو یہ نجات نہ ہوتی' اور چٹان نہ ہٹتی۔ تو خدا کے ہاں بھی مقبولیت ہوئی' دنیا میں بھی نجات ملی' حالانکہ عمل بالکل حقیر سے تھے لیکن خلوص تھا ___ اور وہ بڑے بڑے تین اعمال تھے۔ وہ جہنم سے نہیں بچاسکے' اس لئے کہ ان میں خلوص نہیں تھا۔ تو اصل بنیادی چیز اخلاص ہے۔ خلوص سے جو عمل ہوگا' وہی اللہ کے ہاں قبول ہوگا' اس لئے کہ خلوص عمل کی روح ہے۔ کسی چیز کے ڈھانچے کی قیمت نہیں ہوتی' اس کی جان کی قیمت ہوتی ہے۔ لاش کی قیمت نہیں' جاندار میں جان کی قیمت ہوتی ہے۔ تو عمل کا ڈھانچہ مقبول نہیں۔ کتنا ہی بنا سنوار کے نماز پڑھیں۔ نیت یہ ہو کہ لوگ ہمیں نمازی کہیں' وہ کوئی مقبول چیز نہیں

ہے۔ منہ پر مار دینے کے قابل ہے۔ بنیادی اور اساسی چیز انسان کے لئے خُلوص، لِلّٰہیت اور اخلاص ہے، اللہ کی رضا کے لئے عمل کرنا ہے، مخلوق کے دکھاوے کے لئے عمل کرنا یہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

والعاملون کلھم ھالکون الا المخلصون

"عمل کرنے والے بھی سب کے سب برباد ہیں۔ خُلوص والے بچیں گے، جنہوں نے سچائی اور اخلاص سے عمل کیا"۔

گویا تین بنیادی چیزیں فرمائی گئیں کہ :

الناس کلھم ھالکون الا العالمون۔

انسان ہلاکت اور بربادی سے بچنے والے نہیں ہیں مگر علم والے بچیں گے۔ علم اور عمل ہی نجات کا ذریعہ بنے گا، خلوص، لِلّٰہیت نجات کا ذریعہ بنے گا۔ گویا علم بھی ہو، اس کے ساتھ عمل ہو، اس کے ساتھ اخلاص بھی ہو، تب جا کے نجات کا ثمرہ پیدا ہوگا۔

غُرُور، اخلاص کو ختم کر دیتا ہے

مگر اخلاص کے بعد ایک چیز اور ارشاد فرمائی :

والمخلصون علی خطر عظیم۔

خُلوص ہو تو آدمی غرّہ نہ کرے، اِترائے نہیں کہ میں نے بڑے خُلوص سے عمل کیا، مرتے دم تک خطرہ ہے، جب خاتمہ اخلاص پر ہو جائے، تب اطمینان کرے کہ اب نجات ہوئی ہے۔ ورنہ خاتمہ سے پہلے پہلے اگر کہیں اِتراہٹ پیدا کی، کہیں دل میں کِبر و غُرور آگیا کہ میں بڑا مخلص ہوں، سارا عمل ختم ہو جائے گا۔ سب عمل نامقبول ہو جائے گا ___ تو اخلاص اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا جب تک انسان کے اندر خدا پر بھروسہ کرنے کا جذبہ نہ ہو۔ نازو اتراہٹ نہ ہو، کبر اور غرور نہ ہو کہ میں کوئی چیز ہوں۔ میں نے کوئی عمل کیا۔

مدارِ نجات، صرف اللہ کا فضل ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ ارشاد فرمایا، حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص عابد زاہد تھا۔ رات دن اللہ کی یاد میں لگا رہتا تھا۔ اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں عمل کرتا ہوں، محنت بھی کرتا ہوں، مگر بہرحال بیوی ہے، بچے ہیں، کھیتی باڑی ہے، کمائی ہے، کچھ نہ کچھ اس میں بھی وقت لگانا پڑتا ہے، کوئی ایسی صورت ہو کہ یہ سارے جھگڑے ختم ہوں، اور چوبیس گھنٹے میں خدا ہی کی یاد میں لگا رہوں۔ اس زمانے کی شریعتوں میں یہ بات جائز تھی، آج کی شریعتوں میں یہ بات جائز نہیں ہے، اس زمانے میں یہ جائز تھا کہ آدمی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے پہاڑ کی چٹان پر چلا جائے، تو اس شخص نے رہبانیت اختیار کی، اور وہ یہ کہ بیوی بچے اور مال و دولت کو چھوڑ کر سمندر کے بیچ میں پہاڑ کا ایک ٹیلہ تھا، وہاں جا کے چھپّر ڈالا، کہ یہاں بیٹھ کے اللہ کی عبادت کروں گا، اب یہاں نہ بیوی سامنے ہوگی، نہ اولاد نہ تجارت نہ دکان سامنے ہوگی۔ بس میں ہمہ تن اپنے خدا کو یاد کروں گا، وہاں بیٹھ گیا۔

___ اب کھانے پینے کے لئے تو چاہئے؟ اللہ نے اس کے لئے یہ سامان کیا کہ اسی کڑوے سمندر میں

ٹیلے کے اوپر نہایت میٹھا چشمہ نکل آیا' اور اسی سے ٹھنڈا پانی بہہ پڑا۔ اور اسی ٹیلہ کے اوپر انار کا درخت اگایا' جس کو بڑے بڑے انار لگنے لگے' اور بڑا میٹھا اور بہت ہی قوی قسم کا انار ___ اس عابد کا کام یہ تھا کہ روزانہ ایک انار کھالیتا' اور ایک کٹورا پانی کا پی لیتا۔ اور صبح وشام اللہ کے ذکر میں مصروف ___ نہ رات کو سونا' نہ دن کو آرام کرنا بس دن بھی اور رات بھی اللہ کے ذکر میں مصروف پانچ سو برس اس عابد نے اسی طرح سے گذارے ہیں' کہ ایک کٹورا پانی کا اور ایک انار روز' اور چوبیس گھنٹے خدا کی یاد اور عبادت ___ مرتے وقت اس نے اللہ سے دعا کی کہ یا اللہ! جب تو نے مجھے عمر بھر عبادت کی توفیق دی اور پانچ سو برس عبادت میں لگے' میری موت سجدہ کی حالت میں ہو' اور میرے بدن کو تو قیامت تک محفوظ رکھ' تاکہ میں قیامت تک تیرا سجدہ گذار بندہ سمجھا جاؤں۔ بقیہ زمانہ بھی گویا میں نماز ہی میں لگا ہوا ہوں۔ جب میرا بدن قیامت تک سجدہ میں پڑا ہوا ہے' تو یہ ایسا ہے جیسے میں قیامت تک نماز ہی پڑھتا رہا۔ یہ دعا قبول ہوئی ___ عین سجدہ کی حالت میں اس کا انتقال ہوا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں آج تک اس کا بدن اس پہاڑ کے ٹیلے پر محفوظ ہے۔ لیکن اللہ نے اس کے اردگرد بڑے بڑے گنجان درخت پیدا کردیئے ہیں ___ لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ ہیبت پیدا کردی' اس لئے کہ اگر لوگ جاتے اور دیکھتے کہ ایک مردہ سجدہ میں پڑا ہوا ہے' تو بڑا فتنہ پھیل جاتا' کوئی پوجا پاٹ شروع کردیتا' کوئی اس کی عبادت شروع کردیتا۔ اللہ نے مخلوق کو بچانے کے لئے بڑے بڑے عظیم درخت اُگادیئے' ان کی وجہ سے اندھیرا ہوگیا' اور اندھیرے سے وہاں ایک ہیبت پیدا ہوئی' تو لوگ جاتے ہوئے ڈرتے ہیں' اس لئے نگاہوں سے وہ قصہ اوجھل ہے ___ اس طرح سے اس عابد نے پانچ سو برس گذارے ہیں۔

حدیث میں آپؐ فرماتے ہیں کہ مرنے کی بعد اس کی پیشی ہوئی حق تعالیٰ کے سامنے' حق تعالیٰ نے فرمایا' اے بندے! میں نے تجھے اپنی فضل وکرم سے بخشا' اور ملائکہ سے فرمایا کہ جنت کے اعلیٰ مقامات میں اس کا نام لکھ دو' اور اس کا داخلہ جنت میں منظور ہے اور جہنم سے اس کو بچادیا گیا۔

اس عابد کے دل میں خطرہ یہ پیدا ہوا کہ پانچ سو برس تو میں نے محنت کی' بیوی' بچوں کو چھوڑا' شہر کو چھوڑا' اور اب بھی انہوں نے اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا۔ کم سے کم میری تسلی کے لئے ہی کہہ دیتے کہ تیری نمازوں کی وجہ سے تجھے نجات دی۔ اب بھی اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا۔ گویا میں نے ان کے سامنے کچھ کیا ہی نہیں' یہ ایک وسوسہ پیدا ہوا' عقیدہ تو کفر کا تھا' لیکن وہ عقیدے سے بری تھا مگر دل میں ایک خطرہ گذرا' اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ وہ تو دلوں کی کھٹک سے واقف ہے۔ وہ تو دلوں کے خطروں کو جانتے ہیں۔ جوں ہی یہ وسوسہ پیدا ہوا' حق تعالیٰ نے ملائکہ علیہم السلام سے فرمایا۔ بجائے جنت میں لے جانے کے اس عابد کو جہنم کی طرف لے جاؤ' جہنم میں داخل نہیں کرنا مگر اتنی دور کھڑا کردو کہ وہاں سے جہنم پانچ سو برس کے راستہ پر ہو' وہاں لے جایا گیا۔ ایک دم جو جہنم کی طرف سے گرم ہوا اور لپٹ آئی ہے' اور اس کے بدن کو لگی' تو تمام بدن میں کانٹے پڑگئے۔ پیاس پیاس چلانا شروع کیا' جیسے معلوم ہو کہ اس کا اندر بالکل خشک ہوگیا' تری باقی نہیں رہی' جہنم میں جل کر تو کیا کیفیت ہوتی' اتنی دوری پر ہے' جہنم کی لو اور اک لپٹ لگی۔ سارا بدن لکڑی کی طرح خشک ہوگیا۔

حدیث میں ہے ایک ہاتھ نمایاں ہوا' جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑا کہ اے خدا کے بندے! یہ پانی مجھے دینا' وہ ہاتھ پیچھے ہٹ گیا' آواز یہ آئی' کہنے والا تو کوئی نظر نہیں آرہا تھا' پانی تو ملے گا' مگر اس کی قیمت ہے۔ مفت نہیں دیا جاسکتا۔ اس نے کہا کیا قیمت ہے؟ آواز یہ آئی' جس نے پانچ سو برس خالص عبادت کی ہو۔ وہ عبادت اگر کوئی دے تو اس کے بدلے میں ایک کٹورا مل سکتا ہے' ورنہ مفت نہیں دیا جاسکتا'

____ اس نے کہا میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے' اور بڑی خالص عبادت ہے۔ اس میں کوئی نفاق شامل نہیں۔ اس نے وہ پانچ سو برس کی عبادت پیش کی' بدلے میں کٹورا لیا گیا' پی کر ذرا اس کے دم میں دم آیا۔

حق تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا' اس کو واپس لاؤ' واپس لایا گیا' اس کی پھر پیشی ہوئی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا' اے بندے! تیرے پانچ سو برس کی عبادت کی قیمت تو ادا ہو گئی' اور وہ قیمت تُو نے از خود تجویز کی کہ پانچ سو برس عبادت کی قیمت ایک کٹورا پانی ہے۔ وہ تو ہم دے چکے' معاملہ برابر ہو گیا' تو نے پانچ سو برس کی عبادت دی۔ ہم نے ایک کٹورا پلایا' اور وہ تُو نے خود تجویز کی کہ یہ قیمت ہے ہم نے نہیں کہا تھا۔ لہٰذا اس سے تو ہم ادا ہو گئے۔ اب حساب دے' وہ جو دُنیا میں تو نے لاکھوں کٹورے پانچ سو برس میں پیئے' ان کے بدلے میں کیا عبادت لے آیا ہے اور وہ جو انار کے لاکھوں دانے تو نے کھائے ہیں۔ تو انار کے ایک ایک دانے کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ یہ تو دانہ اور پانی تھا۔ وہ جو تو نے ہماری ہوا کے ذریعے سانس لئے ہیں' جس سے تیری زندگی قائم تھی۔ اب ایک ایک سانس کا حساب دے کہ اس کے بدلے میں کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے' اور وہ جو تیری آنکھوں میں ہم نے نور پیدا کیا تھا' جس سے تو اچھے اور بُرے کو دیکھتا تھا۔ ایک ایک تارِ نگاہ کے بدلے میں کتنے سجدے لے کر آیا ہے؟ کتنی عبادتیں لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو تیرے بدن میں ہم نے طاقت دی تھی' اس کا حساب دے' اس طاقت کے بدلے میں کتنی عبادتیں کیں اور وہ جو تیرے دل میں توفیق و ارادہ پیدا کیا تھا اس کا بدلہ کیا لے کر آیا ہے؟ ____ تو طاقت ہم نے دی۔ ارادہ تیرے قلب میں ہم نے پیدا کیا۔ توفیق ہم نے دی' دانہ پانی ہم نے پیدا کیا' تیرے بدن میں جان اور ہمت ہم نے پیدا کی' اور پھر بھی تجھے دعویٰ ہے کہ میں نے کچھ کیا' اور میرے کئے کے بدلے میں کچھ ملے۔ ارے یہ تو ہمارا کیا کرایا ہے' تو نے کیا کیا جس کے بدلے میں تو چاہتا ہے تجھے صلہ ملے ____ لیکن اگر کیا تو اب حساب دے' یہ عابد تھرا گیا' اور کہا :

> "یا اللہ! بے شک نجات آپ کے فضل سے ہوتی ہے' کسی کے عمل سے نہیں ہوتی۔ عمل کی یہ قدر و قیمت ہے کہ پانچ سو برس کی عبادت کرے' تو وہ ایک کٹورا پانی کے برابر بھی نہیں"۔

اور وہ بھی اللہ کا فضل ہے' اگر وہ توفیق نہ دے' آدمی عبادت نہیں کر سکتا۔ بدن میں جان بھی ہو' سب کچھ ہو' مگر دل میں ارادہ ہی پیدا نہ ہو۔ ارادہ بھی ہو۔ مگر ہمت نہ ہو' کسل اور سُستی بڑھ جائے۔ وہی توفیق دیتے ہیں' وہی ہمت دیتے ہیں' تب تو آپ سجدے کرتے ہیں۔ وہ نہ ہمت دیں تو سجدہ کیسے کریں؟ تو غرہ اور اِترانے کے کیا معنیٰ ____؟ ادھر کی ہی ساری چیزیں ہیں۔

ہر عمل توفیقِ خُداوندی سے ہی وجود میں آتا ہے

وہ ایک شخص کا قصہ مشہور ہے کہ ایک لکھ پتی آدمی تھا' اس کے ہاں ایک ملازم تھا' تو وہ تو لکھ پتی تھے۔ ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ انہیں پتہ بھی نہیں تھا کہ نماز کہتے کسے ہیں ____ اور یہ جو بوڑھا ملازم تھا' وہ بڑا پکا نمازی' فرض ہی نہیں سنّتیں بھی' اور پچاسوں نفل پڑھ کے بھی دَم نہ لے۔ یہ رات دن کرتے کہ اسے جب دیکھو نماز' جب دیکھو نماز' جب دیکھو بوڑھے کو تو نماز۔ یہ نماز ہی نماز کا رہ گیا۔ ایک دن اس کے آقا بازار میں کچھ سامان لینے گئے اور ملازم سے کہا کہ ہمارے ساتھ چل۔ بوڑھا ساتھ ہو گیا۔ راستے میں مغرب کی اذان ہوئی۔ بوڑھے نے کہا صاحب! میں تو جاتا ہوں مسجد میں نماز پڑھنے' آقا نے چلا کے کہا کہ کمبخت! جب دیکھو نماز' جب دیکھو نماز' ارے تجھے اور بھی کوئی کام نماز کے سوا رہ گیا ____ خیر کہا ____ کہ جا اچھا' جلدی سے

پڑھ کے آ۔ اب وہ آقا صاحب مسجد کی سیڑھیوں پہ کھڑے ہو گئے۔ وہ مسجد میں داخل ہوا، جماعت کے ساتھ نیت باندھ لی، جب فرض پڑھ لئے، تو اس کے بعد سنتیں پڑھیں۔ اب یہ آقا کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا جی گھبرایا، کہ جلدی سے آئے، بازار کا وقت نکلا جا رہا ہے، سنتیں پڑھ کے اس نے اوابین کی نیت باندھ لی۔ اب ان کے دل میں غصہ اور گھٹن، کہ اس کمبخت کو اس کی بھی خبر نہیں۔ اب خدا جانے کب تک نفلیں پڑھے گا، جب اس نے دو نفلوں سے سلام پھیرا، اس نے دوسری نفلوں کی نیت باندھنے کا ارادہ کیا، تو انہوں نے چلا کر کہا ارے کمبخت! آتا کیوں نہیں ___؟ تو جواب میں بوڑھے نے کہا کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کے بوڑھے نے پھر نیت باندھ لی۔ یہ گھُٹ کے کھڑے ہو گئے۔ اب بڑے خشوع و خضوع سے دو رکعتیں پڑھیں۔ پانچ دس منٹ میں سلام پھیرا، اور بوڑھا پھر نیت باندھنے کے لئے کھڑا ہونے لگا، تو انہوں نے چلا کے کہا کہ او منحوس! آتا کیوں نہیں ___؟ کہ جی آنے نہیں دیتے، اور یہ کہہ کے پھر نیت باندھ لی۔ اب یہ اور غم وغصہ میں۔ جب چھ پوری ہو گئیں اور وہ پھر لگا کھڑا ہونے۔ تو انہوں نے کہا کہ آتا کیوں نہیں؟ کہ جی آنے نہیں دیتے، کہ بھئی کون نہیں آنے دیتا؟ کہ جو آپ کو اندر نہیں آنے دیتے، وہ مجھے باہر نہیں آنے دیتے۔ تمہیں وہاں روک رکھا، مجھے یہاں روک رکھا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا، اسے پڑھنے نہیں دیتے۔ اس کو دُھتکار دی ہے۔ بندہ کی کیا مجال تھی وہ اللہ سے گریز کرے اور بھاگے۔ جب وہی قبول نہ کریں تو یہ مجبور ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ عبادت نہ کرنے والا دُھتکارا ہوا ہوتا ہے۔ پسند نہیں کرتے، اور جب توفیق دیتے ہیں، تو آپ کا نہ بھی جی چاہے، تب بھی آپ نماز پڑھیں گے، تب بھی آپ روزہ رکھیں گے۔ وہ دل میں اترائے نہیں کہ میں نے کچھ کیا ہے۔ شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی۔ ہزاروں بندے ہیں جنہیں توفیق نہیں ہوتی۔ توفیق ملنا یہ خود مستقل نعمت ہے۔ اللہ نے توفیق دے دی۔

تو اصل یہی ہے کہ نجات ہمارے عمل سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوگی، مگر بھئی اس کا یہ مطلب مت سمجھ جائیو کہ آج نماز صفر ہو جائے کہ نجات اللہ کے فضل سے ہوگی، ہمارے عمل سے تو ہونی نہیں، پھر محنت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جائیں مسجد میں، اور نمازیں پڑھیں، بس جس پر فضل ہونا ہوگا، ہو جائے گا۔ نجات بھی ہو جائے گی، عمل کی کیا ضرورت ہے۔ یہ مت سمجھنا، بلا شبہ نجات اللہ کے فضل سے ہوگی۔ مگر فضل کی علامت یہ ہے کہ آپ عمل کر رہے ہیں۔ تو یہ عمل کرنا علامت ہے کہ فضل آپ کی طرف متوجہ ہے، اگر عمل نہ کرتے، تو یہ اس کی علامت تھی کہ فضل خداوندی آپ کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ تو عمل ضروری ہے۔ کیونکہ وہ فضلِ خدا کی علامت ہے۔ نجات بیشک اللہ کے فضل سے ہوگی۔

جو عبادت ہی صُورۃً ہو تو اس پر اِترانا کیا؟

غرض تعلیم یہ دی گئی کہ کتنا بھی عمل کرے، مگر غرّہ نہ کرے، ناز نہ کرے کہ میں نے کیا ہے۔ شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھے توفیق دے دی۔ میرے اندر کچھ کرنے کی قوت نہیں تھی۔

ملائکہ علیہم السلام قیامت کے دن یوں کہتے ہوئے ہوں گے :

ما عبدنٰک حق عبادتک وما عرفنٰک حقّ معرفتک۔

”اے اللہ! ہم نے کوئی حق تیری عبادت کا ادا نہیں کیا۔ ہم تجھے پہچان بھی نہیں سکے جیسے پہچاننے کا حق ہے“۔

ہم اب تک جاہل اور لا علم ہیں۔ تیرے کمالات کا اب تک بھی ہم اندازہ نہیں کرپائے۔ تیری ذات بہت بڑی ہے۔ تو فرشتے جو لاکھوں برس سے عبادت کررہے ہیں' وہ بھی یہ کہیں گے کہ ہم کچھ بھی نہیں کرسکے۔ ہم ایک پچاس' ساٹھ برس کی عمر لے کر آئے اور اس میں بھی چودہ برس لڑکپن کے نکال دو' اس میں عبادت فرض نہیں ہوتی' اور آخیر کے دس پندرہ برس بڑھاپے کے نکال دو' جس میں آدمی معطل ہو جاتا ہے۔ مشکل سے تیس پینتیس برس رہ جاتے ہیں' اور اس میں بھی سارے اوقات نماز کے نہیں ہیں' چوبیس گھنٹے میں سے بھی ہم بیس گھنٹے سونے اور اپنا مال و دولت کمانے میں لگاتے ہیں۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے میں لگاتے ہیں۔ اس پر بھی لگے غرّہ کرنے کہ ہم نے بھی کچھ کیا ہے۔ یہ بڑی نادانی کی بات ہوگی' ہم تو کچھ بھی نہ کرسکے' جب لاکھوں برس عبادت کرنے والے ملائکہ جو نہ کھاتے ہیں' نہ پیتے ہیں' نہ سوتے ہیں' نہ غفلت میں ہیں' وہ کہیں کہ ہم کچھ نہیں کرسکے' اور ہماری یہ چند منٹ کی عبادت' اور عبادت بھی حقیقی نہیں' عبادت کی صورت بنا رکھی ہے۔ کھڑے ہوئے اللہ کے سامنے ہیں' دل میں وسوسے بھرے ہوئے ہیں۔ دل میں کہیں یہ ہے کہ جلدی سے دو رکعت پوری ہوں' تو دُکان پہ جاؤں' سودا بیچنے کا حرج ہو رہا ہے۔ تاکہ جلدی پہنچ جاتا' آج شنبہ کا دن ہے' گاہک زیادہ آئیں گے۔ یہ نماز جلدی سے جلدی ختم ہو' تاکہ پیسے کماؤں' یہ صورت اور تصویر عبادت کی ہم نے بنائی۔ عبادت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ کا فضل اور انعام ہے کہ وہ اسے عبادت مان لیں' ورنہ یہ عبادت اس قابل نہیں کہ اسے قبولیت نصیب ہو۔ یہ محض ان کا فضل ہے' اور ان کا مفتی فتویٰ دے دے کہ ہاں ہوگئی نماز' تو اِترانے کا' اور غرّہ و غرور کا کوئی موقع نہیں ہے۔ بلکہ جتنا بھی ہو' آدمی شکر ادا کرے کہ میرے پروردگار نے مجھے توفیق دے دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

لن ینجی احد کم عملہ۔

"تم میں سے کسی کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔ ___ اللہ کا فضل نجات دلائے گا"۔

صدّیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا :

ولا انت یارسول اللّٰہ۔

"یارسول اللہ! کیا آپ کا عمل بھی آپ کو نجات نہیں دلائے گا؟

فرمایا :

لا۔ الّا ان یتغمّدنی اللّٰہ برحمتہٖ

"مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا' جب تک اللہ ہی کا فضل دستگیری نہ کرے"۔

اور مجھے اپنی رحمت میں نہ ڈھانپ لے۔ میرا عمل بھی نجات دلانے والا نہیں ہے۔ فضلِ خداوندی ہی نجات دلانے والا ہے۔

حق تعالیٰ کے سامنے اعترافِ قصور ہی شکر ہے

جب انبیاء علیہم السلام بلکہ سردارِ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام جن سے بڑھ کر مخلوقات میں کوئی نہیں ہے' فرمائیں کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلا سکتا۔ اللہ ہی کا فضل نجات دلائے گا' تو میری اور آپ کی کیا حقیقت ہے کہ ہم اپنے کسی عمل پر ناز کرنے لگیں' ہم کسی عمل پر اِترائیں کہ ہم نے بڑا کام کیا۔ بندہ کا کام

یہی ہے کہ سب کچھ کر کے کہے کہ میں کچھ نہیں کر سکا' خدا کی ثناء خوانی یہی ہے کہ ہم سے کچھ ثناء خوانی ممکن نہیں ہے' نہ ہم اللہ کی پوری تعریف کر سکتے ہیں' نہ پوری پوری عبادت کر سکتے ہیں' نہ ہم شکر ہی ادا کر سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ عاجزی اور قصور کا اعتراف کریں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے حکم دیا :

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا۔

''اے داؤد ہمارا شکر ادا کرو''۔

واقعی انبیاء علیہم السلام ہی اللہ کے کلام کو سمجھتے ہیں' جیسے سمجھنے کا حق ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا' اے اللہ! شکر میں ضرور ادا کروں گا' جب آپ ارشاد فرمارہے ہیں' میرا فرض ہے کہ میں تعمیل کروں' اور میں ضرور ادا کروں گا مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ شکر کس طرح سے ادا کروں؟ ___ اس واسطے کہ جب شکر ادا کرنے بیٹھوں گا' تو اس کے ادا کرنے کی توفیق آپ ہی دیں گے' تو توفیق ایک نعمت بن گئی' اس نعمت پر پھر شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور جب اس کا شکر ادا کروں گا تو پھر ایک نعمت بن گئی تو پھر اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ ہر نعمت سے پہلے تو نعمت نکلتی ہے' شکر ادا کروں تو کس طرح' میں تو شکر کی ابتدا بھی نہیں کر سکتا' آپ کے شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں۔

جواب آیا حق تعالیٰ کی طرف سے کہ اے داؤدؑ! اگر تم نے یہ سمجھ لیا کہ تو ہمارا شکر ادا کرنے سے عاجز ہے' تو یہی شکر کی ادائیگی ہے' اسی کے معنٰی شکر ادا کرنے کے ہیں۔ اس لئے کہ حقیقی معنٰی میں کوئی ہمارا شکر ادا نہیں کر سکتا۔ شکر' نعمت کے مقابلے میں ہے' اور نعمتیں غیر محدود ہیں' ان کی کوئی انتہا نہیں ہے ___ اور ہمارا دماغ بھی محدود' ہماری قوتیں بھی محدود' الفاظ و آواز بھی محدود' تو ہم شکر ادا کریں گے' تو اس میں حد لگی ہوئی ہوگی' اور نعمتوں کی کوئی حد نہیں۔ تو لامحدود کا شکر محدود ادا کیسے کر سکتا ہے؟ سوائے اس کے کہ اپنی ہاری مان لے' قصور کا اعتراف کرے' اپنے عجز کا اقرار کرے۔ یہی ہے فی الحقیقت شکر کی ادائیگی کہ آدمی اپنی عاجزی مان لے' کہ میں بالکل عاجز ہوں' اللہ کے ہاں تو سب سے بڑی عبادت یہی ہے کہ اپنے نفس کا قصور مان لے۔ وہ کون ہے جو اس عبادت کا حق ادا کرے' لاکھوں برس عبادت کر کے جب ملائکہ کہیں گے کہ ہم کچھ نہیں کر سکے' ہم کیا چیز ہیں جو ہم کہیں کہ ہم نے عبادت کرلی' ہماری عبادت یہی ہے کہ جو حکم ہے اس کی پوری طرح تعمیل کر کے یوں کہیں' کہ یا اللہ! قصور ہوا ہے' ہم پوری طرح کچھ نہیں کر سکے' آپ معاف کر دیں' بس یہی ہماری عبادت ہے۔ یہ جبھی ہوگا' جب آخرت کا فکر چڑھا ہوا ہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

النلس کلھم ھالکون سب انسان تباہ و برباد ہیں۔ بچیں گے خُلوص والے' علم والے تباہ و برباد ہیں' بچیں گے عمل والے' عمل والے تباہ و برباد ہیں' بچیں گے خُلوص والے' اور خُلوص والے خطرے میں ہیں جب تک خُلوص کے اوپر موت نہ ہو جائے' خاتمہ جب ایمان پر ہو جائے' جب مطمئن ہو کہ ہوگئی نجات۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے مرتے دَم تک خدانخواستہ کوئی بات پیش آجائے' دل میں ایمان نہ رہے۔ دل ہی ایمان سے ہٹ جائے' عمل کی توفیق چھن جائے۔ بہت سے لوگ دیکھے گئے ہیں کہ پوری زندگی نیکیوں میں گذاری' مرنے کا وقت آیا تو لہو ولعب اور بُری باتوں میں مبتلا ہوگئے' بہت سے دیکھنے میں آئے ہیں کہ پوری زندگی تو بُری باتوں میں گذاری' خاتمہ کے وقت ایسی اچھی زندگی ہوئی کہ رات دن طاعت اور عبادت' اور بہترین خاتمہ ہوا' تو آدمی غرہ نہ کرے معلوم نہیں' خاتمہ کیسے ہونے والا ہے' تو فرمایا گیا :

والمخلصون علی خطر عظیم۔

"**مخلصین** خطرہ میں ہیں"۔

خطرہ جب نکلے گا' جب موت آجائے گی' اب اطمینان کا وقت آیا' کہ اس چیز سے نجات پاگئے۔

روحانی زندگی کے عناصرِ اربعہ

نجات کے گویا چار اُصول فرمائے گئے' ایک علم' ایک عمل' ایک اخلاص' اور ایک اپنی آخرت کا فکر۔ یہ چار بنیادیں ہیں' جس سے آدمیت بنتی ہے' انسان کی انسانیت ترقی کرتی ہے اگر انسان میں علم نہ ہو' جہالت ہو' تو یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے' جہالت سے نجات نہیں مل سکتی۔ اگر علم آگیا' روشنی آگئی' مگر عمل نہیں ہے' تو گویا علم کسی کو نجات نہیں دلائے گا' بلکہ وبال بن جائے گا' اگر علم کے ساتھ عمل بھی ہو' مگر عمل کے ساتھ نفاق ہے' اخلاص نہیں ہے' وہ عمل بھی بے کار ہے' نجات نہیں دلائے گا' اگر علم بھی ہے' عمل بھی ہے' اور اخلاص بھی ہے' مگر انسان میں ناز اور شیخی ہے' کہ میں سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہوں' آخرت کا خطرہ نہ ہو' وہ اخلاص بے کار ہے وہ ختم ہو گیا۔ چار چیزیں جمع ہوں گی' تب انسان کی انسانیت بنے گی۔ علم' عمل' خُلوص' اور فکر ___ تین چیزیں اس میں قلب کی ہیں اور ایک چیز ہاتھ پیر کی ہے' علم بھی قلب میں ہوتا ہے ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا' اخلاص اور لِلّٰہیت کا جذبہ بھی قلب میں ہوتا ہے' ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا' آخرت کا خوف اور خطرہ یہ بھی قلب میں ہوتا ہے' ہاتھ پیر میں نہیں ہوتا۔ ہاتھ پیر صرف عمل کرتے ہیں۔ دل کا عمل فی الحقیقت علم' خُلوص' اور تفکّر ہے' یہ تین چیزیں قلب میں ہوں' اور ایک باہر ہو' تب آدمی آدمی بنے گا' اس کی نجات کا سامان ہو گا۔

یہ گویا ایسا ہے جیسے آپ کا بدن چار چیزوں سے بنا ہے' آگ' پانی' مٹی' ہوا۔ تو آپ کی روح چار چیزوں سے بنی ہے' علم' عمل' اخلاص' اور فکر ___ اگر یہ آگ' پانی' مٹی اور ہوا نہ ہو تو بدن ختم ہو جائے گا۔ اور اگر یہ چار چیزیں نہ ہوں' تو روح ختم ہو جائے گی۔

اصل بنیادی چیز صُحبت ومعیّت ہے

انسان کی حقیقی زندگی ان چار چیزوں سے ہے ___ علم درسگاہوں میں مکاتیب میں اور علماء کے پاس ملے گا' عمل' عمل کرنے والوں کی ہیئت دیکھ کر ملے گا۔ خُلوص ملے گا' مخلصوں کی جماعت میں بیٹھ کر' فکر پیدا ہو گا متفکّروں کی جماعت میں بیٹھ کر' غافل لوگوں میں رہ کر فکر نہیں پیدا ہوتا' وہ تو اور غفلت میں مبتلا کر دیں گے' بد عمل لوگوں کی صحبت ہو گی' وہ تو بد عملی پیدا کریں گے' عمل کہاں سے آئے گا؟ جاہلوں کی صحبت رہے گی' جہالت ملے گی' علم کہاں سے آجائے گا؟

تو سب سے بڑی صحبت ومعیّت ہے۔ جس سے علم' عمل' اخلاص اور تفکّر پیدا ہوتا ہے ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کُند
صحبتِ طالح ترا طالح کُند

نیکوں اور سچّوں کی صحبت اختیار کریں گے' تو سچائی آئے گی' بروں کی صحبت اختیار کریں گے' لہو ولعب اور کھیل کود کے جذبات پیدا ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' نیک صحبت کی مثال ایسی ہے' جیسے عطّار کی دکان' جو عطر

پہنچتا ہو کہ اس کی دکان پر جاکے آپ عطر نہیں خریدیں گے تو کم از کم خوشبو تو آ ہی جائے گی۔ دماغ تو معطّر ہو ہی جائے گا' فرحت تو پیدا ہو ہی جائے گی۔ اور بُری صحبت کی مثال ایسی ہے' جیسے لوہار کی دکان' کہ کچھ بھی نہیں ہو گا' آگ کا کوئی پتنگا ہی لگ جائے گا' کچھ دھواں ہی چڑھ جائے گا' بدبو پیدا ہو جائے گی' تو کچھ تکدّر' کدورت اور انقباض ہی لے کر آئیں گے' نیک لوگوں کے پاس جب جائیں گے' کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا' تو ان کے ایمان کی گرمی قلب میں کچھ نہ کچھ گرمی پیدا کردے گی' اللہ کی طرف توجہ بڑھ جائے گی' کچھ آخرت کی طرف توجہ بڑھ جائے گی' کوئی کلمہ ان کی زبان سے نکلے گا' دل کی گرہیں ہی کھلتی چلی جائیں گی' عمل کا راستہ ہی صاف ہو جائے گا' نیک کی صحبت میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچے گا' اور برے کی صحبت میں بیٹھ کر بُرائی کی طرف طبیعت چلے گی۔

اور اس دنیا میں بُری صحبت جلدی اَثر کرتی ہے' نیک صحبت دیر میں اَثر کرتی ہے۔ بروں کے پاس بیٹھ کر تو اگلے ہی دن بُرا بن جاتا ہے' اور نیکوں کے پاس بیٹھ کے کہیں مہینے بھر میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے' تو دنیا میں بدی جلدی اَثر کرتی ہے' نیکی دیر میں اثر پیدا کرتی ہے' اس واسطے نیک صحبت آدمی کی زیادہ چاہئے' بُری صحبت سے زیادہ سے زیادہ بچنے کی ضرورت ہے' اصل بنیادی چیز صحبت و معیّت ہے' کہ آدمی اچھا ماحول تلاش کرے' اچھے نیک لوگوں میں رہنے کا جذبہ پیدا کرے۔

اب یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ نیک لوگ علماء ہی ہوں' نیک وہ ہے' جو اللہ کے راستے پر پڑا ہو' چاہے وہ بڑا عالم نہ ہو' معمولی مسئلے جانتا ہو' مگر مخلص ہو' للّٰہیت ہو' بہت سے لوگ ایسے دیکھے گئے کہ علم کا تو نشان نہیں' لیکن نیکی اور تقویٰ اس درجہ میں بڑھا ہوا کہ بڑے بڑے علماء کو نصیب نہیں۔ تو بعض مرتبہ عمل کی دولت صحبت سے نصیب ہوتی ہے' صحبت یافتہ لوگ بڑے پکے دیندار ہوتے ہیں۔ بعضے علماء میں بھی وہ دین نہیں ہوتا جو بزرگوں کے صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتا ہے' ان کا دین مضبوط ہوتا ہے' ایسے لوگوں کی صحبت میسّر ہو تو وہ کیمیا ہے' انسان کے دل میں پھر دین گھر کرلیتا ہے' اور آدمی دیندار بن جاتا ہے۔ تو تاکید کی گئی ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

صحبت و معیّت کے ثمرات

حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

سبعة يظلّهم الله في ظلّه يوم لاظلّ الاظلّه۔

"سات قسم کے لوگ ہوں گے کہ قیامت کے دن اُنکو عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی' جب کہ کوئی سایہ بجز اللہ کے سائے کے نہ ہو گا"۔

ان میں سے ایک کے بارے میں فرمایا گیا' کہ وہ کون ہوں گے :

رجلان تحابّا في الله۔

"وہ دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی اور دوستی اختیار کی"۔

اور یہ معاہدہ کیا کہ بھائی ہم اس لئے دوستی کرتے ہیں' تاکہ ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کریں گے' اگر نماز میں سستی کروں' تو تم مجھے کھینچ کے لے جانا' اور سزا دینا کہ خبردار جو تو نے نماز چھوڑی۔ اگر تم سستی اختیار کرو گے' تو میں تمہیں لے جاؤں گا' اگر تم نے تلاوت قضا کی تو میں تمہارے سر پر مسلّط ہوں گا۔ کہ

تلاوت کرو قرآن کریم کی اور میں سستی کروں تو تم۔ تو ہم ایک دوسرے کے دین کی حفاظت کے لئے دوستی کرتے ہیں ___ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ان میں سے جب ایک انتقال کرے گا' اور وہ اللہ کی رضا میں اور مقامِ کریم میں داخل ہو گا' بہشت بریں میں جائے گا' تو دعا کرے گا کہ اے اللہ! میں فلاں دوست کی دوستی کی وجہ سے اس اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوں' میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر پہنچا' اس کا خاتمہ بھی ایمان پر فرما۔ اس کی دعا قبول ہو گی۔ تو دونوں جنتی بنیں گے' صحبت و معیّت ہی سے تو یہ بات ملی' نیک صحبت اختیار کی' دونوں کے لئے نجات کا ذریعہ ہو گئی۔

اور یہی صورت اس کے برعکس سمجھ لیجئے' اگر دو آدمی اس لئے دوستی کریں کہ بھئی! سینما میں ایک ساتھ جایا کریں گے' تھیٹر میں ساتھ جایا کریں گے' فلاں برائی میں ساتھ جایا کریں گے' چار آدمیوں نے مل کے دوستی کرلی کہ چوری کیا کریں گے' لوگوں کی جیبیں کترا کریں گے' یہ بھی آپس میں دوستی ہو گئی' یہ بھی صحبت ہے' مگر یہ صحبت و معیّت بد عملی کے لئے ہے۔ اس لئے اگر ایک جہنم میں جائے گا' تو وہ کہے گا خدا کرے وہ پہلا دوست بھی جہنم میں آئے' اسی کی وجہ سے میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں' یہ دونوں چیزیں اپنا اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہتیں۔ تو علم اتنا اثر نہیں پیدا کرتا' جتنی صحبت اثر پیدا کرتی ہے' تو بڑی چیز یہ ہے کہ آدمی سچا ماحول تلاش کرے' نیک لوگوں کے پاس اُٹھنا بیٹھنا ہو' کبھی نہ کبھی یہ چیز کار آمد ثابت ہوتی ہے' کبھی نہ کبھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ بہر حال اس حدیث میں چار باتیں بتلائی گئیں۔ علم' عمل' اخلاص' اور فکر۔ اس کے بغیر آدمی آدمی نہیں بنتا' اس میں جوہر نہیں پیدا ہوتا' وہ کھاتا پیتا ایک حیوان ہو گا' خوبصورت سہی کہ اور کوئی جانور اتنا خوبصورت نہیں' جتنا انسان ہے' مگر ہے جانور' جب علم اور عمل آئے گا۔ تو کہیں گے اب یہ جانور نہیں۔ اب اس میں انسانیت آگئی' یہی انسان اور حیوان میں فرق کی چیز ہے۔ اس واسطے سب سے بڑی توجہ مسلم قوم کو بالخصوص تعلیم کی طرف کرنے کی ضرورت ہے' تاکہ علم کا جوہر پیدا ہو۔ جہالت سے کوئی قوم دنیا میں آج تک نہیں پنپی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ پوری قوم مولوی بنے' سب کے سب عالم بنیں۔ یہ نہ فرض ہے' نہ واجب' نہ لازم' لیکن یہ ہر ایک پر فرض ہے کہ اتنا علم سیکھ لے کہ اپنے دین پر چل سکے' یہ معلوم ہو جائے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور مسلمان ہونے کے معنیٰ کیا ہیں؟ اور اسلام کے کیا ارکان ہیں' جن کے کرنے سے آدمی مسلمان رہتا ہے' یہ بے شک لازم اور واجب ہے' اس کے بغیر نجات کی صورت نہیں ہے' تو سب سے بڑی چیز ادھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ تعلیم عام ہو' دین کا ایک چرچا ہو' اور چرچا اس کی بغیر نہیں ہوا کرتا کہ تعلیم عام ہو۔

ہمارے ہاں مدارس میں' جیسے ابھی مولانا.... صاحب نے دار العلوم دیوبند پر یہ تبصرہ کیا۔ اور یہ کہ وہاں کے فضلاء نے جگہ جگہ مدارس قائم کئے' تو ہزاروں کی تعداد میں مدارس ہیں' کوئی قصبہ خالی نہیں' اور اس تقسیم ملک کے بعد سے تو تقریباً یو۔پی میں کوئی بڑا گاؤں بھی خالی نہیں رہا۔ جس میں لوگوں نے مدارس قائم نہیں کر دیئے' ہزاروں کی تعداد میں دیہات اور گاؤں میں مدارس ہیں۔ تو علم کا اور مسئلے مسائل کا ایک چرچا ہے' اور دیہات کے لوگ چونکہ بے چارے سادہ ہوتے ہیں' کوئی چالاکی' عیاری ان میں ہوا نہیں کرتی۔ ان میں جب علم آتا ہے تو سیدھا سیدھا اپنا عمل کرتے ہیں۔ کوئی فریب اور نفاق ان میں نہیں ہوتا' علم وہاں زیادہ اچھا اثر کرتا ہے' جہاں دلوں کی صفائی اور سادگی ہوتی ہے ___ تو دیہاتی اتنے مسائل جانتے ہیں کہ چھوٹا موٹا مولوی ان کے سامنے چل نہیں سکتا۔ اگر ذرا مسئلہ کی غلطی کر جائے تو کہیں گے مولانا صاحب! تمہاری بات تو سر آنکھوں پر' مگر کہی بات غلط۔ مسئلہ تو یہ ہے' ہم نے فلاں بڑے مولوی صاحب سے سنا تھا۔ فوراً دیہاتی غلطی بتلائے گا' اور مولوی کو ماننا پڑے گا' تو وہ صحبت یافتہ ہونے کی وجہ سے اور دل کی سچائی کی وجہ سے

بہت سے مسائل جانتے ہیں' یہ جب ہوا' جب تعلیم کا چرچا ہے۔ قصبوں میں' شہروں میں' دیہات میں دین پھیلا ہوا ہے۔

گناہ کا جمع ہونا بُرا ہے

عمل کی کوتاہی ہر ایک میں کچھ نہ کچھ ہوتی ہے' کچھ مجھ میں کوتاہیاں ہیں۔ کچھ آپ میں غلطیاں ہیں' ہر ایک کچھ نہ کچھ مبتلا ہے' مگر علم اور فکر تو صحیح رہنا چاہئے۔ تاکہ جب عمل کی توفیق ہو' تو ہم عمل کر گذریں' اور اگر علم ہی صحیح نہیں' تو جی بھی چاہے گا عمل کو' تو راستہ صحیح نہیں ملے گا۔ اس لئے قلب کے اندر علم رہنا چاہئے۔ کوتاہی اللہ معاف کرنے والا ہے' بہرحال انسان بشر ہے' اور بشر بھی ایسا جو بھول چوک سے مرکب ہے۔ بھول بھی ہوتی ہے۔ نفسانیت کا مادہ اس میں ہے' غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں' گناہ بھی ہو جاتا ہے' گناہ کا علاج اللہ نے تو یہ بتلایا' جب تم گناہ کرو' ہاتھ کے ہاتھ توبہ کرلو' فرمایا گیا : **التائب من الذنب كمن لاذنب لہ** ___ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ تو گناہ ہو جانا کوئی جرم نہیں' یہ تو انسان میں مادہ ہے۔ گناہ کا جمع رہنا بُرا ہے' کہ آدمی توبہ نہ کرے۔ توبہ کی' تو روز کا روز کھاتہ صاف ہوتا رہے گا' تو آدمی اپنا کچا چٹھہ روزانہ درست کرتا رہے' جب ادھر سے کوئی اکاؤنٹنٹ حساب لینے والا آئے گا' تو کھاتے آپ کے درست ہوں گے' آپ کہیں گے' دیکھ لیجئے' اور اگر کوئی کلرک ایسا غافل ہے' کہ اس کے حساب میں غلطیاں ہیں' اور وہ سُست پڑا ہوا ہے کہ جب مہینہ بھر میں اکاؤنٹنٹ نے بجائے ایک مہینہ کے بیسویں دن آ کے کہا' لاؤ حساب' وہ سارا غلط پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسی وقت حکم دیا' معطّل یا برخواست۔ اس کی تنخواہ ضبط۔ اب حیران بیٹھے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

موت کا کوئی وقت معیّن نہیں

انسان کے عمل کا کھاتہ کُھلا ہوا ہے' جب موت کا وقت آئے گا' اس وقت کچا چٹھہ درست کرلیں گے' یہ شیطانی وسوسہ ہے ___ موت کے لئے نہ بڑھاپا شرط ہے' نہ بیمار ہونا شرط ہے' ہزاروں انسان عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر مرجاتے ہیں' نہ بیمار ہوئے نہ کچھ۔ رات دن ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں' کہ ایک آدمی آج ہمارے سے مل رہا ہے' کل ہم سن رہے ہیں کہ اس کا انتقال ہو گیا' تو موت کے لئے بڑھاپا آنا ضروری نہیں ہے' کمزور ہونا ضروری نہیں' بڑے بڑے قوی بھی مرجاتے ہیں' جوان ہونا ضروری نہیں' بچے بھی مرجاتے ہیں۔ تو موت بچپن میں بھی آتی ہے' جوانی میں بھی آتی ہے' بڑھاپے میں بھی آتی ہے' بیماری میں بھی آتی ہے بلا بیماری سے بھی آتی ہے۔ یہ خیال کرنا کہ مرنے کے قریب توبہ کراوں گا۔ یہ شیطان کا محض ایک دھوکہ ہے' کسی کو کیا خبر ہے کہ موت کا وقت کب آنے والا ہے' اور کیا ضروری ہے کہ آدمی کے اوپر بڑھاپا آوے ___ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جوانوں کو زیادہ موت آتی ہے' بوڑھوں کو کم آتی ہے' جوان زیادہ مرتے ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ مجمعوں میں' بازاروں میں' درباروں میں دیکھیں تو بوڑھے کم نظر پڑیں گے' جوان زیادہ نظر پڑیں گے' اگر سارے بڑھاپے کو پہنچ کر ہی مرا کرتے تو بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوتی' سفید ڈاڑھیاں زیادہ نظر پڑتیں' مرتے ہی نہ جب تک بڑھاپے کی عمر کو نہ پہنچ جائیں' مگر بڑھاپے کو پہنچنے ہی نہیں پاتے' پہلے ہی مرجاتے ہیں' اس لئے بوڑھوں کی تعداد کم نظر پڑتی ہے' جوان زیادہ نظر آتے ہیں۔

تو اس دھوکے میں رہنا کہ جب بڑھاپا آئے گا' اس وقت توبہ کرلیں گے' یا جوانی ہوئی مگر کوئی مرض ایسا

آن پڑا‘ یہ یقین پڑا کہ بھئی اب چلو ڈیرے ہیں۔ بس اب چلنے والے ہیں‘ یہ غلط ہے‘ کیا خبر ہے کسی کو بیماری آئے نہ آئے ___ روز کا روز اپنا حساب صاف کرتے رہنا چاہئے۔ یہ نہ آدمی سمجھے کہ آخیر میں توبہ کروں گا۔ اور جس نے آخیر میں رکھا کہ کل کروں گا‘ کل کو ممکن ہے یہ کہے کہ کل کروں گا‘ تیسری کل آئی تو اس نے کہا نہیں‘ کل کو کروں گا‘ بس کل کل میں ساری عمر گذر جائے گی‘ موت کا فرشتہ سامنے آجائے گا‘ اور اس وقت توبہ کا کوئی موقع نہیں رہے گا۔

حدیث میں ہے کہ بعض لوگ مَلکُ الموت سے کہیں گے کہ اے مَلکُ الموت! ذرا سا وقفہ دے دو کہ میں توبہ کرلوں۔ فرمائیں گے مَلکُ الموت‘ کہ میرے پچاسیوں قاصد تیرے پاس پہنچے‘ جب تو نے توبہ نہیں کی‘ اب میں آخیر میں آیا ہوں‘ تو تجھے توبہ کی سوجھ رہی ہے۔ وہ کہے گا میرے پاس تو آپ کا کوئی قاصد نہیں آیا ___؟ مَلکُ الموت کہیں گے‘ ایک‘ دو‘ میں نے تو بیسیوں قاصد تیرے پاس بھیجے‘ انہوں نے تجھے نہیں سمجھایا‘ وہ کہے گا میرے پاس کوئی نہیں آیا۔ تو مَلکُ الموت کہیں گے کہ تجھ پر بڑھاپا نہیں آیا؟ ارے بڑھاپا میرے ہی تو قاصد ہے جو خبر لے کر آیا تھا کہ موت کا وقت اب قریب ہے۔ کیا تیری ڈاڑھی اور سر میں سفید بال نہیں آئے؟ یہ سفید بال میرے ہی تو قاصد تھے جو بتلا رہے تھے کہ اب موت کا وقت قریب آگیا ہے‘ کیا تیرے پوتے اور نواسے نہیں پیدا ہوئے؟ ___ یہ پوتے اور نواسے میرے ہی تو قاصد تھے‘ جو بتلا رہے تھے کہ اب قبر میں جانے کا وقت قریب آگیا ہے‘ جب اتنے قاصدوں پر بھی تو نہ سمجھا‘ اور توبہ نہ کی‘ تو میں آخری قاصد ہوں‘ میرے بعد کوئی قاصد آنے والا نہیں۔ اب کون سا موقع ہے توبہ کا ___؟ اب تو گذر گیا وقت‘ جو کچھ ہونا تھا‘ ہولیا۔

مقامِ عبرت

میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ جو کچھ کرنا ہو‘ جلدی سے کرلے‘ اس لئے کہ وقت کم ہے‘ کسی کو اپنی عمر کا پتہ نہیں‘ سال بھر جو ہمارے سامنے موجود تھے‘ آج وہ ہمارے سامنے نہیں ہیں‘ آج جو ہیں‘ ان سے کیا خبر کون رہے گا‘ کون نہیں رہے گا‘ تو روز موت کا بازار گرم ہے‘ آنے والے آرہے ہیں‘ جانے والے جارہے ہیں‘ اس میں آدمی آنکھ بند کئے غفلت میں پڑا رہے۔ یہ بڑی ہی دانش مندی کے خلاف بات ہے۔ روزمرہ کا قصہ سامنے گذر رہا ہے ؎

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش
اے ز فرصت بے خبر در ہرچہ باشی زود باش

نہ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کرو یا وہ کرو‘ میں یہ کہتا ہوں جو کرنا ہو جلدی کرلو۔ اس لئے کہ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ ہم میں سے کسی کی آدھی عمر گذر چکی ہے‘ کسی کی آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے‘ کوئی موت کے قریب پہنچ چکا ہے‘ کوئی قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں‘ روزانہ سلسلہ آنے والوں کا‘ جانے والوں کا بھی جاری ہے‘ آخر پھر عبرت کا کون سا وقت آئے گا‘ جب اتنی چیزیں دیکھ کر عبرت نہ پکڑے؟ تو کیا مَلکُ الموت کو دیکھ کر آدمی عبرت پکڑے گا‘ یا موت جب سر پر آکھڑی ہوگی‘ جب عبرت پکڑے گا؟ اس لئے ابھی سے عبرت پکڑ لینی چاہئے‘ اور سمجھ لینا چاہئے کہ وقت آرہا ہے‘ اس کے لئے ہمیں کچھ کرنا ہے۔

اُخروی غذا بھی حاصل کرنی چاہئے

اس کے لئے سب کچھ کرنے میں پہلی چیز ہے کہ اللہ کی رضا کا علم اور معرفت حاصل کرلیں کہ وہ کن

چیزوں سے خوش ہے' کن چیزوں سے ناخوش ہے' کونسا راستہ ہے کہ جس پر چل کر اس کو خوشی ہوگی' کونسا راستہ ہے کہ جس پر چل کر وہ ناراض ہوگا' وہ علم آپ کو شریعت سے معلوم ہوگا' وہ سائنس اور فلسفہ میں نہیں ملے گا' وہ ہیئت اور اُقلیدس میں نہیں مِلے گا' وہ قرآن وحدیث میں مِلے گا کہ جس سے اللہ کی رضا اور نارضائی کا پتہ چلے' اس کی خوشی وناخوشی کا پتہ چلے۔ تو اس علم کو حاصل کیجئے' جس سے آخرت میں کچھ کام چلے' اور آخرت کا دروازہ کھلے' یہ جتنی نعمتیں ہیں' یہ یہیں کے لئے آرام دہ ہیں' یہ قبر میں آرام نہیں دیں گی' ہم یہاں بہترین مسہری اور گدّے' تکیئے پر لیٹ جائیں' مگر قبر میں آرام دینے کے لئے یہ گدّے تکئے آرام نہیں دیں گے' وہاں کی چیز اعمالِ صالحہ ہے' وہاں کا گاؤ تکیہ نیکی ہے' وہاں کا گاؤ تکیہ روئی' اون اور پلاسٹک کا نہیں ہے' وہاں دوسری چیزیں ہیں۔ یہاں روٹی' چاول اور غذاؤں سے پیٹ بھر جائے گا' قبر میں یہ چیزیں غذا نہیں بن سکتیں۔ وہاں عملِ صالح کی غذا کام آئے گی' وہاں بستر بھی ہوگا تو عمل کا' ___ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب میت سچا جواب دے دے گا کہ میرا رب اللہ ہے' میرا دین اسلام تھا' میرے پیغمبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ تو ایک منادی ندا کرے گا کہ ان صدق عبدی بندے نے جو کچھ کہا سچ کہا۔

فافرشوہ من الجنۃ' والبسوالہ من الجنۃ' وافتحوالہ بابًامن الجنۃ۔

"اس کے لئے جنت کا فرش بچھاؤ' اس کے لئے جنت کا لباس بھی دو' اس کے لئے جنت کے دروازے بھی کھولو"۔

ہوائیں بھی اس کے لئے وہیں سے آنی چاہئیں' تو وہاں کی غذائیں اور نعمتیں دوسری ہیں' اس عالم کی دوسری ہیں۔ جہاں اللہ نے یہاں کی غذائیں دیں' کچھ وہاں کی غذاؤں کے بھی فکر کرنے ضرورت ہے' یہاں تھوڑا بہت فکر تھا' وہاں کے لئے زیادہ فکر کی ضرورت ہے' مگر ہم نے اُلٹا قصہ کیا' کہ یہاں کی فکر زیادہ ہے' وہاں کی ذرّہ برابر نہیں ہے' یہاں ہر آسائش کا خیال ہے' وہاں کی آسائش کا خیال نہیں ہے' کم سے کم تھوڑا بہت وقت کچھ ادھر بھی لگانا چاہئے' اب موت کا بھی دھیان کرلینا چاہئے۔ تو پہلی چیز تو علم ہے کہ اللہ کی خوشی اور ناخوشی معلوم ہو' دوسری چیز راستہ ہے' جو عملِ صالح ہے کہ اس راستہ پر چل کر ہم پروردگار کے قریب ہوتے جائیں' تیسری چیز قلب کے مقامات ہیں' سب سے بڑی چیز اس میں اخلاص اور خُلوص ہے' کہ قلب کی راہ ہماری درست ہوجائے اور اس سے بھی بڑی چیز فکر ہے' کہ آخرت کی دُھن لگی ہوئی ہو' غفلت میں آدمی نہ گذارے۔

مسلمان کو متفکّر پیدا کیا گیا ہے

مسلمان کو متفکّر پیدا کیا گیا ہے' غافل پیدا نہیں کیا گیا' مسلم وہ ہے جو فکر مند ہو' ہر وقت اسے ایک فکر چڑھا ہوا ہو۔

حدیث میں ہے کہ :

الکافر یأکل بسبعۃ امعاء' والمؤمن یأ کل بمع واحد

"کافر سات انتڑیوں سے کھاتا ہے' اور مومن ایک انتڑی سے کھاتا ہے"۔

تو مؤمن کی غذا کم ہوتی ہے' کافر کی غذا زیادہ ہوتی ہے ___ ایک سائز کے دو آدمی لیں' ایک مسلم اور ایک غیر مسلم' وہ زیادہ کھائے گا' یہ کم کھائے گا'

وجہ اس کی یہ ہے کہ کافر کے قلب میں فکر نہیں ہے' اور مؤمن کے قلب میں آخرت کا فکر لگا ہوا ہے'

کتنے سے کتنا ہی بد عمل مسلم ہو گا' جب اندر ٹٹولو گے تو کچھ نہ کچھ فکرِ آخرت ضرور ہو گا۔ لکھ پتی ہے' مگر وہ پوچھ رہا ہے' مولانا یہ چیز جائز ہے' ناجائز ہے؟ یہ جائز ناجائز کیوں پوچھتا ہے؟۔ موت کی فکر لگی ہوئی ہے' جبھی تو پوچھتا ہے' اگر اسے فکر نہ ہوتا' کیا ضرورت تھی پوچھنے کی' یہ کہنا کہ یہ معاملہ میں نے کیا ہے یہ حرام تو نہیں ہے؟ ناجائز تو نہیں ہے؟ کر بھی رہا ہے' مگر فکر بھی چڑھی ہوئی ہے۔ اگر فکر نہ ہوتی سوال نہ کرتا' کوئی مؤمن ایسا نہیں ہے' جس کے اندر تھوڑا بہت آخرت کا فکر نہ ہو' اور جب فکر ہوتی ہے' تو کھانا بھی کم ہو جاتا ہے' عیش بھی کم ہو جاتی ہے۔ یہ کتنے ہی عیش میں مبتلا ہو' لیکن اسی درجہ کا غیر مسلم لیا جائے' وہ پانچ گنے عیش میں ہو گا' یہ ایک گنے عیش میں ہے' اس لئے کہ اس کے دل میں پھر بھی ایک فکر چڑھا ہوا ہے' کہ وقت آنا ہے' حساب دینا ہے' اسے اس کا کوئی فکر نہیں۔

فکرِ آخرت کو چمکانے کی ضرورت

تو فکر کا مادہ اللہ نے رکھا' جو ہر مؤمن کے ایمان کے ساتھ دل میں لگا ہوا ہے' مگر ذرا اسے اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے' ایمان ہر ایک میں ہے' مگر عمل سے ذرا اسے چمکانے کی ضرورت ہے' اسی طرح سے اس تفکر کو بھی چمکانے کی ضرورت ہے' فکر اس وقت تک چمکتا نہیں' جب تک خُلوص نہ ہو' خُلوص چلتا نہیں جب تک عمل کا جذبہ نہ ہو' عمل بنتا نہیں' جب تک علم نہ ہو' تو علم' عمل' خُلوص اور فکر ضروری ہے۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے عرض کیں' کہ تعلیم میں بھی بہت کوتاہی ہو رہی ہے۔ تعلیم کی مردوں کو اور عورتوں کو بھی ضرورت ہے' اور اس کے ساتھ اپنے عمل اور اخلاص کی' اور فکر کی بھی۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چاروں چیزیں نہیں ہوں گی۔ تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے' تباہی ہی تباہی ہے۔ نجات ان چار چیزوں میں ملے گی' تو فرمایا گیا' لوگ تباہ برباد ہیں' بچیں گے علم والے' علم والے تباہ و برباد ہیں' بچیں گے عمل والے' عمل والے تباہ و برباد ہیں' بچیں گے خلوص والے' خلوص والے تباہ و برباد ہیں' بچیں گے فکر رکھنے والے' یعنی غفلت سے نجات نہیں ہو گی' ہلاکت ہو گی۔

اس واسطے یہ چند باتیں میں نے اس حدیث کی روشنی میں عرض کیں۔ امّید ہے کہ آپ حضرات ان باتوں پر غور کریں گے' اور وقتاً فوقتاً سوچیں گے' دماغ میں یہ باتیں گھومیں گی' تو اس کا فکر رکھیں گے کہ کس طرح سے اس حدیث پر ہم عمل کریں' کس طرح سے ہم اپنی انسانیّت کو اُجاگر کریں۔ تو سوچتے رہنا چاہئے اور فکر رکھنا چاہئے کہ ہم عمل کا کوئی نقشہ بنائیں' ایک آدمی ایک ہی نقشہ بناتا ہے' چار مل کر بناتے ہیں' تو ذرا نقشہ اچھا کھلا ہوا بن جائے گا' اور قوم مل کر بنائے گی تو بڑا بہترین نقشہ بنے گا' سارے ہی عمل میں لگ جائیں گے۔ اس لئے بس اللہ سے دعا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیں اور آپ کو' مردوں اور عورتوں کو نیکی کی' عمل کی' خلوص و للہیت کی اور فکر کی توفیق عطا فرمادے۔ دنیا میں بھی نجات عطا فرمادے' اور آخرت میں بھی نجات عطا فرمادے۔ آمین۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ
وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ
بِرَحْمَتِکَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ .

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تعلیم و تبلیغ

آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس دور میں مسلمانوں کے لئے صرف دو پناہ گاہیں ہیں ایک دینی مدرسے اور دوسرے یہ تبلیغی کام ___ تعلیمی ادارے باہر سے لوگوں کو لا کر ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور پھر اپنی تعلیم دیتے ہیں ___ اور یہ تبلیغی کام والے جمع شدہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ___

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ

بزرگان محترم!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ مکی زندگی اور مدنی زندگی' مکی زندگی تیرہ برس کی ہے اور مدنی زندگی دس کی ہے۔

مکی زندگی

مکی زندگی تکالیف و مشکلات' پریشانیوں اور کلفتوں کی ایک طویل صبر آزما زندگی ہے' خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ___ "کسی نبی کو اپنی قوم سے وہ ایذائیں اور تکلیفیں نہیں پہنچیں جو مجھ کو میری قوم سے پہنچی ہیں" ___ لیکن ان تمام تکالیف کے بعد بھی آپ دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام انتہائی انہماک اور لگن سے کرتے رہے۔ مشرکین کے ایمان نہ لانے سے آپ کے دل میں جو ضیق و تنگی پیدا ہوئی تھی اس پر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ اپنے دل کو ان پر نہ کڑھایئے بلکہ اپنے کام میں لگے رہئے۔ آپ خدا کے حکم پر عمل کرتے رہے اور اس کی حمد و تعریف اور اس کی بھیجے ہوئے مذہب کی تبلیغ میں لگے رہے' آپ کو مجنون' کاہن' جادوگر اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا' آپ پر پتھر پھینکے گئے' آپ کو زہر دیا گیا' کوئی نازیبا حرکت نہ تھی جو آپ کے

ساتھ نہ کی گئی ہو' لیکن ان سب کے باوجود آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ انتہائی صبر و ثبات کے ساتھ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے سعی و کوشش کرتے رہے' خدا کی طرف سے بھی آپ کو یہی حکم ملا کہ **فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ - فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا** ___ آپ صبر کیجئے جیسا کہ آپ سے قبل دوسرے اولوالعزم وصاحب ہمت لوگوں نے صبر کیا' صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیئے اور اگر اس پر بھی یہ جاہل اعتراض کریں تو آپ ان پر اپنے دل کو نہ کڑھائیے **لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ** آپ ان پر کوتوال بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔

جہادِ کبیر

یہ بات اسلام کے منافی معلوم ہوتی ہے کہ پٹتے رہنے اور مصائب و تکالیف برداشت کرنے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا' بات یہ نہیں بلکہ خدا کا یہ حکم تھا کہ ہر قسم کی تکالیف و مصائب کو برداشت کرو اور زبان سے اُف بھی نہ کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جواب نہ دیا جائے' جواب دیا جائے اور اس سے بھی سخت دیا جائے اگر تلوار سے جسم پر حملہ کیا جائے تو اس کا جواب زبان سے روح پر حملہ کرکے دیا جائے۔ اگر تکلیف پہنچائی جائے تو دین کی بات انہیں پہنچا کر تکلیف پہنچائی جائے' عربی شاعر نے کیا خوب کہا ؎

جراحات السنان لها التيام
ولا يلتام ماجرح اللسان

یعنی نیزوں کے لگے زخم تو بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے لگے زخم ہمیشہ ہرے رہتے ہیں۔ ان کا اندمال نہیں' یہ زبان کا جہاد بڑا جہاد ہے۔ اسے جہادِ کبیر کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ جہاد جو تلوار لے کر کیا جاتا ہے اس میں منٹوں کا قصوں ہوتا ہے اور تکلیف بھی تھوڑی دیر کی' لیکن دین کی دعوت کا جو جہاد زبان سے کیا جاتا ہے وہ اذیت و تکلیف کے لحاظ سے زیادہ سخت ہے اس میں تکلیفیں اور اذیتیں اٹھانا اور ہر لمحہ قتل ہونا ہے ___ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا بہادر کون ہے؟ ___ لوگوں نے جواب دیا کہ جو حملہ کرکے قتل کردے' حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں جو اپنے نفس کو قتل کردے' یہ دعوت کا کام جہاد کبیر ہے' اس میں انسان طعنے سنتا' گالیاں کھاتا' تکلیفیں اٹھاتا' مصیبتیں جھیلتا اور اذیتیں برداشت کرتا ہے اور میدان کارزار میں آدمی جا کر جنگ کرتا ہے پھر یا تو قتل کرتا یا قتل ہو جاتا ہے۔

انقلابِ عظیم

اسلام نے اپنے متبعین کو صبر و تحمل کی تعلیم دے کر جُبن و بُزدلی کی دعوت نہیں دی، بلکہ بہادری اور اولو العزمی کی طرف بلایا ہے اور اپنے مشن کے لئے ہر قسم کی تکلیف و مصیبت برداشت کرنے کے لئے آمادہ کیا ہے اور بتلادیا ہے کہ کامیابی و کامرانی شدائد و مصائب پر اسی طرح صبر و تحمل کرنے سے ملتی ہے' مکہ کی زندگی کو دیکھئے' تیرا آدمی مسلمان ہوئے یہ سب حضرت ارقمؓ کے گھر میں بند رہتے' زنجیریں چڑھائے رکھتے' عدد کے اعتبار سے بھی کم' شوکت و سطوت بھی ندارد' لیکن دین کی تبلیغ میں لگے رہے' حق کی طرف بلاتے رہے' تکلیفیں اور مصائب جھیلتے رہے اور اپنی زبان سے کفار کے قلب و جگر پر نشترزنی کرتے رہے' بالآخران کی پیہم سعی اور مسلسل کوشش سے ایک عظیم انقلاب آیا' اقلیت اکثریت میں بدل گئی۔ ذلت و خواری کی جگہ عظمت و رفعت نے لے لی' یہ تبدیلی تلوار کے جہاد سے رونما نہیں ہوئی تھی بلکہ زبان کے اس جہاد سے ہوئی تھی جسے

جہاد عظیم کہا گیا ہے اور کیسے ہوئی؟ اس طرح ہوئی کہ وہ لوگ مصائب کو جھیلا کئے مگر حوصلہ نہیں چھوڑا۔

آج کی ہماری زندگی مشابہ ہے مکہ کی زندگی سے، بالکل وہ حال تو نہیں جو وہاں تھا، یہاں ہماری جائدادیں ہیں، ہمیں قانونی حقوق حاصل ہیں۔ ہم جو پیشہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں، لیکن اسلام کی شوکت اور اسلام کا حکم نہیں ہے، تمدن و تہذیب کی ہر بات تسلیم کر لی جاتی ہے، لیکن وہی بات خدا کے نام پر نہیں مانی جاتی، خدا کا نام لے کر کچھ نہیں منوایا جا سکتا۔ تمدن و تہذیب کے نام پر ہر بات منوائی جا سکتی ہے وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ سارا شکوہ صرف اس وجہ سے ہے کہ خدا کا نام لیا جاتا ہے، یہاں مادہ پرستی ہے، وطن پرستی ہے، لیکن خدا پرستی نہیں ہے اس زندگی کا اقتضا یہ ہے کہ آج ہم اور آپ تلوار سے طاقت پیدا نہیں کر سکتے بلکہ صرف خدا کی طرف دعوت دے کر طاقت و قوت پیدا کر سکتے ہیں۔ آج ہماری کامیابی و کامرانی اور فلاح اس دعوتی کام میں مضمر ہے، دعوت و تبلیغ کا یہ کام ہماری زندگیوں میں ایک عظیم انقلاب لا سکتا ہے اور ہم میں وہ قوت پیدا کر سکتا ہے کہ جو ہم سے ٹکرائے پاش پاش ہو جائے۔

ہماری نجات کا ذریعہ

حق بات کو دوسروں تک پہنچانا اور دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام انتہائی امانت اور دیانت سے کرنا خدا کا حکم ہے اور خدا کا کام کرنے والا خدا کی نگرانی میں ہے۔ اگر دل میں یہ تصور جاگ اٹھے کہ خدا کی مدد ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس بات کا ڈر اور کس کا خوف؟ ___ گورنمنٹ کا ایک ادنیٰ ملازم جب سرکاری کام پر ہوتا ہے تو وہ کتنا جری ہوتا ہے اس کی تمام جرأت صرف اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ سرکاری ملازم ہے، اگر اس پر کوئی حملہ کرے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس نے سرکار پر حملہ کیا۔ یہی تصور دین کا کام کرتے وقت ہمارے دل میں ہونا چاہئے۔ ہم اس ملک میں اور ان حالات میں اگر اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں تو صرف مذہب کے نام سے، اس کے علاوہ ہماری نجات کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (عصر پ۳۰)

قسم ہے زمانے کی، زمانہ چلا آ رہا ہے اور چلا جائے گا، زمانہ مکانیات پر چھا گیا ہے، مکان اپنی جگہ قائم ہے اور زمانہ پیہم گردش میں ہے سب سے زیادہ وسیع محرف زمانہ ہے، ازل سے قبل ہے اور انتہا کا علم نہیں زمانہ کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے، خدا تعالیٰ زمانہ کی قسم کھاتا ہے اور قسم گواہ کے قائم مقام ہے یعنی خدا تعالیٰ زمانہ کو گواہ بنا کر کہتا ہے کہ انسان ٹوٹے اور گھاٹے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے نیک اعمال کئے، ایمان لانے والے اور عمل صالح کرنے والوں کے علاوہ تمام لوگ خسارہ و نقصان میں ہیں۔

قوتِ ایمان

تاریخ دیکھی جائے، (آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک فتح ان ہی قوتوں کو ہوئی جو ایمان والے تھے اور جن لوگوں نے ایمان والوں کی مخالفت کی، ان کو تکلیفیں دیں، ایذائیں پہنچائیں وہ ذلیل و خوار ہوئے۔ فرعون، ہامان، شداد، ابوجہل، ابولہب اور ان جیسے تمام مال و دولت والے جنہوں نے اپنے اپنے وقتوں میں ایمان

والوں کو ستایا' پریشان کیا اور ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کی لیکن انجام کار خود ہی ذلت و خواری سے دوچار ہوئے۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اگر کامیابی حاصل کرنا ہے تو ایمان والا بننا پڑے گا قرآن پاک نے صاف الفاظ میں فرمادیا ہے :

لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی ہ (نجم پ ۲۷ ایت ۳۹)

یعنی انسان کو اس کی سعی و کوشش ہی کام دے گی' کسی دوسرے کی سعی کام نہ آئے گی ___ لیکن اس کے برخلاف حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر ثواب دوسروں کو پہنچایا جائے تو ثواب دوسروں کو پہنچ جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک کی سعی دوسرے کے کام آتی ہے۔ اس طرح حدیث و قرآن میں تعارض واقع ہوتا ہے۔

مفتی عزیز الرحمن صاحب جو ایک خدا ترس عالم تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ میں نے جلالین میں قرآن کی یہ آیت پڑھی اور حدیث کی ایک کتاب میں ایصال ثواب کی یہ حدیث دیکھی' دونوں میں تعارض نظر آیا۔ بہت سوچا' کتابیں دیکھی لیکن کسی طرح اس کا حل سمجھ نہ آسکا ___ رات کو سونے کے لئے گھر اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لیکن معاً یہ خیال آیا کہ اگر رات کو موت آگئی تو دو صورتوں میں سے ایک یقینی ہے یا تو حدیث کا انکار لازم آتا ہے یا پھر قرآن کا اور ان دو صورتوں میں ایمان کی سلامتی نہیں۔ یہ خیال آتے ہی بستر چھوڑ دیا اور پیدل گنگوہ کا سفر کیا۔ ۲۲ کوس کا سفر رات بھر میں کرکے صبح تڑکے گنگوہ پہنچا' مولانا گنگوہیؒ جو کہ ضعیف ہوچکے تھے بینائی جاچکی تھی اس وقت وضو فرمارہے تھے' فرمایا کہ کیوں آئے؟ میں نے عرض کیا کہ اس آیت اور حدیث میں تعارض واقع ہوگیا ہے اور اس کا حل سمجھ میں نہیں آرہا ہے' اسی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا :قرآن کی اس آیت لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی سے نفس ایمان مراد ہے یعنی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لائے تو کسی دوسرے کا ایمان اس کے کام نہیں آئے گا اور حدیث سے مراد عمل ہے' ایمان کسی کو نہیں بخشا جاسکتا' عمل بخشا جاسکتا ہے۔

عام تبلیغ ہر شخص پر ضروری ہے

اللہ تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھاکر فرمایا کہ انسان خسارہ میں ہے مگر صرف اہل ایمان اور وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں' جو ایک دوسرے کو حق و صبر کی وصیت کریں اور دوسروں کو صالح و نیکوکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دین کی تبلیغ و اشاعت کا کام اس لئے شروع کیا گیا' کیونکہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ کام صرف علماء سے متعلق ہے' وہ مسائل جن میں اختلاف ہو' انہیں نہ بیان کیا جائے بلکہ علماء اس کو بوقت ضرورت بیان کریں اور عام تبلیغ ہر شخص پر لازمی ہے امتِ محمدیہ کے ہر فرد سے اس ذمّہ داری کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ ارشاد ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران ۱۱۰)

اس آیت میں اس امت کو مخاطب بنایا گیا ہے اور "للنّاس" کہا گیا ہے "للمسلمین" نہیں کہا گیا۔

تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ

ہندوستان میں اس وقت دعوت و تبلیغ کے کام کو چند سال قبل حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے شروع کیا۔ خدا تعالیٰ نے ان کے قلب مبارک پر اس کا القاء کیا انہوں نے تبلیغ کے لئے جماعتوں کا طریقہ اختیار کیا۔ کیونکہ دستور ہے کہ جب کچھ لوگ مل کر ایک بات کہتے ہیں یا کوئی کام کرتے ہیں تو اس کا اثر خاص طور پر پڑتا ہے' ایک ہی بات کو جب مختلف لوگ مختلف وقتوں میں کہتے ہیں تو اس کا اثر کبھی نہ کبھی تو ہوتا ہے حق تعالیٰ نے سورۂ یاسین میں ارشاد فرمایا ہے :

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ۔ (یٰس پ۲۲ آیت ۱۴)

جب ہم نے ان کے پاس دو رسول بھیجے تو انہوں نے ان کی تکذیب کی تو ہم نے تیسرا رسول بھیج کر ان کو سرفراز کیا' انہوں نے کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے دعوت کے کام میں جماعتی طریقہ اپنایا' کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ آج کا دور اجتماعی دور ہے' کھیل کود' صنعت و تجارت و زراعت غرض ہر چیز میں اجتماعیت پائی جاتی ہے' ہر مسئلہ میں وُفود جاتے ہیں میٹنگیں ہوتی ہیں ہر جگہ جماعتی رنگ دکھلائی دیتا ہے' اس جماعتی ماحول میں انفرادی بات کا زیادہ اثر نہیں ہوتا' یہی کچھ سوچ سمجھ کر مولانا مرحومؒ نے اس جماعتی کام کو جماعتی ڈھنگ سے شروع کیا' جب جماعت بنا کر کچھ لوگ کسی آدمی کے پاس جاتے ہیں اور اس حال میں کہ کاندھوں پر بستر لدے ہوئے پیدا چل کر آرہے ہیں' محنت و مشقت کے آثار چہرے سے ظاہر ہیں' لامحالہ وہ آدمی سوچتا ہے کہ یہ لوگ میرے پاس کیوں آئے ہیں؟ انہیں مجھ سے کوئی غرض و مطلب نہیں' پھر کیا چیز ہے جو انہیں اس تکلیف کو برداشت کرنے پر آمادہ کررہی ہے' ضرور جو یہ لوگ کہتے ہیں وہ صحیح ہوگا یہ چیز اسے بہت متاثر کرتی ہے۔

تبلیغی جماعت اور انقلاب عظیم

میں نے شاید کہیں لکھا ہے کہ تبلیغ کو اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے دل پر بطور فن کے القاء کیا' اس میں تعلیم و تربیت' سیر و سیاحت' روح کی دلچسپی' بدن کی ورزش ہر ایک چیز موجود ہے' آج کے دور میں یہ کام بڑا ہی مفید اور لازمی ہے' اسی وجہ سے یہ کام تیزی سے پھیل رہا ہے اور اس تبلیغ سے ایک عظیم انقلاب آرہا ہے' ہندوستان کے ہر خطے میں اور ہندوستان سے باہر جہاں بھی میں گیا وہاں میں نے تبلیغی جماعتیں اور تبلیغی مراکز دیکھے۔ رسمی انداز میں اس عالمگیر طریقہ پر کام نہیں ہوسکتا اور اس کے ساتھ نہ فتنہ وفساد ہے اور نہ واویلا اور شور' آپ نے کہیں نہیں سنا ہوگا کہ ان جماعتی لوگوں نے کہیں غدر کیا' کہیں فساد برپا کیا۔ یہ ایک خاموش تبلیغ ہے' جو عالمگیر طریقہ سے ساری دنیا میں پھیلتی جارہی ہے اور اس کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی آرہی ہے۔

تبلیغ میں باہر نکلنے کا فائدہ

تبلیغ کے کام میں آدمی کو اسکے گھر سے نکالا جاتا ہے' وہ گھر کے ماحول سے نکل کر خدا کے گھر میں پہنچتا ہے وہاں اسے دوسرا ماحول ملتا ہے' گھر کے ماحول میں اور اس ماحول میں بڑا فرق ہوتا ہے' یہاں اسے داعی اور عامل دونوں بننا پڑتا ہے' وہ داعی بن کر آتا ہے اور عامل بن کر جاتا ہے۔

مقصد تبلیغ

حضرت سفیان ثوریؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ہم نے علم حاصل کیا تھا غیر اللہ کے لئے مگر جب علم آ گیا تو اس نے کہا کہ میں تو خدا کے لئے ہوں ___ اس تبلیغی کام کا ایک نظام ہے اور اوقات نکالنے کا ایک اصول ہے' اس کا مقصد یہ ہے کہ قلب کی صفائی ہو وہ تمام دنیوی آلودگیوں سے پاک ہو' تزکیۂ نفس ہو' انشراحِ قلبی اور روحانی قوتوں کو جِلا ہو' شیطانی قوتیں دبیں اور مغلوب ہو جائیں۔

بے لوث خدمت

آج کے دور میں بہت سی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن یہ تحریک اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں نہ عہدے ہیں، نہ منصب ہیں' نہ کرسیاں اور نہ سیٹیں ہیں' بلکہ اپنے ہی مال کا خرچ ہے' اپنی جیب پر بار ہے' یہ تحریک موجودہ دور میں دین کے تحفظ کے لئے ایک بڑی پناہ گاہ ہے' کسی ریاست کی بنیاد ہوتی ہے ''توہمات'' اور ''تنازع للبقاء'' پر لیکن یہاں اس کے برعکس ہے یہاں تنازع للبقاء کی جگہ فنا للبقاء ہے اور توہمات کی جگہ محبت و الفت ہے' ریاست کے لئے پارٹیاں بنائی جاتی ہیں اور یہاں خود بخود پارٹیاں بن جاتی ہیں۔

دو پناہ گاہیں

آج جس دور میں ہم گزر رہے ہیں اس دور میں مسلمانوں کے لئے صرف دو پناہ گاہیں ہیں ایک دینی مدرسے اور دوسرے یہ تبلیغی کام۔ تعلیم والے باہر سے لوگوں کو لا کر ایک جگہ جمع کرتے ہیں اور پھر اپنی تعلیم دیتے ہیں اور یہ تبلیغی کام والے جمع شدہ لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔

دعوتِ شرکت

تبلیغی کام ایک ٹھوس اور بنیادی کام ہے' اس پر قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد ہے جو لوگ اس تبلیغی کام میں لگے ہوئے ہیں اور اپنے وقتوں کو لگاتے ہیں وہ مزید اس کام میں لگیں' اگر پہلے کم وقت لگاتے تھے تو اب اور زیادہ وقت لگائیں اور اس کام کو محنت اور جانفشانی سے کریں جو کہیں اس پر خود عامل ہوں اور عمل کرنے کی کوشش کریں' کیونکہ سب سے بڑی دلیل عمل ہے اور عمل کے بڑے اثرات پڑتے ہیں۔

حضرت امام مالکؒ نے فرمایا کہ دنیا میں ہر شخص اپنی بات کو خوشنما کر کے پیش کرتا ہے لیکن اگر اس کا یہ قول عمل کے مطابق ہے تو ٹھیک ورنہ اس کے لئے ہلاکت و تباہی ہے اسی طرح ہر کام کے کرنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور کچھ حدیں ہوتی ہیں' کام کو اس طرح کریں کہ دوسرے کے حقوق پامال نہ ہوں انّ لنفسک علیک حقًا انسان پر اس کے نفس کا' اس کی جان کا' اس کی بیوی کا' بچوں کا' آنکھوں کا' ہر ایک کا حق ہے اگر ایک انسان ایک حق ادا کرے اور اس حق کے ادا کرنے میں دوسرے بہت سے حقوق پامال ہوں تو یہ خیر کی بات نہیں۔ خیر کی بات تو یہ ہے کہ حق بھی ادا ہو جائے اور دوسرے حقوق کی پامالی بھی نہ ہو' کھاؤ بھی کہ یہ نفس کا حق ہے اور روزہ بھی رکھو کہ خدا کا حق بھی ادا ہو جائے۔

دعوتی کام کا نفع

آج دنیا میں اور خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے راہِ نجات اور فلاح و کامرانی کی راہ یہی دعوتی کام ہے۔ اس کام نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے یہی کام کرنے والے پنپے ہیں ___ اور یہی کام کرنے والے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے ___

اللّٰھم ربّنا تقبّل مِنّا انک انت السمیع العلیم
واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین

نشان منزل، بھوپال
مؤرخہ : ۱۵ر فروری ۱۹۶۷ء

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

جماعتی تبلیغ

یہ مولانا مرحوم کی فراست باطنی تھی کہ جماعتی حیثیت قائم کرکے ایک ماحول بنایا۔ گھروں سے نکل کر اللہ کے گھر میں لوگ جمع ہوں گے۔ کوئی چلّہ دے گا، کوئی دو چلّے، کوئی دس دن، کوئی بیس دن۔ ایک جگہ جمع ہوں گے۔ اب جب سارے مل کر ذکر اللہ کریں گے تو ایک آدمی کیسے ان میں سے غافل رہے گا؟ وہ خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہوگا۔ تو عمل کا راستہ بھی ڈال دیا۔ فقط تعلیم و تربیت ہی کا نہیں، بلکہ عملی راہ بھی ہموار کردی۔ تو جماعتی حیثیت اس لئے ڈالی تاکہ لوگ اس کو قبول کریں، انفرادی بات کم قبول کرتے ہیں اور ماحول اس لئے بنایا کہ جماعت کے لوگوں میں خود دین راسخ ہو۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ. وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَافَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ــــــــ اَمَّا بَعْدُ ــــــــ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ. اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ o اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ o صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (یٰس پ ۲۲ ع ۲۴)

ہمیشہ دین ایک رہا اور شرائع حسب مزاج اقوام نازل ہوتی رہیں

بزرگانِ محترم، و برادرانِ عزیز! [1]

اللہ کا دین ایک ہی ہے، جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی رہا، البتہ شریعتیں مختلف ہوئیں۔ مگر اصل دین ایک رہا۔ اصل دین میں بنیادی چیزیں داخل ہیں۔ جیسے وجودِ خداوندی، توحیدِ الٰہی، رسالت و نبوت، عالم برزخ، عالم حشر،

---

[1] ۱۷ جمادی الاول ۱۳۸۳ھ لاہور

جنت و دوزخ، میزان، پل صراط ــــ یہ تمام چیزیں تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو دی گئیں، جو بنیادی اصول ہیں۔ آگے شریعتیں عملی پروگرام ہیں، جو ان اصول کے تحت ہیں، وہ اقوام کے مختلف مزاج و نفسیات اور ان کی طبعی اُفتاد کے باعث مختلف رہی ہیں۔ جیسی ضرورت ہوئی، اسی انداز کا عمل ان کو بخشا گیا، اگر قوم سخت مزاج ہوئی، تو شرعی احکام سخت نازل ہوئے۔ اگر کسی قوم کے مزاج میں نرمی تھی، تو احکام میں بھی نرمی رکھی گئی، اگر اعتدال ہے تو احکام میں بھی اعتدال رکھا گیا ــــ غرض احکام نفسیاتِ اقوام اور اُفتادِ مزاج کے مطابق حق تعالیٰ نے نازل فرمائے۔

اسی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ

ابونا واحدٌ وامّھاتنا شتّٰی۔

"باپ ہمارا ایک ہے مائیں مختلف ہیں"۔

باپ سے اصول کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دین سب کا ایک ہے اور امّہات سے عملی احکام کی طرف اشارہ ہے، یعنی شریعتیں مختلف ہیں۔ اس لئے ہر نبی کے زمانے میں شریعتوں کے اندر اختلاف رہا ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کا دور مبارک ہے، اسے یوں سمجھئے کہ وہ اس عالم بشریت کی طفولیت اور لڑکپن کا زمانہ ہے گویا۔ عالم بشریت ایک لڑکا ہے جو آگے جا کے جوان اور بوڑھا ہوا۔ اس زمانے کے احکام بہت ہلکے تھے۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا چیزوں کے نام یاد کرادیئے گئے۔ جیسے بچوں کو ابتداءً آپ یاد کرادیتے ہیں۔ یہ آسمان ہے، یہ زمین ہے، روٹی ہے، لوٹا ہے وغیرہ۔ عمل کے درجے میں صرف یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ نام یاد کرادیئے گئے کہ یہ صبح و شام رٹ لیا کرو۔ لوگ یہی عمل کرتے تھے۔ تو عالم بشریت بالکل سادہ تھا۔ جیسے بچے کا مزاج ہوتا ہے۔ تو احکام بھی بالکل ابتدائی تھے۔ یہ مکمل احکام نہیں تھے جو بعد کی شریعتوں میں نازل کئے گئے۔

ابراہیم علیہ السلام کا دور آیا۔ اس میں لوگ فلکیات کی طرف چل پڑے تھے۔ سورج چاند کو پوجنا اور ستاروں سے اثرات لینا، تو ابراہیم علیہ السلام نے اس زمانے کے طریق کو سامنے رکھ کر وجود خداوندی اور توحید خداوندی کو سمجھایا۔ جس کا قرآن کریم میں تذکرہ فرمایا گیا:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○

ابراہیم علیہ السلام کو ستاروں اور فلکیات کی نفسیات سمجھادی گئی۔ انہوں نے اسی طریق پر قوم کی اصلاح فرمائی اور اس کے مناسب ہی احکام بھی دیئے گئے۔

موسیٰ علیہ السلام کا دور آیا۔ یہود کا مزاج بہت سخت تھا۔ ابتداہی سے یہ قوم تلخ اور سخت واقع ہوئی ہے۔ ان میں کبر و نخوت بھی تھا۔ بہرحال اولاد انبیاء علیہم السلام تھی۔ تو بزرگ زادوں میں نسبت کے لحاظ سے کچھ یوں بھی نخوت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ کہتے تھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ حق تعالیٰ سے ہماری رشتہ داریاں قائم ہیں، اسی لئے تو ہم اولاد انبیاء ہیں ــــ تو وہ جلدی ماننے والے نہیں تھے۔ اسی واسطے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا۔ بعض انبیاء کی تکفیر کی، بعض کو قتل کیا۔ یہ ساری گستاخیاں کیں اور جو احکام نازل ہوتے، ان کے مقابلے پر آجاتے تھے۔ مانتے نہیں تھے، تو شریعت بھی سخت قسم کی نازل ہوئی۔ اگر گوسالہ پرستی کی تو فرمایا گیا تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ تو آپس میں باپ نے بیٹے کو اور بیٹے نے باپ کو قتل کیا۔ ہزاروں آدمی قتل ہوئے ــــ بعض احادیث میں فرمایا گیا کہ رات کو جو عمل کرتے تھے، صبح کو ان کے دروازوں پر لکھا ہوتا

کہ یہ بد عملی کی ہے گویا دنیا ہی میں رُسوا کردیا جاتا تھا۔ اتنے سخت احکام دیئے گئے تھے۔

اگر کپڑے پر نجاست لگ گئی، تو پانی سے پاک نہیں ہوتا تھا۔ قینچی سے اسے کاٹنے کی نوبت آتی تھی۔ حتیٰ کہ اگر بدن پر نجاست لگ گئی تو صرف پانی سے پاک نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ کھال کو کھرچا نہ جائے۔ ایسے شدید ترین احکام تھے اس لئے کہ قوم کے مزاج میں شدت تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور آیا، وہ اس پہلے عمل کا رد عمل تھا۔ اس قوم میں نرمی بے حد تھی احکام بھی نرم دیئے گئے۔ فرمایا گیا "اگر تمہارے دائیں گال پر کوئی تھپڑ ماردے تو تم اپنا بایاں گال بھی اس کے سامنے کردو کہ ایک اور ماردے، خدا تیرا بھلا کرے۔ گویا انتقام لینا اس شریعت میں ممنوع تھا۔ یہود کی شریعت میں انتقام لینا واجب تھا۔ اگر کوئی تمہارا دانت توڑے، تمہارا فرض ہے تم بھی اس کا دانت توڑو۔ آنکھ پھوڑے، تمہارا فرض ہے تم بھی آنکھ پھوڑو۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ۔

غرض جیسا عمل کرے، بدلہ لینا واجب ہے۔ معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ معافی نرم خُو لوگوں کے لئے ہوتی ہے۔ جو تُند مزاج ہوں ان کو معافی کارگر نہیں ہوتی۔ وہاں تو بدلہ لینا ہی ضروری ہوتا ہے۔ جبھی وہ سیدھے ہوسکتے ہیں۔ تو شریعت موسوی کے اندر انتقام لینا واجب تھا۔ معاف کرنا جائز نہیں تھا۔ عیسوی شریعت میں اس کا بالکل رد عمل تھا کہ نہ صرف انتقام لینا ہی جائز نہیں، بلکہ معاف کرنا واجب تھا۔

وہاں یہ تھا کہ اگر کپڑے پر نجاست لگ جائے تو کپڑے کا قطع کردینا ضروری تھا۔ یہاں یہ تھا کہ اگر سارا بدن نجاست میں لت پت ہوجائے، دل کو پاک رکھو، عبادت کرتے رہو، بدن چاہے کیسا ہو، اتنی نرمی کی گئی ——— مطلب یہ ہے کہ شرعی احکام حسب مزاجِ اقوام نازل کئے گئے ہیں۔ دین اور اصول سب کے ایک رہے ہیں۔

امّتِ محمدیہ کو اجر و ثواب زیادہ دیا گیا اور عمل کا بار کم ڈالا گیا

جب آخر میں امّتِ مسلمہ آئی تو یہ بوڑھی امّت تھی۔ بوڑھے آدمی کی عقل کے اندر عقل و تجربہ بڑھ جاتا ہے مگر عملی قوت گھٹ جاتی ہے۔ بوڑھے سے عمل ہونا مشکل ہے۔ مگر دماغ اتنا روشن ہوتا ہے کہ نوجوانوں کا فرض ہوتا ہے کہ ان سے مشورہ لیں، ان کی رائے پر عمل کریں۔ وہ زمانے کا سرد اور گرم دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ تو کوئی تجربے کی بات بتائیں گے ——— یہ امّت بوڑھی امت تھی، آخری امّت تھی۔ دنیا کا اختتام اسی امّت کے اوپر تھا۔ گویا یہ عالم بشریت کے بڑھاپے کا دور تھا۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام کے زمانے میں طفولیت کا دور تھا۔ وہاں بچوں کے مناسب احکام تھے۔ یہاں بوڑھوں کے مناسب احکام ہیں ——— بوڑھوں کے لئے یہ ہوتا تھا کہ عمل کا بار تو ان پر کم ڈالتے ہیں مگر تحسین و آفرین زیادہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شادی بیاہ ہو، تو بڑے میاں کو کہتے ہیں کہ آپ کا بڑا کام یہ ہے کہ آپ کھانے کے اوپر بیٹھے نگرانی کرتے رہیں۔ نوجوان کھانا تقسیم کریں گے، بڑے میاں صبح سے شام تک بیٹھے ہوئے ہیں۔ شام کو لوگ کہتے ہیں کہ صاحب بڑے میاں نے بڑا کام کیا، بڑی ہمت کے آدمی ہیں۔ حالانکہ صبح سے شام تک بیٹھے رہے اور بڑے میاں نے کیا کیا؟ مگر کہتے ہیں کہ بڑا کام کیا اور بڑے باہمت ہیں۔ حالانکہ ایک رکابی اٹھا کر انہوں نہیں دی۔ غرض بوڑھوں پر عمل کا بوجھ کم ڈالتے ہیں۔ تحسین اور آفرین زیادہ کرتے ہیں۔ البتہ نوجوانوں پر فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کی رائے پر

چلیں۔ اس لئے کہ ان کی رائے میں وزن ہوتا ہے۔ یہی صورت اس امت کی ہوئی کہ تمام امتوں کے احوال اس کے سامنے تھے۔ تو اس امت کا علم کامل اور تجربہ وسیع ہوا۔ پچھلی امتوں کے سامنے بعض باریک مسئلوں کے احکام نہیں تھے' وہ اسی امت کے بارے میں رائج ہو سکتے تھے اور دنیا کے بارے میں رائج نہیں ہو سکتے تھے' کیونکہ یہ امت جو تھی اس کے سامنے امتِ آدم' امتِ نوح' امتِ موسیٰ' امتِ عیسیٰ علیہم السلام کے احوال کھلے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے ایک ایک چیز روشن کردی۔ احادیثِ نبویہ نے تمام تاریخی چیزیں واضح کردیں۔ گویا یہ اُمتِ سب کے احوال سامنے رکھے ہوئے ہے۔ اس لئے یہ روشن ضمیر ہے اور اس کا علم وسیع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت کے دن اس اُمت کی شہادت سے دنیا کے فیصلے ہوں گے' چونکہ یہ اُمتوں کے احوال کو جانتی تھی' اس لئے جس اُمت کے بارے میں گواہی دے گی کہ یہ باطل پر تھی' وہ عنداللہ بھی باطل پہ سمجھی جائے گی' عذاب وثواب کے سارے معاملات اس امت کی شہادت پر ہوں گے۔ اس لئے کہ جاننے والی امت عالم میں اس کے سوا کوئی نہ ہوگی۔ قرآن حکیم میں فرمایا :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ (بقرہ پ۲ آیت ۱۴۳)

یہ اُمتِ وسط' اُمتِ معتدل بنائی گئی۔ اس کو دنیا کی امتوں کے حق میں گواہ بنایا جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے حق میں گواہ بنیں گے کہ میری امت نے سچ کہا۔ بہرحال اس امت کو علم دیا گیا لیکن عمل کا بار اس پر کم ڈالا گیا۔ جتنے شاق شاق عمل پچھلی امتوں پر اتارے گئے تھے۔ اس پر عُشرِ عشیر اور نصف بھی نہیں ہے۔ بہت ہلکے ہلکے احکام دیئے گئے' مگر اجر زیادہ دیا گیا۔ ایک نیکی کرو گے تو دس نیکیاں ملیں گی اور دس ہی نہیں بلکہ سات سو ملیں گی اور سات سو ہی نہیں بلکہ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ اللہ جس کے لئے چاہے جتنا چاہے اجر بڑھادے۔ تو ایک نیکی دس نیکی کے برابر اور وہ سات سو نیکی کے برابر اور وہ ہزار ہا نیکی کے برابر ـــــ حدیث میں فرمایا :

تصدّقوا ولوبشق تمرة۔

"صدقہ کرو اگرچہ چھوہارے کی گٹھلی صدقہ کی جائے"۔

اس گٹھلی کو حق تعالیٰ پالتے ہیں۔ قیامت میں اس کو جبل اُحد کے برابر کرکے اس کا اجر پیش کیا جائے گا ـــــ لوگ حیران ہوں گے کہ اتنا بڑا اجر ـــــ حق تعالیٰ فرمائیں گے۔ تم نے گٹھلی صدقہ کی۔ تو گٹھلی کا جبل اُحد سے مقابلہ کیا جائے۔ کتنی گٹھلیاں بن سکتی ہیں' اربوں کھربوں بنیں گی۔

امتِ محمدیہ سے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مراعات

مطلب یہ ہے کہ ایک گٹھلی کا اجر کروڑوں گنا زیادہ دیا گیا۔ تو اس امت پر عمل ہلکا رکھا گیا اور اجر زیادہ دیا گیا۔ اگر کوئی ایک نیکی کا ارادہ کرے' ابھی عمل نہیں کیا۔ ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ اگر وہ نیکی کرلی' پھر کئی گنا بڑھادی جاتی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ بدی کے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا کہ آدمی بدی کا ارادہ کرتا' ایک بدی لکھ دی جاتی' مگر نہیں لکھی جاتی۔ ارادے کے بعد اگر بدی سے رُک گیا' تو ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے کہ یہ رکنا بھی ایک مستقل نیکی ہے۔ اگر خدانخواستہ وہ بدی کرلی تو حدیث میں ہے کہ التائب من الذنب کمن لاذنب لہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ اس کا حساب ہی نہیں کیا جائے

گا۔ اگر اس نے توبہ کرلی تو نامۂ اعمال صاف ہے گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں اور اگر توبہ نہ بھی کی آگے وعدہ دیا گیا کہ

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ۔ (ھود: پ ۱۲ ایت ۱۱۴)

تمہاری اگر نیکیاں زیادہ ہیں تو وہ خود تمہاری بدیوں کو مٹادیں گی۔ اس کا تدارک اس طرح سے کردیا۔ انتہائی تسہیل اور سہولت اس امت کو دی گئی ہے کہ عمل کا بار بہت کم ڈالا گیا اور اجر بہت زیادہ دیا گیا۔

پچھلی امتوں کو یہ کہا گیا کہ اگر تم نے نبی کی نافرمانی کی، تم پر عذاب نازل ہو جائے گا۔ قومِ عاد کو ہوا سے تباہ کردیا گیا۔ قومِ ثمود کو حضرت جبریل علیہ السلام کی ایک چنگھاڑ نے تباہ کردیا۔ قومِ شعیب پر آگ برسادی گئی، وہ تہس نہس ہو گئے، قومِ فرعون کو دریائے قلزم میں غرق کردیا گیا۔ تو شدید ترین عذابات آتے تھے۔

اس امت کے بارے میں رحمۃُ اللعالمین کا صدقہ ہے کہ گناہ بھی کررہی ہے، برائیاں بھی کررہی ہے۔ مبتلا بھی ہے لیکن فرمایا گیا

وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ وَمَا کَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۔

اللہ اس امت کو عذاب نہیں دیں گے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہوں اور جب کہ امت میں استغفار کرنے والے موجود ہیں، تو پوری امت کو عذاب میں نہیں مبتلا کیا جائے گا۔

اور آپؐ نے فرمادیا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ میری امت کا استیصال جاہو جائے۔ میری امت میں ہمیشہ ایک جماعتِ حقّہ قائم رہے گی۔ اس امت سے حق کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

لا تجتمع امتی علی الضّلٰلۃ میری امت ساری کی ساری مل کر کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی، فرقے اور پارٹیاں ہوں گی، مُبطِل اور شکوک و شبہات نکالنے والے بھی ہوں گے۔ مگر ایک جماعت حقّہ قائم رہے گی۔ وہی کام کرے گی، جو میں نے کیا۔ وہی باتیں کہے گی، جو میں نے کہیں۔ اعتقاد و عمل کا وہی نقشہ قائم کرے گی جو میں نے کیا۔

لاتزال طائفۃ من امتی منصورین علی الحق لایضرّھم من خذلھم ولا من خالفھم حتیٰ یأتی امراللّٰہ ۔

میری امت میں ہمیشہ ایک طائفہ (حقّہ) موجود رہے گی ___ یہاں طائفہ کا لفظ بولا۔ طائفہ چھوٹی جماعت کو کہتے ہیں۔ یعنی چاہے چھوٹی جماعت ہو مگر حق پر رہے گی اور من جانب اللہ ان کی مدد کی جائے گی۔ کوئی انہیں رُسوا کرنا چاہے گا، نہیں کرسکے گا۔ لوگ ان کی مخالفت کریں گے، مگر وہ حق سے نہیں ہٹے گا اور برابر آگے چلے گا۔

بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃٌ للعالمین کے صدقے اس امّت کو بہت سی سہولتیں دی گئی ہیں۔ نیکیوں میں اجر و ثواب کی، بدیوں میں معافی کی، اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں ہیں۔

وحدتِ دین اور اختلافِ شرائع کا قرآن سے ثبوت

غرض میرا مطلب یہ تھا کہ دین از آدمؑ تا ایں جا ایک ہے۔ آج تک وہی دین ہے، شریعتیں مختلف ہیں۔ تمام انبیاءؑ کا دین ایک ہی رہا۔ یعنی توحیدِ خداوندی، اسی توحید سے پھر سارے اعمال پیدا ہوئے۔ اسی کو فرمایا گیا:

کان دین الانبیاء لا الہ الا اللّٰہ ۔

یعنی دین ایک اور شریعتیں مختلف ' اگر غور کیا جائے تو قرآن کریم میں اس کا اشارہ نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں دین کے بارے میں ارشاد ہے وہاں فرمایا :

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ پ۲۵ آیت ۱۳)

ہم نے جو وصیت حضرت نوح علیہ السلام کو کی تھی۔ وہی وصیت حضور صلی اللہ علیہ و سلم کو کی۔ وہی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام ' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کی کہ دین قائم کرو۔ اس میں تفریق مت ڈالو ___ وہ اوّل سے لے کر آخیر تک ایک تھا۔ شَرَعَ لَكُمْ کے لفظ میں مجموعہ استعمال کیا گیا کہ تم سب کے لئے اللہ نے ایک دین کو مذہب کر دیا دین میں تفریق نہیں ہے۔ (مائدہ پ۶ ایت ۴۸)

اور شریعت کے بارے میں فرمایا : لِكُلٍّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا تم میں سے ہر ایک جماعت اور امّت کے لئے ہم نے شریعتیں اور راستے مختلف بنا دیئے۔ جہاں دین کا لفظ ہے ' وہاں مجموعے کو کہا گیا کہ تمہارے لئے ایک دین ہے اور جہاں شریعتوں کا ذکر ہے وہاں لِكُلٍّ اُمَّةٍ فرمایا ہر ہر طبقہ اور ہر امّت کے لئے فرمایا۔

غرض قرآن کریم سے بالکل تائید ہوتی ہے کہ دین واحد ہے اور شریعتیں مختلف ہیں اور مزاجِ اقوام کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہیں۔

فقہ میں اختلافِ مشرب ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے

اب ظاہر بات ہے کہ یہ شریعت تو ایک ہی ہے۔ کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ' کوئی نئی کتاب آنے والی نہیں ' نئی شریعت آنے والی نہیں۔ ذاتِ نبوی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ و سلم ہیں ' قرآن کریم خاتم الکتب ہے ' شریعتِ اسلام خاتم الشرائع ہے۔ ہر چیز اس دین کی مختتم ' اختتامی اور انتہائی ہے کہ اس کے بعد کوئی نئی چیز آنے والی نہیں ہے۔ مگر اقوام کے مزاج تو مختلف ہیں ' بیشک دین اور شریعت تو ایک ہے لیکن جب یہ دنیا کی مختلف اقوام کے لئے پیغام ہے اور قوموں کے مزاج الگ الگ ہیں۔ یورپین اقوام کا مزاج اور ہے ' ایشین کا اور ' افریقنوں کا اور ___ اور ہم سب کے لئے ایک ہی شریعت ہے۔

اس لئے ضرورت تھی کہ شریعت کے اندر ایسے ائمہ ہدایت پیدا ہوں ' جو مزاج اقوام کے مناسب شریعت کو سمجھائیں۔ ائمہ ہدایت مختلف ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ ' امام شافعیؒ ' امام مالکؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ یہ چار ائمہ تو چاند اور سورج ہیں کہ پورے عالم میں ان کی روشنی پھیلی ہوئی ہے اور بہت سے ائمہ تفقہ ہیں۔ امام بخاریؒ ' حماد بن سلمہؒ ' سفیان ثوریؒ ' سفیان ابن عیینہؒ یہ سب صاحبِ فقہ تھے۔ مگر سب کے فقہ دب گئے اور ان چار ائمہ کے فقہ اوپر آ گئے اور عام طور پر دنیا میں انہیں کو فقہاء مانتے ہیں۔ پوری ترکی ' پورا افغانستان ' ہندوستان کا ایک بڑا حصہ حنفی ہے۔ مغربی ممالک میں اکثریت مالکیوں کی ہے ' نجد میں حنابلہ کی اکثریت ہے اور حجاز و مصر میں شوافع کی اکثریت ہے۔ غرض پوری دنیا انہی چار فقہوں کے اندر گھری ہوئی ہے۔ انہیں چار کا مجموعہ اہلسنّت والجماعت کہلاتا ہے۔ گویا اس وقت اہل السنت والجماعت پوری دنیا میں چھائے ہوئے ہیں۔ انہیں کا مذہب رائج ہے۔

تو انبیاءؑ آ نہیں سکتے تھے۔ نئی کتاب نہیں آ سکتی تھی مگر قرآن کریم کو اللہ نے اتنا جامع بنایا کہ اس کے اندر

فقہیں مختلف نکل آئیں۔ ہر فقہ ہر قوم کے مناسب ہے' ایک فقہ شافعی ہے' جس کو اس سے مناسبت ہو وہ اس پر عمل کرے۔ فقہ حنفی ہے' جس کو اس سے مناسبت ہو وہ اس کا پابند ہو جائے۔ فقہ مالکی ہے' جس کو اس سے مناسبت ہے وہ اس کا تابع ہو جائے۔ اسی طرح فقہ حنبلی ہے ___ غرض ایک شریعتِ اصلی ہے۔ ایک شریعتِ فروعی ہے۔ اصلی شریعت تو ایک ہی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امّت کو مرحمت فرمائی اور شرائع مختلف ہیں یعنی اجتہادی امور میں اختلاف ہے۔ ائمہ سلف و ائمہ ہدایت نے دنیا میں پیش آنے والے واقعات و حوادث کے لئے قرآن وحدیث سے احکام نکالے۔ جو خود ایک مستقل فقہ بن گیا۔ ان فقہوں میں ظاہر ہے کہ مزاجوں کا دخل ہے۔ اس لئے جس مزاج کی قوم ہوگی، اسی فقہ کی طرف چل پڑے گی' جبکہ وہ سب کے سب حق پر ہوں گے اور عند اللہ قبول ہوں گے۔

تصوّف میں اختلافِ مسلک ہے مگر بنیاد سب کی ایک ہے

یہی صورت صوفیاء میں بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ صوفیاء کا جو اصل بنیادی طریقہ ہے' جس کو احسانی سلوک کہتے ہیں' وہ ایک ہی ہے اور وہ قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ قلب کو پاک بناؤ' ذکر اللہ کی کثرت کرو۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ اب قلب کو پاک بنانے کے طریقے کیا ہیں؟ اس میں تجربات ہیں کہ چشتیہ نے اور طریقہ رکھا' نقشبندیہ نے اور طریقہ رکھا' سہروردیہ نے اور طریقہ رکھا۔ یہ درحقیقت قلوب کو مانجھنے کی تدابیر ہیں۔

جب قلوب منجھ گئے' تو آگے ذکر اللہ وہی ہے جو قرآن وحدیث میں ہے۔ ان حضرات نے کوئی ذکر نیا تجویز نہیں کیا۔ وہی اَذکارِ عشرہ ہیں۔ تسبیح' تحمید' تمجید' تہلیل' تکبیر ہے۔ **سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الٰہ الا اللّٰہ' واللّٰہ اکبر ولا وحول ولا قوّۃ الا باللّٰہ العلیّ العظیم** تو حوقلہ' تعوذ' تسمیہ' استغفار اور درود شریف یہ سب کتاب وسنّت میں موجود ہیں۔ تمام طُرق کے حضرات یہی اَذکار بتلاتے ہیں۔ البتہ ان کے طریقے الگ الگ ہیں کہ اس کا دل کدھر چل رہا ہے۔ اس کو مانجھا جائے' مانجھنے کے طریقے الگ ہیں' ریاضات و مجاہدات الگ الگ تجویز کئے۔ مگر و تدبیر کا درجہ ہیں۔ اگر کوئی ان کے خلاف کرے تو یہ نہیں کہ معاذ اللہ وہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اس کو عین دین نہیں کہتے۔ دین کی ایک تدبیر کہتے ہیں۔

بہرحال فقہ میں دیکھو تو مشرب مختلف ہیں۔ تصوّف میں دیکھو تو مشاغل مختلف ہیں۔ فقہ و تصوف میں دیکھو۔ تو علماء کے مسالک مختلف ہیں مگر بنیاد سب کی ایک ہے۔

اِبلاغ و تبلیغ کے طریقے مختلف ہوتے رہے مگر سب کا ماٰخذ ایک رہا

یہی صورت بعینہ دین کے اِبلاغ و تبلیغ میں اب واقع ہوئی۔ دین کو پہنچانا' وہ تو ایک ہی ہے، جیسے آپ پہنچائیں گے ، وہی اَذکار' وہی نماز' وہی روزہ' زکوٰۃ' حج' اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے پہنچانے کے لئے ڈھنگ کیا اختیار کیا جائے؟ کہ کڑوی دوائی کیپسول کے بیچ میں رکھ کے نگلوادی جائے۔ اس میں تدابیر کے طور پر طریقے مختلف ہیں۔ پھر تدابیر کے درجے مختلف ہوتے رہے ہیں۔ لیکن تدبیروں سے جو چیز پہنچائی گئی' وہ ایک ہے۔ اس میں ذرّہ برابر فرق نہیں ہے۔

اب مثلاً مسلمانوں میں ابتدائی دور میں روایت پر زیادہ زور تھا کہ جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت صحیح نہ ہو' لوگ نہیں مانتے تھے۔ اس واسطے اللہ نے محدثین پیدا کئے۔ انہوں نے روایتوں کی چھان

چھین کر کے کھرے کو کھوٹے سے الگ کیا۔ اسماءُ الرجال کا فن ایجاد کیا' جس میں پچاس ہزار آدمیوں کی تاریخیں مرتّب کیں' جو راویانِ حدیث ہیں۔ ان کے خاندان' کیریکٹر' کردار' حافظہ' ضبط اور ان کی عدالت پر تمام چیزیں لکھیں۔ گویا پچاس ہزار آدمیوں کی سوانح عُمری مرتّب کی۔

پھر علم منکراتُ الحدیث مرتّب کیا کہ حدیث کے بھی درجات ہیں۔ قوی' صحیح' ضعیف' متروک' مجہول وغیرہ یہ اصطلاحات مقرر کیں کہ سند متصل ہے تو حدیث مرفوع متصل کہلائے گی۔ اگر بیچ میں منقطع ہو گئی' تو اگر صحابی پر منقطع ہو گئی' تو مرسل کہیں گے' وغیرہ ___ اصطلاحات مقرر کر کے ایک کانٹا اور میزان بنادی کہ حدیث میں غیر حدیث نہ شامل ہو سکے۔ اس میزان پر دیکھ لو۔ کھری چیز الگ ہو جائے گی اور کھوٹ الگ ہو جائے گا۔ تو ابتدائی دور میں زیادہ زور روایت پر تھا۔ تو روایت اور فن تاریخ کے اصول مدوّن کئے گئے۔ روایتی طور پر دین کو نکھار کر کے پیش کر دیا گیا' لوگوں نے قبول کیا۔

پھر ایک زمانہ درایت کا آیا کہ روایتیں تو کتابوں میں جمع ہو گئیں' یکجا ہو گئیں۔ لیکن ان روایتوں سے مسائل اور احکام کا نکالنا' اس میں اجتہاد کی ضرورت تھی۔ یہ دور ائمۂ مجتہدین کا دور تھا۔ تو ائمۂ مجتہدین نے مسائل کا استنباط کیا' یہ معلوم کیا کہ حکمِ نبوی ﷺ کی علّت کیا ہے جس پر یہ حکم دائر ہے۔ اس علّت کو نکالا۔ اس علت میں اختلاف پڑا۔ فرعیات میں اختلاف پڑتا چلا گیا۔ تو مذاہب میں اختلاف پیدا ہوا۔ مگر کُل کے کُل حق پر رہے۔ اس لئے کہ سب کا ماٰخذ کتاب و سنّت ہے۔ یہ دور اجتہاد کا تھا۔ اس میں روایت پر زور نہیں تھا یہ دیکھتے تھے کہ تفقّہ و فقہ کیسا ہے۔ جب تفقہ اور درایت معلوم ہوتی تب لوگ قبول کرتے تھے۔

پھر ایک زمانہ صوفیت پسندیت کا آیا کہ جب تک قرآن و حدیث کو صوفیانہ رنگ میں نہ سمجھاؤ' لوگ سمجھتے نہیں تھے۔ پورے عالم پر صوفیت چھائی تھی۔ امام غزالیؒ' شیخ محی الدین ابن عربیؒ وغیرہ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے قرآن و حدیث کو صوفیانہ رنگ میں سمجھایا ___ بہرحال ڈھنگ بدلتے رہے۔ قرآن و حدیث وہی رہا۔ لیکن سمجھانے کے طریقے الگ الگ ہو گئے۔ فروعات الگ الگ ہو گئیں' مگر ماٰخذ سب کا ایک تھا۔ بنیاد سب کی ایک تھی۔ اس لئے سب کے سب اہل حق تھے۔

اس کے بعد عقل پسندی کا دور آیا کہ عقلیات سے جب تک نہ سمجھاؤ' لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ تو شاہ ولی اللہؒ اور امام غزالیؒ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ انہوں نے دین کو عقلی رنگ میں سمجھایا اور جہاں نقلی دلائل تھے' وہاں عقلی دلائل بھی پیش کئے۔ مگر عقل کو نقل کے تابع رکھا۔ عقل دین کے تابع ہے' دین پر حاکم نہیں ہو سکتی' حاکم دین رہے گا' اس کے خادم کے طور پر عقل بھی چلے گی۔ دین ایک دعویٰ کرے گا' عقل اس کی تائید کر کے اسے ثابت اور واضح کرے گی' خدمت کرنا یہ عقل کا کام ہے۔ اس لئے عقل کو خادم دین بنایا گیا۔ تو یہ دور ایسا تھا کہ جب تک عقلیات سے نہ سمجھاؤ' لوگ نہیں سمجھتے تھے۔

اس کے بعد سائنس کا دور آیا۔ یہاں عقلیات سے زیادہ حسیات ہیں۔ محسوس چیز سے کسی چیز کو سمجھاؤ' تب لوگ سمجھتے ہیں۔ اللہ نے پھر ایسے علماء کرام پیدا کئے' حضرت مولانا گنگوہیؒ' حضرت مولانا نانوتویؒ' ان لوگوں نے محسوسات کے انداز سے دین کو سمجھایا اور حسّی مثالوں سے واضح کیا کہ دین حق ہے۔ گویا دین ایک دعویٰ کرتا ہے' محسوسات اس کی خدمت کرتے ہوئے دلائل مہیا کرتے ہیں۔ جو لوگ منکر تھے' وہ سن کر مجبور ہوئے۔ مثلاً معراج کا مسئلہ تھا۔ تو قدیم فلاسفہ کہتے تھے کہ یہ محال ہے' یہ ممکن نہیں' بالکل صاف انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بیچ میں کرۂ نار ہے وغیرہ۔ اس سے آدمی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا معراج ہو نہیں سکتی ___ اب جب لوگ چاند تک پہنچ گئے اور چاند کی مٹی کھود لائے' اب لوگ معراج کو ماننے پر مجبور ہوئے کہ حسیات

میں ایک نظیر آ گئی، تو خواہ مخواہ مجبور ہیں کہ معراج بھی حق ہے۔ جب مادی وسائل سے آپ چاند تک پہنچ سکتے ہیں، تو روحانی وسائل ان سے کہیں زیادہ قوی ہیں۔ ان سے کیوں نہیں پہنچ سکتے؟ ___ حاصل یہ نکلا کہ دین دعوے کرے اور مغربیت پسند اس کو ثابت کریں تاکہ ان پر حجتیں تمام ہوں اور وہ جھک مار کر ماننے پر مجبور ہوں۔

ہمارے ہاں انور صابری ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں ___ جب یہ لوگ چاند سے لوٹ کر آئے تو اس نے ایک نظم لکھی، اس کا ایک شعر مجھے بھی یاد رہ گیا، وہ کہتا ہے کہ ۔

سفر سے چاند کے لوٹے جو منکرِ معراج
شکست عقل نے کھائی بڑے غرور کے بعد

عقل انکار کرتی تھی۔ اب اُسے جھک مار کے ماننا پڑا۔

ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ بیت اللہ تیار کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اعلان عام کردو۔ لوگو! بیت اللہ بن گیا ہے، آکر حج کرو۔

عرض کیا یا اللہ! میری آواز کیسے پہنچے گی؟

فرمایا تم آواز لگاؤ، ہم پہنچائیں گے۔ تو مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے اعلان کیا کہ اے لوگو! بیت اللہ تیار ہو گیا ہے، حج کرو۔

حدیث میں ہے کہ جن جن کی قسمت میں حج تھا۔ انہوں نے لبیک کہا۔ حتیٰ کہ جو ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے، انہوں نے بھی لبیک کہا اور فرمایا گیا، جس نے جتنی دفعہ لبیک کہا، اتنے ہی حج ان کے لئے مقرّر ہو گئے، دس دفعہ کہا تو دس حج، بیس دفعہ کہا تو بیس حج۔

اس پر لوگ اعتراض کرتے تھے کہ بھلا یہ ہو کیسے سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی آواز مقام ابراہیم سے پوری دنیا میں پہنچ جائے گی؟ لاؤڈ اسپیکر نے سارا مسئلہ حل کر دیا۔ آج لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ایک آدمی بولتا ہے تو مشرق سے مغرب تک سب جگہ آواز پھیل جاتی ہے ___ جب مادی وسائل میں اللہ نے قوت دی ہے کہ ایک آواز پورے عالم میں پھیل جائے۔ تو روحانی وسائل میں یہ طاقت کیوں نہیں ہو سکتی؟ کہ آدمی روحانی قوت سے پورے عالم میں آواز پہنچا دے۔ حقیقت یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی روحانی قوتوں سے وہ سب کام کرتے ہیں، جن کی حسّی مثالیں آج مادی قوتوں سے دی جا رہی ہیں۔ اب امّت کا مزاج اس پر ہو گیا کہ جب تک دین حسّی مثالوں سے نہ سمجھایا جائے، لوگ نہیں سمجھتے۔ اللہ نے ایسے علماء کھڑے کر دیئے کہ حسّی مثالوں سے انہوں نے دین کو سمجھایا۔

تو عقل کا دور آیا تو عقلاء، حِس کا دور آیا تو سائنس دان کھڑے ہو گئے۔ صوفیت کا دور آیا تو متکلّمین کھڑے ہو گئے۔ درایت کا دور ہوا تو فقہاء کھڑے ہو گئے۔ روایت کا دور آیا تو محدّثین کھڑے ہو گئے۔ غرض دین ہر حالت میں چلتا رہا اور ہر شعبے میں نمایاں ہوتا رہا۔

جمہوریت پسندی کے زمانے میں دعوت و تبلیغ جماعتی طور پر مؤثّر ہے

اب یہی صورت تھی کہ دین کو دوسروں تک کس انداز میں پہنچایا جائے، تبلیغ کی جائے تو کس انداز سے کی جائے۔ دعوت دی جائے تو کس انداز سے دی جائے۔ یوں تو علماء دعوت دیتے آرہے تھے اور سلسلۂ دعوت برابر جاری تھا۔ مگر زمانے کے حالات ہوتے ہیں۔ آج کل جمہوریت پسندی کا زمانہ ہے۔ جب تک کسی چیز کو

جماعتی طور پر پیش نہ کیا جائے' لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایک آدمی کتنا ہی ثقہ اور بڑے درجہ کا ہو' وہ کہہ رہا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک آدمی کی بات ہے۔ دو ہوں تو کہتے ہیں کہ خیر اور جب جماعت ہو تو جھک مار کے مجبور ہوتے ہیں کہ جماعت مل کر غلط کیسے کرے گی؟ ___ بہرحال انفرادی طور پر برابر علماء دین پہنچاتے رہے۔ اگر نہ پہنچاتے تو آج مسلمان آپ کے سامنے کہاں سے آتے؟ انہی کی محنتوں کا صدقہ ہے کہ آج ہم فخریہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ستر کروڑ مسلمان ہیں۔ یہ انہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے ___ لیکن دین کے راستے تو بند نہیں۔ آئندہ بھی دین کو پھیلنا ہے۔

جماعت میں مادی اور روحانی قوت ہوتی ہے

اب راستہ یہ آگیا کہ جب تک کوئی کام جماعتی طور پر نہ ہو' لوگ نہیں مانتے ___ مادی چیزوں میں حتیٰ کہ کھیل کود میں بھی ٹیمیں بنتی ہیں۔ ہندوستان کی ہاکی کی ٹیم پاکستان کھیلنے جا رہی ہے اور پاکستان کی ٹیمیں ہندوستان آرہی ہیں۔ وکلاء کو دیکھو تو ان کی ایک ٹیم ہے۔ ججوں کا ایک طبقہ ہے۔ مزدوروں کی ایک جماعت ہے۔ اگر مزدوروں کو کوئی شکایت ہو' ایک آدمی شکایت کرے' کوئی نہیں مانتا۔ لیکن اگر یونین بنالیں تو جھک مار کے مانتے ہیں' ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ تو آج کا دور ہی جماعتی رنگ کا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آج کس قسم کی جمہوریت ہے۔ اسلام نے کس قسم کی جمہوریت پھیلائی ہے' وہ الگ بحث ہے' اس میں ہم پڑنا نہیں چاہتے' مگر بالا جمال یہ ہے کہ جب تک جمہوریت اور جماعتی رنگ پیش نہ ہو' وہ چیز قابل قبول نہیں ہوتی۔ لوگ اس کے اوپر مطمئن نہیں ہوتے' زمانے کے حالات ہیں۔ اب اگر دین پہنچانے ایک آدمی جائے' تو لوگ کہتے ہیں کہ ہاں بھئی! نیک آدمی ہے۔ لیکن اگر جماعت چلی جائے' تو دباؤ پڑتا ہے کہ ہے کچھ بات۔ قرآن نے اس کی اصل بتلائی ہے۔ فرمایا :

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ۔ (یٰس پ۲۲ ایت ۱۳)

"اے پیغمبر! آپ اصحاب قریہ کی مثال بیان کر دیجئے"۔

ایک خاص قریہ اور بستی کے لئے فرمایا گیا کہ آپ مثال بیان کر دیجئے۔ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ جبکہ اللہ کے نبی اس کے اندر ہدایت کرنے کے لئے پہنچے۔ آگے فرمایا :

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ ہم نے اس قریہ میں دو رسول بھیجے کہ جا کے ہدایت کرو' تبلیغ کرو' اللہ کے احکام پہنچاؤ۔

فَكَذَّبُوْهُمَا ان دونوں کو انہوں نے جھٹلا دیا۔ فرماتے ہیں۔ فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ ہم نے انہیں قوت دی اور ایک تیسرے کا اضافہ اور کیا۔

اب جماعتی حیثیت ہو گئی۔ الاثنان او فوقهما جماعة - دو آدمی یا اس سے بڑھ جائیں' تو جماعت کے حکم میں آجاتے ہیں۔ جماعت کا رد کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ فرد واحد کی بات کو آپ رد کر سکتے ہیں کہ شاید یہ شک یا شبہ میں پڑ گیا ہوگا۔ لیکن جب تین چار مل کر کہیں گے اور ایک دوسرے کی تائید کریں گے' پھر یہ وسوسے قطع ہو جاتے ہیں کہ اس سے غلطی ہو گئی ہوگی۔ غلطی ہوتی تو چار مل کر غلطی پر کیسے قائم ہوتے؟ عقلاً و عادۃً محال ہے۔

ظاہر بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں جو تعدد پیدا کیا گیا' وہ اس لئے نہیں کہ ایک نبی کی قوت کافی نہیں۔ انبیاءؑ سارے کے سارے جامع کمالات ہوتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر روحانیت میں کون قوی ہو سکتا

ہے؟ تو جہاں تک قوتِ حق کا جان لینا ہے۔ اس کے لئے ایک نبی بھی کافی ہے ___ پھر یہ ایک کے ساتھ دوسرا کیوں بھیجا گیا؟ ___ عوام کی رعایت کی گئی کہ وہ مان لیں۔ ورنہ فی نفسہٖ ایک نبی بھی کافی ہے ___ مگر جب دو کو بھی جھٹلایا گیا' تو فرمایا **فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ** ہم نے تیسرے کا اور اضافہ کیا۔ اب جماعت بن گئی۔ جماعت کا جھٹلانا انسان کی عقل سے باہر ہوتا ہے۔ کتنا بھی مُعانِد ہو گا مگر جب جماعت کہے گی تو پھر کچھ نہ کچھ سوچنا پڑے گا کہ بھئی کچھ بات سچی معلوم ہوتی ہے۔ سارے آدمی مل کر جمع ہو کر آئے ہیں۔ تو جماعتی حیثیت غالب ہوتی ہے ___ اور ایک حدیث میں بھی ہے کہ **ید اللّٰہ علی الجماعۃ** ۔ اللہ کا ہاتھ جماعت کے سر پر ہوتا ہے۔ یعنی قوتِ خداوندی جماعت کی پُشت پر ہوتی ہے۔ فردِ واحد سے الگ رہ سکتی ہے مگر جماعت کے اوپر ہوتی ہے۔

حتیٰ کہ بعض علماء تو یہاں تک کہتے ہیں' حدیث تو نہیں ہے' تجرباتی بات ہے ___ کہ اگر چالیس مسلمان جمع ہوں' ان میں کوئی نہ کوئی ایک آدھ ضرور مقبول خداوندی ہوتا ہے۔ چالیس آدمی جب آئیں گے تو ایک کی مقبولیت سب میں کام کرے گی اور اس چیز کو مقبول بنادے گی۔ بہرحال تعدّد اور جماعتی رنگ میں ایک برکت کا اثر ہے۔ مادی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی۔ مادی تو یوں کہ جب افراد بڑھ گئے' انکار کی گنجائش نہیں رہی اور روحانی طور پر اس طرح کہ جتنے اہل حق بڑھ جائیں گے' حق ہی کو قوت پہنچے گی۔ حق میں اضافہ ہو گا۔ غرض جماعت ہی ایک ایسی چیز ہے جو مادی طور پر بھی مضبوط ہوتی ہے اور روحانی طور پر بھی مضبوط ہوتی ہے۔

جماعتِ تبلیغ کی برکت سے عمل کا ماحول پیدا ہو گیا

ہمارے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے قلب پر اللہ نے تبلیغ کو ایک فن کی صورت میں القاء فرمایا۔ تبلیغ ہو رہی تھی' علماء دعوتیں بھی دے رہے تھے۔

مولانا کے قلب پر اللہ نے الہام فرمایا اور انہوں نے ایک طریقہ مقرّر کیا' جو اس زمانے میں مؤثر ہو اور اس میں جماعتی رنگ ہو کہ ایک ایک فرد نہ جائے' جماعتیں جائیں' لوگوں کو گھروں سے نکال کر لائیں اور جماعت بناؤ' جماعتی طور پر جب آپ گشت کریں گے اور جماعت ایک زبان ہو کر ایک ہی بات کہے گی' قدرتی طور پر اس کا اثر پڑے گا۔ کوئی مُعانِد ہو' کوئی دشمن ہو نہ مانے' دنیا میں ہر زمانے میں مُعانِد اور دشمن رہے ہیں۔ مگر ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ عقل والوں کا اعتبار ہے۔ عقلمندوں کے سامنے جماعتی حیثیت کبھی نظر انداز ہونے کے قابل نہیں ہوتی۔ تو مولانا کے قلب پر اللہ نے اس طریقے کو القاء فرمایا۔

جب انسان جماعت کے ساتھ چل پڑتا ہے۔ تو گھر میں عمل سے روکنی والی چیز گھر کی آسائشیں اور راحتیں ہی تو ہوتی ہیں۔ گھر میں آرام کرتا ہے تو کبھی نماز چھوٹ گئی' کبھی کوئی عمل چھوٹ گیا۔ لیکن جب گھر سے نکل گیا تو سامانِ راحت ہی منقطع ہو گیا۔ اب سوائے اللہ کے نام کے اور کوئی کام باقی نہیں رہ گیا کہ خواہ مخواہ آدمی اللہ ہی کا نام لے ___ گھر میں نکل کر جب مسجد میں آگیا۔ اب اللہ کا نام نہیں لے گا تو اور کیا کرے گا؟ گویا عمل کرنے اور اللہ کا نام لینے پر مجبور کر دیا۔ تو فقط یہی نہیں کہ دعوت الی اللہ کی جماعتی صورت قائم کی بلکہ ایک عملی صورت بھی قائم کر دی کہ ہر شخص عبادت پر مجبور ہو۔

اس واسطے کہ ماحول کا ایک اثر پڑتا ہے۔ ماحول جب اللہ والوں کا ہوتا ہے' تو آدمی خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بارات کے سلسلہ میں تھانہ بھون گئے تھے۔ ایک

شادی میں شرکت کرنی تھی۔ جیسے بارات والوں کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی بزرگ ہو تو اس سے ملتے جاتے ہیں ___ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون میں موجود تھے۔ باراتیوں نے کہا کہ چلو بھئی! حاجی صاحب سے بھی مل لیں' بزرگ آدمی ہیں۔ مولانا گنگوہیؒ حاضر ہوئے ___ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے مولانا گنگوہیؒ کو فراست باطنی سے پہچان لیا کہ اس شخص کے قلب کے اندر کوئی جوہر موجود ہے ___ خود فرمایا کہ کسی سے مرید بھی ہو؟ انہوں نے کہا نہیں' فرمایا مجھ سے ہی ہو جاؤ۔ یعنی کس تیقن سے فرما رہے ہیں کہ مجھ سے ہی مرید ہو جاؤ ___ انہوں نے کہا کہ مرید ہونے کے لئے میں آیا نہیں۔ میں تو بارات میں آیا ہوں۔ فرمایا' ان دونوں میں کوئی تضاد تھوڑا ہی ہے؟ ٹھیک ہے بارات میں آئے تھے' اب مرید ہو جاؤ۔

انہوں نے کہ میں مرید ہو جاؤں گا تو آپ کہیں گے یہاں رکو اور اللہ اللہ کرو ___ یہ میرے لئے بڑا مشکل ہے۔ میں بچوں کو پالوں گا یا یہاں بیٹھ کر ذکر اللہ میں مشغول رہوں گا۔ فرمایا یہ تو ہم نہیں کہتے کہ تم یہاں ٹھہرو ___ اب حضرت حاجی صاحبؒ بار بار فرما رہے ہیں کہ تم بیعت ہو جاؤ اور مولانا گنگوہیؒ بار بار انکار کر رہے ہیں ___ لیکن بالآخر بیعت ہو گئے۔

اس کے بعد فرمایا کہ بس ایک چالیس دن میرے پاس ٹھہر جاؤ۔ عرض کیا۔ اسی لئے میں بیعت نہیں ہوتا تھا کہ میں نہیں ٹھہر سکتا ___ فرمایا' چلو بیس دن ٹھہر جاؤ۔ انہوں نے کہا میرے پاس بیس دن بھی نہیں ہیں۔ فرمایا' دس دن ہی ٹھہر جاؤ۔ ہوتے ہوتے آخر تین دن پر بات آئی کہ میں تین دن ٹھہر جاؤں گا۔

مجھے سنانا یہ تھا کہ بارات تو رخصت ہو گئی' مولانا گنگوہیؒ آکر تین دن کے لئے خانقاہ میں مقیم ہوئے۔ رات کو جب تین بجے کسی نے تہجد پڑھا۔ کسی نے ذکر اللہ کیا۔ اب بڑے بڑے شرم آئی کہ سارے تو اللہ اللہ کر رہے ہیں اور میں پڑا سوتا ہوں' تو خود بھی اٹھ کر وضو کیا اور چار رکعات پڑھیں ___ اگلے دن ارادہ کیا کہ اب میں نہیں پڑھوں گا' چاہے کوئی اٹھے نہ اٹھے۔ تو سو گئے' جب رات کے تین بجے لوگ اٹھے' تو ارادہ کیا کہ میں نہیں اٹھوں گا' مگر ماحول سے مجبور تھے' اٹھنا پڑا۔ تو کچھ تہجد پڑھا۔ اللہ اللہ بھی کی ___ جب اسی طرح تین دن ہو گئے اور قلب پر اس کا اثر نمایاں ہوا' تو حضرت حاجی صاحبؒ سے عرض کیا۔ حضرت اگر آپ اجازت دیں تو کچھ اور ٹھہر جاؤں؟ فرمایا' ہم نے تو ٹھہرنے کو نہیں کہا تھا۔ تمہاری مرضی ہے۔ پھر دس دن ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ پھر بیس دن۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ چالیس دن یا کتنے دن وہاں ٹھہرے۔ لیکن بہر حال خلافت لے کر وہاں سے واپس ہوئے۔

تو مولانا الیاس صاحبؒ نے جہاں ایک جماعتی رنگ بنایا' وہاں ایک ماحول بھی تیار کیا۔ اس ماحول کے اثر سے آدمی مجبور ہو گا کہ آدمی ذکر اللہ کرے۔

ماحول کا اثر

میں نے اپنی عمر میں تین ماحول دیکھے ہیں۔ ایک دار العلوم دیوبند کا ماحول' ایک گنگوہ کا ماحول اور ایک تھانہ بھون کا ماحول ___ میری عمر آٹھ نو برس کی تھی۔ تو گنگوہ کا ماحول یہ تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ رواں رواں سے اللہ اللہ کی آواز آ رہی ہے۔ ہر ایک سے ذکر اللہ' ہر ایک سے اللہ اللہ۔ اس کا اثر کیا تھا ___؟

گنگوہ میں خانقاہ کے سامنے ایک بہت بڑا تالاب ہے اور شہر کے سارے دھوبی اس میں کپڑے دھوتے ہیں۔ تو ساٹھ ستر دھوبیوں کے کپڑے وہاں رکھے ہوئے ہیں اور بڑے بڑے مٹی کے کنڈے رکھے ہوئے ہیں۔ جس پر وہ کپڑوں پر پانی ڈال کر مارتے ہیں۔ اب دھوبی بے چارے بے پڑھے لکھے جاہل' جو کسی چیز سے واقف

نہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ انہوں نے کپڑا اچھالا اور اس پر مارا' اور ہر ضرب کے ساتھ الا اللہ' الا اللہ۔ سارا تالاب گونج اٹھتا' حالانکہ وہ جاہل اجہل تھے۔ لیکن یہ ماحول کا اثر تھا۔ خانقاہ سے جو ہر وقت اللہ اللہ کی آواز آتی تھی۔ تو دھوبیوں میں بھی وہ اللہ اللہ کی آواز چل پڑی۔ وہ بھی ہر ضرب کے ساتھ الا اللہ کا نعرہ لگاتے تھے۔ یہ تو وہاں کے ماحول کا اثر تھا ___ دار العلوم دیوبند میں یہ دیکھا کہ وہاں بے نماز رہنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہر نماز کے لئے ایک ڈیڑھ ہزار آدمی حجروں سے نکل کر مسجد میں آئے گا' تو کوئی کہاں تک بے نماز رہے گا' خواہ مخواہ شرما شرمی نماز پڑھے گا۔ تو یہاں بے نمازی رہنا بڑا مشکل ہے۔ اتفاقاً کسی کی قضاء ہو جائے' وہ الگ چیز ہے۔ لیکن تارکِ نماز بن جائے' یہ ممکن نہیں۔ یہ ماحول کا اثر ہے' نماز پڑھنے پر مجبور ہے۔

تھانہ بھون کا یہ ماحول تھا کہ معاملات کی سچائی' دیانت اور تقویٰ ___ وہاں ہر طرح کے لوگ مقیم تھے۔ امیر' بھی' غریب بھی۔ کسی حجرے کو ہم نے نہیں دیکھا کہ کوئی تالا لگا کر گیا ہو۔ ایک شخص کو بھی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ وہاں تعلیم یہ ہوتی تھی' دیانت اور تدیّن پر قائم رہو۔ ایک دوسرے کو دوسرے سے تکلیف نہ پہنچے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کی کوئی چیز گر گئی' اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر حفاظت سے رکھو۔ یہیں پڑی رہنے دو۔ ممکن ہے وہ چیز والا آئے اور وہاں سے اٹھا کر لے جائے ___ ایک شخص تولیہ بھول گیا' تین دن تک مسجد کے فرش پر پڑا رہا۔ تیسرے دن وہ آیا اور اپنا تولیہ اٹھا کر لے گیا۔ یہاں دیانت' صفائی اور سچائی معاملات پر زور تھا۔ یہاں کے ماحول میں بددیانت رہنا مشکل تھا۔

دار العلوم کے ماحول میں بے نماز رہنا اور گنگوہ کے ماحول میں رہ کر غافل رہنا مشکل تھا۔ ذکر اللہ کی کچھ نہ کچھ توفیق ہوتی تھی۔ ماحول کا قدرتی اثر ہوتا ہے' جو قلب کے اوپر پڑتا ہے ___ یہ مولانا مرحوم کی فراست باطنی تھی کہ جماعتی حیثیت قائم کر کے ایک ماحول بنایا۔ گھروں سے نکل کر اللہ کے گھر میں لوگ جمع ہوں۔ کوئی چلہ دے گا' کوئی دو چلے دے گا' کوئی دس دن' کوئی بیس دن۔ ایک جگہ جمع ہوں گے' اب جب سارے مل کر ذکر اللہ کریں گے تو ایک آدمی کیسے ان سے غافل رہے گا۔ وہ خواہ مخواہ اللہ کا نام لینے پر مجبور ہو گا۔ تو عمل کا راستہ بھی ڈال دیا' فقط تعلیم و تربیت ہی کا راستہ نہیں' بلکہ عملی راہ بھی ہموار کر دی۔ تو جماعتی حیثیت اس لئے ڈالی تاکہ لوگ اس کو قبول کریں۔ انفرادی بات کم قبول کرتے ہیں اور ماحول اس لئے بنایا کہ جماعت کے لوگوں میں خود دین راسخ ہو' یہ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ جماعت میں جانے والے کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ پہلے بے نماز تھے' اب نمازی بن گئے۔ یہ تھوڑا اثر ہے؟ قدرتی من جانب اللہ اثر ہے۔ جب اس صحبت اور ماحول میں آئے گا' ممکن نہیں کہ آدمی اثر قبول نہ کرے۔

حدیث شریف میں نیک صحبت کی مثال عطار کی دکان سے دی گئی ہے۔ عطار کی دکان سے اگر آپ عطر نہ بھی خریدیں' کم سے کم خوشبو تو آ ہی جائے گی۔ دماغ میں فرحت تو ہو ہی جائے گی ___ اور بری صحبت کی مثال لوہار کی دکان سے دی گئی ہے۔ لوہار کی دکان پر جاؤ گے تو کالک ہی کپڑوں کے اوپر لگ جائے گی۔ کوئی پتنگا ہی آ لگے گا' کپڑا ہی جل جائے گا۔ کچھ نہ کچھ مضرت پہنچے گی۔ تو نیک صحبت سے ہمیشہ پاکیزہ اثرات پھیلتے ہیں اور بری صحبت سے برے اثرات پھیلتے ہیں۔

جماعت میں تربیتِ باطن بھی ہوتی ہے

حضرت مولاناؒ نے نیک صحبت کا ڈھنگ ڈال دیا کہ آدمی خواہ مخواہ ہی نیک بنے۔ ارادہ نہ بھی کرے' تب بھی نیک بننے پر مجبور ہو گا۔ کچھ ذکر اللہ' نماز اور روزے میں لگا' کچھ دیانت پیدا ہوئی' کایا پلٹ گئی۔ اتنے

حالات بدل گئے، تو اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ ___ پھر ایثار اور ایثار کے ساتھ قناعت۔ ان چیزوں کی بھی تعلیم موجود ہے جو تربیتِ باطن ہے۔

اس لئے کہ جب آپ باہر جائیں تو گھر کا سارا سامان تو لے جا نہیں سکتے۔ زُہد کی شان پیدا ہو گئی، پھر جب تک جُڑے رہیں گے، تو ایک دوسرے کی اعانت بھی کریں گے۔ تو ایثار کا جذبہ بھی پیدا ہو گا ___ یہی وجہ ہے کہ جماعت میں خدمت گذاری کا جذبہ، ایثار کا جذبہ، ہر ایک کی خدمت کے لئے کھڑے ہو جانا، یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ جو جماعت کی برکت سے مِن جانب اللہ پیدا ہوتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ایمان دو چیزوں کا نام ہے:۔ **التعظیم لامر اللّٰہ والشفقۃ علی خلق اللّٰہ** اللہ کے اوامر کی تعظیم دل میں بیٹھ جائے اور مخلوق کی خدمت کا جذبہ دل میں پیدا ہو جائے ___ جماعتوں میں نکلنے سے بحمد اللہ، اللہ کی عظمت بھی دل میں بیٹھی ہے اور خدمت خلق کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔ ایک دوسرے کی اخلاص کے ساتھ خدمت گذاری کا جذبہ ابھرتا ہے۔

جو لوگ اپنا خرچ کر کے دنیا کے ملکوں میں جائیں گے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ایثار ہی کر رہے ہیں۔ ایثار کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں اپنے خرچ پہ نکلیں۔ جو اپنا خرچ کرنے پر آمادہ ہے۔ وہ دوسرے کی خدمت سے کیسے گریز کرے گا۔ خود بخود خدمت خلق اللہ کا جذبہ بھی پیدا ہو گا۔

جماعت تبلیغ کی مقبولیت کے آثار

تو اس دور میں اصلاح کا اور طریقہ اس کے سوا نہیں ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ طریقہ مولانا کے قلب مبارک پر وارد کیا اور اس تیس چالیس برس کے اندر اندر جماعتیں پھیلیں۔ دنیا کا کوئی ملک جہاں جہاں ہمارا جانا ہوا، ہم نے نہیں دیکھا کہ جماعتِ تبلیغ وہاں موجود نہ ہو۔ لندن، فرانس، امریکہ اور افریقہ میں جگہ جگہ موجود ہے۔ یہ مِن جانب اللہ مقبولیت کی بات ہے کہ اللہ کا نام لینے والے ہر جگہ پہنچ جائیں اور خدا کے نام کی منادی دیں اور اعلان کریں۔ یہ آثارِ مقبولیت ہیں۔

اور میرا مقصد یہ ہے کہ یہ بنا ڈالنے والے خود مقبولان الٰہی ہیں ___ لوگ کچھ اعتراض کیا کرتے ہیں۔ لیکن بشری کارخانہ کونسا ایسا ہے جس پہ اعتراض نہیں ہوتے۔ مگر میں سب کا جواب ایک ہی دیتا ہوں کہ بھئی! ایک عارف باللہ کے قلب میں یہ چیز مِن جانب اللہ آئی۔ اس واسطے وہ امر خیر ہے۔ اگر یہ کسی لیڈر کے ذہن میں آتی، میں سمجھتا کوئی سیاسی مصلحت ہو گی۔ کسی وطنی آدمی کے ذہن میں آتی، میں سمجھتا کوئی وطنی مصالح ہوں گی۔ لیکن ایک اللہ والے کے دل پر یہ چیز وارد ہوئی۔ اس میں فی الحقیقت خیر ہی خیر ہے۔ اس میں مِن جانب اللہ برکات کے آثار ہیں۔ تو سب جوابوں کا ایک ہی جواب ہے کہ اس سلسلہ کو اہل اللہ نے اٹھایا ہے۔ اس میں ان شاء اللہ خیر ہے۔

جماعتوں کا نکلنا، اس میں لوگوں کی اصلاح ہو جانا۔ یہ خود اس کی ایک دلیل ہے کہ اس کی برکات پھیل رہی ہیں۔ ملکوں کے اندر پھیل رہی ہیں۔

ہم فرانس میں گئے، وہاں پر ظاہر ہے کہ میرا تو کوئی تعارف نہیں تھا۔ ہم پہنچے، ہوائی اڈے پر سینکڑوں آدمی استقبال کے لئے موجود ہیں ___ مجھے حیرت ہوئی کہ میرا تو کوئی تعارف نہیں۔ پہلی دفعہ آنا ہوا ہے۔ بہرحال وہ سمجھے کہ ہمارا ایک خادم آرہا ہے، ہم سب چلے، وہ ہوائی اڈے پر آگئے ___ اب یہ ایثار اور خدمت، یہ جذبۂ خدمت ہی کی بات ہے، ورنہ میں کیا چیز تھا۔ ایک معمولی آدمی، میری کوئی حیثیت نہیں۔ مگر

محبت میں یہ سب آ گئے۔ جگہ جگہ یہی دیکھا۔

اب انہوں نے کہا کہ تقریر بھی کرو۔ ایک جلسہ بھی منعقد کیا۔ وہاں سارے عرب تھے۔ میں نے کہا کہ مجھ سے تو عربی بولنے کی قدرت نہیں ہے۔ کتابوں میں پڑھی تھی، مگر بولنے کا تعلق تو مشق سے ہے، کتاب سے نہیں ہے۔ میں نے کہا اردو میں تقریر کروں گا، کوئی صاحب بعد میں عربی میں ترجمہ کریں۔ مگر وہاں کے عربوں نے کہا ہم عربی میں تقریر سنیں گے، چاہے پانچ ہی منٹ ہو، تو صاحب! وہاں پھر عربی میں تقریر بھی کی۔ پندرہ بیس منٹ ٹوٹی پھوٹی جو سمجھ میں آئی، وہ کر دی۔ بہرحال ہر جگہ امریکہ وغیرہ میں یہی دیکھا۔ ہر جگہ جماعت موجود۔ بغیر مقبولیت من جانب اللہ کے یہ چیز پیدا نہیں ہو سکتی کہ قلوب پر الگ اثرات ہیں، عمومیت الگ ہے، ملکوں میں پھیل جانا الگ ہے۔ یہ ساری چیزیں اس کی دلیل ہیں کہ اللہ کی طرف سے یہ سلسلہ اتارا گیا اور یہ مقبول خداوندی بھی ہے ___

برما میں جب جانا ہوا تو میں نے دو ہی چیزوں پر زور دیا۔ ایک تو یہ کہ بقدر ضرورت تعلیم دو تاکہ مسائل معلوم ہوں۔ سب کا عالم بننا ضروری نہیں۔ جزوی طور پر عالم ہونا فرض کفایہ ہے۔ اگر ہزاروں میں سے ایک بھی بن گیا، پوری جماعت کا فرض ادا ہو گیا۔ لیکن دیندار بننا ہر ایک پر فرض ہے اور دیندار کے لئے کچھ ابتدائی مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اس واسطے ابتدائی تعلیم اور اس کے ساتھ پھر سلسلہ تبلیغ کے اندر لگو۔ اس سے تمہارے قلوب کی بھی اصلاح ہو گی، اعمال کی بھی اصلاح ہو گی اور دین بھی پھیلے گا۔ اس کی اشاعت ہو گی۔

بحمد اللہ جماعت کے اثرات وہاں محدود نہیں، بلکہ پھیل رہے ہیں اور پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔

تبلیغِ دین میں جماعتی حیثیت کا رد کرنا مشکل ہوتا ہے

تو آیت میں نے یہ پڑھی تھی کہ ___ ہم نے رسول بھیجے۔ دو کو انہوں نے جھٹلا دیا تو ہم نے تیسرے کا اضافہ کیا۔ یہ جماعتی صورت پیدا ہو گئی۔ جماعتی حیثیت کا ٹھکرانا بڑا مشکل ہو گا۔ ماننا نہ ماننا، عمل کرنا نہ کرنا تو لوگوں کے اختیار میں ہے۔ لیکن عقلی طور پر اس کو کوئی رد کرے، یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک جماعتی آواز ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ رد کی جاسکے۔

بحمد اللہ یہ اللہ تعالیٰ نے جماعت کو توفیق دی اور جماعت کے ساتھ جو بھی وابستہ ہوا، ان کو توفیق دی اور اس توفیق سے بڑا کام ہوا۔

تعلیم و تبلیغ کا باہمی تقابل نہیں ہے

میں تو کہا کرتا ہوں کہ یہ جماعت اس وقت ہمارے لئے آبرو ہے۔ اگر کوئی ہم سے کہے کہ بھائی! تم نے تبلیغ کیوں نہیں کی؟ ___ ہم کہیں گے کہ ہماری جماعت تبلیغ کر رہی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کوئی جماعت تعلیم میں لگی ہوئی ہے، کوئی تبلیغ میں لگی ہوئی ہے۔ یہ تقسیم عمل ہے، تقسیم عمل سے عمل دو نہیں ہوتے، بنیاد سب کی ایک ہوتی ہے۔ اب دارالعلوم میں ایک جماعت منتظمین کی ہے، وہ درس نہیں دے سکتی۔ مدرسین کی جماعت انتظام نہیں کر سکتی۔ یہ دونوں مدِ مقابل تھوڑا ہی ہیں۔ جو جماعت انتظام کر رہی ہے، وہ مدرسین کو تقویت پہنچا رہی ہے۔ جو درس دے رہے ہیں وہ منتظمین کو تقویت پہنچا رہے ہیں، تو جو جماعت تبلیغ کر رہی

ہے، وہ جماعت تعلیم کو تقویت پہنچا رہی ہے، میں نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خود ان کا مقولہ سنا، ان کی شان عجیب تھی، فرمایا :

"بھائی! یہ سلسلہ میں نے اس لئے جاری کیا ہے کہ مدرسوں کو طالب **علم ملیں** اور مشائخ کو مرید ملیں"۔

اس واسطے یہ سلسلہ جاری کیا ہے تاکہ علم بھی پھیلے اور اخلاق بھی درست ہوں۔

اور مولانا مرحوم اس حد تک تھے کہ جب یہ کام ابتدائی شروع ہوا، تو ہر چھ مہینے کے بعد دہلی میں گزارتے تھے۔ کچھ دارالعلوم دیوبند میں، کچھ مظاہر العلوم میں ___ اور غایت تواضع سے فرماتے کہ :

بھائی اتنا کام تو میں نے کرلیا۔ اب بتاؤ آگے کیا کروں؟

حالانکہ وہ خود ہی جاننے والے تھے۔ ان کے قلب پر یہ چیز وارد ہوئی تھی۔ لیکن تواضع کی انتہاء تھی کہ دوسروں سے پوچھتے، حتیٰ کہ ہم جیسے چھوٹوں سے کہتے کہ بھئی! اب آگے مجھے کیا کرنا چاہئے۔

ہم نے عرض کیا کہ حضرت آپ پوچھ رہے ہیں۔ آپ تو خود دوسروں کے لئے راہنما ہیں۔ مگر یہ کمال تواضع تھا کہ سب کچھ کر کے بھی سمجھتے تھے کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور چھوٹوں سے مشورہ لیتے تھے۔ یہ ان کی شان تھی۔

ایک اللہ والے کے اخلاص نے پوری دُنیا کو متحرّک کردیا

اور ایک دُھن تھی اور ایسی دُھن تھی کہ کسی کو کھانے کی اور سونے کی نہیں ہو سکتی ___ وہی دُھن اللہ کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔ وہی دُھن اور جذبہ ہے کہ جماعت آج تک حرکت میں ہے۔ ایک اللہ والے کے قلب کے اخلاص نے سب کو متحرّک بنا رکھا ہے۔

بہرحال جماعت بھی مبارک ہے، اس کا کام بھی مبارک ہے اور جتنا زیادہ کیا جائے، جتنی اس میں شرکت زیادہ ہو، وہ انشاء اللہ باعثِ خیر و برکت ہوگی۔ جتنا وقت ہے دو۔ چلّہ لگاؤ، دو چلّے لگاؤ، وہ انشاء اللہ خیر ہی خیر پائیں گے۔ کوئی برائی اور شر نہیں ہوگی۔ دین بھی درست ہوگا اور دنیا بھی انشاء اللہ درست ہوگی۔

بس یہ چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں۔

اللّٰھم صل علیٰ سیّدنا ومولانا محمد والہ واصحابہ وبارک وسلّم

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین ۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

تبلیغی جماعت اور اصلاح

اصلاحِ نفس کے چار جز اور طریقے ہیں اور تبلیغ کے اندر حسن اتفاق سے چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں۔ صحبت صالح بھی ہے۔ ذکر و فکر بھی ہے۔ مؤاخاۃ فی اللہ بھی ہے (دشمن سے عبرت و موعظت بھی) اور محاسبۂ نفس بھی ہے اور انہی چاروں کے مجموعہ کا نام تبلیغی جماعت ہے۔ عام لوگوں کے لئے اصلاح نفس کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اس طریق کار سے دین عام ہوتا جا رہا ہے اور ہر ملک کے اندر یہ صدا پہنچتی جا رہی ہے۔ اس کے ذریعے لوگوں کے عقائد درست ہو رہے ہیں۔ لوگ تیزی سے اعمال کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

از حضرت حکیم الاسلام مدظلہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ———

صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا ۝ [1] اَمَّا بَعْدُ ———

تمہید

بزرگانِ محترم!

اس وقت تبلیغی سلسلے کے چند مقاصد آپ حضرات سے گزارش کرنے ہیں، وہ مقاصد اور باتیں کوئی نئی نہیں ہوں گی، ہاں عنوان کا فرق ہو گا، میں چاہتا ہوں کہ ان مقاصد سے پہلے بطور تمہید ایک اصول عرض کر دوں، یہ اصول سمجھ میں آجانے کے بعد مقاصد خود بخود سمجھ میں آجائیں گے ___

اصول یہ ہے کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اضداد بنایا ہے، ہر اصل کے مقابلے میں اس کی ایک ضد رکھی ہے اور ہر اصل کا تصادم اپنی ضد سے برابر ہوتا رہتا ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے مقابلے میں کفر ہے، توحید کے مقابلے میں شرک ہے، اخلاص کے مقابلے میں نفاق ہے، سچ کے مقابلے میں جھوٹ ہے، ظلمت

---

[1] عالمی تبلیغی اجتماع سہارنپور منعقدہ ۷۔۱۹۶۷ء بروز شنبہ بعد مغرب اسلامیہ انٹر کالج میں بیان ہوا۔

کے مقابلے میں نور ہے، دن کے مقابلے میں رات ہے۔ اسی طرح دنیا کے اندر خیر و شر، بھلائی اور برائی بھی ملی جلی چل رہی ہیں۔ اس دنیا کو نہ صرف خیر کا عالم کہہ سکتے ہیں اور نہ صرف شر کا، خیر محض اور راحتِ محض یہ عالمِ جنت ہے۔ تکلیفِ محض اور برائی محض یہ جہنم کا عالم ہے۔ اس دنیا کو جنت و جہنم دونوں سے مرکب کر کے بنایا گیا ہے۔ اس لئے یہاں خیر و شر دونوں ہی کے آثار موجود ہیں۔

ایک غور طلب حقیقت

غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شر و برائی اس عالم میں اصلی ہے اور یہ خود بخود چیزوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے، مگر بھلائی محنت کر کے لانی پڑتی ہے، تجربہ اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ آدمی محنت کرتا ہے بھلائی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر محنت نہیں کرتا تو برائی خود بخود اُبھر کر سامنے آجاتی ہے مثال کے طور پر کھانا ہے اس کو خوش رنگ، خوشبودار اور خوش ذائقہ باقی رکھنے کے لئے نعمت خانہ بنوانا پڑتا ہے اسے ہوادار کمرے میں رکھنا پڑتا ہے، تب کہیں کھانا اپنی خوبیوں کے ساتھ باقی رہتا ہے، لیکن اگر یہ محنت نہ کی جائے تو کھانا خود بخود سڑ جائے گا، خراب ہو جائے گا۔ اس کے اندر بدبو پیدا کرنے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اسی طرح ایک باغ ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ وہ سرسبز ہو، چمن بندی ہوئی ہو، پھول کھلے ہوئے ہوں۔ اس کا منظر نگاہوں کو اچھا معلوم ہوتا ہو، دیکھنے سے آنکھوں میں تراوٹ پیدا ہوتی ہو، سونگھنے سے ناک میں خوشبو آتی ہو، مگر یہ ساری خوبیاں اس وقت پیدا ہوں گی جب کہ آپ مالی رکھیں گے، مالی رکھیں گے اور وہ برابر باغ کی دیکھ بھال کرتے رہیں، درختوں کی جڑوں کو صاف کریں، اس کو پانی دیں، جہاں مناسب سمجھیں کتر بیونت کریں۔ لیکن اگر آپ باغ کو جھاڑ جھنکاڑ بنانا چاہیں تو اس کے لئے آپ کو نہ تو کسی مالی رکھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی مالی و موالی رکھنے کی ضرورت ـــــ بس بنانے کی محنت چھوڑ دیجئے تو خود بخود ہی چند دنوں میں باغ کی ساری سرسبزی و شادابی ختم ہو جائے گی۔

ایسے ہی مکان ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ صاف ہو، ستھرا ہو، خوش رنگ ہو، دیدہ زیب ہو، ڈیزائن اچھا ہو، ان سب کے لئے آپ کو محنت کرنی پڑے گی، ماہر و تجربہ کار معمار لانے پڑیں گے، پھر مکان بن جانے کے بعد فراش رکھنا ہوگا جو برابر اس کو جھاڑتا پونچھتا رہے تب جا کر یہ خوبیاں برقرار رہیں گی، لیکن اگر آپ مکان کو ویران بنانا چاہیں، اسے اجاڑنا چاہیں تو کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، اس کے صحیح رکھنے پر آپ جو محنت صرف کر رہے تھے اسے چھوڑ دیجئے چند دن کے بعد گرد آئے گی پھر پلاستر اکھڑے گا، پھر اینٹیں جھڑیں گی، پھر چھت گرے گی، پھر دیواریں آپڑیں گی اور اس طرح مکان کھنڈر ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ برائی اور شر کائنات کی ہر ہر چیز کی ذات کے اندر موجود ہے، انسان محنت کرتا ہے تو خیر آجاتی ہے، نہیں کرتا تو شر خود بخود ابھر آتا ہے۔ یہ اس عالم کا ایک طرز ہے اور سنت اللہ اسی طرح جاری ہے چونکہ اس عالم کا ایک بڑا فرد انسان بھی ہے لہٰذا اس کے لئے بھی اس اصول اور اس قاعدہ سے جدا ہونا ممکن نہیں، چنانچہ بلا تکلف یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ برائی ہر انسان کی ذات میں موجود ہوتی ہے اور بھلائی لانی پڑتی ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے، آپ اس کی تربیت کرتے ہیں، تعلیم دیتے ہیں تب جا کر وہ انسان بنتا ہے اور اگر آپ یہ محنت نہ کریں، تو اس کے اندر جو برائیاں ہیں ان کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوگی، خوبیاں پیدا کرنے کے لئے، عالم بنانے کے لئے سینکڑوں ادارے ہیں، مدرسے ہیں، مگر کیا جاہل بنانے کے لئے بھی آپ نے کوئی مدرسہ دیکھا؟ ـــــ جاہل تو انسان بنا بنایا پیدا ہوا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تبارک

وتعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۔ (نحل پ ۱۴ آیت ۷۸)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حالت میں نکالا کہ تم ذرہ برابر علم نہیں رکھتے تھے اور پھر تمہارے اندر سننے کی طاقت رکھ دی تاکہ سن سن کر علم حاصل کرو' دیکھنے کی طاقت رکھ دی تاکہ دیکھ دیکھ کر علم حاصل کرو' تدبّر و تفکر کی قوت رکھ دی تاکہ اس کے ذریعہ معلومات میں اضافہ کرو۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان میں علم کی استعداد اور صلاحیت تو رکھتے ہیں' مگر کوئی ماں کے پیٹ سے علم وہنر لے کر نہیں آتا۔

یہ تو انسان کے علم کا حال ہے اور جہاں تک عمل کا تعلق ہے' اس سلسلے میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں موجود ہے :

وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ ۔ (یوسف پ ۱۳ آیت ۵۳)

میں اپنے نفس کی برأت نہیں کرتا اس وجہ سے کہ نفس تو برائی کا ہی حکم دیتا ہے' معلوم ہوا کہ نفسِ انسانی میں ذاتی طور پر شر موجود ہے اس لئے وہ انسان کو برے اعمال ہی کی طرف لے جائے گا۔ آپ اس کی تربیت کریں گے تو بن جائے گا اور بھلائی کی طرف آجائے گا ورنہ برائی پیدا ہونے اور اس کی تربیت کے لئے کسی کالج اور مدرسہ کی ضرورت نہیں ہوگی' خوب کہا ہے کہ کسی شاعر نے کہ ؎

قرنہا باید کہ تا یک سنگ خار از آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

یعنی ایک پتھر کا بے قیمت ٹکڑا جب سالہا سال اور قرن ہا قرن دھوپ میں پڑا رہتا ہے' آفتاب کی تپش اور اس کی گرمی کو برداشت کرتا ہے تب جا کے ایک باقیمت لعل بنتا ہے ؎

ماہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ بعد کشت
جامہ گردد شاہدے را یا شہیدے را کفن

ایک بنولے کا دانہ محبوب کے بدن کے زینت بنے اس کے لئے مہینوں کی مدّت درکار ہوتی ہے' آدمی زمین پر محنت کرتا ہے اس میں ہل چلاتا ہے' اسے کھیتی کے قابل بناتا ہے پھر بیج کو زمین بوس کر دیتا ہے' اس کے بعد اس سے کونپل نکلتی ہے' درخت بنتا ہے' روئی بنتی ہے' اسے توڑلیا جاتا ہے' پھر مل میں بھیجا جاتا ہے' اس کی دھنائی ہوتی ہے' صفائی ہوتی ہے' سوت بنتا ہے پھر کپڑا تیار ہوتا ہے اور پھر درزی اس کی قطع و برید کرتا ہے' ان تمام مراحل سے گزر کر پھر کسی محبوب کا جامہ بنتا ہے' ورنہ تو بنولے کی کوئی قیمت نہیں تھی' زیادہ سے زیادہ کسی بھینس کے منہ میں چلا جاتا۔

آگے کہا ہے کہ ؎

سالہا باید کہ تا یک کود کے از درس علم
عالمے گردد نکو یا شاعر شیریں سخن

یعنی ایک نادان اور چھوٹا بچہ جب سالہا سال کسی مکتب اور مدرسے میں پڑھتا ہے' استاذ کی مار اور سختیاں

برداشت کرتا ہے اس کے بعد جاکر یا وہ عالم بنتا ہے یا شاعر

تو عالم بنانے اور خوش اخلاق بنانے کے لئے سالہاسال کی مدّت درکار ہوتی ہے' مدرسے قائم کئے جاتے ہیں' معلمین وملازمین رکھنے پڑتے ہیں' تب جاکے آدمی' آدمی بنتا ہے' لیکن جاہل وبد اخلاق بنانے کے لئے نہ تو کہیں مدرسہ قائم کیا جاتا ہے اور نہ کوئی ادارہ۔

حاصل یہ کہ کسی چیز کو قیمتی بنانے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے' محنت کی ضرورت پڑتی ہے مگر بے قیمت بنانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

انسان کی قدر وقیمت اوصاف سے ہے

آپ جانتے ہیں کہ اللہ میں بالذّات خوبیاں ہیں' کمالات ہیں اور مخلوق میں ذاتی طور پر خوبی وکمال نام کی کوئی چیز نہیں اور یہ بھی مسلّمہ قاعدہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی قدر وقیمت اوصاف سے ہوتی ہے' جس شئ کے اندر اوصاف زیادہ ہوں گے' اس کی اسی قدر توقیر ہوگی' عزت ہوگی اور اسی اعتبار سے اسے بلند مرتبہ اور مقام حاصل ہوگا' ایک شخص عالم ہے اس کی آپ عزت کرتے ہیں اس کے علم کی وجہ سے اور اگر وہی آپ کا استاذ بھی ہو تو عزت کا ایک درجہ بڑھ جائے گا اور اتفاق سے وہی آپ کا حاکم بھی ہو تو اس کی عزت کا ایک درجہ اور بڑھ جائے گا۔

حاصل یہ کہ انسان کے اندر جس قدر اوصاف بڑھتے جائیں گے' اس کی قدر وقیمت اور عزت و وقار میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ بالذّات انسان میں کوئی کمال نہیں' کمال ایک عارضی شئ ہے' جو محنت کرکے لایا جاتا ہے' یہی وجہ ہے کہ آپ بچے کی تربیت کرتے ہیں' تعلیم دیتے ہیں اور اگر وہ تعلیم سے جی چراتا ہے تو لالچ دلاتے ہیں' اس لئے کہ آپ چاہتے ہیں کہ بچہ کسی ہنر اور کمال کا مالک بن جائے۔

بہرحال اتنا تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اس دنیا میں ہر چیز کی قدر وقیمت اس کے اوصاف سے ہوتی ہے حضرات انبیاءؑ کی ذات بلاشبہ مقدس ہے اور ان میں بھی سیّد الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدّس بابرکات تو حد درجہ متبرک ومقدس ہے' لیکن یہ سارے کا سارا تقدّس نبوت ورسالت ہی کی وجہ سے ہے اور اسی منصبِ رسالت کی وجہ سے آپ واجب الاطاعت ہیں' یہی وجہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ لوگو! اگر میں حکمِ شرعی بیان کروں تو اس کا ماننا لازمی اور ضروری ہے لیکن اگر ذاتی مشورہ دوں تو اس کا ماننا ضروری نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر مسلمان کے قلب میں آپؐ کی حد درجہ محبت ہے اس کی وجہ سے وہ آپؐ کے اشارے کو بھی حکم سمجھے اور ماننے کے لئے تیار ہو جائے' مگر جہاں تک قانون کی بات تھی وہ آپ نے بیان فرمادی۔

آپؐ نے حضرت بریرہؓ جو حضرت عائشہ صدّیقہؓ کی باندی تھیں ان کا نکاح حضرت مغیثؓ سے کردیا' حضرت بریرہؓ نہایت ہی خوبصورت اور حضرت مغیثؓ بالکل معمولی شکل کے آدمی تھے' جس کی وجہ سے ان دونوں میں بنتی نہیں تھی' آئے دن لڑائی جھگڑے کا بازار گرم رہتا' حتیٰ کہ حضرت عائشہ صدّیقہؓ نے بریرہؓ کو آزاد کردیا اور مسئلہ شرعی یہ ہے کہ باندی جب آزاد ہو جائے تو نکاح کا باقی رکھنا نہ رکھنا اس کے ہاتھ میں ہو جاتا ہے' حضرت بریرہؓ نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے فائدہ اٹھانا چاہئے چنانچہ انہوں نے نکاح کے فسخ کرنے ارادہ کرلیا ___ حضرت مغیثؓ حضرت بریرہؓ پر سو جان سے عاشق تھے۔ جب انہیں بریرہ کے ارادے کی خبر ہوئی تو روایتوں میں آتا ہے کہ یہ مدینہ کی گلیوں میں بے چین وبے قرار پھر رہے تھے اسی بے چینی کی حالت میں

خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے بریرہؓ سے نکاح کرایا تھا اور اب آپ ہی اسے باقی رکھیئے، چنانچہ حضرت بریرہؓ کو بلایا گیا۔ آپؐ نے حضرت مغیث کی جانب سے سفارش فرمائی اور بریرہؓ کو طرح طرح سے سمجھایا اور کہا کہ نکاح باقی رکھو فسخ مت کرو، بریرہؓ بھی تھیں بڑی ہوشیار، انہوں نے فوراً پوچھا، یا رسول اللہ! یہ حکم شرعی ہے کہ یا آپ کا ذاتی مشورہ؟ ــــ آپ نے فرمایا کہ یہ میرا ذاتی مشورہ ہے۔ حضرت بریرہؓ کہتی ہیں ــــ پھر تو میں نہیں قبول کرتی، چنانچہ آپؐ نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ذاتی طور پر اگر حضرات انبیاء بھی کوئی بات کہیں تو اس کا ماننا بھی ضروری نہیں ہے، یوں محبت وعقیدت کی لائن سے آپ جو کچھ بھی سمجھ لیں۔ تو جب حضرات انبیاءؑ کے یہ درجات ہیں تو پھر ہماری آپ کی کیا حیثیت ہے اور ہم اور آپ کس شمار میں آئیں گے؟

حقیقتِ آدمیّت

اس کا حاصل یہ نکلا کہ جب انسان کے اندر اوصاف وکمال جمع ہو جائیں وہ علم وفضل کا مالک بن جائے تو اس کی توقیر ہوتی ہے، عزت ہوتی ہے۔

بہرحال میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اس دنیا میں برائی اصل ہے اس کو بروئے کار لانے کے لئے کسی محنت کی ضرورت نہیں ہوتی اور بھلائی لائی جاتی ہے اس کے لئے محنت کرنی ہوتی ہے، مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے ورنہ نہ تعلیم گاہیں ہوتیں نہ خانقاہیں اور نہ اس طرح کے تبلیغی اجتماعات ہوتے، تعلیم کی حاجت ہونا یہ دلالت ہے کہ آدمی اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ نہیں بلکہ اس کو گھڑ گھڑ کر انسان بنایا جاتا ہے، آدمی پیدا ہوتا ہے مگر آدمیت بنائی جاتی ہے، آدمی کی صورت کا نام انسان نہیں بلکہ وہ تو سیرت اور اخلاق کے مجموعہ کا نام ہے، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ــــ

گر بصورت آدمی انساں بُدے
احمد و بوجہل ہم یکساں بُدے

اگر آدمی کی صورت ہی کا نام انسان ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل میں کوئی فرق نہ ہوتا، صورت تو دونوں کی یکساں ہی تھی اس سے معلوم ہوا کہ انسانیت دراصل آتی ہے سیرت سے، اخلاق سے اگر صورت اچھی ہوئی لیکن باطن خراب ہے یا ظاہر درست ہے لیکن اندر ناقص اور نکما تو اس سے کوئی بات پیدا نہ ہوگی، بلکہ یہ صورتِ حال عیب ہے ہنر نہیں اور اسی طرح باطن کے خراب رہتے ہوئے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی جدوجہد بالکل ایسی ہے جیسا کہ نجاست کے اوپر چاندی کا ورق لگا دیا جائے اس طرح نجاست کا پاک ہونا تو درکنار ورق بھی ناپاک اور ناقابلِ استعمال ہو جائیں گے، اسی طرح اگر کوئی بہترین لباس پہن لے مگر دل میں گندگی بھری ہو تو لباس کی وجہ سے وہ نہ تو واجب الاحترام ہوگا اور نہ اس کے کمال میں کسی طرح کا اضافہ ہوگا۔

ارسطو مشہور حکیم اور فلسفی گزرا ہے، رات دن جڑی بوٹیوں کی تلاش میں رہتا اور ان کا امتحان لیا کرتا تھا وہ اپنے کام میں اتنا مشغول رہتا کہ اسے نہ دن کی خبر ہوتی اور نہ رات کی ــــ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے دن کا تھکا ہارا راستہ پر سو گیا، اتفاق سے اسی دن بادشاہ کی سواری نکلی ہوئی تھی، آگے آگے نقیب وچوبدار ہٹو بچو، ہٹو بچو کی صدائیں لگاتے آرہے تھے مگر یہ نیند میں اس طرح مست کہ اسے کچھ بھی خبر نہیں پڑا سوتا رہا، ان بیچاروں کو کسی قسم کی فکر نہیں ہوا کرتی ہے، بادشاہ کی سواری کا گزر اس کے پاس سے ہوا، اسے اس طرح

سوتے دیکھ چلتے چلتے بادشاہ نے غصہ میں ایک ٹھوکر ماری اِس پر اس نے کہا "بے ادب" بادشاہ نے کہا کہ گستاخ! تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں ارسطو نے جواب دیتے ہوئے کہا غالبا آپ جنگل کے درندے معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ وہی ٹھوکر مارتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ بادشاہ کو اس کے اس گستاخانہ کلام کو سن کر اور بھی غصہ آیا اس نے کہا بدتمیز! میرے پاس خزانہ ہے' فوجیں ہیں' قلعہ ہے' تخت و تاج ہے پھر بھی تو مجھ سے یہ گستاخانہ انداز اختیار کئے ہوئے ہے' ارسطو نے کہا کہ یہ ساری چیزیں تو باہر کی ہیں تیرے اندر میں کون سی چیز' کون سی خوبی اور کون سا کمال ہے۔ تو یقین رکھ کہ جس دن تیرے اوپر سے یہ قباشاہی اتر جائے گی تو ذلیل ہو جائے گا' تیرا کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔ آدمی کو فخر اپنے اندر کی چیز پر کرنا چاہئے جب تیرے اندر کوئی کمال نہیں ہے تو تو کپڑوں اور تخت و تاج سے باکمال نہیں بن جائے گا۔ یہ قباشاہی چھوڑ اور ایک لنگی باندھ ___ پھر ہم دونوں دریا میں کودیں جب معلوم ہو گا کہ تم کون ہو اور میں کون ہوں تیرے اندر کیا کمال ہے ___ اور میرے اندر کیا کمال ہے۔

حاصل یہ کہ آدمی صورت انسانی کا نام نہیں اور نہ اس کی وجہ سے آدمی باعزت اور باکمال بنتا ہے اسی طرح لباس' وہ انسان کے باہر کی چیز ہے اور دولت تو اس سے بھی باہر ہوتی ہے لہٰذا ان چیزوں کی وجہ سے باکمال ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا' سرچشمۂ کمال تو خدا ہی کی ذات ہے اور ہمارے اندر جو کمال آئے گا وہ وہیں سے آئے گا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارا قُرب ہو بارگاہ خداوندی سے اور ظاہر ہے کہ قُرب حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی' پھر جس قدر جدوجہد بڑھے گی قُرب بڑھے گا اور جس قدر قُرب بڑھتا جائے گا کمال آتا چلا جائے گا اور جتنا بُعد ہو گا کمال کے اندر کمی پیدا ہوتی جائے گی۔

کمالاتِ انسانی

انسان کے دو کمال ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کا علمی کمال اور دوسرا عملی کمال' علمی کمال پیدا کرنے کے لئے مکاتب ہیں' مدارس ہیں' یونیورسٹیاں ہیں اور عملی کمال پیدا کرنے کے بھی مختلف طریقے ہیں اور مختلف ذرائع ہیں' امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں عملی کمال پیدا کرنے کے چار طریقے لکھے ہیں۔

صحبتِ اہل اللہ

اول یہ کہ اہل اللہ کی صحبت میں رہا جائے' ان حضرات کی جتنی ہی زیادہ صحبت نصیب ہو گی' اتنا ہی ان کا رنگ قلب کے اندر اترتا چلا جائے گا' مثل مشہور ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے' صحبت نیک سے آدمی کے اندر خیر پیدا ہوتی ہے' خوبی پیدا ہوتی ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

مثل الجليس الصالح والسوء كحامل المسک ونافخ الكير' فحامل المسک اما ان يحذيک واما ان تبتاع منه واما ان تجد منه ريحا طيبا ونافخ الكير اما ان يحرق ثيابک واما ان تجد منه ريحاخبيثة۔

اچھے ساتھی اور برے رفیق کی مثال' مشک ساتھ رکھنے والے اور بھٹی دھونکنے والے کی سی ہے' پس مشک والا اگر تمہارے پاس سے بھی گزر گیا تو جب بھی نفع تم اس سے خرید لوگے تو بھی نفع' ہر حال میں دماغ معطر رہے گا ۔ اور بھٹی والے سے تعلق میں کپڑا جلے گا ورنہ تو اس کی بدبو بلاشبہ دماغ کو مکدر رکھے گی۔

تو بھائی! ہر چیز کے اثرات ہوا کرتے ہیں' اگر آپ دریا کے کنارے آباد ہوں گے تو آپ کے مزاج میں بھی رطوبت پیدا ہوگی' خشک علاقے میں رہیں گے تو یبوست پیدا ہوگی' گلاب کے پھول کو کپڑے میں رکھ دیجئے تھوڑی دیر کے بعد نکالیں گے تو کپڑے سے بھی گلاب کی خوشبو آئے گی' ریشمی کپڑوں میں عورتیں برسات کے موسم میں گولیاں رکھ دیتی ہیں' اگلے موسم میں جب نکالتی ہیں تو کپڑوں سے گولیوں کی بدبو آتی ہے' حالانکہ کپڑے کی ذات میں نہ تو خوشبو ہے' نہ بدبو' مگر مصاحبت کا اثر پڑتا ہے' اگر گلاب کو اس کا مصاحب بنا دیا جائے تو کپڑے میں خوشبو آجاتی ہے اور اگر گولیوں کو مصاحب بنا دیا جائے تو اس کے اثرات کپڑے کے اندر رچ بس جاتے ہیں اور کپڑے سے بدبو آنے لگتی ہے ___ اسی طرح اہل اللہ کی صحبت کے اثرات ہوتے ہیں جن سے متاثر ہوئے بغیر انسان نہیں رہ سکتا' ایک عالم ربانی اور درویش حقانی کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آئے گویا کہ ان کا ذکر' ذکر خدا کی تمہید ہے کسی نے کہا ہے ناکہ ؎

خاصان خدا خدا نہ باشند
ولیکن از خدا جدا نہ باشند

جب آپ اہل اللہ کے قریب ہوں گے تو کمالات ربانی آپ کے اندر آئیں گے' صحبت صالح کے آثار خیر و برکت کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔

فیض صحبت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)

یہی وجہ ہے کہ جو مرتبہ اور مقام حضرات صحابہؓ کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں' کوئی بڑے سے بڑا قطب ہو' غوث ہو' صحابیت کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ ان حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے' آپ کی مجلس میں شریک رہے ہیں جسے آپ کی صحبت نصیب ہوئی ہو اور آپ کی مجلس میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو اس کے کمالات کا کیا کہنا' ایک آدمی آفتاب کے نیچے کھڑا ہو تو اس پر جو گرمی ہوگی وہ کمرے میں بیٹھنے والے کو نہیں ہوسکتی اور جو تہہ خانے میں بیٹھا ہوگا اس پر دھوپ اور گرمی کا اثر بھی کم ہوگا' جتنا آفتاب سے قریب ہوگا' حرارت اور نورانیت بڑھتی جائے گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب نبوت ہیں آپ سے جو بلاواسطہ مستفید ہوئے ہیں ان کے فضائل و کمالات درجہ اولیٰ میں ہیں اور جو بالواسطہ ہیں ان کا ثانوی درجہ ہے اور ان حضرات سے جن لوگوں نے استفادہ کیا وہ تیسرے نمبر پر ہیں اسی طرح درجہ بدرجہ کمی ہوتی چلی جائے گی ___ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا :

خير القرون قرنی ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم۔

سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر جو اس سے متصل ہو پھر جو اس سے متصل ہو ___ سلف میں شاگرد و استاذ کی اصطلاح نہیں تھی بلکہ شاگردوں کو "صاحب" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا' کہا جاتا تھا کہ یہ اصحاب ابی حنیفہؒ ہیں' یہ اصحاب مالکؒ ہیں یہ اصحاب فلاں ہیں! اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ان حضرات نے اپنے استاذ اور شیخ سے محض کتاب کے الفاظ اور معنی ہی نہیں حاصل کئے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اپنے استاذ کے رنگ کو بھی قبول کیا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہ رنگ قبول کیا تھا جو آقائے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔

حاصل یہ کہ سب سے بڑی چیز ہے صحبت اس کے ذریعہ ایک کے قلب کا رنگ اور اس کے جذبات دوسرے کے اندر آتے ہیں' محمد حسین آزاد نے بالکل سادہ لفظ میں ایک شعر کہا ہے ؎

ملنے والوں سے راہ پیدا کر
اس کے ملنے کی اور صورت کیا

یعنی تم اگر محبوب سے ملنا چاہتے ہو تو پہلے ان کے پاس آنے جانیوالوں سے رسم و راہ پیدا کرو۔ وہ کسی دن تذکرہ کردیں گے تمہاری بھی رسائی ہو جائے گی ___ ایسے ہی اللہ تبارک وتعالیٰ تک پہنچنے کے لئے پہلے اللہ والوں سے ملا جائے' ان کے رنگ کو قبول کیا جائے' قلوب کے بدلنے کی کوشش کی جائے' اخلاق کو درست کیا جائے' نفس کی اصلاح کی جائے' پھر بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی قبول فرمالیں گے اور اپنا بنالیں گے۔

اگر کسی کے پاس علم ہے مگر اس نے شیخ کی صحبت نہیں اختیار کی ہے' اس کا رنگ نہیں قبول کیا ہے تو وہ علم صرف لفظی ہو گا حقیقی نہیں ہو گا ___ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

اِتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (توبہ پ ۱۱)

اللہ سے ڈرو اور معیّت اختیار کرو سچے لوگوں کی' سچوں کی معیّت اختیار کرنے سے ان کے اثرات تمہارے اندر پیدا ہوں گے اور سچائی کی خوبی تمہارے ذہن میں بیٹھتی چلی جائے گی۔

صحبت ہی کی بات ہے کہ محدثین کے یہاں ان راویوں کی روایت زیادہ قابل قبول ہوتی ہے' جنہوں نے محض سنا ہی نہیں بلکہ اپنے شیخ کی صحبت بھی زیادہ سے زیادہ اٹھائی ہو۔

علم حقیقی

دیکھو بھائی! ایک علم تو ہوتا ہے رسمی اور لفظی جو رٹنے اور کتابوں سے آجاتا ہے اور ایک علم ہوتا ہے حقیقی جو علماء ربانی اور اہل اللہ کی صحبت سے آتا ہے' بہت سے لوگ ایسے بھی دیکھنے میں آئے کہ وہ عالم تو نہیں مگر جاہلوں کو کون کہے عالموں کی بھی رہنمائی فرماتے تھے۔ حاجی امیر خاں صاحب ہمارے اکابر دیوبند کے ایک متعارف خادم جن سے سنی ہوئی روایات کا مجموعہ خود میں نے مرتب کیا اور حضرت اقدس حکیم الامت مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس پر فوائد اپنے قلم سے تحریر فرمائے جیسا کہ معلوم ہے کہ وہ رسمی عالم تو نہیں تھے یعنی انہوں نے باقاعدہ کسی درسگاہ میں نہ پڑھا تھا اور نہ کسی مدرسے کی ان کے پاس سند تھی مگر حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اس کی برکت سے ان کے علم و فکر میں کچھ ایسی گہرائی پیدا ہو گئی تھی کہ علامہ انور شاہؒ جیسی بحر العلوم اور کتابوں کی حافظ شخصیت ان سے استفادہ کرتی تھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص آتا ہے' وہ بد اخلاق بھی ہے' مشرک بھی' مگر جب آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے، محبت سے فیض یاب ہوتا ہے تو عالم بھی بن جاتا ہے' خلیق بھی بن جاتا ہے اور کریم بھی۔

تو بھائی نیک صحبت سے اخلاق بدل جاتے ہیں' روحیں پلٹ جاتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزاروں معجزات ہیں اور معجزات کو تو چھوڑ دیجئے آپ کا یہی کم کارنامہ اور کیا کم معجزہ ہے کہ آپؐ نے عرب جیسی تہذیب واخلاق سے نا آشنا قوم کے قلوب کو بدل کر رکھ دیا' لوہے کا نرم کردینا آسان ہے مگر قلوب اور روحوں کا بدلنا نہایت ہی مشکل' ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا ہر ہر صحابی ایک معجزہ ہے۔

مؤاخاۃ فی اللہ

لیکن اگر کسی شخص کو اتفاق سے شیخ میسّر نہ آئے اور وہ کہے کہ میری بستی میں نہ تو کوئی شیخ ہے نہ کوئی عالم

پھر میرے نفس کی اصلاح کی کیا صورت ہوگی' ایسے شخص کے متعلق امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ اسے مایوس نہیں ہونا چاہئے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بستی میں اس کا کوئی دوست تو ہوگا ہی اور اگر نہ ہو تو ایک دو آدمیوں سے دوستی کر کے آپس میں سمجھوتہ کرلینا چاہئے کہ اگر میں کوئی برائی کروں تو تم میرا ہاتھ پکڑ کر روک دو' تم کرو گے تو میں روک دوں گا' تم سے کوئی کوتاہی ہوگی' تو میں تنبیہ کروں گا' مجھ سے ہوگی تم کرنا' اگر دوستی اس طرح ہوگئی تو زیادہ نہیں چالیس دن کے اندر سینکڑوں برائیاں ختم ہو جائیں گی۔

تو اگر کوئی شیخ نہیں ملتا' کوئی عالم نہیں ملتا۔ تو اس طرح اپنے نفس کی اصلاح کی جاسکتی ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں اسے مؤاخات فی اللہ کہتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن سات آدمی ایسے ہوں گے جنہیں اس دن جس دن کہ کہیں سایہ نہ ہوگا اللہ تبارک وتعالیٰ عرش کے سائے تلے جگہ دیں گے ان میں سے ایک نوع یہ بھی ہے۔

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم سبعۃ یظلھم اللّٰہ فی ظلہ یوم لاظل الاظلہ امام عادل وشاب نشأفی عبادۃ اللّٰہ' ورجل قلبہ معلق بالمسجد اذا خرج منہ حتی یعود الیہ ورجلان تحابا فی اللّٰہ اجتمعا علیہ وتفرقا ورجل ذکر اللّٰہ خالیا ففاضت عیناہ ورجل دعتہ امرأۃ ذات حسب وجمال فقال انی اخاف اللّٰہ ورجل تصدق بصدقۃ فاخفاھا حتی لاتعلم شمالہ ماتنفق یمینہ

(متفق علیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' سات آدمی وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں لیں گے' جس دن کہ سوائے خدا کے سائے کے کسی کا سایہ نہ ہوگا' ایک انصاف پرور بادشاہ' دوسرے وہ نوجوان جس کی جوانی کا آغاز ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوا اور تیسرے وہ شخص جس کا دل مسجد کے ساتھ اٹکا ہوا ہے' جب مسجد سے نکلتا ہے تو بے چین رہتا ہے' تاوقتیکہ پھر مسجد میں نہ پہنچ جائے اور دو اشخاص جنہوں نے اللہ ہی کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کے لئے ترک تعلق کیا اور ایک وہ شخص ہے کہ جس نے خدا کو یاد کیا ہو تنہائی میں اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور ایک وہ کہ جسے ایک ایسی عورت نے زنا کی دعوت دی جو خوبصورت بھی تھی اور بلند خاندان سے تعلق بھی رکھتی تھی اس پر اس نوجوان نے یہ کہہ دیا کہ مجھے تو خدا کا خوف اس کام کی اجازت نہیں دیتا اور ایک وہ شخص جس نے صدقہ دیا اور اتنا چھپایا کہ بائیں ہاتھ کو بھی نہیں معلوم کہ داہنے ہاتھ نے کیا دیا۔

حدیث میں ہے کہ ایسے دو آدمی جن میں مواخات فی اللہ تھی اگر ان میں سے کسی کا انتقال ہو جائے اور وہ مقبول عند اللہ ہو جائے تو وہ دعا کرے گا کہ اے اللہ میرے فلاں دوست کو بھی اسی مقام پر لے آ' اسی کی وجہ سے مجھے یہ مقام ملا ہے۔

انتخاب دوست

اور یہ جو میں نے عرض کیا کہ اصلاح کے اس دوسرے طریقہ میں کسی دوست سے مدد لینی ہوگی' تو بھائی! دوست بھی دنیا میں ایک ہی نوعیت' فطرت اور مزاج کے نہیں ہوتے بلکہ ان میں بڑا فرق اور تفاوت رہتا ہے اس لئے دوست کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا کسی نے کہا ہے نا کہ ؎

ولا اندر جہاں یاراں سہ قسم اند
زبانی اند ونانی اند و جانی

بنانی ناں بدہ ازدر بدر کن
تلطف کن بیاران زبانی

ولیکن یار جانی رابدست آر
مدارا تش بگیری تا توانی

یعنی دوست کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک تو دستر خوانی دوست اگر خدا نے آپ کا دستر خوان سلامت رکھا ہے تو پھر آپ کے لئے دوستوں کی کمی نہیں جتنے چاہئے جمع کر لیجئے اور بعض زبانی دوست ہوتے ہیں ان کی بھی دنیا میں کوئی کمی نہیں اور بعض جگری اور حقیقی دوست ہوا کرتے ہیں جو صرف آرام اور راحت ہی میں نہیں بلکہ تکلیف اور مصیبت میں بھی پورا پورا ساتھ دیتے ہیں' ایسے دوستوں کی تعداد یقیناً کم ہے۔

جو دستر خوانی دوست ہوں ان کی بات تو بالکل نہ مانیو اس لئے کہ جس دن تمہارا دستر خوان لپٹ جائے گا ان کی دوستی بھی ختم ہو جائے گی البتہ انہیں ان کی طلب وخواہش کے مطابق کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑا لیجئے اور جو زبانی جمع خرچ کرنے کے عادی ہوں تم بھی ان کے ساتھ دوستی زبان ہی تک محدود رکھو۔

ایک شاعر تھے انہوں نے ایک امیر صاحب کی شان میں قصیدہ پڑھا اور اس میں خوب ایران توران کی ہانکی کہ آپ کی کرسی کا پایہ ہفت آسمان سے بلند ہے آپ کے تاج کے موتی' جیسے آسمان کے تارے وغیرہ وغیرہ ـــــ جب قصیدہ ختم ہو گیا تو امیر صاحب نے کہا کہ پرسوں آنا تمہیں دو ہزار اشرفیاں دوں گا۔ اس سے جناب خوب خوش ہوئے اور گھر جا کر تیسرے دن کا انتظار کرنے لگے قبل اس کے کہ تیسرا دن آئے پہلے ہی انہوں نے اس امید پر کہ اب تو دو ہزار ملے گا ہی پانچ سو روپیہ قرض لے لیا' چنانچہ اب بہترین کھانے پک رہے ہیں' اعزاء واقارب کی دعوتیں ہو رہی ہیں' نئے نئے جوڑے تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ جب تیسرا دن آیا تو دربار میں پہنچ کر امیر صاحب کو سلامی دی۔ امیر صاحب نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا' دوسری مرتبہ سلام کیا' اس پر بھی متوجہ نہ ہوئے' تیسری بار کھانسے اس پر بھی امیر صاحب کی نگاہ نہ اٹھی' آخر میں زبان ہی سے کہا کہ بندہ حاضر ہے میں نے اس دن قصیدہ پڑھا تھا اور آج کے دن آپ نے دو ہزار اشرفیاں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ امیر صاحب نے سر اٹھایا اور کہا بھائی تم نے قصیدہ پڑھا تھا جس کے اندر محض الفاظ ہی الفاظ تھے' حقیقت اور واقعیت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا تم نے مجھے لفظوں سے خوش کر دیا۔ میں نے بھی تمہیں لفظوں سے خوش کر دیا' جیسا تم نے دیا تھا ویسا میں نے واپس کر دیا اب اور کیا چاہتے ہو؟

تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ دوستوں کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ وہ محض زبانی جمع خرچ کرتے رہتے ہیں ان کی باتوں کا حقیقت اور واقعیت سے نہ کوئی تعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی واسطہ' ایسے دوستوں کی بھی زبانوں پر اعتماد نہ کرنا چاہئے' لیکن ایسے دوست جو مصیبت میں کام آتے ہوں' خود پریشانیاں اٹھا لیتے ہوں مگر دوست پر آنچ نہ آنے دیتے ہوں' ہزاروں میں ایک ہی ہوتے ہیں۔

اور اسی تیسرے دوست کے متعلق شاعر نے یہ بات کی ہے کہ اسے مضبوط پکڑ لو اور اس کے تعلق ومحبت کی قدر کرو۔

بہر حال اصلاح نفس کے لئے اگر کوئی شیخ نہیں ملتا تو اپنے دوستوں ہی سے اپنی اصلاح کرنی چاہئے۔

دشمن کے ذریعے اصلاح

لیکن اگر کوئی کہے کہ میرا کوئی دوست ہی نہیں تو پھر اس کے لئے تیسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے ذریعہ اپنی اصلاح کرے ایسا تو شاید ہی کوئی ہو گا کہ آج کے دور میں جس کا کوئی دشمن نہ ہو، آپ کے دشمن چھانٹ چھانٹ کر آپ کے عیوب اور برائیاں نکالتے اور پھیلاتے رہیں گے اب آپ کا کام یہ ہو گا کہ آپ کے اندر جو برائیاں ہیں انہیں چھوڑتے چلے جایئے۔ اگر آپ اس طرح ایک چلے دو چلّے بھی گزار لیں گے تو بڑی حد تک آپ کی برائیاں ختم ہو جائیں گی اور آپ صالح بن جائیں گے۔

محاسبۂ نفس

اور اگر کوئی کہے کہ میں تو پہاڑ کی کھوہ میں رہتا ہوں، مجھے نہ کسی شیخ کی صحبت میسّر ہے اور نہ میرا کوئی دوست ہے نہ دشمن ہے پھر میرے لئے اصلاح کا کیا طریقہ ہو گا، امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ اس کو بھی مایوس نہ ہونا چاہئے اس کے لئے چوتھا طریقہ محاسبۂ نفس کا ہے، روزانہ سوتے وقت کم از کم پندرہ منٹ مراقبہ کرے اور سوچے کہ آج میں نے کتنی بھلائیاں کیں اور کتنے گناہ مجھ سے سرزد ہوئے، جو بھلائیاں کی ہوں ان پر شکر ادا کرے اس لئے کہ شکریہ ادا کرنے سے اللہ تعالیٰ زیادتی کی توفیق دیں گے، ارشاد خداوندی ہے :

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۔ (ابراہیم پ ۱۳)

یعنی اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم نعمتوں کو بڑھا دیں گے، تو جتنا شکر ادا کریں گے خدا تعالیٰ نعمتوں کو بڑھا دیں گے اور جو گناہ سرزد ہوئے ہوں ان پر سچے دل سے توبہ کرے، جب صدق دل سے توبہ کرلے گا تو سارے گناہ جھڑ جائیں گے، حدیث میں ہے :

التائب من الذنب كمن لاذنب له۔

گناہ سے توبہ کرنیوالا ایسا ہے کہ جیسا کہ اس سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوا۔ اگر برابر اس عمل کو جاری رکھا جائے گا تو برائیاں ختم ہوتی جائیں گی اور نفس میں اصلاح و تقویٰ پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

حاصل یہ کہ اوّلاً تو شیخ کے ذریعہ نفس کی اصلاح کیجئے، شیخ نہ ملے تو پھر دوست کے ذریعے خوبیاں پیدا کیجئے اور اگر دوست نہ ہو تو پھر دشمن کو آلۂ کار بنایئے اور اگر دشمن بھی نہیں ہے تو اپنا شیخ اپنے ہی کو بنا لیجئے، عرفی طور پر اصلاح کے یہی چار طریقے ہیں، ان میں سے اگر ایک بھی میسّر آجائے تو نجات کے لئے کافی ہے اور اگر اتفاق سے یہ چاروں چیزیں میسّر آجاویں تب وہ شخص کیمیا بن جائے گا کہ (۱) شیخ بھی ہو (۲) مؤاخاۃ فی اللہ بھی ہو (۳) دشمن بھی ہو اور (۴) محاسبہ بھی ہو گویا اگر کسی کو یہ چاروں چیزیں میسّر آجائیں تو پھر زہے قسمت وزہے نصیب۔

تبلیغی جماعت اصلاحی طریقوں کی جامع ہے

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ تبلیغ اصلاح کے ان چاروں طریقوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے تو یہ تبلیغی جماعت ایک "معجون مرکّب" ہے گویا یہ نسخۂ امرت کا بن گیا جس پر اصلاح نفس کے یہ چاروں طریقے جمع ہو گئے ہیں۔ الغرض اس میں محنت کرنے سے بہت ہی بڑا فائدہ ہو گا آپ کہیں گے کہ تبلیغ میں نکالا کیوں جاتا ہے؟

تو تبلیغ میں اس لئے نکالا جاتا ہے کہ اس میں بزرگوں کی صحبت میسّر ہوتی ہے پھر ساتھی اچھے ملتے ہیں، جو

ایک دوسرے کو برائی سے روکتے ہیں اور پھر جب وہ اپنا خرچ کر کے باہر نکلا ہے تو دینی جذبات بھی ابھریں گے اسے اپنی اصلاح کا خیال پیدا ہوگا' اس لئے کہ جب وہ اپنا گھر چھوڑ کر گیا ہے اور ہر قسم کی مشقت برداشت کر رہا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ اثر لے کر ضرور ہی آئے گا۔ اس کے بعد بھی اگر یہ اثر لے کر نہ لوٹے تو وہ انسان نہیں ہے بلکہ پتھر ہے۔ اگر انسان ہے تو ضرور وہ اثر لے کر آئے گا۔ کیونکہ وہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہا ہے۔

جماعت کی برکات

بہت ممکن ہے کہ اس مجموعۂ مرکّب میں بعض کمزور ارادہ' بعض نحیف عمل' بعض خام علم والے جمع ہو جائیں اور شبہ یہ ہو کہ تبلیغ سے حاصل ہونیوالا فائدہ یقینی ہونے کی بجائے موہوم ہو کر رہ جائے گا ___ تو بھائی اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ کمزوروں سے مرکّب اجتماع' جمعیّت اور اتحاد کی بنا پر یہ ایک قوّت حاصل کرلے گا جیسا کہ اس کی نظیر خود ہی ہمارے فن حدیث میں بھی موجود ہے' چنانچہ مشہور ہے کہ اگر کسی حدیث کے سلسلے میں چند ضعیف سندیں جمع ہو جائیں تو وہ حدیث بھی محدّثین کے نزدیک قوی سمجھی جانے لگتی ہے' آپ دیکھتے ہیں کہ اگر چند بھیک مانگنے والے دو' دو' چار' چار پیسے جمع کر لیتے ہیں تو سب کے کھانے کا انتظام ہو جاتا ہے اور اگر علیحدہ علیحدہ چاہیں تو کسی کا بھی پیٹ نہیں بھر سکتا' ایسے ہی اگر چند ضعیفُ العمل اور ضعیف روحانیت والے نیک نیتی سے جمع ہو جائیں گے تو ایک کا دوسرے پر اثر پڑے گا اور سبھی کے اندر قوت پیدا ہو جائے گی۔

اور بھائی ان حضرات کی نیک نیتی میں کیا شبہ ہے' ظاہر ہے کہ یہ حضرات نہ تو تجارت کے لئے جمع ہوتے ہیں نہ کھیتی باڑی اور نہ کسی دوسرے کاروبار کے لئے۔

پھر یہ بھی تو سوچئے کہ دس پندرہ آدمیوں کی جماعت میں کوئی نہ کوئی تو مقبول خداوندی ضرور ہی ہوگا اور ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کی مقبولیت کا اثر دوسروں پر یقیناً پڑے گا' یہی وجہ ہے کہ مؤمن کو نماز باجماعت پڑھنے کا حکم ہے۔ اس لئے کہ وہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ سارے جماعت کے نمازی بھی کمزور کیوں نہ ہوں' پھر بھی مجموعہ میں خدا کا کوئی مقبول بندہ ایسا ضرور ہوتا ہے جس کی وجہ سے پوری جماعت کی نماز قبول ہو جاتی ہے' معلوم ہوا کہ جماعت میں خواہ کتنے ہی ضعیف کیوں نہ ہوں' لیکن خدا کا کوئی مقبول بندہ ضرور ہوگا جس کی وجہ سے اس کی مقبولیت ضرور ہوگی۔

نیک نیتی کا اثر

اور پھر وہ اپنی ذاتی غرض سے نہیں نکلے ہیں' بلکہ اللہ کے رضا کے لئے نکلے ہیں۔ اس نیک نیتی کا اثر بھی پڑتا ہے' کیونکہ یہ اللہ کا نام سیکھنے جا رہے ہیں ___ خدا کو یاد کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ تو جب اس نیت سے اللہ کے راستہ میں نکلیں گے تو اس کا اثر بھی ضرور آئے گا۔

گویا اس طرح فی الجملہ صحبت شیخ و صحبت صلحاء میسّر آجائے گی۔ بہرحال یہ سب سے پہلی چیز صحبت اہل اللہ ہے۔

تبلیغی بھائی

پھر جب ایک جذبہ سے جائیں گے تو مواخاۃ (بھائی چارگی) بھی قائم ہوگی' یہی وجہ ہے کہ ان میں باہم دوستی بھی قائم ہوجاتی ہے۔ اس لئے واپس آنے کے بعد ایک دوسرے کو تبلیغی بھائی کے نام سے یاد کیا کرتے ہیں کہ تبلیغی بھائی آرہے ہیں گویا ان میں کا ہر ایک دوسرے کا بھائی بن جاتا ہے اور آپس میں ایک قسم کی اخوت ہوجاتی ہے۔

جماعت کی نماز کی بھی یہی خصوصیت ہے' جب لوگ مسجد میں آتے ہیں تو ایک کی دوسرے سے آنکھیں چار ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں باہمی محبت پیدا ہوجاتی ہے اور جب ان میں کا کوئی کبھی غائب ہوتا ہے تو دوسرے سے معلوم کرتے ہیں کہ فلاں تو روزانہ آیا کرتا تھا آج کیوں نہیں آیا معلوم ہوا کہ بیمار ہے' پھر لوگ اس کی عیادت کے لئے جائیں گے اور اس طرح لوگوں کو عیادت مریض کا ثواب حاصل ہوگا۔ نیز اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل ہوگا۔ حدیث میں ہے کہ مرض کی حالت میں آدمی کو اللہ تعالیٰ سے بے حد قرب ہوتا ہے۔ حدیث ہی میں ہے کہ بندے کو اللہ تعالیٰ سے نعمتوں میں اتنا قرب نہیں ہوتا جتنا کہ مصیبتوں میں ہوتا ہے۔ نیز حدیث ہی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے فرمائیں گے کہ میں بیمار ہوا تھا تو میری مزاج پرسی کے لئے نہیں گیا' بندہ کہے گا کہ اے باری تعالیٰ آپ کی ذات تو ان چیزوں سے پاک ہے' آپ کے بیمار ہونے کا کیا سوال؟ باری تعالیٰ فرمائیں گے میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا' اگر تو اس کی عیادت کے لئے جاتا تو مجھے اس کی پٹی پر موجود پاتا' تو پھر تجھے بھی وہ قرب نصیب ہوتا جو میرے اس بندے کو مجھ سے حاصل تھا۔

حاصل یہ ہے کہ ایک مریض کی عیادت کے لئے جانے سے عیادت کے ثواب کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب بھی نصیب ہوگا' اگر خدانخواستہ اس کا انتقال ہوگیا تو سب کے سب اس کے کفن دفن میں لگیں گے اس کا بھی ثواب ملے گا گویا کہ از اول تا آخر ثواب ہی ثواب ہے' یہ ہیں برکات مسجد میں حاضری اور بروقت مسلمانوں کے آپس میں ملنے جلنے کے نتائج' اب آپ دیکھئے کہ تبلیغ والے مرکز ہمیشہ مسجد ہی بناتے ہیں تو مسجدوں کی وہ برکات جو مسجد میں آنیوالوں کے لئے مخصوص ہیں۔ خود تبلیغ والوں کو ضرور بلکہ کچھ زائد ہی نصیب ہونگی اور پھر ایک مشرب ایک مسکن ایک مطعم کی بناپر جو مواخات بھائی بندی کے جذبات باہم رونما ہوتے ہیں یہ تبلیغ والے اس سے کبھی محروم نہیں رہ سکتے تو تبلیغی جماعت میں نکل کر شیخ بھی ملے' دوست بھی ملے' نیت بھی اچھی ہوئی اور پھر اچھی بات کہنے کا موقع بھی ملا۔

جماعت میں دشمنوں سے عبرت کا موقع

اب جب اچھی بات کہو گے تو ہر ایک ٹھنڈے دل سے نہیں سنے گا بلکہ اس کے مخالف ہوجائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس جماعت میں رہ کر دشمنوں سے بھی نصیحت حاصل کرنے کا بہترین موقع حاصل ہوتا ہے' اس لئے کہ آپ دس لوگوں کے پاس جائیں گے' دس منہ ہوں گے' دس قسم کے باتیں ہوں گی' کوئی بدعتی کہے گا' کوئی وہابی کہے گا اور بھی طرح طرح کی سخت وسست باتیں آپ کو لوگ کہیں گے۔ آپ کے عیوب اور خرابیاں نکالنے کی کوشش کریں گے' جب آپ بار بار اس قسم کی باتوں کو سنیں گے تو غور کریں گے کہ آخر میرے اندر کیا کمزوریاں ہیں کیا کوتاہیاں ہیں پھر ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معلوم کرکے آپ ان کو دور کرنے کی فکر کریں گے۔

حاصل یہ کہ اس میں نیک لوگوں کی صحبت بھی میسر، دوستی بھی میسر، دشمنوں سے عبرت ونصیحت حاصل کرنے کا بھی موقع۔

تبلیغ میں محاسبہ

اور ان تمام باتوں کے ساتھ جب آپ رات کو پڑکر سوئیں گے تو یقیناً سوچیں گے کہ آج میں نے کتنی نیکیاں کیں اور کتنی برائیاں کیں اور پھر آپ کے دل میں خیال پیدا ہوگا کہ رات کا وقت ہے حق تعالیٰ سے قرب ہے لاؤ نیکیوں پر اس کا شکریہ ادا کروں اور برائیوں سے توبہ کرلوں، تو اس طرح نیکیوں کا سلسلہ بڑھ جائے گا اور برائیاں گھٹتی چلی جائیں گی۔

تو بھائی! اس جماعت میں یہ چاروں دوائیں موجود ہیں، جو ہدایت کے لئے ایک ایسا معجونِ مرکب ہے کہ اس کے بعد پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔

تبلیغ اور اصلاح

اور مقصود اصلی یہ ہے کہ پہلے خود ہمارا ہی دین درست ہو، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ابتدا خود اپنے ہی سے کرنی پڑتی ہے، ضروری ہے کہ آدمی پہلے خود صالح بنے، پھر دوسرا مقام یہ ہے کہ دوسروں کو صالح بنائے، ایک دوسرے کو دیکھ کر عمل کرے گا تو صالح بنے گا۔ دوسروں کو عمل کی دعوت دے گا تو مصلح بنے گا۔

اعتراضات اور ان کا اصولی جواب

رہ گئے تبلیغی جماعت پر اعتراضات تو لوگ کرتے ہی رہتے ہیں، کون سا ایسا کام اور کون سی ایسی جماعت ہے کہ جس پر اعتراضات نہیں ہوتے، آپ اعتراضات کو چھوڑ دیجئے اور کام کرتے جائیے ___ مثال کے طور پر لوگ ایک اعتراض یہ کیا کرتے ہیں کہ تبلیغی جماعت والے صرف فضائل بیان کرتے ہیں، مسائل نہیں بیان کرتے اور دین درست ہوتا ہے مسائل سے فضائل سننے کے بعد دل میں اُمنگ تو پیدا ہو جاتی ہے مگر جب آگے مسئلہ نہیں معلوم ہوگا تو ممکن ہے کہ لوگ اُمنگ اور جذبات کی رہ میں بہہ کر من گھڑت عمل شروع کردیں اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ بدعت میں مبتلا ہوں گے؟

لوگوں کا یہ کہنا کہ اس طرز عمل سے لوگ بدعت کے اندر مبتلا ہوتے چلے جائیں گے۔ اولاً تو محض احتمال اور امکان کی بات ہے دیکھنا یہ ہے کہ واقعہ کیا ہے چالیس برس کے اندر کتنے لوگ بدعت میں مبتلا ہوئے؟

رہا مسائل کا نہ چھیڑنا، اس کا اگر یہ جواب دیا جائے کہ ہم پہلے فضائل بیان کرکے جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں مسائل چلائیں گے، تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ چالیس سال سے تبلیغ چل رہی ہے کیا آج تک جذبہ ہی پیدا نہیں ہوا؟ ___

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ تبلیغ والے فضائل ہی تو بیان کرتے ہیں مسائل سے انکار تو نہیں کرتے، کیا وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مسئلہ کسی سے نہ پوچھو، ہرگز وہ ایسا نہیں کہتے۔

دوسرے یہ کہ کام کرنے کے مختلف میدان اور مختلف لائنیں ہوتی ہیں، کوئی درس وتدریس کی لائن اختیار کرتا ہے، کوئی وعظ وتبلیغ کی، تو کوئی سیاست وحکمت کی۔ ان حضرات نے بھی ایک لائن اختیار کرلی ہے، فضائل بیان کرتے ہیں، لوگوں کے اندر دینی جذبہ اور اُمنگ پیدا کرتے ہیں، اب ساری لائن وہی اختیار کرلیں یہ نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی ممکن۔

جب آپ کسی کام کو شروع کرتے ہیں تو آپ کام کرنے سے پہلے کچھ مقاصد اور اصول مقرّر کرتے ہیں اور اپنی لائن متعیّن کرتے ہیں' اس میں آپ سب چیزوں کو داخل نہیں کرتے ہیں' تو پھر آپ اس میں سب چیزوں کو کیوں شامل کرنا چاہتے ہو؟

بہرحال جب کوئی اعتراض کرے تو اسے سن لینا چاہئے اور اپنا کام کرتے رہنا چاہئے عمل ہی سب اعتراضات کا جواب ہے۔

مقصدِ تبلیغ

بس تبلیغ والوں کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر دین کا جذبہ اور دینی امنگ پیدا کردی جائے' اب اس امنگ سے آدمی دین کی جس لائن میں بھی کام لینا چاہے لے سکتا ہے' نیز دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب کسی چیز کی امنگ پیدا ہوجاتی ہے تو آدمی خود ہی اس امنگ کو صحیح طریقے سے پورا کرنے کی جدوجہد اور سعی کرتا ہے۔ اگر آپ کے اندر صحیح امنگ پیدا ہوگئی ہے اور آپ کو مسائل کی طلب ہے تو علماء سے ملیے' مدرسے میں جایئے اور مسائل معلوم کیجئے باقی کام میں نہ لگنا اور اعتراضات کا کرنا یہ حیلہ کرنیوالوں کا کام ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ ہر جماعت کا ایک نصب العین اور طریقہ کار ہوتا ہے' آپ کا اس پر دوسری چیزوں کا لادنا کہ فلاں چیز کو بھی اس میں شامل کرلیجئے' کسی طرح مناسب نہ ہوگا' جب اس جماعت نے اپنا ایک موضوع متعین کرلیا تو آپ کو چاہئے کہ آپ اسے اس پر کاربند رہنے دیں۔

بہرحال تبلیغ سے نفع اَظهر مِن الشمس ہے کہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں دین کی امنگ اور طلب پیدا ہوئی اور اسی امنگ اور طلب کی وجہ سے کتنی بدعات ختم ہوئیں ورنہ لاکھوں آدمیوں کا محض اللہ اور اللہ کے دین کی خاطر اپنا پیسہ خرچ کرکے سفر کرنا' اپنا کھانا' اپنا پینا' پہلے یہ جذبہ کہاں تھا' تو اس سے جو نفع پہنچا اس کو تو آپ بیان نہ کریں اور جو ان کا منصوبہ نہیں اس کو آپ اعتراض کی بنیاد بنائیں' یہ تو کوئی مناسب بات نہ ہوگی۔

خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے

بہرحال! اصلاح نفس کے چار جزو اور چار طریقے ہیں اور تبلیغ کے اندر حسن اتفاق سے چاروں طریقے جمع ہوگئے ہیں' صحبت صالح بھی ہے، ذکر و فکر بھی ہے ___ مؤاخاة فی اللہ بھی ہے ___ دشمن سے عبرت و موعظت بھی اور محاسبۂ نفس بھی ہے اور انہی چاروں کے مجموعہ کا نام تبلیغی جماعت ہے۔ عام لوگوں کے لئے اصلاح نفس کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا' اس طریقہ کار سے دین عام ہوتا جارہا ہے اور ہر ملک کے اندر یہ صدا پہنچتی چلی جارہی ہے' اس کے ذریعہ لوگوں کے عقائد درست ہورہے ہیں' لوگ تیزی سے اعمال کی جانب بڑھ رہے ہیں اور اپنے آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری کوشش کررہے ہیں کم از کم ان تجربات کو سامنے رکھ کر اعتراض کرنے والوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنا اور غور کرنا چاہئے۔

اس لئے اس میں خود چل کر اس کام کے فائدہ کو دیکھنا چاہئے' آپ خود داخل ہوکر اس بات کا فائدہ محسوس کریں گے کہ اس کام سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا؟ آپ اسے تجربات کی روشنی میں معلوم کرلیجئے جو شخص بھی حسن نیت سے اس کام میں آئے گا' اس کا اثر اسے ضرور ہوگا۔ اس کام میں دعوت بھی ہے اور دعوت

ہے لاالہ الا اللہ کی، نماز کی محنت بھی ہے، ساتھیوں کے ساتھ تعلق بھی ہے، ذکر بھی ہے اور محاسبہ بھی ہے۔ اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس محنت سے بہت سی خیر اور بھلائی انسان میں آ رہی ہے۔ کتنے بُرے تھے جو جماعت کی وجہ سے اچھے بن گئے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ برے عقیدے والے صالح عقیدے والے بن گئے۔

بے جا اعتراض

اور پھر اعتراضات تو وہ قابل قبول ہیں، جو کام میں گھس کر کئے جاویں اور جو باہر بیٹھ کر اعتراضات کرے وہ قابل قبول نہیں ہوا کرتے، اگر اندر گھس کر کوئی اعتراض کرے تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن اندر گھسنے والا کوئی اعتراض کرتا نہیں۔ کیونکہ داخل ہونے کے بعد اسے اس کام کا فائدہ معلوم ہو جاتا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ یہ سب باہر کے اعتراضات ہیں جو قابل قبول نہیں۔

یوں تو اعتراضات سے مدرسے والے بھی خالی نہیں۔ اللہ و رسول بھی اعتراضات سے خالی نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی نسبت کہا گیا کہ اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کی باتیں کہنا کسی طرح بھی گالی سے کم نہیں، بخاری شریف کی ایک حدیث ہے:

> **قال اللّٰہ تعالیٰ کذّبنی ابن ادم ولم یکن لہ ذالک وشتمنی ولم یکن لہ ذالک فاما تکذیبہ ایّای فقولہ لن یعیدنی کما بدأنی ولیس اول الخلق باھون علی من إعادتہ واما شتمہ ایّای فقولہ اتّخذ اللّٰہ ولدا وانا الاَحدو الصمد الذی لم الدولم اولدولم یکن لی کفوا احد ۔**
>
> ’’اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نے مجھ کو جھٹلایا، حالانکہ اس کے لئے مناسب نہ تھا کہ میری تکذیب کرے اس نے مجھے برا بھلا کہا، حالانکہ یہ اسے زیبا نہ تھا۔ تکذیب مثلاً یہ کہنا کہ اللہ مجھ کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہ کریں گے۔ حالانکہ پہلی مرتبہ کے مقابلے میں دوبارہ پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا مجھے برا بھلا کہنا یہ ہے کہ یوں کہتا کہ اللہ صاحب اولاد ہے، حالانکہ میں ایک ہوں بے نیاز ہوں اور نہ کوئی میرا باپ ہے نہ بیٹا اور نہ ہی میرا کوئی شریک و ساجھی ہے‘‘۔

آپ خود سوچئے کہ اس سے زیادہ گالی کیا ہوگی کہ کسی آدمی کے متعلق یہ کہا جائے کہ فلاں کے سانپ پیدا ہوا ہے اس شخص کے لئے کتنی شرم کی بات ہوگی، حالانکہ سانپ بھی جاندار ہے اور اس معنی کر کے دونوں میں ایک گونہ مماثلت و مشابہت ہے۔

اور بھائی! اللہ تبارک وتعالیٰ تو نور ہیں، پھر ان کے لئے بیٹا اور بیٹی کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

اسی طرح رسولوں کو بھی موردِ طعن و تشنیع بنایا گیا۔ کسی نے کہا یہ تو کاہن ہیں، کسی نے کہا جادوگر ہیں وغیرہ وغیرہ۔

تو اللہ و رسول بھی اعتراض سے نہیں بچ سکے تو ہماری اور آپ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔ بہرحال اعتراض کرنیوالے تو سب پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان سے گھبرانا نہ چاہئے۔